ملفوظات

حضرت مسیح موعُود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

* * *

۲؍ مئی ۱۹۰۴ء

دُعا ہی خُدا شناسی کا ذریعہ ہے

ایک رئیس کا یہ خیال سُنکر کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ دُعا سے مشکل حل ہوتی ہے، اُن کو بہت ہی کمزور کرنے والا ہے

آپؑ نے فرمایا کہ :

جو دُعا سے مُنکر ہے وہ خُدا سے منکر ہے۔ صرف ایک دُعا ہی ذریعہ خداشناسی کا ہے۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ اُس کی ذات کو طوعاً وکرہاً مانا جاوے۔ اصل میں سب جگہ دہریت ہے۔ آجکل کی محفلوں کا یہ حال ہے کہ دُعا۔ توکّل اور انشاء اللہ کہنے پر تمسخر کرتے ہیں۔ اِن باتوں کو بیوقوفی کہا جاتا ہے ورنہ اگر خدا سے اُن کو ذرا بھی اُنس ہوتا۔ تو اس کے نام سے کیوں چڑتے۔ جس کو جس سے محبت ہوتی ہے وہ ہیر پھیر سے کسی نہ کسی طرح سے محبوب کا نام لے ہی لیتا ہے۔ اگر اُن کے نزدیک خُدا کوئی شے نہیں ہے۔ تو اب موت کا دروازہ کُھلا ہے اُسے ذرا بند کر کے تو دکھلا دیں۔ تعجب ہے کہ ہمیں جس قدر اس کے وجود پر امیدیں ہیں اسی قدر وہ دُوسرا گروہ اس سے نااُمید ہے۔ اصل میں خدا کے فضل کی ضرورت ہے۔ اگر وہ دل کے قفل نہ کھولے تو اَور کون کھول سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو ایک کُتّے کو عقل دے سکتا ہے کہ اس کی باتوں کو سمجھ لیوے اور انسان کو محروم رکھ سکتا ہے۔

طاعون کو گالی دینا منع ہے

طاعون کو سب و شتم کرنا منع ہے کیونکہ وہ تو مامور ہے۔ ہاں خدا سے صُلح کرنی چاہیے کہ وہ اُسے ہٹا لیوے۔[1]

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۱۸/۱۹ صفحہ ۴ مورخہ ۸، ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء

۴؍ مئی ۱۹۰۴ء

خداتعالیٰ کی وحی پر کامل ایمان

آج دن کو مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے منیجر و ایڈیٹر رسالہ ریویو آف ریلیجنز کی طبیعت علیل ہو گئی اور دردِ سر اور بخار کے عوارض دیکھ کر مولوی صاحب کو شُبہ گذرا کہ شاید طاعون کے آثار ہیں۔ جب اس بات کی خبر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہوئی تو آپ فوراً مولوی صاحب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ:

میرے دار میں ہو کر اگر آپ کو طاعون ہو تو پھر اِنِّیْ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ الہام اور یہ سب کاروبار گویا عبث ٹھہرا۔ آپ نے نبض دیکھ کر اُن کو یقین دلایا کہ ہرگز بخار نہیں ہے۔ پھر تھرمامیٹر لگا کر دکھایا کہ پارہ اس حد تک نہیں ہے، جس سے بخار کا شُبہ ہو اور فرمایا کہ میرا تو خدا کی وحی پر ایسا ہی ایمان ہے جیسے اس کی کتابوں پر ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

ان دنوں لوگوں کو اور بعض جماعت کے آدمیوں کو بھی طرح طرح کے شکوک و شبہات پیش آ رہے ہیں، اس لیے میرا ارادہ ہے کہ ایک رسالہ لکھ کر اصل حقیقتِ بیعت اور الہامات سے اطلاع دی جاوے۔ جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ بعض لوگ بیعت میں داخل ہو کر کیوں طاعون سے مرتے ہیں۔؟

ایک نشان

فرمایا کہ ،

ان دنوں ایک دفعہ میری بغل میں ایک گلٹی نکل آئی۔ میں نے اسے مخاطب ہو کر کہا کہ تُو کون ہے۔ جو مجھے ضرر دے سکے اور خدا کے وعدہ کو ٹال سکے۔ تھوڑے عرصہ میں وہ خود بخود ہی بیٹھ گئی۔

آگ ہماری غلام، بلکہ غلاموں کی غلام ہے

فرمایا :

مدت کا یہ میرا الہام ہے کہ ”آگ سے ہمیں مت ڈرا۔ آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے“ یہ ویسے ہی ہے جیسے حدیث شریف میں ہے کہ بعض بہشتی بطور سیر دوزخ کو دیکھنا چاہیں گے اور اس میں اپنا قدم رکھیں گے، تو دوزخ کہے گی کہ تُو نے تو مجھے سرد کر دیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ دوزخ کی آگ اُسے جلاتی۔ خادموں کی طرح آرام دہ ہو جاوے گی۔

عادت اللہ یہی ہے کہ دو ناریں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ محبتِ الٰہی بھی ایک نار ہے اور طاعون کو بھی

نار لکھا ہے لیکن ان میں سے ایک تو عذاب ہے اور دوسری انعام ہے۔ اسی لیے طاعون کی نار کی ایک خاص خصوصیت خدا تعالیٰ نے رکھی ہے۔ اس میں آگ کو جو غلام کہا گیا ہے۔ میرا مذہب اس کے متعلق یہ ہے کہ اسماء اور اعلام کو ان کے اشتقاق سے لینا چاہیے۔ غلام غلم سے نکلا ہے۔ جس کے معنے ہیں کسی شَے کی خواہش کے واسطے نہایت درجہ مضطرب ہونا یا ایسی خواہش جو کہ حد سے تجاوز کر جاتی ہے اور انسان پھر اس سے بیقرار ہو جاتا ہے اور اسی لیے غلام کا لفظ اس وقت صادق آتا ہے جب انسان کے اندر نکاح کی خواہش جوش مارتی ہے۔ پس طاعون کا غلام اور غلاموں کی غلام کے بھی یہی معنے ہیں کہ جو شخص ہم سے ایک ایسا تعلق اور جوڑ پیدا کرتا ہے جو کہ صدق و وفا کے تعلقات کے ساتھ حد سے تجاوز ہوا ہوا اور کسی قسم کی جدائی اور دُوئی اس کے رگ و ریشہ میں نہ پائی جاتی ہو اُسے وُہ ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اور جو ہمارا مُرید الٰہی محبت کی آگ سے جلتا ہو گا اور خدا کو حقیقی طور پر پا لینے کی خواہش کمال درجہ پر اس کے سینہ میں شعلہ زن ہوگی۔ اسی پر بیعت کا لفظ حقیقی طور پر صادق آوے گا یہانتک کہ کسی قسم کے ابتلا کے نیچے آکر وہ ہرگز متزلزل نہ ہو بلکہ اَور قدم آگے بڑھا دے۔ لیکن جبکہ لوگ ابھی تک اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر وہ ابتلا میں آ جاتے ہیں اور اعتراض کرنے لگتے ہیں تو پھر وُہ اس آگ سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔

بیعت کی حقیقت

بیعت کا لفظ ایک وسیع معنے رکھتا ہے اور اس کا مقام ایک انتہائی تعلق کا مقام ہے کہ جس سے بڑھ کر اَور کسی قسم کا تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔

بعض لوگ ایسے ہیں کہ وُہ ہمارے نُور کی پوری روشنی میں نہیں ہیں۔ جب تک انسان کو ابتلا کی برداشت نہ ہو اور ہر طرح سے وہ اس میں ثابت قدمی نہ دکھا سکتا ہو۔ تب تک وہ بیعت میں نہیں ہے۔ پس جو لوگ صدق و صفا میں انتہائی درجہ پر پہنچے ہوئے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو امتیاز میں رکھتا ہے۔ طاعون کے ایام میں جو لوگ بیعت کرتے ہیں، وُہ سخت خطرناک حالت میں ہیں، کیونکہ صرف طاعون کا خوف اُن کو بیعت میں داخل کرتا ہے۔ جب یہ خوف جاتا رہا تو پھر وہ اپنی پہلی حالت پر عود کر آویں گے۔ پس اس حالت میں اُن کی بیعت کیا ہوئی؟[1]

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۱۸/۱۹ صفحہ ۴ مورخہ ۸ و ۱۶؍ مئی ۱۹۰۴ء

۸؍مئی ۱۹۰۴ء

طاعون کا نشان اور جماعتِ احمدیہ

حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام گورداسپور رہتے تھے۔ ہمارے مکرم خلیفہ رجب الدین صاحب تاجر برنج لاہور بھی شرفِ نیاز کے لیے آئے ہوئے تھے۔ خلیفہ صاحب ایک روشن خیال اور ذی فہم آدمی ہیں وہ لاہور کے حالات کا ذکر کرتے رہے کہ وہاں کے مُسلمانوں کی عجیب حالت ہو رہی ہے۔ ہر اتوار کو زیارتیں نکال کر باہر سے جاتے ہیں۔ اور اس فعل کو دفیعۂ طاعون کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ مُسلمانوں کی اس حالت پر خلیفہ صاحب افسوس کر رہے تھے اور اپنے مختلف حالات سُناتے رہے۔ آخر آپ نے عرض کیا :-

خلیفہ صاحب : طاعون میں بعض مقامات پر جو ہمارے احباب مرتے ہیں اور لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ اس کا کیا جواب دیا جاوے ؟

حضرت اقدس : اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی مامور کو دُنیا میں بھیجتا ہے تو سنت اللہ یہی ہے کہ تنبیہ کے لیے کوئی نہ کوئی عذاب بھی بھیجتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب اس کی مخالفت حد سے بڑھ جاتی ہے اور شوخی اور شرارت میں اہلِ دُنیا بہت ترقی کر جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے بکلی دُور جا پڑتے ہیں۔ وُہ عذاب اگرچہ سرکش منکرین کے لیے ہوتا ہے مگر سنت اللہ یہی ہے کہ مامور کے بعض متبعین بھی شہید ہو جاتے ہیں وہ عذاب اَوروں کے لیے عذاب ہوتا ہے مگر ان کے لیے باعثِ شہادت۔ چنانچہ قرآن شریف صاف طور پر بتاتا ہے کہ کفار جو بار بار عذاب مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ تم پر عذاب بصورت جنگ نازل ہوگا۔ آخر جب وہ سلسلہ عذاب کا شروع ہوا۔ اور کفار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیاں ہونے لگیں، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان جنگوں میں صحابہؓ شہید نہیں ہوتے ؛ حالانکہ یہ مسلّم بات ہے کہ وہ تو کفار پر عذاب تھا اور خاص ان کے لیے ہی آیا تھا۔ مگر صحابہؓ کو بھی چشم زخم پہنچا اور بعض جو علمِ الٰہی میں مقدر تھے، شہید ہو گئے۔ جن کی بابت خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ؛ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ (البقرۃ : ۱۵۵) بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (آل عمران : ۱۷۰) یعنی جو لوگ اللہ تعالےٰ کی راہ میں قتل کیے جاویں اُن کو مُردے مت کہو بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں۔ اور اسی جگہ ان کی نسبت فرمایا : فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ (آل عمران : ۱۷۱) اب بتاؤ کہ وہ جنگ

ایک ہی قسم کا تھا، لیکن وہ کفار کے لیے عذاب تھا مگر صحابہؓ کے لیے باعثِ شہادت۔ اسی طرح پر اب بھی حالت ہے۔ لیکن انجام کار دیکھنا چاہیے کہ طاعون سے فائدہ کس کو رہتا ہے۔ ہم کو یا ہمارے مخالفین کو۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ کون کم ہوئے اور کون بڑھے۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت خدا کے فضل سے غیر معمولی طور پر بڑھ رہی ہے اور اس کی وجہ طاعون ہی ہے۔ بعض ایسے لوگوں کی درخواستیں بیعت کے واسطے آئی ہیں۔ جو طاعون میں مبتلا ہو کر لکھتے ہیں کہ اس وقت مجھے طاعون ہوا ہوا ہے۔ اگر زندہ رہا تو پھر آکر بھی بیعت کر لوں گا۔ فی الحال تحریری کرتا ہوں۔ طاعون کے ذریعہ کئی ہزار آدمی اس سلسلہ میں داخل ہوئے ہیں۔

خلیفہ صاحب: وہ جنگ تو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے تھا۔

حضرت اقدس: یہ طاعون بھی اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ہی ہے۔ خدا تعالیٰ نے دو نشان مسیح موعود کی سچائی کے لیے زمینی اور آسمانی اور بہت سے نشانوں کے سوا مقرر کئے تھے۔ آسمانی نشان تو کسوف و خسوف کا تھا جو رمضان کے مہینہ میں واقع ہوگیا۔ جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ دوسرا زمینی نشان طاعون کا تھا۔ وہ بھی پورا ہوگیا ابھی طاعون کا پنجاب میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ جب مَیں نے اس کی خبر دی تھی۔ اس وقت شتاب کار لوگوں نے جلد بازی کی اور خدا تعالیٰ کے اس بزرگ نشان کو ہنسی میں اڑانا چاہا، مگر اب گو وہ زبان سے اقرار نہ کریں، مگر ان کے دلوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ پیشگوئی جو طاعون کے متعلق تھی پوری ہوگئی۔

اس نشان سے اعلاءِ کلمۃ اللہ اس طرح پر ہوگا کہ لوگ آخر جب اس کو عذاب الٰہی سمجھ کر اس کے موجبات پر غور کریں گے اور فسق و فجور اور شرارت و استہزاء چھوڑ کر خدا تعالیٰ کی طرف آئیں گے اور سمجھ لیں گے کہ خُدا حق ہے تو اس سے اعلاءِ کلمۃ اللہ ہوگا یا نہیں؟

جیسا کہ مَیں نے ابھی کہا ہے یہ طاعون ہمارے لیے کام کر رہی ہے۔ اگر اس گروہ میں ایک شہید ہو جاتا ہے تو اس کے قائمقام ہزار آتے ہیں۔ یہ نادانوں کا شُبہ فضول ہے کہ کیوں مرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں صحابہؓ جنگ میں کیوں شہید ہوتے تھے؟ کسی مولوی سے پوچھو کہ وہ جنگ عذاب تھی یا نہیں؟ ہر ایک کو کہنا پڑیگا کہ عذاب تھی۔ پھر ایسا اعتراض کیوں کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جا پڑتا ہے، لیکن اگر کوئی کہے کہ پھر نشان مشتبہ ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نشان مشتبہ نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ انجامکار کفار کا ستیاناس ہوگیا اور ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا اور اسلام ہی اسلام نظر آتا تھا؛ چنانچہ آخر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر ۲، ۲) کا نظارہ نظر آگیا۔ اسی طرح پر طاعون کا

حال ہے۔ اس وقت لوگوں کو تعجب معلوم ہوتا ہے اور وہ اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ایک وقت آتا ہے، جب طاعون اپنا کام کرکے چل جائے گی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ اس نے کس کو نفع پہنچایا اور کون خسارہ میں رہے گا۔ یہ اس زمانہ کے لیے ایک عظیم الشان نشان ہے جس کا ذکر سارے نبی کرتے چلے آئے ہیں اور طاعون سے اس قدر جلدی لوگ حق کی طرف آرہے ہیں کہ پہلے نہیں آئے تھے۔

خلیفہ صاحب: حضور! کیا ایسے لوگ مامون ہوجائیں گے؟

حضرت اقدس: اس میں کیا شک ہے کہ وہ امن میں تو ہوگئے۔ اگر اس سلسلہ میں ہوکر ان میں سے کوئی مر بھی جاوے، تو وہ شہادت ہوگی اور خدا کے مامور پر ایمان لانے کا یہ فائدہ تو حاصل ہوگیا۔

مَیں نے جس قدر طاعون کے متعلق کھول کھول بیان کیا ہے کسی نے نہیں کیا۔ متواتر میں اس پیشگوئی کو شائع کرتا رہا اور خدا تعالیٰ نے مختلف رنگوں میں مختلف اوقات میں اس کے متعلق مجھ پر کھولا اور مَیں نے لوگوں کو سُنایا۔ یَا مَسِیْحَ الْخَلْقِ عَدْوَانَا بہت پُرانا الہام ہے جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ پھر وہ سیاہ پودوں والی رؤیا اور ہاتھی والی رؤیا۔ غرض یہ طاعون خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوکر آئی ہے اور اپنا کام کر رہی ہے۔ بعض لوگ شرارت سے کہتے ہیں کہ یہ طاعون اُن کی شامتِ اعمال سے آئی ہے۔ یہ تو وہی بات ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کو الزام دیا تھا۔ مگر کوئی ان سے پُوچھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ شامت اعمال تو ہماری وجہ سے آئی ہے اور ہماری حفاظت کو خدا تعالیٰ ایک نشان قرار دیتا ہے اور مَر رہے ہیں دوسرے۔

اس وقت ایک خاص تبدیلی کی ضرورت ہے۔ خدا تعالیٰ کا غضب بھڑکا ہوا ہے۔ جواب بھی تبدیلی نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ ان کی پروا نہیں کرے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ اسی طاعون کے متعلق میرا الہام ہے[1]۔

بخاری میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھے مومن کی جان لینے میں تردد ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومن کو یکدفعہ نہیں پکڑتا۔ پکڑتا ہے پھر اس کے ساتھ نرمی کرتا ہے۔ پھر پکڑتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے۔ یہ حالت گویا تردد سے مشابہ ہے۔

پہلی کتابوں میں بھی اس قسم کے الفاظ آئے ہیں کہ خدا پچھتایا۔ میرے الہام میں بھی اُفْطِرُ وَاَصُوْمُ اسی رنگ کے الفاظ ہیں۔ مَیں یقین رکھتا ہوں، جس مومن کے وجود میں خلق اللہ کا نفع ہو اور اس کی موت شماتت کا باعث ہو وہ کبھی طاعون سے نہیں مرے گا۔ مَیں جانتا ہوں اور قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ابھی تک

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ صفحہ ۳ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء

کوئی ایسا آدمی طاعون سے نہیں مرا جس کو مَیں پہچانتا ہوں یا وُہ مجھے پہچانتا ہو جو شناخت کا حق ہے۔

ماُمورین کا خاص نشان

امام اور پیشوا وہی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اِذن اور حکم سے ماُمور ہو کر آوے۔ اس میں اللہ تعالیٰ ایک جذب کی قوّت رکھ دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے سعادت مند رُوحیں خواہ وہ کہیں ہوں اُس کی طرف کھچی چلی آتی ہیں۔ جذب کا پیدا ہونا اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ بناوٹ سے یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جو لوگ خُدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آتے ہیں وہ اس بات کے حریص اور آرزُو مند نہیں ہوتے کہ لوگ ان کے گرد جمع ہوں اور اس کی تعریفیں کریں بلکہ ان لوگوں میں طبعاً مخفی رہنے کی خواہش ہوتی ہے اور وُہ دُنیا سے الگ رہنے میں راحت سمجھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مامور ہونے لگے تو اُنھوں نے بھی عُذر کیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار میں رہا کرتے تھے۔ وہ اس کو پسند کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ خود ان کو باہر نکالتا ہے اور مخلوق کے سامنے لاتا ہے۔ ان میں ایک حیا ہوتی ہے۔ اور ایک انقطاع ان میں پایا جاتا ہے، چونکہ وہ انقطاع تعلقات صافی کو چاہتا ہے، اس لیے وہ خُدا تعالیٰ کے ساتھ ایک لذّت اور سُرُور پاتے ہیں، لیکن وہی انقطاع اور صفائی قلب اللہ تعالیٰ کی نظر میں ان کو پسندیدہ بنا دیتی ہے اور وہ اُن کو اصلاحِ خلق کے لیے برگزیدہ کر لیتا ہے۔ جیسے حاکم چاہتا ہے کہ اُسے کارکن آدمی مل جاوے اور جب وُہ کسی کارکن کو پا لیتا ہے، تو خواہ وُہ انکار بھی کر دے مگر وُہ اُسے منتخب کر ہی لیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو ماُمور کرتا ہے وہ اُن کے تعلقاتِ صافیہ اور صدق و صفا کی وجہ سے انہیں اس قابل پاتا ہے کہ انہیں اپنی رسالت کا منصب سپرد کرے۔

یہ بالکل سچی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر ایک قسم کا جبر کیا جاتا ہے۔ وہ کوٹھڑیوں میں بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں اور اسی میں لذّت پاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی کو ان کے حال پر اطلاع نہ ہو، مگر اللہ تعالےٰ جبراً ان کو کوٹھڑی سے باہر نکالتا ہے۔ پھر ان میں ایک جذب رکھتا ہے اور ہزار ہا مخلوق طبعاً ان کی طرف چلی آتی ہے۔ اگر فریب ہی کا کام ہو تو پھر وُہ سرسبز کیوں ہو۔ پیر اور گدّی نشین آرزُو رکھتے ہیں کہ لوگ اُن کے مُرید ہوں اور ان کی طرف آویں۔ مگر ماُمور اِس شہرت کے خواہشمند نہیں ہوتے۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ مخلوقِ الٰہی اپنے خالق کو پہچانے اور خدا تعالیٰ سے سچّا تعلق پیدا کرے۔ وہ اپنے دل میں بخوبی سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ چیز ہی نہیں ہیں۔ خدا تعالیٰ بھی اُن کو ہی پسند کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسا مخلص نہ ہو کام نہیں کر سکتا۔ ریاکار جو خدا کی جگہ اپنے آپ کو چاہتے ہیں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ اس لیے خُدا ان کو پسند کرتا ہے

کیونکہ وہ دنیا کے آسائش و آرام کے آرزومند نہیں ہوتے۔

ریاکاری ایک بہت بڑا گند ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ریاکار انسان فرعون سے بھی بڑھ کر شقی اور بدبخت ہوتا ہے۔ وُہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کو نہیں چاہتے بلکہ اپنی عزت اور عظمت منوانا چاہتے ہیں۔ لیکن جن کو خدا پسند کرتا ہے وُہ طبعاً اس سے متنفر ہوتے ہیں۔ ان کی ہمّت اور کوشش اسی ایک اَمر میں صرف ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کا جلال ظاہر ہو اور دُنیا اس سے واقف ہو۔ وہ ایسی حالت میں ہوتے ہیں اور پسند کرتے ہیں کہ دُنیا ان کو نہ پہچان سکے، مگر ممکن نہیں ہوتا کہ دُنیا اُن کو چھوڑ سکے کیونکہ وُہ دُنیا کے فائدہ کے لیے آتے ہیں۔ ان لوگوں کے جو دشمن اور مخالف ہوتے ہیں ان سے بھی ایک فائدہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نشانات اُن کے سبب سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور حقائق و معارف کھلتے ہیں۔ اُن کی چھیڑ چھاڑ سے عجیب عجیب انوار ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر ابوجہل وغیرہ نہ ہوتے تو قرآن شریف کے تیس سیپارے کیونکر ہوتے؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سی فطرت والے ہی اگر سب ہوتے تو ایک دم میں وُہ مسلمان ہو جاتے۔ اُن کی کسی نشان اور معجزہ کی حاجت ہی نہ ہوتی۔ پس ہم ان مخالفوں کے وجود کو بھی بے مطلب نہیں سمجھتے۔ اُن کی چھیڑ چھاڑ اللہ تعالیٰ کو غیرت دلاتی ہے اور اس کی نصرت اور تائیدات کے نشانات ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض خدا تعالیٰ کے ماموروں کا یہ خاص نشان ہوتا ہے کہ وُہ اپنی پرستش کرانا نہیں چاہتے۔ جس طرح پر وہ لوگ جو پیر بننے کے خواہشمند ہیں چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی پُوجا کرائے تو کیا وجہ ہے کہ دُوسرے انسان کے بچے اس پُوجا کے مستحق نہ ہوں۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ ایک مُرید اس مُرشد سے ہزار درجہ اچھا ہے جو مکر کی گدی پر بیٹھا ہوا ہو کیونکہ مُرید کے اپنے دل میں کھوٹ اور دغا نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ اخلاص کو چاہتا ہے۔ ریاکاری پسند نہیں کرتا ہے۔[1]

۹؍ مئی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

طاعون کا عذاب

ایک ہندو رئیس کے بعض استفسارات کے جوابات

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام درختوں کے سایہ میں حسب معمول تشریف فرما تھے

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۹/۲۰ صفحہ ۱ و ۲ مورخہ ۱۰، ۱۷ جون ۱۹۰۴ء

کہ دینا نگر کے دو ہندو رئیس آپ کی زیارت کو تشریف لائے۔ ان کے ساتھ اور بھی چند آدمی تھے۔ اُنھوں نے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ سلام عرض کیا اور پھر طاعون کی مصیبت کا رونا رونا شروع کیا کہ بڑا اختلاف مذاہب کا ہو گیا ہے۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا:

اس زمانہ میں نِرا اختلافِ مذاہب ہی نہیں رہا۔ اختلافِ مذاہب کے سوا لوگوں نے خدا تعالیٰ کو بالکل چھوڑ دیا ہے، اس لیے خُدا تعالیٰ نے اپنی سنّت کے موافق یہ عذاب نازل کیا ہے۔ کیونکہ دُنیا میں فسق و فجور بہت بڑھ گیا ہے۔ شرارتوں اور چالاکیوں کی کوئی حد نہیں رہی ہے۔ طاعون کو اللہ تعالیٰ نے مامُور کر کے بھیجا ہے جو اس کے نوکر کی طرح ہے۔ خدا تعالیٰ کے حکم کے بغیر تو ایک پتہ اور ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بدبختی ہے کہ باوجودیکہ طاعون ایک خطرناک ڈرانے والا ہے مگر اس پر بھی خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو ہنسی اور ٹھٹھے میں اُڑاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے اور دل پاک و صاف نہیں کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ جب تک اہلِ دُنیا اپنی اصلاح اور تبدیلی نہیں کریں گے اس وقت تک اس عذاب کو نہیں اُٹھائے گا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو اس طرف بھی بالکل توجہ نہیں ہے۔ جب کسی گاؤں یا شہر میں بیماری پڑتی ہے تو چند روز کے لیے ایک خوف پیدا ہوتا ہے مگر وہ خوف بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے نہیں اور نہ ایسا کہ اس کے ذریعہ کوئی اصلاح کریں بلکہ موت کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ہم بھی مَر نہ جاویں اور یہ جائداد اور اسباب کسی دُوسرے کے قبضہ میں نہ چلا جاوے۔ یونہی ذرا سا وقفہ ہوتا ہے۔ پھر وہی شرارت اور شوخی۔ اور نہیں ڈرتے کہ اس کے دورے بہت لمبے ہوتے ہیں۔

رئیس : جناب! بظاہر زمانہ اچھا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ بھگتی وغیرہ بھی کرتے ہیں۔

حضرت اقدس : دل نہیں ہیں۔ جو کچھ ہے پوست ہی پوست ہے۔ ظاہرداری کے طور پر اگر کچھ کیا جاتا ہے تو کیا جاتا ہے۔ دل والے رُوح ہی اور ہوتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں صاف ہوتی ہیں۔ اُن کی زبان صاف ہوتی ہے۔ ان کے چال چلن میں ایک خاص امتیاز ہوتا ہے۔ وُہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے لرزاں ترساں رہتے ہیں۔ نِری زبان درازی سے کوئی اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکتا۔ مجازی حکام کو جو اصل حالات سے ناواقف ہیں کوئی خوش کر لیوے مگر اللہ تعالیٰ کی نظر تو دل پر ہے اور وہ دل کے مخفی در مخفی خیالات تک کو جانتا ہے۔ پس جب تک انسان سچے دل سے خدا تعالیٰ کی طرف نہیں آتا۔ ریاکاری اور ظاہرداری سے کچھ نہیں بنتا۔ خدا تعالیٰ سچی تبدیلی چاہتا ہے اور مَیں دیکھتا ہوں کہ ابھی وہ پیدا نہیں ہوئی۔ جب لوگ تبدیلی کریں گے تو مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اگر کچھ بھی حصہ لوگوں کا دُرست ہو جاوے گا تو اللہ تعالےٰ رحم کرے گا۔ یہ تو اور بھی چالاکی ہے کہ لوگوں کے سامنے نیک بنتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑا متقی اور خدا ترس

ظاہر کرتے ہیں اور اندرونی طور پر بڑی خرابیاں ان میں موجود ہوتی ہیں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ دُنیا کے ظاہری بحث و مباحثہ میں ہزاروں مذاہب پیدا ہو گئے ہیں مگر خدا تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ کیسا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے معاملہ صاف نہ ہو تو یہ چالاکیاں اور بھی خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتی ہیں۔ چاہیے تو یہ کہ انسان خدا کے ساتھ معاملہ صاف کرے اور پُوری فرمانبرداری اور اخلاص کے ساتھ اس کی طرف رجُوع کرے اور اس کے بندوں کو بھی کسی قسم کی اذیت نہ دے۔ ایک شخص گیروی کپڑے پہن کر یا سبز لباس کر کے فقیر بن سکتا ہے اور دُنیا دار اس کو فقیر بھی سمجھ لیتے ہیں مگر خُدا تعالیٰ تو اس کو خوب جانتا ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے اور وہ کیا کر رہا ہے۔ پس طاعون کا اصل اور صحیح علاج یہی ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے حضُور اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور اس کی حد بندیوں کو نہ توڑے اور اس کی مخلوق کے ساتھ رحم کرے بدمعاملگی نہ کرے۔ یہ سب کام اخلاص کے ساتھ کرے دکھلانے کی نیت سے نہ کرے۔ اگر اس قسم کی تبدیلی کرے گا، تو مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ رحم کے ساتھ اس پر نظر کرے گا۔

رئیس : جناب لوگ باہر جاتے ہیں اور اس کو بھی مفید سمجھتے ہیں۔ مگر مولوی لوگ مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم گھروں سے نکلنے میں خُدا کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ مولویوں کے ایسے فتوے دینے سے بھی بہت سے لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔

حضرت اقدس : اللہ تعالیٰ تو علاج سے منع نہیں کرتا ہے۔ علاج بھی اسی نے رکھے ہیں۔

لوگ دُنیا کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کے واسطے قسم قسم کے منصوبے کرتے ہیں۔ اور ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔ مگر جب تک خدا تعالیٰ کسی کو منتخب اور برگزیدہ نہ کرے کچھ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو کسی کو بھوک پیاس لگتی ہے تو وہ روٹی کھاتا ہے یا پانی پیتا ہے۔ اسی طرح پر بیماریوں کے علاج بھی ہیں اور اشیاء میں خواص بھی اسی کے رکھے ہوئے ہیں۔ مولویوں کی غلطی ہے جو ایسا کرتے ہیں اور لوگوں کو تباہ کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ تو منع کرتا ہے کہ انسان عذاب کی جگہ پر رہے۔ لیکن ہاں جب بیماری شدّت کے ساتھ پھیل جاوے تو یہ مناسب نہیں کہ انسان اس گاؤں یا شہر سے نکل کر کسی دوسرے گاؤں یا شہر میں جاوے اور یہ اس لیے منع ہے کہ جو لوگ وبازدہ گاؤں سے نکلتے ہیں وہ متاثر آب و ہوا سے نکل کر دوسری جگہ کو متاثر کرتے ہیں اور پھر بیمار ہو کر مر جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ بھی منع ہے کہ جہاں وبا پڑی ہوئی ہو وہاں بھی کوئی آدمی تندرست جگہ سے نہ جاوے لیکن یہ کبھی منع نہیں ہے کہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باہر کھلے میدانوں میں اور کھیتوں میں نہ جاویں بلکہ یہ ضروری ہے اور اس سے عموماً فائدہ پہنچتا ہے۔ جہاں طاعون ہو فوراً اس گھر کو خالی کر دینا چاہیے۔ اور باہر کھیتوں یا کھلے میدانوں میں بیشک چلے جاؤ۔ بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔

رئیس : جناب تعجب ہی ہے کہ خدا کے ہوتے ہوئے یہ غضب ہو رہا ہے۔

حضرت اقدس : یہ خدا تعالیٰ کی باتیں ہیں ان میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے تو خود دُنیا پر یہ غضب نازل کیا ہے۔ اگر لوگ خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان لاتے تو اس قدر شرارتیں جو زمین پر ہو رہی ہیں نہ کرتے اور خدا تعالیٰ کے غضب سے ڈر جاتے، مگر آپ دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا اقرار کر کے پھر دنیا پر ظلم اور فساد ہو رہا ہے اور خدا تعالیٰ کے حکموں کی ہرگز پابندی نہیں کی جاتی۔ تو یہ تو ایک قسم کی خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی ہنسی ہے پھر خدا تعالیٰ اس کو کب پسند کر سکتا ہے۔ اب یہ غضب آیا ہے جو دُنیا کو سیدھا کرے گا۔ خود اسی نے بھیجا ہے۔ وہ اپنے اَسرار کو آپ ہی جانتا ہے۔ ہم لوگوں کو اس کی قدرتوں میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ جب وقت آجائے گا وہ خود رحم فرمائے گا اور اس عذاب کو اٹھا لے گا۔ وہ ظالم نہیں ہے وہ تو اَرحم الرّاحمین ہے۔

رئیس : حضُور اب تو رحم ہونا چاہیے۔ آپ ہی کچھ کریں۔

حضرت اقدس : مَیں دیکھتا ہوں کہ ابھی دُنیا کی اصلاح ہونی ضروری ہے۔ ہم تو خدا تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے ہر ایک فعل کو سراسر حکمت سمجھتے ہیں۔ یہ عذاب جو اس نے نازل کیا ہے یہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ لوگوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اُن کو تکلیف نہیں ہے۔ اگر وہ تکلیف کو محسوس کر لیتے تو مَیں دیکھتا کہ ان میں تبدیلی شروع ہو جاتی، مگر ایسا نہیں ہے۔ رہا ہمارا رحم۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے ہم اس کی قضا و قدر پر ہر طرح راضی ہیں اور اسے دیکھتے ہیں؛ البتہ جب وہ خود ہمارے دل میں یہ بات ڈالے گا تو ہم اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ہماری دعاؤں کو سُن لے گا اور سب کچھ کر دیگا۔ فی الحال تو جو ہو رہا ہے اس کی عین مرضی کے موافق ہے۔ جب تک وہ پسند کرے گا ہوتا رہے گا۔ اصل علاج یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے صُلح کی جاوے۔

اس تقریر کے بعد رئیس مذکور اپنے احباب کو لے کر نیاز مندی سے سلام کر کے رخصت ہوا۔

طاعون سے محفوظ رہنے کے لیے زیارتیں لیکر نکلنا

لاہور میں جو لوگ طاعون سے محفوظ رہنے کے لیے نماز پڑھنے کے واسطے زیارتیں لے کر نکلتے ہیں۔ اُن کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس پر فرمایا:

جو لوگ اب باہر جا کر نمازیں پڑھتے ہیں اور زیارتیں نکالتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ پُوری صفائی نہیں کرتے۔ سچی تبدیلی کا ارادہ نہیں معلوم ہوتا؛ ورنہ پھر وہی شوخی، بیباکی کیوں نظر آ رہی ہے۔ اگر سچی تبدیلی

ہو تو ممکن نہیں کہ طاعون نہ ہٹ جائے۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف جب مَیں کہتا ہوں کہ سچی تبدیلی کرو اور استغفار کرو۔ خدا تعالیٰ سے صلح کرو تو میری ان باتوں پر ہنسی کرتے ہیں اور ٹھٹھے اُڑاتے ہیں اور اب خود بھی دُعا ہی اس کا علاج بتلاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ طاعون ان کے ہی سبب سے آیا ہے کیونکہ انھوں نے جھوٹے دعوے کئے تھے۔ مجھے اُن کی اس بات پر بھی تعجب اور افسوس آتا ہے کہ مَیں تو جھوٹے دعوے کرکے سلامت بیٹھا ہوں، حالانکہ بقول ان کے طاعون میرے ہی سبب سے آیا ہے اور مجھے ہی حفاظت کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ یہ عجیب معاملہ ہے۔ یہ بات تو اُن عدالتوں میں بھی نہیں ہوتی کہ صریح ایک مجرم ہو وہ چھوڑ دیا جاوے اور بے گناہ کو پھانسی دے دی جاوے۔ پھر کیا خدا تعالیٰ کی خدائی ہی میں یہ اندھیر اور ظلم ہے کہ جس کے لیے طاعون بھیجا جاوے وہ تو محفوظ رہے اور اس کو سلامتی کا وعدہ دیا جاوے اور وہ ایک نشان ہو اور دُوسرے لوگ مرتے رہیں؟ مَیں کہتا ہوں اسی ایک بات کو لیکر کوئی شخص انصاف کرے اور بتا دے کہ کیا ہو سکتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر افترا کرے وُہ سلامت رہے اور اس کو یہ وعدہ دیا جاوے کہ تیرے گھر میں جو ہوگا وہ بھی بچایا جاوے گا اور دُوسروں پر چُھری چلتی رہے؟ یہ تو وہی شیعوں کی سی بات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبوت دراصل حضرت علیؓ کو ملنی تھی اور انہیں کے واسطے جبرئیلؑ لائے تھے مگر غلطی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی اور تیئیس سال تک برابر یہ غلطی چلی گئی اور اس کی اصلاح نہ ہوئی۔ ایسا ہی اب بھی غلطی لگ گئی۔ جن کی حفاظت کرنی تھی وُہ تو مر رہے ہیں اور جو حفاظت کے لائق نہ تھے۔ ان کی حفاظت کا وعدہ ہوگیا۔ بھلا اس قسم کی باتوں پر کوئی تسلّی پا سکتا ہے؟

طاعون سے معجزانہ حفاظت

ایک امرتسری ملّا کا ذکر آیا کہ وُہ کہتا ہے کہ ایک سال گذر گیا تو کیا ہوا۔ ابھی آگے دیکھنا چاہیے۔ فرمایا:

وُہ تو ایک سال کہتا ہے۔ ہم تو یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے وُہ بالکل سچا ہے اور اس کے دورے تو ستر ستر سال تک ہوتے ہیں۔ وُہ منتظر رہیں اور دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ہم بھی ان کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ وُہ ہماری نسبت اگر کوئی خبر خدا تعالیٰ سے پا چکے ہیں، تو شائع کر دیں۔ ہم کو تو جو کچھ خدا تعالیٰ نے بتایا ہے ہم نے تو اس کو شائع کر دیا ہے اور دُنیا کو معلوم ہوگیا ہے۔ وہ صبر کے ساتھ اب انجام تک دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

یہ لوگ ہماری نسبت طرح طرح کی گردشیں چاہتے ہیں۔ وُہ آخر اُن پر ہی لوٹ کر پڑتی ہیں۔ ایک بٹالوی مولوی نے ایک مرتبہ کہا کہ قادیان میں طاعون پڑی ہوئی ہے اور خود ان کو بھی گلٹی نکلی ہوئی ہے۔ یہ اُن

کی اَمانی ہیں۔ کیا گولی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نکل سکتی ہے؟ جب تک آسمان پر تغیر نہ ہو زمین پر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان دنوں جب قادیان میں طاعون پڑی ہوئی تھی۔ ہم خدا تعالیٰ کی قدرت کا عجیب نظارہ دیکھ رہے تھے۔ ہمارے گھر کے اِدھر اُدھر سے چیخیں آتی تھیں۔ اور ہمارا گھر درمیان میں اس طرح تھا جیسے سمندر میں کشتی ہوتی ہے۔ اُس نے محض اپنے فضل وکرم سے اُسے محفوظ رکھا جیسا اُس نے فرمایا تھا۔ اور آئندہ بھی ہم اس کے فضل وکرم سے یقین رکھتے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت فرمائے گا۔

ہندوؤں کے ہاتھ سے پکا ہوا کھانا

اس کے بعد ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا ہندوؤں کے ہاتھ کا کھانا درست ہے؟ فرمایا:

شریعت نے اس کو مباح رکھا ہے۔ ایسی پابندیوں پر شریعت نے زور نہیں دیا بلکہ شریعت نے تو... قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس : ۱۰) پر زور دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آرمینیوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں کھا لیتے تھے اور بغیر اس کے گذارہ بھی تو نہیں ہوتا ہے۔

تسبیح شماری

ایک شخص نے تسبیح کے متعلق پوچھا کہ تسبیح کرنے کے متعلق حضور کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا:

تسبیح کرنے والے کا اصل مقصود گنتی ہوتا ہے اور وہ اس گنتی کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ یا تو وہ گنتی پوری کرے اور یا توجہ کرے۔ اور یہ صاف بات ہے کہ گنتی کو پوری کرنے کی فکر کرنے والا سچی توبہ کر ہی نہیں سکتا۔ انبیاء علیہم السلام اور کاملین لوگ جن کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذوق ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے عشق میں فنا شُدہ ہوتے ہیں انھوں نے گنتی نہیں کی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی۔ اہلِ حق تو ہر وقت خدا تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے لیے گنتی کا سوال اور خیال ہی بیہودہ ہے۔ کیا کوئی اپنے محبوب کا نام گِن کر لیا کرتا ہے؟ اگر سچی محبت اللہ تعالیٰ سے ہو اور پوری توجہ الی اللہ ہو تو مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ پھر گنتی کا خیال پیدا ہی کیوں ہوگا - وہ تو اسی ذکر کو اپنی رُوح کی غذا سمجھے گا اور جس قدر کثرت سے کرے گا۔ زیادہ لُطف اور ذوق محسوس کرے گا اور اس میں اور ترقی کرے گا۔ لیکن اگر محض گنتی مقصود ہو گی تو وہ اُسے ایک بیگار سمجھ کر پورا کرنا چاہے گا۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۹-۲۰ صفحہ ۲، ۳ بابت ۱۰/۱۷ جون ۱۹۰۴ء

نماز کے بعد تسبیح

ایک صاحب نے پوچھا کہ بعد نماز تسبیح لے کر ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر وغیرہ جو پڑھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ حسبِ مراتب ہوا کرتا تھا اور اسی حفظ مراتب نہ کرنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو مشکلات پیش آئی ہیں اور انھوں نے اعتراض کر دیا ہے کہ فلاں دو احادیث میں باہم اختلاف ہے؛ حالانکہ اختلاف نہیں ہوتا بلکہ وہ تعلیم بلحاظ محل اور موقعہ کے ہوتی تھی۔ مثلاً ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے پُوچھا کہ نیکی کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہے کہ اس میں یہ کمزوری ہے کہ ماں باپ کی عزت نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ نیکی یہ ہے کہ تو ماں باپ کی عزت کر۔ اب کوئی خوش فہم اس سے یہ نتیجہ نکال لے کہ بس اور تمام نیکیوں کو ترک دیا جاوے۔ یہی نیکی ہے۔ ایسا نہیں۔ اسی طرح تسبیح کے متعلق بات ہے۔ قرآن شریف میں تو آیا ہے۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (انفال: ۴۶) اللہ تعالیٰ کا بہت ذکر کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ اب یہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا نماز کے بعد ہی ہے تو ۳۳ مرتبہ تو کثیر کے اندر نہیں آتا۔ پس یاد رکھو کہ ۳۳ مرتبہ والی بات حسب مراتب ہے؛ ورنہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو سچے ذوق اور لذت سے یاد کرتا ہے، اُسے شمار سے کیا کام۔ وہ تو بیرون از شمار یاد کرے گا۔

ایک عورت کا قصہ مشہور ہے کہ وُہ کسی پر عاشق تھی۔ اُس نے ایک فقیر کو دیکھا کہ وہ تسبیح ہاتھ میں لیے ہوئے پھیر رہا ہے۔ اس عورت نے اُس سے پوچھا کہ تو کیا کر رہا ہے اُس نے کہا کہ مَیں اپنے یار کو یاد کرتا ہوں۔ عورت نے کہا کہ یار کو یاد کرنا اور پھر گن گن کر؟

درحقیقت یہ بات بالکل سچی ہے کہ یار کو یاد کرنا ہو تو پھر گن گن کر کیا یاد کرتا ہے اور اصل بات یہی ہے کہ جب تک ذکرِ الٰہی کثرت سے نہ ہو وُہ لذت اور ذوق جو اس ذکر میں رکھا گیا ہے حاصل نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ۳۳ مرتبہ فرمایا ہے وہ آنی اور شخصی بات ہوگی کہ کوئی شخص ذکر نہ کرتا ہوگا تو آپؐ نے اُسے فرما دیا کہ ۳۳ مرتبہ کر لیا کر۔ اور یہ تو تسبیح ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں۔ یہ مسئلہ بالکل غلط ہے۔ اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے آشنا ہو تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ آپؐ نے کبھی ایسی باتوں کا التزام نہیں کیا۔ وُہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں فنا تھے۔ انسان کو تعجب آتا ہے کہ کس مقام اور درجہ پر آپ پہنچے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تھے۔ رات کو جب میری آنکھ کھُلی تو مَیں نے آپؐ کو اپنے بستر پر نہ پایا۔ مجھے خیال گذرا کہ کسی دُوسری بیوی کے گھر میں ہوں گے؛ چنانچہ مَیں نے سب گھروں میں دیکھا، مگر آپؐ کو نہ پایا۔ پھر

مَیں باہر نکلی تو قبرستان میں دیکھا کہ آپ سفید چادر کی طرح پر زمین پر پڑے ہوئے ہیں اور سجدہ میں گرے ہوئے کہہ رہے ہیں سَجَدَتْ لَكَ رُوْحِيْ وَجَنَانِيْ اب بتاؤ کہ یہ مقام اور مرتبہ ۳۳ مرتبہ کی دانہ شماری سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

جب انسان میں اللہ تعالیٰ کی محبت جوش زن ہوتی ہے تو اس کا دل سمندر کی طرح موجیں مارتا ہے۔ وُہ ذکرِ الٰہی کرنے میں بے انتہا جوش اپنے اندر پاتا ہے اور پھر گن کر ذکر کرنا تو کُفر سمجھتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عارف کے دل میں جو بات ہوتی ہے اور جو تعلق اپنے محبوب و مولا سے اُسے ہوتا ہے وہ کبھی روا رکھ سکتا ہی نہیں کہ تسبیح لے کر دانہ شماری کرے۔ کسی نے کہا ہے ؎ من کا منکا صاف کر۔

انسان کو چاہیے کہ اپنے دل کو صاف کرے اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کرے۔ تب وہ کیفیت پیدا ہوگی اور ان دانہ شماریوں کو ہیچ سمجھے گا۔

تعداد رکعات پُوچھا گیا کہ نمازوں میں تعداد رکعات کیوں رکھی ہے؟ فرمایا:

اس میں اللہ تعالیٰ نے اور اسرار رکھے ہیں۔ جو شخص نماز پڑھے گا۔ وہ کسی نہ کسی حد پر تو آخر رہے گا ہی۔ اور اسی طرح پر ذکر میں بھی ایک حد تو ہوتی ہے۔ لیکن وہ حد وہی کیفیت اور ذوق و شوق ہوتا ہے۔ جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ جب وہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بس کر جاتا ہے۔

دُوسرے یہ بات حال والی ہے قال والی نہیں۔ جو شخص اس میں پڑتا ہے وہی سمجھ سکتا ہے۔ اصل غرض ذکرِ الٰہی سے یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو فراموش نہ کرے اور اسے اپنے سامنے دیکھتا رہے۔ اس طریق پر وہ گناہوں سے بچا رہے گا۔ تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک تاجر نے ستر ہزار کا سودا لیا اور ستر ہزار کا دیا مگر وُہ ایک آن میں بھی خدا سے جُدا نہیں ہوا۔ پس یاد رکھو کہ کامل بندے اللہ تعالیٰ کے وہی ہوتے ہیں جن کی نسبت فرمایا ہے۔ لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور : ۳۸) جب دل خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق اور عشق پیدا کر لیتا ہے تو وہ اس سے الگ ہوتا ہی نہیں۔ اس کی ایک کیفیت اس طریق پر سمجھ میں آسکتی ہے کہ جیسے کسی کا بچہ بیمار ہو تو خواہ وہ کہیں جاوے، کسی کام میں مصروف ہو مگر اس کا دل اور دھیان اسی بچہ میں رہے گا۔ اسی طرح پر جو لوگ خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق اور محبت پیدا کرتے ہیں۔ وُہ کسی حال میں بھی خُدا تعالیٰ کو فراموش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی کہتے ہیں کہ عام لوگوں کے رونے میں اتنا ثواب نہیں جتنا عارف کے ہنسنے میں ہے۔ وہ بھی تسبیحات ہی ہوتی ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عشق اور محبت میں رنگین ہوتا ہے۔ یہی مفہوم اور غرض اسلام کی ہے کہ

وُہ آستانۂ اُلوہیت پر اپنا سر رکھ دیتا ہے[1]۔

۱۶؍مئی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

اعلیٰ حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام احاطہ کچہری میں رونق افروز تھے۔ وقتاً فوقتاً جو کچھ آپ نے فرمایا۔ ہدیۂ ناظرین ہے۔ (ایڈیٹر الحکم)

دُنیا کی مشکلات اور تلخیاں دُنیا کی تلخیوں اور ناکامیوں پر فرمایا کہ :

مثنوی میں لکھا ہے ؎

دشتِ دُنیا جُز دَد و جُز دام نیست
جُز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

فرمایا :

دُنیا کے مشکلات اور تلخیاں بہت ہیں۔ یہ ایک دشت پُر خار ہے۔ اس میں سے گذرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ گذرنا تو سب کو پڑتا ہے لیکن راحت اور اطمینان کے ساتھ گذر جانا یہ ہر ایک شخص کو میسّر نہیں آ سکتا۔ یہ صرف ان لوگوں کا حصّہ ہے جو اپنی زندگی کو ایک فانی اور لاشئی سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے لیے اسے وقف کر دیتے ہیں اور اس سے سچا تعلق پیدا کر لیتے ہیں؛ ورنہ انسان کے تعلقات ہی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی تلخی اس کو دیکھنی پڑتی ہے۔ بیوی اور بچے ہوں تو کبھی کوئی بچہ مر جاتا ہے تو صدمہ برداشت کرتا ہے۔ لیکن اگر خدا تعالیٰ سے سچا تعلق ہو تو ایسے ایسے صدمات پر ایک خاص صبر عطا ہوتا ہے جس سے وُہ گھبراہٹ اور سوزش پیدا نہیں ہوتی جو اُن لوگوں کو ہوتی ہے جن کا خدا تعالےٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کے منشاء کو سمجھ کر اس کی رضا کے لیے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں۔ وہ بیشک آرام پاتے ہیں؛ ورنہ ناکامیاں اور نامرادیاں زندگی تلخ کر دیتی ہیں۔

ایک کتاب میں ایک عجیب بات لکھی ہے کہ ایک شخص شرک پر روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک ولی اللہ اس سے ملے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ تُو کیوں روتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرا

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۱ صفحہ ۱ مورخہ ۲۴؍جون ۱۹۰۴ء

دوست مرگیا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ تُجھ کو پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔ مرنے والے کے ساتھ دوستی ہی کیوں کی؟

دُنیا عجیب مشکلات کا گھر ہے۔ بیوی بچّوں کے نہ ہونے سے بھی غم ہوتا ہے اور اگر ہوں تب بھی مشکلات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی ضروریات کے پُورا کرنے کے لیے۔ بعض نادان انسان عجیب عجیب مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں اور صراطِ مستقیم سے ہٹ کر اُن کی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے مال بہم پہنچاتے ہیں اور پھر اور مشکلات میں پھنستے ہیں۔ ایک فقیر ننگ دھڑنگ جس کے پاس ستر پوشی کے سوا اور کوئی کپڑا تک نہ تھا خوش وخرم کھیلتا کودتا جا رہا تھا۔ کسی سوار نے اس سے پُوچھا کہ سائیں صاحب آپ ایسے خوش کیوں ہیں؟ اس نے کہا کہ جس کی مُرادیں حاصل ہو جائیں وُہ خوش ہوتا ہے کہ نہیں؟ سوار نے کہا کہ تیری ساری مُرادیں کس طرح پُوری ہوگئی ہیں؟ اُس نے کہا کہ جب خواہشیں چھوڑ دیں تو مُرادیں پُوری ہوگئیں۔

بات بالکل ٹھیک ہے۔ انسان دُو طرح ہی خوش ہو سکتا ہے یا تو حصولِ مراد کے ساتھ یا ترکِ مراد کے ساتھ اور ان میں سے سہل طریق ترکِ مراد کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سب کی زندگی تلخ ہے بجُز اس کے جو اس دُنیا کے علاقوں سے الگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بادشاہوں نے بھی ان تلخیوں اور ناکامیوں سے عاجز آکر خودکشی کرلی ہے۔

لذاتِ دنیا کی مثال

دُنیا کی لذّت خارش کی طرح ہے۔ ابتداءً لذّت آتی ہے۔ پھر جب کھجلاتا رہتا ہے تو زخم ہو کر اُس میں سے خُون نکل آتا ہے یہانتک کہ اس میں پیپ پڑ جاتی ہے اور وُہ ناسُور کی طرح بن جاتا ہے اور اس میں درد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ گھر بہت ہی ناپائیدار اور بے حقیقت ہے۔ مجھے کئی بار خیال آیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی مُردے کو اختیار دیدے کہ وہ پھر دُنیا میں چلا جاوے تو وُہ یقیناً توبہ کر اُٹھے کہ مَیں اس دُنیا سے باز آیا۔ خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو تو انسان ان مشکلاتِ دنیا سے نجات پا سکتا ہے، کیونکہ وُہ دردمندوں کی دُعاؤں کو سُن لیتا ہے مگر اس کے لیے یہ شرط ہے کہ دُعائیں مانگنے سے انسان تھکے نہیں تو کامیاب ہوگا۔ اگر تھک جاوے گا تو نِری ناکامی نہیں بلکہ ساتھ بے ایمانی بھی ہے کیونکہ وہ خُدا تعالیٰ سے بدظن ہو کر سلبِ ایمان کر بیٹھے گا۔ مثلاً ایک شخص کو اگر کہا جاوے کہ تو اس زمین کو کھود۔ خزانہ نکلے گا مگر وہ دو چار پانچ ہاتھ کھودنے کے بعد اُسے چھوڑ دے اور دیکھے کہ خزانہ نہیں نکلا تو وہ اس نامرادی اور ناکامی پر ہی نہ رہے گا بلکہ بتانے والے کو بھی گالیاں دے گا؛ حالانکہ یہ اس کی اپنی کمزوری اور غلطی ہے جو اُس نے

پُورے طور پر نہیں کھودا۔ اسی طرح جب انسان دُعا کرتا ہے اور تھک جاتا ہے تو اپنی نامرادی کو اپنی سُستی اور غفلت پر تو محمول نہیں کرتا، بلکہ خدا تعالیٰ پر بدظنی کرتا ہے اور آخر بے ایمان ہو جاتا ہے اور آخر دہریہ ہو کر مرتا ہے۔

نیم ملاں خطرۂ ایمان

جہاں حضُور بیٹھے ہوئے تھے وہاں سامنے ایک آم کا درخت تھا جس کو کچے پھل لگے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا:

دیکھو۔ اس آم کو پھل لگا ہوا ہے مگر یہ کچا پھل ہے۔ اگر کوئی اس کو کھانے بیٹھ جاوے اور اس کو ہی اصل مقصد سمجھ لے تو بجز اس کے کہ اس کے کھانے سے پھُنسیاں وغیرہ نکل آویں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح پر نیم مُلّاں خطرۂ ایمان والی مثال سچ ہے۔ نارسیدہ منزل کچے پھل کی طرح ہوتا ہے۔ وہ جو کسی کو بات سُنائے گا تو اسے گمراہ کرے گا اور اگر خود کرے گا تو آپ گمراہ ہوگا۔

خدا تعالیٰ کی راہ میں جبتک انسان بہت سی مشکلات اور امتحانات میں پُورا نہ اُترے وہ کامیابی کا سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کرسکتا۔ اسی لیے فرمایا ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (العنکبوت : ۳) کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض اتنی ہی بات پر راضی ہو جاوے کہ وہ کہدیں کہ ہم ایمان لائے اور وُہ آزمائے نہ جاویں۔ ایسے لوگ جو اتنی بات پر اپنی کامیابی سمجھتے ہیں وُہ یاد رکھیں انہیں کے لیے دُوسری جگہ آیا ہے۔ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ۔ (البقرۃ : ۹) اور ایسا ہی ایک جگہ فرمایا: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ (الحجرات : ۱۵) یعنی تم یہ نہ کہو کہ ایماندار ہو گئے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے مقابلہ چھوڑ دیا ہے اور اطاعت اختیار کرلی ہے بہت سے لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کامِل ایماندار بننے کے لیے مجاہدات کی ضرورت ہے اور مختلف ابتلاؤں اور امتحانوں سے ہو کر نکلنا پڑتا ہے ؎

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر
آرے شود ولیک بخونِ جگر شود

فوٹو گرافی

منشی نظیر حسین صاحب نے سوال کیا کہ مَیں فوٹو کے ذریعہ تصویریں اُتارا کرتا تھا۔ اور دِل میں ڈرتا تھا کہ کہیں یہ خلافِ شرع نہ ہو۔ لیکن جناب کی تصویر دیکھ کر یہ وہم جاتا رہا۔ فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ ہم نے اپنی تصویر محض اس لحاظ سے اُتروائی تھی کہ یورپ کو تبلیغ

کرتے وقت ساتھ تصویریں بھیج دیں، کیونکہ ان لوگوں کا عام مذاق اس قسم کا ہوگیا ہے کہ وُہ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی اُس کی تصویر دیتے ہیں جس سے وُہ قیافہ کی مدد سے بہت سے صحیح نتائج نکال لیتے ہیں۔ مولوی لوگ جو میری تصویر پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ خود اپنے پاس روپیہ پیسہ کیوں رکھتے ہیں کیا ان پر تصویریں نہیں ہوتی ہیں۔

اسلام ایک وسیع مذہب ہے۔ اس میں اعمال کا مدار نیات پر رکھتا ہے۔ بدر کی لڑائی میں ایک شخص میدانِ جنگ میں نکلا جو اِترا کر چلتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو یہ چال بُری ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا۔ (بنی اسرائیل: ۳۸) مگر اس وقت یہ چال خدا تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے کیونکہ یہ اُس کی راہ میں اپنی جان تک نثار کرتا ہے اور اس کی نیت اعلیٰ درجہ کی ہے۔

غرض اگر نیت کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بہت مشکل پڑتی ہے۔ اسی طرح پر ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن کا تہ بند نیچے کو ڈھلکتا ہے وُہ دوزخ میں جاویں گے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ سُن کر رو پڑے کیونکہ اُن کا تہ بند بھی ویسا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تُو اُن میں سے نہیں ہے۔ غرض نیت کو بہت بڑا دخل ہے اور حفظِ مراتب ضروری شے ہے۔

منشی نظیر حسین صاحب: مَیں خود تصویر کشی کرتا ہوں۔ اس کے لیے کیا حکم ہے؟

فرمایا:

اگر کفر اور بُت پرستی کو مدد نہیں دیتے۔ تو جائز ہے۔ آجکل نقوش و قیافہ کا علم بہت بڑھا ہوا ہے۔[لہ]

بلا تاریخ

اہل اللہ اور ریا حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مَیں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پُوچھا کہ کیا کبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ میں بھی ریا آوے؟

[لہ] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۷ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۴ء

و البدر جلد ۳ نمبر ۲۰-۲۱ صفحہ ۹-۱۰

اس پر حضور نے فرمایا :

کبھی چڑیا خانہ گئے ہو؟ مَیں نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا :

دیکھو وہاں شیر، چیتے اور دُوسرے حیوانات ہوتے ہیں۔ کبھی یہ خیال وہاں جاکر دل میں آسکتا ہے کہ ان کے سامنے لمبی لمبی نمازیں پڑھیں؟ کبھی یہ خیال وہاں جاکر ریاکار سے ریاکار کے دل میں بھی نہیں آسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وُہ خوب جانتا ہے کہ یہ حیوانات ہماری جنس سے تو نہیں ہیں تو پھر ریا کہاں رہی؟ ریا تو ہم جنسوں سے ہوتی ہے تو اہل اللہ کس سے ریا کریں۔ اُن کے سامنے دُوسرے لوگوں کی وہی مثال ہے جیسے چڑیا خانہ میں جانور بھرے ہوتے ہیں۔

اپنے الہامات پر کامل ایمان

مولٰنا موصوف نے فرمایا کہ ایک دن کی مجھے بات یاد ہے کہ کسی نے ذکر کیا کہ منشی الٰہی بخش اور اس کا ترجمان منشی عبدالحق کہتا ہے کہ الہام وُہ ہے جو پورا ہو جاوے اور جو نہ ہووے وہ شیطانی کام ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ :

مکّہ معظمہ میں داخل ہو کر اگر خدا تعالیٰ کی قسم دی جاوے تو مَیں کہوں گا کہ میرے الہام خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ جس شخص نے خیالی طور پر دعویٰ کیا ہو وہ ہرگز یہ جرأت نہیں کرسکتا۔ کبھی وہ شخص جو کامل یقین رکھتا ہو اور وہ جو مشکوک ہے برابر ہو سکتے ہیں؟

عہدِ دوستی

مولٰنا موصوف نے کہا کہ ایک دفعہ حضرت اقدس نے خاص طور پر مجھے مخاطب کرکے فرمایا :

"میرے خُلق کی پیروی کر"

مَیں نے عرض کی کہ دُعا کریں۔ فرمایا کہ :

اگر کسی نے ایک بار میرے ساتھ عہدِ دوستی باندھا ہو تو مجھے اس قدر اس کی رعایت ہوتی ہے کہ اگر اُس نے شراب پی ہوئی ہو تو بھی مَیں بلا خوف لَوْمَۃَ لَائِم اُسے اُٹھا لاؤں گا۔ یعنی جب تک وہ خود ترک نہ کرے ہم خود نہ چھوڑیں گے۔ پس اگر کوئی اپنے بھائیوں کو ترک کرے گا۔ وہ سخت گنہگار ہوگا۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ

مولٰنا موصوف کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت اقدس نے فرمایا کہ :

مومن مومن کبھی نہیں ہو سکتا جب تک کہ کفر اس سے مایوس نہ ہو جاوے۔ فتح مسیح کو ایک بار ہم نے رسالہ بھیجا۔ اس پر اُس نے لکیریں کھینچ کر واپس بھیج دیا اور لکھا کہ جس قدر دل آپ نے دُکھایا ہے کسی اَور نے نہیں دُکھایا۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن نے خود اقرار کر لیا کہ ہمارا دل دُکھا پس ایسی مضبوطی ایمان میں پیدا کرو کہ کفر مایوس ہو جاوے کہ میرا قابو نہیں چلتا۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کے یہ معنے بھی ہیں۔

قبولیت دُعا کی شرط طاعون کا ذکر تھا۔ کثرتِ اموات پر ذکر کرتے کرتے فرمایا:

دُعائیں کرتے رہو۔ بجز اس کے انسان مکر اللہ سے بچ نہیں سکتا۔ مگر دُعاؤں کی قبولیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر پاک تبدیلی پیدا کرے۔ اگر بدیوں سے نہیں بچ سکتا اور خدا تعالےٰ کی حدود کو توڑتا ہے، تو دُعاؤں میں کوئی اثر نہیں رہتا۔

خدا تعالیٰ کی شناخت کا وقت فرمایا:

اس وقت دُنیا میں خدا تعالیٰ کا وجود ثابت ہو رہا ہے، اگرچہ لوگ بلائے نام خدا تعالیٰ کے قائل تھے، مگر اصل بات یہ ہے کہ ایک قسم کی دہریّت پھیل رہی تھی اور خدا تعالیٰ سے بکلّی دُور جا پڑے ہیں مگر اب وقت آگیا ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کو شناخت کریں۔ خدا تعالیٰ کے اُوامر و نواہی کو توڑنا اس سے بڑھ کر خباثت کیا ہوگی۔ یہ تو اس کا مقابلہ ہے[1]

۲۰ رمئی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

نومبایعین کو نصائح بعد نماز عصر حیدرآباد دکن کے چند احباب نے بیعت کی۔ بیعت کے بعد تقریر کرتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰة والسلام نے فرمایا:

آپ نے جو مجھ سے آج تعلقِ بیعت کیا ہے تو مَیں چاہتا ہوں کہ کچھ بطور نصیحت چند الفاظ تمہیں کہوں۔

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۹-۲۰ صفحہ ۱ مورخہ ۱۰، ۱۷ رجون ۱۹۰۴ء

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کی زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ پر ایمان رکھے اور پھر قرآن کریم پر غور کرے کہ خدا تعالیٰ نے کیا کچھ قرآن مجید میں فرمایا ہے تو وُہ شخص دیوانہ وار دُنیا کو چھوڑ خدا تعالیٰ کا ہو جاتے۔ یہ بالکل سچ کہا گیا ہے کہ دُنیا روزے چند عاقبت با خداوند۔ اب خدا تعالیٰ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف آنا چاہتا ہے اور فی الواقعہ اس کا دل ایسا نہیں کہ اس نے دین کو دُنیا پر مقدم کیا ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قابلِ سزا ٹھہرتا ہے۔ ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اس کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جب تک کافی حِصّہ اپنا اُن کی طلب میں خرچ نہ کر دیں، وہ مقاصد حاصل ہونے ناممکن ہیں مثلاً اگر طبیب ایک دوائی اور اس کی ایک مقدار مقرر کر دے اور ایک بیمار وہ مقدار دوائی کی تو نہیں کھاتا بلکہ تھوڑا حِصّہ اس دوائی کا استعمال کرتا ہے تو اس کو کیا فائدہ اس سے ہوگا؟ ایک شخص پیاسا ہے تو ممکن نہیں کہ ایک قطرہ پانی سے اس کی پیاس دُور ہو سکے۔ اسی طرح جو شخص بھوکا ہے وہ ایک لقمہ سے سیر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ یا اس کے رسُولؐ پر زبانی ایمان لے آنا یا ایک ظاہری رسم کے طور پر بیعت کر لینا بالکل بے سُود ہے۔ جبتک انسان پوری طاقت سے خدا تعالیٰ کی راہ میں نہ لگ جاوے۔ نفس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ انسان پورے طور پر وہ حصہ لے جو رُوحانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ صرف یہ خیال کہ مَیں مسلمان ہوں کافی نہیں۔

مَیں نصیحت کرتا ہوں کہ آپ نے جو تعلق مجھ سے پیدا کیا ہے (خدا تعالیٰ اس میں برکت ڈالے) اس کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کی فکر میں ہر وقت لگے رہیں لیکن یاد رہے کہ صرف اقرار ہی کافی نہیں جبتک عملی رنگ سے اپنے آپ کو رنگین نہ کیا جاوے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت : ۲) یعنی کیا انسانوں نے گمان کر لیا ہے کہ ہم آمنا ہی کہہ کر چھٹکارا پالیں گے اور کیا وہ آزمائش میں نہ ڈالے جائیں گے۔ سو اصل مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائش اسی لیے ہے کہ خدا تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا ایمان لانے والے نے دین کو ابھی دنیا پر مقدم کیا ہے یا نہیں؟ آج کل اس زمانہ میں جب لوگ خدا تعالیٰ کی راہ کو اپنے مصالح کے خلاف پاتے ہیں یا بعض جگہ حکّام سے ان کو کچھ خطرہ ہوتا ہے تو وہ خدا کی راہ سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے لوگ بے ایمان ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ فی الواقعہ خدا ہی احکم الحاکمین ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا تعالیٰ کی راہ بہت دشوار گذار ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ جب تک انسان خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی کھال اپنے ہاتھ سے نہ اُتارے تب تک وُہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک بھی ایک بے وفا نوکر کسی قدر و منزلت کے قابل نہیں۔ جو نوکر صدق اور وفا نہیں دکھلاتا وہ کبھی قبولیت نہیں پاتا۔ اسی

طرح جنابِ الٰہی میں وہ شخص پرلے درجہ کا بے ادب ہے جو چند روزہ دنیوی منافع پر نگاہ رکھ کر خدا تعالیٰ کو چھوڑتا ہے۔

بیعت کی حقیقت

بیعت سے مراد خدا تعالیٰ کو جان سپرد کرنا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنی جان آج خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں چل کر انجام کار کوئی شخص نقصان اٹھاوے۔ صادق کبھی نقصان نہیں اُٹھا سکتا۔ نقصان اسی کا ہے جو کاذب ہے۔ جو دُنیا کے لیے بیعت کو اور عہد کو جو اللہ تعالیٰ سے اس نے کیا ہے توڑ رہا ہے وہ شخص جو محض دُنیا کے خوف سے ایسے امور کا مرتکب ہو رہا ہے۔ وہ یاد رکھے بوقتِ موت کوئی حاکم یا بادشاہ اُسے نہ چھڑا سکے گا۔ اس نے اَحکم الحاکمین کے پاس جانا ہے جو اُس سے دریافت کریگا کہ تُو نے میرا پاس کیوں نہیں کیا؟ اس لیے ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ خدا جو ملک السمٰوات و الارض ہے اس پر ایمان لاوے اور سچی توبہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ امر بھی یُونہی حاصل نہیں ہوتا ہے۔ خدا ہی یہ امر دل میں بٹھائے تو بیٹھ سکتا ہے۔ سو اس کے لیے دُعا بکار ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدق سے قدم اُٹھاتا ہے اس کو عظیم الشان طاقت اور خارقِ عادت قوت دی جاتی ہے۔ مومن کے دل میں ایک جذب ہوتا ہے کہ جس سے قوتِ جاذبہ کے ذریعہ وہ دُوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر تم میں جذبِ محبت خدا تعالیٰ کی راہ میں کافی ہو تو پھر کیوں لوگ تمہاری طرف نہ کھنچے آویں اور کیوں تم میں ایک مقناطیسی طاقت نہ ہو جاوے۔ دیکھو قرآن میں سورۂ یوسف میں آیا ہے۔ کہ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یوسف : ۲۵) یعنی جب زلیخا نے یوسف کا قصد کیا یوسف بھی زلیخا کا قصد کرتا اگر ہم حائل نہ ہوتے۔ اب ایک طرف تو یوسف جیسا متقی ہے اور اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نبی زلیخا کی طرف مائل ہو ہی چکا تھا اگر ہم نہ روکتے۔ اس میں سِر یہ ہے کہ انسان میں ایک کششِ محبت ہوتی ہے۔ زلیخا کی کششِ محبت اس قدر غالب آئی تھی کہ اس کشش نے ایک متقی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ سو جائے شرم ہے کہ ایک عورت میں جذب اور کشش اس قدر ہو کہ اس کا اثر ایک مضبوط دل پر ہو جاوے اور ایک شخص جو مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس میں جذبِ محبت الٰہی اس قدر نہ ہو کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آویں۔ یہ عذر قابلِ پذیرائی نہیں کہ زبان میں یا وعظ میں اثر نہیں۔ اصلی نقصان قوتِ جاذبہ میں ہے۔ جب تک وہ کامل نہیں تب تک زبانی خالی باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

وفاتِ مسیح

اور ہمارے مسائل، سو وہ بھی بالکل صاف ہیں۔ مثلاً قرآن شریف کی یہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدة : ۱۱۸) اس میں ایک جواب اور ایک سوال ہے۔ خدا تعالیٰ مسیح علیہ السلام سے پوچھے گا کہ کیا تُو نے لوگوں کو ایسی تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لینا تو وہ جواب میں عرض کریں گے کہ بارِ خدایا جب تک میں زندہ رہا اور اُن میں رہا میں نے تو اُن کو ایسی تعلیم نہیں دی، البتہ تُو نے جب مجھ کو مار دیا تو پھر تُو ہی ان کا نگرانِ حال تھا۔ مجھے کوئی علم نہیں کہ میرے پیچھے انہوں نے کیا کیا۔ یہ کیسی موٹی بات ہے کہ خود مسیح اپنی وفات کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر عیسائی بگڑے تو میری وفات کے بعد بگڑے۔ جب تک میں اُن میں زندہ رہا تب تک وہ صحیح عقیدہ پر قائم تھے۔ اب اگر عیسائی بگڑ گئے ہیں تو بالضرور مسیح مر چکا ہے۔ اور اگر مسیح آج تک نہیں مرا تو عیسائی بھی نہیں بگڑے اور اگر عیسائی نہیں بگڑے تو بالضرور عقیدہ الوہیتِ مسیح بھی درست ہے۔ پھر مسیح کا یہ کہہ دینا کہ مجھے تو اُن کے بگڑنے کا علم نہیں جیسے کہ اسی آیت سے پایا جاتا ہے۔ کیا یہ جواب اُن کا جھوٹا نہیں ہوگا۔ اگر ان کا دوبارہ دُنیا میں آنا دُرست ہے، کیونکہ سوال و جواب قیامت کو ہوگا۔ اور اگر انھوں نے دوبارہ دنیا میں آکر چالیس سال رہنا ہے اور عیسائیوں اور کفار کو قتل کر کے اسلام کو پھیلانا ہے تو بالضرور اُنھوں نے عیسائیوں کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ لیا ہے اور اس بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر وہ دوبارہ اس دُنیا سے تشریف لے جاویں گے تو پھر حضرت مسیح کا یہ جواب دینا خُدا کے حضور میں دروغ بیانی ہے۔ کیا وہ احکم الحاکمین نہ کہے گا کہ تُو دوبارہ دُنیا میں گیا اور تُو نے دیکھ لیا کہ تیری اُمت بگڑ چکی تھی۔ ایک مجازی حاکم کے آگے غلط بیانی، دروغِ حلفی کے جُرم کا خطرناک ارتکاب ہے۔ چہ جائیکہ ایک عالم الغیب حاکم کی جناب میں ایسی دروغ بیانی کی جاوے تو گویا اس آیت نے بڑی صفائی کے ساتھ ایک طرف مسیح کی وفات کو ثابت کر دیا اور دوسری طرف ان کے دوبارہ دُنیا میں تشریف لانے کا اُبطلان کر دیا۔ اس کے مقابل جب ہم حدیثوں پر غور کرتے ہیں تو وہاں سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا اور یہ متفق علیہ حدیث ہے کہ میں نے حضرت مسیحؑ کو حضرت یحییٰؑ کے ساتھ دیکھا۔ حضرت یحییٰ کا مر جانا اور ان کا اس جماعت میں داخل ہونا جن کی قبض رُوح ہو چکی ہے ثابت شدہ امر ہے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مسیح بلا قبض رُوح و انتقال کرنے کے ایک ایسے شخص کا جلیس ہو جو دنیا سے مر چکا ہے اب ایک طرف قولِ خدا اور دوسری طرف رؤیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاتِ مسیحؑ اور ان کا دوبارہ دُنیا میں واپس نہ آنا قطعی ثابت ہو گیا۔ اب بھی یہ لوگ اگر عقیدہ حیاتِ مسیحؑ سے باز نہ آویں۔ تو یہی سمجھا جاوے گا کہ سچی ہدایت اور سعادت صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اُن کے حال

پر تو پھر سعدی کا یہ قول صادق آتا ہے ؎

آنکس کہ بقرآں و خبر زو نہ رہد
ایں است جوابش کہ جوابش نہ دہی

آنیوالا مسیح اُمتی ہوگا

رہا یہ کہ آنے والا کون ہے؟ اس کا فیصلہ بھی قرآن و حدیث نے کر دیا ہے۔ سورہ نور نے صاف طور پر بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلفاء اس امت میں سے ہوں گے۔ بخاری اور مُسلم کا بھی یہی مذہب ہے کہ آنیوالا مسیح اس امت میں سے ہوگا۔ اب ایک طرف قرآن و حدیث بنی اسرائیلی مسیح کی موت اور دوبارہ نہ آنے کو بیان کرتے ہیں۔ دُوسری طرف یہی قرآن و حدیث آنے والے مسیح کو اسی امت میں سے ٹھہراتے ہیں تو پھر اب اِنتظار کس بات کا ہے؟

نشانات

اب علامات کو بھی دیکھ لیا جاوے۔ صدی کے سر پر مجدّد کا آنا سب نے تسلیم کیا ہے اور یہ بھی مانا ہے کہ مسیح بطور مجدّد صدی کے سر پر آوے گا۔ صدی میں سے بائیس سال گذر گئے اور اس وقت تک مجدّد نظر نہ آیا۔ آخر اس صدی کے سر پر جس مجدّد نے آنا تھا وہ کہاں ہے؟

کُسوف وخُسوف کا نشان

مہدی کا نشان کسوف وخسوف تھا جو رمضان میں ہونا تھا۔ اس کسوف وخسوف پر بھی آٹھ سال گذر گئے۔ مہدی نہ آیا۔ اگر یہ کہا جاوے کہ نشان تو گیا، لیکن صاحبِ نشان بعد میں آوے گا تو یہ عقیدہ بڑا فاسد ہے اور قسم قسم کے فسادات کی بنا رہے۔ اگر ایک زمانہ کے بعد اکٹھے بیس انسان مہدویت کے مدعی ہو جاویں تو پھر اُن میں کون فیصلہ کریگا؟ ضرور ہے کہ صاحبِ نشان نشان کے ساتھ ہو۔ یہ لوگ منبروں پر چڑھ کر صدی کے سرے کو اور کُسوف وخسوف کو یاد کیا کرتے اور روتے تھے، لیکن جب وہ وقت آیا تو یہی لوگ دشمن بن گئے۔ حدیث کے مطابق تمام نشان واقع ہو گئے لیکن یہ لوگ اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔ کسوف و خُسوف کا عظیم الشان نشان ظاہر ہو گیا، لیکن خدا تعالیٰ کے اس نشان کی قدر نہ کی گئی۔

طاعون کا نشان

اسی طرح کُل انبیاء کی کتب سابقہ اور قرآن و حدیث میں ایک اَور بلا کی طرف اشارہ تھا جو کُسوف وخُسوف کے آسمانی نشان کے بعد آنے والی تھی اور وہ طاعون ہے۔ جو وہ بھی مسیح کے زمانہ سے وابستہ تھی۔ یہ ایک خطرناک مصیبت ہے جس کی طرف ہر ایک اُولوالعزم نبی نے بالتصریح یا بالاجمال اشارہ کیا ہے۔ طاعون آگئی۔ لاکھوں انسان تباہ ہو

گئے۔ اور نہ معلوم کب تک اس کی تباہی چلتی رہے گی۔ لیکن جس موعود کے زمانہ کی شناخت کا یہ نشان ہے اسے اب تک ان لوگوں نے نہ پہچانا۔ اسی طرح زمین و آسمان نے شہادت دی لیکن ان شہادتوں کو ردّی سمجھا گیا۔ خُدا غیور ہے اور وہ اپنی غیرت دکھلاتے گا۔ ایک مجازی حاکم عدول حکمی پسند نہیں کرتا تو وہ احکم الحاکمین غیُور خدا کب اس عدول حکمی کو بلا سزا چھوڑیگا۔

نئی سواری کا نشان

ایک اور نشان اس زمانہ کا وہ نئی سواری تھی جس نے اُونٹوں کو بیکار کر دینا تھا۔ قرآن نے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (التکویر : ۵) (جب اُونٹیاں بے کار ہو جاویں گی) کہہ کر اس زمانہ کا پتہ بتلایا۔ حدیث نے مسیح کے نشان میں یوں کہا: وَیُتْرَکُ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا۔ پھر یہ نشان کیا پورا نہ ہوا؟ حتیٰ کہ اس سرزمین میں بھی جہاں آج تک اُونٹنی کی سواری تھی اور بغیر اُونٹنیوں کے گذارہ نہ تھا، وہاں بھی اس سواری کا انتظام ہو گیا ہے اور چند سالوں میں اُونٹوں کی سواری کا نام و نشان نہیں ملے گا۔ اونٹنیاں بیکار ہو گئیں۔ مقرر کردہ نشان پُورے ہو گئے۔ لیکن جس کا یہ نشان تھا وہ پہچانا نہ گیا! کیا یہ اُمور بھی میرے اختیار میں تھے کہ ایک طرف تو میں دعویٰ کروں اور دُوسری طرف یہ نشان پورے ہوتے جاویں۔ کیا آسمانی نظام پر بھی میرا دخل ہے جو کسوف و خسُوف موعود کو پیدا کر لیتا؟ یا میرے ہاتھ کوئی ایسے مواد ہیں جن سے زمین پر موعود طاعون پیدا ہو گئی؟ یا حج کا رُکنا جو یہ بھی مسیح کا نشان تھا کیا یہ بھی میرے اشارہ سے ہوا؟ اسی طرح بیسیوں نشان زمانہ مسیح کے ساتھ وابستہ تھے وہ سب پورے ہو گئے۔ خدا تعالیٰ نے کونسی حجت کو ان پر پُورا نہیں کیا، لیکن ان کا انکار ابھی اسی طرح ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ زمانہ میں دہریت پھیلی ہوئی ہے جو خفیہ خفیہ سب دلوں پر اثر کر رہی ہے۔ خشیتِ الٰہی دن بہ دن مفقُود ہو رہی ہے۔ کان رکھتے ہیں پر سُن نہیں سکتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں پر نہیں دیکھتے۔ دل رکھتے ہیں پر نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ انکار ہے وَرنہ معاملہ تو بہت ہی صاف تھا۔ میری کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس قدر اتمامِ حجت کی گئی۔ اب ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ خُدا تعالیٰ نے قوی دلائل سے اُن کا رگ و ریشہ کاٹ دیا ہے لیکن یہ نہیں دیکھتے۔

شناختِ مامُور کے تین طریق

ایک مامور کی شناخت کے تین طریق ہیں :۔ نقل، عقل، تائیداتِ سماوی۔ اب دیکھنا چاہیے۔ کہ یہ تینوں امور اس سلسلہ کے مؤیّد ہیں۔ دانیال اور دیگر انبیاء نے تو اس کے آنے کا زمانہ مقرر کر دیا ہے حتیٰ کہ صدی اور سال بھی مقرر کر دیا ہے۔ تمام عیسائیوں میں ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہوئی ہے کیونکہ کتبِ سابقہ کے مطابق مسیح کی آمد کا وقت آ چکا ہے۔ اور مسیح ابھی تک آیا نہیں۔ اس لیے بعض علماء اخیر مجبور ہو کر اس طرف گئے ہیں کہ مسیح کی آمدِ ثانی سے مراد کلیسیا کی ترقی ہے جو ہو چکی ہے۔[1]

[1] (از ریویو) البدر جلد ۳ نمبر ۳۰ صفحہ ۳/۴ مورخہ ۸ر اگست ۱۹۰۴ء

اسی طرح ہماری کتب کے مطابق بھی بعثتِ مسیح کا یہی زمانہ ہے۔ حجج الکرامہ والے نے لکھا ہے کہ کُل اہلِ کشوف اسی طرف گئے ہیں کہ مسیح کی آمدِ ثانی کے لیے چودھویں صدی مقرر ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اسی زمانہ کے لیے اُسے چراغ الدین کہا ہے۔ غرضیکہ ہر ایک بزرگ نے جو زمانہ مقرر کیا ہے وہ چودھویں صدی سے آگے نہیں گیا، اگرچہ اُن میں کچھ اختلاف ہے۔ چودھویں صدی میں لطیف اشارہ اس طرف تھا کہ دینِ اسلام چودھویں رات کے چاند کی طرح اس زمانہ میں چمک اٹھے گا۔ جس طرح چاند کا کمال چودھویں رات کو ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا کمال کُل دُنیا میں چودھویں صدی میں ظاہر ہوگا۔ تیرھویں صدی کی تاریکی ان لوگوں میں ضرب المثل ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس صدی کے علماء سے بھیڑیوں نے بھی نجات مانگی تھی۔ یہ لوگ چودھویں صدی کے منتظر تھے، لیکن جب صدی آگئی تو اپنی بدبختی کے باعث انکار کر گئے۔ اسی طرح قرآن میں ذکر ہے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ۔ (البقرۃ: ۹ اہلِ کتاب منتظر تھے کہ پیغمبر کے آنے پر وہ اس کے ساتھ مل کر کفار سے جنگ کریں گے لیکن جب پیغمبر آیا تو انکار پر آمادہ ہو گئے۔

عقل کے نزدیک بھی زمانہ مسیح کا یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسلام اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ ایک وقت ایک شخص کے مُرتد ہو جانے پر اس میں شور پڑ جاتا تھا۔ لیکن اب لاکھوں مُرتد ہو گئے۔ رات دن مخالفتِ اسلام میں کُتب تصنیف ہو رہی ہیں۔ اسلام کی بیخ کنی کے واسطے طرح طرح کی تجاویز ہو رہی ہیں۔ عقل پسند نہیں کرتی کہ جس خدا نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) کا وعدہ دیا ہے وہ اس وقت اسلام کی حفاظت نہ کرے اور خاموش رہے۔ یہ زمانہ کس قسم کی مصیبت کا اسلام پر ہے کہ شرفا کی اولاد دشمنِ اسلام ہو کر گرجاؤں میں چلے گئے اور کُھلے طور پر رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہو رہی ہے۔ ہر ایک قسم کی گالی اور سب و شتم میں اُن کو یاد کیا جاتا ہے۔ ان تمام امور کو بہ ہیئت مجموعی اگر دیکھا جائے تو عقل کہتی ہے کہ یہی وقت خدا تعالیٰ کی تائید کا ہے اور مَیں تم کو سچ کہتا ہوں کہ اگر یہ سلسلہ قائم نہ ہوتا تو اسلام برباد ہو چکا تھا۔ سو خدا تعالیٰ کے وجود کا یہ بھی ایک نشان ہے کہ عین ضرورت کے وقت خدا تعالیٰ نے اس سلسلہ کو قائم کیا اور عین مصیبت کے وقت اسلام کو سنبھالا۔ تائیداتِ سماوی اگر دیکھی جاویں تو یہاں بھی ایک بڑا خزانہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہزار ہا نشان میرے ہاتھ پر ظاہر کیے۔ اگر مَیں ان تمام نشانوں کو جمع کروں جو ہر روز مَیں اور میرے ساتھ رہنے والے دیکھتے ہیں تو اُن کی تعداد لاکھ کے قریب ہو جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے صرف براہین احمدیہ کے بعض الہامات کو دیکھا جاوے۔ چوبیس برس

ہوئے کہ یہ کتاب تصنیف ہوئی جو اس وقت مکہ، مدینہ، مصر، بخارا، لنڈن اور ایسا ہی ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں پہنچ گئی۔ کئی ایک پادریوں اور دیگر مخالفینِ اسلام کے گھروں میں پہنچ گئی۔ اب اس کتاب میں مثلاً لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھے ارشاد ہے کہ اس وقت تو اکیلا ہے اور تیرے ساتھ کوئی نہیں لیکن ایک وقت آئے گا کہ لوگ تیرے پاس دُور دُور سے آئیں گے۔ (یَأْتُوْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ) تو لوگوں میں پہچانا جاوے گا اور تیری شہرت کی جاوے گی۔ تیری امداد اور تائید کو دُور دُور سے لوگ آویں گے۔ پھر کہا کہ لوگ کثرت سے آویں گے اور تو اُن سے نرمی اور اخلاق سے پیش آنا۔ اُن کی ملاقات سے مت گھبرانا۔ (وَلَا تُصَعِّرْ لِخَلْقِ اللّٰہِ وَلَا تَسْئَمْ مِنَ النَّاسِ) پھر آخر کار فرمایا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَ انْتَہٰی اَمْرُ الزَّمَانِ اِلَیْنَا۔ اَلَیْسَ ہٰذَا بِالْحَقِّ۔ یعنی جب خدا تعالیٰ کی فتح اور نصرت آوے گی اور زمانہ کا امر ہماری طرف منتہی ہوگا تو اس وقت کہا جاوے گا کہ کیا یہ سلسلہ حق نہیں؟ اب لاہور اور امرتسر کے لوگ اور ایسا ہی پنجاب کے لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ براہین کی اشاعت کے وقت مجھے کوئی جانتا نہیں تھا حتیٰ کہ قادیان میں بہت کم لوگ ہوں گے جو مجھے پہچانتے ہوں گے۔ پھر یہ امور کس طرح پورے ہو رہے ہیں، اگرچہ یہ پیشگوئیاں بدرجہ اتم ابھی پوری نہیں ہوئیں، لیکن جس قدر الہامات کا ظہور ہو رہا ہے وُہ طالبِ حق کے لیے کافی ہے۔ اب کیا یہ میری بناوٹ ہے کہ ایک انسان آج سے چوبیس سال پہلے آجکل کے واقعات کا نقشہ کھینچ سکتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ہزارہا مخلوق کا مرجع ہوگا خصوصاً جبکہ ایک مدت تک ان امور کا ظہور نہ ہوا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ امور کسی فراست کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ ان اُمور کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر نشانات خدا تعالیٰ نے میری تائید میں ظاہر کئے وہ اپنی تعداد اور شوکت میں ایسے ہیں کہ بجز حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کل انبیاء و مرسلین سے ایسے ثابت نہیں ہوئے لیکن اس میں میرا کیا فخر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس پاک نبی کی فضیلت ہے۔ جس کی امت میں ہونے کا مجھے فخر حاصل ہے۔

پھر مَیں کہتا ہوں کہ آج کل کے پیرزادوں اور سجادہ نشینوں کو آزما لو۔ کسی پادری یا کسی مذہب کے سرگروہ کو میرے مقابل میں لاؤ۔ خدا تعالیٰ نشان نمائی میں بالضرور اس کو میرے مقابل شرمندہ اور ذلیل کرے گا۔ یہاں تو نشانوں کا دریا بہہ رہا ہے۔ میرے دوست اس الہام سے خوب واقف ہیں جو دس بارہ سال ہوئے خدا تعالیٰ نے فرمایا، اِنِّیْ مُہِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِہَانَتَکَ وَاِنِّیْ مُعِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِعَانَتَکَ اس ایک الہام کو کس قدر مواقع اور محل پر میرے دوستوں نے پورے ہوتے دیکھا۔ کس طرح لوگوں نے میری اہانت اور تذلیل کے لیے بیڑے اٹھائے۔ اور کس طرح وہ خود ہی ذلیل اور خوار ہو گئے۔ اس

کی ایک مثال نہیں بلکہ کئی ایک مثالیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان نشانات کو دیکھ کر بھی لوگ ابھی گمراہ ہیں سو بات یہ ہے کہ دُنیا میں ہمیشہ سے دو گروہ چلے آئے ہیں۔ ایک سعید دوسرا شقی۔ ابوجہل نے ہزاروں نشان دیکھے لیکن وہ کافر ہی رہا۔ سو اس صورت میں مومن کے لیے ضرور ہے کہ وہ دُعا میں لگ جاوے۔

صرف بیعت پر قناعت نہ کریں

آپ نے جو آج مجھ سے بیعت کی ہے۔ یہ تخم ریزی کی طرح ہے۔ چاہیے کہ آپ اکثر مجھ سے ملاقات کریں اور اس تعلق کو مضبوط کریں جو آج قائم ہوا ہے۔ جس شاخ کا تعلق درخت سے نہیں رہتا وہ آخر خشک ہو کر گِر جاتی ہے۔ جو شخص زندہ ایمان رکھتا ہے وُہ دُنیا کی پروا نہیں رکھتا۔ دُنیا ہر طرح مل جاتی ہے۔ دین کو دُنیا پر مقدم رکھنے والا ہی مبارک ہے لیکن جو دُنیا کو دین پر مقدم رکھتا ہے وہ ایک مُردار کی طرح ہے جو کبھی سچی نصرت کا مُنہ نہیں دیکھتا۔ یہ بیعت اس وقت کام آسکتی ہے۔ جب دین کو مقدم کر لیا جاوے اور اس میں ترقی کرنے کی کوشش ہو۔ بیعت ایک بیج ہے جو آج بویا گیا۔ اب اگر کوئی کسان صرف زمین میں تخم ریزی پر ہی قناعت کرے اور پھل حاصل کرنے کے جو جو فرائض ہیں ان میں سے کوئی ادا نہ کرے۔ نہ زمین کو درست کرے اور نہ آبپاشی کرے اور نہ موقعہ بہ موقعہ مناسب کھاد زمین میں ڈالے نہ کافی حفاظت کرے تو کیا وہ کسان کسی پھل کی امید کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا کھیت بالضرور تباہ اور خراب ہوگا۔ کھیت اسی کا رہے گا جو پورا زمیندار بنے گا۔ سو ایک طرح کی تخم ریزی آپ نے بھی آج کی ہے۔ خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ کس کے مقدر میں کیا ہے، لیکن خوش قسمت وہ ہے جو اس تخم کو محفوظ رکھے اور اپنے طور پر ترقی کے لیے دُعا کرتا رہے۔ مثلاً نمازوں میں ایک قسم کی تبدیلی ہونی چاہیے۔

نماز میں حضور اور لذت پیدا کرنے کا طریق

مَیں دیکھتا ہوں کہ آج کل لوگ جس طرح نماز پڑھتے ہیں وہ محض ٹکریں مارنا ہے۔ اُن کی نماز میں اس قدر بھی رقّت اور لذت نہیں ہوتی جس قدر نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا میں ظاہر کرتے ہیں۔ کاش یہ لوگ اپنی دُعائیں نماز میں ہی کرتے۔ شاید اُن کی نمازوں میں حضور اور لذت پیدا ہو جاتی۔ اس لیے مَیں حکماً آپ کو کہتا ہوں کہ سرِدست آپ بالکل نماز کے بعد دُعا نہ کریں۔ اور وہ لذت اور حضُور جو دُعا کے لیے رکھا ہے، دعاؤں کو نماز میں کرنے سے پیدا کریں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ نماز کے بعد دعا کرنی منع ہے لیکن مَیں چاہتا ہوں کہ جب تک نماز میں کافی لذت اور حضور پیدا نہ ہو نماز کے بعد دعا کرنے میں نماز کی لذّت کو مت گنواؤ۔ ہاں جب یہ حضُور پیدا ہو جاوے تو کوئی حرج نہیں۔ سو بہتر ہے نماز میں دعائیں اپنی زبان میں مانگو۔ جو طبعی جوش کسی کی مادری زبان میں ہوتا ہے وہ ہرگز غیر زبان میں پیدا نہیں

ہوسکتا۔ سو نمازوں میں قرآن اور ماثورہ دعاؤں کے بعد اپنی ضرورتوں کو برنگِ دُعا اپنی زبان میں خدا تعالیٰ کے آگے پیش کرو تاکہ آہستہ آہستہ تم کو حلاوت پیدا ہو جائے۔ سب سے عمدہ دُعا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضامندی اور گناہوں سے نجات حاصل ہو، کیونکہ گناہوں ہی سے دل سخت ہو جاتا اور انسان دُنیا کا کیڑا بن جاتا ہے۔ ہماری دُعا یہ ہونی چاہیے کہ خدا تعالیٰ ہم سے گناہوں کو جو دل کو سخت کر دیتے ہیں دُور کر دے اور اپنی رضامندی کی راہ دکھلاتے۔ دنیا میں مومن کی مثال اس سوار کی ہے کہ جو جنگل میں جا رہا ہے۔ راہ میں بسبب گرمی اور تھکانِ سفر کے ایک درخت کے نیچے سستانے کے لیے ٹھہر جاتا ہے لیکن ابھی گھوڑے پر سوار ہے اور کھڑا کھڑا گھوڑے پر ہی کچھ آرام لے کر آگے اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے لیکن جو شخص اس جنگل میں گھر بنالے وہ ضرور درندوں کا شکار ہوگا۔ مومن دنیا کو گھر نہیں بناتا اور جو ایسا نہیں خدا تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرتا نہ خدا تعالیٰ کے نزدیک دنیا کو گھر بنانے والے کی عزت ہے۔ خدا تعالیٰ مومن کی عزت کرتا ہے۔

نوافل کی حقیقت

حدیث میں آیا ہے کہ مومن نوافل کے ساتھ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ نوافل سے مراد یہ ہے کہ خدمت مقررہ کردہ میں زیادتی کی جاوے۔ ہر ایک خیر کے کام میں دُنیا کا بندہ تھوڑا سا کر کے سُست ہو جاتا ہے، لیکن مومن زیادتی کرتا ہے۔ نوافل صرف نماز سے ہی مختص نہیں بلکہ ہر ایک حسنات میں زیادتی کرنا نوافل ادا کرنا ہے۔ مومن محض خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اُن نوافل کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اس کے دل میں ایک درد ہے جو اسے بے چین کرتا ہے اور وہ دن بہ دن نوافل و حسنات میں ترقی کرتا جاتا ہے اور بالمقابل خدا تعالیٰ بھی اس کے قریب ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ مومن اپنی ذات کو فنا کر کے خدا تعالیٰ کے سایہ تلے آجاتا ہے۔ اس کی آنکھ خدا تعالیٰ کی آنکھ۔ اس کے کان خدا تعالیٰ کے کان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ کسی معاملہ میں خدا تعالیٰ کی مخالفت نہیں کرتا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس کی زبان خدا تعالیٰ کی زبان اور اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔

مومن کا مقام

پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے کسی بات میں اس قدر تردد نہیں ہوتا جس قدر مومن کی جان نکالنے میں تردد ہوتا ہے۔ یوں تو خدا تعالیٰ کی ذات سب ترددات سے پاک ہے لیکن یہ فقرہ جو فرمایا تو مومن کے اکرام کے لیے فرمایا۔ اب دوسرے لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر جاتے ہیں لیکن مومن کا معاملہ دگرگوں ہے۔ مجھے یہ سمجھ آتی ہے کہ جو صلحاء اور انبیاء کی زندگی آئے دن طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہتی ہے اور بعض وقت اُن کو خوفناک امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ ہمارے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت تھی۔ یہ اُس تردّد کا اظہار ہے

جس کا اُوپر ذکر ہوا ہے گویا اللہ تعالیٰ اس سے معاملہ ایسا کرتا ہے اور خوفناک بیماریوں سے اُسے نجات دیکر ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ اُسے معمولی انسانوں کی طرح ضائع نہیں کرتا۔ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے کہ مومن کی ہر ایک چیز بابرکت ہو جاتی ہے جہاں وہ بیٹھتا ہے وہ جگہ دوسروں کیلئے موجبِ برکت ہوتی ہے۔ اسکا پس خوردہ اَوروں کیلئے شفا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک گنہگار خدا تعالیٰ کے سامنے لایا جاوے گا۔ خدا تعالیٰ اس سے پُوچھے گا کہ تُو نے کوئی نیک کام کیا؟ وُہ کہے گا کہ نہیں۔ پھر خدا تعالیٰ اس کو کہے گا کہ فلاں مومن تو ملا تھا وہ کہے گا خداوند مَیں ارادتًا تو کبھی نہیں ملا وہ خود ہی ایک دن مجھے راستہ میں مِل گیا۔ خدا تعالیٰ اسے بخش دے گا۔ پھر ایک اَور موقعہ پر حدیث میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ فرشتوں سے دریافت کرے گا کہ میرا ذکر کہاں پر ہو رہا ہے؟ وہ کہیں گے کہ ایک حلقہ مومنین کا تھا جہاں دنیا کے ذکر کا نام و نشان بھی نہ تھا؛ البتہ ذکرِ الٰہی آٹھوں پہر ہو رہا ہے۔ اُن میں ایک دُنیا پرست شخص تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ مَیں نے اس دنیادار کو اس ہم نشینی کے باعث بخش دیا۔ اِنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقَى جَلِيْسُهُمْ۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ جہاں ایک مومن امام ہو اس کے مقتدی پیشتر ازیں کہ وہ سجدہ سے سر اُٹھا دے بخش دیتے جاتے ہیں۔

مومن وہ ہے کہ جس کے دل میں محبتِ الٰہی نے عشق کے رنگ میں جڑ پکڑ لی ہو۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ ہر ایک تکلیف اور ذلّت میں بھی خدا تعالیٰ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ اب جس نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کب کسی کا کانشنس کہتا ہے کہ وہ ضائع ہوگا کیا کوئی رسُول ضائع ہوا؟ دُنیا ناخنوں تک اُن کو ضائع کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن وہ ضائع نہیں ہوتے جو خدا تعالیٰ کے لیے ذلیل ہو وہی انجام کار عزت و جلال کا تخت نشیں ہوگا۔ ایک ابوبکرؓ ہی کو دیکھو جس نے سب سے پہلے ذلّت قبول کی اور سب سے پہلے تخت نشین ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پہلے کچھ نہ کچھ دُکھ اٹھانا پڑتا ہے کسی نے سچ کہا ہے ؎

عشق اوّل سرکش و خونی بود
تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

عشقِ الٰہی بے شک اوّل سرکش و خونی ہوتا ہے تاکہ نا اہل دور ہو جاوے۔ عاشقانِ خدا تکالیف میں ڈالے جاتے ہیں[1]۔ قسم قسم کے مالی اور جسمانی مصائب اُٹھاتے ہیں اور اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے دل پہچانے جاویں۔ خدا تعالیٰ نے یہ امر مقرر کر دیا ہے کہ جب تک کوئی پہلے دوزخ پر راضی نہ ہو جاوے بہشت میں نہیں جاتا۔ بہشت دیکھنا اسی کو نصیب ہوتا ہے جو پہلے دوزخ دیکھنے کو تیار

---

[1] (از ریویو) البدر جلد ۳ نمبر ۳۱ صفحہ ۵-۶ مورخہ ۱۶؍اگست ۱۹۰۴ء

ہوتا ہے۔ دوزخ سے مراد آئندہ دوزخ نہیں بلکہ اس دنیا میں مصائب شدائد کا نظارہ مراد ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ کافر کے لیے دوزخ بہشت کے رنگ میں اور مومن کے لیے بہشت دوزخ کے رنگ میں متمثّل کیا جاتا ہے۔ کافر جو دنیا کا طالب ہے دنیا میں منہمک ہو کر سگِ دُنیا ہو جاتا ہے۔ مومن ایک عاشق ہے جو دنیا کو طلاق دے کر ہر ایک تکلیف سہنے کو تیار ہوتا ہے اور فی الواقعہ یہ عشق ہی ہے جو اُسے ہر قسم کی تکلیف سہنے کے لیے آمادہ کر دیتا ہے۔ مومن کا رنگ عاشق کا رنگ ہوتا ہے اور وہ اپنے عشق میں صادق ہوتا ہے اور اپنے معشوق یعنی خدا کے لیے کامل اخلاص اور محبت اور جان فدا کرنے والا جوش اپنے اندر رکھتا ہے اور تضرّع اور ابتہال اور ثابت قدمی سے اس کے حضور میں قائم ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی لذّت اس کے لیے لذّت نہیں ہوتی۔ اس کی رُوح اسی عشق میں پرورش پاتی ہے۔ معشوق کی طرف سے استغنا دیکھ کر وہ گھبراتا نہیں۔ اس طرف سے خاموشی اور بے التفاتی بھی معلوم کرکے وہ کبھی ہمّت نہیں ہارتا بلکہ ہمیشہ قدم آگے ہی رکھتا ہے اور دردِ دل زیادہ سے زیادہ پیدا کرتا جاتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کا ہونا ضروری ہے کہ مومن عاشق کی طرف سے محبتِ الٰہی میں پُورا استغراق ہو۔ عشق کامل ہو۔ محبت میں سچّا جوش اور عہدِ عشق میں ثابت قدمی ایسی کوٹ کوٹ کے بھری ہو کہ جس کو کوئی صدمہ جنبش میں نہ لا سکے اور معشوق کی طرف سے کبھی کبھی بے پرواہی اور خاموشی ہو۔ درد دو قسم کا موجود ہو۔ ایک تو وُہ جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد ہو۔ دُوسرا وہ جو کسی کی مصیبت پر دل میں درد اُٹھے اور خیر خواہی کے لیے اضطراب پیدا ہو۔ اور اس کی اعانت کے لیے بے چینی پیدا ہو۔ خدا تعالیٰ کی محبت کے لیے جو اخلاص اور درد ہوتا ہے اور ثابت قدمی اس کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، وہ انسان کو بشریت سے الگ کرکے اُلوہیت کے سایہ میں لا ڈالتا ہے۔ جب تک اس کی حد تک درد اور عشق نہ پہنچ جائے کہ جس میں غیر اللہ سے محویت حاصل ہو جائے اس وقت انسان خطرات میں پڑا رہتا ہے۔ ان خطرات کا استیصال بغیر اس امر کے مشکل ہوتا ہے کہ انسان غیر اللہ سے بکلّی منقطع ہو کر اسی کا ہو جائے اور اُس کی رضا میں داخل ہونا بھی محال ہوتا ہے اور اُس کی مخلوق کے لیے ایسا درد ہونا چاہیے جس طرح ایک نہایت ہی مہربان والدہ اپنے ناتواں پیارے بچّے کے لیے دل میں سچّا جوشِ محبت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلّق کے لیے محویّت کی ضرورت

خدا تعالیٰ ایک تعلق چاہتا ہے اور اس کے حضور میں دعا کرنے کے لیے تعلق کی ضرورت ہے۔ بغیر تعلق کے دُعا نہیں ہو سکتی۔ پہلے بزرگوں کی بھی اس قسم کی باتیں چلی آئی ہیں کہ جن سے دُعا کرنے والوں کو دُعا کرانے سے پہلے تعلق ثابت کرنے کی تاکید کی۔ خواہ مخواہ بازار میں

چلتے ہوئے کسی بے تعلق کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تُو میرا دوست ہے اور نہ ہی اس کے لیے دردِ دل پیدا ہوتا ہے۔ اور نہ ہی جوشِ دُعا پیدا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق اس طرح نہیں ہو سکتا کہ انسان غفلت کاریوں میں مبتلا بھی رہے اور صرف مُنہ سے دم بھرتا ہے کہ مَیں نے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کر لیا ہے۔ اکیلے بیعت کا اقرار اور سلسلہ میں نام لکھ لینا ہی خدا تعالیٰ سے تعلق پر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لیے ایک محویّت کی ضرورت ہے۔ ہم بار بار اپنی جماعت کو اس بات پر قائم ہونے کے لیے کہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک دُنیا کی طرف سے انقطاع اور اس کی محبت دلوں سے ٹھنڈی ہو کر اللہ تعالیٰ کے لیے فطرتوں میں طبعی جوش اور محویّت پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک ثبات میسّر نہیں آسکتا۔ بعض صوفیوں نے لکھا ہے کہ صحابہؓ جب نمازیں پڑھا کرتے تھے تو انہیں ایسی محویّت ہوتی تھی کہ جب فارغ ہوتے تو ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکتے تھے۔ جب انسان کسی اور جگہ سے آتا ہے تو شریعت نے حکم دیا ہے کہ وہ آکر السلام علیکم کہے۔ نماز سے فارغ ہونے پر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے کی حقیقت یہی ہے کہ جب ایک شخص نے نماز کا عقد باندھا اور اللہ اکبر کہا تو وہ گویا اس عالم سے نکل گیا اور ایک نئے جہان میں جا داخل ہوا۔ گویا ایک مقامِ محویّت میں جا پہنچا۔ پھر جب وہاں سے واپس آیا تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر آن ملا۔ لیکن صرف ظاہری صورت کافی نہیں ہو سکتی جب تک دل میں اس کا اثر نہ ہو چھلکوں سے کیا ہاتھ آسکتا ہے۔ محض صورت کا ہونا کافی نہیں۔ حال ہونا چاہیے۔ علّت غائی حال ہی ہے۔ مطلق قال اور صورت جس کے ساتھ حال نہیں ہوتا وہ تو اُلٹی ہلاکت کی راہیں ہیں۔ انسان جب حال پیدا کر لیتا ہے اور اپنے حقیقی خالق و مالک سے ایسی سچّی محبت اور اخلاص پیدا کر لیتا ہے کہ بے اختیار اس کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے اور ایک حقیقی محویّت کا عالم اس پر طاری ہو جاتا ہے، تو اس وقت اس کیفیت سے انسان گویا سلطان بن جاتا ہے اور ذرّہ ذرّہ اس کا خادم بن جاتا ہے۔

مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ایسی محویّت دی تھی کہ تمام دنیا سے الگ ہو بیٹھا تھا۔ تمام چیزیں سوائے اس کے مجھے ہرگز بھاتی نہ تھیں۔ مَیں ہرگز ہرگز حجرہ سے باہر قدم رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مَیں نے ایک لمحہ کے لیے بھی شہرت کو پسند نہیں کیا۔ مَیں بالکل تنہائی میں تھا اور تنہائی ہی مجھ کو بھاتی تھی۔ شہرت اور جماعت کو جس نفرت سے مَیں دیکھتا تھا اس کو خُدا ہی جانتا ہے۔ مَیں تو طبعًا گمنامی کو چاہتا تھا اور یہی میری آرزو تھی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ پر جبر کر کے اس سے مجھے باہر نکالا۔ میری ہرگز مرضی نہ تھی مگر اس نے میری خلافِ مرضی کیا کیونکہ وہ ایک کام لینا چاہتا تھا۔ اسی کام کے لیے اس نے مجھے پسند کیا اور اپنے فضل سے مُجھ کو اس عہدہ جلیلہ پر مامور فرمایا۔ یہ اسی کا اپنا انتخاب اور کام ہے۔ میرا اس میں کچھ دخل نہیں۔ مَیں تو دیکھتا ہوں

کہ میری طبیعت اس طرح واقع ہوئی ہے کہ شہرت اور جماعت سے کوسوں بھاگتی ہے اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ لوگ کس طرح شہرت کی آرزو رکھتے ہیں۔ میری طبیعت اَور طرف جاتی تھی لیکن خدا تعالیٰ مجھے اَور طرف لے جاتا تھا۔ مَیں نے بار بار دُعائیں کیں کہ مجھے گوشہ میں ہی رہنے دیا جاوے۔ مجھے میری خلوت کے حجرے میں ہی چھوڑ دیا جائے۔ لیکن بار بار حکم ہوا کہ اس سے نکلو اور دین کا کام جو اس وقت سخت مصیبت کی حالت میں تھا، اس کو سنوارو۔ انبیاء کی طبیعت اسی طرح واقع ہوتی ہے کہ وہ شہرت کی خواہش نہیں کیا کرتے کسی نبی نے کبھی شہرت کی خواہش نہیں کی۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خلوت اور تنہائی کو ہی پسند کرتے تھے۔ آپ عبادت کرنے کے لیے لوگوں سے دُور تنہائی کی غار میں جو غارِ حرا تھی چلے جاتے تھے۔ یہ غار اس قدر خوفناک تھی کہ کوئی انسان اس میں جانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اس کو اس لیے پسند کیا ہوا تھا کہ وہاں کوئی ڈر کے مارے بھی نہ پہنچے گا۔ آپ بالکل تنہائی چاہتے تھے۔ شہرت کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ کا حکم ہوا۔ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (المدثر: ۲-۳) اس حکم میں ایک جبر معلوم ہوتا ہے اور اسی لیے جبر سے حکم دیا گیا کہ آپ تنہائی کو جو آپ کو بہت پسند تھی اب چھوڑ دیں۔ بعض لوگ بیوقوفی اور حماقت سے یہی خیال کرتے ہیں کہ گویا مَیں شہرت پسند ہوں۔ مَیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ مَیں ہرگز شہرت پسند نہیں۔ خدا تعالیٰ نے جبر سے مجھ کو مامور کیا ہے۔ میرا اس میں قصور کیا ہے اور وہی گواہ ہے کہ مَیں شہرت پسند نہیں ہوں۔ مَیں تو دُنیا سے ہزاروں کوس بھاگتا تھا۔ حاسد لوگوں کی نظر چونکہ زمین اور اس کی اشیاء تک ہی محدود ہوتی ہے اور وُہ دنیا کے کیڑے ہیں اور شہرت پسند ہوتے ہیں۔ ان کو اس خلوت گزینی اور بے تعلقی کی کیفیت ہی معلوم نہیں ہو سکتی۔ ہم تو دنیا کو نہیں چاہتے۔ اگر وہ چاہیں اور اس پر قدرت رکھتے ہیں تو سب دنیا لے جائیں ہمیں ان پر کوئی گلہ نہیں۔ ہمارا ایمان تو ہمارے دل میں ہے نہ دُنیا کے ساتھ۔ ہماری خلوت کی ایک ساعت ایسی قیمتی ہے کہ ساری دنیا اس ایک ساعت پر قربان کرنا چاہیے۔ اس طبیعت اور کیفیت کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا مگر ہم نے خدا تعالیٰ کے امر پر جان و مال و آبرو کو قربان کر دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں تجلّی کرتا ہے تو پھر وہ پوشیدہ نہیں رہتا۔ عاشق اپنے عشق کو خواہ کیسے ہی پوشیدہ کرے، مگر بھید پانے والے اور تاڑنے والے قرائن اور آثار اور حالات سے پہچان ہی جاتے ہیں۔ عاشق پر وحشت کی حالت نازل ہو جاتی ہے۔ اُداسی اُس کے سارے وجود پر چھا جاتی ہے۔ الگ قسم کے خیالات اور حالات اس کے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وہ اگر ہزاروں پردوں میں چھپے اور اپنے آپ کو چھپائے مگر چھپا نہیں رہتا۔ سچ کہا ہے ؎

عشق و مُشک را نتواں نہفتن

جن لوگوں کو محبتِ الٰہی ہوتی ہے وہ اس محبت کو چھپاتے ہیں جس سے اُن کے دل لبریز ہوتے ہیں بلکہ اس کے افشا پر وہ شرمندہ ہوتے ہیں، کیونکہ محبّت اور عشق ایک راز ہے جو خدا اور اس کے بندے کے درمیان ہوتا ہے اور ہمیشہ راز کا فاش ہونا شرمندگی کا موجب ہوتا ہے۔ کوئی رسُول نہیں آیا جس کا راز خدا تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ اسی راز کو چھپانے کی خواہش اس کے اندر ہوتی ہے مگر معشوق خود اس کو فاش کرنے پر جبر کرتا ہے اور جس بات کو وہ نہیں چاہتے وہی اُن کو ملتی ہے جو چاہتے ہیں ان کو ملتا نہیں اور جو نہیں چاہتے وہی ان کو جبراً ملتا ہے۔

جب تک انسان ادنیٰ حالت میں ہوتا ہے اس کے خیالات بھی ادنیٰ ہی ہوتے ہیں اور جس قدر معرفت میں گرا ہوا ہوتا ہے اسی قدر محبّت میں کمی ہوتی ہے۔ معرفت سے حُسنِ ظن پیدا ہوتا ہے۔ ہر شخص میں محبّت اپنے ظن کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ سے یہی تعلیم ملتی ہے۔ صادق عاشق جو ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ پر حُسنِ ظن رکھتا ہے کہ وہ اس کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔ خدا تعالیٰ تو وفاداری کرنا پسند کرتا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان صدق دکھلاوے اور اس پر ظن نیک رکھے کہ تا وہ بھی وفا دکھلائے مگر یہ لوگ کب اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تو اپنی ہوا و ہوس کے بُتوں کے آگے جُھکے رہتے ہیں اور ان کی نظر دُنیا تک ہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کریم و رحیم نہیں سمجھتے۔ اس کے وعدوں پر ذرہ ایمان نہیں رکھتے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان رکھتے کہ وُہ کریم و رحیم ہے تو وہ بھی اُن پر رحمت اور وفا کے ثبوت نازل کرتا۔

گر وزیر از خدا بترسیدے
ہمچناں کز ملک ملک بودے

اللہ تعالیٰ سے بدظنی مت کرو

شر بدظنی سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن شریف کو اوّل سے آخر تک پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بدظنی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ساتھ نہ چھوڑو۔ اسی سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ ہر میدان میں مومن کی مدد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں میدان میں تیرے ساتھ ہوں وہ اس کے لیے ایک فرقان پیدا کر دیتا ہے جو اس کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کرتا وہ بدظنی کرتا ہے جو شخص خدا تعالیٰ سے نیک ظن کرتا ہے وہ اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے بدظنی کرتا ہے، وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے لیے کوئی دُوسرا معبود بنائے اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے جب انسان اس بات کو سمجھتا ہے کہ خدا کریم و رحیم ہے اور اس بات پر ایمان صدق دل سے لاتا ہے کہ اس کے وعدے ٹلنے کے نہیں تو وہ اس پر جان فدا کرتا ہے اور در پردہ خدا تعالیٰ سے

عشق رکھتا ہے۔ ایسا انسان خدا تعالیٰ کا چہرہ اسی دُنیا میں دیکھ لیتا ہے۔ خدا تعالیٰ طرح طرح سے اس کی مدد کرتا ہے اور اپنے انعامات اس پر نازل کرتا ہے اور اس کو تسلّی بخشتا ہے اور محبت اور وفا کا چہرہ دکھاتا ہے لیکن بے وفا غدار ہمیشہ محروم رہتا ہے[1]۔

۲۱؍مئی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

طاعون اور الہام اِنَّهٗ اٰوَى الْقَرْيَةَ

بوقت ایک بجے بمقام کچہری گورداسپور درخت جامن کے نیچے بیٹھے ہوئے حکیم نور محمد صاحب نے ذکر کیا کہ ایک شخص نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آپ لوگ احمدی جماعت کے جو یہ کہتے ہیں کہ طاعون سے ہم بچے رہیں گے اس کی وجہ کیا ہے؟ حکیم صاحب نے اس کے جواب میں جو کچھ اس نے تقریر کی تھی۔ وہ سُنائی۔ پھر اس پر حضرتِ اقدس نے فرمایا کہ:

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا۔ (بنی اسرائیل: ۵۹) یعنی طاعون کا عذاب دو طرح پر ہوگا کوئی بستی اس سے خالی نہیں رہے گی۔ بعض تو ایسی ہوں گی کہ جن کو ہم بالکل ہلاک کر دیں گے یعنی وہ اُجڑ کر بالکل غیر آباد ہو جائیں گی اور ویرانہ اور تھِہ (اُجڑے ہوئے کھنڈرات) ہو جائیں گی۔ اُن کا کوئی نشان بھی نہ رہے گا۔ لوگ تلاش کرتے پھریں گے کہ اس جگہ فلاں بستی آباد تھی۔ لیکن پھر بھی پتہ نہ ملے گا۔ گویا طاعون وہاں جاروب دیکر اس کو دنیا سے صاف کر دے گی اور کوئی آثار اس کے نہ چھوڑے گی۔ بعض قریئے ایسے ہوں گے کہ جن کو کم و بیش عذاب کر کے چھوڑ دیا جاوے گا۔ اور صفحہ دنیا سے اُن کا نام نہ مٹایا جاوے گا۔ صرف سرزنش کے طور پر کچھ عذاب اُن میں نازل کیا جاوے گا اور تازیانہ کر کے عذاب ہٹا لیا جاوے گا۔ دوسرے بہت سے شہر فنا ہوں گے، مگر وہ فنا نہ ہوں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قادیان کو اسی قسم میں شامل کیا ہے اور اس الہام اِنَّهٗ اٰوَى الْقَرْيَةَ سے مُراد یہی ہے کہ اَور بستیوں کی طرح ہمارے گاؤں کو طاعون جارف بالکل تباہ نہ کرے گی کہ لوگ تلاش کرتے پھریں کہ کہاں قادیان واقع تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ ان بستیوں کی طرح خدا اس کو تباہ نہ کرے گا بلکہ یہ بچی رہے گی اِلّا بطور تازیانہ کچھ سزا دے کر اُس کو بچا

---

[1] (از ریویو) البدر جلد ۳ نمبر ۳۲ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۲۴؍اگست ۱۹۰۴ء

لیا جائے گا۔ ہم نے بار بار مجلسوں میں بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ سے یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس قریہ کو پناہ دے دی ہے کہ وہ طاعون جارف سے بچی رہے اور بالکل فنا نہ ہو۔ خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ باوجود گنہگار ہونے کے اللہ تعالیٰ بغیر عذاب کے چھوڑ دے۔ ایک طرف تو قرآن میں یہ لکھا ہے کہ طاعون سے کوئی بستی خالی نہیں رہے گی اور طاعون کی وجہ صرف یہی ہے جو اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد : ۱۲) کے الہام سے ظاہر ہے یعنی جب لوگوں نے اپنے افعال اور اعمال سے غضبِ الٰہی کے جوش کو بھڑکایا اور بدعملیوں سے اپنی حالتوں کو ایسا بدل لیا کہ خوفِ خدا اور تقویٰ و طہارت کی ہر ایک راہ کو چھوڑ دیا اور بجائے اس کے طرح طرح کے فسق و فجور کو اختیار کر لیا اور خدا تعالیٰ پر ایمان سے بالکل ہاتھ دھو دیا۔ دہریت اندھیری رات کی طرح دنیا پر محیط ہو گئی اور اللہ تعالےٰ کے نورانی چہرے کو ظلمت کے نیچے دبا دیا تو خدا تعالیٰ نے اس عذاب کو نازل کیا تا لوگ خدا تعالیٰ کے چہرے کو دیکھ لیں اور اس کی طرف رجوع کریں۔ بعض بستیاں مُہْلِکُوْھَا میں داخل ہو کر بالکل فنا ہو جائیں گی اور بعض مُعَذِّبُوْھَا میں داخل ہوں گی، لیکن خالی کوئی نہ رہے گی۔ قادیان مُہْلِکُوْھَا میں داخل نہ ہو گی۔ یہی مراد الہام اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ سے ہے۔ گناہوں کی سرزنش کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے یہاں بھی طاعون نازل فرمائی۔ خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے لَوْلَا الْاِکْرَامُ لَھَلَکَ الْمَقَامُ۔ یعنی قادیان مُہْلِکُوْھَا میں داخل کر دیا جاتا، لیکن صرف تمہاری تکریم اور تعظیم سے اس کو مُہْلِکُوْھَا میں داخل نہیں کیا گیا۔ جو بچے ہیں اور جو بچیں گے وہ تمہارے اِکرام کی وجہ سے بچیں گے۔ یہ تو قرآن کے بالکل مخالف ہے کہ قادیان عذاب طاعون سے بالکل محفوظ رہے۔ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد : ۱۲) دوسری طرف اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ کے اگر یہ معنے ہوں کہ قادیان بالکل بچ گئی تو ان دونوں کے درمیان تضاد واقع ہوتا ہے۔ دو ضدین جمع نہیں ہو سکتیں۔ ہم نے کبھی اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ کے یہ معنی نہیں سمجھے۔ طاعون تو دنیا کی ہر ایک بستی میں آئے گی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جہاں کسی نے دعویٰ کیا کہ فلاں مقام میں طاعون نہیں تو اسی جگہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ دہلی والوں نے بڑے زور سے لکھا تھا کہ دو وجوہ سے وہاں طاعون نہیں آتی اور نہ آئے گی۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہاں کے لوگ بہت صفائی رکھتے ہیں۔ دوسرے مچھروں کا وہاں نہ ہونا۔ اب گزٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی طاعون آگئی۔ لاہور کی نسبت کہا جاتا تھا کہ اس کی سرزمین میں ایسے اجزاء ہیں کہ اس میں طاعونی کیڑے زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن وہاں بھی طاعون نے آن ڈیرا ڈالا ہے۔ ابھی لوگوں کو معلوم نہیں ہے لیکن سالہا سال کے بعد لوگ دیکھیں گے کہ کیا ہو گا۔ کئی لوگ اور دیہات بھی بالکل تباہ ہو جائیں گے۔

دُنیا سے ان کا نام و نشان مٹ جاتے گا اور اُن کے آثار تک باقی نہ رہیں گے، لیکن یہ حالت کبھی قادیان پر وارد نہ ہوگی۔ یہ ایک لمبی بیماری ہے عمروں تک چلی جاتی ہے۔ بڑے بڑے قطعے اس نے برباد کر کے جنگل کر دیئے شہروں کے شہر ویرانے بنا دیئے۔ سینکڑوں کوس ایسے غیر آباد کئے کہ جانور بھی زندہ نہ رہے۔ اس کے آگے تو بڑے بڑے شہر بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ بڑے سے بڑے آباد شہر کو بھی اگر چاہے تو دو تین دن میں صاف کر سکتی ہے[1]۔

---

۳۱ ؍ مئی ۱۹۰۴ء

تقریر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام

بمقام گورداسپور۔ بحاضری مولوی الٰہی بخش صاحب آمدہ از بنارس

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مامور آتا ہے تو لوگ عموماً اس کی طرف سے بے پرواہی کرتے ہیں اور اکابر اور علماء کو خصوصیت سے اس کی طرف توجہ کرنا عیب سمجھتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ غنی ہے اور مُرسل اور مامور چونکہ ایک خدمت پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مقرر ہوتے ہیں۔ وہ بھی بے پروا ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو دُنیا کا محتاج نہیں سمجھتے بلکہ جیسے وہ ذاتِ الٰہی کا مظہر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اسی ذات سے غنا کا حصہ بھی لیتے ہیں۔ ہر ایک شخص جو مامور بن کر دُنیا میں خُدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اس کو ایک خاص قسم کی ہمت اور حوصلہ عطا کیا جاتا ہے۔ اور عزم میں ایک بے روک حزم اور استقلال عطا کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ بڑا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے کسی پر اثر نہیں ڈال سکتے۔ انسان تو ایک انسان پر اثر نہیں ڈال سکتا۔

یہ محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ ہزارہا بلکہ لاکھوں آدمیوں کو کھینچے لیے آتا ہے۔ یہاں کسی بناوٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ چوبیس برس سے زیادہ ہوتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے مجھے الہام کیا تھا کہ یَنْصُرُكَ رِجَالٌ نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ۔ یَاْتِیْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ یَاْتُوْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ وَلَا تُصَعِّرْ لِخَلْقِ اللّٰہِ

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ صفحہ ۲ ؍ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء
الحکم جلد ۸ نمبر ۲۳، ۲۴ صفحہ ۱۱، ۱۲ ؍ مورخہ ۱۷، ۲۴ جولائی ۱۹۰۴ء

وَلَا تَسْئَمْ مِنَ النَّاسِ۔ یعنی ہم لوگوں کے دل میں وحی کریں گے اور وہ تیری مدد کریں گے بڑے بڑے دُور دراز راہوں سے تیرے پاس لوگ آئیں گے تم خلق کے ہجوم سے جو تیرے گرد جمع ہوگی۔ تنگ مت آنا اور لوگوں سے تھکنا مت۔ یہ ایسے وقت کی باتیں ہیں جب مَیں بالکل گمنام تھا۔ اور کوئی آدمی میرے ساتھ نہ تھا۔ میرے گاؤں سے باہر کوئی بھی مجھے جانتا نہ تھا اور کوئی انسان اس بات پر یقین نہیں لاسکتا تھا کہ ایسی کشش لوگوں کو ہوگی کہ وہ قادیان جیسی گمنام بستی میں دور دراز سے کھنچے چلے آئیں گے سو ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے کلمات کس طرح صفائی سے پورے ہو رہے ہیں۔ ایسے ایسے علاقوں سے لوگ آتے ہیں کہ جہاں ہمارے وہم و گمان میں بھی ہماری تبلیغ کا نام و نشان نہیں ہوتا اور اس عقیدت اور اخلاص سے آتے ہیں کہ ہم کو اُن کے اخلاص و عقیدت پر رشک آتا ہے۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ کو فرمایا ہوا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَانْتَھٰی اَمْرُ الزَّمَانِ اِلَیْنَا۔ اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ۔ یعنی عنقریب ایک زمانہ آنیوالا ہے کہ تجھے اللہ تعالیٰ نصرت اور فتح دیگا اور ہماری طرف زمانہ کا امر انتہا پادے گا تو اس وقت کہا جاوے گا کیا یہ سچ نہیں؟ یعنی اس سلسلہ کی صداقت پر زمانہ گواہی دے اُٹھے گا۔ ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ لوگ تیری ترقی کے روکنے کی کوشش کریں گے لیکن ہم تیری مدد کریں گے اور دشمن تیری راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں گے مگر ہم اُن کو دُور کریں گے اور وہ تیرے نابود کرنے کے منصوبے کریں گے۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ چوبیس برس کی پیشگوئیاں پوری ہو رہی ہیں۔ ہر ایک شخص جو ہمارے پاس آتا ہے وہ اس پیشگوئی کو پورا کرتا ہے۔

ہمارا سارا دارومدار دُعا پر ہے

ہمارا تو سارا دارومدار ہی دُعا پر ہے۔ دُعا ہی ایک ہتھیار ہے جس سے مومن ہر کام میں فتح پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومن کو دُعا کرنے کی تاکید فرمائی ہے بلکہ وہ دُعا کا منتظر رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو خاص فضل سے قبول فرماتا ہے۔ دُعا سے انسان ہر ایک بلا اور مرض سے بچ جاتا ہے۔ ہم نے ایک دفعہ ایک اخبار پڑھا تھا کہ ایک تھانیدار کے ناخن میں پنسل کا ایک ٹکڑا کسی طرح سے چُبھ گیا پنسل میں کچھ زہر بھی ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس کے ہاتھ میں وَرم ہونا شروع ہوگیا۔ بڑھتے بڑھتے وَرم اس قدر بڑھ گیا کہ کہنی تک جا پہنچا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سہ چند بوجھ ہوگیا۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا — ڈاکٹر نے کہا کہ اس بازو میں زہر اثر کر گیا ہے۔ تم اگر اس کو کٹانے پر راضی ہو تو جان بچ جائے گی، ورنہ نہیں۔ وہ تھانیدار کٹانے پر راضی نہ ہوا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں وہ مرگیا۔ ہمارے بھی ایک دفعہ اسی طرح ناخن میں پنسل لگ گئی۔ ہم سیر کرنے گئے تو دیکھا کہ ہمارے ہاتھ میں بھی وَرم ہونا شروع ہو

گیا ہے۔ تو ہمیں وہ قصّہ یاد آگیا۔ میں نے اسی جگہ سے دعا شروع کر دی۔ گھر پہنچنے تک برابر دُعا ہی کرتا رہا تو دیکھتا کیا ہوں کہ جب میں گھر پہنچا تو وَرم کا نام و نشان تک بھی نہ تھا۔ پھر میں نے لوگوں کو دکھایا اور سارا قصّہ بیان کیا۔

اسی طرح ایک دفعہ میرے دانت کو سخت درد شروع ہوگیا۔ میں نے لوگوں سے ذکر کیا تو اکثر نے صلاح دی کہ اس کو نکلوا دینا بہتر ہے۔ میں نے نکلوانا پسند نہ کیا اور دُعا کی طرف رجوع کیا تو الہام ہوا وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِی۔ اس کے ساتھ ہی مرض کو بالکل آرام ہوگیا۔ اس بات کو قریبًا پندرہ سال ہو گئے ہیں۔

خدا تعالیٰ صالحین کا متولی ہوتا ہے

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے ایمان کے موافق اسباب سے نفرت ہو جاتی ہے۔ جس قدر ایمان کامل ہوتا ہے۔ اسی قدر اسباب سے نفرت ہوتی جاتی ہے۔ حقیقت میں دیکھا گیا ہے کہ دنیا بڑے دھوکے میں پڑی ہوئی ہے۔ جن باتوں کو اپنی ترقی کے ذرائع سمجھی بیٹھی ہے۔ اصل میں وہی ذلّت کا موجب ہوتی ہے۔ دنیاوی عزّت بڑھانے اور عروج و مالداری حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے فریبُ دجل اور دھوکے استعمال کرتے ہیں اور طرح طرح کی بے ایمانیوں سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اِنہیں مکاریوں کو اپنی مرادوں کا ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں۔ یہانتک کہ بڑے فخر سے اپنی کامیابیوں کا دوستوں میں ذکر کرتے ہیں اور اپنی اولاد کو بھی یہی تعلیم دیتے ہیں لیکن اگر نظرِ انصاف و معرفت سے دیکھا جاوے تو انکے یہ طریق کوئی راحت نہیں بخشتے۔ جب پُوچھو تو شاکی اور نالاں ہی نظر آتے ہیں اور کبھی راحت اور طمانیت اُن کے حال سے ظاہر نہیں ہوتی۔ طمانیت کی رَویت بجُز فضل خدا کے نہیں ہوئی۔ جب تک انسان اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان نہیں رکھتا اور اس کے وعدوں پر سچا یقین نہیں کرتا اور ہر ایک مقصود کا دینے والا اسی کو نہیں سمجھتا اور کامل اصلاح اور تقویٰ اختیار نہیں کرلیتا تو اس وقت تک وہ حقیقی راحت دستیاب نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ (الاعراف : ۱۹۷) یعنی جو صلاحیت اختیار کرتے ہیں خدا تعالیٰ اُن کا متولی ہو جاتا ہے۔ انسان جو متولّی رکھتا ہے اس کے بہت بوجھ کم ہو جاتے ہیں۔ بہت ساری ذمّہ واریاں گھٹ جاتی ہیں۔ بچپن میں ماں بچّے کی متولّی ہوتی ہے، تو بچے کو کوئی فکر اپنی ضروریات کا نہیں رہتا۔ وہ خود ہی اس کی ضروریات کی کفیل ہوتی ہے۔ اس کے کپڑوں اور کھانے پینے کے خود ہی فکر میں لگی رہتی ہے۔ اس کی صحت قائم رکھنے کا دھیان اسی کو رہتا ہے۔ اس کو نہلاتی اور دھلاتی ہے اور کھلاتی اور پلاتی ہے۔ یہانتک کہ بعض وقت اس کو مار کر کھانا کھلاتی ہے اور پانی پلاتی اور کپڑا پہناتی

ہے۔ بچہ اپنی ضرورتوں کو نہیں سمجھتا بلکہ ماں ہی اس کی ضرورتوں کو خوب سمجھتی اور اُن کو پُورا کرنے کے خیال میں لگی رہتی ہے۔ اسی طرح جب ماں کی تولیت سے نکل آئے تو انسان کو بالطبع ایک متولّی کی ضرورت پڑتی ہے۔ طرح طرح سے اپنے متولّی اَور لوگوں کو بناتا ہے جو خود کمزور ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات میں غلطاں ایسے ہوتے ہیں کہ دُوسرے کی خبر نہیں لے سکتے۔ لیکن جو لوگ ان سب سے منقطع ہو کر اس قسم کا تقویٰ اور اصلاح اختیار کرتے ہیں ان کا وہ خود متولّی ہو جاتا ہے اور ان کی ضروریات اور حاجات کا خود ہی کفیل ہو جاتا ہے۔ انہیں کسی بناوٹ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ اس کی ضروریات کو ایسے طور سے سمجھتا ہے کہ یہ خود بھی اس طرح نہیں سمجھ سکتا اور اس پر اس طرح فضل کرتا ہے کہ انسان خود حیران رہتا ہے۔ گرنہ ستانی بہ ستم مے رسد۔ والی نوبت ہوتی ہے۔ لیکن انسان بہت سے زمانے پالیتا ہے۔ جب اس پر ایسا زمانہ آتا ہے کہ خدا اس کا متولّی ہو جائے یعنی اس کو خدا تعالیٰ کی تولیت حاصل کرنے سے پہلے کئی متولیوں کی تولیت سے گذرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۪ۙ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ (النّاس: ۲تا۷)

پہلے حاجت ماں باپ کی پڑتی ہے۔ پھر جب بڑا ہوتا ہے تو بادشاہوں اور حاکموں کی حاجت پڑتی ہر پھر جب اس سے آگے قدم بڑھاتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جن کو مَیں نے متولّی سمجھا ہوا تھا وہ خود ایسے کمزور تھے کہ ان کو متولّی سمجھنا میری غلطی تھی کیونکہ انہیں متولّی بنانے میں نہ تو میری ضروریات ہی حاصل ہو سکتی تھیں اور نہ ہی وہ میرے لیے کافی ہو سکتے تھے۔ پھر وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجُوع کرتا ہے اور ثابت قدمی دکھانے سے خدا تعالیٰ کو اپنا متولّی پاتا ہے۔ اس وقت اس کو بڑی راحت حاصل ہوتی ہے اور ایک عجیب طمانیت کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب خدا کسی کو خود کہے کہ مَیں تیرا متولّی ہوا تو اس وقت جو راحت اور طمانیت اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایسی حالت پیدا کرتی ہے کہ جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حالت تمام تلخیوں سے پاک ہوتی ہے۔ دنیاوی حالتوں میں انسان تلخی سے خالی نہیں ہو سکتا۔ دشتِ دنیا کانٹوں اور تلخیوں سے بھری ہوئی ہے ؎

دشتِ دُنیا جز در و جز دام نیست
جز بخلوت گاہِ آرام نیست

جن کا اللہ تعالیٰ متولّی ہو جاتا ہے۔ وُہ دُنیا کے آلام سے نجات پا جاتے ہیں اور ایک سچّی راحت اور طمانیت کی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۳و۴) جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے

اس کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر ایک بلا اور الم سے نکال لیتا ہے اور اس کے رزق کا خود کفیل ہو جاتا ہے اور ایسے طریق سے دیتا ہے کہ جو وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔

دُنیا میں کئی قسم کے جرائم ہوتے ہیں بعض جرائم قانون کی حد میں آسکتے ہیں اور بعض قانون کی حد میں بھی نہیں آسکتے. گناہ، خون اور نقب زنی وغیرہ جب کرتا ہے تو اُن کی سزا قانون سے پاسکتا ہے۔ لیکن جھوٹ وغیرہ جو معمولی طور پر بولتا ہے یا بعض حقوق کی رعایت نہیں رکھتا وغیرہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے لیے قانون تدارک نہیں کرتا. لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور اس کو راضی کرنے کے لیے جو شخص ہر ایک بدی سے بچتا ہے اس کو متقی کہتے ہیں یہ وہی متقی ہے جسکی آج عدالت میں بحث تھی۔ ایک مولوی عدالت میں از طرف کرم دین مستغیث گواہ تھا اور اس پر جرح تھی۔ اثنائے جرح میں اس نے بحلف بیان کیا کہ ایک شخص زنا بھی کرے، جھوٹ بولے یا خیانت کرے۔ دغا دے۔ فریب کرے۔ وغیرہ وغیرہ تو پھر بھی وہ متقی ہی رہتا ہے۔ اللہ تعالےٰ تو متقی کے لیے وعدہ کرتا ہے کہ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (الطلاق : ۳) یعنی جو اللہ تعالیٰ کے لیے تقویٰ اختیار کرتا ہے تو ہر مشکل سے اللہ تعالیٰ اس کو رہائی دے دیتا ہے۔ لوگوں نے تقویٰ کے چھوڑنے کے لیے طرح طرح کے بہانے بنا رکھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جھوٹ بولے بغیر ہمارے کاروبار نہیں چل سکتے اور دوسرے لوگوں پر الزام لگاتے ہیں کہ اگر سچ کہا جائے تو وہ لوگ ہم پر اعتبار نہیں کرتے۔ پھر بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ سود لینے کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ کیونکر متقی کہلا سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ تو وعدہ کرتا ہے کہ مَیں متقی کو ہر ایک مشکل سے نکالوں گا۔ اور ایسے طور سے رزق دُوں گا جو گمان اور وہم میں بھی نہ آسکے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے جو لوگ ہماری کتاب پر عمل کریں گے ان کو ہر طرف سے اُوپر سے اور نیچے سے رزق دُوں گا۔ پھر فرمایا ہے کہ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ۔ (الذّٰریٰت : ۲۳) جس کا مطلب یہی ہے کہ رزق تمہارا تمہاری اپنی محنتوں اور کوششوں اور منصوبوں سے وابستہ نہیں۔ وہ اس سے بالاتر ہے۔ یہ لوگ ان وعدوں سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ جو شخص تقویٰ اختیار نہیں کرتا وہ معاصی میں غرق رہتا ہے اور بہت ساری رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ لکھا ہے کہ ایک ولی اللہ کسی شہر میں رہتے تھے ان کی ہمسائگت میں ایک دنیا دار بھی رہتا تھا۔ ولی ہر روز تہجد پڑھا کرتا تھا۔ ایک دفعہ دنیا دار کے دل میں خیال آیا کہ یہ شخص جو ہر روز تہجد پڑھا کرتا ہے مَیں بھی تہجد پڑھوں۔ غرض یہی ارادہ مصمم کر کے وہ ایک رات اُٹھا اور تہجد کی نماز پڑھی۔ اس کو تہجد پڑھنے سے اس قدر تکلیف ہوئی کہ کمر میں درد شروع ہو گیا۔ اس ولی اللہ کو خبر ملی کہ رات اُن کے دُنیا دار ہمسایہ نے تہجد کی نماز پڑھی تھی تو اس کے سبب سے اس کے کمر میں درد ہونے لگا ہے۔ وہ عیادت کے لیے آیا اور اُس سے حال پوچھا۔

دُنیادار نے کہا کہ میں آپ کو دیکھا کرتا تھا کہ آپ ہر رات تہجد پڑھتے ہیں۔ میرے خیال میں بھی آیا کہ میں بھی تہجد پڑھوں۔ سو آج رات میں تہجد پڑھنے اُٹھا اور یہ مصیبت مجھ پر آگئی۔ اس نے جواب میں کہا کہ تجھے اس فضول سے کیا؟ پہلے چاہیے تھا کہ تو اپنے آپ کو صاف کرتا اور پھر تہجد کا ارادہ کرتا۔ اللہ تعالےٰ کی اجابت بھی متقین کے لیے ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (المائدة : ۲۸) درحقیقت جب تک انسان تقویٰ اختیار نہ کرے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجُوع نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں بے نظیر صفات ہیں۔ جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں انہیں کو اس سے اطلاع ملتی ہے اور وہی اس سے مزہ پاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے رشتہ میں اس قدر شیرینی اور لذت ہوتی ہے کہ کوئی پھل ایسا شیریں نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ سے جلدی کوئی شخص خبرگیراں نہیں ہوسکتا۔ پھر جس کا خدا متولی ہو جاتا ہے، اس کو کئی فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو وُہ طمانیت کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ راحت پاتا ہے جو کسی دُنیا دار کو نصیب ہونا ناممکن ہے اور ایسی لذت پاتا ہے جو کہیں دُوسری جگہ نصیب نہیں ہوسکتی۔ اور اس کا متولی ایسا زبردست ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک مشکل سے بہت جلدی نکالتا اور خبرگیری کرتا ہے۔ یہ لوگ بالکل بے ہودہ جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ جھوٹی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ نماز اگر پڑھتے ہیں تو ریا کیلئے پڑھتے ہیں۔ وہ نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلائی تھی وہ نہیں پڑھتے۔ یہ وُہ نماز ہے جس کے پڑھنے سے انسان ابدال میں داخل ہو جاتا ہے۔ گناہ اس کے دُور ہو جاتے ہیں۔ دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ انسان خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ (العنکبوت : ۳) لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف منہ سے کہہ دینا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، کافی ہے۔ اور کوئی امتحانی مشکل پیش نہ آئے گی۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن پر ابتلا بھیج کر امتحان کرتا ہے۔ تمام راستبازوں سے خدا تعالیٰ کی یہی سنت ہے وہ مصائب اور شدائد میں ضرور ڈالے جاتے ہیں۔

اِنقطاع الی اللہ

مصائب بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ مصائب ہیں جو زیرِ سایہ شریعت ہوتے ہیں۔ انسان احکام کی تعمیل کے لیے انقطاع حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس طرف ہر ایک دنیاوی تعلق میں جو کشش ہے وہ اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بیوی، بچے، دوست دُنیاداری کی رُسوم کے تعلقات چاہتے ہیں کہ ہماری کشش اس پر ایسی ہو کہ وہ ہماری طرف کھنچا چلا آوے اور ہم میں ہی محو رہے۔ تعمیلِ احکام کی کشش ان سے انقطاع کا تقاضا کرتی ہے۔ ان سب کا چھوڑنا ایک موت کا سامنا ہوتا ہے۔

ہمارا یہ مطلب تو نہیں کہ ان سب کو اس طرح چھوڑے کہ ان سے کوئی تعلق ہی نہ رکھے۔ ایک طرف بیوی بیواؤں کی طرح ہو جائے اور بچے یتیموں کی طرح ہو جائیں۔ قطع رحم ہو جاتے بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ بیوی بچوں کا پورا تعہد کرے۔ اُن کی پرورش پُورے طور سے کرے اور حقوق ادا کرے صلہ رحم کرے لیکن دل اُن میں اور اسبابِ دُنیا میں نہ لگا دے۔ دل با یار دست بکار رہے؛ اگرچہ یہ بات بہت نازک ہے مگر یہی سچا انقطاع ہے جس کی مومن کو ضرورت ہے۔ وقت پر خدا تعالیٰ کی طرف ایسا آجا دے کہ گویا وہ ان سے کورا ہی تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ صاحب نے ایک دفعہ سوال کیا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ہاں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس پر بڑا تعجب کیا اور کہا کہ ایک دل میں دو محبتیں کس طرح جمع ہو سکتی ہیں۔ پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے کہا کہ وقت مقابلہ پر آپ کس سے محبت کریں گے۔ فرمایا اللہ سے۔ غرض انقطاع اُن کے دلوں میں مخفی ہوتا ہے اور وقت پر ان کی محبت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے رہ جاتی ہے۔ مولوی عبداللطیف صاحب نے عجیب نمونہ انقطاع کا دکھلایا۔ جب اُنہیں گرفتار کرنے آئے تو لوگوں نے کہا کہ آپ گھر سے ہو آویں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا اُن سے کیا تعلق ہے۔ خدا تعالیٰ سے میرا تعلق ہے سو اُس کا حکم آن پہنچا ہے۔ مَیں جاتا ہوں۔ ہر چیز کی اصلیت امتحان کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ اصحاب رسُول اللہ سب کچھ رکھتے تھے۔ زن و فرزند اور اموال و اقارب سب کچھ اُن کے موجود تھے۔ عزتیں اور کاروبار بھی رکھتے تھے، مگر اُنہوں نے اس طرح شہادت کو قبول کیا کہ گویا شیریں پھل انہیں میسر آگیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے موت کو پسند کرتے۔ ایک طرف تعہد حقوقِ عیال و اطفال میں کمال دکھایا اور دُوسری طرف ایسا انقطاع کہ گویا وہ بالکل کورے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے لیے موت کو پسند کرتے کبھی نامردی نہ دکھاتے بلکہ آگے ہی قدم رکھتے۔ ایسی محبت سے وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جان دیتے تھے کہ بیوی بچوں کو بلا جیسی سمجھتے تھے۔ اگر بیوی بچے مزاحم ہوں تو اُن کو دشمن سمجھتے تھے اور یہی معنے انقطاع کے ہیں۔ آجکل کے رُہبانوں کی طرح نہیں کہ بالکل بیوی بچے سے تعلق چھوڑ دے اور سارے جہان سے ایک طرف ہو جاتے۔ آسمان پر رہبانیت کے انقطاع کی کچھ قدر نہیں۔ صوفی منقطعین بھی نمونے دکھاتے رہے ہیں کہ با زن و فرزند اور با خدا رہے ہیں۔ پھر جب وقت آیا تو زن و فرزند کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گئے۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف منقطع ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حال دیکھئے کیا انقطاع کا نمونہ ان سے ظاہر ہوا۔ جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ضائع کرنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرتا اور اس کا نشان دنیا سے معدوم نہیں کرتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ایسا اخلاص ظاہر کریں اور اس قدر کوشش کریں کہ

اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو جائے۔ دوست دوست سے راضی نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے وفاداری ظاہر اور ثابت نہ ہو۔ کسی کے دو خدمتگار ہوں۔ ایک وفادار اور مخلص ثابت ہو اور اپنے فرائض کو نہ رسم و رواج اور دباؤ سے بلکہ پوری محبت اور اخلاص سے ادا کرے اور دُوسرا ایسا ہو جو بے دلی اور رسمی طور پر کچھ کام کرے تو اُن میں سے مالک اسی پہلے پر راضی ہوگا اور اسی کی باتوں کو سنے گا اور اسی پر اعتبار کرے گا اور وفادار ہی کو پیار کرے گا۔

فیج اعوج کے زمانہ میں تعصب بڑھ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَنْ عَادَا وَلِیًّا لِّیْ فَعَادَانِیْ۔ ان لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ ان کے تعصب نے ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل دُور کر دیا ہے۔ ایک زمانہ آنیوالا ہے کہ جس قدر رسم لوگ ہیں وہ سب نہ ہوں گے۔ رسمی نمازوں سے خدا تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔ دُنیا کے دوست بھی صرف الفاظ سے نہیں بنتے۔ اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام کا لفظ ہی مُسلمان بناتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وفاداری اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا اور حکموں پر گردن جھکائی جاوے۔ یہ لقب کسی اَور ملّت کو نہیں دیا گیا۔ اس اُمّت پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ اسلام جس بات کو چاہتا ہے وُہ اسی جگہ سے اسلام کے ذریعہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ (الرحمٰن: ۴۷) خدا کے دیدار کے واسطے اسی جگہ سے حواس ملتے ہیں۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (بنی اسرائیل: ۷۳) جو یہاں خدا نہیں دیکھتا وہ وہاں بھی نہیں دیکھ سکے گا۔[1]

یکم جون ۱۹۰۴ء (قبل از شام)

دُعا دُعا کی مثال ایک چشمۂ شیریں کی طرح ہے جس پر مومن بیٹھا ہوا ہے۔ وہ جب چاہے اس چشمہ سے اپنے آپ کو سیراب کر سکتا ہے۔ جس طرح ایک مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح مومن کا پانی دُعا ہے کہ جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس دُعا کا ٹھیک محل نماز ہے جس میں وہ راحت اور سرور مومن کو ملتا ہے کہ جس کے مقابل ایک عیاش کا کامل درجہ کا سرور جو اُسے کسی بدمعاشی میں میسر آسکتا ہے۔ یہ ہیچ ہے۔ بڑی بات جو دُعا میں حاصل ہوتی ہے وُہ قربِ الٰہی ہے۔ دُعا کے ذریعہ ہی انسان خدا تعالیٰ کے نزدیک ہو جاتا اور اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جب مومن کی دُعا میں پُورا

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ صفحہ ۳ تا ۶ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء

اخلاص اور انقطاع پیدا ہو جاتا ہے۔ تو خدا کو بھی اس پر رحم آجاتا ہے اور اس کا متوّلی ہو جاتا ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی پر غور کرے تو الٰہی تولّی کے بغیر انسانی زندگی قطعاً تلخ ہو جاتی ہے۔ دیکھ لیجیے جب انسان حدِ بلوغت کو پہنچتا ہے اور اپنے نفع نقصان کو سمجھنے لگتا ہے تو نامرادیوں ناکامیابیوں اور قسما قسم کے مصائب کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وُہ اُن سے بچنے کیلئے طرح طرح کی کوششیں کرتا ہے۔ دولت کے ذریعہ اپنے تعلق حکام کے ذریعہ، قسما قسم کے حیلہ و فریب کے ذریعہ وہ بچاؤ کے راہ نکالتا ہے، لیکن مشکل ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو۔ بعض وقت اس کی تلخ کامیوں کا انجام خودکشی ہو جاتی ہے۔ اب اگر ان دنیا داروں کے غموم و ہموم اور تکالیف کا مقابلہ اہل اللہ یا انبیاء کے مصائب کے ساتھ کیا جاوے تو انبیاء علیہم السلام کے مصائب بمقابل اوّل الذکر جماعت کے مصائب بالکل ہیچ ہیں لیکن یہ مصائب و شدائد اس پاک گروہ کو رنجیدہ یا محزون نہیں کر سکتے۔ اُن کی خوشحالی اور سُرور میں فرق نہیں آتا۔ کیونکہ وُہ اپنی دعاؤں کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی تولّی میں پھر رہے ہیں۔

استقامت ایک معجزہ ہے

دیکھو اگر ایک شخص کا ایک حاکم سے تعلق ہو اور مثلاً اس حاکم نے اسے اطمینان بھی دیا ہو کہ وُہ اپنے مصائب کے وقت اس سے استعانت کر سکتا ہے تو ایسا شخص کسی ایسی تکلیف کے وقت جس کی گرہ کشائی اس حاکم کے ہاتھ میں ہے، عام لوگوں کے مقابل کم درجہ رنجیدہ اور غمناک ہوتا ہے تو پھر وہ مومن جس کا اس قسم کا بلکہ اس سے بھی زیادہ مضبوط تعلق احکم الحاکمین سے ہو۔ وُہ کب مصائب و شدائد کے وقت گھبرا اُٹھے گا۔ انبیاء علیہم السلام پر جو مصیبتیں آتی ہیں اگر ان کا عشر عشیر بھی ان کے غیر پر وارد ہو تو اس میں زندگی کی طاقت باقی نہ رہے۔ یہ لوگ جب دُنیا میں بغرضِ اصلاح آتے ہیں تو اُن کی کُل دنیا دشمن ہو جاتی ہے۔ لاکھوں آدمی اُن کے خُون کے پیاسے ہوتے ہیں لیکن یہ خطرناک دشمن بھی اُن کے اطمینان میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک شخص کا ایک دشمن بھی ہو تو وُہ کسی لمحہ بھی اس کے شر سے امن میں نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ مُلک کا مُلک اُن کا دشمن ہو اور پھر یہ لوگ باامن زندگی بسر کریں۔ ان تمام تلخ کامیوں کو ٹھنڈے دل سے برداشت کریں۔ یہ برداشت ہی معجزہ و کرامت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت اُن کے لاکھوں معجزوں سے بڑھ کر ایک معجزہ ہے۔ کُل قوم کا ایک طرف ہونا۔ دولت، سلطنت، دنیوی وجاہت، حسینہ جمیلہ بیویاں وغیرہ سب کچھ کے لالچ قوم کا اس شرط پر دینا کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے رُک جاویں لیکن ان سب کے مقابل جناب رسالتمآب کا قبول کرنا اور فرمانا کہ میں اگر اپنے نفس سے کرتا تو یہ سب باتیں قبول کرتا۔ میں تو حکمِ خدا کے ماتحت یہ سب کچھ کر رہا ہوں اور پھر دُوسری طرف سب تکالیف کی برداشت کرنا یہ ایک فوق الطاقت معجزہ ہے۔ یہ سب طاقت اور برداشت اُس دُعا کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جو مومن کو خدا تعالیٰ نے عطا کی ہے۔

ان لوگوں کی دردناک دُعا بعض وقت قاتلوں کے سفاکانہ حملہ کو توڑ دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لیے جانا آپ لوگوں نے سُنا ہوگا۔ ابوجہل نے ایک قسم کا اشتہار قوم میں دے رکھا تھا کہ جو جناب رسالتمآب کو قتل کرے گا وہ بہت کچھ انعام واکرام کا مستحق ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے مشرف باسلام ہونے سے پہلے ابوجہل سے معاہدہ کیا اور قتل حضرت کے لیے آمادہ ہوگیا۔ اس کو کسی عمدہ وقت کی تلاش تھی۔ دریافت پر اُسے معلوم ہوا کہ حضرت نصف شب کے وقت خانہ کعبہ میں بغرض نماز آتے ہیں۔ یہ وقت عمدہ سمجھ کر حضرت عمرؓ سرِشام خانہ کعبہ میں جا چھُپے۔ آدھی رات کے وقت جنگل میں سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی آواز آنا شروع ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گریں تو اس وقت قتل کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درد کے ساتھ مناجات شروع کی اور سجدہ میں اس طرح حمدِ الٰہی کا ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ کا دل پسیج گیا۔ اس کی ساری جرأت جاتی رہی اور اس کا قاتلانہ ہاتھ سُست ہوگیا۔ نماز ختم کرکے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر کو چلے تو اُن کے پیچھے حضرت عمرؓ ہوگئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آہٹ پاکر دریافت کیا اور معلوم ہونے پر فرمایا کہ اے عمرؓ کیا تو میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ حضرت عمرؓ بددُعا کے ڈر سے بول اُٹھے کہ حضرتؐ میں نے آپ کے قتل کا ارادہ چھوڑ دیا۔ میرے حق میں بددُعا نہ کیجئے گا؛ چنانچہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ وہ پہلی رات تھی جب مجھ میں اسلام کی محبت پیدا ہوئی۔

سو میرے نزدیک شق القمر کا معجزہ ایسا زبردست معجزہ نہیں جیسے رسُول پاکؐ کی استقامت ایک معجزہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ضرورتِ وقت کے لحاظ سے انبیاء علیہم السّلام معجزہ دکھلاتے ہیں اور وُہ نُور و ہدایت اپنے اندر رکھتے ہیں لیکن ان سب معجزات سے بڑھ کر استقامت ایک معجزہ ہے۔ آج چوبیس سال مجھ پر گذر گئے جب میں نے دعویٰ وحی والہام کیا۔ جو لوگ میرے پاس دن رات بیٹھتے ہیں وُہ دیکھتے ہیں اور گواہ اس بات کے ہیں کہ کس طرح خدا تعالیٰ ہر روز مجھے اپنے کلام سے مشرف کرتا ہے اور کس طرح جو مجھ پر ظاہر کیا جاتا ہے وُہ پُورا ہوتا ہے۔ اب کیا میں ہر روز افترا کرتا ہوں؟ اور خدا تعالیٰ بھی اس قدر صابر ہے کہ ایسے مفتری کو مہلت دے رہا ہے۔ پیغمبر صاحب کو تو یہ حکم کہ اگر تُو ایک افترا مجھ پر باندھتا تو میں تیری رگِ گردن کاٹ دیتا جیسے کہ آیت لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (الحاقّة ۴۵ تا ۴۷) سے ظاہر ہوتا ہے اور یہاں چوبیس سال سے روزانہ افترا خدا تعالیٰ پر ہو اور خدا اپنی سنّتِ قدیمہ کو نہ برتے۔ بدی کرنے میں اور جھوٹ بولنے میں کبھی مداومت اور استقامت نہیں ہوتی۔ آخرکار انسان دروغ کو چھوڑ ہی دیتا ہے۔

لیکن کیا میری ہی فطرت ایسی ہو رہی ہے کہ مَیں چوبیس سال سے اس جھوٹ پر قائم ہوں اور برابر چل رہا ہوں اور خدا تعالیٰ بھی بالمقابل خاموش ہے اور بالمقابل ہمیشہ تائیدات پر تائیدات کر رہا ہے۔ پیشگوئی کرنا یا علم غیب سے حصّہ پانا کسی ایک معمولی ولی کا بھی کام نہیں۔ یہ نعمت تو اس کو عطا ہوتی ہے جو حضرتِ احدیت آب میں خاص عزّت اور وجاہت رکھتا ہے۔ اب دیکھ لیا جاوے کہ خدا تعالیٰ نے کس قدر پیشگوئیاں میرے ہاتھ پر پُوری کیں۔ براہین احمدیہ اور اس میں جو میرے آئندہ حالات درج ہیں ان کو دیکھا جاوے اور پھر میرے آجکل کے حالات کو دیکھا جاوے کہ وہ تمام کس طرح پُورے ہوئے پھر جو جو نشانات مسیح موعُود کے زمانہ کے آثار ہیں، موجود ہیں۔ وہ کس طرح اس زمانہ میں پُورے ہو گئے۔ رمضان میں کسُوف خسوف کا ہونا۔ ریل کا جاری ہو کر اُونٹنیوں کا حجاز میں بھی بند ہو جانا، طاعون کا نمودار ہونا۔ یہ سب علامات ہیں جو زمانہ مہدی کے ساتھ مختص ہیں۔ یہ خُدا تعالیٰ نے کیوں پُورے کیے؟ کیا ایک کذّاب اور مفتری علی اللہ کی رونق افزائی کے لیے جو چوبیس سال سے برابر افترا باندھ رہا ہے۔ آخر میں مَیں یہ وصیّت کرتا ہوں کہ عمر کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ وقت ہے اس کو غنیمت سمجھا جاوے۔ یہ خدا تعالیٰ کے نشان ہیں۔ ان سے مُنہ موڑنا خدا تعالیٰ کی حکم عدولی ہے۔ دیکھو ایک مجازی حاکم کا پیادہ اگر آ جاوے اور پیادہ جس حکم کو لاتا ہے اُس کی پروا نہ کی جاوے، تو پھر یہ حکم عدولی کیسے بدنتائج پیدا کرتی ہے؛ چہ جائیکہ خدا تعالیٰ کی حکم عدولی۔ دُنیا میں جب کبھی کوئی خدا تعالیٰ کا مُرسل آوے گا وُہ انسان ہی ہوگا۔ اس کے اوضاع و اطوار انسانوں والے ہی ہوں گے۔ آخر فرشتہ کو تو نہیں آنا۔ یہ لوگ اس کے لوازم انسانیت سے گھبرا جاتے ہیں اور اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک حجاب ہے جو اس کے جامۂ نبوّت کو چھپاتے ہوتے ہے لیکن یہ حجاب ضروری ہے جس میں ہر ایک نبی مستُور ہوتا ہے۔ مبارک ہے وہ جو اس حجاب کے اندر اُس شخص کو دیکھ لے۔[1]

ابتدائے جون ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

تعدّد ازدواج۔ مقصد اور حدود

ایک احمدی نے حضرتِ اقدس کی خدمت میں عرض کی کہ تعدّدِ ازدواج میں جو عدل کا حکم ہے کیا اس سے یہی

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۱۹-۲۰ صفحہ ۶ مورخہ ۱۰ و ۱۷ جون ۱۹۰۴ء

مُراد ہے کہ مرد بحیثیت اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: ۳۵) کے خود ایک حاکم عادل کی طرح جس بیوی کو سلوک کے قابل پاوے ویسا سلوک اس سے کرے یا کچھ اَور معنے ہیں۔

حضرتِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ:

محبت کو قطع نظر بالائے طاق رکھ کر عملی طور پر سب بیویوں کو برابر رکھنا چاہیے۔ مثلاً پارچہ جات۔ خرچ خوراک۔ معاشرت حتّٰی کہ مباشرت میں بھی مساوات برتے۔ یہ حقوق اس قسم کے ہیں کہ اگر انسان کو پورے طور پر معلوم ہوں تو بجائے بیاہ کے وہ ہمیشہ رنڈوا رہنا پسند کرے۔ خدا تعالیٰ کی تہدید کے نیچے رہ کر جو شخص زندگی بسر کرتا ہے وہی اُن کی بجا آوری کا دم بھر سکتا ہے۔ ایسے لذّات کی نسبت جن سے خدا تعالیٰ کا تازیانہ ہمیشہ سر پر رہے، تلخ زندگی بسر کر لینی ہزار ہا درجہ بہتر ہے۔ تعدّدِ ازدواج کی نسبت اگر ہم تعلیم دیتے ہیں تو صرف اس لیے کہ معصیت میں پڑنے سے انسان بچا رہے اور شریعت نے اسے بطور علاج کے ہی رکھا ہے کہ اگر انسان اپنے نفس کا میلان اور غلبہ شہوات کی طرف دیکھے اور اس کی نظر بار بار خراب ہوتی ہو تو زنا سے بچنے کے لیے دوسری شادی کر لے، لیکن پہلی بیوی کے حقوق تلف نہ کرے۔ تورات سے بھی یہی ثابت ہے کہ اُس کی دلداری زیادہ کرے، کیونکہ جوانی کا بہت سا حصہ اُس نے اس کے ساتھ گذارا ہوا ہوتا ہے اور ایک گہرا تعلق خاوند کا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ پہلی بیوی کی رعایت اور دلداری یہانتک کرنی چاہیے کہ اگر کوئی ضرورت مرد کو ازدواجِ ثانی کی محسوس ہو، لیکن وہ دیکھتا ہے کہ دوسری بیوی کے کرنے سے اس کی پہلی بیوی کو سخت صدمہ ہوتا ہے اور حد درجہ کی اُس کی دل شکنی ہوتی ہے تو اگر وہ صبر کر سکے اور کسی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا ہو اَور نہ کسی شرعی ضرورت کا اُس سے خُون ہوتا ہو تو ایسی صورت میں اگر اُن اپنی ضرورتوں کی قربانی سابقہ بیوی کی دلداری کے لیے کر دے اور ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے تو کوئی حرج نہیں ہے اور اُسے مناسب ہے کہ دوسری شادی نہ کرے۔

اس قدر ذکر ہوا تھا کہ ایک صاحب نے اُٹھ کر عرض کی کہ البدر[1] اور الحکم اخباروں میں تعدّدِ ازدواج کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ذمّہ دُوسرا نکاح حضور نے فرض کر دیا ہے۔

آپؑ نے فرمایا کہ:

ہمیں جو کچھ خدا تعالیٰ سے معلوم ہوا ہے وہ بلا کسی رعایت کے بیان کرتے ہیں۔ قرآن شریف کا منشاء

---

[1] حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ ملفوظات ۲۲ ستمبر ۱۹۰۳ء کی ڈائری میں چھپ چکے ہیں۔

زیادہ بیویوں کی اجازت سے یہ ہے کہ تم کو اپنے نفوس کو تقویٰ پر قائم رکھنے اور دوسرے اغراض مثلاً اولادِ صالحہ کے حاصل کرنے اور خویش و اقارب کی نگہداشت اور ان کے حقوق کی بجا آوری سے ثواب حاصل ہو۔ اور اپنی اغراض کے لحاظ سے اختیار دیا گیا ہے کہ ایک دو تین چار عورتوں تک نکاح کر لو۔ لیکن اگر ان میں عدل نہ کر سکو تو پھر یہ فسق ہوگا۔ اور بجائے ثواب کے عذاب حاصل کرو گے کہ ایک گناہ سے نفرت کی وجہ سے دُوسرے گناہوں پر آمادہ ہوئے۔ دِل دکھانا بڑا گناہ ہے اور لڑکیوں کے تعلقات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ جب والدین اُن کو اپنے سے جُدا اور دُوسرے کے حوالہ کرتے ہیں، تو خیال کرو کہ کیا امیدیں اُن کے دلوں میں ہوتی ہیں اور جن کا اندازہ انسان عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء : ۲۰) کے حکم سے ہی کر سکتا ہے۔ اگر انسان کا سلوک اپنی بیوی سے عمدہ ہو اور اسے ضرورتِ شرعی پیدا ہو جاوے تو اس کی بیوی اس کے دُوسرے نکاحوں سے ناراض نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنے گھر میں کئی دفعہ دیکھا ہے کہ وہ ہمارے نکاح والی پیشگوئی کے پُورا ہونے کے لیے رو رو کر دُعائیں کرتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بیویوں کی ناراضگی کا باعث خاوند کی نفسانیت ہوا کرتی ہے اور اگر اُن کو اس بات کا علم ہو کہ ہمارا خاوند صحیح اغراض اور تقویٰ کے اصول پر دُوسری بیوی کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ کبھی ناراض نہیں ہوتیں۔ فساد کی بنا تقویٰ کی خلاف وَرزی ہوا کرتی ہے۔

خدا تعالیٰ کے قانون کو اس کے منشاء کے برخلاف ہرگز نہ برتنا چاہیے اور نہ اُس سے ایسا فائدہ اٹھانا چاہیے جس سے وہ صرف نفسانی جذبات کی ایک سپر بن جاوے۔ یاد رکھو کہ ایسا کرنا معصیت ہے۔ خدا تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ شہوات کا تم پر غلبہ نہ ہو، بلکہ تمہاری غرض ہر ایک امر میں تقویٰ ہو۔ اگر شریعت کو سپر بنا کر شہوات کی اِتباع کے لیے بیویاں کی جاویں گی تو سوائے اس کے اَور کیا نتیجہ ہوگا کہ دوسری قومیں اعتراض کریں کہ مُسلمانوں کو بیویاں کرنے کے سوا اَور کوئی کام ہی نہیں۔ زنا کا نام ہی گناہ نہیں بلکہ شہوات کا کھلے طور پر دل میں پڑ جانا گناہ ہے۔ دنیاوی تمتع کا حِصّہ انسانی زندگی میں بہت ہی کم ہونا چاہیے تاکہ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا۔ (التوبہ : ۸۲) یعنی ہنسو تھوڑا اور روؤ بہت کا مصداق بنو، لیکن جس شخص کی دنیاوی تمتع کثرت سے ہیں اور رات دن بیویوں میں مصروف ہے۔ اُس کو رقّت اور رونا کب نصیب ہوگا۔ اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ وُہ ایک خیال کی تائید اور اتّباع میں تمام سامان کرتے ہیں اور اس طرح سے خدا تعالیٰ کے اصل منشاء سے دُور جا پڑتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اگرچہ بعض اشیاء جائز تو کر دی ہیں، مگر اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ عمر ہی اس میں بسر کی جاوے۔ خدا تعالیٰ تو اپنے بندوں کی صفت میں فرماتا ہے يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (الفرقان: ۶۵) کہ وہ اپنے ربّ کے لیے

تمام رات سجدہ اور قیام میں گذارتے ہیں۔ اب دیکھو۔ رات دن بیویوں میں غرق رہنے والا خدا تعالیٰ کے منشار کے موافق رات کیسے عبادت میں کاٹ سکتا ہے۔ وہ بیویاں کیا کرتا ہے گویا خدا کے لیے شریک پیدا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں اور باوجود ان کے آپ ساری ساری رات خدا تعالیٰ کی عبادت میں گذارتے تھے۔ ایک رات آپ کی باری عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھی۔ کچھ حصہ رات کا گذر گیا تو حضرت عائشہؓ کی آنکھ کھلی۔ دیکھا کہ آپ موجود نہیں۔ اُسے شُبہ ہوا کہ شاید آپ کسی اور بیوی کے ہاں گئے ہوں اُس نے اُٹھ کر ہر ایک گھر میں تلاش کیا، مگر آپؐ نہ ملے۔ آخر دیکھا کہ آپؐ قبرستان میں ہیں اور سجدہ میں رو رہے ہیں۔ اب دیکھو کہ آپؐ زندہ اور چہیتی بیوی کو چھوڑ کر مُردوں کی جگہ قبرستان میں گئے اور روتے رہے تو کیا آپؐ کی بیویاں حظِّ نفس یا اتباعِ شہوت کی بنا پر ہو سکتی ہیں۔؟

غرضکہ خوب یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کا اصل منشا یہ ہے کہ تم پر شہوات غالب نہ آویں۔ اور تقویٰ کی تکمیل کے لیے اگر ضرورتِ حقہ پیش آوے تو اور بیوی کر لو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمتع دنیاوی کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضرت عمرؓ آپؐ سے ملنے گئے۔ ایک لڑکا بھیج کر اجازت چاہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھجور کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ جب حضرت عمرؓ اندر آئے تو آپؐ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مکان سب خالی پڑا ہے اور کوئی زینت کا سامان اس میں نہیں ہے۔ ایک کھونٹی پر تلوار لٹک رہی ہے یا وہ چٹائی ہے جس پر آپؐ لیٹے ہوئے تھے اور جس کے نشان اسی طرح آپؐ کی پُشت مبارک پر بنے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ ان کو دیکھ کر رو پڑے۔ آپؐ نے پوچھا۔ اے عمرؓ! تجھ کو کس چیز نے رُلایا؟ عمرؓ نے عرض کی کہ کسریٰ اور قیصر تو تنعّم کے اسباب رکھیں اور آپؐ جو خدا تعالیٰ کے رسُول اور دو جہان کے بادشاہ ہیں اس حال میں رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے عمرؓ مجھے دُنیا سے کیا غرض؟ میں تو اس مسافر کی طرح گذارہ کرتا ہوں جو اُونٹ پر سوار منزلِ مقصود کو جاتا ہو۔ ریگستان کا راستہ ہو اور گرمی کی سخت شدت کی وجہ سے کوئی درخت دیکھ کر اس کے سایہ میں سستا لے اور جونہی کہ ذرا پسینہ خشک ہوا ہو وہ پھر چل پڑے۔ جس قدر نبی اور رسُول ہوتے ہیں سب نے دُوسرے پہلو (آخرت) کو ہی مدِّنظر رکھا ہوا تھا۔

پس جاننا چاہیے کہ جو شخص شہوات کی اِتباع سے زیادہ بیویاں کرتا ہے وہ مغزِ اسلام سے دُور رہتا ہے۔ ہر ایک دن جو چڑھتا ہے اور رات جو آتی ہے اگر وہ تلخی سے زندگی بسر نہیں کرتا اور روتا کم یا بالکل ہی نہیں روتا اور ہنستا زیادہ ہے تو یاد رہے کہ وہ ہلاکت کا نشانہ ہے۔ استیفاءِ لذت اگر حلال طور پر ہو تو حرج نہیں۔ جیسے ایک شخص ٹٹو پر سوار ہے اور راستہ میں اُسے نہاری وغیرہ اس لیے دیتا ہے کہ اس کی طاقت قائم

رہے اور وہ منزلِ مقصود تک اُسے پہنچا دے جہاں خدا تعالیٰ نے سب کے حقوق رکھے ہیں وہاں نفس کا بھی حق رکھا ہے کہ وُہ عبادات بجا لاسکے۔

لوگوں کے نزدیک چوری زنا وغیرہ ہی گناہ ہیں اور اُن کو یہ معلوم نہیں کہ استیفاءِ لذّات میں مشغول ہونا بھی گناہ ہے۔ اگر ایک شخص اپنا اکثر حصّہ وقت کا تو عیش و آرام میں بسر کرتا ہے اور کسی وقت اُٹھ کر چار ٹکریں بھی مار لیتا ہے۔ (یعنی نماز پڑھ لیتا ہے) تو وہ نمرودی زندگی بسر کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ریاضت اور مشقت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تُو اس محنت میں مر جائے گا؛ حالانکہ ہم نے تیرے لیے بیویاں بھی حلال کی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ نے آپؐ کو ایسے ہی فرمایا جیسے ماں اپنے بچے کو پڑھنے یا دوسرے کام میں مستغرق دیکھ کر صحت کے قیام کے لحاظ سے اُسے کھیلنے کودنے کی اجازت دیتی ہے۔ خدا تعالےٰ کا یہ خطاب اسی غرض سے ہے کہ آپ تازہ دم ہو کر پھر دین کی خدمت میں مصروف ہوں۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ آپ شہوات کی طرف جُھک جاویں۔ نادان معترض ایک پہلو کو تو دیکھتے ہیں اور دُوسرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پادریوں نے اس بات کی طرف کبھی غور نہیں کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا حقیقی میلان کس طرف تھا اور رات دن آپؐ کس فکر میں رہتے تھے۔ بہت سے مُلّا اور عام لوگ ان باریکیوں سے ناواقف ہیں۔ اگر اُن کو کہا جاوے کہ تم شہوات کے تابع ہو تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم حرام کرتے ہیں؟ شریعت نے ہمیں اجازت دی ہے تو ہم کرتے ہیں۔ ان کو اس بات کا علم نہیں کہ بے محل استعمال سے حلال بھی حرام ہو جاتا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات : ۵۷) سے ظاہر ہے کہ انسان صرف عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ پس اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جس قدر چیز اُسے درکار ہے اگر اُس سے زیادہ لیتا ہے تو گو وہ شئے حلال ہی ہو مگر فضول ہونے کی وجہ سے اس کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ جو انسان رات دن نفسانی لذّات میں مصروف ہے وہ عبادت کا کیا حق ادا کر سکتا ہے۔ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وُہ ایک تلخ زندگی بسر کرے لیکن عیش و عشرت میں بسر کرنے سے تو وہ اس زندگی کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

ہمارے کلام کا مقصد یہ ہے کہ دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا جاوے۔ یہ نہیں کہ صرف لذّات کے پہلو پر زور دیا جاوے اور تقویٰ کو بالکل ترک کر دیا جاوے۔ اسلام نے جن کاموں اور باتوں کو مباح کہا ہے اس سے یہ غرض ہرگز نہیں ہے کہ رات دن اس میں مستغرق رہے۔ صرف یہ ہے کہ بقدرِ ضرورت وقت پر اُن سے فائدہ اُٹھایا جاوے۔

اس مقام پر پھر وہی صاحب بولے کہ اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ تعدّدِ ازواج بطور دوا کے ہے نہ

بطور غذا کے۔

حضورؑ نے فرمایا۔ ہاں۔

اس پر انھوں نے عرض کی کہ ان اخبار والوں نے تو لکھا ہے کہ احمدی جماعت کو بڑھانے کے لیے زیادہ بیویاں کرو۔

حضورؑ نے فرمایا کہ :

ایک حدیث میں یہ ہے کہ کثرتِ ازدواج سے اولاد بڑھاؤ تاکہ اُمت زیادہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ انسان کے ہر عمل کا مدار اس کی نیت پر ہے۔ کسی کے دل کو چیر کر ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اگر کسی کی یہ نیت نہیں ہے کہ زیادہ بیویاں کر کے عورتوں کی لذات میں فنا ہو بلکہ یہ ہے کہ اس سے خادمِ دین پیدا ہوں تو کیا حرج ہے لیکن یہ امر بھی مشروط بشرائط بالا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کی چار بیویاں ہوں اور ہر سال ہر ایک سے ایک ایک اولاد ہو تو چار سال میں سولہ بچے ہوں گے، مگر بات یہ ہے کہ لوگ دوسرے پہلو کو ترک دیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ صرف ایک پہلو پر ہی زور دیا جاوے، حالانکہ ہمارا یہ منصب ہرگز نہیں ہے۔ قرآن شریف میں متفرق طور پر تقویٰ کا ذکر آیا ہے، لیکن جہاں کہیں بیویوں کا ذکر ہے وہاں ضرور ہی تقویٰ کا بھی ذکر ہے۔ ادائیگی حقوق ایک بڑی ضروری شئے ہے اسی لیے عدل کی تاکید ہے۔ اگر ایک شخص دیکھتا ہے کہ وہ حقوق کو ادا نہیں کر سکتا یا اس کی رجولیت کے قویٰ کمزور ہیں یا خطرہ ہو کہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے تو اُسے چاہیے کہ دیدہ دانستہ اپنے آپ کو عذاب میں نہ ڈالے تقویٰ یعنی شرعی ضرورت جو اپنے محل پہ ہو اگر موجود ہو تو پہلی بیوی خود تجویز کرتی ہے کہ خاوند اَور نکاح کرے۔

آخری نصیحت ہماری یہی ہے کہ اسلام کو اپنی عیاشیوں کے لیے سپر نہ بناؤ کہ آج ایک حسین عورت نظر آئی تو اُسے کر لیا۔ کل اَور نظر آئی تو اُسے کر لیا۔ یہ تو گویا خدا کی گدی پر عورتوں کو بٹھانا اور اُسے بھلا دینا ہوا۔ دین تو چاہتا ہے کہ کوئی زخم دل پر ایسا رہے جس سے ہر وقت خدا تعالیٰ یاد آوے ورنہ سلبِ ایمان کا خطرہ ہے۔ اگر صحابہ کرامؓ عورتیں کرنے والے اور انہیں میں مصروف رہنے والے ہوتے تو اپنے سر جنگوں میں کیوں کٹواتے؟ حالانکہ اُن کا یہ حال تھا کہ ایک کی اُنگلی کٹ گئی تو اُسے مخاطب ہو کے کہا کہ تُو ایک اُنگلی ہی ہے اگر کٹ گئی تو کیا ہوا۔ مگر جو شب و روز عیش و عشرت میں مستغرق ہے وہ کب ایسا دل لا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں اس قدر روتے اور قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں پر ورم ہو جاتا۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ خدا تعالیٰ نے آپ کے تمام گناہ بخش دیتے ہیں پھر اس قدر مشقت اور رونے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا۔ کیا میں خدا تعالیٰ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں[1]۔

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ صفحہ ۲ و ۳ مورخہ ۸ رجولائی ۱۹۰۴ء

۴ رجون ۱۹۰۴ء

نماز اصل میں دُعا ہے ایک شخص کے سوال پر فرمایا کہ :

نماز اصل میں دُعا ہے۔ نماز کا ایک ایک لفظ جو بولتا ہے وہ نشانہ دُعا کا ہوتا ہے۔ اگر نماز میں دل نہ لگے تو پھر عذاب کے لیے تیار رہے کیونکہ جو شخص دُعا نہیں کرتا وُہ سوائے اس کے کہ ہلاکت کے نزدیک خود جاتا ہے اَور کیا ہے۔ ایک حاکم ہے جو بار بار اس امر کی ندا کرتا ہے کہ میں دُکھیاروں کا دُکھ اُٹھاتا ہوں۔ مشکل والوں کی مشکل حل کرتا ہوں۔ مَیں بہت رحم کرتا ہوں۔ بیکسوں کی امداد کرتا ہوں لیکن ایک شخص جو کہ مشکل میں مبتلا ہے۔ اس کے پاس سے گذرتا ہے اَور اُس کی ندا کی پروا نہیں کرتا نہ اپنی مشکل کا بیان کر کے طلب امداد کرتا ہے تو سوائے اس کے کہ وہ تباہ ہو اور کیا ہوگا۔ یہی حال خدا تعالیٰ کا ہے کہ وہ تو ہر وقت انسان کو آرام دینے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ کوئی اس سے درخواست کرے۔ قبولیتِ دُعا کے لیے ضروری ہے کہ نافرمانی سے باز رہے اور دُعا بڑے زور سے کرے۔ کیونکہ پتھر پر پتھر زور سے پڑتا ہے تب آگ پیدا ہوتی ہے۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣ الْمُسْتَقَرُّ (القیامة : ۱۳)

اس آیت کو قیامت پر چسپاں کرنا غلطی ہے کیونکہ اس دن تو خُدا کی طرف رُجُوع کرنا کسی کام نہ آویگا۔ بلکہ یہ اس زمانہ کی حالت ہے کہ طاعون کے بارے میں خواہ کوئی حیلہ حوالہ کریں ہرگز کام نہ آوے گا۔ آخر مستقر خدا تعالیٰ ہی ہوگا۔ لوگ جب اس کو مانیں گے۔ تب وہ اس سے رہائی دے گا۔ اَیْنَ الْمَفَرُّ (القیامة:) بھی اسی پر چسپاں ہے۔ کیونکہ دُوسرے آفات میں تو کوئی نہ کوئی مفر ہوتا ہے۔ مگر طاعون میں کوئی مفر نہیں ہے۔ صرف خدا تعالیٰ کی پناہ ہی کام آویگی۔

خدا تعالیٰ کی طرف ظلم کبھی منسوب نہیں ہوسکتا جو صادق ہوگا۔ وہ ضرور اپنے صدق سے نفع پاوے گا۔ یہ وہی دن ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے۔[1] هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (المائدة : ۱۲۰)

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ صفحہ ۶ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء
نیز الحکم جلد ۸ نمبر ۲۳-۲۴ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۷ و ۲۴ جولائی ۱۹۰۴ء

۱۵؍ جون ۱۹۰۴ء

حقیقی تہذیب

صنعت وحرفت میں دسترس حاصل کرنے، سیروسیاحت میں قوم کے افراد کو مشغول رہنے۔ لنڈن ہو آنے، مشنوں میں ترقی کرنے وغیرہ کو آج کل تہذیب کے نام سے نامزد کیا جاتا ہے۔ اور جب کسی قوم میں یہ باتیں ہوں تو اسے ایک مہذب قوم کہتے ہیں یہ ذکر ایک صاحب نے حضرت اقدسؑ کی مجلس میں آج کیا۔

اس پر آپؑ نے فرمایا کہ :

جس قوم میں راستی کا پیار نہیں۔ اعمال میں للّٰہیت نہیں اور ریاکاری اور خود پسندی ان کا شیوہ ہے، اُسے مہذّب نہیں کہہ سکتے۔ تہذیب کے اصول اخلاص، صدق اور توحید ہیں۔ وہ سوائے اسلام کے اور کسی دُوسرے مذہب میں نہیں مل سکتے۔ عیسائیوں کو اخلاق کا بڑا ناز ہے مگر ان کی جو بات دیکھو اسی میں گناہ ہے۔ کوئی عمل ہو اس میں ریاکاری ضرور ہے؛ حالانکہ خُلق وہ ہے جو للّٰہ ہو۔ خدا تعالیٰ کی عظمت، اس پر ایمان اور نوعِ انسان کی خدمت یہ باتیں خلق کی ہیں۔ لیکن یہاں خدا کی جگہ تو ایک یسوع نامی کو دیدی گئی ہے اور مخلوق کے ساتھ جو معاملہ ہے وُہ ظاہر ہے۔ بات یہ ہے کہ جب خُدا کو شناخت ہی نہیں کیا، تو اس پر نظر رکھ کر کسی کی خدمت کیا کر سکتے ہیں؟ سچے خُلق کا برتاؤ بہت مشکل ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ہر ایک قوی کو برمحل برتا جاوے اور خُدا سے ڈر کر وہ اپنی حد پر رہیں لیکن ایمان کے سوا یہ باتیں حاصل نہیں ہوتیں۔ ثواب اس کو ملا کرتا ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈر کر گناہ کو چھوڑتا ہے یا اس کو راضی کرنے کی محنت برداشت کر کے ایک نیکی کو کرتا ہے۔ اور جب تک یہ نیّت نہیں ہوتی۔ تب تک ہرگز ثواب نہیں ملتا؛ اگرچہ وہ کام بذاتِ خود نیک ہی ہو۔ ہندو لوگ بتوں کی خاطر کیا کیا کرتے ہیں۔ کتنی محنتیں اُٹھاتے ہیں مگر سب کی سب رائیگاں جاتی ہیں[1]۔

۱۹؍ جون ۱۹۰۴ء بوقت ظہر

متقی کون ہے؟

ایک مولوی صاحب جن کے والد بزرگوار احمدی جماعت میں داخل تھے اور بقضائے الٰہی فوت ہو گئے۔ علاقہ گوجرانوالہ سے تشریف لائے ہوئے

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ صفحہ ۶ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء

تھے۔ ان کو حضرت اقدس سے ارادت حاصل نہ تھی اور نہ اپنے والدِ مرحوم کو صراطِ مستقیم پر سمجھتے تھے۔ چند احباب کی تحریک سے وہ بحث و مباحثہ کی غرض لے کر یہاں آئے تھے۔ حضرتِ اقدس کے رُوبرو تو ان کی کوئی کلام ہم نے نہ سُنی۔ حضرت مولوی نورالدین صاحب البتہ کلام کرتے رہے۔ جس میں نووارد مولوی صاحب نے یہ کہا کہ ہمارے نزدیک بہت سے متقی ہیں کہ جنھوں نے مرزا صاحب کو نہیں مانا اور چونکہ ہم ان کو متقی اور راستباز تسلیم کرتے ہیں، اس لیے ہم بھی نہیں مانتے۔ حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ اگر کوئی ایسا شخص ہے کہ جو ضد اور تعصب وغیرہ سے تو پاک ہے اور سچی ارادت سے حق کا طالب ہے اور اس لیے کسی شخص کو متقی مان کر اس کی تقلید سے وہ حضرت امام علیہ السلام کا مُنکر ہے تو وہ میرے نزدیک وہ اس وقت تک معذور ہے جبتک کہ اللہ تعالیٰ اس پر حقیقت کو واضح نہ کر دے، کیونکہ مؤاخذہ کے لیے ضروری ہے کہ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (البقرہ : ۲۵۷) ہو۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (الانفال : ۴۳) جو ہلاک ہو وہ بھی بیّن آیات دیکھ کر ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ بھی بیّن آیات دیکھ کر زندہ ہو۔

نووارد مولوی صاحب نے چاہا کہ اس کی تصدیق حضرت مرزا صاحب سے کرائی جاوے، اس لیے جناب حکیم صاحب نے بوقتِ ظہر اس مسئلہ کو حضرت امام علیہ السلام کی خدمتِ بابرکت میں عرض کیا جس پر آپؑ نے فرمایا کہ :

اس قسم کا سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا تو اُنھوں نے جواب دیا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ۔ (طٰہٰ : ۵۳) ایسے ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ اُن کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ وہ جیسے جیسے سمجھے گا ویسا معاملہ اس سے کرے گا۔ ہاں کوئی آدمی کسی کو متّقی کیونکر یقین کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے۔ لَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ (النجم : ۳۳) اور فرماتا ہے۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ (النجم : ۳۳) اور فرماتا ہے اللہ تعالیٰ ہی عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (مائدہ : ۸) ہے۔ ہاں مامورین اللہ کے متّقی ہونے اور نہ ہونے کے نشانات بیّن ہوتے ہیں نہ اَوروں کے۔

بعد نماز مغرب

مغرب کی نماز کے بعد جب حضرت امام علیہ السلام شہ نشین پر جلوہ افروز ہوئے تو سیّد احمد شاہ صاحب سندھی نے آپ سے نیاز حاصل کی اور پوچھا کہ متقی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ فرمایا :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور آپؐ نے دعویٰ کیا تو اس وقت بھی لوگوں کی نظروں میں بہت سے یہودی عالم متقی اور پرہیزگار مشہور تھے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خدا تعالیٰ کے

نزدیک بھی متقی ہوں۔ خدا تعالیٰ تو اُن متقیوں کا ذکر کرتا ہے جو اس کے نزدیک تقویٰ اور اخلاص رکھتے ہیں۔ جب ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سُنا۔ لوگوں میں جو اُن کی وجاہت تھی اس میں فرق آتا دیکھ کر رعونت سے انکار کر دیا اور حق کو اختیار کرنا گوارا نہ کیا۔ اب دیکھو کہ لوگوں کے نزدیک تو وہ بھی متقی تھے مگر اُن کا نام حقیقی متقی نہیں تھا۔ حقیقی متقی وہ شخص ہے کہ جس کی خواہ آبرو جاتے۔ ہزار ذلت آتی ہو۔ جان جانے کا خطرہ ہو، فقر و فاقہ کی نوبت آئی ہو تو وہ محض اللہ تعالیٰ سے ڈر کر ان سب نقصانوں کو گوارا کرے لیکن حق کو ہرگز نہ چھپا دے۔ متقی کے یہ معنے جیسے آجکل کے مولوی عدالتوں میں بیان کرتے ہیں ہرگز نہیں ہیں کہ جو شخص زبان سے سب مانتا ہو خواہ اس کا عمل درآمد اس پر ہو یا نہ ہو اور وہ جھوٹ بھی بول لیتا ہو، چوری بھی کرتا ہو تو وہ متقی ہے۔ تقویٰ کے بھی مراتب ہوتے ہیں اور جبتک کہ یہ کامل نہ ہوں تب تک انسان پورا متقی نہیں ہوتا۔ ہر ایک شئے وہی کارآمد ہوتی ہے جس کا پورا وزن لیا جاوے۔ اگر ایک شخص کو بھوک اور پیاس لگی ہے۔ تو روٹی کا ایک بھورا اور پانی کا ایک قطرہ دے لینے سے اُسے سیری حاصل نہ ہوگی اور نہ جان کو بچا سکے گا، جبتک پوری خوراک کھانے اور پینے کی اُسے نہ ملے۔ یہی حال تقویٰ کا ہے کہ جب تک انسان اسے پورے طور پر ہر ایک پہلو سے اختیار نہیں کرتا۔ تب تک وہ متقی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ بات نہیں تو ہم ایک کافر کو بھی متقی کہہ سکتے ہیں کیونکہ کوئی نہ کوئی پہلو تقویٰ کا (یعنی خوبی) اس کے اندر ضرور ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے محض ظلمت تو کسی کو پیدا نہیں کیا۔ مگر تقویٰ کی یہ مقدار اگر ایک کافر کے اندر ہو تو اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ کافی مقدار ہونی چاہیے جس سے دل روشن ہو۔ خدا تعالیٰ راضی ہو اور ہر ایک بدی سے انسان بچ جاوے۔ بہت سے ایسے مُسلمان ہیں کہ جو کہتے ہیں کیا ہم روزہ نہیں رکھتے۔ نماز نہیں پڑھتے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان باتوں سے وہ متقی نہیں ہو سکتے۔ تقویٰ اَور شئے ہے۔ جب تک انسان خدا تعالیٰ کو مقدم نہیں رکھتا اور ہر ایک لحاظ کو خواہ برادری کا ہو خواہ قوم کا، خواہ دوستوں اور شہر کے رؤسا، کا خدا تعالیٰ سے ڈر کر نہیں توڑتا اور خدا تعالیٰ کے لیے ہر ایک ذلت برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتا تب تک وہ متقی نہیں ہے۔

قرآنِ شریف میں جو بڑے بڑے وعدے متقیوں کے ساتھ ہیں وہ ایسے متقیوں کا ذکر ہے جنھوں نے تقویٰ کو وہاں تک نبھایا جہانتک ان کی طاقت تھی۔ بشریت کے قویٰ نے جہانتک ان کا ساتھ دیا برابر تقویٰ پر قائم رہے حتّٰی کہ اُن کی طاقتیں ہار گئیں۔ اَور پھر خدا تعالیٰ سے انھوں نے اَور طاقت طلب کی جیسے کہ اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ۔ (الفاتحہ: ۵) سے ظاہر ہے اِیَّاكَ نَعۡبُدُ یعنی اپنی طاقت تک تو ہم نے کام کیا اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ یعنی آگے چلنے کے

لیے اور نئی طاقت تجھ سے طلب کرتے ہیں جیسے حافظ نے کہا ہے ؎

ما بداں منزل عالی نتوانیم رسید
ہاں اگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند

پس خوب یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک متقی ہونا اور شئے ہے اور انسانوں کے نزدیک متقی ہونا اور شئے ہے۔ مسیح علیہ السلام کے وقت جو مخالفوں کے جتھے وغیرہ بنتے تھے۔ اس کا باعث بھی یہی تھا کہ جو عام لوگ یہود کے نزدیک مسلّم تھے اور متقی پرہیزگار تسلیم کیے جاتے تھے وہ مخالف تھے۔ اگر وہ مخالف نہ ہوتے تو جتھے وغیرہ نہ بنتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے وقت میں بھی یہی حال تھا۔ عُجب۔ بُخل۔ ریا۔ نمود اور وجاہت کی پاسداری وغیرہ کی باتیں تھیں جنھوں نے حق کی قبولیّت سے اُن کو رد کے رکھا۔ غرضیکہ تقویٰ مشکل شے ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے تو اس کی علامات بھی ساتھ ہی رکھ دیتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ حق جب ظاہر ہو تو جو اسے خواہ نخواہ ردّ کرتا ہے اور دلائل معقولات۔ منقولات اور خدا تعالیٰ کے نشانوں کو ٹالتا جاوے وہ کب متقی ہو سکتا ہے؟[1]

سچی بات یہ ہے کہ حق جب ظاہر ہو تو اُسے جو خواہ نخواہ ردّ کرتا ہے اور دلائل معقولات منقولات اور خدا تعالیٰ کے نشانات کو ٹالتا جاتا ہے وہ ہرگز متقی نہیں ہو سکتا۔ متقی کو تو ترساں اور لرزاں ہونا چاہیے۔ کیا دُنیا میں ایسا ہوا ہے کہ چوبیس سال سے برابر ایک انسان رات کو منصوبہ بناتا ہے اور صبح کو خدا کی طرف لگا کر کہتا ہے کہ مجھے یہ وحی یا الہام ہوا اور خدا تعالیٰ اس سے مؤاخذہ نہیں کرتا۔ اس طرح سے تو دنیا میں اندھیر پڑ جاوے اور مخلوق تباہ ہو جاوے۔ متقی تو ایک ہی بات سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور یہاں تو ہزاروں ہیں۔ زمانہ الگ پکار رہا ہے۔ احادیث مِنْكُمْ مِنْكُمْ کہہ رہی ہیں۔ سورہ نور میں بھی مِنْكُمْ لکھا ہے۔ قساوتِ قلبی اور بہائم کی طرح جو زندگی بسر ہو رہی ہے وہ الگ بتا رہی ہے۔ صدی کے سر پر کہتے تھے کہ مجدّد آتا ہے۔ اب ۲۲ سال بھی ہو چکے۔ کسوف و خسوف بھی ہو لیا۔ طاعون بھی آ گئی، حج بھی بند ہوا۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر اگر اب بھی یہ لوگ نہیں مانتے تو ہم کیونکر جانیں کہ ان میں تقویٰ ہے۔ ہم نے بار بار کہا کہ آؤ اور جن باتوں کا تم کو سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے وہ پوچھو۔ ہاں یہ نہیں ہوگا کہ قرآن شریف تو کچھ کہے اور تم کچھ کہو اور ایسے اقوال پیش کرو جو اس کے مخالف ہوں۔ مسیح کا نزول جسمانی آسمان سے

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۲-۲۳ صفحہ ۲ مورخہ ۸ - ۱۶ رجون ۱۹۰۴ء
نیز الحکم جلد ۸ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۰ رجولائی ۱۹۰۴ء

مانتے ہیں؛ حالانکہ وہ تب صحیح ہو سکتا ہے جبکہ صعود اول ہو۔ قرآن مسیح کی وفات بیان کرتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ چھت پھاڑ کر آسمان پر چلا گیا۔ کیا تقویٰ اس بات کا نام ہے کہ یقین کو ترک کر کے توہمات کی اتباع کی جاوے۔ سچے تقویٰ کا پتہ قرآن سے ملتا ہے کہ دیکھ لیوے کہ تقویٰ والوں نے کیا کیا کام کیے ہیں۔

دعا کے ذریعہ اپنے بھائیوں کی مدد کرو

مذکورہ بالا تقریر کے بعد ایک صاحب نے عرض کی کہ حضور بعض احمدی بھائی ایسے ہیں کہ انھوں نے بیعت کی ہوئی ہے اور اخلاص بھی رکھتے ہیں، مگر بعض اقوال اور حرکات اُن سے بیجا ظاہر ہوتی ہیں۔ بعض ان میں سے احادیث کے قائل نہیں۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا :

اصل بات یہ ہے کہ سب لوگ ایک طبقہ کے نہیں ہوتے۔ خدا تعالیٰ بھی قرآن شریف میں مومنوں کے طبقات بیان کرتا ہے۔ مِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ وَ مِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ۔ (فاطر : ۳۳) کہ بعض ان میں سے اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو اور بعض سبقت کرنے والے۔

دُوسری یہ بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی تو ترقی آہستہ آہستہ ہی کی تھی۔ ایمان میں بھی اور عمل میں بھی۔ لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو ایک صحابی سے آپ نے ایک ٹکڑا زمین کا مسجد[1] بنانے کے لیے طلب کیا۔ اس نے عُذر کیا اور کہا کہ مُجھ کو آپ درکار ہے۔ اب یہ کس قدر گناہ کی بات تھی کہ خدا تعالیٰ کا رُسول مسجد کے لیے زمین طلب کرے اور یہ باوجود مرید ہونے کے اپنی نفسانی ضرورت کو دین کی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے، لیکن آخر وہی صحابہؓ تھے کہ جنھوں نے اللہ کے لیے اپنے سر کٹوائے۔ ترقی ہمیشہ رفتہ رفتہ ہوتی ہے۔ ایک سال انسان کچھ کرتا ہے، دُوسرے سال کچھ، لیکن اگر بدظنی کریں تو اُس کی مثال یہ ہوگی کہ ایک مریض ہمارے پاس آتا ہے جو کہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہے اور ہم اُسے ایک دو دن دوا دیکر نکال دیں اور پورے طور پر لگ کر علاج نہ کریں۔ ہمارا کام تو رات دن اُن کے لیے دُعا، تضرّع اور ابتہال میں لگا رہنا ہے۔ مبلغین کا یہ کام نہیں ہوتا کہ ہر ایک بات پر چڑ کر لوگوں سے متنفر ہوتے رہیں۔ ابھی یہ لوگ قابلِ رحم ہیں اور خدا تعالیٰ اُن کی اصلاح کے سامان کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں سب ایک درجہ کے نہیں ہوتے۔ صحابہؓ میں سے بعض اس درجہ کے تھے کہ عنقریب نبی کے مقام پر پہنچ جاویں اور بعض ادنیٰ درجہ کے۔ جیسے دریا میں موتی بھی ہوتا ہے اور مونگا بھی اور

---

[1] مسجد کا لفظ اصل میں موجود نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے رہ گیا ہے۔ بعد کے فقرات اس کی وضاحت کر دیتے ہیں۔

سیپ بھی اور دوسری اشیاء مثل سونا اور دوسرے حیوانات کے۔ ایسا ہی جماعت کا حال ہوتا ہے۔

ہماری جماعت کو چاہیے کہ کسی بھائی کا عیب دیکھ کر اس کے لیے دعا کریں، لیکن اگر وہ دُعا نہیں کرتے اور اس کو بیان کر کے دور سلسلہ چلاتے ہیں تو گناہ کرتے ہیں۔ کونسا ایسا عیب ہے جو کہ دُور نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہمیشہ دُعا کے ذریعہ سے دوسرے بھائی کی مدد کرنی چاہیے۔

حکایت

ایک صُوفی کے دو مرید تھے۔ ایک نے شراب پی اور نالی میں بیہوش ہو کر گرا۔ دُوسرے نے صُوفی سے شکایت کی۔ اس نے کہا تُو بڑا بے اَدب ہے کہ اسکی شکایت کرتا ہے اور جا کر اُٹھا نہیں لاتا۔ وُہ اسی وقت گیا اور اُسے اُٹھا کر لے چلا۔ کہتے تھے کہ ایک نے تو بہت شراب پی لیکن دُوسرے نے کم پی کہ اُسے اُٹھا کر لے جا رہا ہے۔ صُوفی کا یہ مطلب تھا کہ تُو نے اپنے بھائی کی غیبت کیوں کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبت کا حال پُوچھا تو فرمایا کہ کسی کی سچی بات کا اسکی عدم موجودگی میں اس طرح سے بیان کرنا کہ اگر وہ موجود ہو تو اسے بُرا لگے غیبت ہے۔ اور اگر وہ بات اس میں نہیں ہے اور تُو بیان کرتا ہے، تو اس کا نام بہتان ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا۔ (الحجرات ؛ ۱۳) اس میں غیبت کرنے کو ایک بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ جو آسمانی سلسلہ بنتا ہے ان میں غیبت کرنے والے بھی ضرور ہوتے ہیں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر یہ آیت بے کار جاتی ہے۔ اگر مومنوں کو ایسا ہی مطہر ہونا تھا اور ان سے کوئی بدی سرزد نہ ہوتی، تو پھر اس آیت کی کیا ضرورت تھی؟ بات یہ ہے کہ ابھی جماعت کی ابتدائی حالت ہے۔ بعض کمزور ہیں جیسے سخت بیماری سے کوئی اٹھتا ہے۔ بعض میں کچھ طاقت آ گئی ہے۔ پس چاہیے کہ جسے کمزور پاوے اسے خفیہ نصیحت کرے۔ اگر نہ مانے تو اس کے لیے دعا کرے اور اگر دونوں باتوں سے فائدہ نہ ہو تو قضاء و قدر کا معاملہ سمجھے۔ جب خدا تعالیٰ نے ان کو قبول کیا ہوا ہے تو تم کو چاہیے کہ کسی کا عیب دیکھ کر سر دست جوش نہ دکھلایا جاوے۔ ممکن ہے کہ وہ دُرست ہو جاوے۔ قطب اور ابدال سے بھی بعض وقت کوئی عیب سرزد ہو جاتا ہے، بلکہ لکھا ہے القطب قد یزنی کہ قطب سے بھی زنا ہو جاتا ہے۔ بہت سے چور اور زانی آخر کار قطب اور ابدال بن گئے۔ جلدی اور عجلت سے کسی کو ترک کر دینا ہمارا طریق نہیں ہے۔ کسی کا بچہ خراب ہو تو اس کی اصلاح کے لیے وہ پُوری کوشش کرتا ہے۔ ایسے ہی اپنے کسی بھائی کو ترک نہ کرنا چاہیے، بلکہ اس کی اصلاح کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ عیب دیکھ کر اسے پھیلاؤ اور دُوسروں سے تذکرہ کرتے پھرو بلکہ وہ فرماتا ہے۔ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ (البلد : ۱۸) کہ وہ صبر اور رحم سے نصیحت کرتے ہیں۔ مرحمہ یہی ہے کہ دوسرے کے عیب دیکھ کر اسے نصیحت کی جاوے اور اس کے لیے دُعا بھی کی جاوے۔ دُعا میں بڑی

تاثیر ہے اور وہ شخص بہت ہی قابلِ افسوس ہے کہ ایک کے عیب کو بیان تو سو مرتبہ کرتا ہے لیکن دعا ایک مرتبہ بھی نہیں کرتا۔ عیب کسی کا اس وقت بیان کرنا چاہیے۔ جب پہلے کم از کم چالیس دن اس کے لیے رو رو کر دُعا کی ہو۔ سعدی نے کہا ہے ؎

خدا داند بپوشد
ہمسایہ نداند و خروشد

خدا تعالیٰ تو جان کر پردہ پوشی کرتا ہے مگر ہمسایہ کو علم نہیں ہوتا اور شور کرتا پھرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا نام ستّار ہے تمہیں چاہیے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ بنو۔ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ عیب کے حامی بنو بلکہ یہ کہ اشاعت اور غیبت نہ کرو، کیونکہ کتاب اللہ میں جیسا آگیا ہے تو یہ گناہ ہے کہ اس کی اشاعت اور غیبت کی جاوے۔ شیخ سعدیؒ کے دو شاگرد تھے۔ ایک ان میں سے حقائق و معارف بیان کیا کرتا تھا۔ دُوسرا جلا بُھنا کرتا تھا۔ آخر پہلے نے سعدیؒ سے بیان کیا کہ جب مَیں کچھ بیان کرتا ہوں تو دُوسرا جلتا ہے اور حسد کرتا ہے۔ شیخ نے جواب دیا کہ ایک نے راہ دوزخ کی اختیار کی کہ حسد کیا اور تُو نے غیبت کی۔ غرضیکہ یہ سلسلہ چل نہیں سکتا جبتک رحم، دُعا، ستاری اور مرحمہ آپس میں نہ ہو[1]

۲۱؍ جون ۱۹۰۴ء

منکرِ وفاتِ مسیح سے قسم کن الفاظ میں لی جائے

حضرتِ اقدس کے ایک مخلص حواری نے عرض کی کہ وزیرآباد میں ایک حافظ صاحب ہیں۔ وُہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ قسم کھا کر کہیں کہ عیسٰی علیہ السلام اسی جسدِ عنصری کے ساتھ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ :

جو شخص دلیری کرکے شوخی کی راہ سے فتنہ ڈالتا ہے خُدا اس سے خود سمجھ لیتا ہے۔ اگر اُس کو قسم کھانی ہے تو تین باتوں کی قسم کھائے۔

(۱) ایک تو یہ کہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ میں سے مسیح کی وفات ہرگز ثابت نہیں ہوتی اور یہاں تَوَفَّيْتَنِيْ کے وُہ معنے ہرگز نہیں ہیں جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس لفظ کے معنے کئے جاتے ہیں۔

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ صفحہ ۴ مورخہ ۸؍ جولائی ۱۹۰۴ء
نیز الحکم جلد ۸ نمبر ۲۳، ۲۴ صفحہ ۹، ۱۰ مورخہ ۱۷، ۲۴؍ جولائی ۱۹۰۴ء

(۲) دُوسری یہ بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح کو معراج کی شب میں اُن تمام انبیاء کی طرح نہیں دیکھا جو کہ وفات پاچکے ہیں بلکہ دُوسرے انبیاء کی ارواح کے خلاف حضرت مسیح کو معراج کی شب میں اس ہیئت اور شکل میں پایا جس سے اُن کا بجسدِ عنصری زندہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۳) تیسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر صحابہؓ کا اجماع جو آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ (آل عمران : ۱۴۵) کے ان معنوں پر ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر جس قدر نبی گذرے ہیں وُہ سب فوت ہو چکے ہیں۔ یہ بات غلط ہے کیونکہ ان تینوں باتوں میں اللہ تعالیٰ کا قول، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت اور صحابہؓ کا اجماع سب آجاتا ہے۔ پس ان تینوں باتوں پر وہ قسم کھاوے۔

۴۔ اور چوتھی بات یہ بھی ملاوے کہ ہم مفتری ہیں اور ۲۴ سال سے جو الہامات ہم سُنا رہے ہیں یہ خدا تعالیٰ پر افترا۔ باندھتے ہیں۔ اور قسم میں یہ بھی کہے کہ اگر اس میں مَیں نے کوئی بد نیتی کی ہے یا ایسی بات بیان کی ہے جو کہ میرے ذہن میں نہیں ہے تو اس کا وبال مجھ پر نازل ہو۔

فرمایا :

اگر یہ لوگ منہاجِ نبوت کو معیار ٹھہرا دیں تو آج فیصلہ ہوتا ہے۔

اس مقام پر نواب محمد علی صاحب نے عرض کی کہ ایک شخص نے مجھ سے حضور کے بارے میں بحث کرنی چاہی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ اوّل تم سب کتابیں حضرت مرزا صاحب کی مطالعہ کرو اگر اس میں سمجھ نہ آوے تو ایک ماہ قادیان چل کر رہو اور وہاں مرزا صاحب کے حالات وغیرہ کو آنکھ سے دیکھو۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی کرے۔

بعض دفعہ موت ہی انسان کے حق میں اچھی ہوتی ہے

فرمایا کہ :

اگر ہمارا کوئی مرید طاعون سے مرجاتا ہے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں ؛ حالانکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف بیعت کرنے والا ہی اس سے محفوظ رہے گا، بلکہ اس نے ایک دفعہ مجھے مخاطب کر کے فرمایا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (الانعام: ۸۳) یعنی بقدر دعویٰ کے ایمان میں کسی قسم کا ظلم نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ پوری وفا، پورا صدق اور اخلاص کا معاملہ ہو اور اس کی شناخت کامل ہو تو وہ شخص اس آیت کا مصداق ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ایسی بات ہے کہ جس کو سوائے خدا تعالیٰ کے اَور کوئی نہیں جان سکتا کہ آیا فلاں شخص میں پورا صدق و اخلاص ہے کہ نہیں۔ بعض وقت ایک

انسان کے حق میں موت ہی اچھی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ اسے اس ذریعہ سے آئندہ لغزش سے بچا لیتا ہے۔ (جیسے بعض کافروں کے حق میں زندگی اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ اُن کو آئندہ ایمان نصیب ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بعض مومن کے حق میں موت اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ اگر وُہ زندہ رہتا تو کافر ہو جاتا) کہ اس کا خاتمہ کفر پر نہ ہو۔

یہ طاعون اسی قسم کی ہے جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے عذاب کا وعدہ تھا۔ لیکن پھر صحابہ کرامؓ نے بھی آخر اُس سے حصّہ لیا اور اکثر شہید ہوئے۔ کفر کا استیصال ان کی شہادت کا ثبوت ہے پس اسی طرح یہاں بھی استیصالِ کفر ہو گا۔

کربلائیست سیر ہر آنم
صد حسین است در گریبانم

ایک صاحب نے جو کہ بیعت شدہ ہیں، عرض کی کہ بعض لوگ صرف اس لیے بیعت سے پرہیز کرتے ہیں کہ حضور نے حضرت حسینؓ سے بڑے ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ جیسے کہ یہ شعر مذکورہ بالا ہے۔ ایک شخص نے مجھ پر بھی یہ اعتراض کیا مگر چونکہ مجھے اس کی حقیقت معلوم نہ تھی، اس لیے مَیں ساکت ہو گیا۔

فرمایا کہ :

اوّل انسان کو اطمینانِ قلب ہونا چاہیے کہ آیا جس کو مَیں نے قبول کیا ہے وہ راستباز ہے کہ نہیں۔ مختصر کیفیت اس کی یہ ہے کہ جب انسان ایک دعویٰ کا مصدق ہوتا ہے۔ اور دعویٰ بھی ایسا ہو کہ اس کی بناء پر کوئی اعتراض نہ قائم ہوتا ہو تو اس قسم کے شکوک کا دروازہ خود ہی بند ہو جاتا ہے۔ مثلاً میرا دعویٰ ہے کہ مَیں وہ مسیح ہوں جس کا وعدہ قرآن شریف اور حدیث میں دیا گیا ہے۔ اب جبتک کوئی میرے اس دعوے کا مصدق نہیں ہے تب تک اس کو حق ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ نیک آدمی کے مقابل پر بھی وہ ہم پر اعتراض کرے۔ لیکن اگر کوئی بیعت کر کے دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے کہ مَیں سچا ہوں تو وہ پھر اعتراض کیوں کرتا ہے۔ (اُسے چاہیے تھا کہ بیعت سے پیشتر اس بات کا اطمینان حاصل کرتا کہ آیا آپ سچے ہیں کہ نہیں[1]) اس قسم کے معترضین

---

[1] حاشیہ : بریکٹ میں جو فقرات درج ہوتے ہیں یہ ڈائری نویس کی اپنی عبارت اور اپنا خیال ہوتا ہے جسے وہ بغرض تشریح خطوط وحدانی میں لکھ دیتے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب ؛ (خاکسار مرتب)

سے سوال کرنا چاہیے کہ جس مسیح کے وہ منتظر ہیں۔ آیا وہ اُن کے نزدیک از روئے اعتقاد حسینؓ سے افضل ہے کہ نہیں؟ اگر وہ اُسے افضل قبول کرتا ہے تو پھر ہم تو کہتے ہیں کہ ہم وہی ہیں۔ پہلے ہمارا وہی ہونا فیصلہ کرے پھر اعتراض خود بخود رفع ہو جاتے گا۔

یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے فیوض بے انتہا ہیں۔ جو اُن کو محدود کرتا ہے وہ اصل میں خدا کو محدود کرتا ہے اور اس کی کلام کو عبث قرار دیتا ہے۔ وہی بتلاوے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ : ۶، ۷) میں جب وہ انہی کمالات اور انعامات کو طلب کرتا ہے جو کہ سابقین پر ہوتے تو اب ان کو محدود کیسے مانتا ہے؟ اگر وہ محدود ہیں اور بقول شیعہ بارہ امامؑ تک ہی رہے تو پھر سورہ فاتحہ کو نماز میں کیوں پڑھتا ہے۔ وہ تو اس کے عقیدہ کے خلاف تعلیم کر رہی ہے اور خدا کو ملزم گردانتی ہے کہ ایک طرف تو وہ خود ہی کمالات کو بارہ امام تک ختم کرتا ہے اور پھر لوگوں کو قیامت تک ان کے طلب کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دیکھو مایوس ہونا مومن کی شان نہیں ہوتی اور ترقیات اور مراتب قرب کی کوئی حد بست نہیں ہے۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ کسی فردِ خاص پر ایک بات قائم کر دی جاوے۔ خدا تعالیٰ نے جیسا خاص طور پر ذکر کر دیا اور احادیث میں آگیا کہ فلاں زمانہ میں مسیح موعود ہوگا اور اس کی علامات، اس کا کام، اس کے حالات سب بتلا دیئے تو اب ہم سے یہ سوال کیوں ہوتا ہے کہ تم حسینؓ سے افضل کیوں بنتے ہو۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں فرمایا ہے کہ مسیح موعود حسینؓ سے افضل نہ ہوگا بلکہ کمتر ہوگا۔ ایسے معترضوں کو تم یہ جواب دو کہ ہم تو مسیح موعود مان چکے ہیں۔ اب تم اس امر کا ثبوت دو کہ آیا وہ امام حسینؓ سے کم ہوگا یا برابر یا افضل؟ بجز توہمات کے اُن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ جیسے ایک لاہوری شیعہ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر کُل انبیاء نے صرف حسین کی وجہ سے ہی نجات پائی ہے۔

خدا تعالیٰ کا جو معاملہ میرے ساتھ ہے اور وہ میرے ساتھ کلام کرتا ہے ایسا کوئی الہام حسینؓ کا تو پیش کرو۔ میں تو اپنی وحی پر ویسے ہی ایمان لاتا ہوں جیسے کہ قرآن شریف اور توریت کے کلام الٰہی ہونے پر۔ زیادہ سے زیادہ یہ لوگ امام حسینؓ کی فضیلت میں بعض ظنی احادیث پیش کریں گے اور میں وہ پیش کرتا ہوں جو یقینی ہے اور پھر خدا کا کلام ہے۔ بطور تنزّل کے میں اگر مان لوں کہ حسینؓ کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا مکالمہ ویسا ہی تھا جیسے کہ میرے ساتھ ہے تو پھر ان کے الہامات کا اور میرے الہامات کا مقابلہ کرو اور دیکھو کہ بڑھ چڑھ کر کس کا کلام ہے۔ اور اگر تم میرے الہامات کو ظنی مانتے ہو تو امام حسینؓ کے الہامات تو پہلے ہی سے ظنی ہیں پس دونوں ظنی الہاموں کا مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ خدا تعالیٰ نے جو مراتب میرے بیان کیے ہیں مثلاً
اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ عَرْشِيْ۔ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةٍ لَا يَعْلَمُهَا الْخَلْقُ۔ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ

تَوْحِيْدِيْ وَتَفْرِيْدِيْ۔ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ اَوْلَادِيْ۔ اَنْتَ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْكَ) کیا امام حسینؓ کے بھی مراتب بیان ہوئے ہیں؟ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں نہ امام حسینؓ کا نام لیا اور نہ یزید کا۔ اگر ذکر کیا ہے تو زید کا ذکر کیا ہے۔ یا بعض مفسروں نے ایک صحابی سجل کا لکھا ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے اس طرح سے دو صحابہ کا ذکر قرآن شریف میں ہوا ہے اور جو ہمیں مفتری سمجھتا ہے اور مفتری سمجھ کر پھر یہ اعتراض کرتا ہے تو اوّل وہ ہمارے افترا پر بحث کرے کہ آیا افترا ہے کہ نہیں۔

البدر جلد ۳ نمبر ۲۲-۲۳ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۸، ۱۶؍جون ۱۹۰۴ء[1]

بمقام گورداسپور

۳۰؍جون ۱۹۰۴ء

طعام اہلِ کتاب

امریکہ اور یورپ کی حیرت انگیز ایجادات کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی میں یہ ذکر بھی آگیا کہ دُودھ اور شوربا وغیرہ جو کہ ٹینوں میں بند ہو کر ولایت سے آتا ہے بہت ہی نفیس اور سُتھرا ہوتا ہے اور ایک خوبی ان میں یہ ہوتی ہے کہ ان کو بالکل ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔ دُودھ تک بھی بذریعہ مشین دوہا جاتا ہے۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰة والسلام نے فرمایا:

چونکہ نصاریٰ اس وقت ایک ایسی قوم ہو گئی ہے جس نے دین کی حدود اور اس کے حلال و حرام کی کوئی پروا نہیں رکھی اور کثرت سے سؤر کا گوشت اُن میں استعمال ہوتا ہے اور جو ذبح کرتے ہیں اس پر بھی خدا کا نام ہرگز نہیں لیتے بلکہ جھٹکے کی طرح جانوروں کے سر جیسا کہ سُنا گیا ہے علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لیے شُبہ پڑ سکتا ہے کہ بسکٹ اور دُودھ وغیرہ جو اُن کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہوں اُن میں سؤر کی چربی

---

[1] حاشیہ: شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ۲۱؍جُون کی ڈائری ۸، ۱۶؍جون کے پرچہ میں کیسے شائع ہو گئی تو واضح ہو کہ پرچہ دیر کے بعد شائع ہوا۔ جیسا کہ ایڈیٹر صاحب کی طرف سے ڈائری کے آخر میں یہ نوٹ موجود ہے:۔ ”کاتب کی مشکلات بدستور موجود ہونے کی وجہ سے اخبار میں دیر ہو رہی ہے۔ ان مشکلات کو اپنی ذاتی مشکلات جان کر امید ہے کہ ناظرین رنجیدہ خاطر نہ ہونگے۔ (خاکسار مرتب)

اور سؤر کے دودھ کی آمیزش ہو۔ اس لیے ہمارے نزدیک بسکٹ ولائتی اور اس قسم کے دُودھ اور شوربے وغیرہ استعمال کرنے بالکل خلافِ تقویٰ اور ناجائز ہیں جس حالت میں کہ سؤر کے پالنے اور کھانے کا عام رواج ان لوگوں میں ولایت میں ہے تو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ دُوسری اشیائے خوردنی جو کہ یہ لوگ تیار کر کے ارسال کرتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی حصّہ اس کا نہ ہوتا ہو۔

اس پر ابوسعید صاحب المعروف عرب صاحب تاجر برنج رنگون نے ایک واقعہ حضرت اقدس کی خدمت میں یوں عرض کیا کہ رنگون میں بسکٹ اور ڈبل روٹی بنانے کا ایک کارخانہ انگریزوں کا تھا۔ وُہ ایک مُسلمان تاجر نے قریب ڈیڑھ لاکھ روپے کے خرید لیا۔ جب اس نے حساب و کتاب کی کتابوں کو پڑتال کر کے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ سؤر کی چربی بھی اس کارخانہ میں خریدی جاتی رہی ہے۔ دریافت پر کارخانہ والوں نے بتایا کہ ہم اُسے بسکٹ وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ چیزیں لذیذ نہیں ہوتیں اور ولایت میں بھی یہ چربی ان چیزوں میں ڈالی جاتی ہے۔ اس واقعہ کے سُننے سے ناظرین کو معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا خیال کس قدر تقویٰ اور باریک بینی پر تھا۔ لیکن چونکہ ہم میں سے بعض ایسے بھی تھے جن کو اکثر سفر کا اتفاق ہوا ہے اور بعض بھائی افریقہ وغیرہ دُور دراز امصار و بلاد میں ابتک موجود ہیں جن کو اس قسم کے دُودھ اور بسکٹ وغیرہ کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، اس لیے اُن کو بھی مدنظر رکھ کر دوبارہ اس مسئلہ کی نسبت دریافت کیا گیا۔ نیز اہلِ ہنود کے کھانے کی نسبت عرض کیا گیا کہ یہ لوگ بھی اشیاء کو بہت غلیظ رکھتے ہیں اور ان کی کڑاہیوں کو اکثر کتے چاٹ جاتے ہیں۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ:

ہمارے نزدیک نصاریٰ کا وہ طعام حلال ہے جس میں شُبہ نہ ہو اور از روئے قرآن مجید وہ حرام نہ ہو۔ ورنہ اس کے یہی معنے ہوں گے کہ بعض اشیاء کو حرام جان کر گھر میں تو نہ کھایا، مگر باہر نصاریٰ کے ہاتھ سے کھا لیا۔ اور نصاریٰ پر ہی کیا منحصر ہے اگر ایک مُسلمان بھی مشکوک الحال ہو تو اس کا کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔ مثلاً ایک مُسلمان دیوانہ ہے اور اسے حرام و حلال کی خبر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کے طعام یا تیار کردہ چیزوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ہم گھر میں ولائتی بسکٹ نہیں استعمال کرنے دیتے بلکہ ہندوستان کی ہندو کمپنی کے منگوایا کرتے ہیں۔

عیسائیوں کی نسبت ہندوؤں کی حالت اضطراری ہے کیونکہ یہ کثرت سے ہم لوگوں میں مِل جُل گئے ہیں اور ہر جگہ انہیں کی دوکانیں ہوتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کی دوکانیں موجود ہوں۔ اور سب شئے وہاں ہی سے مِل جاوے

تو پھر البتہ ان سے خوردنی اشیاء نہ خریدنی چاہییں۔ علاوہ ازیں میرے نزدیک اہلِ کتاب سے غالباً مراد یہودی ہی ہیں، کیونکہ وہ کثرت سے اس وقت عرب میں آباد تھے اور قرآن شریف میں بار بار خطاب بھی انہیں کو ہے۔ اور صرف توریت ہی کتاب اس وقت تھی جو کہ حلت اور حُرمت کے مسئلے بیان کر سکتی تھی اور یہود کا اس پر اس امر میں جیسے عملدرآمد اس وقت تھا ویسے ہی اب بھی ہے۔ انجیل کوئی کتاب نہیں ہے۔

اس پر ابوسعید صاحب نے عرض کی کہ اھل الکتاب میں کتاب پر الف لام بھی اس کی تخصیص کرتا ہے۔ جس سے یہ مسئلہ اَور بھی واضح ہو گیا۔

دجّال شخص واحد بھی ہو سکتا ہے

خواجہ کمال الدین صاحب نے عرض کی کہ دجّال کے متعلق جو کچھ حضور نے بیان فرمایا ہے وہ بالکل حق ہے لیکن ایک دن میرے ذہن میں یہ بات گذری کہ دجّال ایک شخصِ واحد بھی گذرا ہے اور اس وقت جو دجّال موجود ہے وہ اس کا ظل اور اثر ہے کیونکہ موجودہ عیسویت دراصل وہ عیسویت نہیں ہے جو حضرت مسیح نے تعلیم کی بلکہ یہ پولوس کا مذہب ہے۔ جس نے ہر ایک حرام کو حلال کر دیا اور کفارہ وغیرہ کے مسئلہ کی مسئلہ کی بدعت ایجاد کی اور اس کی ایک آنکھ ہی تھی پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اس کا حُلیہ بیان کیا ہے ممکن ہے کہ مکاشفہ میں آپؐ کو وہی دکھایا گیا ہو اور اس کے متبعین نے ہی یہ تمام ایجادیں کی ہیں جس کو دجّال کی صفت اَور کانا ہوں کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ حضرت اقدس نے فرمایا:

ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے

تقدیر مُعلّق و مُبرَم

صدقات و خیرات سے بَلا کے ٹلنے کا ذکر ہوا۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تقدیر کے دو حصے کیوں ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ بعض دفعہ سخت خطرناک صورتیں پیش آتی ہیں اور انسان بالکل مایوس ہو جاتا ہے لیکن دُعا و صدقات و خیرات سے آخر کار وہ صورت ٹل جاتی ہے۔ پس آخر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر معلق تقدیر کوئی شے نہیں ہے اور جو کچھ ہے مبرم ہی ہے تو پھر دفعِ بَلا کیوں ہو جاتا ہے؟ اور دُعا و صدقہ خیرات وغیرہ کوئی شے نہیں ہے۔ بعض ارادے الٰہی صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ انسان کو ایک حد تک خوف دلایا جاوے اور پھر صدقہ و خیرات جب وہ کرے تو وہ خوف دُور کر دیا جاوے۔ دُعا کا اثر مثل نر و مادہ کے ہوتا

ہے کہ جب وہ شرط پوری ہو اور وقت مناسب مل جاوے اور کوئی نقص نہ ہو تو ایک امر ٹل جاتا ہے۔ اور جب تقدیر مبرم ہو تو پھر ایسے اسبابِ دُعا کی قبولیت کے بہم نہیں پہنچتے۔ طبیعت تو دعا کو چاہتی ہے مگر توجہ کامل میسّر نہیں آتی اور دل میں گداز پیدا نہیں ہوتا۔ نماز سجدہ وغیرہ جو کچھ کرتا ہے اس میں بدمزگی پاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام بخیر نہیں اور تقدیر مُبْرَم ہے۔[1]

اس مقام پر ایک شخص نے عرض کی کہ جب نواب محمد علی خانصاحب کا صاحبزادہ سخت بیمار ہوا تھا تو جناب کو اس قسم کا الہام ہوا کہ تقدیر مُبْرَم ہے اور موت مقدر ہے۔ لیکن پھر حضور کی شفاعت سے وہ تقدیر مبرم ٹل گئی۔ آپ نے فرمایا کہ :

سیّد عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض وقت میری دُعا سے تقدیر مبرم ٹل گئی ہے۔ اس پر شارح شیخ عبدالحق محدّث دہلی نے اعتراض کیا ہے کہ تقدیر مبرم تو ٹل نہیں سکتی پھر اس کے کیا معنے ہوتے۔ آخر خود ہی جواب دیا ہے کہ تقدیر مبرم کی دو اقسام ہیں۔ ایک مبرم حقیقی اور ایک مبرم غیر حقیقی۔ جو مبرم حقیقی ہے وہ تو کسی صورت سے ٹل نہیں سکتی ہے۔ جیسے انسان پر موت تو آتی ہے۔ اب اگر کوئی چاہے کہ اس پر موت نہ آوے اور یہ قیامت تک زندہ رہے تو یہ نہیں ٹل سکتی۔ دوسری غیر حقیقی وہ ہے جس میں مشکلات اور مصائب انتہائی درجہ تک پہنچ چکے ہوں اور قریب قریب نہ ٹلنے کے نظر آویں۔ اس کا نام مجازی طور پر مبرم رکھا گیا ہے، ورنہ حقیقی مبرم تو ایسی ہے کہ کُل انبیاء بھی مِل کر دُعا کریں کہ وہ ٹل جاوے تو وہ ہرگز نہیں ٹل سکتی۔

فرمایا کہ :

صبح کو یہ فقرہ الہام ہوا :

”خدا تیری ساری مرادیں پوری کر دے گا“

⁂

---

[1] الحکم :- صدقہ۔ صدق سے لیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں صدقہ دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ خُدا سے صدق رکھتا ہے۔ دُوسرا دُعا۔ دعا کے ساتھ قلب پُر سوز و گداز اور رقّت پیدا ہوتی ہے۔ دعا میں ایک قربانی ہے۔ صدق اور دعا اگر یہ دو باتیں میسّر آجاویں تو اکسیر ہیں۔

الحکم جلد ۸ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۴ء۔

رؤیا میں فرشتے دیکھنا

فرشتوں پر ذکر چل پڑا کہ یہ خواب میں ہمیشہ خوبصورت لڑکوں کی صورت و شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے چند ایک سابقہ رؤیا بیان فرمائے جن کو ہم اس نیت سے درج کر دیتے ہیں کہ اُن میں سے اگر کوئی شائع نہیں ہوا تو اب ہو جاتے۔

(۱)

ایک فرشتہ ایک چبوترہ پر بیٹھا ہے اور ایک عجیب روٹی نان کی شکل چمکتی ہوئی اس کے ہاتھ میں ہے وہ روٹی بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ قسم کی نظر آتی ہے۔ مجھے وہ روٹی دے کر کہتا ہے کہ یہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ کے درویشوں کے لیے ہے۔ اس رؤیا کو عرصہ قریبًا ۳۰ سال کا ہو گیا ہو گا۔

(۲)

فرمایا :

ایک فرشتہ کو مَیں نے ۲۰ برس کے نوجوان کی شکل میں دیکھا۔ صورت اس کی مثل انگریزوں کے تھی اور میز کرسی لگائے ہوئے بیٹھا ہے۔ مَیں نے اس سے کہا کہ آپ بہت ہی خوبصورت ہیں۔ اس نے کہا۔ ہاں مَیں درشنی آدمی ہوں۔ یہ رؤیا کوئی ۲۵ برس کا ہو گا۔[1]

رجوع کا صحیح وقت نزولِ بلا سے پہلے ہوتا ہے

عادت اللہ یہی ہے کہ جب انسان امن کے زمانہ میں ہو اور وہ گذر جاوے اور اس اثناء میں کوئی رجوع خدا تعالیٰ کی طرف حقیقی اور اخلاص سے نہ کیا ہو تو پھر خطرناک زمانہ میں واویلا شور مچانا اس کے کام نہیں آیا کرتے۔ یہ تو وہی فرعون کی مثال ہوتی کہ جب ڈوبنے لگا تو کہا کہ اب مَیں موسیٰ اور ہارون کے خدا پر ایمان لایا۔ مشکل یہ ہے کہ دُنیاداروں کو اُن کے اپنے سلسلوں اور پیچ در

---

[1] الحکم سے :- "اس سلسلہ کی بنیاد سے پہلے مَیں نے دیکھا۔ جب مرزا صاحب فوت ہوتے ہیں۔ مَیں اصل مکان موجودہ سلطان احمد والے میں ایک دالان میں بیٹھا ہوں۔ مغربی کوٹھڑی سے ایک برقع پوش عورت نکلی اور مجھے کہنے لگی۔ مَیں اس گھر سے جانے کو تھی مگر تیرے واسطے رہ گئی۔

جوان عورت اگر خواب میں دیکھی جاوے تو اس سے مراد دُنیا کے اقبال اور فتوحات ہوتے ہیں خواہ کسی قوم کی ہو۔"

الحکم جلد ۸ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۴ء

پیچ معاملات سے ہرگز فرصت نہیں ہے کہ وہ روح کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور خدا کا خوف بھی محسوس کریں۔ اگر کچھ خوف ہے تو گورنمنٹ کا اور امید ہے تو اسباب سے یا اپنے مکر و فریب سے۔ اس زمانہ میں جو توکل کا نام لے وہ دیوانہ اور مخبوط الحواس ہے۔ اس کا نام مسلوب العقل رکھا جاتا ہے۔ یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ قبل از نزولِ بلا وہ تبدیلی کر لے لیکن اگر کوئی تبدیلی نہیں کرتا اور اس کی نظر اسباب اور مکر و حیلہ پر ہے تو سوائے اس کے کہ وہ اپنے ساتھ گھر بھر کو تباہ کر دے اور کیا انجام ہو سکتا ہے کیونکہ مردِ گھر کا کشتی بان ہوتا ہے۔ اگر وہ ڈوبے گا تو کشتی بھی ساتھ ہی ڈوبے گی۔ اسی لیے کہا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: ۳۵) اسی کی رستگاری کے ساتھ اس کے اہل و عیال کی رستگاری ہے اور وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (الشمس: ۱۶) سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کو ان کے پسماندوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس وقت اس کی بے نیازی کام کرتی ہے۔[1]

۳؍جولائی ۱۹۰۴ء بمقام قادیان شریف

غربا کی دلجوئی

شام کا وقت تھا۔ بعد نماز مغرب مختلف بلاد سے جو لوگ زیارت اور بیعت سے شرف یاب ہونے کے لیے آتے ہوئے تھے۔ مثل پروانہ حضرت پر گر رہے تھے۔ اکثر حصّہ ان میں سے دیہات والوں کا تھا۔ جگہ کی تنگی اور مردمان کی کثرت دیکھ کر بعض نے کہا کہ لوگو پیچھے ہٹ جاؤ۔ حضرت جی کو تکلیف ہوتی ہے۔

اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ

کس کو کہا جاوے کہ تم پیچھے ہٹو۔ جو آتا ہے اخلاص اور محبت سے کر آتا ہے۔ سینکڑوں کوس کے سفر کر کے یہ لوگ آتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ کوئی دم صحبت حاصل ہو اور انہیں کی خاطر خدا تعالیٰ نے سفارش کی ہے اور فرمایا ہے وَلَا تُصَعِّرْ لِخَلْقِ اللّٰهِ وَلَا تَسْئَمْ مِنَ النَّاسِ۔ یہ صرف غریبوں کے حق میں ہے کہ جن کے کپڑے میلے ہوتے ہیں اور ان کو چنداں علم بھی نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ کا فضل ہی ان کی دستگیری کرتا ہے۔ کیونکہ امیر لوگ تو عام مجلسوں میں خود ہی پوچھے جاتے ہیں اور ہر ایک اُن سے با اخلاق پیش آتا ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے غریبوں کی سفارش کی ہے جو بیچارے گمنام زندگی بسر

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۷ صفحہ ۳،۴ مورخہ ۱۶؍جولائی ۱۹۰۴ء

کہتے ہیں۔ ؎

بہت تجسس کرنا جائز نہیں

ایک شخص نے سوال کیا کہ ہمارے شہر میں وجودی فرقہ کے لوگ کثرت سے ہیں۔ اور ذبیحہ وغیرہ انہیں کے ہاتھ سے ہوتا ہے کیا اس کا کھانا حلال ہے کہ نہیں؟ فرمایا کہ:

بہت تجسس کرنا جائز نہیں ہے۔ موٹے طور پر جو انسان مشرک یا فاسق ہو اس سے پرہیز کرو۔ عام طور پر اس طرح تجسس کرنے سے بہت سی مشکلات درپیش آتی ہیں۔ جو ذبیحہ اللہ کا نام لے کر کیا جاوے اور اس میں اسلام کے آداب مدِنظر ہوں وہ خواہ کسی کا ہو۔ جائز ہے۔

وجودی فرقہ کی بنا۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وجودی پیدا کہاں سے ہوئے۔ قرآن شریف اور اسلام میں تو ان کا پتہ نہیں ملتا مگر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو صرف دھوکا لگا ہوا ہے۔ جو راستباز اکابر گذرے ہیں وہ اصل میں فنائے نظری کے قائل تھے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان ہر ایک فعل اور حرکت اور سکون میں توجہ اللہ کی طرف رکھے اور اس قدر فانی اس میں ہو کہ گویا اور کسی شئے کی قدرت اور حرکت بذاتہٖ اُسے نظر نہ آوے۔ ہر ایک شئے کو فانی جانے اور اس قدر تصرفِ الٰہی اُسے نظر آوے کہ بلا ارادۂ الٰہی کے اور کچھ نہیں ہو رہا۔ اسی مسئلہ میں غلطی واقع ہو کر آخر فنا وجودی تک نوبت آگئی اور یہ کہنے لگے کہ سوائے خدا کے اور کوئی شئے نہیں ہے۔ اپنے آپ کو بھی خدا ماننے لگے۔ اس خیال سے یہ مذہب پھیلا ہے کہ فنائِ نظری کے شوق میں اولیاء اللہ سے کچھ ایسے کلمات نکلے ہیں کہ جن کی اُلٹی تاویل کر کے یہ وجودی فرقہ بن گیا ہے۔ فنائِ نظری تک انسان کا حق ہے کہ محبوب میں اور اپنے آپ میں کوئی جُدائی نہ سمجھے اور ؎

من تُو شُدم تُو من شُدی، من تن شُدم تُو جاں شُدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تُو دیگری

کا مصداق ہو۔ کیونکہ محب اور محبوب کا علاقہ فنائِ نظری کا تقاضا کرتا ہے اور ہر ایک سالک کی راہ میں ہے کہ وہ محبوب کے وجود کو اپنا وجود جانتا ہے لیکن فنائِ وجودی ایک من گھڑت بات ہے جسے ذوق شوق، محبت، صدق اور وفا اور اعمالِ صالحہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فنائِ نظری کی مثال وہی ہے جو ماں اور بچے کی ہے کہ اگر کوئی بچے کو کئی مارے تو درد ماں کو ہوتا ہے۔ سخت تعلق جو محبت کا ہے یہ اس سے بھی دردناک ہے اور

یہ ایک سچی اور حقیقی محبت ہوتی ہے لیکن وجُودی کا مدعا جھوٹا ہے۔ یہ وہ کرے جو خدا تعالیٰ پر محیط ہو۔ وجودی چونکہ ترکِ ادب کا طریق اختیار کرتا ہے۔ اس لیے طاعت، محبت، عبادتِ الٰہی سے محروم رہتا ہے۔[1]

۸ جولائی ۱۹۰۴ء

احاطہ عدالت

دنیوی تکالیف اور مصائب کی تلافی

فرمایا:

جن کو اللہ تعالیٰ دنیا میں تکالیف دیتا ہے اور جو لوگ خود خدا تعالیٰ کے لیے دُکھ اُٹھاتے ہیں۔ اُن دونوں کو خدا تعالیٰ آخرت میں بدلہ دیگا۔ دُنیا تو چلنے کا مقام ہے، رہنے کا نہیں۔ اگر کوئی شخص سارے سامان خوشی کے رکھتا ہے، تو خوشی کا مقام نہیں۔ یہ سب آرام اور دُکھ ختم ہونے والے ہیں اور اس کے بعد ایک ایسا جہان آنیوالا ہے جو دائمی ہے۔ جو لوگ اس مختصر جہان میں انسانی بناوٹ میں فرق اور کمی بیشی دیکھ کر دوسرے جنم کے گناہوں اور عملوں پر محمول کر لیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ وہ یہ معلوم نہیں کرتے کہ آخرت کا ایک بڑا جنم آنیوالا ہے اور جن کو خدا تعالیٰ نے پیدائش میں کوئی نقص عطا کیا ہے اور جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود بخود خدا تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دُکھوں میں ڈال دیا ہے ان دونوں کو وہاں چل کر بدلہ ملے گا۔ یہ جہان تو تخم ریزی کا جہان ہے اور ایسے موقع حاصل کرنے کے واسطے ہے۔ جن سے خدا تعالیٰ راضی ہو۔

بعض لوگ اپنے عملوں سے خدا کو راضی کرتے اور بعض اپنے آپ کو تکالیف میں ڈال کر خدا کو راضی کرتے ہیں۔ ایک شخص کے دو خدمتگار ہیں۔ ایک کو وہ ایسے کام اور سفر پر روانہ کرتا ہے کہ جہاں اس کو سواری مِل سکتی اور راستہ بھی سایہ دار اور ٹھنڈا ہے اور ہر طرح کا آرام ہے۔ دُوسرے خدمتگار کو ایسی طرف روانہ کرتا ہے جس راستہ میں نہ تو سواری مِل سکتی ہے اور نہ سایہ ہے بلکہ پیدل چلنا اور سخت گرمی اور دھوپ اور لُو کا سامنا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ جس کو جتنی تکلیف ہوگی اس کو اتنا ہی بدلہ اور عوضِ خدمت

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۸ صفحہ ۴ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۴ء
نیز الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵-۲۶ صفحہ ۱۱ مورخہ ۳۱ جولائی و ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء

دُوں گا۔ پس پھر ان دونوں خدمتگاروں کو اپنے سفر پر کیا اعتراض ہے؟ اسی طرح لنگڑے، اندھے، اپاہج، غریب، فقیر وغیرہ لوگ جو خدا تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں اُن کو جب اس آخری جہان میں چل کر بدلہ ملنا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ ہم گوناگوں جنم مان لیں اور اس بڑے اور حقیقی جنم سے اعراض کریں۔ جو دُکھ اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں۔ وہ تو ثواب حاصل کرنے کو دیئے ہیں۔ جبکہ وہ رحم کرنیوالا ہے تو کسی کو کسی طرح اور کسی کو کسی طرح بدلہ دیتا اور دیتا رہے گا۔ پس اپاہج اور اندھے وغیرہ کو اپنی ان نقائص خلقت کا بدلہ قیامت میں مل جاوے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص شاہی گھر میں پیدا ہوا ہے اور سارے سامان عیش و نشاط مہیا ہیں پر وُہ بار بار یک دربار یک دکھوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہے اور وہ شخص جو گدائی اور فقیری حیثیت میں بھیک مانگتا پھرتا ہے ایسے سُکھوں میں ہو کہ اس امیرزادے کو کبھی میسّر نہیں۔ پھر کیا کہیں دولت والے کو یہ حکم دیا ہے کہ اس سے عیاشی کر بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ غریب بھائی کی طرح عبادت کر۔ بہرحال یہ دُنیا چند روزہ ہے۔ انسان کیا سمجھتا ہے کہ میری عمر کس قدر ہے۔

عقیدہ تناسخ

جنم کی شکّی بات کو قبول کرنا عقل کا کام ہرگز نہیں۔ انسان جب پیدا ہوتا اور اپنی عمر طبعی پوری کر کے مرجاتا ہے تو کبھی کسی نے اُس شخص کو اِس جہان میں واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مثلاً بڑے بڑے عالم اور فاضل مرجاتے ہیں تو اُنھوں نے واپس آکر کبھی نہیں بتلایا کہ میں نے پچھلے جنم میں فلاں عِلم حاصل کیا تھا۔ ہزاروں جنم پائے اور علم وعمل حاصل کرتا رہا۔ مگر جب واپس آیا وہ پہلے علم وعمل ضائع ہوتے رہے۔ جس طرح وہ واپس آکر سب علوم بھلا دیتا بلکہ یہاں کا پہلا آنا بھی اس کو یاد نہیں رہتا، تو وہاں کیا یاد رکھے گا اور نجات کس طرح حاصل کرے گا۔ جو لوگ تناسخ کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ مکتی گیان سے ہوگی مگر کروڑ دفعہ کے جنم سے ایک حرف تک ان کو یاد نہیں رہتا اور جب آتا ہے خالی ہاتھ ہی آتا ہے۔ کچھ تو ساتھ لاوے۔ اگر کچھ ساتھ نہیں لاتا تو گیان کیا ہوا۔

غرض جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں۔ دم بند ہو گیا ہے۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں اور رُوح رخصت ہو گیا ہے۔ اسی طرح تم اس کے واپس آنے کا ثبوت پیش کر دو۔ تو ہم مان لیتے ہیں۔ واپس آنے کا ثبوت تو یہی تھا کہ اپنے کسی گیان کو ساتھ لے آتا۔ مگر یہ بیہودہ خیال ہے کہ وہ کسی گیان کو ساتھ لاوے۔ پس بغیر ثبوت کے ہم کیسے مان سکتے ہیں۔ بڑا مولوی اور بڑا پنڈت بن کر اس جگہ سے رخصت ہوا تھا۔ واپس آکر کچھ بھی یاد نہیں۔ جب وہاں جا کر سب کچھ بھول آتا ہے تو کسطرح معلوم ہو کہ یہ دُوسرا جنم لے کر آیا ہے۔ اگر صرف اس کمی بیشی کو پورا کرنے کے واسطے جنم مانتا ہے، تو ہم یوں کیوں نہ مان لیں کہ جس طرح یہاں تکلیف اُٹھاتا

ہے۔ اسی طرح[1] وہ خدا تعالیٰ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ عطا نہیں کرسکتا؟ مثلاً دیانند مرگیا ہے[2]۔ آجاوے تو ہم اسکو اس طرح شناخت کرسکیں گے کہ ستیارتھ پرکاش کا یا وید کا کچھ حصہ ہمیں پڑھ کر سُنا دیوے۔ پڑھا ہوا آدمی تو اگر بھینس کی شکل میں بھی آجاوے تو چاہیے کہ وُہ بھینس بھی طوطے کی طرح بولے۔ ہاں صوفیوں نے بھی یہ لکھا ہے ؎

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

مگر اس کے کچھ اور معنے ہیں یعنی جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف ترقی کرنے لگتا ہے تو پہلے اس کی حالت بہت اَبتر ہوتی ہے جس طرح ایک بچہ آج پیدا ہوا ہے تو اس میں صرف دُودھ چوسنے ہی کی طاقت ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ پھر جب غذا کھانے لگتا ہے تو آہستہ آہستہ غصہ، کینہ، خود پسندی، نخوت علیٰ ہذا القیاس سب باتیں اس میں ترقی کرتی جاتی ہیں اور دن بدن جُوں جُوں اس کی غذائیت بڑھتی جاتی ہے شہوات اور طرح طرح کے اخلاقِ ردیہ اور اخلاقِ فاضلہ زور پکڑتے جاتے ہیں اور اسی طرح ایک وقت پر اپنے پورے کمال انسانی پر جا پہنچتا ہے اور یہی اس کے جسمانی جنم ہوتے ہیں یعنی کبھی کُتے، کبھی سؤر، کبھی بندر، کبھی گاتے، کبھی شیر وغیرہ جانوروں کے اخلاق اور صفات اپنے اندر پیدا کرتا جاتا ہے گویا کل مخلوقات الارض کی خاصیت اس کے اندر ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ سلوک کا راستہ چلے گا تو یہ ساری خاصیتیں اس کو طے کرنی پڑیں گی اور یہی تناسخ اصفیاء نے مانا ہے اور اس کا اسلام اور قرآن بھی اقراری ہے۔ غالباً یہی تناسخ ہنود میں بھی تھا، مگر بے علمی سے دھوکہ لگا اور سمجھ اُلٹی ہوگئی۔ مگر دُنیا میں جس بات کو کوئی شخص مان بیٹھا ہے وہ اس کو چھوڑ نہیں سکتا، ورنہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ راستی کو دریافت کرکے ناراستی کو چھوڑ دیتے، مگر یہاں ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی ماننے نہیں دیتی۔

مکھیاں شہد بناتیں۔ ریشم کا کیڑا ریشم بناتا۔ موتی کا کیڑا موتی بناتا، بیل، گھوڑے، گاتے، جونک وغیرہ ہر ایک چیز انسان کے واسطے فائدہ مند ہے۔ اگر سب چیزیں اتفاقی ہیں، اور خدا تعالیٰ نے حکمت سے پیدا نہیں کیں تو پھر ایک وقت پر اپنا جنم پورا کرکے کُل گائیں، کل مکھیاں، کل گھوڑے وغیرہ سب جانور انسان بن جانے چاہئیں۔ تو پھر یہ چیزیں اور نعمتیں ایک وقت آنے پر دنیا سے نابُود ہو جانی چاہئیں۔

---

[1] البدر میں یہ فقرہ یوں درج ہے: (البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ، مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۴ء)
"اسی طرح کیا وہ خدا تعالیٰ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ عطا نہیں کرسکتا؟"

[2] البدر میں ہے: "اگر آجاوے" (حوالہ مذکور)

مگر جبتک انسان موجود ہے ان چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ پانی اور ہوا میں بھی کیڑے ہیں۔ پھلوں اور اناجوں میں بھی کیڑے ہیں جن کے بغیر انسان کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ پس یا تو تناسخ مانو یا خدا تعالیٰ کی حکمت مانو، مگر چونکہ انسان کا ان چیزوں کے سوائے گذارہ ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ ساری پیدائش حکمتِ الٰہی پر مبنی ہے[1]۔ والسلام ۝

---

۱۸ ؍ جولائی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ

مہر نبی بخش المعروف عبد العزیز نمبردار بٹالہ نے عرض کیا کہ مَیں علاقہ بار سے صرف اس خیال پر آیا ہوں کہ ایک تفسیرِ قرآن لکھوں جس سے لوگوں کے شکوک اور غلط معانی کی اصلاح کروں۔ اگر آپ مجھے امداد دیں تو مَیں موجودہ ثابت شدہ فلسفہ کے مطابق ترجمہ کرکے دکھلاؤں۔

فرمایا :

ہمارا مشرب تو کسی سے نہیں ملتا۔ ہم تو جو کچھ خدا سے پاتے ہیں خواہ اس کو عقل اور فلسفہ مانے یا نہ مانے ہم اس کو ضرور مانتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں؛ البتہ اہلِ عقل سے جو لوگ عقل کی پیروی کرتے ہیں وہ آپ کی بات پر توجہ کریں تو خوب ہے۔ آپ مولوی نورالدین صاحب سے مشورہ لیں۔ آجکل تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں کہ مروّجہ فلسفہ کی پیروی میں شائع ہوتے ہیں۔ مگر ہمارا مذہب یہ نہیں ہے۔ پر مَیں تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔ اس کو ضرور غور سے سُن لو۔ اگر خدا تعالیٰ نے تم سے کوئی ایسا عظیم الشان کام لینا ہوتا تو تمہارا ریہ[2] اور دماغ اچھا بناتا۔ مگر یہ مصلحتِ الٰہی ہے کہ وہ اچھا نہیں بنایا گیا بلکہ کمزور بنایا گیا ہے۔ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

تم اپنے آپ کو خوش باش رکھو اور خدا تعالیٰ کی منشاء کے خلاف نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۲ مورخہ ۱۰ ؍ جولائی ۱۹۰۴ء
نیز البدر جلد ۳ نمبر ۲۷ صفحہ ۷ مورخہ ۱۶ ؍ جولائی ۱۹۰۴ء

[2] ریہ پھیپھڑے کو کہتے ہیں (مرتب)

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (بنی اسرائیل : ۸۵) ہر شخص کرتا اور کر سکتا ہے، مگر اپنی بناوٹ پر۔ مثلاً ایک شخص کو تھوڑا ہی صدمہ دیکھ کر غشی لاحق ہو جاتی ہے۔ اب اس کو میدانِ جنگ میں تلوار دے کر بھیجا جاتا ہے۔ کیا وہ صرف بندوقوں کی آوازیں سُنکر ہی نہ مرجاوے گا۔ مَیں نے خود قادیان میں ایک شخص کو دیکھا ہے کہ اگر وہ بکرا ذبح ہوتا ہوا دیکھ لیتا ہے تو اس کو غش ہو جاتا تو اگر قصاب کا کام اس کے سپرد کیا جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ آپ ارادہ کرتے ہیں اختلاف مٹانے کا اور دماغ اور ریہ آپ کا بہت خراب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیماری مہلک ہو کر تمہارے اندر ہی اختلاف پیدا ہو جاوے۔ انسانی قویٰ تو بیشک ہر شخص کو ملے ہیں۔ مگر مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ دھوکہ نہیں کھاتا۔ پس آپ پر اس محنت کا پہلے بداثر ہو چکا ہے۔ آپ کم سے کم پہلے تمام ڈاکٹروں سے دریافت کریں کہ آپ اس محنت کے قابل ہیں یا نہیں۔ مَیں تو بمصداق اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ کے ایک امین اور شفیق ناصح ہو کر آپ کو صلاح دیتا ہوں کہ آپ کے قویٰ ایسے نہیں ہے کہ اس محنت کو برداشت کر سکیں۔ دوزخ کے سات دروازے ہیں اور بہشت کے آٹھ۔ جس رنگ سے اللہ تعالیٰ چاہے یقین عطا فرما دیوے۔ صحابہ کرامؓ نے علوم فلسفہ وغیرہ کہاں پڑھے تھے۔ جو اسرارِ الٰہی طبعیات اور فلسفہ وغیرہ میں بھرے پڑے ہیں جو شخص ان سب کو طے کرنا چاہتا ہے وہ جاہل اور بے نصیب رہے گا۔ مثلاً آگ گرم اور مہلک ہے۔ اس بات کو تو ہر شخص دریافت کر سکتا ہے پر جب اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیوں گرم ہے اور کیوں مہلک ہے تو یہاں فلسفہ ختم ہو جاوے گا۔ پس اسرارِ الٰہیہ کو حد تک کوئی نہیں پہنچا سکتا ؎

تو کارِ زمیں کے نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

پہلے ضرور ہے کہ اپنے گھر اور نفس کی صفائی کرو بعد میں لوگوں کی طرف توجہ کرنا۔

دُنیا میں چار موٹی باتیں ماننے کے قابل ہیں۔ ملائکہ، رُوحِ انسانی اور اس کا بقا بعد از مرگ۔ جنّات کا وجود۔ خدا تعالیٰ کا وجود۔ لوگوں نے سب سے پہلے جنّات کا انکار کیا۔ پھر ملائکہ کا۔ پس دو باتوں کو اُڑا کر اپنی اور خدا کی رُوح کے قائل ہو بیٹھے یعنی کچھ کرنا اور کچھ نہ کرنا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (بقرہ : ۸۶) اس میں پھر دہریوں نے ہی کمال کیا ہے کہ کچھ بھی نہ مانو اور سب کا انکار کرو۔

منشی صاحب مذکور نے سوال کیا کہ قرآنِ کریم میں بہت سارے لفظ زائد ہوتے ہیں اور ان کے معنے نہیں کیے جاتے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ فرمایا :

قرآن کریم بلکہ ہر زبان میں قرائن ہوتے ہیں اور یہ ایسے بہت سارے محاورے ہوتے ہیں۔ آپکو

صرف و نحو سے واقفیت نہیں۔

منشی صاحب نے کہا کہ مَیں نے صرف و نحو کو خوب پڑھا ہے۔ فرمایا :

موجودہ مروجہ صرف و نحو ناقص ہے اور آپ نے صرف و نحو کو کمال تک بھی نہیں پہنچایا۔ ہر ایک زبان کا ایک خاص محاورہ ہوتا ہے۔ جبتک انسان کی مادری زبان نہ ہو یا اس زبان میں اتنا کمال نہ ہو کہ مشابہ بہ مادری ہو جاوے، تب تک وُہ اس کو سمجھ نہیں سکتا پس اس امر کو زبان کے واقفوں سے دریافت کرو۔ اور دیکھو قومی محاورات میں کوئی اہلِ علم اعتراض نہیں کر سکتا۔

پھر سوال کیا کہ بعض لفظ لکھنے میں آتے اور پڑھنے میں نہیں آتے۔ فرمایا :

انگریزی زبان ہی کو لے لو اس میں بھی بہت سے ایسے حروف ہیں جو لکھنے میں تو آتے ہیں پڑھنے میں نہیں آتے۔ مَیں پھر یہی کہوں گا کہ آپ کو صرف و نحو کی واقفیت بالکل نہیں۔ یہ باتیں عمر کھا کے حاصل ہوتی ہیں۔ آپ کی عمر اس وقت آرام چاہتی ہے اور خیال آپ کو یہ لگ گیا ہے۔ پھر مجھے اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کہیں آپ یہ نہ کہہ دیں کہ مجھے قرآن کی خدمت سے روک دیا ہے۔ بہر حال مَیں تو پھر بھی یہی کہوں گا اور بطور نصیحت کہوں گا کہ راحت سے زندگی بسر کرو۔ آپ کا رعشہ بہت خراب ہے کوئی مہلک بیماری نہ ہو جاوے۔ ہاں ان لوگوں کے واسطے دُعا کر چھوڑو کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دیوے۔ اور قرآن سمجھنے کی ہر ایک کو توفیق دیوے۔ مخلوق کے تم ٹھیکیدار نہیں۔ اپنے آپ کو مشکلات میں نہ ڈالو اور نہ تمہارے قویٰ خدا تعالیٰ نے اس لائق بنائے ہیں۔ مَیں تو ہمیشہ آپ کو یہی کہوں گا اور یہی نصیحت کروں گا۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ والسّلام۔

عرش کی حقیقت

عرش کے متعلق سوال ہوا۔ آپ نے اپنی تقریر کے اس حصّہ کا اعادہ فرمایا جو کہ قبل ازیں کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ اور فرمایا کہ :

عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کا جھگڑا عبث ہے۔ احادیث سے اس کا جسم کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ ایک قسم کے علو کے مقام کا اظہار عرش کے لفظ سے کیا گیا ہے اگر اُسے جسم کہو تو پھر خُدا کو بھی مجسّم کہنا چاہیے یاد رکھنا چاہیے کہ اس کو علو جسمانی نہیں کہ جس کا تعلق جہات سے ہو بلکہ یہ رُوحانی علوّ ہے۔

عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کی بحث بھی ایک بدعت ہے جو کہ پیچھے ایجاد کی گئی۔ صحابہؓ نے اس کو مطلق نہیں چھیڑا۔ تو اب یہ لوگ چھیڑ کر نافہم لوگوں کو اپنے گلے ڈالتے ہیں۔ لیکن عرش کے اصل معنے اس وقت سمجھ میں آ سکتے ہیں جبکہ خدا تعالیٰ کے دوسری تمام صفات پر بھی ساتھ ہی نظر ہو۔[2]

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۳-۲۴ صفحہ ۱۶ مورخہ ۱۷-۲۴ جولائی ۱۹۰۴ء

[2] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵-۲۶ صفحہ ۱۴ مورخہ ۳۱ جولائی و ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء

نیز البدر جلد ۳ نمبر ۲۸ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۴ء

۲۱؍جولائی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

ترکِ گناہ

ایسی ہوا چلی ہے کہ گناہ کا چھوڑنا عیب خیال کرتے ہیں۔ اور جب کوئی گناہ کو چھوڑنا چاہتا ہے تو اُسے ایک حسرت ہوتی ہے کہ اب یہ ہاتھ سے گیا۔ اگر خدا تعالیٰ کی عظمت کو مدِ نظر رکھ کر بھی ترکِ گناہ کیا جاوے تو بھی اس کا بوجھ ہلکا ہو جاوے، لیکن اس کا خیال کسے ہے[1]۔

۲۵؍جولائی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

تعظیمِ قبلہ

سوال ہوا کہ اگر قبلہ شریف کی طرف پاؤں کر کے سویا جاوے تو جائز ہے کہ نہیں؟

فرمایا کہ:

یہ ناجائز ہے کیونکہ تعظیم کے برخلاف ہے۔

سائل نے عرض کی کہ احادیث میں اس کی ممانعت نہیں آئی۔ فرمایا کہ:

یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر کوئی اسی بناء پر کہ حدیث میں ذکر نہیں ہے اور اس لیے قرآن شریف پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا کرے، تو کیا یہ جائز ہو جاوے گا؟ ہرگز نہیں[2]۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (الحج: ۳۳)

۲۶؍جولائی ۱۹۰۴ء بمقام گورداسپور

اکرامِ ضیف

اعلیٰ حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مہمان نوازی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اعلیٰ اور زندہ نمونہ ہیں جن

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵-۲۶ صفحہ ۱۴ مورخہ ۳۱؍جولائی، ۱۰؍اگست ۱۹۰۴ء
نیز البدر جلد ۳ نمبر ۲۸ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴؍جولائی ۱۹۰۴ء

[2] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵-۲۶ صفحہ ۱۴ مورخہ ۳۱؍جولائی، ۱۰؍اگست ۱۹۰۴ء
نیز البدر جلد ۳ نمبر ۲۸ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴؍جولائی ۱۹۰۴ء

لوگوں کو کثرت سے آپ کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے وُہ خوب جانتے ہیں کہ کسی مہمان کو (خواہ وہ سلسلہ میں داخل ہو یا نہ داخل ہو) ذرا سی بھی تکلیف حضور کو بے چین کر دیتی ہے۔ مخلصین احباب کے لیے تو اَور بھی آپ کی رُوح میں جوشِ شفقت ہوتا ہے۔ اس امر کے اظہار کے لیے ہم ذیل کا ایک واقعہ دُرج کر دیتے ہیں :

میاں ہدایت اللہ صاحب احمدی شاعر لاہور پنجاب جو کہ حضرت اقدس کے ایک عاشق صادق ہیں۔ اپنی اِس پیرانہ سالی میں بھی چند دنوں سے گورداسپور آئے ہوئے تھے۔ آج انہوں نے رُخصت چاہی، جس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ :

آپ جا کر کیا کریں گے۔ یہاں ہی رہیے اکٹھے چلیں گے۔ آپ کا یہاں رہنا باعثِ برکت ہے۔ اگر کوئی تکلیف ہو تو بتلا دو اُس کا انتظام کر دیا جاوے گا۔

پھر اس کے بعد آپ نے عام طور پر جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

چونکہ آدمی بہت ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ کسی کی ضرورت کا علم (اہلِ عملہ کو) نہ ہو۔ اس لیے ہر ایک شخص کو چاہیے کہ جس شَے کی اُسے ضرورت ہو وہ بلا تکلف کہدے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر چھپاتا ہے تو وہ گنہگار ہے۔ ہماری جماعت کا اصول ہی بے تکلفی ہے۔

بعد ازیں حضرت اقدس نے میاں ہدایت اللہ صاحب کو خصُوصیت سے سید سرور شاہ صاحب کے سپُرد کیا کہ ان کی ہر ضرورت کو وہ بہم پہنچا دیں۔

سکھ مذہب اور عیسائیت

کل شام کو بعد از نماز مغرب دو نوجوان اکاؤنٹنٹ جنرل آفس لاہور کے کلارک جن میں سے ایک صاحب مسلمان تھے اور ایک عیسائی حضرت کی ملاقات کے لیے تشریف لائے؛ چونکہ مسلمان صاحب کا تعارف جناب مفتی محمد صادق صاحب سپرنٹنڈنٹ تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان سے تھا، اس لیے مفتی صاحب نے ان کو حضرت اقدس سے انٹروڈیوس کیا۔ مختصر حالات کے استفسار کے بعد حضور عیسائی نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ اوّل یہ سکھ مذہب کے تھے اور ان کے والد عیسائی تھے۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ آج کل اگر دنیا کے خُدا گنے جاویں ایک ضخیم کتاب طیار ہوتی ہے، لیکن تعجب کہ سکھ جیسے مذہب کو چھوڑ کر جس میں توحید کی تعلیم ہے آپ نے عیسائی مذہب کو کیسے پسند کیا۔ اس کے بعد متفرق طور پر مزاج پُرسی وغیرہ ہوتی رہی۔ اور

بر وقت رُخصت حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

ہمیں آپ کی ملاقات سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ قیام بہت تھوڑا ہے۔[1]

بلا تاریخ[2]

کوئی نسخہ حکمی نہیں

ہمارے گھر مرزا صاحب (عالی جناب مرزا غلام مرتضیٰ خانصاحب مرحوم) پچاس برس تک علاج کرتے رہے۔ وہ اس فن طبابت میں بہت مشہور تھے، مگر اُن کا قول تھا کہ کوئی حکمی نسخہ نہیں ملا۔ حقیقت میں اُنھوں نے سچ فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر کوئی ذرہ جو انسان کے اندر جاتا ہے کوئی اثر نہیں کرسکتا۔

حکام اور برادری سے سلوک

ایک شخص نے پوچھا کہ حکام اور برادری سے کیسا سلوک کریں؟ فرمایا:

ہر ایک سے نیک سلوک کرو۔ حکام کی اطاعت اور وفاداری ہر مسلمان کا فرض ہے۔ وہ ہماری حفاظت کرتے اور ہر قسم کی مذہبی آزادی ہمیں دے رکھی ہے۔ مَیں اس کو بڑی بے ایمانی سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کی اطاعت اور وفاداری سچے دل سے نہ کی جاوے۔

برادری کے حقوق ہیں۔ اُن سے بھی نیک سلوک کرنا چاہیے؛ البتہ ان باتوں میں جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف ہیں۔ ان سے الگ رہنا چاہیے۔

ہمارا اصول تو یہ ہے کہ ہر ایک سے نیکی کرو اور خدا تعالیٰ کی کل مخلوق سے احسان کرو۔

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵، ۲۶ صفحہ ۱۴ مورخہ ۳۱؍جولائی، ۱۰؍اگست ۱۹۰۴ء

نیز البدر جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴؍جولائی ۱۹۰۴ء

[2] ایڈیٹر صاحب الحکم نے "پرانی نوٹ بک میں سے کچھ" کے زیر عنوان یہ ملفوظات درج کیے ہیں۔ ان پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ معلوم ہوتا ہے مختلف تاریخوں کے ہیں۔ (خاکسار مرتب)

قبولیتِ دُعا کے آثار

جب اللہ تعالیٰ کا فضل قریب آتا ہے تو وہ دُعا کی قبولیت کے اسباب پہنچا دیتا ہے۔ دل میں ایک رقّت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے، لیکن جب دُعا کی قبولیت کا وقت نہیں ہوتا، تو دل میں اطمینان اور رجُوع پیدا نہیں ہوتا طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالو مگر طبیعت متوجہ نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی خدا تعالیٰ اپنی قضاء و قدر منوانا چاہتا ہے اور کبھی دُعا قبول کرتا ہے۔ اس لیے مَیں تو جبتک اذنِ الٰہی کے آثار نہ پاؤں قبولیت کی کم اُمید کرتا ہوں اور اس کی قضاء و قدر پر اس سے زیادہ خوشی کے ساتھ جو قبولیتِ دُعا میں ہوتی ہے راضی ہو جاتا ہوں، کیونکہ اس رضا بالقضاء کے ثمرات اور برکات اس سے بہت زیادہ ہیں۔

خدا تعالیٰ اعمالِ صالحہ کو چاہتا ہے

اللہ تعالیٰ پوست کو پسند نہیں کرتا۔ وُہ تو روحانیت اور مغز کو قبول کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا۔ لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (الحج : ۳۸) اور دُوسری جگہ فرمایا اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۔ (المائدۃ : ۲۸)

حقیقت میں یہ بڑی نازک جگہ ہے۔ یہاں پیغمبر زادگی بھی کام نہیں آسکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایسا ہی فرمایا۔ قرآن شریف میں بھی صاف الفاظ میں فرمایا : اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات : ۱۴)۔

یہودی بھی تو پیغمبر زادے ہیں۔ کیا صدہا پیغمبر اُن میں نہیں آتے تھے مگر اس پیغمبر زادگی نے اُن کو کیا فائدہ پہنچایا۔ اگر اُن کے اعمال اچھے ہوتے تو وہ ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ (البقرۃ : ۶۲) کے مصداق کیوں ہوتے۔ خدا تعالیٰ تو ایک پاک تبدیلی کو چاہتا ہے۔ بعض اوقات انسان کو تکبّرِ نسب بھی نیکیوں سے محروم کر دیتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ مَیں اسی سے نجات پاؤں گا، جو بالکل خیال خام ہے کبیؔر کہتا ہے کہ اچھا ہوا مَیں نے چماروں کے گھر جنم لیا ؎

کبیؔرا اچھا ہوا ہم نیچ بھئے سب کو کریں سلام

خدا تعالیٰ وفاداری اور صدق کو پیار کرتا ہے اور اعمالِ صالحہ کو چاہتا ہے۔ لاف و گزاف اُسے راضی نہیں کر سکتے۔

رفع عیسیٰ علیہ السلام

فرمایا :

قرآن شریف تو رفعِ اختلاف کے لیے آیا ہے۔ اگر ہمارے مخالف

رَافِعُكَ اِلَیَّ کے یہ معنے کرتے ہیں کہ مسیح جسم سمیت آسمان پر چڑھ گیا تو وہ ہمیں یہ بتائیں کہ کیا یہود کی یہ غرض تھی؟ اور وہ یہ کہتے تھے کہ مسیح آسمان پر نہیں چڑھا؟ اُن کا اعتراض تو یہ تھا کہ مسیح کا رفع الی اللہ نہیں ہوا۔ اگر رَافِعُكَ اِلَیَّ اُس اعتراض کا جواب نہیں تو پھر چاہیے کہ اس اعتراض کا جواب دیا اور دکھایا جاوے۔

مرکز میں آنے کی اصل غرض دین ہو

ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ مَیں تجارت کے لیے یہاں آنا چاہتا ہوں۔ فرمایا :

یہ نیّت ہی فاسد ہے۔ اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ یہاں تو دین کے واسطے آنا چاہیے۔ اور اصلاحِ عاقبت کے خیال سے یہاں رہنا چاہیے۔ نیّت تو یہی ہو۔ اور اگر پھر اس کے ساتھ کوئی تجارت وغیرہ یہاں رہنے کے اغراض کو پورا کرنے کے لیے ہو تو حرج نہیں ہے۔ اصل مقصد دین ہو نہ دنیا۔ کیا تجارتوں کے لیے شہر موزوں نہیں؟ یہاں آنے کی اصل غرض کبھی دین کے سوا اَور نہ ہو۔ پھر جو کچھ حاصل ہو جاوے وہ خدا تعالیٰ کا فضل سمجھو۔

ہمدردیٔ خلائق

بنی نوع انسان کی ہمدردی خصوصاً اپنے بھائیوں کی ہمدردی اور حمایت پر نصیحت فرماتے ہوئے ایک موقعہ پر فرمایا کہ :

میری تو یہ حالت ہے کہ اگر کسی کو درد ہوتا ہو اور مَیں نماز میں مصروف ہوں۔ میرے کان میں اس کی آواز پہنچ جاوے تو مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ نماز توڑ کر بھی اگر اس کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں تو فائدہ پہنچاؤں اور جہاں تک ممکن ہے اس سے ہمدردی کروں۔ یہ اخلاق کے خلاف ہے کہ کسی بھائی کی مصیبت اور تکلیف میں اس کا ساتھ نہ دیا جاوے۔ اگر تم کچھ بھی اس کے لیے نہیں کر سکتے تو کم از کم دعا ہی کرو۔

اپنے تو درکنار مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ غیروں اور ہندوؤں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق کا نمونہ دکھاؤ اور اُن سے ہمدردی کرو۔ لاابالی مزاج ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ایک مرتبہ مَیں باہر سیر کو جا رہا تھا۔ ایک پٹواری عبدالکریم میرے ساتھ تھا۔ وہ ذرا آگے تھا اور مَیں پیچھے۔ راستہ میں ایک بڑھیا کوئی ۷۰ یا ۷۵ برس کی ضعیفہ ملی۔ اس نے ایک خط اُسے پڑھنے کو کہا مگر اُس نے اُسے جھڑکیاں دے کر ہٹا دیا۔ میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے وہ خط مجھے دیا۔ مَیں اُس کو لے کر ٹھہر گیا اور اس کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھا دیا اس پر اسے سخت شرمندہ ہونا پڑا۔ کیونکہ ٹھہرنا تو

پڑا اور ثواب سے بھی محروم رہا۔

سلسلہ کا مستقبل

مجھے بڑے ہی کشفِ صحیح سے معلوم ہوا ہے کہ ملوک بھی اس سلسلہ میں داخل ہوں گے۔ یہانتک کہ وہ ملوک مجھے دکھائے بھی گئے ہیں۔ وُہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَیں تجھے یہانتک برکت دُوں گا کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ اللہ تعالیٰ ایک زمانہ کے بعد ہماری جماعت میں ایسے لوگوں کو داخل کرے گا اور پھر اُن کے ساتھ ایک دُنیا اس طرف رجُوع کرے گی[1]

آدابِ دُعا

دُعا میں جس قدر بیہودگی ہوتی ہے اسی قدر اثر کم ہوتا ہے۔ یعنی اس کی استجابت ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً ایک شخص ہے کہ اس کا گذارہ ایک دو روپیہ روزانہ میں بخوبی چل سکتا ہے لیکن وہ پچاس روپیہ روزانہ طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا سوال بیہودہ ہوگا۔ یہ ضروری امر ہے کہ ضرورتِ حقہ اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کی جاوے۔ جب کسی کی مصیبت کا خط آتا ہے اور اس میں دُعا کی درخواست ہوتی ہے تو دیکھا گیا ہے کہ دل خوب لگ کر دُعا کرتا ہے لیکن دُوسری بیہودہ درخواستوں میں اس قدر دل نہیں لگتا۔

عام لوگ جو آجکل دفعِ طاعون کے لیے دعا مانگتے ہیں اس پر آپ نے فرمایا کہ :

اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو منوانا چاہتا ہے۔ نِری دُعا سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے جبتک کہ عقائد کی اصلاح نہ ہو۔ ایسی دعائیں کیا بُت پرست نہیں مانگتے؟ پھر اُن میں اور اِن میں فرق کیا ہوا؟ بلکہ مجھے خیال آتا ہے۔ وَاِذَا سَاَ لَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ (البقرۃ : ۱۸۷) کے یہی معنے ہیں کہ اگر سوال ہو کہ خدا کا علم کیونکر ہوا تو جواب یہ ہے کہ اسلام کا خدا بہت قریب ہے۔ اگر کوئی اسے سچے دل سے بُلاتا ہے، تو وہ جواب دیتا ہے۔ دوسرے فرقوں کے خدا قریب نہیں ہیں بلکہ اس قدر دُور ہیں کہ ان کا پتہ ہی ندارد۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غرض عابد اور پرستار کی یہی ہے کہ اس کا قُرب حاصل ہو اور یہی ذریعہ ہے جس سے اس کی ہستی پر یقین حاصل ہوتا ہے۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرۃ : ۱۸۷) کے بھی یہی معنے ہیں کہ وہ جواب دیتا ہے گونگا نہیں ہے۔ دوسرے تمام دلائل اس کے آگے ہیچ ہیں۔ کلام ایک ایسی شئے ہے جو کہ دیدار کے قائمقام ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵-۲۶ صفحہ ۱۳ مورخہ ۳۱ ؍جولائی ، ۱۰ ؍اگست ۱۹۰۴ء

عذاب اور فسق

ایک تحصیلدار صاحب نے گورداسپور میں عرض کی کہ تجربہ ہوا ہے کہ خاص طاعون کے دنوں میں فسق بڑھ جاتا ہے، چنانچہ ایک گھر میں پے در پے طاعون سے موتیں ہوتی رہیں اور اس کے ساتھ ہی دیوار بہ دیوار ایک شخص ایک ہفتہ زناکاری میں مبتلا رہا۔ فرمایا کہ ؛

قرآن شریف سے بھی ایسا ثابت ہے جیسے کہ۔ اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل : ۱۷) یعنی جب اس قسم کے عذاب نازل ہوتے ہیں تو فاسقوں کو ڈھیل دی جاتی ہے کہ وہ جی بھر کر فسق کریں۔ پھر ان کو ایک ہی دفعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

لذاتِ دنیوی میں انہماک

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کافر وہ ہیں جو حیاتِ دُنیا پر راضی ہو گئے اور اطمینان پا گئے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی طرف حرکت کی ضرورت کو وہ بالکل محسوس ہی نہیں کرتے فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (الکہف : ۱۰۶) میں گناہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ ان لوگوں نے دُنیا کی خواہشوں کو مقدم رکھا ہوا تھا۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ دنیا کا حظ پا چکے۔ وہاں بھی گناہ کا ذکر نہیں بلکہ دنیا کی لذات جن کو خدا تعالیٰ نے جائز کیا ہے۔ اُن میں منہمک ہو جانے کا ذکر ہے۔ اس قسم کے لوگوں کا مرتبہ عند اللہ کچھ نہ ہو گا اور نہ اُن کو عزت کا مقام دیا جائے گا۔ شیریں زندگی اصل میں ایک شیطان ہے جو کہ انسان کو دھوکا دیتی ہے۔ مومن تو خود مصیبت خریدتا ہے ا ور نہ اگر وہ مداہنہ برتتے تو ہر طرح آرام سے رہ سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس طرح کرتے تو اس قدر جنگیں کیوں ہوتیں، لیکن آپؐ نے دین کو مقدم رکھا اس لیے سب دشمن ہو گئے۔

حُسنِ نیّت

ملازمت پیشہ لوگوں کو عبادت کا بڑا کم وقت ملتا ہے اور وہ دینی خدمات سے بھی محروم رہتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی آرام میں گذرتی ہے۔ تلخ زندگی کا اُن کو موقعہ ہی نہیں آتا۔ فرمایا کہ ؛

وہ بھی ایک تلخی کا حصّہ ہے، کیونکہ معاش کے لیے کرتا ہے اس لیے عبادت کا ثواب پاتا ہے۔ نیک نیتی سے اگر انسان چلے اور نیّت یہ ہو کہ بال بچوں کی پرورش اس لیے کرتا ہوں کہ وہ خادمِ دین ہوں تو اس پر بھی اُسے ثواب ملتا ہے۔

نبی اور اجتہادی غلطی

انبیاء کے دشمنوں کے دو گروہ ہوتے ہیں ایک وہ جو اُن کے مکذّب ہوتے ہیں۔ دُوسرے وہ جو اُن کو خدا مانتے ہیں۔ اہلِ اسلام کا عقیدہ جو مسیح علیہ السّلام کے دوبارہ آنے کا ہے وہ اسی قسم کا ہے کہ یہ لوگ اُن کے مکذّب تو نہیں ہیں، لیکن ان کو خُدا ضرور مانتے ہیں کہ ہر ایک اس کی صفت میں اُسے شریک کیا ہوا ہے؛ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ بعض وقت نبی کو اجتہاد اور تفہیمِ الہام میں غلطی ہو جاتی ہے۔ یہ غلطی اگر احکامِ دین کے متعلق ہو تو اُن کو فوراً متنبہ کیا جاتا ہے۔ لیکن دُوسرے اُمور میں ضروری نہیں کہ وہ اطلاع دیئے جاویں۔ پس اس لیے یہ بات ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام کو اُن کے دوبارہ آنے کے بارے میں جو الہامات ہوتے خود انھوں نے بھی اسے حقیقی معنوں پر حمل کر لیا ہو کیونکہ ان کا مخطی ہونا تو ثابت ہے، اس لیے انجیلوں میں ان کا یہ فقرہ نقل ہوا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس زمانہ کے لوگ زندہ ہوں گے کہ میں دوبارہ آجاؤں گا۔ اس قسم کی اجتہادی غلطی کا امکان ہر ایک نبی سے ہے۔ اب دیکھو کہ مسیح علیہ السلام سے تو ایک اجتہادی غلطی ہوئی لیکن دوسروں کو کس قدر وبال آیا۔ اگر ان مسلمانوں کو یہ سمجھ ہوتی تو وہ دُوسرے نبیوں سے ان کو کیوں زیادہ مرتبہ دیتے۔ مُسلمانوں پر یہ بات لازم نہیں ہے کہ وہ انجیل کے الفاظ پر ضرور اڑیں۔ مسیح علیہ السلام کو یہ خاص عزّت دیں کہ وہ مخطی نہیں یہ تو اسلام سے خارج ہونا ہے۔

چند فقہی مسائل

سفر گورداسپور میں نماز کے متعلق ذیل کے مسائل میری موجودگی میں حل ہوتے۔
(ڈائری نویس)

(۱) ایک مقام پر دو جماعتیں نہ ہونی چاہییں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت اقدس ابھی وضو فرما رہے تھے اور مولانا محمد احسن صاحب بوجہ ملالتِ طبع نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ میں معذور ہوں الگ پڑھ لوں، مگر چند ایک احباب ان کے پیچھے مقتدی بن گئے اور جماعت ہو گئی۔ جب حضرت اقدس کو علم ہوا کہ ایک دفعہ جماعت ہو چکی ہے اور اب دوسری ہونے والی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ؛

ایک مقام پر دو جماعتیں ہرگز نہ ہونی چاہییں

(۲) ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضورِ اقدس اپنی کوٹھڑی میں تھے اور ساتھ ہی کوٹھڑی میں نماز ہونے لگی۔ آدمی تھوڑے تھے۔ ایک ہی کوٹھڑی میں جماعت ہو سکتی تھی بعض احباب نے خیال کیا کہ شاید حضرت اقدس اپنی کوٹھڑی میں ہی نماز ادا کریں گے، کیونکہ امام کی آواز وہاں پہنچتی ہے۔ اس پر آپؑ نے

فرمایا کہ:

جماعت کے ٹکڑے الگ الگ نہ ہونے چاہئیں بلکہ اکٹھی پڑھنی چاہیے۔ ہم بھی وہاں ہی پڑھیں گے۔ یہ اس صورت میں ہونا چاہیے جبکہ جگہ کی قلت ہو۔

۳۔ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل خان صاحب گورداسپور میں مقیم تھے اور احمدی جماعت نزیل قادیان بہ باعث سفر میں ہونے کے نماز جمع کر کے ادا کرتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مسئلہ پوچھا۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

مقیم پوری نماز ادا کریں

وہ اس طرح ہوتی رہی کہ جماعت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نماز ادا کرتے۔ جماعت دو رکعت ادا کرتی، لیکن ڈاکٹر صاحب باقی کی دو رکعت بعد از جماعت ادا کر لیتے۔ ایک دفعہ حضرتؑ اقدس نے دیکھ کر کہ ڈاکٹر صاحب نے ابھی دو رکعت ادا کرنی ہے۔ فرمایا کہ:

ٹھہر جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب دو رکعت ادا کر لیویں

پھر اس کے بعد جماعت دوسری نماز کی ہوئی۔ ایسی حالتِ جمع میں سنت اور نوافل ادا نہیں کیے جاتے۔

۴۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے۔ آپ نے پانی مانگا۔ جب پانی آیا تو اُسے بیٹھ کر آپ نے پیا اور بھی کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ پانی وغیرہ آپ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیتے ہیں۔[1]

۱۷؍اگست ۱۹۰۴ء بمقام قادیان ۔ بوقت شام

صوفیا کا ملامتی فرقہ اور ریاء

شام کی نماز کے بعد چند ایک احباب نے بیعت کی۔ ان میں ایک صاحب ایسے تھے جو کہ اپنے زمانہ جہالت میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو سخت الفاظ سے یاد کرتے اور بہت ہی بُرا بھلا کہتے تھے۔ وہ اپنی ان خطاؤں کی معافی حضرت اقدس علیہ السلام سے طلب کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتا ہے۔ اس اثناء میں اس تائب کا دل اپنے گناہوں کو یاد کر کے

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۲۹ صفحہ ۳، ۴ مورخہ یکم اگست ۱۹۰۴ء

بھر آیا اور پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگ گیا۔ روتا جاتا تھا اور گناہوں کی مغفرت کی دعا بھی کرتا جاتا تھا۔ اس کی اس حالت کو جناب حکیم نورالدین صاحب نے دیکھ کر عرض کی کہ ایسے ہی مذنب ہیں جنکو خدا تعالیٰ بخش دیتا ہے۔ اس پر سلسلہ کلام چل پڑا اور حضرت اقدس نے ذیل کی تقریر شروع کی۔ فرمایا کہ :

ذنوب آدمی کو اسی لیے قُرب بخشتے ہیں بشرطیکہ ساتھ توبہ اور استغفار بھی ہو اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خطا اور صغائر میں انبیا کو بھی شریک کر دیا ہے تاکہ قُربِ الٰہی کے مراتب میں وہ ترقی کر سکیں۔ فرقۂ ملامتی کو مَیں پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ پر غیر کے وجود کو بڑا خیال کرتے ہیں اور اپنے اعمالِ صالحہ کو پوشیدہ رکھ کر مخلوق کی نظروں میں مُتہَم (جائے تہمت) ہونا چاہتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ دوسرے وجود کو تو لاشیٔ خیال کرنا چاہیے اور کسی کے ضرر اور نفع پر نظر ہرگز نہ رکھنی چاہیے۔ نہ کسی کی مدح سے پھُولے اور دل میں خوش ہو اور نہ کسی کی ذم سے رنجیدہ خاطر ہو۔ سچے موحد وہی ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے سوا کسی دُوسرے وجود کو کوئی شئے خیال نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ فرقۂ ملامتی اس توحید سے گرا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مومنوں کی صفت فرمائی ہے۔ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (المائدۃ:۵۵) کہ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں خوف کھاتے اور صرف اپنے مولا کی رضامندی کو مقدم رکھتے ہیں۔

مومن ایک لاپروا انسان ہوتا ہے۔ اُسے صرف خدا تعالیٰ کی رضامندی کی حاجت ہوتی ہے اور اسی کی اطاعت کو وہ ہر دم مدِّنظر رکھتا ہے۔ کیونکہ جب اس کا معاملہ خدا سے ہے تو پھر اُسے کسی کے ضرر اور نفع کا کیا خوف ہے۔ جب انسان خدا تعالیٰ کے بالمقابل کسی دوسرے کے وجُود کو دخل دیتا ہے، تو ریاء اور عُجب وغیرہ معاصی میں مبتلا ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ دخل دہی ایک زہر ہے اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے اوّل جزو لَآ اِلٰہَ میں اس کی بھی نفی ہے، کیونکہ جب انسان کسی انسان کی خاطر خدا تعالیٰ کے ایک حکم کی بجا آوری سے قاصر رہتا ہے تو آخر اُسے خدا کی کسی صفت میں شریک کرتا ہے تبھی تو قاصر رہتا ہے اس لیے لَآ اِلٰہَ کہتے وقت اس قسم کے معبودوں کی بھی نفی کرتا ہے۔

صُوفیوں نے اس قسم کے ملامتی لوگوں کے بہت سے قصے لکھے ہیں۔ امام غزالی (علیہ الرحمۃ) نے بھی لکھا ہے کہ آجکل کے فُقراء ریاکار ہوتے ہیں۔ تن کی آسانی کو مدِّنظر رکھ کر موٹے جھوٹے کپڑے تو پہنتے نہیں اس لیے باریک کپڑوں کو گیرو یا سبز رنگ لیتے ہیں اور اُن کے جبّے پہن کر اپنے کو فقراء مشہور کرتے ہیں مقصُود ان کا یہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے متمیّز ہوں اور عوام الناس خصُوصیت سے اُن کی طرف دیکھیں۔ پھر روزہ داروں کا ذکر لکھا ہے کہ کوئی روزہ دار مولوی کسی کے ہاں جاوے اور اُسے مقصود ہو کہ اپنے روزہ کا اظہار کرے تو

مالکِ خانہ کے استفسار پر بجائے اس کے کہ سچ بولے کہ مَیں نے روزہ رکھا ہوا ہے اس کی نظروں میں بڑا نفس کُش ثابت کرنے کے لیے جواب دیا کرتے ہیں کہ مجھے عذر ہے۔ غرضیکہ اسی طرح کے بہت سے مخفی گناہ ہوتے ہیں جو اعمال کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

کِبر اور نخوت

امراء کو کبر اور نخوت لگے رہتے ہیں جو کہ ان کے عملوں کو کھاتے رہتے ہیں۔ اس لیے بعض غریب آدمی جن کو اس قسم کے خیالات نہیں ہوتے وہ سبقت لے جاتے ہیں۔

غرضیکہ ریاء وغیرہ کی مثال ایک چُوہے کی ہے جو کہ اندر ہی اندر اعمال کو کھاتا رہتا ہے۔ خُدا تعالیٰ بڑا کریم ہے لیکن اس کی طرف آنے کے لیے عجز ضروری ہے۔ جس قدر انانیت اور بڑائی کا خیال اس کے اندر ہوگا خواہ وہ علم کے لحاظ سے ہو، خواہ ریاست کے لحاظ سے۔ خواہ مال کے لحاظ سے، خواہ خاندان اور حسب نسب کے لحاظ سے، تو اسی قدر پیچھے رہ جاوے گا۔ اسی لیے بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ سادات میں سے اولیاء کم ہوئے ہیں، کیونکہ خاندانی تکبّر کا خیال ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ قرونِ اولیٰ کے بعد جب یہ خیال پیدا ہوا تو یہ لوگ رہ گئے۔

اس قسم کے حجاب انسان کو بے نصیب اور محروم کر دیتے ہیں۔ بہت ہی کم ہیں جو ان سے نجات پاتے ہیں۔ امارت اور دولت بھی ایک حجاب ہوتا ہے۔ امیر آدمی کو کوئی غریب سے غریب اور ادنیٰ آدمی السلام علیکم کہے تو اُسے مخاطب کرنا اور وعلیکم السلام کہنا اس کو عار معلوم ہوتا ہے اور خیال گذرتا ہے کہ یہ حقیر اور ذلیل آدمی کب اس قابل ہوتا ہے کہ ہمیں مخاطب کرے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ غریب امیروں سے پانصد سال پیشتر جنّت میں جاویں گے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس حدیث کے معانی کیا ہیں، لیکن ہم ان الفاظ پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ غریبوں کا تزکیۂ نفس قضاء قدر نے خود ہی کیا ہوتا ہے

حصولِ فضل کی راہیں

یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے حاصل کرنے کے دو راہ ہیں۔ ایک تو زُہد نفس کشی اور مجاہدات کا ہے اور دُوسرا قضاء و قدر کا۔ لیکن مجاہدات سے اس راہ کا طے کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس میں انسان کو اپنے ہاتھ سے اپنے بدن کو مجروح اور خستہ کرنا پڑتا ہے۔ عام طبائع بہت کم اس پر قادر ہوتی ہیں کہ وُہ دیدہ و دانستہ تکلیف جھیلیں لیکن قضاء و قدر کی طرف سے جو واقعات اور حادثات انسان پر آ کر پڑتے ہیں وہ ناگہانی ہوتے ہیں اور جب آ پڑتے ہیں تو قہرِ درویش بر جان درویش ان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے جو کہ اس کے تزکیۂ نفس کا باعث ہو جاتا ہے جیسے شہداء کو دیکھو کہ جنگ کے بیچ میں لڑتے لڑتے جب مارے جاتے ہیں تو خدا تعالےٰ کے

نزدیک کس قدر اجر کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ درجاتِ قرب بھی ان کو قضا و قدر سے ہی ملتے ہیں؛ ورنہ اگر تنہائی میں اُن کو اپنی گردنیں کاٹنی پڑیں تو شاید بہت تھوڑے ایسے نکلیں جو شہید ہوں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ غُربا کو بشارت دیتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ (البقرۃ : ١٥٦، ١٥٧) اس کا یہی مطلب ہے کہ قضا و قدر کی طرف سے ان کو ہر ایک قسم کے نقصان پہنچتے ہیں اور پھر وہ صبر کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی عنایتیں اور رحمتیں ان کے شاملِ حال ہوتی ہیں، کیونکہ تلخ زندگی کا حصّہ ان کو بہت ملتا ہے لیکن امراء کو یہ کہاں نصیب۔ امیروں کا تو یہ حال ہے کہ پنکھا چل رہا ہے۔ آرام سے بیٹھے ہیں۔ خدمتگار چائے لایا ہے۔ اگر اس میں ذرا سا قصور بھی ہے۔ خواہ میٹھا ہی کم یا زیادہ ہے تو غصہ سے بھر جاتے ہیں۔ خدمتگار پر ناراض ہوتے ہیں۔ بہت غصہ ہو تو مارنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ یہ مقام شکر کا ہے کہ اُن کو ہل جوتنا نہیں پڑا۔ کاشتکاری کے مصائب برداشت نہیں کیے۔ چولہے کے آگے بیٹھ کر آگ کے سامنے تپش کی شدت برداشت نہیں کی اور پکی پکائی شئے محض خدا کے فضل سے سامنے آگئی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خدا کے احسانوں کو یاد کر کے رطب اللسان ہوتے۔ لیکن اس کے سارے احسانوں کو بھول کر ایک ذرا سی بات پر سارا کیا کرایا رائیگاں کر دیتے ہیں؛ حالانکہ جیسے وُہ خدمتگار انسان ہے اور اس سے غلطی اور بھول ہو سکتی ہے ویسے ہی وُہ (امیر) بھی تو انسان ہے۔ اگر اس خدمتگار کی جگہ خود یہ کام کرتا ہوتا تو کیا یہ غلطی نہ کرتا؟ پھر اگر ماتحت آگے سے جواب دے تو اس کی اَور شامت آتی ہے اور آقا کے دل میں رہ رہ کر جوش اُٹھتا ہے کہ یہ ہمارے سامنے کیوں بولتا ہے اور اسی لیے وہ خدمتگار کی ذلّت کے دَرپے ہوتا ہے؛ حالانکہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے زبان کشائی کرے۔ اس پر مجھے ایک بات یاد آئی ہے کہ سلطان محمودؔ کی (یا ہارون الرشید کی) ایک کنیز تھی۔ اُس نے ایک دن بادشاہ کا بستر جو کیا تو اُسے گدگدا اور ملائم اور پھُولوں کی خوشبو سے بسا ہوا پا کر اس کے دل میں آیا کہ مَیں بھی لیٹ کر دیکھوں تو سہی اس میں کیا آرام حاصل ہوتا ہے۔ وہ لیٹی تو اسے نیند آگئی۔ جب بادشاہ آیا تو اُسے سوتا پا کر ناراض ہوا اور تازیانہ کی سزا دی۔ وہ کنیز روتی بھی جاتی اور ہنستی بھی جاتی۔ بادشاہ نے وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ روتی تو اس لیے ہوں کہ ضربوں سے دَرد ہوتی ہے اور ہنستی اس لیے ہوں کہ مَیں چند لمحہ اس پر سوئی تو مجھے یہ سزا ملی اور جو اس پر ہمیشہ سوتے ہیں ان کو خدا معلوم کس قدر عذاب بھگتنا پڑے گا۔

غربت ایک کیمیا ہے

پس غریبوں کو ہرگز بے دل نہ ہونا چاہیے۔ ان کا قدم آگے ہی ہے، لیکن وہ کوشش کریں کہ تھوڑی بہت جو کسر ہے وہ نکال دیں کیونکہ بعض وقت ان لوگوں سے غریبی میں بھی بڑے بڑے گناہ صادر ہو جاتے ہیں۔ صبر نہیں کرتے خدا تعالیٰ کو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔ معاش کی قلّت ہو تو چوری، ڈاکہ اور دوسرے جرائم شروع کر دیتے ہیں۔ ایسی حالتوں میں صبر کرنا چاہیے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف ہرگز مائل نہ ہونا چاہیے۔ غُربت اور کم رزقی دراصل انسان کو انسان بنانے کے لیے بڑی کیمیا ہے؛ بشرطیکہ اس کے ساتھ اَور قصور نہ ہوں۔ جیسے مالداروں میں تکبّر اور نخوت وغیرہ پیدا ہو کر ان کے اعمال کو تباہ کر دیتے ہیں ویسے ہی ان میں بے صبری موجبِ ہلاکت ہوتی ہے۔ اگر غریب لوگ صبر سے کام لیں تو ان کو وہ حاصل ہو جو اَور لوگوں کو مجاہدہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ نے اصل میں بڑا احسان کیا ہے کہ انبیاء کے ساتھ غریبی کا حصّہ بھی رکھ دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بکریاں چرایا کرتے تھے۔ موسیٰؑ نے بکریاں چرائیں۔ کیا امراء یہ کام کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک جنگل میں ہوا۔ وہاں کچھ پھل دار درخت تھے۔ چند ایک صحابی جو کہ ہمراہ تھے وہ ان کا پھل توڑ کر کھانے لگے تو آپؐ نے فرمایا کہ فلاں درخت کا پھل کھاؤ بہت شیریں ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یا حضرت آپ کو کیسے علم ہے؟ فرمایا کہ جب مَیں بکریاں چرایا کرتا تھا تو اس جنگل میں بھی آیا کرتا اور ان پھلوں کو کھایا کرتا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تجویز نہیں کیا کہ انبیاء شاہی خاندان سے ہوں؛ ورنہ تکبّر اور نخوت کا کچھ نہ کچھ حصّہ ان میں ضرور رہ جاتا۔ اور پھر نبوّت کے بھی دو حصّے کر دیئے۔ ایک مصائب اور شدائد کا اور دوسرا فتح و نُصرت کا۔ انبیاء کی زندگی کے ان دو حصّوں میں بھی الٰہی حکمت تھی۔ ایک تو یہی تھی کہ ان کے اخلاق میں ترقی ہو۔ اور سچی بات یہی ہے کہ جُوں جُوں نبوّت کا زمانہ گذرتا ہے اور واقعات اور حادثات کی صورت بدلتی جاتی ہے انبیاء کی اخلاقی حالت بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ ابتداء میں ممکن ہے کہ غصّہ وغیرہ زیادہ ہو۔ اس لیے نبی کی زندگی کا آخری حصّہ بہ نسبت پہلے کے بلحاظ اخلاق کے بہت ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ ابتداء میں ان کے اخلاق عام لوگوں سے ترقی یافتہ نہیں ہوتے بلکہ یہ مراد ہے کہ اپنے دائرہ نبوّت میں وہ آخری حصّہ عمر میں بہت مؤدب ہوتے ہیں، ورنہ ان کی ابتدائی زندگی کا حصّہ بھی اخلاق میں تو کُل لوگوں سے اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ نبی اگر شدائد اور مصائب سے امن میں رہے تو اُن کی صبر کی قوت کا پتہ لوگوں کو کیسے معلوم ہو۔ پھر بہت سے اخلاقِ فاضلہ اس قسم کے ہیں کہ وہ صرف نزولِ مصائب

پر ہی حاصل ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا تعالیٰ کا بڑا فضل و احسان تھا کہ آپؐ کو دونوں موقع عطا کیے۔ ہر ایک نبی کا یہ کام نہیں کہ وہ ہر ایک رتبہ کے لوگوں کو ایک کامل نمونہ اخلاق کا پیش کرسکے۔ فقیر، غریب اور امیر وغیرہ ہر ایک اس کے چشمہ سے مساوی سیراب ہوں۔ یہ صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات سے ہے جس نے کُل ضرورتوں کو پورا کرکے دکھایا۔

تعلیم کے ساتھ اُسوَہ کی ضرورت

فرقہ چکڑالوی نے بھی یہاں ہی ٹھوکر کھائی ہے۔ اس نے یہ نہیں سمجھا کہ بغیر نمونہ کے دُوسرا انسان اِتباع کیسے پُوری کرسکتا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (آل عمران : ۳۲) کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک طبقہ کے انسان کو مخاطب کیا ہے کہ ہر ایک قسم کا سبق مجھ سے لو۔ اور ظاہر ہے کہ جبتک ایک اُسوہ سامنے نہ ہو۔ انسان عملدرآمد سے قاصر رہتا ہے۔ ہر ایک قسم کے کمال کے حصول کے لیے نمونہ کی ضرورت ہے۔ انسانی طبائع اسی قسم کی واقع ہوئی ہیں کہ وہ صرف قول سے متأثر نہیں ہوتیں جب تک اس کے ساتھ فعل نہ ہو۔ اگر صرف قول ہو تو صدہا اعتراض لوگ کرتے ہیں۔ دین کی باتوں کو سُنکر کہا کرتے ہیں کہ یہ سب باتیں کہنے کی ہیں کون ان کو بجا لا سکتا ہے۔ یُونہی بنا چھوڑی ہیں۔ اور ان اعتراضوں کا رد نہیں ہوسکتا جبتک ایک انسان عمل کرکے دکھلانے والا نہ ہو

دُعا کے آداب

دُعا کے لیے انسان کو اپنے خیال اور دل کو ٹٹولنا چاہیے کہ آیا اس کا میلان دنیا کی طرف ہے یا دین کی طرف یعنی کثرت سے وہ دُعائیں دنیاوی آسائش کے لیے ہیں یا دین کی خدمت کے لیے۔ پس اگر معلوم ہو کہ اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہوئے اسے دنیاوی افکار ہی لاحق ہیں اور دین مقصود نہیں تو اسے اپنی حالت پر رونا چاہیے۔ بہت دفعہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ کمر باندھ کر حصولِ دنیا کے لیے مجاہدے اور ریاضتیں کرتے ہیں۔ دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ بعض مجنون ہو جاتے ہیں۔ لیکن سب کچھ دین کے لیے ہو تو خدا تعالیٰ ان کو کبھی ضائع نہ کرے۔ قول اور عمل کی مثال دانہ کی ہے۔ اگر کسی کو ایک دانہ دیا جاوے اور وہ اسے لے جا کر رکھ چھوڑے اور استعمال نہ کرے تو آخر اُسے پڑے پڑے گھن لگ جاوے گا۔ ایسے ہی اگر قول ہو اور اس پر عمل نہ ہو تو آہستہ آہستہ وہ قول بھی نہ رہے گا۔ اس لیے اعمال کی طرف سبقت کرنی چاہیئے[1]

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۳۱ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۱۶؍اگست ۱۹۰۴ء

۹ر اگست ۱۹۰۴ء

بمقام قادیان

اپنی نیک نیت میں فرق نہ لاؤ

بعض لوگوں کے ایک مسجد کے تنازعہ پر آپ نے فرمایا:

خُدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ زیادہ بزرگ تم میں سے وُہ ہے جو تقویٰ میں زیادہ ہے۔ جیسے قرآن شریف میں ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات: ۱۴) اور متقیوں کے صفات میں سے ہے کہ وُہ بالغیب ایمان لاتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرۃ: ۴) یعنی علم، مال اور دُوسرے قویٰ ظاہری اور باطنی جو کچھ دیا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا تعالیٰ نے بڑے بڑے وعدے انعام کے کئے ہیں۔

انسان ایک کارِ خیر کے لیے جب نیت کرتا ہے تو اس کو چاہیے کہ پھر اس میں کسی قسم کا فرق نہ لاوے۔ اگر کوئی دُوسرا جو اس میں حصّہ لینے والا تھا یا نہ تھا، مزاحم ہو اور بد دیانتی کرے تو بھی اوّل الذکر کو چاہیے کہ وہ کسی قسم کا تغیر اپنے ارادہ میں نہ کرے۔ اس کو اس کی نیت کا اجر ملے گا اور دُوسرا اپنی شرارت کی سزا پاوے گا۔

دُنیا میں لوگوں کو ایک یہ بھی بڑی غلطی لگی ہے کہ دُوسرے سے مقابلہ کے وقت یا اس کی نیت میں فرق آتا دیکھ کر اپنی نیت کو جو خیر پر مبنی ہوتی ہے، بدل دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے بجائے ثواب کے عذاب حاصل ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لیے نقصان روا نہیں رکھتا وہ عنداللہ کسی اجر کا بھی مستحق نہیں۔ خدا کے لیے تو جان تک دریغ نہ کرنی چاہیے۔ پھر زمین وغیرہ کیا شئے ہے۔ جس قدر کوئی دُکھ اٹھانے کے لیے تیار ہوگا اتنا ہی اُسے ثواب ملے گا۔ اگر کوئی شخص یہ اصول اختیار نہیں کرتا تو اس نے ابھی تک ہمارے سلسلہ کا مطلب اور مقصُود ہی نہیں جانا۔ جو لوگ اس جماعت میں داخل ہیں۔ اگر وہ عام لوگوں کے سے اخلاق، مروّت اور ہمدری برتتے ہیں تو اُن میں اور دُوسرے لوگوں سے کیا فرق ہوا؟ شریر کی شرارت کو شریر کے حوالہ کرو۔ اور اپنے نیک جوہر دکھاؤ۔ تب تمیز ہوگی۔ دنیاوی تنازعات کے وقت مالی نقصان برداشت کرنے اور ضبطِ نفس سے کام لینے کے سوا چارہ نہیں ہوا کرتا اور نہ انسان کو ہمیشہ اس قسم کے مواقع ہاتھ آتے ہیں کہ وہ فطرت کے یہ نیک جوہر دکھا سکے۔ اس لیے اگر کوئی ایسا موقعہ ہاتھ آ جاوے تو اُسے غنیمت خیال کرنا چاہیے۔

مساجد کی اہمیت اور برکات

اس وقت ہماری جماعت کو مساجد کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ خانۂ خدا ہوتا ہے۔ جس گاؤں یا شہر میں ہماری جماعت کی مسجد قائم ہو گئی تو سمجھو کہ جماعت کی ترقی کی بنیاد پڑ گئی۔ اگر کوئی ایسا گاؤں ہو یا شہر جہاں مُسلمان کم ہوں یا نہ ہوں اور وہاں اسلام کی ترقی کرنی ہو تو ایک مسجد بنا دینی چاہیے پھر خدا خود مسلمانوں کو کھینچ لاوے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قیامِ مسجد میں نیّت بہ اخلاص ہو۔ محض للہ اُسے کیا جاوے۔ نفسانی اغراض یا کسی شر کو ہرگز دخل نہ ہو۔ تب خدا برکت دے گا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مسجد مرصّع اور پکی عمارت کی ہو۔ بلکہ صرف زمین روک لینی چاہیے اور وہاں مسجد کی حد بندی کر دینی چاہیے اور بانس وغیرہ کا کوئی چھپر وغیرہ ڈال دو کہ بارش وغیرہ سے آرام ہو۔ خدا تعالےٰ تکلّفات کو پسند نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد چند کھجوروں کی شاخوں کی تھی اور اسی طرح چلی آئی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اس لیے کہ ان کو عمارت کا شوق تھا۔ اپنے زمانہ میں اسے پختہ بنوایا۔ مجھے خیال آیا کرتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ اور عثمانؓ کا قافیہ خوب ملتا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے ان کو ان باتوں کا شوق تھا۔ غرضیکہ جماعت کی اپنی مسجد ہونی چاہیے جس میں اپنی جماعت کا امام ہو اور وعظ وغیرہ کرے۔ اور جماعت کے لوگوں کو چاہیے کہ سب مل کر اسی مسجد میں نماز باجماعت ادا کیا کریں۔ جماعت اور اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ پراگندگی سے پھوٹ پیدا ہوتی ہے اور یہ وقت ہے کہ اس وقت اتحاد اور اتفاق کو بہت ترقی دینی چاہیے اور ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے جو کہ پھوٹ کا باعث ہوتی ہیں۔

نفسِ لوّامہ

مولوی تاج محمود صاحب ساکن لالیاں نے بڑھ کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مصافحہ کیا اور نماز میں سرور اور لذّت کے لیے دُعا کی درخواست کی۔ فرمایا کہ :

دُعا کرتے رہو۔ اور کراتے رہو۔ ایک کارڈ روزانہ لکھ دیا کرو کہ دُعا یاد آ جایا کرے۔ طبیعت پر جبر کر کے جو کام کیا جاتا ہے ثواب اسی کا ہوتا ہے اور اسی کا نام نفسِ لوّامہ ہے کہ طبیعت آرام کرنا چاہتی ہے اور محبوباتِ نفسانی کی طرف کھچی جاتی ہے مگر وہ بزور اسے مغلوب کر کے خدا کے احکام کے ماتحت چلاتا ہے اس لیے اجر پاتا ہے۔ ثواب کی حد نفسِ لوّامہ تک ہی ہے اور اسے ہی خدا نے پسند کیا ہے؛ چنانچہ قرآنِ شریف میں بھی قَسَم نفس لوّامہ کی ہی خدا نے کھائی ہے۔ مطمئنہ کی نہیں کھائی، کیونکہ مطمئنہ میں جا کر ثواب نہیں رہتا۔ کیونکہ وہاں کوئی کشاکشی اور جنگ نہیں۔ وہ تو امن کی حالت ہے۔

سونے چاندی اور ریشم کا استعمال

عرض کی گئی کہ چاندی وغیرہ کے بٹن استعمال کئے جاویں؟ فرمایا کہ:

۳۔۴ ماشہ تک کوئی حرج نہیں، لیکن زیادہ کا استعمال منع ہے۔ اصل میں سونا چاندی عورتوں کی زینت کے لیے جائز رکھا ہے۔ ہاں علاج کے طور پر ان کا استعمال منع نہیں۔ جیسے کسی شخص کو کوئی عارضہ ہو اور چاندی سونے کے برتن میں کھانا طبیب بتلاوے تو بطور علاج کے صحت تک وہ استعمال کر سکتا ہے۔

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اُسے جوئیں بہت پڑی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے حکم دیا کہ تُو ریشم کا کُرتہ پہنا کر اس سے جُوئیں نہیں پڑتیں۔ (ایسے ہی خارش والے کے لیے ریشم کا لباس مفید ہے۔)

سُود

سُود کی بابت پُوچھا گیا کہ بعض مجبوریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ فرمایا کہ:

اس کا فتویٰ ہم نہیں دے سکتے۔ یہ بہر حال ناجائز ہے۔ ایک طرح کا سُود اسلام میں جائز ہے کہ قرض دیتے وقت کوئی شرط وغیرہ کسی قسم کی نہ ہو اور مقروض جب قرضہ ادا کرے۔ تو مروّت کے طور پر اپنی طرف سے کچھ زیادہ دے دیوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے۔ اگر دس روپے قرض لیے تو ادائگی کے وقت ایک سو تک دے دیا کرتے۔ سُود حرام وہی ہے جس میں عہد معاہدہ اور شرائط اوّل ہی کر لی جاویں[1] ؎

۲۱ر اگست ۱۹۰۴ء

بمقام لاہور:۔ احاطہ میاں چراغ دین و سراج دین رئیسانِ لاہور۔

ظُہر کے وقت حضرت اقدس تشریف لائے اور نماز با جماعت ادا کرنے کے بعد احباب کی درخواست پر آپ ایک کُرسی پر رونق افروز ہوئے۔ میاں فیروز الدین صاحب نے آگے بڑھ کر نیاز حاصل کی۔ حضرت اقدس نے چند نصائح فرماتے ہوئے تقریر کا سلسلہ یوں شروع کیا:

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۴ء

تمام گناہوں سے بچنے کا ذریعہ خوفِ الٰہی ہے

دیکھو یاد رکھنے کا مقام ہے کہ بیعت کے چند الفاظ جو زبان سے کہتے ہو کہ مَیں گناہ سے پرہیز کروں گا۔ یہی تمہارے لیے کافی نہیں ہیں اور نہ صرف ان کی تکرار سے خدا راضی ہوتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک تمہاری اس وقت قدر ہوگی جبکہ دلوں میں تبدیلی اور خدا تعالیٰ کا خوف ہو؛ ورنہ ادھر بیعت کی اور جب گھر میں گئے تو وہی بُرے خیالات اور حالات رہے تو اس سے کیا فائدہ؟ یقیناً مان لو کہ تمام گناہوں سے بچنے کے لیے بڑا ذریعہ خوفِ الٰہی ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو ہرگز ممکن نہیں کہ انسان اُن سب گناہوں سے بچ سکے جو کہ اسے مصری پر چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ مگر خوف ہی ایک ایسی شئے ہے کہ حیوانات کو بھی جب ہو تو وہ کسی کا نقصان نہیں کر سکتے۔ مثلاً بلّی جو کہ دُودھ کی بڑی حریص ہے۔ جب اُسے معلوم ہو کہ اُس کے نزدیک جانے سے سزا ملتی ہے پرندوں کو جب علم ہو کہ اگر یہ دانہ کھایا تو جال میں پھنسے اور موت آئی، تو وہ اس دُودھ اور دانہ کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ اس کی وجہ صرف خوف ہے۔ پس جبکہ لایعقل حیوان بھی خوف کے ہوتے ہوئے پرہیز کرتے ہیں تو انسان جو عقلمند ہے، اُسے کس قدر خوف اور پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ امر بہت ہی بدیہی ہے کہ جس موقعہ پر انسان کو خوف پیدا ہوتا ہے اس موقعہ پر وُہ جرم کی جرأت ہرگز نہیں کرتا۔ مثلاً طاعون زدہ گاؤں میں اگر کسی کو جانے کو کہا جاوے، تو کوئی بھی جرأت کر کے نہیں جاتا حتیٰ کہ اگر حکام بھی حکم دیویں تو بھی ترساں اور لرزاں جائیگا اور دل پر یہ ڈر غالب ہوگا کہ کہیں مجھ کو بھی طاعون نہ ہو جاوے اور وہ کوشش کرے گا کہ مفوضہ کام کو جلد پُورا کر کے وہاں سے بھاگے۔ پس گناہ پر دلیری کی وجہ بھی خدا کے خوف کا دلوں میں موجود نہ ہونا ہے۔ لیکن یہ خوف کیونکر پیدا ہو۔ اس کے لیے معرفتِ الٰہی کی ضرورت ہے۔ جس قدر خدا تعالیٰ کی معرفت زیادہ ہوگی اسی قدر خوف زیادہ ہوگا ؎

ہر کہ عارف تر است ترساں تر

اس امر میں اصل معرفت ہے اور اس کا نتیجہ خوف ہے۔ معرفت ایک ایسی شئے ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے انسان ادنیٰ ادنیٰ کیڑوں سے بھی ڈرتا ہے۔ جیسے پسّو اور مچھر کی جب معرفت ہوتی ہے تو ہر ایک اُن سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ خدا جو قادرِ مطلق اور علیم اور بصیر ہے اور زمینوں اور آسمانوں کا مالک ہے، اس کے احکام کے برخلاف کرنے میں یہ اس قدر جرأت کرتا ہے۔ اگر سوچ کر دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ معرفت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت طلب کرو

بہت ہیں کہ زبان سے تو خدا تعالیٰ کا اقرار کرتے ہیں، لیکن اگر ٹٹول کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر دہریت ہے۔ کیونکہ دُنیا کے کاموں میں جب مصروف ہوتے ہیں تو خدا تعالیٰ کے قہر اور اس کی عظمت کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات بہت ضروری ہے کہ تم لوگ دُعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے معرفت طلب کرو۔ بغیر اس کے یقین کامل ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ اس وقت حاصل ہوگا جبکہ یہ علم ہو کہ اللہ تعالےٰ سے قطع تعلق کرنے میں ایک موت ہے۔ گناہ سے بچنے کے لیے جہاں دعا کرو وہاں ساتھ ہی تدابیر کے سلسلہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑو اور تمام محفلیں اور مجلسیں جن میں شامل ہونے سے گناہ کی تحریک ہوتی ہے ان کو ترک کرو اور ساتھ ہی دُعا بھی کرتے رہو۔ اور خوب جان لو کہ ان آفات سے جو قضاء و قدر کی طرف سے انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ جبتک خدا تعالیٰ کی مدد ساتھ نہ ہو۔ ہرگز رہائی نہیں ہوتی۔ نماز جو کہ پانچ وقت ادا کی جاتی ہے اس میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اگر وہ نفسانی جذبات اور خیالات سے اُسے محفوظ نہ رکھے گا تب تک وہ سچی نماز ہرگز نہ ہوگی۔ نماز کے معنے ٹکریں مار لینے اور رسم اور عادت کے طور پر ادا کرنے کے ہرگز نہیں۔ نماز وہ شئے ہے جسے دل بھی محسوس کرے کہ رُوح پگھل کر خوفناک حالت میں آستانۂ الوہیت پر گر پڑے۔ جہانتک طاقت ہے وہاں تک رقت کے پیدا کرنے کی کوشش کرے اور تضرع سے مانگے کہ شوخی اور گناہ جو اندر نفس میں ہیں وُہ دُور ہوں۔ اسی قسم کی نماز بابرکت ہوتی ہے اور اگر وہ اس پر استقامت اختیار کرے گا تو دیکھے گا کہ رات کو یا دن کو ایک نُور اس کے قلب پر گرا ہے اور نفسِ امارہ کی شوخی کم ہوگئی ہے۔ جیسے اژدہا میں ایک سمّ قاتل ہے۔ اسی طرح نفس اماره میں بھی سمِّ قاتل ہوتا ہے اور جس نے اُسے پیدا کیا۔ اُسی کے پاس اُس کا علاج ہے۔

کبھی یہ دعویٰ نہ کرو کہ مَیں پاک صاف ہوں جیسے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ فَلَا تُزَکُّوْۤا اَنْفُسَکُمْ (النجم : ۳۳) کہ تم اپنے آپ کو مُزکّٰی مت کہو۔ وُہ خود جانتا ہے کہ تم میں سے متقی کون ہے۔ جب انسان کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اُس کا متولّی اور متکفّل ہو جاتا ہے۔ اور جیسے ماں بچے کو گود میں پرورش کرتی ہے اسی طرح وہ خدا کی گود میں پرورش پاتا ہے اور یہی حالت ہے کہ خدا تعالیٰ کا نُور اس کے دل پر گِر کر کل دنیاوی اثروں کو جلاتا ہے اور انسان ایک تبدیلی اپنے اندر محسوس کرتا ہے، لیکن ایسی حالت میں بھی اُسے ہرگز مطمئن نہ ہونا چاہیے کہ اب یہ طاقت مجھ میں مستقل طور پر پیدا ہوگئی ہے اور کبھی ضائع نہ ہوگی۔ جیسے دیوار پر دُھوپ ہو تو اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہوتے کہ یہ ہمیشہ ایسی ہی روشن رہے گی۔ اس پر لوگوں نے ایک مثال لکھی ہے کہ دیوار جب

دُھوپ سے روشن ہوئی تو اُس نے آفتاب کو کہا کہ مَیں بھی تیری طرح روشن ہوں۔ آفتاب نے کہا کہ رات کو جب مَیں نہ ہوں گا تو پھر تو کہاں سے روشنی لے گی؟! اسی طرح انسان کو جو روشنی عطا ہوتی ہے، وہ بھی مستقل نہیں ہوتی، بلکہ عارضی ہوتی ہے اور ہمیشہ اُسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے استغفار کی ضرورت ہے۔ انبیاء جو استغفار کرتے ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہوتی ہے کہ وہ ان باتوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کو خطرہ لگا رہتا ہے کہ نُور کی چادر جو ہمیں عطا کی گئی ہے ایسا نہ ہو کہ وُہ چھن جاوے۔

استغفار کی حقیقت

نادان لوگ لاعلمی کی وجہ سے یہ کہتے اور فخر کرتے ہیں کہ مسیح استغفار نہ کرتا تھا؛ حالانکہ یہ بات کسی قسم کے ناز کی نہیں بلکہ رونے اور افسوس کرنے کی ہے۔ اگر وہ استغفار نہ کرتا تو گویا اس نُور سے بالکل محروم تھا جو کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدوں کو عطا کیا کرتا ہے۔ کوئی نبی جس قدر زیادہ استغفار کرنیوالا ثابت ہوگا اسی قدر اس کا درجہ بڑا اور بلند ہوگا، لیکن جس کو یہ حالت حاصل نہیں تو وہ خطرہ میں ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت اس سے وہ چادر حفاظت کی چھین لی جاوے، کیونکہ نبیوں کو بھی وہ مستعار طور پر ملتی ہے اور وہ پھر استغفار کے ذریعہ اسے مدامی طور پر رکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اصل انوار تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں اور نبی ہو یا کوئی اَور، سب خدا تعالےٰ سے انہیں حاصل کرتے ہیں۔ سچے نبی کی یہی علامت ہے کہ وہ اس روشنی کی حفاظت بذریعہ استغفار کے کرے۔ استغفار کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ موجودہ نور جو خدا تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے وہ محفوظ رہے اَور زیادہ اور ملے۔ اسی کی تحصیل کے لیے پنجگانہ نماز بھی ہے تاکہ ہر روز دل کھول کھول کر اس روشنی کو خدا تعالےٰ سے مانگ لیوے۔ جسے بصیرت ہے وہ جانتا ہے کہ نماز ایک معراج ہے اور وہ نماز ہی کی تضرع اور ابتہال سے بھری ہوئی دُعا ہے جس سے یہ امراض سے رہائی پا سکتا ہے۔ وہ لوگ بہت بیوقوف ہیں جو دُوری ڈالنے والی تاریکی کا علاج نہیں کرتے۔

بیعت کی غرض

میرے پاس اکثر خطوط آتے ہیں، مگر ان میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ میرے املاک کے لیے یا اولاد کے لیے دُعا ہو۔ فلاں مقدمہ ہے یا فلاں مرض ہے وہ اچھا ہو جاوے، لیکن مشکل سے کوئی خط ایسا ہوتا ہے جس میں ایمان یا ان تاریکیوں کے دُور ہونے کے لیے درخواست کی گئی ہو۔ بعض خطوط میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ اگر مجھے پانسو روپیہ مل جاوے تو مَیں بیعت کروں۔ بیوقوفوں کو اتنا خیال نہیں کہ جن باتوں کو ہم چھوڑانا چاہتے ہیں۔ وہی ہم سے طلب کی جاتی ہیں۔ اسی لیے مَیں اکثر لوگوں کی بیعت سے خوف کرتا ہوں، کیونکہ سچی بیعت کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ بعض تو ظاہری شروط لگاتے ہیں جیسے کہ اُوپر ذکر ہوا۔ اور بعض لوگ بعد بیعت کے ابتلا میں پڑ جاتے

ہیں۔ جیسے کسی کا لڑکا مر گیا تو شکایت کرتا ہے، مَیں نے تو بیعت کی تھی یہ صدمہ مجھے کیوں ہوا؟ اس نادان کو یہ خیال نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود کہ پیغمبر تھے، مگر آپؐ کے گیارہ بچے فوت ہو گئے اور کبھی شکایت نہ کی کہ خداوندا تُو نے تو مجھے پیغمبر بنایا تھا میرے بچے کیوں مار دیئے۔

غرضکہ یاد رکھو کہ دین کو دُنیا سے ہرگز نہ ملانا چاہیے اور بیعت اس نیّت سے ہرگز نہ کرنی چاہیے کہ مَیں بادشاہ ہی بن جاؤں گا یا ایسی کیمیا حاصل ہو جاوے گی کہ گھر بیٹھے روپیہ بنتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تو اس لیے مامور کیا ہے کہ ان باتوں کو لوگوں سے چُھڑا دیویں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو لوگ صدق اور وفا سے خدا تعالیٰ کی طرف آتے ہیں اور اس کے لیے ہر ایک دُکھ اور مصیبت کو سر پر لیتے ہیں تو خدا تعالےٰ ان کو اور ان کی اولاد کو ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کہتے ہیں کہ مَیں بوڑھا ہو گیا لیکن کبھی نہیں دیکھا کہ صالح آدمی کی اولاد ضائع ہوئی ہو۔ خدا تعالیٰ خود اس کا متکفل ہوتا ہے۔ لیکن ابتدا میں ابتلا کا آنا ضروری ہے تاکہ کھوٹے اور کھرے کی شناخت ہو جاتے۔

عشق اوّل سرکش و خونی بود ٭ تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

دُوسرے ابتلا اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھلاوے کہ جو ہماری طرف آنیوالے ہیں وہ کیسے مستقل مزاج اور جفاکش ہوتے ہیں کہ مار پر مار کھاتے ہیں لیکن مُنہ نہیں پھیرتے اور جب وہ ثابت قدم نکل آتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اُن سے وہی سنّت برتتا ہے جو کہ منعم علیہ گروہ سے برتنی چاہیے۔

خدا تعالیٰ سے زیادہ پیار اور رحم اور محبت کرنی کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اخلاص ضروری ہے۔ کوئی دل سے اس کا ہو۔ پھر دیکھے کہ آیا مخلص کی دست گیری اور کفالت اس کی خوبی ہے کہ نہیں، لیکن جو اُسے آزماتا ہے وُہ خود آزمایا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اسلام لایا۔ بعد ازاں اندھا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اسلام قبول کرنے سے یہ آفت مجھ پر آئی ہے۔ اس لیے کافر ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بہت سمجھایا، لیکن نہ مانا؛ حالانکہ اگر وہ مسلمان رہتا تو خدا تعالیٰ تو اس امر پر قادر تھا کہ اسے دوبارہ بینائی بخش دیتا، لیکن کافر ہو کر دُنیا سے تو اندھا تھا دین سے بھی اندھا بن گیا۔ مجھے فکر ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کہ خُدا تعالےٰ کو آزماتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خود آزمائے جاویں۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو مجھ پر ایمان لاوے، اوّل وہ مصائب کے لیے تیار رہے۔ مگر یہ سب کچھ اوائل میں ہوتا ہے۔ اگر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر فضل کر دیتا ہے؛ کیونکہ مومن کے لیے دو حالتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ جب ایمان لاتا ہے تو مصائب کا ایک دوزخ اس کے لیے تیار کیا جاتا ہے جس میں اُسے کچھ عرصہ رہنا پڑتا ہے اور اس کے صبر اور استقلال کا امتحان کیا جاتا ہے اور جب

وہ اس میں ثابت قدمی دکھاتا ہے تو دوسری حالت یہ ہے کہ اس دوزخ کو جنت سے بدل دیا جاتا ہے۔ جیسے کہ بخاری میں حدیث ہے کہ مومن بذریعہ نوافل کے اللہ تعالیٰ سے یہاں تک قرب حاصل کرتا ہے کہ وہ اس کی آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور کان ہو جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے۔ اور ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں ہو جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ کہ جو شخص میرے ولی کی عداوت کرتا ہے وہ جنگ کے لیے تیار ہو جاوے۔ اس قدر غیرت خدا تعالیٰ کو اپنے بندے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر دوسری جگہ فرماتا ہے کہ مجھے کسی شے میں اس قدر تردد نہیں ہوتا جس قدر کہ مومن کی جان لینے میں ہوتا ہے اور اسی لیے وہ کئی دفعہ بیمار ہوتا ہے اور پھر اچھا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی جان لینا چاہتا ہے مگر اسے مہلت دے دیتا ہے کہ اور کچھ عرصہ دنیا میں رہ لیوے۔

جماعتِ احمدیہ کے قیام کی غرض

اس جماعت کو تیار کرنے سے غرض یہی ہے کہ زبان، کان، آنکھ اور ہر ایک عضو میں تقویٰ سرایت کر جاوے۔ تقویٰ کا نُور اس کے اندر اور باہر ہو۔ اخلاقِ حسنہ کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ اور بیجا غصہ اور غضب وغیرہ بالکل نہ ہو۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ جماعت کے اکثر لوگوں میں غصہ کا نقص اب تک موجود ہے۔ تھوڑی تھوڑی سی بات پر کینہ اور بُغض پیدا ہو جاتا ہے اور آپس میں لڑ جھگڑ پڑتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا جماعت میں سے کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ اور مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں کیا دقت پیش آتی ہے کہ اگر کوئی گالی دے تو دوسرا چُپ کر رہے اور اس کا جواب نہ دے۔ ہر ایک جماعت کی اصلاح اوّل اخلاق سے شروع ہوا کرتی ہے۔ چاہیے کہ ابتدا میں صبر سے تربیت میں ترقی کرے اور سب سے عمدہ ترکیب یہ ہے کہ اگر کوئی بدگوئی کرے تو اس کے لیے دردِ دل سے دُعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کر دیوے۔ اور دل میں کینہ کو ہرگز نہ بڑھاوے۔ جیسے دُنیا کے قانون ہیں ویسے خدا کا بھی قانون ہے جب دنیا اپنے قانون کو نہیں چھوڑتی تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون کو کیسے چھوڑے۔ پس جب تک تبدیلی نہ ہوگی تب تک تمہاری قدر اس کے نزدیک کچھ نہیں۔ خدا تعالیٰ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ حلم اور صبر اور عفو جو کہ عمدہ صفات ہیں ان کی جگہ درندگی ہو۔ اگر تم ان صفاتِ حسنہ میں ترقی کرو گے تو بہت جلد خدا تک پہنچ جاؤ گے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ جماعت کا ایک حصہ ابھی تک ان اخلاق میں کمزور ہے۔ ان باتوں سے صرف شماتتِ اعدا ہی نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ خود بھی قرب کے مقام سے گرائے جاتے ہیں۔

خُلق کی اِصلاح ممکن ہے

یہ سچ ہے کہ سب انسان ایک مزاج کے نہیں ہوتے۔ اسی لیے قرآن شریف میں آیا ہے کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰے شَاکِلَتِہٖ (بنی اسرائیل : ۸۵) بعض آدمی ایک قسم کے اخلاق میں اگر عمدہ ہیں، تو دُوسری قسم میں کمزور۔ اگر ایک خلق کا رنگ اچھا ہے تو دُوسرے کا بُرا لیکن تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصلاح ناممکن ہے۔

خُلق سے ہماری مراد شیریں کلامی ہی نہیں بلکہ خَلق اور خُلق دو الفاظ ہیں۔ آنکھ، کان، ناک وغیرہ جس قدر اعضاء ظاہری ہیں جن سے انسان کو حسین وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یہ سب خَلق کہلاتے ہیں اور اس کے مقابل پر باطنی قویٰ کا نام خُلق ہے۔ مثلاً عقل، فہم، شجاعت، عِفّت، صبر وغیرہ اس قسم کے جس قدر قویٰ سرشت میں ہوتے ہیں وہ سب اسی میں داخل ہیں اور خُلق کو خَلق پر اس لیے ترجیح ہے کہ خَلق یعنی ظاہری جسمانی اعضاء میں اگر کسی قسم کا نقص ہو تو وہ ناقابل علاج ہوتا ہے۔ مثلاً ہاتھ اگر چھوٹا پیدا ہوا ہے تو اس کو بڑا نہیں کر سکتا لیکن خُلق میں اگر کوئی کمی بیشی ہو تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

ذکر کرتے ہیں کہ افلاطون کو علمِ فراست میں بہت دخل تھا اور اس نے دروازہ پر ایک دربان مقرر کیا ہوا تھا۔ جسے حُکم تھا کہ جب کوئی شخص ملاقات کو آوے، تو اوّل اُس کا حُلیہ بیان کرو۔ اس حُلیہ کے ذریعے وُہ اس کے اخلاق کا حال معلوم کر کے پھر اگر قابلِ ملاقات سمجھتا تو ملاقات کرتا؛ ورنہ رَدّ کر دیتا۔ ایک دفعہ ایک شخص اس کی ملاقات کو آیا۔ دَربان نے اطلاع دی۔ اس کے نقوش کا حال سُنکر افلاطون نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اس پر اس شخص نے کہلا بھیجا کہ افلاطون سے کہدو کہ جو کچھ تم نے سمجھا ہے۔ بالکل دُرست ہے۔ مگر مَیں نے قوّتِ مجاہدہ سے اپنے اخلاق کی اصلاح کر لی ہے۔ اس پر افلاطون نے ملاقات کی اجازت دیدی۔ پس خُلق ایسی شئے ہے جس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اگر تبدیلی نہ ہو سکتی تو یہ ظلم تھا، لیکن دُعا اور عمل سے کام لوگے، تب اس تبدیلی پر قادر ہو سکو گے۔ عمل اس طرح سے کہ اگر کوئی شخص مُمسک ہے تو وہ قدرے قدرے خرچ کرنے کی عادت ڈالے اور نفس پر جبر کرے۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد نفس میں ایک تغیرِ عظیم دیکھ لے گا اور اس کی عادت امساک کی دُور ہو جاوے گی۔ اخلاق کی کمزوری بھی ایک دیوار ہے جو خُدا اور بندے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

وحدتِ جمہوری

اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ تمام انسانوں کو ایک نفسِ واحد کی طرح بنا دے۔ اس کا نام وحدتِ جمہوری ہے جس سے بہت سے انسان بحالتِ مجموعی ایک انسان کے حکم میں سمجھا جاتا ہے۔ مذہب سے بھی یہی منشاء ہوتا ہے کہ تسبیح کے دانوں کی طرح وحدتِ جمہوری کے ایک دھاگہ میں سب پروتے جائیں۔ یہ نمازیں

باجماعت جو کہ ادا کی جاتی ہیں وہ بھی اسی وحدت کے لیے ہیں تاکہ کُل نمازیوں کا ایک وجود شمار کیا جاوے اور آپس میں مل کر کھڑے ہونے کا حکم اس لیے ہے کہ جس کے پاس زیادہ نُور ہے وہ دوسرے کمزور میں سرایت کرکے اُسے قوّت دیوے۔ حتیٰ کہ حج بھی اسی لیے ہے۔ اس وحدتِ جمہوری کو پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی ابتدا اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے کی ہے کہ اوّل یہ حکم دیا کہ ہر ایک محلّہ والے پانچ وقت نمازوں کو باجماعت محلّہ کی مسجد میں ادا کریں تاکہ اخلاق کا تبادلہ آپس میں ہو اور انوار مل ملا کر کمزوری کو دُور کر دیں اور آپس میں تعارف ہو کر اُنس پیدا ہو جاوے۔ تعارف بہت عمدہ شئے ہے کیونکہ اس سے اُنس بڑھتا ہے جو کہ وحدت کی بنیاد ہے۔ حتیٰ کہ تعارف والا دشمن ایک ناآشنا دوست سے بہت اچھا ہوتا ہے کیونکہ جب غیر ملک میں ملاقات ہو تو تعارف کی وجہ سے دلوں میں اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ کینہ والی زمین سے الگ ہونے کے باعث بغض جو کہ عارضی شئے ہوتا ہے وہ تو دُور ہو جاتا ہے اور صرف تعارف باقی رہ جاتا ہے۔

پھر دوسرا حکم یہ ہے کہ جمعہ کے دن جامع مسجد میں جمع ہوں کیونکہ ایک شہر کے لوگوں کا ہر روز جمع ہونا تو مشکل ہے۔ اس لیے یہ تجویز کی کہ شہر کے سب لوگ ہفتہ میں ایک دفعہ مل کر تعارف اور وحدت پیدا کریں۔ آخر کبھی نہ کبھی تو سب ایک ہو جائیں گے۔ پھر سال کے بعد عیدین میں یہ تجویز کی کہ دیہات اور شہر کے لوگ مل کر نماز ادا کریں تاکہ تعارف اور اُنس بڑھ کر وحدتِ جمہوری پیدا ہو۔ پھر اسی طرح تمام دُنیا کے اجتماع کے لیے ایک دن عمر بھر میں مقرر کر دیا کہ مکّہ کے میدان میں سب جمع ہوں۔ غرضیکہ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ آپس میں اُلفت اور اُنس ترقی پکڑے۔ افسوس کہ ہمارے مخالفوں کو اس بات کا علم نہیں کہ اسلام کا فلسفہ کیسا پکّا ہے۔ دنیوی حکّام کی طرف سے جو احکام پیش ہوتے ہیں۔ ان میں تو انسان ہمیشہ کے لیے ڈھیلا ہو سکتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کے احکام میں ڈھیلا پن اور اس سے بکلّی روگردانی کبھی ممکن ہی نہیں کونسا ایسا مسلمان ہے جو کم از کم عیدین کی بھی نماز نہ ادا کرتا ہو۔ پس ان تمام اجتماعوں کا یہ فائدہ ہے کہ ایک کے انوار دوسرے میں اثر کرکے اُسے قوّت بخشیں۔

صُحبتِ صادقین

نفس اور اخلاق کی پاکیزگی حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ صحبتِ صادقین بھی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ۔ (التوبہ : ۱۱۹) یعنی تم خدا تعالیٰ کے صادق اور راستباز لوگوں کی صُحبت اختیار کرو تاکہ اُن کے صدق کے انوار سے تم کو بھی حِصّہ ملے۔ جو مذاہب کہ تفرقہ پسند کرتے ہیں اور الگ الگ رہنے کی تعلیم دیتے ہیں وہ یقیناً وحدتِ جمہوری کی برکات سے محروم رہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا کہ ایک نبی ہو جو کہ جماعت بنا دے اور اخلاق کے ذریعہ آپس میں تعارف اور وحدت پیدا کرے۔

آدابِ دُعا

درستیٔ اخلاق کے بعد دوسری بات یہ ہے کہ دُعا کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی پاک محبت حاصل کی جاوے۔ ہر ایک قسم کے گناہ اور بدی سے دُور رہے اور ایسی حالت میسّر ہو کہ جس قدر اندرونی آلودگیاں ہیں ان سب سے الگ ہو کر ایک مصفّٰی قطرہ کی طرح بن جاوے۔ جب تک یہ حالت میسّر نہ ہوگی تب تک خطرہ ہی خطرہ ہے، لیکن دعا کے ساتھ تدابیر کو نہ چھوڑے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تدبیر کو بھی پسند کرتا ہے اور اسی لیے فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (النازعات : ۶) کہہ کر قرآن شریف میں قسم بھی کھائی ہے۔ جب وہ اس مرحلہ کو طے کرنے کے لیے دُعا بھی کرے گا اور تدبیر سے بھی اس طرح کام لے گا کہ جو مجلس اور صحبت اور تعلقات اس کو حارج ہیں ان سب کو ترک کر دے گا اور رسم عادت اور بناوٹ سے الگ ہو کر دُعا میں مصروف ہوگا تو ایک دن قبولیت کے آثار مشاہدہ کرے گا۔ یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ کچھ عرصہ دُعا کر کے پھر رہ جاتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے اس قدر دُعا کی مگر قبول نہ ہوئی، حالانکہ دُعا کا حق تو اُن سے ادا ہی نہ ہوا۔ تو قبول کیسے ہو؟ اگر ایک شخص کو بھوک لگی ہو یا سخت پیاس ہو اور وہ صرف ایک دانہ یا ایک قطرہ لے کر شکایت کرے کہ مجھے سیری حاصل نہیں ہوئی۔ تو کیا اس کی شکایت بجا ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ جب تک وہ پوری مقدار کھانے اور پینے کی نہ لے گا۔ تب تک کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہی حال دُعا کا ہے۔ اگر انسان لگ کر اُسے کرے اور پُورے آداب سے بجا لاوے۔ وقت بھی میسّر آوے تو امید ہے کہ ایک دن اپنی مراد کو پا لیوے۔ لیکن راستہ میں ہی چھوڑ دینے سے صدہا انسان مر گئے (گمراہ ہو گئے) اور صدہا ابھی آئندہ مرنے کو تیار ہیں۔ ایک من پیشاب میں ایک قطرہ پانی کا کیا شئے ہے جو اسے پاک کرے۔ اسی طرح وہ بداعمالیاں جن میں لوگ سر سے پاؤں تک غرق ہیں ان کے ہوتے ہوتے چند دن کی دُعا کیا اثر دکھا سکتی ہے۔ پھر عُجب، خود بینی، تکبّر اور ریا وغیرہ ایسے امراض لگے ہوئے ہوتے ہیں جو عمل کو ضائع کر دیتے ہیں۔ نیک عمل کی مثال ایک پرند کی طرح ہے۔ اگر صدق اور اخلاص کے قفس میں اُسے قید رکھو گے تو وُہ رہے گا ورنہ پرواز کر جاوے گا اور یہ بجز خُدا تعالیٰ کے فضل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (الکہف : ۱۱۱)

عمل صالح سے یہاں یہ مُراد ہے کہ اس میں کسی قسم کی بدی کی آمیزش نہ ہو۔ صلاحیت ہی صلاحیت ہو۔ نہ عُجب ہو، نہ کبر ہو، نہ نخوت ہو، نہ تکبّر ہو، نہ نفسانی اغراض کا حصّہ ہو۔ نہ رو بخلق ہو۔ حتّٰی کہ دوزخ اور بہشت کی خواہش بھی نہ ہو۔ صرف خدا تعالیٰ کی محبت سے وہ عمل صادر ہو۔ جب تک دوسری کسی قسم کی غرض کو دخل ہے تب تک ٹھوکر کھاوے گا۔ اور اس کا نام شرک ہے، کیونکہ وہ دوستی اور محبت کس کام کی جس کی بنیاد صرف ایک پیالہ چائے یا دوسری خالی محبوبات تک ہی ہے۔ ایسا

انسان جس دن اس میں فرق آتا دیکھے گا، اسی دن قطع تعلق کر دے گا. جو لوگ خدا تعالیٰ سے اس لیے تعلق باندھتے ہیں کہ ہمیں مال ملے یا اولاد حاصل ہو یا ہم فلاں فلاں امور میں کامیاب ہو جائیں، اُن کے تعلقات عارضی ہوتے ہیں اور ایمان بھی خطرہ میں ہے جس دن ان کے اغراض کو کوئی صدمہ پہنچا اسی دن ایمان میں فرق آ جائے گا۔ اس لیے پکا مومن وہ ہے جو کسی سہارے پر خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا.

راستباز کی علامت

راستبازوں کی ایک یہ بھی نشانی ہے کہ مصیبت سے اُن کو چڑ ہوتی ہے اور جب ایسے موقعہ پر شیطان دخل دے کر ان کو بہکانا چاہتا ہے تب ان کی غیرت جوش مارتی ہے اور بجائے اس کے کہ ان کا قدم پیچھے ہٹے وہ آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیطان ہمیں پیچھے ہرگز نہیں ڈال سکتا. شیطان بھی ایسے موقعہ پر ہر ایک قسم کے منصوبے اس کی لغزش کے لیے پیش کرتا ہے۔ مال، اولاد، عزت، آبرو، خلقت کی ملامت، طعن و تشنیع وغیرہ سب نقصانوں سے ڈراتا ہے۔ لیکن وہ اوّل ہی سے دل میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم ان نقصانوں کی کچھ پروا نہ کریں گے۔ آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان ان کے نزدیک ایک مخنّث سے بھی کمتر ہوتا ہے۔ لیکن جس کا دعویٰ تو ایمان کا ہوتا ہے اور دماغ میں اغراضِ نفسانی بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو شیطان بڑی آسانی سے اپنا تسلط اس پر بٹھاتا ہے اور جس راستے چاہتا ہے چلاتا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ سفلی خواہشات سے شیطان کا مقابلہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔

شیطان کے وجود کا ثبوت

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہاں ایسے ہوں کہ جو شیطان کے وجود ہی سے مُنکر ہوں، لیکن مَیں کہتا ہوں کہ اس کے وجود سے انکار بھی نادانی ہے۔ کیا وہ مشاہدہ نہیں کرتے کہ انسان میں دو قوتیں موجود ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ایک لہر اس کے دل میں آتی ہے کہ نیکی کروں اور اکثر اوقات وہ اس کا ایسا پابند ہو جاتا ہے کہ بلا اس کے تقاضا ادا کیے کے رہ ہی نہیں سکتا۔ اور اسی طرح کبھی اس کے دل میں ایسی لہر آتی ہے جو کہ بدی کی طرف رغبت دلاتی ہے اور وہ گھر سے اُٹھ کر کنجروں کی طرف چلا جاتا ہے۔ پس یہ قوتیں ہیں جن میں سے بدی کے محرک کا نام شیطان رکھ لو۔ انسان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ابتدائی مراحل میں ہر ایک شئے کی حقیقت کو سمجھ لیوے جیسے جیسے بتدریج اس کی معرفت ترقی کرتی ہے۔ ویسے ویسے وہ باریک در باریک امور کو سمجھتا جاتا ہے۔ آسمان کے ستاروں کو دیکھو کہ وہ اوّل سوائے نقطوں کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتے مگر جب انہی نقطوں کو دُوربینوں سے دیکھا جاوے تو کسقدر عجائبات معلوم ہوتے ہیں اور سابقہ معرفت اسکے آگے ہیچ نظر آتی ہے اور انسان کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے کہ مَیں نے انکو نقطہ کیوں سمجھا. ایسے ہی شیطان اور فرشتے کے وجود کا حال ہے کہ انکو اوّل نقطوں کی طرح

ماننا پڑتا ہے اور پھر اس دُور بین سے جو انبیاء لے کر آتے ہیں دیکھا جاوے تو اُن کی اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو جُملہ معترضہ تھا جو کہ درمیان میں آ گیا۔

عورتوں کی اصلاح کی ضرورت

پھر میں اصل مطلب کو بیان کرتا ہوں کہ اگر تم اپنی اِصلاح چاہتے ہو تو یہ بھی لازمی امر ہے کہ گھر کی عورتوں کی اِصلاح کرو۔ عورتوں میں بُت پرستی کی جڑ ہے کیونکہ ان کی طبائع کا میلان زینت پرستی کی طرف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بُت پرستی کی ابتداء انہی سے ہوئی ہے۔ بُزدلی کا مادہ بھی ان میں زیادہ ہوتا ہے کہ ذرا سی سختی پر اپنے جیسی مخلوق کے آگے ہاتھ جوڑنے لگ جاتی ہے، اس لیے جو لوگ زن پرست ہوتے ہیں رفتہ رفتہ ان میں بھی یہ عادتیں سرایت کر جاتی ہیں پس بہت ضروری ہے کہ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ رہو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: ۳۵) اور اسی لیے مرد کو عورتوں کی نسبت قویٰ زیادہ دیئے گئے ہیں۔ اس وقت جو نئی روشنی کے لوگ مساوات پر زور دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں ان کی عقلوں پر تعجب آتا ہے۔ وہ ذرا مردوں کی جگہ عورتوں کی فوجیں بنا کر جنگوں میں بھیج کر دیکھیں تو سہی کہ کیا نتیجہ مساوی نکلتا ہے یا مختلف۔ ایک طرف تو اسے حمل ہے اور ایک طرف جنگ ہے وہ کیا کر سکے گی؟ غرضکہ عورتوں میں مردوں کی نسبت قویٰ کمزور ہیں اور کم بھی ہیں اس لیے مرد کو چاہیے کہ عورت کو اپنے ماتحت رکھے۔

پردہ کی اہمیت

یورپ کی طرح بے پردگی پر بھی لوگ زور دے رہے ہیں لیکن یہ ہرگز مناسب نہیں یہی عورتوں کی آزادی فسق و فجور کی جڑ ہے۔ جن ممالک نے اس قسم کی آزادی کو روا رکھا ہے ذرا اُن کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرو۔ اگر اس کی آزادی اور بے پردگی سے اُن کی عفت اور پاک دامنی بڑھ گئی ہے تو ہم مان لیں گے کہ ہم غلطی پر ہیں۔ لیکن یہ بات بہت ہی صاف ہے کہ جب مرد اور عورت جوان ہوں اور آزادی اور بے پردگی بھی ہو تو اُن کے تعلقات کس قدر خطرناک ہوں گے۔ بدنظر ڈالنی اور نفس کے جذبات سے اکثر مغلوب ہو جانا انسان کا خاصہ ہے۔ پھر جس حالت میں کہ پردہ میں بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور فسق و فجور کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو آزادی میں کیا کچھ نہ ہو گا۔ مردوں کی حالت کا اندازہ کرو کہ وہ کس طرح بے لگام گھوڑے کی طرح ہو گئے ہیں۔ نہ خدا کا خوف رہا ہے نہ آخرت کا یقین ہے۔ دُنیاوی لذّات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ پس سب سے اوّل ضروری ہے کہ اس آزادی اور بے پردگی سے پہلے مردوں کی اخلاقی حالت درست کرو۔ اگر یہ درست ہو جاوے اور مردوں میں کم از کم اس قدر قوت ہو کہ وہ اپنے نفسانی جذبات سے مغلوب نہ ہو سکیں تو اس وقت

اس بحث کو چھوڑ دو کہ آیا پردہ ضروری ہے کہ نہیں، ورنہ موجودہ حالت میں اس بات پر زور دینا کہ آزادی اور بے پردگی ہو گویا بکریوں کو شیروں کے آگے رکھ دینا ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کسی بات کے نتیجہ پر غور نہیں کرتے۔ کم ازکم اپنے کانشنس سے ہی کام لیں کہ آیا مردوں کی حالت ایسی اصلاح شدہ ہے کہ عورتوں کو بے پردہ ان کے سامنے رکھا جاوے۔ قرآن شریف نے جو کہ انسان کی فطرت کے تقاضوں اور کمزوریوں کو مدنظر رکھ کر حسب حال تعلیم دیتا ہے، کیا عمدہ مسلک اختیار کیا ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ۔ (النور: ۳۱) کہ تو ایمان والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کریں۔ یہ وہ عمل ہے جس سے اُن کے نفوس کا تزکیہ ہوگا۔ فروج سے مراد شرمگاہ ہی نہیں بلکہ ہر ایک سوراخ جس میں کان وغیرہ بھی شامل ہیں اور ان میں اس امر کی مخالفت کی گئی ہے کہ غیر محرم عورت کا راگ وغیرہ سُنا جاوے۔ پھر یاد رکھو کہ ہزار در ہزار تجارب سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ تعالیٰ روکتا ہے آخر کار انسان کو اُن سے رُکنا ہی پڑتا ہے۔ تعدّد ازدواج اور طلاق کے مسئلہ پر غور کرو ؎

ہرچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

ہمیں افسوس ہے کہ آریہ صاحبان بھی بے پردگی پر زور دیتے ہیں اور قرآن شریف کے احکام کی مخالفت چاہتے ہیں، حالانکہ اسلام کا یہ بڑا احسان ہندوؤں پر ہے کہ اُس نے اُن کو تہذیب سکھلائی اور اس کی تعلیم ایسی ہے جس سے مفاسد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے ؎

خر بستہ بہ گرچہ دزد آشنا است

یہی حالت مرد اور عورت کے تعلقات کی ہے کہ اگرچہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن تاہم فطری جوش اور تقاضے بعض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جب اُن کو ذرا سی تحریک ہوئی تو جھٹ حدِ اعتدال سے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات میں حد درجہ کی آزادی وغیرہ کو ہرگز نہ دخل دیا جاوے۔ ذرا اپنے دلوں میں غور کرو کہ کیا تمہارے دل راجہ رامچندر اور کرشن وغیرہ کی طرح پاک ہو گئے ہیں؟ پھر جب وُہ پاک دلی تم کو نصیب نہیں ہوئی تو بے پردگی کو رواج دیکر بکریوں کو شیروں کے آگے کیوں رکھتے ہو۔ ہٹ اور ضد اور تعصب اور چڑ وغیرہ سے تم لوگ دیدہ دانستہ اسلام کے اُن پاکیزہ اصولوں کی مخالفت کیوں کرتے ہو جن سے تمہاری عفّت برقرار رہتی ہے۔ عقل تو اس بات کا نام ہے کہ انسان کو نیک بات جہاں سے ملے وہ لے لیوے، کیونکہ نیک بات کی مثال سونے اور ہیرے اور جواہر کی ہے اور یہ اشیاء خواہ کہیں ہوں۔ آخر وہ سونا وغیرہ ہی ہوں گی۔ اس لیے تم کو لازم ہے کہ اسلام کے نام سے چڑ کر تم نیکی

کو ترک نہ کرو، ورنہ یاد رکھو کہ اسلام کا تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اگر اس کا ضرر ہے تو تم ہی کو ہے۔ ہاں اگر تم لوگوں کو یہ اطمینان ہے کہ سب کے سب بھگت بن گئے ہو اور نفسانی جذبات پر تم کو پوری قدرت حاصل ہے اور قویٰ پر بشری کی رضا اور احکام کے برخلاف بالکل حرکت نہیں کرتے تو پھر ہم تم کو منع نہیں کرتے۔ بیشک بے پردگی کو رواج دو لیکن جہانتک میرا خیال ہے ابھی تک تم کو وہ حالت نصیب نہیں اور تم میں سے جسقدر لوگ لیڈر بن کر قوم کی اصلاح کے درپے ہیں اُن کی مثال سفید قبر کی ہے جس کے اندر بجز ہڈیوں کے اور کچھ نہیں، کیونکہ ان کی صرف باتیں ہی ہیں۔ عمل وغیرہ کچھ نہیں۔

نفسِ انسانی کی چار حالتیں

اسلام نے جو یہ حکم دیا ہے کہ مرد عورت سے اور عورت مرد سے پردہ کرے اس سے غرض یہ ہے کہ نفسِ انسان پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کی حد سے بچا رہے، کیونکہ ابتدا میں اس کی یہی حالت ہوتی ہے کہ وہ بدیوں کی طرف جُھکا پڑتا ہے اور ذرا سی بھی تحریک ہو تو بدی پر ایسے گرتا ہے۔ جیسے کئی دنوں کا بھوکا آدمی کسی لذیذ کھانے پر۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کرے اور اسکی اصلاح کی حالتوں کے لحاظ سے اس کے چار نام مقرر کئے گئے ہیں۔ اوّل اوّل نفسِ زکیّہ ہوتا ہے کہ جس کو نیکی بدی کی کوئی خبر نہیں ہوتی اور یہ حالت طفلگی تک رہتی ہے۔ پھر نفسِ امّارہ ہوتا ہے کہ بدیوں کی طرف ہی مائل رہتا ہے اور انسان کو طرح طرح کے فسق و فجور میں مبتلا کرتا ہے اور اس کی بڑی غرض یہی ہوتی ہے کہ ہر وقت بدی کا ارتکاب ہو۔ کبھی چوری کرتا ہے۔ کوئی گالی دے یا ذرا خلافِ مرضی کام ہو تو اُسے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر شہوت کی طرف غلبہ ہو تو گناہوں اور فسق و فجور کا سیلاب بہہ نکلتا ہے۔ دُوسرا نفس لوّامہ ہے کہ اس میں بدیاں بالکل دُور تو نہیں ہوتیں، مگر ہاں ایک پچھتاوا اور حسرت و افسوس مرتکب اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور جب بدی ہو جاوے تو اس کے دل میں نیکی سے اس کا معاوضہ کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور تدبیر کرتا ہے کہ کسی طرح گناہ سے بچے۔ اور دعا میں لگتا ہے کہ زندگی پاک ہو جاوے اور ہوتے ہوتے جب یہ گناہ سے پوتّر ہو جاتا ہے تو اس کا نام مطمئنّہ ہو جاتا ہے اور اس حالت میں بدی کو ایسی ہی بدی سمجھتا ہے۔ جیسے کہ خدا تعالیٰ بدی کو بدی سمجھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دُنیا اصل میں گناہ کا گھر ہے جس میں سرکشیوں میں پڑ کر انسان خُدا کو بُھلا دیتا ہے۔ نفس امّارہ کی حالت میں اس کے پاؤں میں زنجیریں ہوتی ہیں اور لوّامہ میں کچھ زنجیریں پاؤں میں ہوتی ہیں اور کچھ اُتر جاتی ہیں مگر مطمئنّہ میں کوئی زنجیر نہیں رہتی سب کی سب اُتر جاتی ہیں اور وہی زمانہ انسان کا خدا تعالیٰ کی طرف پکّے رجوع کا ہوتا ہے اور وہی خدا تعالیٰ کے کامل بندے ہوتے ہیں جو کہ نفسِ مطمئنّہ کے ساتھ دُنیا سے علیحدہ ہوویں اور جبتک وہ اسے حاصل نہ کرے تب تک اُسے مطلق علم نہیں ہوتا کہ جنّت میں جاوے گا یا

دوزخ میں پس جبکہ انسان بلاحصول نفسِ مطمئنہ کے نہ پوری پاکیزگی حاصل کرسکتا ہے اور نہ جنت میں داخل ہوسکتا ہے تواب خواہ آریہ ہوں یا عیسائی کونسی عقلمندی ہے کہ قبل اس کے کہ یہ نفس حاصل ہو وہ بھیڑیوں اور بکریوں کو اکٹھا چھوڑ دیویں۔ کیا ان کو امید ہے کہ وہ پاک اور بے شر زندگی بسر کریں گے۔ یہ ہے سِر اسلامی پردہ کا۔ اور مَیں نے خصوصیت سے اُسے اُن مسلمانوں کے لیے بیان کیا ہے جن کو اسلام کے احکام اور حقیقت کی خبر نہیں اور مجھے امید ہے کہ آریہ لوگ اس سے بہت کم مستفید ہوں گے کیونکہ ان کو تو اسلام کی ہر ایک بھلی بات سے چڑ ہے۔

مسیحِ موعود کو ماننے کی ضرورت

اس قدر تقریر ہو چکی تھی کہ اس اثنا میں خلیفہ رجب الدین صاحب نے بلند آواز سے لاہور کی پبلک کی طرف سے حضرت مرزا صاحب کو ماننے کی ضرورت کا سوال پیش کیا؛ اگرچہ بعض لوگوں کو یہ دخل اس لیے ناگوار ہوا کہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ نُورِ فراست سے جس ضرورت کو محسوس کرکے کلام فرما رہا تھا اس کی توجہ ادھر سے پھیر دی گئی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ تحریک بھی مصالح ایزدی سے باہر نہیں۔

آپ نے فرمایا کہ:

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مَیں نے بہت سی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے یہ بات سمجھا دی ہُوئی ہے کہ مَیں وہ مسیح ہوں جس کا ذکر اور وعدہ اجمالاً قرآن میں اور تفصیلاً احادیث میں پایا جاتا ہے اور جو لوگ اسے نہیں مانتے قرآنِ شریف کی رُو سے ان کا نام فاسق ہے اور احادیث سے واضح ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اس مسیح کو نہیں مانتا وہ گویا مجھے نہیں مانتا اور جو اس کی معصیت کرتا ہے۔ گویا میری معصیت کرتا ہے۔

لوگ مخلوق کو دھوکہ دیتے ہیں اور غلطیوں میں ڈالتے ہیں کہ ہم نے کوئی نیا کلمہ یا نماز تجویز کی ہے۔ ایسے افتراؤں کا مَیں کیا جواب دُوں۔ اسی قسم کے افتراؤں سے وہ ایک عاجز انسان مسیح علیہ السّلام کو تین خدا بنا بیٹھے۔ دیکھو۔ ہم مسلمان ہیں اور اُمّتِ محمدی ہیں اور ہمارے نزدیک نئی نماز بنانی یا قبلہ سے رُوگردانی کُفر ہے۔ کُل احکامِ پیغمبری کو ہم مانتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے حکم کو ٹالنا بھی بدذاتی ہے۔ اور ہمارا دعویٰ قال اللہ اور قال الرسُول کے ماتحت ہے۔ اتباعِ نبویؐ سے الگ ہوکر ہم نے کوئی کلمہ یا نماز یا حج یا ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد نہیں بنائی۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اس دین کی خدمت کریں اور اس کو کل مذاہب پر غالب کرکے دکھا دیں۔ قرآنِ شریف کی اور احادیث کی جو پیغمبرِ خدا سے ثابت ہیں۔ اِتّباع کریں ضعیف

سے ضعیف حدیث بھی بشرطیکہ وہ قرآن شریف کے مخالف نہ ہو ہم واجب العمل سمجھتے ہیں اور بخاری اور مسلم کو بعد کتاب اللہ اصح الکتب مانتے ہیں۔

اور دوسری بات یہ یاد رکھو کہ مجھے کبھی بھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ لوگ مجھے مانیں بلکہ مجھے تو ان جماعتوں سے ہمیشہ سے نفرت ہے اور اگر میں ملتا ہوں یا ان لوگوں میں آکر بیٹھتا ہوں تو اپنی مرضی سے ہرگز نہیں ملتا، بلکہ اللہ تعالیٰ مجھے مجبور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تُو ایسا کر۔ ایسی حالت میں بتلاؤ کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں تو کیا کروں؟ میں تو رات دن وحی کے نیچے کام کرتا ہوں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پختہ طور سے مانو۔ آپ کو ماننا یہ ہے کہ آپ کے وصایا پر عملدرآمد کیا جاوے اور انہی میں سے یہ بات بھی ہے کہ جب وہ مسیح موعود آوے تو تم سب اس کے ساتھ ہو جانا۔ میرے ماننے کی مثال یہ ہے جیسے ایک آقا نوکر کو کہے کہ فلاں شخص میرا میزبان[1] ہے تم اُسے لاکر کھانا کھلاؤ اور ہر طرح کی تعظیم اور تکریم کرو، لیکن نوکر اس کے جواب میں یہ کہے کہ میں تو صرف آپ کو مانتا ہوں۔ مجھے کسی دوسرے کی تعظیم و تکریم سے غرض نہیں ہے اور نہ اس کی خواہش ہے۔ تو اب سوچ کر دیکھو کہ کیا اس نے اپنے آقا کو مانا؟ ہرگز نہیں مانا۔ کیونکہ جس بات میں وہ راضی ہوتا ہے اس کے کرنے سے تو اُسے انکار ہے۔ پس یاد رکھو کہ تم لوگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقی طور پر اسی وقت مانو گے، جبکہ آپ کے احکام اور وصایا کو مانو گے۔ جس نے آخری حکم کو توڑا اُس نے سارے حکموں کو توڑا۔ سوچو تو سہی کہ اگر ایک شخص تمام عمر نماز، روزہ ادا کرے، لیکن آخری وقت بجائے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے رام رام کہے تو کیا وہ نماز روزہ اس کے کام آوے گا؟

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہانتک فرمادیا کہ اس اُمت کی دو دیواریں ہیں۔ ایک میں اور ایک مسیح اور اس کے درمیان آپ نے فیجِ اعوج فرمایا ہے جن کی نسبت ارشاد ہے کہ وہ نہ مجھ سے ہیں اور نہ میں اُن سے ہوں۔ پس جبکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے ایک ٹیڑھا گروہ قرار دیتے ہیں تو ہم اُن کی باتوں کو کیوں قبول کریں۔

اس موقعہ پر ایک وزیر آبادی متعصب مولوی نے مداخلت کی اور ٹیڑھی راہ اختیار کر کے بے جا سوال اور کلام شروع کیا۔ اوّل تو حضرت اقدس اُسے حلیمی سے سمجھاتے رہے، مگر جب معلوم ہوا کہ اس کی غرض رفع شکوک و شبہات نہیں، صرف مناظرہ کا ایک اکھاڑہ قائم کرنا چاہتا ہے تو اُس سے اعراض کیا اور فرمایا کہ مباحثہ کا دروازہ تو ہم بند کر چکے ہیں۔ اب اس میں پڑنا پسند

---

[1] کتابت کی غلطی ہے "مہمان" ہونا چاہیے۔ (مرتب)

نہیں کرتے۔ اس پر بعض مفسد طبائع نے شور کرنا شروع کیا۔ آخر مصلحتِ وقت دیکھ کر مولوی صاحب کو بیجا مداخلت سے روکا گیا اور جب وہ باز نہ آتے تو اُن کو جبراً احاطہ سے باہر کر دیا گیا۔

اس اثنا میں جو کلام حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اُسے ہم یکجائی طور پر درج کرتے ہیں۔

فرمایا کہ:

مسیح اور مہدی کی ضرورت

شکوک کے رفع کرنے کیلئے اندرونی راستی اور سچی نیت سے آوے تو ہم اسے سمجھا سکتے ہیں اور اب تو ایسا زمانہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ایک معلّم کی طرح سمجھا رہا ہے۔ یہ اس کی عادت میں داخل ہے کہ جب دنیا میں گناہ اور بے ایمانی بڑھ جاوے اور ردّی اخلاق اور ردّی عادات ترقی پکڑ جاویں تو ایک شخص کو اصلاح کے لیے مامور کرے۔ اسلام اس وقت دو آفتوں کے ماتحت ہے۔ ایک اندرونی۔ دوسری بیرونی۔ اندرونی خود عالموں کا اختلاف اور مُسلمانوں کا دُنیا کی طرف میلان۔ اور بیرونی وہ آفت جو عیسائیت کی وجہ سے ہے۔ پس کیا ابھی تمہارے نزدیک مہدی اور مسیح کی ضرورت نہ تھی؟

تیس ۳۰ دجال

پھر ایک اعتراض یہ پیش کرتے ہو کہ اس امت میں تیس دجال آنیوالے ہیں۔ اے بدقسمتو! کیا تمہارے لیے دجال ہی رہ گئے کہ اگر ایک کے آنے سے ایمان کے تباہ ہونے میں کوئی کسر رہ جاوے تو پھر دوسرا تیسرا اور چوتھا حتیٰ کہ تیس دجال آویں تاکہ ایمان کا نام ونشان نہ رہے۔ اس طرح تو موسیٰ علیہ السلام کی امت ہی اچھی رہی کہ جس میں پے در پے چار سو نبی آیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے وقت تو عورتوں سے بھی خدا تعالیٰ نے کلام کیا۔ کیا امت محمدیہ کے مرد بھی اس قابل نہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ اُن سے ہمکلام ہوتا؟ پھر یہ بتلاؤ کہ یہ اُمتِ مرحومہ کس طرح ہوئی، اس کا نام تو بدنصیب ہونا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرہ سو برس گذر گئے اور جس قدر فیوض اور برکات تھے وہ سب سماع کے حکم میں آ گئے۔ اب اگر خدا تعالیٰ اُن کو تازہ کر کے نہ دکھائے تو صرف قصہ کہانی کے رنگ میں اُن کو کون مان سکتا ہے؛ جبکہ تازہ طور پر خدا تعالیٰ کی مدد نہیں۔ نُصرت نہیں تو خدا تعالیٰ کی حفاظت کیا ہوئی؟ حالانکہ اس کا وعدہ ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر: ۱۰)

طاعون اور احمدی

جب متعصّب مولوی صاحب نے طاعون کا ذکر کیا کہ آپ کے مُرید کیوں مرتے ہیں اور اس کا علاج کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو آپ نے فرمایا:

کسوف وخسوف کا علاج بھی کچھ سوچا ہے۔ اس وقت بحث تو نشانوں کی ہے نہ کہ علاج کی۔ ہاں جو

خاص طور پر مجھ کو قبول کرتا ہے وہ ضرور محفوظ رہے گا لیکن اس کا مجھے علم نہیں کہ وہ کون ہے۔ میں کسی کے سینہ کو چیر کر نہیں دیکھتا۔ صحابہ کرامؓ کا بھی ایک گروہ طاعون سے شہید ہوا تھا مگر دیکھ لو کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما طاعون سے ہرگز نہیں فوت ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے بھی اپنے بندوں میں امتیاز رکھا ہے۔ جیسے کہ فرمایا ہے

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ۔ (فاطر: ۳۳)

جماعت سے خطاب

اس کے بعد آپ نے جماعت کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ :

ضروری بات یہ ہے کہ تم لوگ ان باتوں کی طرف متوجہ نہ ہو اور تقویٰ اور طہارت میں ترقی کرو۔ تمہارا معاملہ اور حساب خدا سے الگ ہے اور مخالف لوگوں کا حساب الگ ہے جنہوں نے قسم کھائی ہے کہ کیسی ہی سچی بات کیوں نہ ہو مگر وہ قبول نہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کی نسبت یہی فرماتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو ہی قبول کریں گے۔ ان کی بناوٹ ہی اسی قسم کی ہے کہ عمدہ شئے یا بات جو پیش کی جاوے وہ ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر بدبودار بات ہو تو خوش ہوتے ہیں۔ قرآن شریف، احادیث اور عقلی دلائل اور نشان پیش کئے۔ مگر یہ لوگ ان کی پروا نہیں کرتے۔ صرف ایک بات کو نشانہ بناتے ہیں۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ نے نہ چاہا کہ ایک مذہب ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے فہمِ سلیم عطا کیا ہے ان کو چاہیے کہ وہ شکر کریں کیونکہ فائدہ اُٹھانیوالے وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے خود پاک کیا۔

نشاناتِ صداقت

ابھی ہماری جماعت کے بہت سے لوگ چھپے ہوتے ہیں ظاہراً وہ ہم سے الگ ہیں لیکن دراصل ہم میں سے ہیں۔ ہمیں خود ان کا علم نہیں لیکن امید ہے کہ اپنے وقت پر وہ آجاویں گے۔ خود لاہور میں ایک شخص نے ملاقات کی اور کہا کہ میں آپکو گالیاں دیا کرتا تھا۔ معاف کرو اب میرے شکوک رفع ہو گئے ہیں اور ہزاروں خطوط اس قسم کے آئے ہیں کہ میں اوّل ابوجہل تھا۔ اب توبہ کرتا ہوں۔ بعضوں نے بذریعہ خواب کے مانا اور اکثر کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کشف میں یا خواب میں کہا کہ تم قبول کر لو۔ جو لوگ بغض کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی تیز دھار کو روک لیویں مگر وہ کسی کے روکنے سے رُک نہیں سکتی۔ اگر انسانی کاروبار ہوتا تو آجتک کب کا تباہ ہو جاتا۔ مجھے دعویٰ کئے ہوئے چوبیس ۲۴ برس سے زیادہ عرصہ گذر گیا ایک مفتری کو اس قدر مہلت مل سکتی ہے کہ اگر کسی کو عقل، فہم اور موت کا ڈر ہو تو وہ براہین کے وقت کو دیکھے کہ جو پیشگوئیاں اس میں ہیں وہ کیسے پوری ہو کر رہیں، لیکن یہ بات ہے کہ جبتک اللہ تعالیٰ ہدایت نہ دے اور وہ دل کے

ملتے نہ دکھوتے تو کس طرح سمجھ میں آوے۔ کوئی بتادے تو سہی کہ جب سے دُنیا ہوئی ہے کسی مفتری نے اس قسم کی پیشگوئی بھی کی ہے۔ خدا تعالیٰ سے خوف کرنے والے کے لیے تو ایک ہی نشان کافی ہو سکتا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے اس قدر کثیر نشانوں سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔

غرض مدعا یہ ہے کہ یہ تمام باتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ہدایت قبول کرتے ہیں۔ نہ کہ مُنکروں کے لیے جن کے واسطے اللہ تعالیٰ کا قانون اور ہے۔ تم خدا سے پناہ مانگو کہ اُن کے لیے جو قانون ہے اس میں تم کو داخل نہ کرے۔ ہمیشہ نیک دل خدا تعالیٰ کی رحمت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ نہ خیال کرو کہ یہ لوگ مذہب میں پکے ہیں۔ بڑے بُزدل ہوتے ہیں۔ قہرِ الٰہی کا ذرا نہیں مقابلہ کر سکتے۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ ایسا زمانہ ہے۔ جس کے لیے سب نبیوں کی پیش گوئیاں ہیں اور جیسے مختلف نہریں مِل کر ایک دریا بن کر بہہ نکلتی ہیں اسی طرح ان پیش گوئیوں کا سیلاب بہہ نکلے گا اور آدمؑ، موسیٰؑ، ابراہیمؑ وغیرہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا وہ سب پُورا ہو کر رہے گا۔ بعض رحمت کے نشان بھی ہوں گے مگر اُن سے انہی کو حصہ ملے گا جو عاجز۔ فروتن اور خائف اور تائب ہوں گے اور جو مُنکر ہیں وہ قہری نشان سے حصہ لیں گے، اگرچہ یہ لوگ اس وقت انکار کو نہیں چھوڑتے اور صرف ماں باپ یا جاہل لوگوں سے سُن سُنا کر غلط عقائد پر اڑے ہوتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ زبردستی سب کچھ چھڑا دے گا۔ زبردست سے لڑنا نادانی ہے۔ اگر یہ کاروبار انسان کی طرف سے ہوتا تو کب کا تباہ ہو جاتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ ہم پر افترا کرتا تو ہم اس کی شاہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر میں خدا پر افترا کرتا ہوں اور تھوڑی مدت نہیں بلکہ تیس۳۰ سال کے قریب ہو چلا کہ ہمیشہ اس کی طرف سے وحی لوگوں کو سُناتا ہوں اور وہ جانتا بھی ہے کہ مَیں جھُوٹا ہوں لیکن میری تائید کرتا ہے اور ہلاک نہیں کرتا۔ وہ کیسا خدا ہے کہ ایک جھوٹے سے اتفاق کر بیٹھا ہے اور ہزاروں نشان اس کی تائید میں دکھاتا ہے۔ نئی سواری بھی اس کے لیے نکالی۔ کسوف و خسوف بھی اس کے لیے ماہِ رمضان میں کیا۔ طاعون بھی بھیجی۔ گویا خدا نے جان کر دھوکا دیا اور جو کام دجّال نے کرنا تھا وہ خود آپ کیا تاکہ مخلوق تباہ ہو۔ ذرا سوچو کیا خدا تعالیٰ کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک کذّاب مفتری اور دجّال کی وہ اس قدر مدد کرے۔ اور مولوی لوگ جو خود کو اس کا مقرب جانتے ہیں۔ ان کی دعا ہرگز قبول نہ ہو۔ جو لڑائی یہ لوگ لڑ رہے ہیں وہ مجھ سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ مَیں تو کچھ شَے نہیں ہوں۔ خدا تعالیٰ سے لڑائی والا کبھی بابرکت نہیں ہو سکتا۔ مَیں تو اس بات کو کہتے ہوئے ڈرتا ہوں اور مجھے لرزہ پڑتا ہے کہ افترا ہو اور خدا تعالیٰ چپ کر کے بیٹھا رہے۔ اگر اُن کے نزدیک یہ افترا ہے تو چاہیے کہ دُعا کریں کہ خدا اسے نیست کرے یا دُعا کر کے حضرت مسیحؑ کو آسمان سے اُتاریں۔ عیسائی محققین نے بھی آخر کار مسیحؑ کے آسمان

کے آسمان سے آنے سے تنگ آکر اور میعاد گذرتی دیکھ کر فیصلہ کر دیا ہے کہ کلیسا کو مسیح مان لو۔ یہی مسیح کا نزول ہے۔ ان کو بھی آخر کار نزول کو استعارہ کے رنگ میں ہی ماننا پڑا۔ احادیث پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ تمام خلفاء اس اُمت میں سے ہوں گے۔ قرآن شریف بھی یہی کہہ رہا ہے اور سب جگہ مِنْکُمْ کا لفظ موجود ہے مگر نامعلوم کہ ان لوگوں نے مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کہاں سے بنا لیا۔ کیا یہ تھوڑا نشان ہے کہ نہ کوئی واعظ ہے نہ لیکچرار اور ہماری ترقی برابر ہو رہی ہے۔ بھلا اگر ان کو طاقت ہے تو روک دیں۔ اللہ تعالیٰ خود لوگوں کو ادھر رجوع دلا رہا ہے۔ مصر سے بھی بیعت کی درخواست آئی ہے۔ یورپ میں تحریک ہے۔ امریکہ میں تحریک ہے۔

میں پھر جماعت کو تاکید کرتا ہوں کہ تم لوگ ان کی مخالفتوں سے غرض نہ رکھو۔ تقویٰ طہارت میں ترقی کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہوگا اور ان لوگوں سے وہ خود سمجھ لیوے گا۔ وہ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۔ (نحل : ۱۲۹)۔

اور خوب یاد رکھو کہ اگر تقویٰ اختیار نہ کرو گے اور اس نیکی سے جسے خدا چاہتا ہے کثیر حصّہ نہ لوگے تو اللہ تعالیٰ سب سے اول تم ہی کو ہلاک کرے گا کیونکہ تم نے ایک سچائی کو مانا ہے اور پھر عملی طور سے اس کے منکر ہوتے ہو۔ اس بات پر ہرگز بھروسہ نہ کرو اور مغرور مت ہو کہ بیعت کر لی ہے۔ جبتک پورا تقویٰ اختیار نہ کرو گے ہرگز نہ بچو گے۔ خدا تعالیٰ کا کسی سے رشتہ نہیں نہ اس کو کسی کی رعایت منظور ہے۔ جو ہمارے مخالف ہیں وہ بھی اسی کی پیدائش ہیں اور تم بھی اسی کی مخلوق ہو۔ صرف اعتقادی بات ہرگز کام نہ آوے گی جبتک تمہارا قول اور فعل ایک نہ ہو۔

ان لوگوں کی حالتوں پر غور کرو کہ جب توفّی کا لفظ مسیح کے لیے آوے تو اس کے معنے آسمان پر جانے کے کرتے ہیں۔ اور جب وہی لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہو تو اس کے معنے وفات پانے کے کرتے ہیں پس خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ عملی راستی دکھاؤ تا وہ تمہارے ساتھ ہو۔ رحم، اخلاق، احسان، اعمالِ حسنہ، ہمدردی اور فروتنی میں اگر کمی رکھو گے تو مجھے معلوم ہے اور بار بار میں بتلا چکا ہوں کہ سب سے اول ایسی ہی جماعت ہلاک ہو گی۔ موسیٰ علیہ السلام کے وقت جب اس کی امت نے خدا تعالیٰ کے حکموں کی قدر نہ کی تو باوجودیکہ موسیٰ اُن میں موجود تھا مگر پھر بھی بجلی سے ہلاک کئے گئے۔ پس اگر تم بھی ویسے کرو گے تو میری موجودگی کچھ کام نہ آوے گی۔

اب ہم ان لوگوں کو کہاں تک سمجھائیں۔ بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں اور ان کے لیے کافی اتمام حجت ہو چکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام پر توفّی کا استعمال کریں تو اس کے معنے موت کے ہوں۔

ساحرینِ موسیٰ کے لیے وہی لفظ آوے تو اس کے معنے موت کے ہوں۔ لیکن جب مسیح پر بولا جاوے تو اس کے معنے آسمان پر جانا کرتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کو کیا جواب دیویں گے۔ کیا یہی اُن کی محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور یہ کیسی دلیری اور شوخی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک جس کی دنیا کو ضرورت تھی وہ تو تیرہ ۱۳ سو برس گذرے کہ خاک میں دفن ہو اور آپؐ ترسیٹھ ۶۳ برس کی عمر میں فوت ہو جاویں اور مسیح ابتک آسمان پر۔ کوئی بتلاوے کہ وہاں کیا کر رہا ہے۔ اس کا وعدہ تھا کہ مَیں بنی اسرائیل کی طرف آیا ہوں اور کتنی قومیں بنی اسرائیل کی باقی تھیں کہ آسمان پر جا بیٹھا اور وعدہ بھی پورا نہ کیا اور پھر عقل، نقل اور کتاب اللہ کے برخلاف ہے۔ یہ سب دلائل ہیں جو کہ ایک مومن کے لیے کافی ہیں اور بجز اس کے کہ عیسیٰ کو فوت شدہ مانا جاوے اور کوئی ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو محفوظ رکھنے کا نہیں ہے مَیں تو اس شخص سے بہت خوش ہوں کہ جس نے کتاب حیاۃ النبیؐ لکھی ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پیغمبر کو زندہ کہے وہ کافر ہے کیونکہ آخر محبت کی کچھ بھی تو علامت چاہیے۔ بعض نئے نئے لوگوں نے جو عیسائیوں میں سے اسلام میں داخل ہوئے ــ حضرت عمرؓ کو یہ بات کہی ہوگی کہ عیسیٰ ابتک زندہ ہے تب ہی تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ہرگز یہ باور نہ کیا کہ آپ فوت ہو گئے ہیں بلکہ ایسا کہنے والے کو قتل کرنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ آخر جب حضرت ابوبکرؓ نے آکر اس مسئلہ کو حل کیا کہ سب نبی فوت ہو گئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی فوت ہوئے تب آپ کو اعتبار آیا۔

اب عیسائیت کا اثر غالب آگیا ہے اور جو محبت مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چاہیئے تھی وہ نہیں رہی۔ ہزاروں رسالے اور اخبار نکالتے ہیں لیکن کسی نے آجتک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا رسالہ نہ نکالا۔ پس اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپؐ کی عزت کو دُنیا میں قائم کرے۔ کئی کروڑ کتب اسلام کے ردّ میں لکھی گئیں کیا اب بھی خدا کو لازم نہ تھا کہ کوئی ذریعہ قائم کر کے آپؐ کی عزت کو ظاہر کرے۔ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نبی مانتے ہیں اور سب سے اشرف جانتے ہیں اور ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ کوئی عمدہ بات کسی اَور کی طرف منسوب کی جاوے۔ جب کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی معجزہ طلب کیا کہ آسمان پر چڑھ کر دکھاویں تو آپؐ نے فرمایا سُبْحَانَ رَبِّیْ اور انکار کر دیا۔ دُوسری طرف حضرتِ مسیح کو خدا آسمان پر لے جاوے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم قرآن سے کیا بلکہ کل کتابوں سے دکھا سکتے ہیں کہ جس قدر اخلاق اور خوبیاں کل انبیاء میں تھیں وہ سب کی سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع تھیں۔ کَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا (النساء: ۱۱۴) اسی کی طرف اشارہ ہے۔

پس اگر آسمان پر جانا کوئی فضیلت ہوسکتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کب باہر رہ سکتے تھے۔ آخر یہ لوگ پچھتا دیں گے کہ ان باتوں کو ہم نے کیوں نہ مانا۔ یہ لوگ ایک وار تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کرتے ہیں کہ ایک معجزہ آسمان پر جانے کا لوگوں نے مانگا مگر خدا نے آپ کی پرداہ نہ کی اور عیسٰی کو یہ عزت دی کہ اُسے آسمان پر اٹھا لیا اور دوسرا حملہ خود خدا پر کرتے ہیں کہ اُس نے اپنی قوتِ خلق سے مسیح کو بھی کچھ دے دی جس سے تشابہ الخلق ہوگیا۔ جواب دیتے ہیں کہ خدا نے خود مسیح کو یہ قدرت دی تھی۔ اے نادانو! اگر خدائی نے تقسیم ہونا تھا تو کیا اس کے حِصّہ گیر عیسٰی ہی رہ گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہ حِصّہ ملا۔[1]

اس قدر تقریر ہوچکی تھی کہ بعض جان نثاروں نے بہت وقت گذر جانے کی درخواست کی تاکہ آپ کی طبیعت کو زیادہ صدمہ نہ ہو اور سلسلہ تقریر ختم ہو جاوے؛ چنانچہ حضور نے دُعا پر اُسے ختم کیا۔

۲۸؍ اگست ۱۹۰۴ء

بمقام لاہور۔ سات بجے صبح

(حضرت اقدس کی تقریر جو ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مجمع کے درمیان آپ نے فرمائی)

توبہ کا دن جمعہ اور عیدین سے بھی بہتر اور مُبارک ہے

سب صاحب یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام میں ایسے دن مقرر کئے ہیں کہ وہ دن بڑی خوشی کے دن سمجھے جاتے ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ نے عجیب عجیب برکات رکھی ہیں۔ منجملہ ان دنوں کے ایک جمعہ کا دن ہے۔ یہ دن بھی بڑا ہی مبارک ہے۔ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جمعہ ہی کو پیدا کیا اور اسی دن ان کی توبہ منظور ہوئی تھی۔ اور بھی بہت سی برکات اور خوبیاں اس دن کی ماثور ہیں۔ ایسا ہی اسلام میں دو عیدیں ہیں۔ ان دونوں دنوں کو بھی بڑی خوشی کے دن مانا گیا ہے اور ان میں بھی عجیب عجیب برکات

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۳۴ صفحہ ۳ تا ۸ مورخہ ۸؍ ستمبر ۱۹۰۴ء
نمبر ۳۵ صفحہ ۱، ۲ مورخہ ۱۶؍ ستمبر ۱۹۰۴ء

رکھی ہیں لیکن یاد رکھو کہ یہ دن بیشک اپنی اپنی جگہ مبارک اور خوشی کے دن ہیں۔ لیکن ایک دن ان سب سے بھی بڑھ کر مبارک اور خوشی کا دن ہے، مگر افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ لوگ نہ تو اس دن کا انتظار کرتے ہیں اور نہ اس کی تلاش، ورنہ اگر اس کی برکات اور خوبیوں سے لوگوں کو اطلاع ہوتی یا وہ اس کی پروا کرتے تو حقیقت میں وہ دن ان کے لیے بڑا ہی مُبارک اور خوش قسمتی کا دن ثابت ہوتا اور لوگ اُسے غنیمت سمجھتے۔

وہ دن کونسا دن ہے جو جمعہ اور عیدین سے بھی بہتر اور مبارک دن ہے؟ مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ دن انسان کی توبہ کا دن ہے جو ان سب سے بہتر ہے اور ہر عید سے بڑھ کر ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس دن وُہ بداعمال نامہ جو انسان کو جہنم کے قریب کرتا جاتا ہے اور اندر ہی اندر غضبِ الٰہی کے نیچے اُسے لا رہا تھا دھو دیا جاتا ہے اور اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ حقیقت میں اس سے بڑھ کر انسان کے لیے اور کونسا خوشی اور عید کا دن ہو گا جو اسے ابدی جہنم اور ابدی غضبِ الٰہی سے نجات دیدے۔ توبہ کرنے والا گنہگار جو پہلے اللہ تعالیٰ سے دُور اور اس کے غضب کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اب اس کے فضل سے اُس کے قریب ہوتا اور جہنم اور عذاب سے دُور کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ (البقرۃ: ۲۲۳) بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور ان لوگوں سے جو پاکیزگی کے خواہاں ہیں پیار کرتا ہے۔ اس آیت سے نہ صرف یہی پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی توبہ کے ساتھ حقیقی پاکیزگی اور طہارت شرط ہے۔ ہر قسم کی نجاست اور گندگی سے الگ ہونا ضروری شرط ہے، ورنہ نری توبہ اور لفظ کے تکرار سے تو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ پس جو دن ایسا مُبارک دن ہو کہ انسان اپنی بدکرتوتوں سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچّا عہدِ صلح باندھے اور اس کے احکام کے لیے اپنا سر خم کر دے تو کیا شک ہے کہ وہ اس عذاب سے جو پوشیدہ طور پر اس کے بدعملوں کی پاداش میں تیار ہو رہا تھا بچایا جاوے گا اور اس طرح پر وُہ وہ چیز پا لیتا ہے جس کی گویا اسے توقع اور امید ہی نہ رہی تھی۔

تم خود قیاس کر سکتے ہو کہ ایک شخص جب کسی چیز کے حاصل کرنے سے بالکل مایوس ہو گیا ہے اور اس ناامیدی اور یاس کی حالت میں وہ اپنے مقصود کو پا لے تو اسے کس قدر خوشی حاصل ہو گی۔ اس کا دل ایک تازہ زندگی پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ احادیث اور کتبِ سابقہ سے یہی پتہ لگتا ہے کہ جب انسان گناہ کی موت سے نکل کر توبہ کے ذریعہ نئی زندگی پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی زندگی سے خوش ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ خوشی کی بات تو ہے ہی کہ انسان گناہوں کے نیچے دبا

ہو اور ہلاکت اور موت ہر طرف سے اس کے قریب ہو۔ عذاب الٰہی اس کے کھا جانے کو تیار ہو کہ وہ یکا یک ان بدیوں اور بدکاریوں سے جو بُعد اور ہجر کا موجب تھیں توبہ کر کے خدا تعالیٰ کی طرف آ جاوے وہ وقت خدا تعالیٰ کی خوشی کا ہوتا ہے اور آسمان پر ملائکہ بھی خوشی کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی بندہ تباہ اور ہلاک ہو، بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ اگر اس کے بندہ سے کوئی غلطی اور کمزوری ظاہر ہوئی ہے پھر بھی وہ توبہ کر کے امن میں داخل ہو۔ پس یاد رکھو کہ وہ دن جب انسان اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے۔ بہت ہی مبارک دن ہے اور سب ایام سے افضل ہے۔ کیونکہ وہ اس دن نئی زندگی پاتا ہے اور اللہ تعالےٰ کے قریب کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے یہ دن (جس میں تم میں سے بہتوں نے اقرار کیا ہے کہ میں آج اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور آئندہ جہاں تک میری طاقت اور سمجھ ہے گناہوں سے بچتا رہوں گا) **يَوْمِ تَوْبَہٗ** ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے موافق میں یقین رکھتا ہوں کہ ہر ایک شخص کے جس نے سچے دل سے توبہ کی ہے پچھلے گناہ بخش دیئے گئے اور وُہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ کے نیچے آ گیا ہے۔ گویا کہہ سکتے ہیں کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مگر ہاں میں پھر کہتا ہوں کہ اس کے لیے یہ شرط ہے کہ حقیقی پاکیزگی اور سچی طہارت کی طرف قدم بڑھایا جاوے اور یہ توبہ نری لفظی توبہ ہی نہ ہو بلکہ عمل کے نیچے آ جاوے۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے کہ کسی کے گناہ بخش دیئے جاویں، بلکہ ایک عظیم الشان امر ہے۔

دیکھو! انسانوں میں اگر کوئی کسی کا ذرا سا قصور اور خطا کرے تو بعض اوقات اس کا کینہ پشتوں تک چلا جاتا ہے وُہ شخص نسلاً بعد نسل تلاشِ حریف میں رہتا ہے کہ موقعہ ملے تو بدلہ لیا جاوے لیکن اللہ تعالےٰ بہت ہی رحیم و کریم ہے۔ انسان کی طرح سخت دل نہیں جو ایک گناہ کے بدلے میں کئی نسلوں تک پیچھا نہیں چھوڑتا اور تباہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ رحیم کریم خُدا ستر برس کے گناہوں کو ایک کلمہ سے ایک لحظہ میں بخش دیتا ہے۔ یہ مت خیال کرو کہ وہ بخشنا ایسا ہے کہ اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ نہیں وہ بخشنا حقیقت میں فائدہ رساں اور نفع بخش ہے اور اس کو وہ لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے سچے دل سے توبہ کی ہو۔

نزُولِ بلا کا فلسفہ

بہت سے لوگ اس امر سے غافل ہیں کہ انسان پر جو بلائیں آتی ہیں وُہ بلا وجہ یونہی آ جاتی ہیں یا اُن کے نزول کو انسان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا خیال بالکل غلط ہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ ہر بلا جو اس زندگی میں آتی ہے یا جو مرنے کے بعد آئے گی جس کا ہمیں یقین ہے۔ اس کی اصل جڑ گناہ ہی ہے۔ کیونکہ گناہ کی حالت میں انسان اپنے آپ کو اُن انوار اور فیوض سے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں پرے ہٹا دیتا ہے اور اس

اصل مرکز سے جو حقیقی راحت کا مرکز ہے۔ ہٹ جاتا ہے، اس لیے تکلیف کا آنا اس حالت میں اس پر ضروری ہے۔

یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انبیاء اور راستبازوں پر بھی بعض اوقات بلائیں آجاتی ہیں اور مصائب اور شدائد میں ڈالے جاتے ہیں لیکن یہ گمان کرنا کہ وہ مصائب اور بلائیں کسی گناہ کی وجہ سے آتی ہیں خطرناک غلطی اور گناہ ہے۔ ان بلاؤں میں جو خدا کے راستبازوں اور پیارے بندوں پر آتی ہیں اور ان بلاؤں میں جو خُدا تعالیٰ کے نافرمانوں اور خطاکاروں پر آتی ہیں زمین آسمان کا فرق ہے اس لیے کہ ان کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ نبیوں اور راستبازوں پر جو بلائیں آتی ہیں اُن میں ان کو ایک صبرِ جمیل دیا جاتا ہے جس سے وہ بلا اور مصیبت ان کے لیے مُنُک الحلاوت ہو جاتی ہیں۔ وہ اس سے لذّت اُٹھاتے ہیں اور روحانی ترقیوں کے لیے ایک ذریعہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کے درجات کی ترقی کے لیے ایسی بلاؤں کا آنا ضروری ہے جو ترقیات کے لیے زینہ کا کام دیتی ہیں۔ جو شخص ان بلاؤں میں نہیں پڑتا اور ان مصیبتوں کو نہیں اُٹھاتا وہ کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتا۔

دُنیا کے عام نظام میں بھی تکالیف اور مشقتوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں سے ہر ایسے شخص کو جو ترقی کا خواہاں ہے گذرنا پڑتا ہے، لیکن ان تکالیف اور شاقہ محنتوں میں باوجود تکالیف کے ایک لذّت ہوتی ہے جو اُسے کشاں کشاں آگے لیے جاتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ مصیبت اور تکالیف جو انسان کی اپنی بدکرداری کی وجہ سے اس پر آتی ہیں ـــ وہ مصیبت ہوتی ہے جس میں ایک درد اور سوزش ہوتی ہے، جو اس کی زندگی اس کے لیے وبالِ جان کر دیتی ہے وہ موت کو ترجیح دیتا ہے مگر نہیں جانتا کہ یہ سلسلہ مرکر بھی ختم نہیں ہوگا۔

غرض ان بلاؤں کے نزول میں ہمیشہ سے قانونِ قدرت یہی ہے کہ جو بلائیں شامتِ اعمال کی وجہ سے آتی ہیں وہ الگ ہیں اور خُدا کے راستبازوں اور پیغمبروں پر جو بلائیں آتی ہیں وہ ان کی ترقی درجات کے لیے ہوتی ہیں۔ بعض جاہل جو اس راز کو نہیں سمجھتے وہ جب بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اس بلا سے فائدہ اُٹھاویں اور کم ازکم آئندہ کے لیے مفید سبق حاصل کریں اور اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا کریں کہہ دیتے ہیں کہ اگر ہم پر مصیبت آئی تو کیا ہوا نبیوں اور پیغمبروں پر بھی تو آجاتی ہیں، حالانکہ ان بلاؤں کو انبیاء کی مشکلات اور مصائب سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ جہالت بھی کیسی بُری مرض ہے کہ انسان اس میں قیاس مع الفارِق کر بیٹھتا ہے۔ یہ بڑا دھوکہ واقع ہوتا ہے جو انسان تمام انبیاء کی مشکلات کو عام لوگوں کی بلاؤں پر حمل کرلیتا ہے۔

پس خوب یاد رکھو کہ جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے انبیاء اور دوسرے اخیار و ابرار کی بلائیں محبت کی راہ سے ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کو ترقی دیتا جاتا ہے اور یہ بلائیں وسائل ترقی میں سے ہیں، لیکن جب مفسدوں پر آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو اس عذاب سے تباہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بلائیں ان کے استیصال اور نیست و نابود کرنے کا ذریعہ ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسا فرق ہے کہ دلائل کا محتاج نہیں ہے، کیونکہ جب اچھے آدمی جو اللہ تعالیٰ کو مقدم کر لیتے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کیوں کرتے ہیں۔ بہشت اور دوزخ ان کے دل میں نہیں ہوتا اور نہ بہشت کی خواہش اور دوزخ کا ذکر اُن کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا محرک ہوتا ہے بلکہ وہ طبعی جوش اور طبعی محبت سے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے اور اس کی اطاعت میں محو ہوتے ہیں۔ ان پر جب کوئی بلا آتی ہے تو وہ خود محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ از راہِ محبت ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان بلاؤں کے ذریعہ ایک چشمہ کھولا جاتا ہے جس سے وہ سیراب ہوتے ہیں اور ان کا دل لذّت سے بھر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت ایک فوّارہ کی طرح جوش مارنے لگ جاتی ہے۔ تب وہ چاہتے ہیں کہ یہ بلا زیادہ ہو تاکہ قربِ الٰہی زیادہ ہو اور رضا کے مدارج جلد طے ہوں۔ غرض الفاظ وفا نہیں کرتے جو اس لذّت کو بیان کر سکیں جو اخیار و ابرار کو ان بلاؤں کے ذریعہ آتی ہے۔ یہ لذّت تمام سفلی لذّتوں سے بڑھی ہوئی ہے اور فوق الفوق لذّت ہوتی ہے۔ یہ مصیبت کیا ہے۔ ایک عظیم الشان دعوت ہے جس میں قسم قسم کے انعام و اکرام اور پھل اور میوے پیش کیے جاتے ہیں۔ خُدا اس وقت قریب ہوتا ہے۔ فرشتے ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مکالمہ کا شرف عطا کیا جاتا ہے اور وحی اور الہام سے اس کو تسلی اور سکینت دی جاتی ہے۔ لوگوں کی نظر میں یہ بلاؤں اور مصیبتوں کا وقت ہے مگر دراصل اس وقت اللہ تعالیٰ کے فیضان اور فیوض کی بارش کا وقت ہوتا ہے۔ سفلی اور سطحی خیال کے لوگ اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ بلاؤں اور غموں ہی کا وقت ہے جس میں مزا آتا ہے اور راحت ملتی ہے کیونکہ خدا جو انسان کا اصل مقصود ہے۔ اس وقت اپنے بندے کے بہت ہی قریب ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قرآن جو دیا گیا ہے غم کی حالت میں دیا گیا ہے۔ پس تم بھی اس کو غم کی حالت میں پڑھو۔

غرض میں کہاں تک بیان کروں کہ ان بلاؤں میں کیا لذّت اور مزا ہوتا ہے اور عاشق صادق کہاں تک ان سے محظوظ ہوتا ہے۔ مختصر طور پر یاد رکھو کہ ان بلاؤں کا پھل اور نتیجہ جو ابرار اور اخیار پر آتی ہیں جنّت اور ترقی درجات ہے اور وہ بلائیں اور غم جو مفسدوں اور شریروں پر آتے ہیں، ان کی وجہ شامتِ اعمال اور تاریک زندگی ہے اور اس کا نتیجہ جہنم اور عذابِ الٰہی ہے۔ پس جو شخص آگ کے پاس جاتا ہے ضرور

ہے کہ وہ اس کی سوزش سے حصہ لے اور اسے محسوس کرے اور اُسے دُکھ پہنچے لیکن جو ایک باغ میں جاتا ہے یہ یقینی امر ہے کہ اس کے پھلوں اور پھولوں کی خوشبو سے اور اس خوبصورت نظارہ کے مشاہدہ سے لذت پاوے۔

شامتِ اعمال کی وجہ سے آنیوالی بلاؤں کا علاج

اب واضح ہے کہ جس حال میں وہ بلائیں جو شامتِ اعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ اور جن کا نتیجہ جہنمی زندگی اور عذابِ الٰہی ہے ان بلاؤں سے جو ترقی درجات کے طور پر اخیار و ابرار کو آتی ہیں الگ ہیں۔ کیا کوئی ایسی صورت بھی ہے جو انسان اس عذاب سے نجات پالے۔ ہاں اس عذاب اور دُکھ سے رہائی کی بجز اس کے کوئی تجویز اور علاج نہیں ہے کہ انسان سچے دل سے توبہ کرے۔ جبتک سچی توبہ نہیں کرتا، یہ بلائیں جو عذابِ الٰہی کے رنگ میں آتی ہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون کو نہیں بدلتا جو اس بارے میں اس نے مقرر فرما دیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد: ۱۲) یعنی جبتک کوئی قوم اپنی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی — اللہ تعالیٰ بھی اس کی حالت نہیں بدلتا۔

اللہ تعالیٰ ایک تبدیلی چاہتا ہے اور وہ پاگیزہ تبدیلی ہے۔ جبتک وہ تبدیلی نہ ہو عذابِ الٰہی سے رستگاری اور مخلصی نہیں ملتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک قانون اور سُنّت ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (الاحزاب: ۶۳) سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی پس جو شخص چاہتا ہے کہ آسمان میں اس کیلئے تبدیلی ہو یعنی وہ ان عذابوں اور دُکھوں سے رہائی پائے جو شامتِ اعمال نے اس کے لیے تیار کئے ہیں۔ اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی کرے۔ جب وہ خود تبدیلی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق جو اس نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ میں کیا ہے۔ اسکے عذاب اور دکھ کو بدلا دیتا ہے اور دُکھ کو سُکھ سے تبدیل کر دیتا ہے جب انسان کے اندر تبدیلی کرتا ہے، تو اسکے لیے ضرور نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو بھی دکھاتا پھرے۔ وہ رحیم کریم خدا جو دلوں کا مالک ہے۔ اس کی تبدیلی کو دیکھ لیتا ہے کہ یہ پہلا انسان نہیں ہے اسلئے وہ اسپر فضل کرتا ہے۔ تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک شخص نماز روزہ اور دُوسرے اشغال اذکار سے ریا کرتا تھا تاکہ لوگ اسے ولی سمجھیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوگ اُسے ریا کار سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ بچے بھی جس راستہ سے وہ گذرتا تھا اس کو ریا کار اور فریبی کہا کرتے تھے۔ ایک وقت تک اس کی حالت ایسی ہی رہی۔ آخر اُس نے سوچا کہ اس طریق سے کوئی فائدہ تو نہیں ہوا، بلکہ حالت بدتر ہی ہوئی ہے اس لیے اسکو

چھوڑ دینا چاہیے۔ پس اس نے چھوڑ دیا اور ملامتی فرقہ کا سا طریق اختیار کر لیا۔ مسلمانوں میں ملامتی ایک فرقہ ہے جو اپنی نیکیوں کو چھپاتا ہے اور بدیوں کو ظاہر کرتا ہے تاکہ لوگ انہیں بُرا کہیں۔ اسی طرح پر وہ اپنی نیکیوں کو چھپانے لگا اور اندر ہی اندر اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کرنے لگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھا ہے کہ جس کوچہ سے گذرتا عام لوگ اور بچے بھی اُسے کہتے کہ بڑا نیک ہے۔ ولی ہے۔ بزرگ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا مُشک اور عطر کی طرح ہے جو کسی طرح سے چُھپ نہیں سکتا۔ یہی تاثیریں ہیں سچی توبہ میں۔ جب انسان سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ پھر اُسے نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے۔ اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ خدا اس کے دوستوں کا دوست اور اس کے دشمنوں کا دشمن ہو جاتا ہے اور وہ تقدیر جو شامت اعمال سے اس کے لیے مقرر ہوتی ہے، دُور کی جاتی ہے۔ اس امر کے دلائل بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنی اس مختصر زندگی میں بلاؤں سے محفوظ رہنے کا کس قدر محتاج ہے اور چاہتا ہے کہ ان بلاؤں اور وباؤں سے محفوظ رہے جو شامتِ اعمال کی وجہ سے آتی ہیں اور یہ ساری باتیں سچّی توبہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ پس توبہ کے فوائد میں سے ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا حافظ اور نگران ہو جاتا ہے۔ اور ساری بلاؤں کو خدا دُور کر دیتا ہے اور اُن منصوبوں سے جو دشمن اس کے لیے تیار کرتے ہیں اُن سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کا یہ فضل اور برکت کسی سے خاص نہیں بلکہ جس قدر بندے ہیں خدا تعالیٰ کے ہی ہیں — اس لیے ہر ایک شخص جو اُس کی طرف آتا ہے اور اس کے احکام اور اوامر کی پیروی کرتا ہے وُہ بھی ویسا ہی ہو گا جیسے پہلا شخص توبہ کر چکا ہے۔ وہ ہر ایک سچی توبہ کرنے والے کو بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ پس یہ توبہ جو آج اس وقت کی گئی ہے یہ مبارک اور عید کا دن ہے۔ اور یہ عید ایسی عید ہے جو کبھی میسّر نہیں آئی ہو گی۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑے سے خیال سے ماتم کا دن بنا دو۔ عید کے دن اگر ماتم ہو تو کیسا غم ہوتا ہے کہ دُوسرے خوش ہوں اور اس کے گھر ماتم ہو۔ موت تو سب کو ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس کے گھر عید کے دن موت ہو وہ کس قدر ناخوشگوار ہو گی۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان ایک نعمت کی قدر نہیں کرتا وہ ضائع ہو جاتی ہے۔ دیکھو جن چیزوں کی تم قدر کرتے ہو اُن کو صندوقوں میں بڑی حفاظت سے رکھتے ہو۔ اگر ایسا نہ کرو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس مال کا جو ایمان کا مال ہے چور شیطان ہے۔ اگر اس کو بچا کر دل کے صندوقوں میں احتیاط سے نہ رکھو گے تو چور آئے گا اور لے جائے گا۔ یہ چور بہت ہی خطرناک ہے۔ دُوسرے چور اندھیری راتوں میں آ کر نقب لگاتے ہیں وہ اکثر پکڑے جاتے ہیں اور سزا پاتے ہیں لیکن یہ چور

ایسا ہے کہ اس کی خبر نہیں ہوتی اور نہ کبھی پکڑا جائے گا۔ یہ اس وقت آتا ہے جب گناہ کی تاریکی پھیل جاتی ہے۔ کیونکہ چور اور روشنی میں دشمنی ہے۔ جب انسان اپنا مُنہ خدا کی طرف رکھتا ہے اور اسی کی طرف رجُوع اور توجہ کرتا ہے تو وہ روشنی میں ہوتا ہے۔ اور شیطان کو کوئی موقعہ اپنی دستبرد کا نہیں ملتا۔

پس کوشش کرو کہ تمہارے ہاتھوں میں ہمیشہ روشنی رہے۔ اگر غفلت بڑھ گئی تو یہ چور آئے گا اور سارا اندوختہ لے جائے گا اور برباد ہو جاؤ گے۔ اس لیے اس اندوختہ کو احتیاط اور اپنی راستبازی اور تقویٰ کے ہتھیاروں سے محفوظ رکھو۔ یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے ضائع ہونے سے کچھ حرج نہ ہو بلکہ اگر یہ اندوختہ جاتا رہا تو ہلاکت ہے اور ہمیشہ کی زندگی سے محروم ہو جاؤ گے۔

تنبیہہ و انذار

یاد رکھو۔ یہ طاعون کے دن ہیں۔ معلوم نہیں ستمبر کے آخر اور اکتوبر کے شروع میں کیا ہو۔ جہانتک خُدا نے مجھ پر ظاہر کیا ہے مَیں دیکھتا ہوں کہ بہت خطرناک دن آنیوالے ہیں۔ اس لیے ہر ایک شخص جو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے محفوظ رہے وُہ اسی وقت سے تیاری کرے۔ جبتک غضبِ الٰہی نازل نہیں ہوتا اور اس کے آثار نمودار نہیں ہوتے۔ تو ہر شخص واجب الرحم ہوتا ہے لیکن جب آثار نمودار ہو جاویں پھر عذاب نہیں ٹلتا۔ بہت سے لوگ بیباک اور جرأت کرنے والے ہوتے ہیں۔ وُہ شوخی سے کہہ دیتے ہیں کہ صدہا وبائیں بلائیں اور ہیضے وغیرہ آتے ہیں۔ ایسا ہی طاعُون بھی ہے، لیکن یہ اُن کی بدبختی اور شقاوت ہے جو ایسی جرأت پیدا ہوتی ہے وہ نہیں جانتے کہ یہ بُرے دنوں کی نشانی ہے۔ جب بلائیں دُنیا میں آتی ہیں اور دنیا کو تباہ کرتی ہیں تو شامتِ اعمال سے ہی آتی ہیں۔ ہمیشہ سے گناہ ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ان صورتوں میں ہی عذاب اور بلا آئی ہے اور ان گناہوں کے بدلے میں سزا دی گئی ہے۔ پھر یہ شوخی اچھی نہیں۔ اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہے۔ یہ وقت تو ایسا ہے کہ خُدا سے صلح کرو اور پاک تبدیلی کرو نہ یہ کہ شوخی و شرارت سے پیش آؤ۔

یاد رکھو یہ طاعُون ایک خطرناک عذابِ الٰہی ہے جو اس وقت نازل ہوا ہے اس کو حقیر مت سمجھو اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں یہ ایک نشان مقرر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نشانوں کو جو شخص حقارت سے دیکھتا ہے وہ نقصان اُٹھاتا ہے۔ مَیں کھول کھول کر بیان کرتا ہوں کہ اس عذاب سے مخلصی کے لیے سچی توبہ اور پاک تبدیلی کی ضرورت ہے اور بجز اس کے چارہ نہیں پس اسی وقت سے اس کے لیے تیاری کرو۔ شوخیوں اور شرارتوں سے باز آجاؤ۔

مسیح موعود کے زمانہ کے دو بڑے نشان

مَیں یہ بات بھی بیان کرنی چاہتا ہوں کہ مسیح موعود کے زمانہ کے بہت سے نشانوں میں سے دو بڑے نشان

ہیں جن میں سے ایک آسمان پر ظاہر ہوگا اور دُوسرا زمین پر۔

آسمان کا نشان تو یہ تھا کہ اُس کے زمانہ میں رمضان کے مہینہ میں مقررہ تاریخوں پر سُورج اور چاند گرہن ہوگا؛ چنانچہ کئی سال گذرے یہ نشان پورا ہوگیا اور نہ صرف اس ملک میں بلکہ دُوسری مرتبہ امریکہ میں بھی پُورا ہو۔

دُوسرا نشان یہی طاعون کا نشان تھا جو زمینی ہے۔ یہ نشان بدن پر لرزہ ڈال دینے والا نشان ہے۔ کئی سال سے یہ بلا اس مُلک میں نازل ہو رہی ہے مگر مَیں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ ابھی تک غفلت اور بدمستی اسی طرح ترقی پر ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر اس طاعون کی اس قدر شدت ہو جائے گی کہ دس میں سے سات مَرجائیں گے اور بعض بستیاں بالکل تباہ اور برباد ہو جائیں گی۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ابھی بہت خطرناک دن آنے والے ہیں۔ اس لیے مَیں ہر ایک کو جو سُنتا ہے کہتا ہوں کہ دیکھو اس وقت ہر ایک نفس کو چاہیے کہ اپنے نفس، اپنے بیوی بچوں اور دوستوں پر رحم کرے۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ رجُوع کرنے والوں پر اپنا فضل کر دیتا ہے اور یہ عذاب ٹل سکتا ہے۔ پس چاہیے کہ ہر شخص کوشش کرے اور سچی توبہ اور پاک تبدیلی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگے۔

ایک اعتراض کا جواب

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں بھی بعض آدمی طاعون سے مرگئے ہیں۔ ایسے معترضین کو یاد رکھنا چاہیے کہ موت تو ہر نفس کے لیے مقرر ہے اور ایک نہ ایک دن سب کو مرجانا ہے اور طاعُون سے صحابہؓ میں سے بھی بعض شہید ہو گئے تھے۔ غرض موت سے تو چارہ نہیں۔ امیر۔ غریب، ہندو، مُسلمان، زن و مرد سب مرتے ہیں لیکن کسی موت پر اتنا رحم نہیں آتا جیسا اس موت پر کہ گھر کا گھر تباہ ہو جاتے اور قُفل لگ جاوے۔ اس لیے اوّل نسبت قائم کرو کہ ایسی موتیں کن لوگوں میں ہوئی ہیں۔

اس کے سوا یہ بھی یاد رکھو کہ ہماری جماعت میں داخل ہونے والوں کا صحیح علم کہ ان کے ایمان کس درجہ تک ہیں اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اب دو لاکھ سے بھی زیادہ جماعت ہے ہمیں علم نہیں کہ کس حد تک کس کا ایمان ہے، البتہ قیاسی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض کامل الایمان ہیں اور بعض اوسط درجہ کا ایمان رکھتے ہیں اور بعض ابھی ناقص درجہ پر ہیں۔

مومنوں کے تین درجے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ۔ (فاطر: ۳۳) یعنی تین قسم کے

مومن ہوتے ہیں۔ ایک تو ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ ہوتے ہیں۔ ان میں گناہ کی آلائش موجود ہوتی ہے۔ بعض میانہ رو اور بعض سراسر نیک ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم ہے کہ کون کس درجہ اور مقام پر ہے۔ ہر ایک شخص کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ الگ معاملہ ہے۔ جیسا کوئی اس سے تعلق رکھتا ہے ویسا ہی وہ اس سے معاملہ کرتا ہے۔ جو لوگ کامل الایمان ہیں۔ مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُسے امتیاز دے گا، کیونکہ مومن اور کافر کے درمیان ایک فرقان رکھا جاتا ہے۔ قرآنِ شریف میں مومن سے یہ مراد نہیں ہے کہ صرف زبان تک ہی اس کی قیل وقال محدود ہو اور صُبح وہ ایمان کا کام کرے، تو شام کو کُفر کا کرے۔ ایک لقمہ وہ تریاق کا کھالیتا ہے تو دُوسرا زہر کا بھی کھالیتا ہے۔ ایسے شخص کو وہ فرقان اور امتیاز جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے نہیں دیا جاتا۔ تم خود ہی سوچ لو کہ وہ مریض جو پرہیز نہیں کرتا ہے خواہ اسکو کیسے ہی شفا بخش نسخے دیئے جاویں اور کتنے ہی مجرب کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ پرہیز نہیں کرتا تو وہ نسخے اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

پس یہی حال بیعت کا ہے۔ اگر کوئی شخص بیعت تو کرتا ہے، لیکن شرائطِ بیعت کو پورا نہیں کرتا اور اپنے اندر پاک تبدیلی جو بیعت کا اصل مقصد ہے نہیں کرتا وہ اپنے لیے وبالِ جان ہو جاتا ہے۔ ہاں کامل الایمان اکسیر ہے۔ اس کے ساتھ فرقان رکھا جاتا ہے۔ اگر یہ امتیاز نہ ہوتا تو دُنیا تباہ ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ پر ایمان مشکل ہو جاتا۔ اس قسم کے نشانوں سے ہی اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان پیدا ہوتا ہے۔

احمدی جماعت اور طاعُون

اب مَیں پھر اس اعتراض کی طرف توجہ کرتا ہوں جو کہتے ہیں کہ ہماری جماعت میں سے بعض آدمی طاعون سے مرے ہیں۔ اس بات کو خوب غور سے یاد رکھو کہ صحابہؓ میں سے جو بعض طاعون سے شہید ہوئے وہ اُن کے لیے عذاب نہ تھی بلکہ صحابہؓ کا گروہ بڑھا اور ان کے لیے موجبِ شہادت ہوئی۔ دوسروں کے لیے وہی طاعون تباہی اور بربادی کا باعث ہوئی یہی فرق ہے۔ اگر کسی مومن کو طاعون ہو جاوے وہ اس کے لیے شہادت ہے اور دوسروں کے لیے تباہی کا موجب۔ بایں ہمہ جیسا مَیں نے پہلے بیان کیا ہے۔ مومن اور غیر مومن میں ایک امرِ فارق ہوتا ہے۔ اس دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مومن کے ساتھ ایسے معاملات ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایک بیّن امتیاز عطا کرتا ہے اور اس کو تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ اسکی وہی مثال ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی مصیبت آتی ہے اور دوسروں پر بھی جو انکے مخالف ہوتے ہیں انبیاء علیہم السلام بڑھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں اور دوسرے تباہ اور ذلیل ہوتے ہیں۔ پس دہریوں کی طرح دھوکا مت کھاؤ۔ وہاں اور رنگ ہے اور یہاں اور رنگ ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی خوب غور سے سُنو کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وقت میں لڑائیاں ہوتی تھیں اور وہ لڑائیاں عذاب کے رنگ میں تھیں، کیونکہ کافر بار بار سوال کرتے تھے کہ آپ ہمیں قہری نشان اور معجزہ دکھاؤ کہ ہم پر پتھر برسیں انکے بار بار کے سوالات پر ان کو وعدہ دیا گیا

کہ میں قہری نشان دکھاؤں گا اور وعدہ دیا گیا کہ وہ نشان تلوار کے ذریعہ ظاہر ہوگا۔ اب صاف ثابت ہے کہ وہ عذاب کافروں کے واسطے تھا، مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان جنگوں میں (جو قہری نشان کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے) صحابہؓ بھی شہید ہوتے۔ اب کیا کوئی یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ صحابہؓ جو شہید ہوتے تھے معاذ اللہ وُہ تلوار اُن کے لیے بھی عذاب تھی؟ ہرگز نہیں بلکہ صحابہؓ کی شہادت تو قوم کی ترقی اور فتوحات کا باعث ہوئی۔ صحابہؓ کی قوم بڑھی اور بالمقابل مخالفوں کا نام و نشان مٹ گیا اور ستیاناس ہوگیا۔ اب کوئی پتہ دے سکتا ہے کہ ابوجہل کی اولاد کہاں ہے؟ اس کی بیخ کُنی ہو گئی۔ یہی مثال سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح پر اس میں شک نہیں کہ طاعُون عذاب کی صُورت میں نازل ہوا ہے۔ اور اگر ہماری جماعت میں سے بعض آدمی طاعون سے فوت ہوتے ہیں تو اس پر شور مچانا یا اعتراض کرنا دانشمندی نہیں ہے بلکہ غور طلب یہ امر قرار دینا چاہیے کہ طاعُون سے نقصان کس کا ہوا۔ اور فائدہ کس کو پہنچا؟ میں یقیناً کہتا ہوں کہ جب طاعون شروع ہوئی ہے اس وقت میری جماعت کی تعداد بہت تھوڑی تھی، مگر اس وقت دو لاکھ سے بھی یہ جماعت بڑھی ہوئی ہے اور یہ ترقی طاعون کے سبب سے بھی ہوئی ہے۔ طاعون نے میری جماعت کو بڑھایا ہے اور مخالفوں کو گھٹایا ہے۔ مجھے وعدہ دیا گیا تھا کہ طاعون تیری ترقی کا موجب ہوگی۔ سو اس وعدہ کے موافق یہ جماعت بڑھ رہی ہے اور دو لاکھ تک بڑھی ہے، مگر مخالفوں کا تو دوہرا نقصان ہوا ہے۔ کچھ اُن میں سے قبروں میں گئے اور کچھ ہمارے پاس آئے ہیں۔ اگر ہمارا نقصان اس سے ہوتا تو یہ جماعت جو بہت ہی مختصر اور قلیل تھی بالکل تباہ ہو جاتی اور آج کوئی اس کو جاننے والا بھی نہ ہوتا۔ ان واقعات کو مدِنظر رکھ کر معترض کو چاہیے کہ دیکھے کیا یہ اعتراض کوئی شے ہے؟

طاعون کی خبر آج سے نہیں ۲۳ برس سے براہین احمدیہ میں شائع ہو چکی ہوئی ہے اور اس لیے یہ معمولی نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ عظیم الشان قہری نشان ہے۔

غرض طاعون نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا بلکہ فائدہ ہی دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی ضرور کہتا ہوں کہ ایمان کے طبقات ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ اس لیے ان طبقات کے لحاظ سے جو شخص کامل الایمان ہے وہ نافع الناس وجود ہے۔ تبلیغ دین کرنے والا ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک قابلِ قدر ہے وُہ طاعون سے ضرور بچایا جاوے گا۔ بعض آدمی جن کی ایمانی حالت کمزور ہوتی ہے اور وُہ اس درجہ پر نہ پہنچے ہوتے ہوں، جہاں اللہ تعالیٰ کسی کو مومن کہتا ہے اور ان کی ضرورت بھی کم ہو پھر ان میں سے اگر کوئی فوت ہو جاوے تو اس میں کیا حرج ہے۔ میں یہ خوب جانتا ہوں کہ ایمان کے

درجات ہیں اور ہر درجہ پر برکت ملتی ہے لیکن ان میں باہم فرق ضرور ہوتا ہے۔ دیکھو اس وقت آفتاب کی روشنی ہے آنکھیں کھلی ہیں ہر ایک چیز دُور و نزدیک کی صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ جب آفتاب کی سلطنت ختم ہو جائے گی تو رات آئے گی۔ اس وقت عالم ہی اور ہوگا؛ اگرچہ اس وقت چاند یا ستاروں کی روشنی ہوگی مگر ان روشنیوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ ایسا ہی ایمان کے مراتب میں فرق صریح ہے۔ ایمان بھی ایک روشنی ہے جس جس درجہ پر ایمان پہنچتا ہے اسی مرتبہ کے موافق روشنی اور پھل پاتا ہے جو چاہتا ہے کہ عمر زیادہ ہو اور اس قہری نشان میں ایک امتیاز پیدا کرے اس کو لازم ہے کہ وہ کامل الایمان ہو اور اپنے وجود کو قابل قدر بنا دے اور اس کی یہی صورت ہے کہ لوگوں کو نفع پہنچا دے اور دین کی خدمت کرے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (الرعد:۱۸) یہ خوب یاد رکھو۔ کہ عمر کھانے پینے سے لمبی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی اصل راہ وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو صرف کھانے پینے کو ہی زندگی کی غرض و غایت سمجھتے ہیں، حالانکہ زندگی کی یہ غرض نہیں۔ سعدی کہتا ہے ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن است

جب انسان کا ایک اصول ہو جاوے کہ زیستن از بہرِ خوردن است۔ اس وقت اس کی نظر خدا پر نہیں رہتی بلکہ وُہ دُنیا کے کاروبار اور تجارت ہی میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کی طرف توجہ اور رجُوع کا خیال بھی نہیں رہتا۔ اس وقت اس کی زندگی قابلِ قدر وجود نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:۷۸)

یعنی میرا رب تمہاری پروا کیا رکھتا ہے۔ اگر تم اس کی بندگی نہ کرو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس مُلک میں ہیضہ کی خطرناک وبا پڑی تھی۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کشف کے ذریعہ یہ نظارہ دکھایا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک بڑا میدان ہے اور اس میں ایک بہت بڑی لمبی نالی نہر ہے۔ جس پر قصابوں نے بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اور چھُریاں اُن کی گردنوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ آسمان کی طرف مُنہ کرکے دیکھ رہے ہیں گویا آسمانی حکم کا انتظار کرتے ہیں۔ مَیں پاس ہی ٹہل رہا ہوں اتنے میں مَیں نے یہ آیت پڑھی قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:۷۸) یہ آیت سُنتے ہی اُنھوں نے چھُریاں پھیر دیں اور وہ بھیڑیں تڑپنے لگیں۔ اُن کو تڑپتے دیکھ کر وہ قصاب بولے

کہ تم کیا ہو ، گوُہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔ غرض اس کے بعد ہیضہ کی وُہ خطرناک وَبا پڑی پس جو انسان خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہیں کرتا اس کا رتبہ اور قدر نجاست خور بھیڑ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ (بدر ۱۹؍ ستمبر ۱۹۰۴ء۔ الحکم ۱۷؍ ستمبر ۱۹۰۴ء)

دلائلِ صداقت

بالآخر مَیں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ میری نسبت جو مخالف لوگ مخالفت کرتے ہیں اور میرا انکار کرتے ہیں۔ اگر وہ دُعائیں کرتے اور خدا تعالےٰ سے میری نسبت کشفِ حقائق چاہتے تو اُن کی آنکھیں کھُل جاتیں، مگر افسوس ہے کہ انھوں نے مخالفت میں حد سے زیادہ حصّہ لیا اور میرے دعاوی پر نہ غور کی اور نہ میری کتابوں کو پڑھا اور نہ میری باتوں کو تعصّب سے خالی ہو کر سُنا۔ وُہ مجھے دجّال اور مفتری تو کہتے ہیں مگر وہ اس امر پر غور نہیں کرتے کہ کیا دجّال اور مفتری بھی اِس قسم کی کامیابی حاصل کیا کرتے ہیں؟ یاد رکھو کہ اگر یہ انسان کا اپنا سلسلہ ہوتا تو کبھی کا تباہ ہو جاتا کیونکہ اس کے تباہ کرنے میں ہر طرف سے مخالفانہ کوشش ہو رہی ہے اور جب خدا تعالیٰ کے بھی خلاف ہوتا تو وہ بھی اس کا دشمن تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ بجائے تباہ ہونے کے ترقی کر رہا ہے؟ اِس کی وجہ یہی ہے کہ یہ خُدا کی طرف سے ہے انسانی کاروبار نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرا یہ دعویٰ آج نہیں ہوا ہے بلکہ چوبیس سال سے مَیں دعویٰ کر رہا ہوں کہ خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہمکلام ہوتا ہے اور اس نے مجھے مامور کیا ہے۔

انسانی گورنمنٹ میں اگر کوئی شخص جھوٹا ملازم سرکار بنے تو وہ فوراً پکڑا جاتا ہے۔ اور سزا پاتا ہے۔ تو یہ کیسا اندھیر ہے کہ خدا تعالیٰ کی گورنمنٹ میں ایک شخص مامور ہونے کا مدعی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ پکڑا جاتا اور تباہ کیا جاتا، اُسے ترقی مِل رہی ہے کوئی بتاوے کیا جھوٹوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہے۔ براہینِ احمدیہ چھپی ہوئی موجود ہے۔ اس شہر میں اس کے بہت سے نسخے ہوں گے۔ اس کو پڑھو اور دیکھو کہ جو کچھ اس میں دَرج ہے کیا آج بہت سی باتیں ان میں پوری نہیں ہو چکیں؟ اور کیا کوئی منصوبہ باز کر سکتا ہے کہ اسقدر عرصہ دراز پہلے جبکہ اپنی زندگی کا بھی اعتبار نہیں ہوتا ایک بات کہے اور پھر اتنے عرصہ کے بعد جس میں ایک بچہ پیدا ہو کر بھی صاحبِ اولاد ہو سکتا ہے وہ پوری ہو جاوے۔ مَیں جانتا ہوں کہ اسی شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں مجھے جاننے والے کتنے تھے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ مَیں ایک گمنامی کی حالت میں تھا۔ سال بھر میں بھی کبھی ایک خط نہ آتا تھا، لیکن اِس گمنامی کے زمانہ میں علیم وخبیر خدا نے مجھے خبر دی جو براہینِ احمدیہ میں موجود ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جبکہ فوج در فوج لوگ تیرے پاس آئیں گے۔ مَیں لوگوں کو کھینچ کھینچ کر لاؤں گا اور مالی نُصرتیں بھی آئیں گی اور دُنیا میں تیری شہرت ہو جائے گی جیسے لکھا ہے فَحَانَ اَنْ تُعَانَ وَتُعْرَفَ بَیْنَ النَّاسِ اور پھر فرمایا یَأْتُوْنَ مِنْ کُلِّ

فَجٍّ عَمِيْقٍ اور يَأْتِيْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔

اور پھر فرمایا لَا تُصَعِّرْ لِخَلْقِ اللّٰهِ وَلَا تَسْئَمْ مِّنَ النَّاسِ یعنی اب وقت آگیا ہے کہ تو لوگوں میں شناخت کیا جاوے اور تیری مدد کی جاوے۔ تیرے پاس دُور دُور راہوں سے لوگ آئیں گے اور دُور دراز جگہوں سے تجھے تحائف اور مالی نصرتیں آئیں گی۔

اور پھر فرمایا کہ تیرے پاس کثرت سے مخلوق آئے گی، اس لیے تُو تحمّل سے ان کو قبول کرنا اور ان کی کثرت سے تھک نہ جانا۔

غرض اس قسم کے بہت سے الہامات ہیں جو نہ صرف عربی زبان میں ہوتے بلکہ فارسی میں ہوتے۔ اُردو میں ہوتے اور انگریزی میں بھی ہوئے جس کو مَیں جانتا بھی نہیں اور ایک لمبا سلسلہ ان الہامات اور پیشگوئیوں کا چلا گیا ہے اور جہاں براہین ختم ہوتی ہے وہاں یہ الہام ہوا:

"دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اس کو قبول نہ کیا پر خُدا
اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کریگا"

مجھے حیرت آتی ہے جب مَیں ان لوگوں کے مُنہ سے سُنتا ہوں کہ کوئی نشان دکھاؤ۔ ان نشانات پر وہ غور نہیں کرتے اور ان کو حقیر سمجھتے ہیں افسوس! اور اَور نشان مانگتے ہیں۔ مَیں یقین کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ قادر ہے۔ وہ نشان پر نشان دکھا رہا ہے، لیکن یہ دانشمندی اور تقویٰ کا طریق نہیں ہے کہ پہلے نشانوں کو چھوڑ دیا جائے۔ ان نشانوں کو سرسری نظر سے نہ دیکھو۔ مولوی محمد حسین صاحب وہ شخص ہیں کہ ان سے بڑھ کر کسی نے عداوت کا نمبر نہیں لیا۔ اُنھوں نے بنارس تک پھر کر کفر کا فتویٰ حاصل کیا۔ اور ہر قسم کی مخالفت میں انھوں نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب باوجود اس مخالفت کے اس کو قسم دیکر پوچھو کہ جب تم نے براہین احمدیہ پر ریویو لکھا اور یہ پیشگوئیاں اور نشان اس میں موجود تھے اس وقت ہمارا کیا حال تھا۔ کہاں تک میری شہرت تھی اور کس قدر لوگوں کو تعلق تھا۔ اور کیا اب ان الہامات کے موافق یہ نشانات جو پورے ہوتے ہیں آپ بنائے گئے ہیں؟ اس وقت موجود تھے یا نہیں؟ اور اُنہوں نے پڑھے تھے یا نہیں؟ اگر پڑھے تھے تو پھر سچ سچ کہو کہ ایسے زمانہ میں جب یہ دعا سکھاتا ہے رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ (الانبیاء: ۹۰) اور اس میں آپ گواہی دیتا ہے کہ مَیں اکیلا ہوں۔ وہ الہامات جو جماعت کی ترقی اور میری قبولیت کے متعلق ہیں عظیم الشان نشان ہیں یا نہیں؟ اگر تعصب اور سخت دل مانع نہ ہو تو اقرار کرنا پڑے گا۔

پھر اسی براہین میں یہ بھی موجود ہے کہ علماء مخالفت کریں گے کہ ترقی نہ ہو، لیکن مَیں ترقی دُوں گا۔

اور پھر سب لوگ جانتے ہیں اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ کس قدر مخالفت ہو رہی ہے۔ اور کیا اس مخالفت سے یہ سلسلہ رُک گیا یا اس نے ترقی کی؟ اگر کوئی ایسی نظیر دنیا میں موجود ہے اور کوئی شخص ایسی کتاب پیش کر سکتا ہے جس میں ایک عرصہ پہلے ایسی پیشگوئیاں درج ہوں اور وہ پوری ہوئی ہوں۔ یقیناً یاد رکھو کہ کسی مفتری اور کذّاب سے ایسا سلوک نہیں کیا جاتا اور اس قدر مہلت اور فرصت اسے نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی ایسا مفتری یا کذّاب پیش کیا جاوے تو ہم قبول کریں گے۔ پھر ایسی مخالفت کے متعلق یہ خبر بھی دی گئی تھی کہ ہر مخالفت کرنے والا اپنے منصوبوں اور تجویزوں میں ناکام اور نامُراد رہے گا خواہ وہ مولوی ہو یا فقیر ہو یا امیر ہو کوئی ہو۔ اور اب تک واقعات نے اس امر کو سچا ثابت کر دکھایا ہے اور مَیں کھلے دل سے بیان کرتا ہُوں کہ مَیں خدا تعالیٰ کی ان پیشگوئیوں اور ان مکالمات پر جو میرے ساتھ ہوتے ہیں ایسا ہی یقین رکھتا ہوں جیسا کہ خدا کی دُوسری کتابوں پر ایمان لاتا ہوں۔ اس نے یہ بھی مجھے فرمایا ہے کہ مَیں تجھے بہت برکت دُوں گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ وہ زمانہ خواہ کبھی آنے والا ہو، لیکن مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اسی طرح ہو گا۔ اس زمانہ کے لوگ دیکھیں گے یا اُن کے بیٹے یا اُن کے بیٹے۔ غرض یہ ہو گا ضرور۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ ایک نقطہ یا شوشہ نہ ٹلے گا۔

غرض یہ نشانات ہیں جن پر غور کرنا چاہیے اور ٹھنڈے دل سے سوچو کہ مفتری کو یہ تائیدیں نہیں ملا کرتیں۔ پھر بعض لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ ہم نشانات کو کیا کریں قرآنِ شریف کے خلاف مسائل پیش کیے جاتے ہیں۔ مجھے ایسا کہنے والوں پر بھی افسوس آتا ہے کہ اگر اُن کا قرآنِ شریف پر ایمان ہوتا تو ہرگز ایسی بات نہ کہتے، کیونکہ ہم نے بارہا ظاہر کیا ہے۔ اور کتابوں میں شائع کیا ہے کہ ہم قرآنِ شریف پر ایمان لاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک آیت کا بھی انکار کرے وہ گمراہ اور جہنّمی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا انکار کرے وہ کافر ہے مگر کیا کروں یہ لوگ بنی اسرائیل کی طرح جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا انکار کیا نہیں مانتے اور انکار کرتے ہیں۔ مجھ میں اور ان میں یہی اختلاف ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آیت يَا عِيْسَى إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ۔ (اٰلِ عمران : ٥٦) کی ترتیب جو قرآن شریف میں ہے صحیح نہیں ہے، مگر مَیں کہتا ہوں کہ خدا تعالےٰ کے کلام کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنا یا گمان کرنا خطرناک بے ادبی اور شوخی ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ اس آیت کی ترتیب صحیح ہے اور اسی لیے اس کے یہ معنے ہیں کہ اے عیسیٰ مَیں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف تیرا رفع کرنے والا ہوں۔ مگر یہ لوگ اس ترتیب کو غلط (معاذ اللہ) ٹھہراتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ رَافِعُكَ إِلَيَّ کی جگہ رَافِعُكَ إِلَى السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ چاہیے اور اس کے بعد مُتَوَفِّيْكَ چاہیے۔ گویا کہ ان کے اعتقاد کے موافق خدا تعالیٰ کو غلطی لگی۔ اس نے کہنا تو یہ تھا

کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ رَافِعُكَ اِلَی السَّمَآءِ الثَّانِيَةِ وَ مُتَوَفِّيْكَ اور کہہ دیا یہ جو آیت میں درج ہے۔

اب میں قرآن کو چھوڑتا ہوں اور اس کے خلاف کہتا ہوں یا یہ خود کرتے اور کہتے ہیں انصاف سے بولو اگر یہ تحریف نہیں تو کیا ہے۔ اسی پر مجھے کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ قرآن کی تحریف ہے جس سے یہودیوں پر لعنت پڑی اور وُہ سؤر اور بندر بنے۔ یہودی جو تحریف کرتے تھے ان کے متعلق بھی یہی فرمایا ہے یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (النساء : ۴۷) اور جب تم بھی اسی قسم کی تحریف کرتے ہو تو قرآنِ شریف پر تمہارا اچھا ایمان ہے۔ میں زور سے کہتا ہوں کہ کیا وہ دل خدا ترس ہے اور اس میں تقویٰ کا حصہ ہے جو خدا تعالیٰ کے کلام میں تصرف کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم سچے ہو اور تحریف نہیں کرتے تو پھر وہ حدیث صحیح پیش کرو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ رَافِعُكَ اِلَیَّ کی بجائے رَافِعُكَ اِلَی السَّمَآءِ الثَّانِيَةِ چاہیے اور یہ متوفّی سے پہلے ہے۔ قرآنِ شریف میں جو لکھا ہوا ہے وہ غلط ہے۔ تم سُن رکھو کہ ہرگز ہرگز کوئی شخص ایسی حدیث صحیح پیش کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

جس قدر صاحب یہاں موجود ہیں آخر ہوش وحواس رکھتے ہیں وہ انصاف سے کہیں کہ اگر کوئی شخص تمسک کو الٹ پلٹ کرتا ہے تو وہ جعلسازی کا مرتکب ہوتا ہے یا نہیں اور وہ اس جعلسازی کی سزا میں جیل میں بھیجا جاتا ہے۔ پھر یہ اندھیر کیوں روا رکھا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام کو اُلٹ پلٹ کیا جاوے۔ خُدا سے ڈرو یہ بہت خطرناک دلیری ہے۔ ہاں اگر صحیحین میں کوئی حدیث درج ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح پر فرمایا ہے تو پیش کرو ہم مان لیں گے۔ لیکن اگر تم پیش نہ کرو اور نہیں کر سکو گے تو یہ تقویٰ کے خلاف ہے کہ خود کہہ دو اور دوسری غلطیوں کو قرآنِ شریف کی شرح بنا لو۔ ہم بار بار تم سے پوچھیں گے کہ بخاری یا مسلم میں دکھاؤ کہ اس میں لکھا ہے کہ رَافِعُكَ اِلَی السَّمَآءِ الثَّانِيَةِ پڑھا کرو۔

دیکھو۔ ان باتوں پر غور کرو۔ میرا یہ مدعا نہیں کہ ہر ایک شخص محض اس وجہ سے کہ وہ میرے ساتھ عداوت رکھتا ہے اور تعصب نے اس کے جوش کو بڑھا دیا ہے بے اختیار بول اُٹھے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ میں صرف خدا تعالیٰ کے لیے کہتا ہوں۔ انسان کی جھوٹی منطق کبھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے میں مقابلہ کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں، لیکن میں اپنے دل میں مخلوق کی ہمدردی اور بھلائی کے لیے ایک جوش رکھتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا ہے اس لیے سچے دل سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلمات سے مجھے خبر دی ہے۔ مت سمجھو کہ میں بیہودہ طور پر کہتا ہوں بلکہ سچ مچ یہی بات ہے پس جلد بازی نہ کرو کہ جلدی صحیح نتیجہ پر پہنچنے سے روک دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ اپنے سینے اور دل کو تھام نہیں سکتے اور یہ مرض کثرت سے پھیل گیا

ہے کہ مخالفت کی وجہ سے حق بات پر بھی غور نہیں کرتے اور یُونہی کوئی بات سُنی منہ پر جھاگ آجاتی ہے اور پھر جو زبان پر آجاتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ مگر یاد رکھو یہ امر تقویٰ کے خلاف ہے۔ متقی کی زبان ڈرتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کوئی بات مُنہ سے نکالے۔

میرا معاملہ اگر سمجھ میں نہیں آتا تو طریقِ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگو تاکہ وہ خود تم پر اصل حقیقت کھول دے۔ خدا تعالیٰ کے کلام کی بے حُرمتی نہ کرو؛ ورنہ طریقِ نجات بھول جانے کا اندیشہ ہے۔ آج وقت ہے بصیرت سے کام لو۔

قرآنِ شریف قانونِ آسمانی اور نجات کا ذریعہ ہے۔ اگر ہم اس میں تبدیلی کریں تو یہ بہت ہی سخت گناہ ہے۔ تعجب ہوگا کہ ہم یہودیوں اور عیسائیوں پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور پھر قرآنِ شریف کے لیے وہی روا رکھتے ہیں۔ مجھے اَور بھی افسوس اور تعجب آتا ہے کہ وہ عیسائی جن کی کتابیں فی الواقعہ محرّف مبدّل ہیں وہ تو کوشش کریں کہ تحریف ثابت نہ ہو اور ہم خود تحریف کرنے کی فکر میں !!!

دیکھو افترا کرنے والا خبیث اور موذی ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرنا۔ یہ بھی افترا ہے اس سے بچو۔

عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا مسئلہ

غرض قرآنِ شریف کی یہ آیت صاف طور پر مسیح کی وفات کا وعدہ دیتی ہے اور جس قدر وعدے اس آیت میں وَرَافِعُكَ اِلَیَّ سے شروع ہوکر آخر تک ہیں۔ وہ ہمارے مخالف بھی مانتے ہیں کہ پورے ہوگئے حالانکہ وہ سب بعد وفات ہیں۔ پھر وفات کا انکار کیوں کیا جاتا ہے۔

علاوہ بریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مُخبرِ صادق ہیں جو مسلمان کہلا کر بھی آپ پر ایمان نہیں لاتا اور آپ کو مخبرِ صادق تسلیم نہیں کرتا وہ بڑی بدذاتی کرتا ہے۔ آپ نے تو فرمایا ہے کہ مَیں نے مسیح کو دوسرے آسمان پر یحییٰ کے پاس دیکھا ہے۔ اب کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہے یا نہیں۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام درحقیقت وفات یافتہ نہ تھے بلکہ زندہ تھے تو پھر اس سوال کا کیا جواب ہے کہ ایک وفات یافتہ سے کیا تعلق ہے؟ ان کی تو رُوح بھی ابھی قبض نہیں ہوئی تھی۔ ادنیٰ فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ مُردے کے پاس تو مُردہ ہی ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کیا ہوا کہ مُردہ کے پاس زندہ جا بیٹھا۔ یہ صرف اپنی ہی غلطی ہے۔ ورنہ سچ یہی ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی مرکر ہی یحییٰ علیہ السلام کے پاس گئے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قول سے یعنی قرآنِ شریف سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فعل یعنی رؤیت سے ثابت کر دیا۔ جو اس قول اور فعل کو نہیں مانتا اسے پھر مَیں کیا کہوں۔ ان دو گواہوں کے بعد اَور کس گواہ کی حاجت

ہے۔ پھر یہاں تک ہی بات نہیں۔ خود حضرت مسیحؑ کا تو صاف اقرار بھی موجود ہے اور اس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدۃ: ۱۱۸) سے تو اس سارے قضیہ کا فیصلہ ہی ہو جاتا ہے۔ اس آیت سے پہلی آیتوں میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیحؑ سے قیامت کے دن سوال کرے گا کہ کیا تو نے کہا تھا کہ میری ماں کو اور مجھ کو خُدا بنا لو۔ حضرت عیسٰی اپنی بریّت میں عرض کریں گے کہ میری کیا مجال تھی جو مَیں ایسی تعلیم دیتا۔ مَیں تو جب تک اُن میں رہا اُن کو تیری توحید ہی کی تعلیم دیتا رہا جو تو نے مجھے دی تھی لیکن جب تُو نے مجھ کو وفات دیدی پھر تو ان پر نگران تھا۔

اب غور کا مقام ہے کہ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ میں جو وعدہ تھا وہ اس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ سے پورا ہوتا ہے۔

ماسوا اس کے یہ آیت حضرت مسیحؑ کی موت اور ان کی دوبارہ آمد کے متعلق ایک فیصلہ کُن آیت ہے اور یہ اس قرآن کی آیت ہے جس کا حرف حرف محفوظ ہے اور جس کی حفاظت کا ذمہ دار خود اللہ تعالےٰ ہے جیسا کہ اس نے فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر: ۱۰) افسوس مُسلمانوں نے اس کتاب کی قدر نہیں کی۔ اس آیت میں حضرت مسیحؑ نے اپنی بریّت دو صورتوں سے کی ہے۔ اوّل تو یہ کہ میری زندگی میں عیسائی نہیں بگڑے کیونکہ مَیں ان کو توحید کی تعلیم دیتا رہا۔ دوّم جب مجھے وفات دیدی مجھے کچھ خبر نہیں۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ ابھی تک زندہ ہی ہیں۔ تو صاحبو! پھر اُن کے اس اقرار کے موافق یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی تک عیسائی بگڑے بھی نہیں اور جو تعلیم وہ پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے حالانکہ یہ واقعاتِ صحیح کے خلاف ہے۔ عیسائی ضرور بگڑ چکے ہیں۔

صاحبو! اگر مسلمانوں کے اس خیالی عقیدہ زندہ آسمان پر جانے کو لے کر اور اس آیت کے موافق عیسائی مسلمانوں پر اعتراض کریں کہ ہماری تعلیم تمہارے اقرار کے موافق بگڑی نہیں ہے تو کیا جواب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ امر تو حضرت مسیحؑ کی زندگی سے وابستہ ہے اور زندگی تسلیم ہے تو پھر دوسری تعلیموں کے انکار کے لیے کیا عذر ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ قرآنِ شریف پر ایمان لا دیں اور وُہ یہی ہے کہ مسیحؑ کی وفات پر ایمان لا دیں۔

دُوسری بات جو اس آیت میں فیصلہ کی گئی ہے وہ ان کی دوبارہ آمد کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں میں غلطی سے یہ عقیدہ مشہور ہو گیا ہے جس کی کوئی اصل نہیں کہ وہی مسیح ابنِ مریم دوبارہ آسمان سے نازل ہوں گے اور چالیس برس تک اس دنیا میں رہیں گے۔ صلیبوں کو توڑیں گے اور کافروں سے جنگ کریں گے۔

وغیرہ وغیرہ۔

اب غور کا مقام ہے کہ ایک نبیؐ صادق کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا کہ اس نے جھوٹ بولا یہ تو بے ایمانی ہے۔ ایک شخص اگر عدالت کے سامنے جھوٹ بولے تو وہ حلفِ دروغی کی سزا پاتا ہے۔ پھر علیم و خبیر عالم الغیب خُدا کے حضُور قیامت کے دن کسی نبی کو جھوٹ بولنے کی جرأت کب ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں لیکن یہ عقیدہ جو مَیں نے ابھی بیان کیا ہے۔ تسلیم کر لیا جاوے اور اس کو صحیح مانا جاوے تو پھر قرآنِ شریف چھوڑنا پڑے گا اور حضرت مسیح کو معاذ اللہ خدا تعالیٰ کے حضور قیامت کے دن جھوٹ بولنے والا قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ اگر یہ سچ ہے کہ وہی مسیح اُتر آتے گا، تو پھر خُدا تعالیٰ کے سامنے ان کا یہ جواب کہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ صحیح نہیں۔ کیونکہ ان کو تو اس وقت یہ کہنا چاہیے کہ چالیس سال تک آسمان سے اُتر کر پھر زمین پر رہا اور مَیں نے جنگیں کیں، صلیبیں توڑیں اور شریروں کو مارا۔ کفّار کو مسلمان کیا۔ حالانکہ ان کے جواب میں ان باتوں میں سے کسی کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ پھر خدا کے واسطے سوچ کر جواب دو۔ کیا تم یہ تجویز نہ کرو گے کہ حضرت مسیح نے معاذ اللہ جھوٹ بولا؟ اور کیا یہ نبی کی شان ہے کہ خُدا کے سامنے جھُوٹ بولے؟ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے اور قرآن پر حملہ کرتا ہے وہ بدذات اور جہنمی ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ملعون ہیں جو رسمی بات کے لیے قرآنِ شریف پر حملہ کرتے ہیں۔

پس یہ آیت مسیح کی وفات اور ان کی دوبارہ آمد کے متعلق قولِ فیصل ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں اور وہ دوبارہ نازل نہیں ہوں گے اور قرآنِ شریف سچّا ہے اور حضرت مسیح کا جواب بھی سچّا ہے۔ ہاں یہ امر کہ آنے والے مسیح سے پھر کیا مراد ہے تو یاد رکھو جو کچھ خدا تعالےٰ نے مجھ پر ظاہر کیا اور اپنی تائیدوں اور نُصرتوں اور نشانوں کے ساتھ اُسے ثابت کیا۔ وہ یہی ہے کہ آنیوالا اسی اُمّت کا ایک فردِ کامل ہے اور خدا تعالیٰ کی کھُلی کھُلی وحی نے ظاہر کیا ہے کہ وہ آنے والا مَیں ہوں جو چاہے قبول کرے۔ میرا یہ دعویٰ نِرا دعویٰ نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ زبردست ثبوت ہیں جو ایک سلیم الفطرت اور متقی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

مامور کی صداقت ثابت کرنے کے تین ذرائع

یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ جب کسی مامور کو بھیجتا ہے تو تین ذریعوں سے اس کی سچّائی کو ثابت کرتا اور اتمامِ حجت کرتا ہے۔

اوّل۔ نصوص کے ذریعہ یعنی شہادتوں سے اتمامِ حجت کرتا ہے۔

دوم۔ نشانات کے ذریعہ جو اس کی تائید میں اور اس کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں۔

سوّم: عقل کے ذریعہ۔

بعض اوقات یہ تینوں ذریعے۔ جمع ہو جاتے ہیں اور اِس وقت خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ سب ذریعے میری سچائی کو ثابت کر رہے ہیں۔

پس نصوص کے لیے یاد رکھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے بخاری اور مُسلم میں جس آنے والے کی خبر دی ہے اس کے لیے یہی فرمایا ہے کہ وہ اسی اُمّت میں سے ہو گا؛ چنانچہ بخاری اور مُسلم میں مِنۡکُمۡ کا لفظ موجود ہے کہیں بھی نہیں فرمایا کہ مِنۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ۔ اور قرآنِ شریف میں سورۂ نور میں استخلاف کے وعدہ میں بھی مِنۡکُمۡ ہی فرمایا ہے۔ اب بتاؤ کہ قرآن اور حدیث کے نصوص آنے والے کو اسی اُمّت سے ٹھہراتے ہیں یا باہر سے لاتے ہیں۔ اور قرآنِ شریف یہی زمانہ مسیح موعود کے آنے کا ٹھہراتا ہے۔

دوّم نشانات: وُہ نشانات جو میری تائید میں ظاہر ہو چکے ہیں اور جو میرے ہاتھ پر پورے ہوئے ہیں۔ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کے زندہ گواہ اس وقت لاکھوں انسان موجود ہیں۔ مَیں نے اپنی کتاب نزول المسیح میں ڈیڑھ سو کے قریب نشان لکھے ہیں اور بعض کا مَیں نے ابھی ذکر بھی کیا ہے تاہم وہ نشان جو میرے لیے ظاہر ہوئے وُہ بھی تھوڑے نہیں ہیں۔ اور انسانی طاقت میں یہ نہیں کہ وہ ان باتوں کو اپنے لیے خود جمع کرے۔

قرآنِ شریف سے ثابت ہے کہ مسیح موعود اس وقت آئے گا جب چھ ہزار سال کا دَور ختم ہو گا اور عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک وہ وقت آگیا ہے۔

پھر قرآنِ شریف سے معلوم ہوتا ہے اور احادیثِ صحیحہ اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ مسیح موعود کے زمانہ میں ایک نئی سواری پیدا ہو گی جس سے اُونٹ بیکار ہو جائیں گے۔ جیساکہ قرآن شریف میں ہے وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ (التکویر: ۵) اور حدیثِ صحیح میں ہے۔ وَلَیُتۡرَکُنَّ الۡقِلَاصُ فَلَا یُسۡعٰی عَلَیۡهَا۔ اب آپ لوگ جانتے ہیں کہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان بھی ریل تیار ہو رہی ہے۔ اس عظیم الشان پیشگوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اخبار والے نے لکھا ہے کہ مکّہ مدینہ والے بھی یہ نظارہ دیکھ لیں گے کہ اونٹوں کی قطاروں کی بجائے ریل گاڑی وہاں چلے گی۔ قرآنِ شریف میں جو فرمایا وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ اس کے متعلق نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ عِشار حاملہ اُونٹنی کو کہتے ہیں اس لیے یہ لفظ اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا تاکہ یہ سمجھ آجاوے کہ اسی دنیا کے متعلق ہے کیونکہ حاملہ ہونا تو اسی دُنیا میں ہوتا ہے۔

اسی طرح نہروں کا نکالے جانا۔ چھاپے خانوں کی کثرت اور اشاعت کتب کے ذریعوں کا عام

ہونا۔ اس قسم کے بہت سے نشان ہیں جو اس زمانہ سے مخصوص تھے اور وہ پورے ہوگئے ہیں۔ ایسا ہی کسوف وخسوف کا نشان جو رمضان میں ہوا۔ یہ حدیث اکمال الدین اور دارقطنی میں موجود ہے۔ پھر حج کا بند ہونا بھی نشان تھا وُہ بھی پُورا ہوا۔ ایک ستارہ نکلنے کی نشانی تھی وہ بھی نکل چکا۔ طاعون کا نشان تھا وہ بھی پُورا ہوگیا۔

غرض میں کہاںتک بیان کرتا جاؤں یہ ایک لمبا سلسلہ ہے۔ طالبِ حق کے لیے اسی قدر کافی ہے۔

پھر تیسرا ذریعہ عقل ہے اگر عقل سے کام لیا جاوے اور زمانہ کی حالت پر نظر کی جاوے تو صاف طور پر ضرورت نظر آتی ہے۔ غور سے دیکھو اسلام کی حالت کیسی کمزور ہوگئی ہے۔ اندرونی طور پر تقویٰ طہارت اُٹھ گئی ہے۔ اوامر واحکامِ الٰہی کی بے حُرمتی کی جاتی ہے اور ارکانِ اسلام کو ہنسی میں اُڑایا جاتا ہے اور بیرونی طور پر یہ حالت ہے کہ ہر قسم کے معترض اس پر حملہ کر رہے ہیں اور اپنی جگہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کا نام ونشان مٹا دیں۔

غرض جس پہلو سے دیکھو۔ اسلام کمزور ہوگیا ہے۔ وہ اسلام جس میں ایک بھی مُرتد ہوجاتا تو قیامت آجاتی۔ اس میں تیس لاکھ مُرتد ہو چکا ہے کیا ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر: ۱۰) پورا نہ ہوتا؟ اگر اب اسلام کی خبر نہ لی جاتی تو پھر اور کونسا وقت آنے والا تھا؟

پس از آنکه من نه مانم بچه کار خواہی آمد

کیا خُدا تعالیٰ اس وقت نُصرت کرے گا جب یہ نام مٹ جائے گا؟ ایک طرف حدیث میں یہ وعدہ کہ ہر صدی پر مجدد آئے گا مگر اس وقت جو عین ضرورت کا وقت ہے کوئی مجدد نہ آئے؟ تعجب ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تو وہ زمانہ کہ اس میں متواتر نبی آتے رہے اور یہ اُمّت جو خیر الامّت کہلاتی ہے اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امّت ہے۔ باوجود اُمّتِ مرحومہ کہلانے کے اس میں جب آئے تو دجّال آئے اور پھر ایک دو نہیں تیس دجّال۔ گویا خدا کو خطرناک دشمنی ہے۔ وُہ اس کو ایسا تباہ کرنا چاہتا ہے کہ نام ونشان نہ رہے۔ افسوس میری مخالفت میں یہ لوگ ایسے اندھے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور شوخی اور بے ادبی کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس کو عملی طور پر وعدہ شکن کا قرار دیتے ہیں اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتکِ شان کرتے ہیں۔

وفاتِ مسیح علیہ السلام

دیکھو مَیں کھول کر کہتا ہوں کہ تم اپنے نفسوں پر رحم کرو۔ اس پیغمبر کی شان میں جو افضل الرُّسل ہے یہ بے ادبی نہ کرو کہ حضرت مسیح

کو اس سے افضل قرار دو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آپؐ کی وفات پر صحابہؓ کی کیا حالت ہوئی تھی۔ وہ دیوانہ وار پھرتے تھے۔ آپؐ کی زندگی ان کو اتنی عزیز تھی کہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی تھی کہ اگر کوئی آپ کو مُردہ کہے گا تو مَیں اس کا سر اُڑا دُوں گا۔ اس شور پر حضرت ابوبکرؓ آئے اور اُنہوں نے آگے بڑھ کر آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا کہ آپؐ پر خدا تعالیٰ دو موتیں جمع نہ کریگا اور پھر یہ آیت پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران : ۱۴۵) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک رسُول ہیں۔ پہلے جس قدر رسُول آئے ہیں سب وفات پا گئے ہیں۔ صحابہؓ نے جب اس آیت کو سُنا تو انہیں ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت اب اُتری ہے۔ اُنہوں نے معلوم کیا کہ آپؐ کے مقابلہ میں کوئی اور زندہ نہیں ہے۔ تم میں وہ عشق اور محبّت نہیں جو صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے تھی؟ ورنہ تم یہ کبھی روا نہ رکھتے کہ مسیح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقابل زندہ کہتے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اگر صحابہؓ کے سامنے اس وقت کوئی کہتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو اُن میں سے ایک بھی زندہ نہ رہتا وُہ اس قدر آپؐ کے عشق اور محبت میں فنا شدہ تھے۔ حسان بن ثابتؓ نے اس موقعہ پر ایک مرثیہ لکھا ہے جس میں وُہ کہتے ہیں:

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ ۔ فَعَمِيَ عَلَيْكَ النَّاظِرُ ۞ مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ ۔ فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

یعنی اے میرے پیارے نبی تُو تو میری آنکھوں کی پُتلی تھا اور میرے دیدوں کا نُور تھا پس مَیں تو تیرے مرنے سے اندھا ہو گیا۔ اب تیرے بعد مَیں دُوسروں کی موت کا کیا غم کروں۔ عیسیٰؑ مرے یا موسیٰؑ مرے۔ کوئی مرے۔ مجھے تو تیرے ہی مرنے کا غم تھا۔ صحابہؓ کی تو یہ حالت تھی۔ مگر اس زمانہ میں اپنے مُنہ سے اقرار کرتے ہیں کہ نہیں افضل الانبیاء وفات پا گئے اور حضرت مسیح زندہ ہیں۔ افسوس مُسلمانوں کی حالت کیا سے کیا ہو گئی۔ مَیں خُوب جانتا ہوں اور اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کا پہلا اجماع مسیح کی وفات ہی پر ہوا تھا۔ پھر اُن کے خلاف کرنا یہ کونسی عقلمندی اور تقویٰ ہے۔ مَیں یہ مانتا ہوں۔ کہ یہ غلطیاں امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ہیں۔ تقویٰ نہیں رہا۔ جہالت بڑھ گئی ہے۔ رو بحق ہونا کم ہو گیا ہے۔ راہِ راست محجوب ہو گیا ہے اور یہی اُمور ہیں جو میری ضرورت کے داعی ہیں۔ مَیں آخر میں پھر کہتا ہوں کہ ان باتوں پر غور کرو۔ اپنے گھروں میں جا کر تنہائی میں سوچو کہ تم چاہتے ہو کہ اسلام اَور سو سال تک آفتوں کا نشانہ بنا رہے اگر اب تک کوئی نہیں آیا تو پھر صدی کا سر تو چلا گیا۔ بائیس برس گذر چکے۔ اب اَور سو سال تک انتظار کرو۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر مجھے قبول نہ کرو گے تو پھر تم کبھی بھی آنے والے موعود کو نہیں پاؤ گے۔

مَیں نے اتنی باتیں کی ہیں۔ بعض مخالفوں کو فائدہ کی بجائے جوش آئے گا اور وہ ہار جیت کی طرف توجہ کریں گے یہ نہیں کہ رو رو کر دُعائیں کریں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق اور مدد چاہیں میری یہی نصیحت ہے

کہ تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دو اور خدا ترسی سے ان باتوں پر غور کرو اور تنہائی میں سوچو اور آخر اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرو کہ وُہ دُعائیں سنتا ہے۔[1]

۲؍ستمبر ۱۹۰۴ء

بمقام لاہور

ایک رُوح پرور مجلس کی روئیداد

بعد نماز جمعہ حضرتِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام زائرین اور مشتاقانِ زیارت کے اصرار و خواہش پر اجلاس فرما ہوئے۔ حاضرین میں سے ہر ایک دُوسرے سے پہلے آگے بڑھنا چاہتا تھا ان کے بڑھے ہوئے جوشِ زیارت اور شوقِ ارادت میں انتظام کا ہونا آسان نہ تھا دھکے پر دھکا کھاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ آخر جب حضرت کا حُکم سُنا کہ بیٹھ جاؤ۔ جو جہاں کھڑا تھا۔ وہیں بیٹھ گیا۔ وہ نظارہ جن لوگوں نے دیکھا ہے اس کا لُطف اور اثر کچھ وہی دل محسوس کر سکتے ہیں۔ حضرت حجۃ اللہ کے انفاسِ طیبہ کا کچھ ایسا اثر پڑ رہا تھا کہ اس مجمع پر نگاہ ڈالنے سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا پتہ لگتا تھا اور صاف سمجھ میں آتا تھا کہ یہ جذب اور کشش کسی مفتری اور کذاب کو نہیں دیا جاتا۔ آپ خاموش بیٹھے تھے کہ خاکسار ایڈیٹر الحکم نے ایک ارادت مند کی طرف سے عرض کیا کہ وُہ کچھ سُنانا چاہتا ہے۔ فرمایا:

ہاں سُنا دو

اس پر اس شخص نے نہایت پُر درد اور پُر جوش لہجہ میں بزبانِ پنجابی کچھ اشعار سُنائے جن میں حضرت حجۃ اللہ کی بعثت، آپ کی صداقت پر بحث تھی اور بالآخر اہلِ لاہور کو خطاب تھا کہ دیکھو مسیح موعود تمہارے گھر مہمان ہو کر آیا ہے۔ تمہارا فرض تو یہ ہے کہ تم اس کا اِکرام کرو نہ یہ کہ سبّ و شتم سے کام لو۔ مہمانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک مناسب نہیں۔ اور پھر طاعون کے زور آور حملوں سے ڈرایا تھا۔ یہ نظم بہت ہی مؤثر اور رقّت خیز تھی جس کو سُنکر

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ صفحہ ۴ تا ۶ مورخہ ۱۷؍ستمبر ۱۹۰۴ء

اکثر حاضرین رو رہے تھے۔ نظم ختم ہو جانے کے بعد حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ و السّلام نے ذیل کی تقریر فرمائی۔ (ایڈیٹر)

پیدائشِ انسانی کی غرض

تمام مُسلمان جو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں مَیں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک کی غرض دین ہے۔ یہ مَیں جانتا ہوں کہ کوئی تھوڑا جوش رکھتا ہے کوئی زیادہ۔ لیکن کچھ نہ کچھ غرض دین کی رکھتا ضرور ہے۔ یقیناً سمجھو کہ ہر شخص اپنے اندازہ کے موافق عمر کا ایک حِصّہ کھا چکا ہے۔ بڑی عمر ہو گئی ہے تب بھی تھوڑے دن باقی ہیں اور تھوڑی ہے تب بھی تھوڑے ہی باقی ہیں۔ کیونکہ گذرنے والے زمانہ کو ہمیشہ تھوڑا خیال کیا جاتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ انسان جو اِس مسافر خانہ میں آتا ہے اس کی اصل غرض کیا ہے؟ اصل غرض انسان کی خِلقت کی یہ ہے کہ وہ اپنے ربّ کو پہچانے۔ اور اُس کی فرمانبرداری کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۷) مَیں نے جن اور انس کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اکثر لوگ جو دنیا میں آتے ہیں بالغ ہونے کے بعد بجائے اس کے کہ اپنے فرض کو سمجھیں اور اپنی زندگی کی غرض اور غایت کو مدِّنظر رکھیں، وہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دُنیا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور دُنیا کا مال اور اُس کی عزّتوں کے ایسے دِلدادہ ہوتے ہیں کہ خدا کا حِصّہ بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے اور بہت لوگوں کے دل میں تو ہوتا ہی نہیں۔ وُہ دُنیا ہی میں منہمک اور فنا ہو جاتے ہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ خدا بھی کوئی ہے ہاں اس وقت پتہ لگتا ہے جب قابضِ اَرواح آ کر جان نکال لیتا ہے۔ پس اُس دھوکا سے خبردار رہو۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کا وقت آ جاوے اور تم خالی کے خالی ہی رہو۔ یہ شعر اچھا کہا ہے ؎

مکن تکیہ بر عمرِ ناپائیدار   مباش ایمن از بازیٔ روزگار

ایک دفعہ ہی پیامِ موت آ جاتا ہے اور پتہ نہیں لگتا۔ انسانی ہستی بہت ہی ناپائدار ہے۔ ہزارہا مرضیں لگی ہوئی ہیں۔ بعض ایسی ہیں کہ جب دامنگیر ہو جاتی ہیں تو اِس جہان سے رخصت کر کے ہی رُخصت ہوتی ہیں۔

جبکہ حالت ایسی نازک اور خطرناک ہے تو ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک خُدا سے صُلح کرے۔ اسلام نے جو خدا پیش کیا ہے اور مسلمانوں نے جس خدا کو مانا ہے وہ رحیم، کریم، حلیم، توّاب اور غفّار ہے۔ جو شخص سچّی توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔ لیکن دُنیا میں خواہ حقیقی بھائی بھی ہو یا کوئی اَور قریبی عزیز اور رشتہ دار ہو وہ جب ایک مرتبہ قصور

دیکھ لیتا ہے۔ پھر وہ اس سے خواہ باز بھی آجاوے مگر اُسے عیبی ہی سمجھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کیسا کریم ہے کہ انسان ہزاروں عیب کر کے بھی رجُوع کرتا ہے تو بخش دیتا ہے۔ دُنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے بجز پیغمبروں کے (جو خدا تعالیٰ کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں) جو چشم پوشی سے اس قدر کام لے بلکہ عام طور پر تو یہ حالت ہے جو سعدی نے کہا ہے ؎

خُدا داند و بپوشد و ہمسایہ نداند و بخروشد

پس غور کرو کہ اس کے کرم اور رحم کی کیسی عظیم الشان صفت ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اگر وہ مؤاخذہ پر آتے تو سب کو تباہ کر دے۔ لیکن اس کا کرم اور رحم بہت ہی وسیع ہے اور اس کے غضب پر سبقت رکھتا ہے۔

اِسلام اور دُوسرے مذاہب میں خُدا کا تصوّر

یہ دین یعنی اسلام جو سچّا مذہب ہے اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم کو ملا ہے اس کی سچّائی کی یہ زبردست علامت ہے کہ انسانی ضمیر اور فطرت جس قسم کا خُدا چاہتی ہے قرآن نے ویسا ہی خُدا پیش کیا ہے یعنی اس قسم کے صفات سے مُتصف اسے بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ مقابلہ کے بغیر کسی کی خُوبی اور عمدگی کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مقابلہ دُوسرے مذاہب سے کیا جاوے؛ اگرچہ ہمارا یہ مذہب ہے کہ قرآن شریف سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے کہ کُل عالم کا ایک ہی خُدا ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مثلاً ہندوؤں کا خدا۔ تو اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ وُہ خدا جو اپنے خیالات اور عقائد کے موافق ہندوؤں نے پیش کیا ہے یا عیسائی جس قسم کا تسلیم کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ یہ کبھی بھی خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ کسی اَور خُدا کی مخلوق ہیں۔

غرض جب ہم اس خدا کا مقابلہ ان خداؤں سے (جو دُوسرے لوگوں نے پیش کیے ہیں) کرتے ہیں تو صاف طور پر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ خُدا جو قرآن شریف نے یا اسلام نے پیش کیا ہے وہی حقیقی خُدا ہے۔ مثلاً اسی مسئلہ عفوِ گناہ سے متعلق جب ہم غور کرتے ہیں تو جیسا کہ ابھی مَیں نے بیان کیا ہے۔ خواہ انسان کتنے ہی گناہ کرے لیکن جب سچے دل سے توبہ کرلے اور آئندہ کے لیے گناہوں سے باز آجاوے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا اور اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل ہندوؤں نے جس خدا کو پیش کیا ہے وہ اس کے متعلق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ وہ ایسا خُدا ہے کہ وہ ایک گناہ کے بدلے کروڑوں جُونوں میں ڈالتا ہے اور جُوئیں۔ پشُو۔ درند۔ چرند یہاں تک کہ پانی اور ہوا کے کیڑے یہ سب انسان ہی ہیں جو اپنی شامتِ اعمال کی وجہ سے سزائیں بھگتنے کے واسطے ان جُونوں میں آئے ہوئے ہیں۔ دُوسرے

الفاظ میں یُوں کہو کہ جس قدر مخلوقات انسان کے سوا نظر آتی ہیں وُہ سب انسان کے گناہوں کے طفیل ہے اور خدا تعالیٰ کو (معاذ اللہ) اب تک اُن پر کوئی رحم نہیں آتا اور وُہ ایسا سخت دل پرمیشر ہے کہ وہ رحم کر ہی نہیں سکتا۔

جب یہ عقیدہ رکھا جائے گا کہ ہر ایک گناہ کی سزا میں ضرور کئی کروڑ جُونوں میں جانا پڑیگا تو گناہ کی معافی اور رحم پرمیشر میں کہاں پایا گیا؟ کیونکہ جُونوں کے اس چکر سے تو کبھی نجات ہی نہیں ہے! حالانکہ فطرتِ انسانی ایک ایسا خدا چاہتی ہے جو انسانی کمزوریوں پر رحم کرتا ہو۔ اور انسان کے نادم اور تائب ہونے پر اس کے قصوروں کو معاف کر دے۔ کیونکہ خود انسان میں بھی یہ وصف ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ پھر تعجب کی بات ہوگی کہ انسان تو توبہ اور معافی پر قصور معاف کر دے اور خدا تعالیٰ ایسا کینہ توز (معاذ اللہ) ہو کہ اُسے کسی طرح رحم ہی نہ آوے؟ یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے بلکہ صحیح اعتقاد وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے کہ خدا تعالیٰ بڑا ہی کریم اور رحیم ہے اور وہ سچے رجُوع اور حقیقی توبہ پر گناہ بخش دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل عیسائی جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ اور بھی عجیب ہے۔ وہ خُدا تعالیٰ کو رحیم تو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ رحیم ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ رحم بلا مبادلہ نہیں کر سکتا جبتک بیٹے کو پھانسی نہ دے لے اس کا رحم کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تعجّب اور مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ جب اس عقیدہ کے مختلف پہلوؤں پر نظر کی جاتی ہے اور پھر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خُدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو پھانسی بھی دیا۔ لیکن یہ نسخہ رحم پھر بھی خطا ہی گیا سب سے پہلے تو یہ کہ یہ نُسخہ اس وقت یاد آیا جب بہت سی مخلوق گناہ کی موت سے تباہ ہو چکی اور اُن پر کوئی رحم نہ ہو سکا کیونکہ پہلے کوئی بیٹا پھانسی پر نہ چڑھا اور علاوہ بریں اگرچہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ زید کے سر میں درد ہوا اور بکر اپنا سر پتھر سے پھوڑے اور یہ سمجھا جاوے کہ اس نسخہ سے زید کو آرام ہو جاوے گا لیکن اس کو بفرضِ محال مان کر بھی اس نسخہ کا جو اثر ہوا ہے وہ تو بہت ہی خطرناک ہے۔ جب تک یہ نسخہ استعمال نہیں ہوا تھا۔ اکثر لوگ نیک تھے اور توبہ اور استغفار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر جب یہ نسخہ گھڑا گیا کہ ساری دنیا کے گناہ خُدا کے بیٹے کے پھانسی پانے کے ساتھ معاف ہو گئے تو اس سے بجائے اس کے کہ گُناہ رُکتا، گناہ کا ایک اور سیلاب جاری ہو گیا اور وہ بند جو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے خوف اور شریعت کا لگا ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ جیسا کہ یورپ کے حالات سے پتہ لگتا ہے کہ اس مسئلہ نے وہاں کیا اثر کیا ہے اور فی الحقیقت ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ پھر جب یہ بات ہے اور حالت ایسی ہے تو ہم کیونکر تسلیم کریں کہ وہ خدا جو اس رنگ میں دُنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ حقیقی خدا ہے۔

اس قسم کی غلط تعلیمیں دُنیا میں جاری ہو چکی ہیں اور حقیقی خدا کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے آکر دُنیا کے سامنے وہ خدا پیش کیا جو انسانی کانشنس اور فطرت چاہتی ہے اور اس کا پورا پورا بیان خدا تعالیٰ کی سچی کتاب قرآن مجید میں ہے۔

مُسلمانوں سے خصُوصی خطاب

مَیں اس وقت دُوسرے لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں الگ رکھ کر صرف ان لوگوں کے متعلق کچھ کہوں گا جو مُسلمان ہیں اور انہیں سے خطاب کروں گا

یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (فرقان: ۳۱)

یاد رکھو قرآن شریف حقیقی برکات کا سرچشمہ اور نجات کا سچا ذریعہ ہے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی غلطی ہے جو قرآن شریف پر عمل نہیں کرتے۔ عمل نہ کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جس کو اس پر اعتقاد ہی نہیں اور وہ اس کو خُدا تعالیٰ کا کلام ہی نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ تو بہت دُور پڑے ہوئے ہیں، لیکن وُہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور نجات کا شفا بخش نسخہ ہے۔ اگر وہ اس پر عمل نہ کریں تو کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جنھوں نے ساری عمر میں کبھی اُسے پڑھا ہی نہیں۔ پس ایسے آدمی جو خدا تعالیٰ کے کلام سے ایسے غافل اور لاپروا ہیں اُن کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو معلوم ہے کہ فلاں چشمہ نہایت ہی مصفّیٰ اور شیریں اور خنک ہے اور اس کا پانی بہت سی امراض کے واسطے اکسیر اور شفاء ہے، یہ علم اس کو یقینی ہے لیکن باوجود اس علم کے اور باوجود پیاسا ہونے اور بہت سی امراض میں مبتلا ہونے کے وہ اس کے پاس نہیں جاتا، تو یہ اس کی کیسی بدقسمتی اور جہالت ہے۔ اُسے تو چاہیے تھا کہ وہ اس چشمہ پر مُنہ رکھ دیتا اور سیراب ہو کر اُس کے لُطف اور شفا بخش پانی سے حظ اُٹھاتا۔ مگر باوجود علم کے اس سے ویسا ہی دُور ہے جیسا کہ ایک بے خبر۔ اور اس وقت تک اُس سے دُور رہتا ہے جو موت آکر خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس شخص کی حالت بہت ہی عبرت بخش اور نصیحت خیز ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی ہی ہو رہی ہے وہ جانتے ہیں کہ ساری ترقیوں اور کامیابیوں کی کلید یہی قرآن شریف ہے جس پر ہم کو عمل کرنا چاہیے۔ مگر نہیں۔ اس کی پروا بھی نہیں کی جاتی۔ ایک شخص جو نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ اور پھر نِری ہمدردی ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم اور ایماء سے اس طرف بُلاوے تو اُسے کذاب اور دجال کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا قابلِ رحم حالت اس قوم کی ہوگی۔

مُسلمانوں کو چاہیے تھا اور اب بھی اُن کے لیے یہی ضروری ہے کہ وہ اس چشمہ کو عظیم الشان

نعمت سمجھیں اور اس کی قدر کریں۔ اس کی قدر یہی ہے کہ اس پر عمل کریں۔ اور پھر دیکھیں کہ خدا تعالیٰ کس طرح اُن کی مصیبتوں اور مشکلات کو دُور کر دیتا ہے۔ کاش مسلمان سمجھیں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے یہ ایک نیک راہ پیدا کر دی ہے اور وُہ اس پر چل کر فائدہ اُٹھائیں۔

یقیناً یاد رکھو کہ جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پاک کتاب پر عمل کرتا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو لا انتہا برکات سے حِصّہ دیتا ہے۔ ایسی برکات اُسے دی جاتی ہیں جو اس دُنیا کی نعمتوں سے بہت ہی بڑھ کر ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک عفوِ گناہ بھی ہے کہ جب وہ رجُوع کرتا اور توبہ کرتا ہے تو خُدا تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔ دُوسرے لوگ اس نعمت سے بالکل بے بہرہ ہیں اس لیے کہ وہ اس پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے کہ توبہ سے گناہ بھی بخشے جایا کرتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ہم کو جُونوں میں جانا پڑے گا اور معافی نہیں مِل سکتی۔ عیسائیوں کے اصُول کے موافق مسیح کے خُون پر ایک بار ایمان لا کر اگر گناہ ہو جاوے، تو پھر صلیبِ مسیح کوئی فائدہ نہیں دے سکتی کیونکہ مسیح دو مرتبہ صلیب پر نہیں چڑھے گا تو کیا یہ بات صاف نہیں ہے کہ ان دونوں کے لیے بخشے جانے اور نجات کی راہ بند ہے کیونکہ صدورِ گناہ تو رُک نہیں سکتا۔ اگر خُدا تعالیٰ کی کسی نعمت کا شکر نہ کرے تو یہ بھی گناہ ہے اور غفلت کرے تو یہ بھی گناہ ہے اور ان گناہوں پر بھی جُونوں میں جانا پڑے گا یا مسیح کو دوبارہ صلیب نہیں دیا جائے گا، اس لیے کُلّی طور پر مایُوس ہونا پڑے گا، مگر اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں کو یہ تعلیم نہیں دی۔ ان کے لیے ہر وقت توبہ کا دروازہ کُھلا ہے۔ جب انسان اس کی طرف رجُوع کرے اور اپنے پچھلے گناہوں کا اقرار کر کے اس سے خواستگارِ معافی ہو اور آئندہ کے لیے نیکیوں کا عزم کرے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دیتا ہے۔

سچّی توبہ اور رجُوع الی اللہ کی نصیحت

اس لیے مَیں کہتا ہوں کہ میری باتوں کو متوجہ ہو کر سُنو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ باتیں صرف تمہارے کان تک ہی رہ جائیں اور تم اُن سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ اور یہ تمہارے دل تک نہ پہنچیں۔ نہیں بلکہ توجہ سے سُنو اور اُن کو دل میں جگہ دو اور اپنے عمل سے دکھاؤ کہ تم نے اُن کو سرسری طور پر نہیں سُنا اور اُن کا اثر اسی آن تک نہیں بلکہ گہرا اثر ہے۔

اس بات کو بخوبی یاد رکھو کہ گناہ ایسی زہر ہے جس کے کھانے سے انسان ہلاک ہو جاتا ہے اور نہ صرف ہلاک ہی ہوتا ہے بلکہ وُہ خدا تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے سے رہ جاتا ہے اور اس قابل نہیں ہوتا کہ یہ نعمت اس کو مِل سکے۔ جس جس قدر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسی اسی قدر خدا تعالیٰ سے

دُور ہوتا چلا جاتا ہے اور وُہ روشنی اور نُور جو خدا تعالیٰ کے قُرب میں اُسے ملنی تھی اس سے پرے ہٹتا جاتا ہے اور تاریکی میں پڑ کر ہر طرف سے آفتوں اور بلاؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہانتک کہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن شیطان اس پر اپنا قابو پا لیتا ہے اور اُسے ہلاک کر دیتا ہے۔ لیکن اس خطرناک نتیجہ سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ اگر انسان اس سے فائدہ اُٹھائے تو وہ اس ہلاکت کے گڑھے سے بچ جاتا ہے اور پھر خدا تعالیٰ کے قُرب کو پا سکتا ہے۔ وہ سامان کیا ہے، رجُوع الی اللہ یا سچی توبہ۔ خُدا تعالیٰ کا نام توّاب ہے۔ وُہ بھی رجوع کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان جب گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دُور ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس سے بعید ہوتا ہے لیکن جب انسان رجُوع کرتا ہے یعنی اپنے گناہوں سے نادم ہو کر پھر خدا تعالیٰ کی طرف جُھکتا ہے تو اس کریم رحیم خُدا کا رحم اور کرم بھی جوش میں آتا ہے اور وُہ اپنے بندہ کی طرف توجہ کرتا ہے اور رجُوع کرتا ہے۔ اس لیے اس کا نام توّاب ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ اپنے ربّ کی طرف رجُوع کرے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع برحمت کرے۔

شامت اعمال

انسان جس قدر مشکلات اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے اور دُنیا میں اس پر آفتیں آتی ہیں، یہ سب شامتِ اعمال ہی سے آتی ہیں۔ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ لوگ ایک دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہم پر اگر مصیبتیں آئیں تو کیا ہوا؟ انبیاء علیہم السلام پر بھی مصیبتیں آئی ہیں لیکن وُہ نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے ان کی مصائب اور مشکلات کو کوئی نسبت نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی مصائب میں لذت ہوتی ہے۔ وہ قربِ الٰہی کے بڑھانے کا موجب ہوتی ہیں۔ ان سے محبت بڑھتی ہے اور ان کا فوق العادت استقلال اور رضا و تسلیم اعلیٰ درجہ کی معرفت کا باعث بنتا ہے۔ برخلاف اس کے یہ مصیبتیں اور بلائیں و بائیں جو گناہ کی شامت سے آتی ہیں اُن میں درد اور تکلیف کے علاوہ خُدا سے بُعد ہوتا ہے اور ایک تاریکی چھا جاتی ہے۔ آخر بالکل تباہی اور بربادی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک زہر ہے۔ زہر کھا کر کوئی بچ نہیں سکتا۔ پس گناہ کی زہر کھا کر یہ توقع کرنا کہ وہ بچ جائے گا خطرناک غلطی ہے۔ یقیناً یاد رکھو جو گناہ سے باز نہیں آتا وہ آخر مرے گا اور ضرور مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسل کو اسی لیے بھیجا اور اپنی آخری کتاب قرآنِ مجید اس لیے نازل فرمائی کہ دُنیا اس زہر سے ہلاک نہ ہو بلکہ اس کی تاثیرات سے واقف ہو کر بچ جاوے۔ قدیم سے سنت اللہ اسی طرح پر چلی آئی ہے کہ جب دُنیا پر گناہ کی تاریکی پھیل جاتی ہے اور انسانوں میں عبُودیت نہیں رہتی اور عبُودیت اور الُوہیت کا باہمی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان سرکشی اور بغاوت اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ

محض اپنے فضل وکرم سے اُس کی آگاہی اور تنبیہ کے لیے اپنا ایک مامور بھیج دیتا ہے وُہ دُنیا آکر اہلِ دُنیا کو اس خطرناک عذاب سے ڈراتا ہے جو ان کی شرارتوں اور شوخیوں کی وجہ سے آنے والا ہوتا ہے اور ان کو اس زہر سے جو گناہ کی زہر ہے بچانا چاہتا ہے جو سعید الفطرت ہوتے ہیں وُہ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اور سچّی توبہ کرکے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ لیکن شریر النفس اپنی شرارتوں میں ترقی کرتے اور اس کی باتوں کو ہنسی ٹھٹھے میں اُڑا کر خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتے ہیں اور آخر تباہ ہو جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ سے سچّا تعلق عبوُدیت ہو

آجکل یہی زمانہ آیا ہوا ہے۔ خدا تعالےٰ کے ساتھ جو سچّا تعلق عبوُدیت کا ہونا چاہیے اور جو محبّت اپنے خالق سے ضروری ہے وہ کہاں ہے؟ ہر ایک شخص اپنی جگہ پر غور کرے اور اپنے نفس پر قیاس کرکے دیکھے کہ خُدا تعالیٰ کے ساتھ اس کے تعلقات کس قدر ہیں آیا وُہ دُنیا اور اس کی شان وشوکت کو اپنا معبُود سمجھتا ہے یا حقیقی خُدا کو معبُود مانتا ہے۔ اس کے تعلقات اپنے نفس، اہل وعیال اور دُوسری مخلوق کے ساتھ کس قسم کے ہیں؟ ان میں خدا تعالیٰ کا کس درجہ تک ہے۔ ان باتوں پر جب آپ غور کریں گے اور خالی الذہن ہو کر غور کریں گے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ وہ وقت آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کوئی رشتہ اور پیوند رکھا ہی نہیں ہے۔ اکثر ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے وجود اور ہستی ہی کا یقین نہیں رکھتے اور جو بعض مانتے ہیں کہ خدا ہے ان کا ماننا نہ ماننا برابر ہو رہا ہے کیونکہ وہ تقویٰ اللہ اور خشیۃ اللہ جو خدا تعالیٰ پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے اُن میں پائی نہیں جاتی۔ گناہ سے نفرت اور احکام الٰہی کی پابندی اور نواہی سے بچنا نظر نہیں آتا۔ پھر کیونکر تسلیم کر لیا جاوے کہ یہ لوگ فی الحقیقۃ خدا تعالےٰ پر ایمان لاتے ہوتے ہیں[1]۔

اور ماسوا اس کے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خُدا تعالیٰ کے ساتھ جبتک کامل اور پُورا تعلق نہ ہو۔ وہ برکات اور فیوض جو اس تعلق کے لازمی نتائج ہیں حاصل نہیں ہوتے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جہاں ایک پیالہ پانی کا پی کر سیر ہونا ہو وہاں ایک قطرہ کہاں تک مفید ہو سکتا ہے اور تشنہ لبی کو بُجھا سکتا ہے اور جہاں دس تولہ دَوا کھانی ہو وہاں ایک چاول یا ایک رتّی سے کیا ہوگا؟ اسی طرح پر جب تک انسان

حاشیہ [1] لِلّٰہِ دَرُّ مَنْ قَالَ ۔ (از ایڈیٹر)

از عمل ثابت کُن آں نورے کہ در ایمان تُست
دل چو دادی یُوسفے را راہِ کنعاں را گزیں

(حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام)

پُورے طور پر خدا تعالیٰ کا مطیع اور وفادار بندہ نہیں بنتا اور کامل نیکی نہیں کرتا۔ اس وقت تک اس کے انوار و برکات ظاہر نہیں ہوتے۔ ادھوری اور ناتمام باتوں سے بعض اوقات ٹھوکر لگتی ہے۔ ایک شخص نیکی کو اس کے کمال تک تو پہنچاتا نہیں اور اس سے ان ثمرات کی توقع کرتا ہے جو اس کے درجہ کمال پر پیدا ہوتے ہیں اور جب وہ نہیں ملتے تو اس سچی اور پاک تعلیم سے بدظن ہونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ بہت سے لوگ اسی طرح پر گمراہ ہوتے ہیں۔ لیکن میں یقیناً کہتا ہوں کہ قرآنِ شریف نے جو تعلیم پیش کی ہے اور جس طریق پر نیکی کی راہیں بتائی ہیں ان پر اور اس درجہ تک عامل ہونے سے انسان وہ تمام کمالات اور برکات حاصل کر سکتا ہے جن کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اسی پاک تعلیم کی سچّی اور کامل پیروی سے ولی اللہ اور اَبدال بنتے ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ولی اللہ یا ابدال بننے کے لیے کوئی خاص راہ ہے جو قرآن شریف میں نہیں ہے۔ وُہ سخت نادان اور غلطی پر ہیں۔ یہی وہ راہ ہے جس سے یہ درجے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ولی یا ابدال کیا کرتے ہیں؟ یہی کہ وہ سچّی تبدیلی کر لیتے ہیں اور قرآن شریف کی تعلیم کا سچّا متبع اپنے آپ کو بناتے ہیں اور نیکی کو اس حد اور درجہ تک کرتے ہیں جو اس کے کمالات کے لیے مقرر ہے۔ یہی نماز، روزہ زکوٰۃ، صدقات وغیرہ وہ بھی بجا لاتے ہیں، لیکن ان میں اور دُوسرے لوگوں میں اس قدر فرق ہے کہ وہ اس حدّ تک ان اعمالِ صالحہ کو بجا لاتے ہیں کہ اُن میں ایک قوت اور طاقت آجاتی ہے اور اُن سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جو دوسروں کی نظر میں خوارق ہوتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ وہ اعمالِ صالحہ کو پورے طور پر بجا لاتے ہیں پس جو شخص پُوری نیکی کرتا ہے اور اس کو ادھورا اور ناقص نہیں چھوڑتا اور قرآن شریف کی تعلیم کا پورا پابند اپنے آپ کو بنا لیتا ہے وہ یقیناً ولی اور ابدال ہو جاتا ہے۔ جو چاہے بن سکتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اس کے واسطے بڑی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اور دُعا کی تعلیم بھی قرآن شریف کی تعلیم ہے۔ جس کے لیے جا بجا ہدایت کی گئی ہے، بلکہ اس کا شروع ہی دُعا سے ہوا ہے۔ اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جیسے اگر کسی شخص کو زندہ رکھنا مقصود ہے تو ضرور ہے کہ اس کو پُوری غذا دی جاوے چند دانوں پر اس کی زندگی کی امید کرنا خیالِ خام ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ میں زندگی حاصل کرنے کے لیے پُوری نیکیوں کا کرنا ضروری ہے جو اس طریق کو چھوڑتا ہے وہ آج نہیں کل مَر جاوے گا۔ قرآن شریف نے اسی اصل کو بتایا ہے جو زیادہ حظ اٹھانا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ زیادہ توجہ کرے۔

جماعتِ احمدیہ کے لیے خصوصی نصائح

ہماری جماعت (جس سے مخالف بُغض رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ جماعت ہلاک اور تباہ ہو جاوے) کو یاد رکھنا چاہیے کہ مَیں اپنے مخالفوں سے باوجود اُن کے بغض کے ایک بات میں

اتفاق رکھتا ہوں اور وُہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہے کہ یہ جماعت گناہوں سے پاک ہو اور اپنے چال چلن کا عمدہ نمونہ دکھاوے وُہ قرآن شریف کی سچی تعلیم پر سچی عامل ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں فنا ہو جاوے۔ ان میں باہم کسی قسم کا بغض و کینہ نہ رہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ پوری اور سچی محبت کرنے والی جماعت ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس جماعت میں داخل ہو کر بھی اس غرض کو پُورا نہیں کرتا اور سچی تبدیلی اپنے اعمال سے نہیں دکھاتا وہ یاد رکھے کہ دشمنوں کی اس مراد کو پُورا کر دے گا۔ وہ یقیناً ان کے سامنے تباہ ہو جاوے گا۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کا رشتہ نہیں اور وہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ وہ اولاد جو انبیاء کی اولاد کہلاتی تھی۔ یعنی بنی اسرائیل جن میں کثرت سے نبی اور رسول آتے اور خدا تعالےٰ کے عظیم الشان فضلوں کے وہ وارث اور حقدار ٹھہرائے گئے تھے۔ لیکن جب اس کی رُوحانی حالت بگڑی اور اُس نے راہِ مستقیم کو چھوڑ دیا۔ سرکشی اور فسق و فجور کو اختیار کیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ ضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّۃُ وَ الْمَسْکَنَۃُ (البقرۃ : ۶۲) کی مصداق ہوئی۔ خدا تعالیٰ کا غضب ان پر ٹوٹ پڑا۔ اور ان کا نام سوّر اور بندر رکھا گیا۔ یہانتک وہ گر گئے کہ انسانیت سے بھی اُن کو خارج کیا گیا۔ یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے۔ بنی اسرائیل کی حالت ہر وقت ایک مفید سبق ہے۔ اسی طرح یہ قوم جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے وہ قوم ہے کہ خدا تعالیٰ اس پر بڑے بڑے فضل کرے گا۔ لیکن اگر کوئی اس جماعت میں داخل ہو کر خدا تعالےٰ سے سچی محبت اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اور کامل اتباع نہیں کرتا وہ چھوٹا ہو یا بڑا کاٹ ڈالا جائے گا اور خُدا تعالےٰ کے غضب کا نشانہ ہو گا۔ پس تمہیں چاہیے کہ کامل تبدیلی کرو اور جماعت کو بدنام کرنے والے نہ ٹھہرو۔

خاندانی تفاخر

بعض نادان ایسے بھی ہیں جو ذاتوں کی طرف جاتے ہیں اور اپنی ذات پر بڑا تکبر اور ناز کرتے ہیں بنی اسرائیل کی ذات کیا کم تھی جن میں نبی اور رسُول آتے تھے۔ لیکن کیا اُن کی اس اعلیٰ ذات کا کوئی لحاظ خدا تعالیٰ کے حضور ہوا۔ جب اس کی حالت بدل گئی۔ ابھی مَیں نے کہا ہے کہ ان کا نام سوّر اور بندر رکھا گیا اور اسے اس طرح پر انسانیت کے دائرہ سے خارج کر دیا۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ بہت لوگوں کو یہ مرض لگا ہوا ہے۔ خصوصاً سادات اس مرض میں بہت مبتلا ہیں وہ دُوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنی ذات پر ناز کرتے ہیں۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنے کے لیے ذات کچھ بھی چیز نہیں ہے اور اُسے ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جو سیّد وُلدِ آدم اور افضل الانبیاء ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے صاف طور پر فرمایا کہ اے فاطمہؓ تو اس رشتہ پر بھروسہ نہ کرنا کہ مَیں پیغمبر زادی ہوں۔ قیامت کو یہ

ہرگز نہیں پُوچھا جاوے گا کہ تیرا باپ کون ہے۔ وہاں تو اعمال کام آئیں گے۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے قُرب سے زیادہ دُور پھینکنے والی اور حقیقی نیکی کی طرف آنے سے روکنے والی بڑی بات یہی ذات کا گھمنڈ ہے کیونکہ اس سے تکبّر پیدا ہوتا ہے اور تکبّر ایسی شے ہے کہ وہ محروم کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وُہ اپنا سارا سہارا اپنی غلط فہمی سے اپنی ذات پر سمجھتا ہے کہ مَیں گیلانی ہوں یا فلاں سیّد ہوں، حالانکہ وُہ نہیں سمجھتا کہ یہ چیزیں وہاں کام نہیں آئیں گی۔ ذات اور قوم کی بات تو مرنے کے ساتھ ہی الگ ہو جاتی ہے۔ مرنے کے بعد اس کا کوئی تعلق باقی رہتا ہی نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قرآنِ شریف میں یہ فرماتا ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال: ۹) کوئی بُرا عمل کرے خواہ کتنا ہی کیوں نہ کرے اس کی پاداش اس کو ملے گی۔ یہاں کوئی تخصیص ذات اور قوم کی نہیں اور پھر دوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات: ۱۴) اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

پس ذاتوں پر ناز اور گھمنڈ نہ کرو کہ یہ نیکی کے لیے روک کا باعث ہو جاتا ہے۔ ہاں ضروری یہ ہے کہ نیکی اور تقویٰ میں ترقی کرو۔ خدا تعالیٰ کے فضل اور برکات اسی راہ سے آتے ہیں۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ ہماری جماعت اور ہم جو کچھ ہیں اسی حال میں اللہ تعالیٰ کی تائید اور اُس کی نُصرت ہمارے شاملِ حال ہوگی کہ ہم صراطِ مستقیم پر چلیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اور سچی اتباع کریں۔ قرآن شریف کی پاک تعلیم کو اپنا دستور العمل بنا دیں اور ان باتوں کو ہم اپنے عمل اور حال سے ثابت کریں نہ صرف قال سے۔ اگر ہم اس طریق کو اختیار کریں گے تو یقیناً یاد رکھو کہ ساری دُنیا بھی مِل کر ہم کو ہلاک کرنا چاہے تو ہم ہلاک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ خُدا ہمارے ساتھ ہوگا۔

لیکن اگر ہم خدا تعالیٰ کے نافرمان اور اس سے قطع تعلق کر چکے ہیں تو ہماری ہلاکت کے لیے کسی کو منصوبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی مخالفت کی حاجت نہیں۔ وُہ سب سے پہلے خود ہم کو ہلاک کر دے گا۔

ہمیشہ سے سنّت اللہ اسی طرح پر چلی آئی ہے۔ جب بنی اسرائیل نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی اختیار کی اور اس نے گناہ کیا۔ خُدا تعالیٰ نے اس قوم کو ہلاک کیا؛ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر اُن میں موجود تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ سے سخت بیزار اور متنفّر ہے۔ وہ کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ ایک شخص بغاوت کرے اور اس کو سزا نہ دی جاوے۔

یہ بات بھی خُوب یاد رکھو کہ گنہگار خُدا تعالےٰ پر ایمان اور یقین نہیں رکھتا۔ اگر ایمان رکھتا تو ہرگز گناہ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ چوری کرنے والا یا زانی یا بدکار اپنے فعل کے وقت مومن نہیں ہوتا۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے کیونکہ سچا ایمان تو گناہ سے دُور کرتا ہے اور شیطان کی کُشتی میں وُہ

شیطان پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص علانیہ بدکاری میں مبتلا ہے اور دُوسری خطاکاریوں سے باوجودیکہ اُن کی بُرائی سے آگاہ ہے باز نہیں آتا تو پھر بجز اس کے اَور کیا کہنا پڑے گا کہ وُہ خدا تعالےٰ پر ایمان نہیں رکھتا۔ اگر ایمان رکھتا تو کیوں ان بدیوں سے نہ بچتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خُدا گناہ سے سخت بیزار ہے اور اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا اور تکلیف دِہ ہے۔

انسانی نفس کے مراتب

نفس کی تین حالتیں ہیں۔ یا یہ کہو کہ نفس تین رنگ بدلتا ہے: بچپن کی حالت میں نفسِ زکیّہ ہوتا ہے یعنی بالکل سادہ ہوتا ہے۔ اس عمر کے طے کرنے کے بعد پھر نفس پر تین حالتیں آتی ہیں سب سے اوّل جو حالت ہوتی ہے اس کا نام نفسِ اَمّارہ ہے۔ اس حالت میں انسان کی تمام طبعی قوتیں جوش زن ہوتی ہیں اور اس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے دریا کا سیلاب آجاوے اس وقت قریب ہے کہ غرق ہو جاوے۔ یہ جوشِ نفس ہر قسم کی بے اعتدالیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

لیکن پھر اس پر ایک حالت اور بھی آجاتی ہے جس کا نام نفسِ لَوّامہ ہے۔ اس کا نام لوّامہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ بدی پر ملامت کرتا ہے اور یہ حالت نفس کی روا نہیں رکھتی کہ انسان ہر قسم کی بے اعتدالیوں اور جوشوں کا شکار ہوتا چلا جاوے۔ جیسا کہ نفسِ اَمّارہ کی صورت میں تھا بلکہ نفسِ لوّامہ اُسے بدیوں پر ملامت کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نفسِ لَوّامہ کی حالت میں انسان بالکل گناہ سے پاک اور بَری نہیں ہوتا مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اس حالت میں انسان کی شیطان اور گناہ کے ساتھ ایک جنگ ہوتی رہتی ہے۔ کبھی شیطان غالب آجاتا ہے اور کبھی وُہ غالب آجاتا ہے۔ مگر نفسِ لَوّامہ والا خدا تعالیٰ کے رحم کا مستحق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وُہ بدیوں کے خلاف اپنے نفس سے جنگ کرتا رہتا ہے اور آخر اسی کشمکش اور جنگ وجدل میں اللہ تعالیٰ اس پر رحم کر دیتا ہے اور اُسے وہ نفس کی حالت عطا ہوتی ہے جس کا نام مُطمئنّہ ہے۔ یعنی اس حالت میں انسان شیطان اور نفس کی لڑائی میں فتح پا کر انسانیت اور نیکی کے قلعے کے اندر آکر داخل ہو جاتا ہے اور اس قلعہ کو فتح کرکے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ خدا پر راضی ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اس پر راضی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں فنا اور محو ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی مقادیر کے ساتھ اس کو پُوری صلح اور رضا حاصل ہوتی ہے؛ چنانچہ فرمایا

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ (الفجر ۲۸ : ۳۱)

یعنی اے نفس آرام یافتہ جو خدا سے آرام پا گیا ہے اپنے خدا کی طرف واپس چلا آ۔ تُو اس سے راضی

اور وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں مل جا اور میرے بہشت کے اندر آجا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سچا رجوع اس وقت ہوتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ کی رضا سے رضاءِ انسانی مل جاوے۔ یہ وہ حالت ہے جہاں انسان اولیاء اور ابدال اور مقربین کا درجہ پاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف ملتا ہے اور وحی کی جاتی ہے۔ اور چونکہ وہ ہر قسم کی تاریکی اور شیطانی شرارت سے محفوظ ہوتا ہے۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا میں زندہ ہوتا ہے، اس لیے وہ ایک ابدی بہشت اور سرور میں ہوتا ہے۔ انسانی ہستی کا مقصدِ اعلیٰ اور غرض اسی مقام کا حاصل کرنا ہے اور یہی وہ مقصد ہے جو اسلام کے لفظ میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے کیونکہ اسلام سے سچی مراد یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع اپنی رضا کرے۔

بلند تر مراتب پانے کے لیے دُعا کی ضرورت ہے

مگر سچ یہ ہے کہ یہ مقام انسان کی اپنی قوت سے نہیں مل سکتا۔ ہاں اس میں کلام نہیں کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ مجاہدات کرے لیکن اس مقام کے حصول کا اصل اور سچا ذریعہ دُعا ہے۔ انسان کمزور ہے جب تک دُعا سے قوت اور تائید نہیں پاتا اس دشوار گذار منزل کو طے نہیں کر سکتا۔ خود اللہ تعالیٰ نے انسان کی کمزوری اور اس کے ضعفِ حال کے متعلق ارشاد فرمایا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء: ۲۹) یعنی انسان ضعیف اور کمزور بنایا گیا ہے۔ پھر باوجود اس کی کمزوری کے اپنی ہی طاقت سے ایسے عالی درجہ اور ارفع مقام کے حاصل کرنے کا دعویٰ کرنا سراسر خام خیالی ہے۔ اس کے لیے دُعا کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ دُعا ایک زبردست طاقت ہے جس سے بڑے بڑے مشکل مقام حل ہو جاتے ہیں اور دُشوار گذار منزلوں کو انسان بڑی آسانی سے طے کر لیتا ہے کیونکہ دُعا اس فیض اور قوت کو جذب کرنے والی ہے جو اللہ تعالیٰ سے آتی ہے۔ جو شخص کثرت سے دُعاؤں میں لگا رہتا ہے وہ آخر اس فیض کو کھینچ لیتا ہے اور خُدا تعالیٰ سے تائید یافتہ ہو کر اپنے مقاصد کو پا لیتا ہے۔ ہاں نری دُعا خدا تعالیٰ کا منشاء نہیں ہے بلکہ اوّل تمام مساعی اور مجاہدات کو کام میں لاوے اور اس کے ساتھ دُعا سے کام لے۔ اسباب سے کام نہ لینا اور نری دُعا سے کام لینا یہ آدابُ الدُّعا سے ناواقفی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کو آزمانا ہے۔ اور نرے اسباب پر گر رہنا اور دُعا کو لاشئ محض سمجھنا یہ دہریت ہے۔ یقیناً سمجھو کہ دُعا بڑی دولت ہے۔ جو شخص دُعا کو نہیں چھوڑتا۔ اس کے دین اور دُنیا پر آفت نہ آئے گی۔ وہ ایک ایسے قلعہ میں محفوظ ہے جس کے ارد گرد مسلح سپاہی ہر وقت حفاظت کرتے ہیں لیکن جو دعاؤں سے لاپروا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو خود بے ہتھیار ہے اور اس پر کمزور بھی ہے اور پھر ایسے جنگل میں ہے جو

درندوں اور مُوذی جانوروں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کی خیر ہرگز نہیں ہے۔ ایک لمحہ میں وہ مُوذی جانوروں کا شکار ہو جائے گا اور اس کی ہڈی بوٹی نظر نہ آئے گی۔ اس لیے یاد رکھو کہ انسان کی بڑی سعادت اور اس کی حفاظت کا اصل ذریعہ ہی یہی دُعا ہے۔ یہی دُعا اس کے لیے پناہ ہے۔ اگر وہ ہر وقت اس میں لگا رہے۔

قرآنی نصائح کا مغز

یہ بھی یقیناً سمجھو کہ یہ ہتھیار اور نعمت صرف اسلام ہی میں دی گئی ہے۔ دُوسرے مذاہب اس عطیہ سے محروم ہیں۔ آریہ لوگ بھلا کیوں دُعا کریں گے جبکہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ تناسخ کے چکر میں سے ہم نکل ہی نہیں سکتے ہیں اور کسی گناہ کی معافی کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔ ان کو دُعا کی کیا حاجت اور کیا ضرورت اور اس سے کیا فائدہ؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آریہ مذہب میں دُعا ایک بے فائدہ چیز ہے اور پھر عیسائی دُعا کیوں کریں گے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ دوبارہ کوئی گناہ بخشا نہیں جائے گا کیونکہ مسیح دوبارہ تو مصلوب ہو ہی نہیں سکتا۔ پس یہ خاص اکرام اسلام کے لیے ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اُمّتِ مرحومہ ہے۔ لیکن اگر آپ ہی اس فضل سے محروم ہو جاویں اور خود ہی اس دروازہ کو بند کر دیں، تو پھر کس کا گناہ ہے۔ جب ایک حیات بخش چشمہ موجود ہے اور ہر وقت اس میں سے پانی پی سکتا ہے۔ پھر اگر کوئی اس سے سیراب نہیں ہوتا تو خود طالب موت اور تشنۂ ہلاکت ہے۔ اس صورت میں تو چاہیے کہ اس پر مُنہ رکھ دے اور خوب سیراب ہو کر پانی پی لیوے۔ یہ میری نصیحت ہے جس کو مَیں ساری نصائح قرآنی کا مغز سمجھتا ہوں۔ قرآن شریف کے تیس سپارے ہیں اور وہ سب کے سب نصائح سے لبریز ہیں لیکن ہر شخص نہیں جانتا کہ ان میں سے وہ نصیحت کون سی ہے جس پر اگر مضبوط ہو جاویں اور اس پر پُورا عملدرآمد کریں تو قرآن کریم کے سارے احکام پر چلنے اور ساری منہیات سے بچنے کی توفیق مل جاتی ہے۔ مگر مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کلید اور قوت دُعا ہے۔ دُعا کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ مَیں یقین رکھتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ پھر اللہ تعالیٰ ساری مشکلات کو آسان کر دے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ دُعا کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ دُعا کیا چیز ہے۔ دُعا یہی نہیں ہے کہ چند لفظ مُنہ سے بڑبڑا لیے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ دُعا اور دعوت کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مدد کے لیے پکارنا۔ اور اس کا کمال اور مؤثر ہونا اس وقت ہوتا ہے جب انسان کمال دردِ دل اور قلق اور سوز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجُوع کرے اور اس کو پکارے ایسا کہ اس کی رُوح پانی کی طرح گداز ہو کر آستانۂ اُلوہیت کی طرف بہہ نکلے یا جس طرح پر کوئی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ دوسرے لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکارتا ہے تو دیکھتے ہو کہ اس کی پکار میں کیسا انقلاب اور تغیر ہوتا ہے۔ اس کی آواز ہی میں

وہ درد بھرا ہوا ہوتا ہے جو دوسروں کے رحم کو جذب کرتا ہے۔ اسی طرح وُہ دعا جو اللہ تعالیٰ سے کی جاوے۔ اس کی آواز، اس کا لب ولہجہ بھی اور ہی ہوتا ہے۔ اُس میں وہ رقّت اور درد ہوتا ہے جو اُلوہیت کے چشمۂ رحم کو جوش میں لاتا ہے۔ اس دُعا کے وقت آواز ایسی ہو کہ سارے اعضاء اس سے متاثر ہو جاویں اور زبان میں خشوع خضوع ہو۔ دل میں درد اور رقّت ہو۔ اعضاء میں انکسار اور رجُوع الی اللہ ہو۔ اور پھر سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر کامل ایمان اور پوری امید ہو۔ اس کی قدرتوں پر ایمان ہو۔ ایسی حالت میں جب آستانۂ اُلوہیت پر گرے۔ نامراد واپس نہ ہوگا۔ چاہیے کہ اس حالت میں بار بار حضورِ الٰہی میں عرض کرے کہ مَیں گنہگار اور کمزور ہوں۔ تیری دستگیری اور فضل کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تُو آپ رحم فرما اور مجھے گناہوں سے پاک کر، کیونکہ تیرے فضل و کرم کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو مجھے پاک کرے۔ جب اس قسم کی دُعا میں مداومت کرے گا اور استقلال اور صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل اور تائید کا طالب رہے گا تو کسی نامعلوم وقت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نُور اور سکینت اس کے دل پر نازل ہوگی جو دل سے گناہ کی تاریکی دور کر دیگی۔ اور غیب سے ایک قوت عطا ہوگی جو گناہ سے بیزاری پیدا کر دے گی اور وُہ ان سے بچے گا۔ اس حالت میں دیکھے گا کہ میرا دل جذبات اور نفسانی خواہشوں کا ایسا اسیر اور گرفتار تھا کہ گویا ہزاروں ہزار زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا جو بے اختیار اُسے کھینچ کر گناہ کی طرف لے جاتے تھے اور یا یک دفعہ وہ سب زنجیر ٹوٹ گئے ہیں اور آزاد ہوگیا ہے اور جیسے پہلی حالت میں وہ محسوس اور مشاہدہ کرے گا کہ وہی رغبت اور رجُوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ گناہ سے محبت کی بجائے نفرت اور اللہ تعالیٰ سے وحشت اور نفرت کی بجائے محبت اور کشش پیدا ہوگی۔

یہ ایک زبردست صداقت ہے جو اسلام میں موجود ہے اس کا انکار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس کا زندہ ثبوت ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے۔ مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ اگر انسان اس امر کو سمجھ لے اور وُہ دُعا کے راز سے آگاہ ہو جاوے تو اُس میں اس کی بڑی ہی سعادت اور نیک بختی ہے اور اس صورت میں سمجھو کہ گویا اس کی ساری ہی مرادیں پوری ہو گئی ہیں، ورنہ دُنیا کے ہم و غم تو اس قسم کے ہیں کہ انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

رُو بخدا ہو جاؤ

جو شخص رُو بدُنیا ہوتا ہے وہ تھوڑی دُور چل کر رہ جاتا ہے کیونکہ نامرادیاں اور ناکامیاں آخر آ کر ہلاک کر دیتی ہیں، لیکن جو شخص ساری قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ رُو بخدا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ ہی کے لیے اس کی سب حرکات و سکنات ہوتی ہیں تو خدا تعالیٰ دُنیا کو بھی ناک سے پکڑ کر اس کا خادم بنا دیتا ہے، اگرچہ اس حالت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دنیادار

تو دُنیا کا دیوانہ ہوتا ہے، لیکن یہ خود بخود شخص جس کی دُنیا خادم کی جاتی ہے۔ دُنیا اور اس کی لذتوں میں کوئی لذت نہیں پاتا۔ بلکہ ایک قسم کی بدمزگی ہوتی ہے کیونکہ وہ لُطف اور ذوقِ دُنیا کی طرف نہیں ہوتا بلکہ کسی اور طرف ہو جاتا ہے۔

انسان جب اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے اور ساری راحت اور لذت اللہ تعالیٰ ہی کی رضا میں پاتا ہے تو کچھ شک نہیں دُنیا بھی اس کے پاس آ جاتی ہے، مگر راحت کے طریق اور ہو جائیں گے۔ وہ دُنیا اور اس کی راحتوں میں کوئی لذت اور راحت نہیں پاتا۔ اسی طرح پر انبیاء اور اولیاء کے قدموں پر دُنیا کو لا کر ڈال دیا گیا ہے مگر اُن کو دُنیا کا کوئی مزا نہیں آیا، کیونکہ اُن کا رُخ اور طرف تھا۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔ جب انسان دُنیا کی لذت چاہتا ہے تو وہ لذت اُسے نہیں ملتی لیکن جب خدا تعالیٰ میں فنا ہو کر دُنیا کی لذت کو چھوڑتا ہے اور اس کی آرزو اور خواہش باقی نہیں رہتی تو دُنیا ملتی ہے، مگر اس کی لذت باقی نہیں رہتی۔ یہ ایک مستحکم اصول ہے اس کو بھُولنا نہیں چاہیے۔ خدا یابی کے ساتھ دنیا یابی وابستہ ہے۔ خدا تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرے گا اُسے تمام مشکلات سے نجات ملے گی اور ایسے طور پر اسے رزق دے گا کہ اُسے علم بھی نہ ہوگا۔ یہ کس قدر برکت اور نعمت ہے کہ ہر قسم کی تنگی اور مشکل سے آدمی نجات پا جاوے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے رزق کا کفیل ہو، لیکن یہ بات جیسا کہ خود اس نے فرمایا۔ تقویٰ کے ساتھ وابستہ ہے اور کوئی امر اس کے ساتھ نہیں بتایا کہ دنیوی مکر و فریب سے یہ باتیں حاصل ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں کی علامات میں سے یہ بھی ایک علامت ہے کہ وہ دُنیا سے طبعی نفرت کرتے ہیں، پس جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جاوے اور دنیا اور آخرت کی راحت اُسے مل جاوے وہ یہ راہ اختیار کرے۔ اگر اس راہ کو تو چھوڑتا ہے اور اور راہیں اختیار کرتا ہے تو پھر ٹکریں مار کر دیکھ لے کہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ ہوں گے جن کو یہ نصیحت بُری لگے گی اور وہ ہنسی کریں گے، لیکن وہ یاد رکھیں کہ آخر ایک وقت آ جائے گا کہ وہ ان باتوں کی حقیقت کو سمجھیں گے اور پھر بول اُٹھیں گے کہ افسوس ہم نے یونہی عمر ضائع کی لیکن اس وقت کا افسوس کچھ کام نہ دیگا۔ اصل موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور پیغامِ موت آ جائے گا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی فکر کرو۔ کیونکہ اگر خدا تعالیٰ مہربان ہو جاوے تو ساری دُنیا مہربان ہو جاتی ہے، لیکن اگر وہ ناراض ہو تو پھر کوئی بھی کام نہیں آ سکتا۔ جب اس کا غضب آ گیا تو دُنیا میں کوئی مہربان نہ رہے گا خواہ کیسا ہی مکر و فریب کرے۔ تسبیحیں ڈالے۔ بھگوے اور سبز کپڑے پہنے۔ مگر دُنیا اس کو حقیر ہی سمجھے گی۔ اگر چند روز دُنیا دھوکہ کھا بھی لے تو بھی آخر اس کی قلعی کھُل جاتے گی اور اس کا

مکر و فریب ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے دُنیا اس کی کتنی ہی مخالفت کرے وہ اپنی مخالفت اور منصوبوں میں کامیاب نہ ہو گی۔ اس کو گالیاں دے۔ لعنتیں بھیجے۔ لیکن ایک وقت آجائے گا کہ وہی دُنیا اس کی طرف رجُوع کرے گی اور اس کی سچائی کا اعتراف اسے کرنا پڑے گا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اللہ جس کا ہو جاتا ہے دُنیا بھی اُسی کی ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ ابتداءً اہلِ دُنیا اُن کے دشمن ہو جاتے ہیں اور اُسے قسم قسم کی تکلیفیں دیتے اور اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ کوئی پیغمبر اور مُرسل نہیں آیا جس نے دُکھ نہ اُٹھایا ہو۔ مکّار۔ فریبی۔ دکاندار اس کا نام نہ رکھا ہو۔ مگر باوجود اس کے کہ کروڑ ہا بندوں نے اس پر ہر قسم کے تیر چلانے چاہے۔ پتھر مارے۔ گالیاں دیں۔ انھوں نے کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ کوئی امر اُن کی راہ میں روک نہیں ہو سکا۔ وہ دُنیا کو خدا تعالیٰ کی کلام سُناتے رہے اور وُہ پیغام جو لے کر آئے تھے۔ اس کے پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان تکلیفوں اور ایذا رسانیوں نے جو نادان دُنیاداروں کی طرف سے پہنچیں ان کو سُست نہیں کیا بلکہ وہ اور تیز قدم ہو گئے یہانتک کہ وُہ زمانہ آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے وُہ مشکلات ان پر آسان کر دیں اور مخالفوں کو سمجھ آنے لگی اور پھر وہی مخالف دنیا ان کے قدموں پر آگری اور اُن کی راستبازی اور سچائی کا اعتراف ہونے لگا۔ دل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں وہ جب چاہتا ہے بدل دیتا ہے۔

تبلیغ کی مشکلات

یقیناً یاد رکھو۔ تمام انبیاء کو اپنی تبلیغ میں مشکلات آئی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو سب انبیاء علیہم السلام سے افضل اور بہتر تھے۔ یہانتک کہ آپ پر سلسلہ نبوت اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا یعنی تمام کمالات نبوت آپ پر طبعی طور پر ختم ہو گئے۔ باوجود ایسے جلیل الشان نبی ہونے کے کون نہیں جانتا کہ آپؐ کو تبلیغِ رسالت میں کس قدر مشکلات اور تکالیف پیش آئیں اور کفار نے کس حد تک آپؐ کو ستایا اور دُکھ دیا۔ اس مخالفت میں اپنی ہی قوم اور چچا اور دوسرے بزرگ سب سے بڑھ کر حصّہ لینے والے تھے۔ آپؐ کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا زمانہ اتنا لمبا ہوا کہ تیرہ برس تک اپنی قوم سے ہر قسم کے دُکھ اُٹھاتے رہے۔ اس حالت میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص کامیاب ہو گا۔ کیونکہ ہر طرف مخالفت کا بازار گرم تھا اور خود اپنے رشتہ دار ہی تشنۂ خُون ہو رہے تھے جدی اور برادری کے لوگوں نے جب قبول نہ کیا تو اوروں کو اور بھی مشکلات پیش آگئے۔ غرض اس طرح پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مصیبتوں کا زمانہ دراز ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کے مشکلات پیش نہیں آئے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل نے ان کو فوراً قبول کر لیا تھا۔ اس لیے قوم کی طرف سے کوئی دُکھ اور مصیبت یا روک ان کو پیش نہیں

آئی لیکن برخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ہی قوم سے مشکلات اور انکار کا مرحلہ پیش آیا پھر ایسی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابیاں کیسی اعلیٰ درجہ کی ثابت ہوئی ہیں جو آپ کے کمالات اور فضائل کا سب سے بڑھ کر ثبوت ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اللہ تعالیٰ کے اِذن و اَمر سے تبلیغ شروع کی تو پہلے ہی آپ کو یہ مرحلہ پیش آیا کہ قوم نے انکار کیا۔ لکھا ہے کہ جب آپؐ نے قریش کی دعوت کی اور سب کو بُلا کر کہا میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ اس کا جواب دو۔ یعنی میں اگر تمہیں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بڑی بھاری فوج پڑی ہوئی ہے اور وہ اس گھات میں بیٹھی ہوئی ہے کہ موقع پا کر تمہیں ہلاک کر دے، تو کیا تم باور کرو گے۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ بیشک ہم اس بات کو تسلیم کریں گے۔ اس لیے کہ تو ہمیشہ سے صادق اور امین ہے۔ جب وہ یہ اقرار کر چکے تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو میں سچ کہتا ہوں کہ میں خدا تعالیٰ کا پیغمبر ہوں اور تم کو آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اتنی بات کہنی تھی کہ سب آگ ہو گئے اور ایک شریر بول اُٹھا۔ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ۔ افسوس جو بات ان کی نجات اور بہتری کی تھی نا عاقبت اندیش قوم نے اس کو ہی بُرا سمجھا اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ اب اسکے بالمقابل موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو دیکھو۔ بنی اسرائیل باوجودیکہ ایک سخت دل قوم تھی، لیکن انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ پر فوراً ہی اس کو قبول کر لیا۔ اور اس طرف موسیٰ علیہ السلام سے افضل کو قوم نے تسلیم نہ کیا اور مخالفت کے لیے تیار ہو گئے۔ مصائب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آئے دن قتل کے منصوبے ہونے لگے۔ اور یہ زمانہ اتنا لمبا ہو گیا کہ تیرہ برس تک برابر چلا گیا۔ تیرہ برس کا زمانہ کم نہیں ہوتا۔ اس عرصہ میں آپؐ نے جس قدر دُکھ اُٹھائے ان کا بیان بھی آسان نہیں ہے۔ قوم کی طرف سے تکالیف اور ایذا رسانی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی جاتی تھی اور ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر اور استقلال کی ہدایت ہوتی تھی اور بار بار حکم ہوتا تھا کہ جس طرح پہلے نبیوں نے صبر کیا ہے تُو بھی صبر کر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کمال صبر کے ساتھ ان تکالیف کو برداشت کرتے تھے اور تبلیغ میں سُست نہ ہوتے تھے بلکہ قدم آگے ہی پڑتا تھا۔ اور اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر پہلے نبیوں کا سا نہ تھا کیونکہ وہ تو ایک محدود قوم کے لیے مبعوث ہو کر آئے تھے، اس لیے ان کی تکالیف اور ایذا رسانیاں بھی اسی حد تک محدود ہوتی تھیں[1]۔ لیکن اس کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر بہت ہی بڑا تھا، کیونکہ سب سے اوّل تو اپنی ہی قوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالف ہو گئی اور ایذا رسانی کے دَرپے ہوئی اور پھر عیسائی بھی دشمن ہو گئے۔ جب انکو

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ صفحہ ۱ تا ۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء

سُنایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ایک خدا کے بندے اور رسُول تھے تو اُن کو آگ لگ گئی۔ کیونکہ وہ تو اُنکو خُدا بنائے بیٹھے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر حقیقت کھول دی۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان جس کو خُدا بنالیتا ہے اور اپنا معبُود مانتا ہے۔ اس کا ترک کرنا آسان نہیں ہوتا بلکہ پھر اس کو چھوڑنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ عیسائیوں کا یہ اعتقاد پختہ ہو گیا ہوا تھا۔ اس لیے جب انہوں نے سُنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے مصنوعی خدا کو انسان بنا دیا تو وہ دشمنِ جان بن گئے اور اسی طرح پر یہودیوں میں بہت سی مشرکانہ رسُومات پیدا ہو گئی تھیں اور وہ حضرت مسیح کا بالکل انکار کرتے تھے۔ جب اُن کو متنبہ کیا گیا تو وہ بھی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ وُہ تو حضرت مسیح کو معاذ اللہ مکّار اور کذّاب کہتے تھے۔ بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بتایا کہ تم اُن کو کذّاب کہنے میں خود کذّاب ہو۔ وُہ خدا تعالیٰ کا ایک برگزیدہ نبی ہے۔

اس کے علاوہ ان کی مخالفت کی ایک بڑی بھاری وجہ یہ ہوئی کہ وہ اپنی بے وقوفی اور کم فہمی سے یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ خاتم الانبیاء بنی اسرائیل میں سے آئے گا، کیونکہ توریت میں جیسا کہ سنّت اللہ ہے۔ آخری نبی کے متعلق جو پیشگوئی ہے وہ ایسے الفاظ میں ہے جس سے اُن کو یہ شُبہ پیدا ہو گیا تھا وہاں لکھا ہے کہ تمہارے بھائیوں میں سے۔ وہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہی لیے بیٹھے تھے؛ حالانکہ اس سے مراد بنی اسمٰعیل تھی۔ پس جب اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سُنا کہ وہ خاتم الانبیاء ہیں تو ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور جو کچھ وہ توریت کی اس پیشگوئی کے موافق سمجھے بیٹھے تھے وہ غلط قرار دیا گیا۔ اس سے اُن کے آگ لگی اور وہ مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

پیشگوئیوں کے متعلق سنّت اللہ

اصل بات یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ کی پیشگوئیوں میں سنّت اللہ یہی ہے کہ ان میں اِخفاء اور ابتلاء کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ پہلو نہ رکھا جاوے تو پھر کوئی اختلاف ہی نہ رہے اور سب کا ایک ہی مذہب ہو جاتا۔ مگر خدا تعالیٰ نے امتیاز کے لیے ایسا ہی چاہا ہے۔ کہ پیشگوئیوں میں ایک ابتلا کا پہلو رکھ دیتا ہے۔ کوتاہ اندیش، ظاہر پرست اس پر اَڑ جاتے ہیں اور اصل مقصد سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اسی طرح پر ان یہودیوں کو یہ مشکل پیش آئی۔ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شک میں پڑ گئے۔ اگر توریت میں وہ پیشگوئی صاف الفاظ میں ہوتی کہ آنے والا بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا اور اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔ اس کے باپ کا نام عبد اللہ بن عبد المطلب ہوگا اور اس کی ماں کا نام آمنہ ہوگا تو یہودی کیونکر انکار کرتے؟ مگر ان کی بدقسمتی سے پیشگوئی میں ایسی صراحت نہ تھی۔ وہاں لکھا تھا کہ تیرے بھائیوں میں سے

وہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہی سمجھتے رہے۔

ایسا ہی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وقت بھی یہودیوں کو ٹھوکر لگی تھی۔ ملاکی نبی کی کتاب میں حضرت مسیح کے آنے سے پہلے ایلیا کے آنے کی پیشگوئی درج ہے۔ جب حضرت مسیح آگئے اور اُنھوں نے دعویٰ کیا تو یہودی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ پہلے ایلیاس کا آنا ضروری ہے۔ اس لیے وہ انکار کرنے لگے، چنانچہ انھوں نے خود حضرت مسیح سے یہی سوال کیا کہ ایلیاس کا آنا جو مسیح سے پہلے ضروری ہے وہ کہاں ہے؟ حضرت مسیح نے کہا کہ آنیوالا ایلیاس آگیا ہے۔ یعنی وہ یوحنّا ابنِ زکریا کے رنگ میں آیا ہے چاہو تو قبول کرو۔ مگر یہ بات ان کی تسلّی کا موجب کیونکر ہو سکتی تھی۔ وہ اس بات پر اَڑے رہے کہ وہاں کسی مثیل کے آنے کی خبر تو دی نہیں گئی۔ وہاں تو خود ایلیا کے آنے کا وعدہ ہے۔ اس بنا پر وہ اِنکار کرتے رہے اور دُکھ اور تکلیفیں بھی پہنچاتے رہے۔ یہاں تک کہ اب بھی یہودی یہی یقین رکھتے ہیں۔ میرے پاس ایک فاضل یہودی کی کتاب ہے۔ اُس نے اس مسئلہ پر ایک لمبی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ ہم اس مسیح کو کیونکر قبول کر سکتے ہیں جبکہ اس سے پہلے ایلیا نہیں آیا۔ یہ شخص جو یسوع مسیح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا دعویٰ بناوٹی اور جُھوٹا ہے کیونکہ وہ ایلیا کے دوبارہ آنے کی جھوٹی تاویل کرتا ہے۔ ہم اس کے خالہ زاد بھائی یحییٰ کو کیونکر ایلیا سمجھ لیں پھر وہ لوگوں کے سامنے اپیل کرتا ہے کہ ہم کس طرح پر اس شخص کے دعویٰ کو تسلیم کر لیں جبکہ ہمیں یہ خبر دی گئی تھی کہ پہلے ایلیا آئے گا۔ اس میں کسی مثیل کا وعدہ نہیں کیا گیا۔ آخر میں کہتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ قیامت کو ہم سے سوال کرے گا کہ کیوں اس مسیح کو قبول نہیں کیا، تو ہم ملاکی نبی کی کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھ دیں گے۔

اس قسم کے مشکلات ان لوگوں کو کیوں پیش آتے؟ اس کی وجہ بجُز اس کے کچھ نہیں کہ اُنھوں نے خدا تعالیٰ کی پیشگوئیوں پر غور نہیں کیا اور ظاہر الفاظ پر اَڑے رہے۔ اسی قسم کے مشکلات اس وقت مسلمانوں کو پیش آتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جاوے تو اُن کے سامنے تو کوئی نظیر اور فیصلہ موجود نہ تھا لیکن ان کے سامنے تو دوبارہ آنے کا مقدمہ فیصل شدہ موجود ہے جو خود حضرت عیسٰی علیہ السلام کی عدالت سے فیصل ہو چکا ہے۔ انھوں نے تاویل کر کے بتا دیا تھا کہ دوبارہ آنے والے شخص سے مراد وہی نہیں ہوتا۔ پھر کس قدر افسوس ہے ان پر کہ یہ اس فیصلہ سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَرَّتَیْنِ۔ یہودیوں کو جس پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ لعنتی ہو گئے۔ اسی پتّھر سے یہ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ یہودی اس وقت دُنیا میں موجود ہیں۔ ان کی کتابیں موجود ہیں۔ اُن سے دریافت کر لو کہ کیا ان کا یہ عقیدہ تھا یا نہیں کہ مسیح سے پہلے ایلیاس آئے گا اور ملاکی نبی کی کتاب میں یہ پیشگوئی درج ہے یا نہیں؟ اور پھر عیسائیوں سے

پوچھو اور انجیل میں اس فیصلہ کو پڑھو جو مسیح نے خود کیا ہے۔ مومن تو دوسرے کی مصیبت سے عبرت پکڑتا ہے لیکن ان مسلمانوں نے اس سے کیا سبق سیکھا؟ یہودی عقیدہ ہے جس کی وجہ سے یہودی داخلِ جہنم ہوتے۔ اب کیا یہ بھی یہی چاہتے ہیں؟ میں حیران ہوتا ہوں کہ ان کی عقلوں کو کیا ہو گیا۔ اگر حضرت مسیح کا وہ فیصلہ جو انہوں نے الیاس کے دوبارہ آنے کے متعلق کیا ہے صحیح نہیں ہے تو پھر مجھے جواب دیں کہ حضرت مسیح سچے پیغمبر کیونکر ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ اس میں تو کوئی کلام اور شُبہ ہی نہیں کہ اُن کے آنے سے پیشتر ایلیا کا آنا ضروری تھا اور ایلیا آسمان سے نہیں آیا۔ پھر حضرت مسیحؑ کیونکر سچے نبی ٹھہریں گے۔

اِس عقیدۂ فاسدہ سے یہی نہیں کہ یہودیوں کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی رسالت سے انکار کرنا پڑے گا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بھی معاذ اللہ ہاتھ سے جاتے گی۔ کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد اور بعثت حضرت مسیحؑ کے بعد ہے اور جب ابھی تک مسیحؑ بھی نہیں آیا تو پھر اسلام کیونکر صحیح ہو گا؟ سوچو اور غور کرو کہ تمہاری ذرا سی ٹھوکر کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے۔ سُنو۔ اصل حقیقت یہی ہے اور سچا فیصلہ وہی ہے جو حضرت مسیحؑ نے کر دیا تھا۔ اس سے مُنہ پھیرنا اچھا نہیں ہے۔ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (الانبیاء: ۸)۔

غرض انبیاء علیہم السلام کو اپنی تبلیغ کی راہ میں بہت سی مشکلات ہوتی ہیں اور اُن کے مصائب میں سے یہ بھی بڑی مصیبت ہے کہ جس قدر دیر نبی کی کامیابی میں ہو گی۔ اسی قدر ہم و غم اس کا پڑے گا۔ میں ان مشکلات سے الگ نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس سلسلہ کو بھی منہاجِ نبوت پر قائم کیا ہے۔

جماعت میں شامل ہونے والوں کے لیے نصائح

ہماری جماعت کے لیے بھی اسی قسم کی مشکلات ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت مسلمانوں کو پیش آئے تھے؛ چنانچہ نئی اور سب سے پہلی مصیبت تو یہی ہے کہ جب کوئی شخص اس جماعت میں داخل ہوتا ہے تو معاً دوست، رشتہ دار اور برادری الگ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات ماں باپ اور بھائی بہن بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ السلام علیکم تک کے روادار نہیں رہتے اور جنازہ پڑھنا نہیں چاہتے۔ اس قسم کی بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بعض کمزور طبیعت کے آدمی بھی ہوتے ہیں اور ایسی مشکلات پر وہ گھبرا جاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ اس قسم کی مشکلات کا آنا ضروری ہے۔ تم انبیاء و رسل سے زیادہ نہیں ہو۔ ان پر اس قسم کی مشکلات اور مصائب آئیں اور یہ اسی لیے آتی ہیں کہ خدا تعالیٰ پر ایمان قوی ہو اور پاک تبدیلی کا موقعہ ملے۔ دعاؤں میں لگے رہو۔ پس یہ ضروری ہے کہ تم انبیاء و رسل کی پیروی کرو اور صبر کے طریق کو اختیار کرو۔ تمہارا کچھ بھی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ دوست

جو تمہیں قبولِ حق کی وجہ سے چھوڑتا ہے وہ سچا دوست نہیں ہے، ورنہ چاہیے تھا کہ تمہارے ساتھ ہوتا۔ تمہیں چاہیے کہ وہ لوگ جو محض اس وجہ سے تمہیں چھوڑتے اور تم سے الگ ہوتے ہیں کہ تم نے خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ میں شمولیت اختیار کر لی ہے اُن سے دنگہ یا فساد مت کرو بلکہ اُن کے لیے غائبانہ دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی وہ بصیرت اور معرفت عطا کرے جو اُس نے اپنے فضل سے تمہیں دی ہے۔ تم اپنے پاک نمونہ اور عمدہ چال چلن سے ثابت کر کے دکھاؤ کہ تم نے اچھی راہ اختیار کی ہے۔ دیکھو مَیں اس امر کے لیے مامور ہوں کہ تمہیں بار بار ہدایت کروں کہ ہر قسم کے فساد اور ہنگامہ کی جگہوں سے بچتے رہو اور گالیاں سُن کر بھی صبر کرو۔ بدی کا جواب نیکی سے دو اور کوئی فساد کرنے پر آمادہ ہو تو بہتر ہے کہ تم ایسی جگہ سے کھسک جاؤ اور نرمی سے جواب دو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بڑے جوش سے مخالفت کرتا ہے اور مخالفت میں وہ طریق اختیار کرتا ہے جو مفسدانہ طریق ہو۔ جس سے سُننے والوں میں اشتعال کی تحریک ہو لیکن جب سامنے سے نرم جواب ملتا ہے اور گالیوں کا مقابلہ نہیں کیا جاتا، تو خود اُسے شرم آجاتی ہے اور وہ اپنی حرکت پر نادم اور پشیمان ہونے لگتا ہے۔ مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ صبر کو ہاتھ سے نہ دو۔ صبر کا ہتھیار ایسا ہے کہ توپوں سے وہ کام نہیں نکلتا جو صبر سے نکلتا ہے۔ صبر ہی ہے جو دلوں کو فتح کر لیتا ہے۔ یقیناً یاد رکھو کہ مجھے بہت ہی رنج ہوتا ہے جب مَیں یہ سُنتا ہوں کہ فلاں شخص اس جماعت کا ہو کر کسی سے لڑا ہے۔ اس طریق کو مَیں ہرگز پسند نہیں کرتا اور خُدا تعالیٰ بھی نہیں چاہتا کہ وہ جماعت جو دُنیا میں ایک نمونہ ٹھہرے گی وہ ایسی راہ اختیار کرے جو تقویٰ کی راہ نہیں ہے بلکہ مَیں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یہانتک اس اَمر کی تائید کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس جماعت میں ہو کر صبر اور برداشت سے کام نہیں لیتا تو وہ یاد رکھے کہ وہ اس جماعت میں داخل نہیں ہے۔ نہایت کار اشتعال اور جوش کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ مجھے گندی گالیاں دی جاتی ہیں تو اس معاملہ کو خُدا کے سپرد کر دو۔ تم اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ میرا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ تم ان گالیوں کو سُن کر بھی صبر اور برداشت سے کام لو۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ مَیں ان لوگوں سے کس قدر گالیاں سُنتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گندی گالیوں سے بھرے ہوئے خطوط آتے ہیں اور کُھلے کارڈوں میں گالیاں دی جاتی ہیں۔ بیرنگ خطوط آتے ہیں جن کا محصول بھی دینا پڑتا ہے اور پھر جب پڑھتے ہیں تو گالیوں کا طومار ہوتا ہے۔ ایسی فحش گالیاں ہوتی ہیں کہ مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ کسی پیغمبر کو بھی ایسی گالیاں نہیں دی گئی ہیں۔ اور مَیں اعتبار نہیں کرتا کہ ابوجہل میں بھی ایسی گالیوں کا مادہ ہو۔ لیکن یہ سب کچھ سُننا پڑتا ہے۔ جب مَیں صبر کرتا ہوں تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی صبر کرو۔ درخت سے بڑھ کر تو شاخ نہیں ہوتی۔ تم دیکھو کہ یہ کب تک گالیاں دیں گے۔ آخر یہی تھک کر رہ جائیں گے۔ اُن کی گالیاں، اُن کی شرارتیں اور منصوبے مجھے ہرگز نہیں تھکا سکتے۔ اگر مَیں

خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو بیشک میں اُن کی گالیوں سے ڈر جاتا، لیکن میں یقیناً جانتا ہوں کہ مجھے خدا نے مامور کیا ہے پھر میں ایسی خفیف باتوں کی کیا پروا کروں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم خود غور کرو کہ اُن کی گالیوں نے کس کو نقصان پہنچایا ہے اُن کو یا مجھے؟ ان کی جماعت گھٹی ہے اور میری بڑھی ہے۔ اگر یہ گالیاں کوئی روک پیدا کر سکتی ہیں تو دو لاکھ سے زیادہ جماعت کس طرح پیدا ہو گئی۔ یہ لوگ ان میں سے ہی آتے ہیں یا کہیں اور سے؟ اُنھوں نے مجھ پر کُفر کے فتوے لگائے لیکن اس فتویٰ کفر کی کیا تاثیر ہوئی؟ جماعت بڑھی۔ اگر یہ سلسلہ منصوبہ بازی سے چلایا گیا ہوتا تو ضرور تھا کہ اس فتویٰ کا اثر ہوتا اور میری راہ میں وہ فتویٰ کفر بڑی بھاری روک پیدا کر دیتا۔ لیکن جو بات خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو انسان کا مقدور نہیں ہے کہ اُسے پامال کر سکے جو کچھ منصوبے میرے مخالف کئے جاتے ہیں، پہچان کرنے والوں کو حسرت ہی ہوتی ہے۔ میں کھول کر کہتا ہوں کہ یہ لوگ جو میری مخالفت کرتے ہیں ایک عظیم الشان دریا کے سامنے جو اپنے پورے زور سے آ رہا ہے اپنا ہاتھ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اس سے رُک جاوے، مگر اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ رُک نہیں سکتا۔ یہ اُن گالیوں سے روکنا چاہتے ہیں مگر یاد رکھیں کہ کبھی نہیں رُکے گا۔ کیا شریف آدمیوں کا کام ہے کہ گالیاں دے۔ میں ان مُسلمانوں پر افسوس کرتا ہوں کہ یہ کس قسم کے مسلمان ہیں جو ایسی بیباکی سے زبان کھولتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسی گندی گالیاں میں نے تو کبھی کسی چوڑھے چمار سے بھی نہیں سُنی ہیں جو ان مسلمان کہلانے والوں سے سُنی ہیں۔

ان گالیوں میں یہ لوگ اپنی حالت کا اظہار کرتے ہیں اور اعتراض[1] کرتے ہیں کہ وہ فاسق و فاجر ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی آنکھیں کھولے اور ان پر رحم کرے۔ (آمین)

ایسے گالیاں دینے والے خواہ ایک کروڑ ہوں۔ خُدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ جانتے ہیں کہ ایک پیسہ کا کارڈ ہی ضائع ہو گا مگر نہیں جانتے کہ اس پیسہ کے نقصان کے ساتھ نامۂ اعمال بھی سیاہ ہو جائے گا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گالیاں دی کیوں جاتی ہیں۔ کیا صرف اس لیے کہ میں کہتا ہوں کہ قرآنِ شریف کو نہ چھوڑو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب نہ کرو۔ غضب کی بات ہے کہ قرآنِ شریف میں لکھا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے اور پھر زمین پر نہیں آئیں گے مگر یہ ماننے میں نہیں آتے اور اس عقیدۂ مخالفتِ قرآن پر اڑتے ہیں۔ اگر میں نہ آیا ہوتا اور خدا تعالیٰ نے ایک سلسلہ قائم نہ کیا ہوتا، تو یہ جو کچھ چاہتے کہتے کیونکہ اُن کو بیدار کرنے والا اور آگاہ کرنے والا ان میں موجود نہ تھا۔ لیکن اب جبکہ خدا تعالیٰ

---

[1] یہ لفظ "اعتراف" ہے۔ سہوِ کاتب سے اعتراض لکھا گیا ہے۔ (مرتب)

نے مجھے مامور کر کے بھیجا ہے اور میں وہی ہوں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حَکم قرار دیا ہے تو پھر میرے فیصلہ پر چون وچرا کرنا ان کا حق نہیں تھا۔ طریق تقویٰ تو یہ تھا کہ میری باتوں کو سنتے اور غور کرتے انکار کے لیے جلدی نہ کرتے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ میرے آنے کے بعد اُن کا حق نہیں ہے کہ یہ زبان کھولیں، کیونکہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوں اور حَکم ہو کر آیا ہوں[1]۔

ابھی بہت زمانہ نہیں گذرا کہ مُقلِّد غیر مقلدوں کی غلطیاں نکالتے اور وہ ان کی غلطیاں ظاہر کرتے اور اس طرح پر دُوسرے فرقے آپس میں درندوں کی طرح لڑتے جھگڑتے تھے۔ ایک دُوسرے کو کافر کہتے اور نجس بتاتے تھے۔ اگر کوئی تسلی کی راہ موجود تھی، تو پھر اس قدر اختلاف اور تفرقہ ایک ہی قوم میں کیوں تھا؟ غلطیاں واقع ہو چکی تھیں اور لوگ حقیقت کی راہ سے دُور جا پڑے تھے۔ ایسے اختلاف کے وقت ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ خود فیصلہ کرتا، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور ایک حَکَمْ اُن میں بھیج دیا۔ اب بتاؤ کہ میں نے کیا زیادتی کی ہے یا کیا قرآن شریف سے کم کر دیا ہے جو میری مخالفت کے لیے اس قدر جوش پیدا ہوا ہے؟

یہ سچ ہے کہ اس وحی کی بناء پر جو خدا تعالےٰ کی کامل اور مجید کتاب کی شرح میں ہے میں نے کہا کہ مسیحؑ مر گیا ہے، لیکن اس کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے؟ کیوں یہ قرآن شریف کو غور سے نہیں پڑھتے۔ کیا اُن کو شرم نہیں آتی ہے کہ یہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ موحد کہلاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء اور خیر البشر تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن جب وہی لفظ تَوَفّی کا آپؐ پر آتا ہے تو اس کے معنے موت کرتے ہیں اور جب مسیح پر آتا ہے تو زندہ مع جسم آسمان پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اُن کی غیرت کو کیا ہوا؟ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہتک کیوں روا رکھتے ہیں؟ کیا قرآن شریف میں نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (یونس: ۴۷) رسُول اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں آیا؟ اور وہی لفظ مسیح کے لیے مُتَوَفِّيْكَ اور فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ میں آیا ہے۔ پھر یہ کیا ہو گیا کہ ایک جگہ کچھ اور معنے اور ایک جگہ کچھ اور۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کمزور نبی سمجھا ہے جو انہیں زمین میں دفن کرتے ہیں اور مسیحؑ کو آسمان پر چڑھاتے ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوتی اور آپؐ کے جلال اور شوکت کے لیے غیرت ہے تو کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہ بھی زندہ آسمان

---

[1] اس مقام پر پہنچ کر حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آواز اور تقریر میں ایک خاص جلال اور شوکت تھی جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، آپؐ کی عظمت جو آپ کے دل میں ہے معلوم ہوتی تھی۔ تقریر میں غیر معمولی زور تھا اور وہ پُر زور دریا کی طرح بہہ رہی تھی۔ پورے طور پر ہم قادر نہیں ہو سکے کہ اس حصہ کو قلمبند کر سکیں تاہم جس قدر کوشش اور سعی سے ہو سکا قلمبند کیا ہے۔ (ایڈیٹر الحکم)

پر اٹھائے گئے ہیں۔ تب میں بھی سمجھ لیتا کہ یہ مسیح کی خصوصیت نہیں ٹھہراتے مگر موجودہ حالت میں میرا دل گوارا نہیں کر سکتا کہ میں قرآنِ شریف کے ایسے معنے کروں جو خود قرآنِ شریف اور لغت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کے خلاف ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتکِ شان کا باعث ہوں۔

میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے یہ لکھا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نہیں وہ کافر ہے وہ سچ کہتا ہے۔

اس خصوصیت کے پیدا کرنے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ تیس لاکھ مُرتد ہوگیا۔ خُدا کے واسطے اس قدر ظلم نہ کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور رُتبہ کو گھٹایا جاوے۔ جو اس عقیدہ سے برابر گھٹتی ہے کہ وہ تو زمین میں دفن کئے گئے اور مسیح آسمان پر اٹھایا گیا۔ مسیح ہرگز زندہ نہیں رہا۔ وُہ مرگیا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ یَا عِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ (آل عمران: ۵۶) اور خود مسیح نے اقرار کر لیا فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ۔ (المائدہ: ۱۱۸)

میں پھر کہتا ہوں کہ عیسائیوں کو اعتراض کا موقعہ نہ دو۔ میری باتوں کو سُنو اور غور سے سُنو اور پھر اپنی جگہ پر جا کر سوچو۔

۳؍ستمبر ۱۹۰۴ء

بمقام لاہور

مذہبی رواداری کی تعریف

حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تیسری تقریر جو حضور نے بارہ ہزار سے زائد آدمیوں کے مجمع میں حاضرین کی بیحد خواہش سے کی:

میں آپ سب صاحبوں کا شکر کرتا ہوں کہ آپ نے نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ میرے لیکچر کو سُنا۔ میں ایک مسافر آدمی ہوں اور کل صبح انشاء اللہ چلا جاؤں گا۔ لیکن میں اس شُکر اور خوشی کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اور یاد رکھوں گا کہ باوجود اختلاف رائے کے (کہ جس کی وجہ سے عموماً جوش پیدا ہو جاتا ہے) آپ نے نیکی اور نیک اخلاقی اور آہستگی سے میرے مضمون کو سُنا۔ میں یہ جانتا ہوں اور خود محسوس کرتا ہوں کہ مدت کے خیالات کو چھوڑنا سہل اور آسان نہیں ہوتا خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ یہ محض اللہ تعالےٰ

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۳۳ صفحہ ۱ تا ۳ مورخہ ۳۰؍ستمبر ۱۹۰۴ء

کے فضل پر موقوف ہے کہ انسان اپنے اندر علمی یا عملی تبدیلی کر سکے۔ لیکن جو اخلاق آپ نے دکھائے ہیں وہ نہایت ہی قابلِ تعریف ہیں اور مَیں دُعا کرتا ہوں کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے عام طور پر یہ اجتماعی رنگ دکھایا ہے وہ ایسا وقت اور زمانہ بھی لا دے کہ دلوں میں بھی اتحاد اور اجتماع ہو اس ملک کو تفرقہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس مُلک کے ہندوؤں اور مُسلمانوں میں بہت بڑا اتحاد اور اتفاق تھا اور باوجود اختلافِ مذاہب بھی ان میں قابلِ قدر میل ملاپ تھا مگر اس زمانہ میں فرق آگیا اور خُدا کرے کہ یہ دُور ہو جاتے۔

یاد رکھو کہ یہ تنگ دلی اور تنگ ظرفی کا نشان ہے کہ انسان اختلافِ شریعت و مذہب کی وجہ سے اخلاق کو بھی چھوڑ دے۔ اختلافِ رائے اور چیز ہے اور اخلاق اور۔ یہ انسانی اخلاق کی خوبی اور کمال ہے کہ باوجود اختلافِ رائے کے اخلاقی کمزوری نہ دکھائے۔ آج کے جلسہ نے مجھے ایک تازہ امید دلائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے تو یہ میل جول ترقی کریگا۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ جبتک طبیعت میں یہ اِستعداد نہیں ہوتی کہ کوئی شخص صبر اور خوش خلقی سے ایک مخالف رائے کو سُن سکے وہ ایسی رائے کو سُن کر چُپ نہیں رہ سکتا اسی لیے یہ خاموشی اور صبر مجھے اُمید دلاتا ہے کہ اچھے نتیجے پیدا ہوں گے۔ یہ بھی خوبی کی بات ہے کہ جب مخالف رائے کو سُنے تو فوراً جواب دینے کو تیار نہ ہو جائے کیونکہ یہ تو محض ہار جیت کی خواہش ہوگی لیکن اس رائے کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے اس پر صبر سے فکر کرنا چاہیے۔ اس سے عِلم و حکمت پیدا ہوتی ہے اور عِلم و حکمت ایسا خزانہ ہے جو تمام دولتوں سے اشرف ہے۔ دُنیا کی تمام دولتوں کو فنا ہے لیکن علم و حکمت کو فنا نہیں ہے پس جو جلدی نہیں کرتا بلکہ فکر کرتا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے کہ اے اللہ اگر مَیں غلطی پر ہوں تو مجھے بصیرت اور معرفت عطا کر۔ وہ اس حکمت کے خزانہ کو محفوظ رکھتا ہے پس مَیں چاہتا ہوں کہ آپ صاحبان اس خزانہ کے حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔

مَیں آپ صاحبوں کی خدمت میں ادب، عجز اور تواضع سے عرض کرتا ہوں کہ یہ جو کچھ سُنایا گیا ہے آپ اس پر توجہ کریں تاکہ میری محنت ضائع نہ ہو۔ جو کچھ میری قلم سے نکلا ہے اور میرے دوست مولوی عبدالکریم صاحب نے پڑھا ہے مَیں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کسی کی دل آزاری یا استخفافِ مذہب کی نیت سے نہیں لکھا بلکہ خدا گواہ ہے اور اس سے بہتر کون گواہ ہو سکتا ہے کہ مَیں نے سچے دل سے لکھا ہے اور بنی نوعِ انسان کی ہمدردی کے لیے لکھا ہے اور مَیں جانتا ہوں کہ ؎

سخن کز دِل بروں آید نشیند لاجرم بر دل

چونکہ فرصت بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نے نہ سُنا ہو اس لیے ہم نے چھپوا دیا ہے اور بشرطِ گنجائش ل

سکتا ہے۔ پس اس کو پڑھ کر توجہ کریں اور مذہبی مخالفت کو عام مخالفت کا ذریعہ نہ بنا دیں۔ مذہب تو اس لیے ہوتا ہے کہ اخلاق وسیع ہوں جیسے خدا تعالیٰ کے اخلاق وسیع ہیں۔ کوئی ہزاروں گالیاں اُسے دے وہ اس پر پتھر نہیں برسا دیتا۔ پس اسی طرح حقیقی مذہب والا تنگ ظرف نہیں ہو سکتا۔ تنگ ظرف خواہ ہندو یا مسلمان یا عیسائی وہ دوسرے بزرگوں کو بھی بدنام کرتا ہے۔ مَیں اس سے منع نہیں کرتا کہ اختلافِ مذہب بیان نہ کرو۔ بیشک نیک نیتی سے اختلاف بیان کرو۔ مگر اس میں تعصب اور کینہ کا رنگ نہ ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات دو چار سال سے نہیں بلکہ صدہا سال سے چلے آتے ہیں۔ اس لیے خدا کرے کہ بہت سے دلوں میں جوش ڈال دے کہ جو ان تعلقات کو دُور نہ ہونے دیں۔

یہ بھی یاد رکھو کہ مذہب صرف قیل و قال کا نام نہیں بلکہ جبتک عملی حالت نہ ہو کچھ نہیں۔ خدا اس کو پسند نہیں کرتا۔ جس قدر بزرگ اسلام میں یا ہندوؤں میں اوتار وغیرہ گذرے ہیں ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے عمل سے اُن سچائیوں کو جن کا وہ وعظ کرتے تھے ثابت کر دکھایا ہے۔ قرآنِ شریف بھی یہی تعلیم ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (المائدة : ۱۰۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو درست کرو۔ جس شخص کے اندر خود روشنی اور نُور نہیں ہے وہ اگر زبان سے کام لے گا تو وہ مذہب کو بچوں کا کھیل بنا دے گا اور حقیقت میں ایسے ہی مصلحوں سے ملک کو نقصان پہنچا ہے۔ ان کی زبان پر تو منطق اور فلسفہ جاری رہتا ہے مگر اندر خالی ہوتا ہے۔

مصلح کی صفات

خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ مَیں نہایت خیرخواہی سے کہہ رہا ہوں خواہ کوئی میری باتوں کو نیک ظنی سے سُنے یا بدظنی سے، مگر مَیں کہوں گا کہ جو شخص مصلح بننا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ پہلے خود روشن ہو اور اپنی اصلاح کرے۔ دیکھو یہ سُورج جو روشن ہے پہلے اس نے خود روشنی حاصل کی ہے۔ مَیں یقیناً سمجھتا ہوں کہ ہر ایک قوم کے معلّم نے یہی تعلیم دی ہے، لیکن اب دوسرے پر لاٹھی مارنا آسان ہے، لیکن اپنی قربانی دینا مشکل ہو گیا ہے۔ پس جو چاہتا ہے کہ قوم کی اصلاح کرے اور خیرخواہی کرے۔ وہ اسکو اپنی اصلاح سے شروع کرے۔ قدیم زمانہ کے رشی اور اوتار جنگلوں اور بَنوں میں جاکر اپنی اصلاح کیوں کرتے تھے وہ آجکل کے لیکچراروں کی طرح زبان نہ کھولتے تھے جبتک خود عمل نہ کر لیتے تھے۔ یہی خدا تعالیٰ کے قُرب اور محبت کی راہ ہے۔ جو شخص دل میں کچھ نہیں رکھتا اس کا بیان کرنا پرنالہ کے پانی کی طرح ہے، جو جھگڑے پیدا کرتا ہے اور جو نُورِ معرفت اور عمل سے بھر کر بولتا ہے وہ بارش کی طرح ہے جو رحمت سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت میری نصیحت یاد رکھیں۔ آج کے بعد آپ مجھے یہاں نہ دیکھیں گے اور مَیں نہیں جانتا کہ پھر موقعہ ہو یا نہ ہو، لیکن ان تفرقوں کو مٹانے کی کوشش کرو۔ میری نسبت خواہ آپ کا کچھ ہی خیال ہو لیکن یہ سمجھ کر کہ ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
در نوشت است پند بر دیوار

میری نصیحت پر عمل کرو۔ جو شخص خود زہر کھا چکا ہے وُہ دوسروں کی زہر کا کیا علاج کرے گا۔ اگر علاج کرتا ہے تو خود بھی مرے گا اور دُوسروں کو بھی ہلاک کرے گا کیونکہ زہر اس میں اثر کر چکا ہے اور اس کے حواس چونکہ قائم نہیں رہے، اس لیے اس کا علاج بجائے مفید ہونے کے مضر ہوگا۔ غرض جس قدر تفرقہ بڑھتا جاتا ہے اس کا باعث وہی لوگ ہیں جنھوں نے زبانوں کو تیز کرنا ہی سیکھا ہے۔

دُوسرے مذاہب کی حیثیت

یہ بھی یاد رکھو کہ میرا یہ مذہب نہیں کہ اسلام کے سوا سب مذاہب بالکل جھوٹے ہیں۔ مَیں یہ یقین رکھتا ہوں کہ وُہ خدا جو مخلوق کا خدا ہے وہ سب پر نظر رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی قوم کی پرواہ کرے اور دُوسروں پر نظر نہ کرے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ حاکم کے دورے کی طرح کبھی کسی قوم پر وہ وقت آجاتا ہے اور کبھی کسی پر۔ مَیں کسی کے لیے نہیں کہتا۔ خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایسا ہی ظاہر کیا ہے کہ راجہ رامچندر اور کرشن جی وغیرہ بھی خدا کے راستباز بندے تھے اور اس سے سچا تعلق رکھتے تھے۔ مَیں اس شخص سے بیزار ہوں جو ان کی نِندیا یا توہین کرتا ہے۔ اس کی مثال کنوئیں کے مینڈک کی سی ہے جو سمندر کی وسعت سے ناواقف ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کے صحیح سوانح معلوم ہوتے ہیں اس سے پایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں مجاہدات کیے اور کوشش کی کہ اس راہ کو پائیں جو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی حقیقی راہ ہے پس جس شخص کا یہ مذہب ہو کہ وہ راستباز نہ تھے وہ قرآن شریف کے خلاف کہتا ہے کیونکہ اس میں فرمایا ہے وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ (فاطر: ۲۵) یعنی کوئی قوم اور اُمّت ایسی نہیں گذری جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔ مَیں بابا نانک صاحب کو بھی خُدا پرست سمجھتا ہوں اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ ان کو بُرا کہا جاتے۔ مَیں ان کو ان لوگوں میں سے سمجھتا ہوں جن کے دل میں خدا تعالیٰ اپنی محبت آپ بٹھا دیتا ہے۔ پس ان لوگوں کی پیروی کرو۔ اور دل کو روشن کرو۔ پھر دوسروں کی اصلاح کے لیے زبان کھولو۔ اس ملک کی شائستگی اور خوش قسمتی کا زمانہ تب آئے گا جب نری زبان نہ ہوگی۔ بلکہ دل پر دار و مدار ہوگا۔ پس اپنے تعلقات خدا تعالیٰ سے زیادہ کرو۔ یہی تعلیم سب نبیوں نے دی ہے اور یہی میری نصیحت ہے۔ اگر در خانہ کس است حرفے بس است۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ صفحہ ۷ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء

۱۷؍ اکتوبر ۱۹۰۴ء بمقام قادیان بعد نماز مغرب

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہ نشین پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا کہ:

میرے سر کی حالت آج بھی اچھی نہیں، چکر آرہا ہے۔ جب جماعت کا وقت آتا ہے۔ تو اس وقت خیال گذرتا ہے کہ سب جماعت ہوگی اور مَیں شامل نہ ہوں گا اور افسوس ہوتا ہے۔ اس لیے افتاں خیزاں چلا آتا ہوں۔

چند اصحاب اپنی مستورات کے علاج کے لیے لاہور تشریف لے گئے ہوتے تھے اور انجام کار معلوم ہوا کہ مِس ڈاکٹروں کے علاج سے کوئی فرق مرض میں معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ:

چونکہ یہ لوگ متدین نظر نہیں آتے۔ اس لیے خطرہ ہے کہ کوئی اور تکلیف نہ بڑھ جاوے۔ انکو کہہ دو کہ چلے آویں۔ شافی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دائیوں کا دستور ہوتا ہے کہ محض روپیہ بٹورنے کی خاطر وہ مرض کو بڑھاتی جاتی ہیں۔ قادیان کی آب و ہوا لاہور کی نسبت بہت عمدہ ہے۔ اس سے اُن کو فائدہ ہوگا۔ ہم یہ اس لیے کہتے ہیں کہ جو بات دل میں آوے اُسے مخفی رکھا جاوے تو یہ ایک قسم کی خیانت ہے۔

بعض امراض کا علاج

عورتوں کے بعض امراض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُن کے علاج کے لیے کھُلی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے بعض رؤسا میں جو اشد درجہ کا پردہ رائج ہے، مَیں اس کے خلاف ہوں۔ بعض عورتوں کو بعض وقت کھُلی ہوا میں پھرانا چاہیے۔ دیکھو حضرت عائشہ صدیقہؓ رفع حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں کیا پھر آجکل کے رؤساء کی عورتیں اُن سے بڑھ کر ہیں؟

حضرت حکیم نورالدین صاحب نے فرمایا کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مراق کے تین علاج ہیں۔ اوّل چلنا پھرنا۔ دُوسرے بیکار نہ رہنا۔ کسی نہ کسی شغل میں مصروف رہنا۔ تیسرے ہینگ اور اَلمِنتین کا استعمال۔

حصُولِ اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ کے فضل ہی کی ضرورت ہے اور قرآن شریف اور تورات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ بہت ضعیف تھیں اور ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی نسبت تورات میں لکھا ہے کہ خداوند نے کہا کہ مَیں نے اس کے رحم کو کھولا۔[1]

---

[1] پیدائش باب ۳۰ آیت ۲۲۔

پس خدا تعالیٰ ہی کھولے تو کُھل سکتا ہے۔

(مگر یاد رہے کہ اس تقریر سے دائیوں کے علاج کی حُرمت نہ سمجھی جائے۔)[1]

۱۹؍اکتوبر ۱۹۰۴ء

سیالکوٹ سے احمدی جماعت کی طرف سے دعوت کا پیغام آیا۔ آپ نے فرمایا کہ:

تین چار روز کے بعد جواب دُوں گا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام استخارہ کے بعد روانگی کی تاریخ مقرر کریں گے۔[2]

۲۰؍اکتوبر ۱۹۰۴ء . بوقت ظہر

تجارتی روپیہ پر منافع

ایک صاحب کی خاطر حضرت حکیم نورالدین صاحبؓ نے ایک مسئلہ حضرت اقدس علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ ایک شخص ہیں جن کے پاس بیس بائیس ہزار کے قریب روپیہ موجود ہے۔ ایک سکھ ہے وہ ان کا روپیہ تجارت میں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ان کے اطمینان کے لیے اس نے تجویز کی ہے کہ یہ روپیہ بھی اپنے قبضہ میں رکھیں لیکن جس طرح وہ ہدایت کرے۔ اسی طرح ہر ایک شئے خرید کر جہاں کہے وہاں روانہ کریں اور جو روپیہ آوے وہ امانت رہے۔ سال کے بعد وہ سکھ دو ہزار چھ سو روپیہ ان کو منافع کا دے دیا کرے گا۔ یہ اس غرض سے یہاں فتویٰ دریافت کرنے آئے ہیں کہ یہ روپیہ جو اُن کو سال کے بعد ملے گا اگر سُود نہ ہو تو شراکت کر لی جاوے۔

حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا کہ:

چونکہ اُنھوں نے خود بھی کام کرنا ہے اور ان کی محنت کو دخل ہے اور وقت بھی صرف کریں گے اسلئے ہر ایک شخص کی حیثیت کے لحاظ سے اس کے وقت اور محنت کی قیمت ادا ہوا کرتی ہے۔ دس دس ہزار اور دس دس لاکھ روپیہ لوگ اپنی محنت اور وقت کا معاوضہ لیتے ہیں۔ لہذا میرے نزدیک تو یہ روپیہ جو اُن کو وہ دیتا ہے سُود نہیں ہے۔ اور مَیں اس کے جواز کا فتویٰ دیتا ہوں۔ سُود کا لفظ تو اس روپیہ پر دلالت کرتا ہے جو مُفت بلا محنت کے (صرف روپیہ کے معاوضہ میں) لیا جاتا ہے۔ اب اس

[1،2] البدر جلد ۳ نمبر ۴۰ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۴ء

ملک میں اکثر مسائل زیر و زبر ہو گئے ہیں۔ کُل تجارتوں میں ایک نہ ایک حصّہ سُود کا موجود ہے۔ اسلئے اس وقت نئے اجتہاد کی ضرورت ہے[1]۔

احباب کی ضروریات کا خیال

ظُہر کی نماز سے پیشتر حضُور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کچھ روپے جن کی تعداد غالبًا آٹھ یا دس ہو گی ایک مخلص مہاجر کو یہ کہہ کر دیئے کہ چونکہ موسم سرما ہے آپ کو کپڑوں کی ضرورت ہو گی۔ اس مہاجر کی طرف سے کوئی سوال نہ تھا۔ خود حضُور علیہ السلام نے ان کی ضرورت کو محسوس کر کے یہ رقم عطا کی جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کو مخلص خدام کی ضرورت کا کس قدر خیال ہے۔

گناہوں سے معصوم انبیاء ہیں۔ لیکن دُوسرے لوگ توبہ و استغفار کے ذریعہ سے اُن سے مشابہت پیدا کر لیتے ہیں[2]۔

۲۱؍اکتوبر ۱۹۰۴ء

اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے

ایک صاحب کے رشتہ دار کسی وجہ سے قید ہو گئے تھے۔ ان کے ذکر پر حضرت حکیم نورالدین صاحبؓ نے عرض کی کہ مَیں نے اُن سے یہ کہا ہے کہ اُسے خود استغفار کی تاکید کی جاوے اس پر حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا کہ :

بعض لوگ جو استغفار کے لائق ہیں وُہ تو استغفار کرتے ہیں اور دُوسروں کو محض خدا تعالیٰ کی رحمت سے بھی رہائی مل جایا کرتی ہے۔ جن کی طبیعت میں کجی ہے ان کے لیے اس کی رحمت وسیع ہے۔

---

[1] جو صاحب اس مسئلہ کو دریافت کرنے آئے تھے اُن کی دینداری واقع میں قابلِ رشک ہے کہ اسوقت جبکہ مُسلمانوں نے حلال و حرام کی تمیز کو خیرباد کہہ کر صرف زراندوزی کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے یہ صاحب استفسار کیلئے اِسقدر سفر دراز طے کر کے آئے۔ صرف اس غرض سے کہ کہیں اس لین دین میں سُود نہ ہو جاوے۔ اللہ تعالیٰ اس زمانہ کے کُل اہلِ اسلام کو اس قسم کی توفیق دیوے کہ وہ اپنے معاملات میں دین کو مقدم رکھیں۔ آمین (ایڈیٹر)

[2] البدر جلد ۲ نمبر ۴۱، ۴۲ صفحہ ۸ مورخہ یکم و ۸؍نومبر ۱۹۰۴ء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فارسی کا ایک الہام

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نے دریافت کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے کبھی فارسی زبان میں بھی کلام کی ہے۔ تو آپؑ نے فرمایا۔ ہاں۔ ایک دفعہ یہ فقرہ الہام ہوا تھا ؎

این مُشتِ خاک را گر نہ بخشم چہ کنم

رُوس اور جاپان کی جنگ

اِس جنگ کے ذکر پر حضرت حکیم نورالدین صاحب نے بیان کیا کہ اس قدر خونخوار جنگ ہے کہ ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہیں؛ حالانکہ دونوں سلطنتوں کا مذہب ایسا ہے جس کی رُو سے اس جنگ کی مطلق نوبت ہی نہ آنی چاہیے۔ جاپان کا بُدھ مذہب ہے اور اس کی رُو سے ایک چیونٹی کا مارنا بھی گناہ ہے۔ رُوس عیسائی[1] ہے اور اُن کو چاہیے کہ مسیح کی تعلیم کے بموجب اگر جاپان ایک مقام پر قبضہ کرے تو دُوسرا مقام خود اس کے حوالہ کر دیں۔

چند عیسائیوں سے گفتگو

آج تین عیسائی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کے لیے تشریف لائے۔ ایک نوجوان تھے جو کہ ایک صاحب کے بچے تھے اور باقی میں سے ایک صاحب ڈاکٹر تھے۔ جو کہ ضعیف العمر تھے اور ایک قاضی صاحب پشاوری جوان مرد تھے۔ ایک صاحب ان میں سے وہ تھے جنھوں نے تحقیقِ مذاہب کی بناء پر نیازمندانہ طور پر حضرت اقدس سے کسی زمانہ میں خط و کتابت کی تھی جس کی وجہ سے انکو کمال شوق حضور علیہ السلام کی زیارت کا تھا۔ خانقاہوں میں سے ایک مشہور خانقاہ ہے جہاں اکثر لوگ مشرکانہ عقائد کی بناء پر زیارت وغیرہ کے لیے جاتے ہیں۔ وہاں کی نسبت ایک عیسائی صاحب نے ذکر کیا کہ جالندھر کے ضلع کے لوگوں کے لیے وہ یہ کیا کرتے ہیں کہ ایک سفید کبوتر کی ٹانگیں کمزور کر کے قبر پر بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحبِ مزار کی رُوح اس میں حلول کر آئی ہے اس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ:

یہ کبوتر پیچھا نہیں چھوڑتا

---

[1] اُس وقت رُوس کا مذہب عیسائی تھا۔ (مُرتّب)

اِس کے بعد حضرت اقدس اور عیسائی صاحبوں میں ذیل کی گفتگو ہوئی جس میں اکثر رُوئے سخن ڈاکٹر صاحب کی طرف ہی تھا۔

حضرت اقدس۔ ادھر آپ کا آنا کس تقریب پر ہوا ؟

ڈاکٹر صاحب۔ صرف زیارت کی غرض سے کیونکہ ایک عرصہ سے شوق تھا۔

حضرت اقدس۔ مگر تاہم ایسی کونسی تقریب ہوئی کہ آپ ادھر آ گئے ؟

ڈاکٹر صاحب۔ مَیں نے رُخصت لی تھی اور بال بچوّں کو لے کر آیا تھا۔ وُہ لاہور میں ہیں اور خود ادھر آیا ہوں۔ بڑا باعث رخصت کا آپ کی ملاقات ہی تھی۔

حضرت اقدس۔ اب رُخصت کے کتنے دن باقی ہیں ؟

مفتی صاحب۔ (حساب کر کے) ۱۰ دن باقی ہیں۔

حضرت اقدس۔ تو اب آپ کو یہ ایام یہاں ہمارے پاس ہی گذارنے چاہئیں۔

حکیم نورالدین صاحب۔ یہ تو آج ہی رخصت ہوتے تھے مگر رات کو مَیں نے رکھ لیا ہے۔

حضرت اقدس۔ جب رُخصت ہمارے لیے لی تو پھر رخصت کے ایام ہمارے پاس گذارنے چاہئیں۔

عیسائی قاضی صاحب۔ اتنی فرصت نہیں۔ زیارت مقصود تھی سو ہو گئی۔

حضرت اقدس۔ ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے۔ اب پھر کیا صلاح ہے۔ کتنے دن رہو گے ؟

عیسائی قاضی صاحب نے پھر جلدی جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

حضرت اقدس۔ یہ مہمان داری کے ادب کے خلاف ہے اور آپ کے ارادے کے بھی برخلاف ہے کہ اس قدر جلدی کی جاوے۔ میرا ارادہ جمعرات کو سیالکوٹ جانے کا ہے تب تک رہیں۔ پھر اکٹھے چلیں گے۔[1]

اس اثنا میں نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت اقدس نے حکم فرمایا کہ ان کی خوابگاہ اور بستر اور خوراک وغیرہ کا اہتمام بہت عمدہ طور سے کر دیا جاوے کہ کوئی تکلیف نہ ہو اور ہر سہ صاحبان تشریف لے گئے۔ دُوسرے دن احمدی عمارات اور کارخانوں کو دیکھ کر رخصت ہو گئے۔

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۴۱، ۴۲ صفحہ ۸ مورخہ یکم و ۸ ؍ نومبر ۱۹۰۴ء

۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۴ء

ایک شخص بیمار کا ذکر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ؛

انسان حالتِ تندرستی میں صحت کی قدر نہیں کرتا (کہ ان ایام میں اپنے تعلقات اللہ تعالےٰ سے مضبوط کرے تاکہ وہ ہر طرح اس کا حافظ و ناصر ہو[1]) اور جب بیمار ہوتا ہے تو پھر دوبارہ صحت اس لیے طلب کرتا ہے کہ انہی دُنیا کے اُمور میں مبتلا ہو (اگر اس کا ارادہ خدمتِ دین ہو تو اس کا صحت طلب کرنا گویا منشائے الہٰی کے مطابق ہوگا۔[1])

اسی بیمار کی نسبت ذکر ہوا کہ اس نے کئی سَو روپیہ لوگوں سے لینا ہے، مگر صرف چند روپوں کے کاغذات ہیں باقی تمام زبانی لین دین ہے اور اس کی دو لڑکیاں ہیں بعض احباب نے تجویز کیا کہ جو کچھ رقوم لوگوں کے ذمہ ہیں اور وہ تحریر میں نہیں آئیں تو چاہیے کہ اب دو آدمی گواہ مقرر کرکے اس کی زندگی میں وہ رقمیں ان مقروضوں کی منوا لی جاویں۔ اور تحریر کروا لیا جاوے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ؛

اس کی ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بڑے ثواب کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ اگر وہ مَر جاوے تو بیچاری لڑکیوں کو ہی کچھ فائدہ پہنچ جاوے۔

اِسلام میں مساوات

اہلِ اسلام کی وحدت اور اخوت پر ذکر ہوا کہ عیسائیوں نے بھی اس خوبی کو تسلیم کیا ہے کہ مسلمان لوگ جب مسجد میں داخل ہو جاویں تو اُن میں بادشاہ اور امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں رہتی اور کسی کو حق نہیں کہ کسی قسم کا امتیاز کرے؛ حالانکہ عیسائیوں کے گرجے اس سے محروم ہیں۔ خاص انگریزوں کے گرجوں میں عام عیسائی لوگ داخل نہیں ہو سکتے۔ پھر گرجوں میں درجہ بدرجہ چوکیاں لگی ہوتی ہیں اور رومن کیتھولک تو نشستگاہوں پر نام بھی لکھ دیتے ہیں۔

---

[1] [1] بریکٹ کے اندر کی عبارت ایڈیٹر کی طرف سے معلوم ہوتی ہے؛ ورنہ اگر حضورؑ ہی کے فقرات ہوتے تو بریکٹ میں دینے کی ضرورت نہ تھی۔ حضور کی ڈائریوں میں بالعموم یہ طریق چلتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
(مُرتّب)

اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ:
مسلمانوں کے معبد میں یہ ایک بے نظیر نمونہ ہے کہ سب کو یکساں نظر سے دیکھا جاتا ہے۔
مولٰنا حکیم نورالدین صاحب نے عرض کی کہ ہماری مسجد میں تو خود امام الوقت بھی مقتدی بنکر نماز پڑھتا ہے۔

مہمان خانہ کے منتظمین کے لیے ہدایات

مہمان کی تواضع کے متعلق آپ نے فرمایا کہ:

لنگر خانہ کے مہتمم کو تاکید کر دی جاوے کہ وہ ہر ایک شخص کی احتیاج کو مدِ نظر رکھے مگر چونکہ وہ اکیلا آدمی ہے اور کام کی کثرت ہے ممکن ہے کہ اُسے خیال نہ رہتا ہو، اس لیے کوئی دُوسرا شخص یاد دلا دیا کرے۔ کسی کے میلے کپڑے وغیرہ دیکھ کر اس کی تواضع سے دست کش نہ ہونا چاہیے، کیونکہ مہمان تو سب یکساں ہی ہوتے ہیں اور جو نئے ناواقف آدمی ہیں تو یہ ہمارا حق ہے کہ اُن کی ہر ایک ضرورت کو مدِ نظر رکھیں۔ بعض وقت کسی کو بیت الخلا کا ہی پتہ نہیں ہوتا تو اُسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مہمانوں کی ضروریات کا بڑا خیال رکھا جاوے۔ مَیں تو اکثر بیمار رہتا ہوں، اس لیے معذور ہوں۔ مگر جن لوگوں کو ایسے کاموں کے لیے قائمقام کیا ہے یہ ان کا فرض ہے کہ کسی قسم کی شکایت نہ ہونے دیں۔ کیونکہ لوگ صدہا اور ہزارہا کوس کا سفر طے کرکے صدق اور اخلاص کے ساتھ تحقیقِ حق کے واسطے آتے ہیں۔ پھر اگر اُن کو یہاں تکلیف ہو تو ممکن ہے کہ رنج پہنچے اور رنج پہنچنے سے اعتراض بھی پیدا ہوتے ہیں اس طرح سے ابتلا کا موجب ہوتا ہے۔ اور پھر گناہ میزبان کے ذمہ ہوتا ہے۔

بیان کیا گیا کہ حضور بعض لوگ جو مسافر خانہ میں نوواردوں سے مذہبی مناظرے شروع کر دیتے ہیں اور اس میں وہ اپنے خیال اور رائے کے موافق کلام کرتے ہیں جو کہ بعض اوقات بے محل اور حضور کے منشا کے خلاف بھی ہوتی ہے اور نووارد متلاشی بھی اس سے اندازہ لگاتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کا یہی مشرب ہوگا، حالانکہ یہ بالکل غلطی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ نوواردوں کے لیے ابتلا ہوتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تجویز فرمایا کہ:
اس قسم کی کلام ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ ہمارے بعض مناظرین کو چونکہ نصاریٰ کے ساتھ کلام کرنی پڑتی

ہے اور جب وُہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسرِشان کرتے ہیں تو محل اور موقعہ کے لحاظ سے اُن کو یسُوع کی نسبت اسی قسم کے ثبوت دینے پڑتے ہیں۔ اور وُہ مقتضائے وقت ہوتا ہے مگر ہر ایک آدمی اس کا اہل نہیں ہے اور دُوسرے لوگ اکثر کسی نبی کی شان میں بھی کوئی کلمہ گستاخی یا بے ادبی کا استعمال کرتے ہیں، تو وہ گناہ کرتے ہیں۔ یہ کبھی نہ گمان کرنا چاہیے کہ حضرت مسیحؑ یا دُوسرے انبیاء ایک معمولی آدمی تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور مقرب تھے۔ قرآنِ شریف نے مصلحت اور موقعہ کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک لفظ اسی قسم کا بیان فرمایا ہے کہ جہاں آپ کے بہت سے انوار و برکات اور فضائل بیان کیے ہیں وہاں.... بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکھف: ۱۱۱) بھی کہہ دیا ہے مگر اس کے یہ ہرگز معنے نہیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقعہ ہی عام آدمیوں جیسے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ آپ کی شان میں اس لیے استعمال فرمایا کہ دُوسرے انبیاء کی طرح آپ کی پرستش نہ ہو اور آپ کو خدا نہ بنایا جاوے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ آپؐ کے فضائل و مراتب ہی سلب کر دیئے جاویں۔[1]

آخر کار تجویز ہوا کہ ایک صاحب ذی وجاہت و ذی اثر کے ہاتھ میں مہمانوں کی تواضع کا اہتمام دیا جاوے۔

۲۳؍اکتوبر ۱۹۰۴ء

(بوقت ظہر)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے تصویری کارڈ

ظہر کے وقت مفتی محمد صادق صاحب نے حضرت اقدس علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص کی تحریری درخواست بذریعہ کارڈ کے ان الفاظ میں پیش کی۔ کہ یہ شخص حضوُر کی تصویر کو خط و کتابت کے کارڈوں پر چھاپنا چاہتے ہیں اور اجازت طلب کرتے ہیں۔

اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ:

مَیں تو اسے ناپسند کرتا ہوں

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۴۰ صفحہ ۱، ۲ مورخہ ۲۴؍نومبر ۱۹۰۴ء
نیز البدر جلد ۳ نمبر ۴۱-۴۲ صفحہ ۹ مورخہ یکم و ۸؍نومبر ۱۹۰۴ء

یہ الفاظ جا کر میں نے اپنے کانوں سے سُنے۔ لیکن حضرت مولوی نورالدین صاحب اور حکیم فضل دین صاحب بیان کرتے ہیں کہ اس سے پیشتر آپ نے یہ الفاظ فرمائے کہ:

یہ بدعت بڑھتی جاتی ہے۔ میں اسے ناپسند کرتا ہوں[1]

۲۷؍اکتوبر ۱۹۰۴ء

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سیالکوٹ تشریف لے جا رہے تھے۔ بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر جماعت بٹالہ نے آکر شرفِ نیاز حاصل کیا۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کوئی محنت و تکلیف نہ اُٹھانی پڑے اور کمال حاصل ہو جائے اس پر حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ[2]:

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۴۱-۴۲ صفحہ ۹ مورخہ یکم و ۸ نومبر ۱۹۰۴ء

[2] بدر میں یہ ڈائری ان الفاظ میں ہے۔

بٹالہ اسٹیشن پر حضرت اقدس چہل قدمی فرما رہے تھے کہ ایک ضعیف العمر صاحب نے جن کو حضرت اقدس سے شاید کوئی دیرینہ تعارف ہوگا۔ ملاقات کی طرزِ کلام سے جو مجھے سُننے کا اتفاق ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ روحانی فیوض کے حصول کے لیے وہ صاحب خواستگار تھے اور حضرت اقدس شاید اُن کو کہتے تھے کہ قادیان آرہو اور ان دنیاوی مخصوں کو ترک کر دو۔

اس پر ان صاحب نے کہا کہ آپ وہاں ہی دعا کر سکتے ہیں۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

دُعا تب کام کرتی ہے جب انسان کی کوشش بھی ساتھ ہو۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ پھونک مار کر ولی بنا دیا جاوے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ پھونک بھی اسی آدمی کو لگتی ہے جو نزدیک آوے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بغیر انسان کی سعی کے کچھ ہو جاوے۔ قرآن شریف میں ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم: ۴۰) اور دل کی ہر ایک حالت کے لیے ایک ظاہری عمل کا نشان ضرور ہوتا ہے۔ جب دل پر غم کا غلبہ ہو تو آنسو نکل آتے ہیں۔ اسی لیے شریعت نے ثبوت کا مدار ایک شہادت پر نہیں رکھا۔ جبتک دوسرا گواہ بھی نہ ہو۔ پس جبتک ظاہر و باطن ایک نہ ہو۔ تب تک کچھ نہیں بنتا۔

پوچھا کہ آپ کب واپس ہوں گے؟ فرمایا۔ رفتن بہ ارادت و آمدن بہ اجازت۔

طاعون کے ذکر پر فرمایا کہ:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حصولِ کمال کے لیے مجاہدہ شرط ہے

اس قسم کے لوگ ہمیشہ گذرے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بغیر کسی قسم کی محنت اور تکلیف اور سعی اور مجاہدہ کے وہ کمالات حاصل کریں جو مجاہدات سے حاصل ہوتے ہیں۔ صوفیاء کرام کے حالات میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے آکر اُن سے کہا کہ کوئی ایسا انتظام ہو کہ ہم پھُونک مارنے سے ولی ہو جاویں۔ ایسے لوگوں کے جواب میں انھوں نے یہی فرمایا کہ پھُونک کے واسطے بھی تو قریب ہونے کی ضرورت ہے، کیونکہ پھُونک بھی دُور سے نہیں لگتی۔

قرآنِ شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم : ۴۰) یعنی کوئی انسان بغیر سعی کے کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ خدا تعالیٰ کا مقرر کردہ قانون ہے۔ پھر اس کے خلاف اگر کوئی کچھ حاصل کرنا چاہے تو وہ خدا تعالیٰ کے قانون کو توڑتا ہے اور اسے آزماتا ہے۔ اس لیے محروم رہے گا۔ دُنیا کے عام کاروبار میں بھی تو یہ سلسلہ نہیں ہے کہ پھونک مار کر کچھ حاصل ہو جائے یا بدُوں سعی اور مجاہدہ کے کوئی کامیابی مل سکے۔ دیکھو۔ آپ شہر سے چلے تو اسٹیشن پر پہنچے۔ اگر شہر سے ہی نہ چلتے تو کیونکر پہنچتے۔ پاؤں کو حرکت دینی پڑتی ہے یا نہیں؟ اسی طرح سے جس قدر کاروبار دُنیا کے ہیں سب میں اوّل انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی برکت ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ کی راہ میں وہی لوگ کمال حاصل کرتے ہیں جو مجاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۷۰) پس کوشش کرنی چاہیے کیونکہ مجاہدہ ہی کامیابیوں کی راہ ہے۔[1]

۲۸؍اکتوبر ۱۹۰۴ء بعد نماز جمعہ

بیعت کی اہمیت

یہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے بیعت کی ہے چند نصیحت آمیز کلمات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۔ ۔ لوگوں کی شقاوت کی ایک یہ نشانی ہے کہ نزولِ بلا پر بجائے اس کے کہ استغفار کریں۔ جھوٹی تاویلوں سے دل کو تسلّی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں بیماری ہوا ہی کرتی ہے۔ یہ دہریّت کی علامت ہے یعنی وہ لوگ اس میں تصرفِ الٰہی کو نہیں مانتے۔ پھر یہ تاویل کرتے ہیں کہ دیکھو چین اور لنڈن میں نہیں۔ کم بختوں کو یہ خیال نہیں کہ اپنے نفس کی اصلاح اور فکر کریں اور چین اور لنڈن کی فکر پڑ جاتی ہے۔

البدر جلد ۳ نمبر ۴۱، ۴۲ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم و ۸ نومبر ۱۹۰۴ء

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸-۳۹ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰، ۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء

کہنا چاہتا ہوں یہ بیعت تخم ریزی ہے اعمالِ صالحہ کی۔ جس طرح کوئی باغبان درخت لگاتا ہے یا کسی چیز کا بیج بوتا ہے۔ پھر اگر کوئی شخص بیج بو کر یا درخت لگا کر وہیں اس کو ختم کر دے اور آئندہ آبپاشی اور حفاظت نہ کرے تو وہ تخم بھی ضائع ہو جاوے گا۔ اسی طرح انسان کے ساتھ شیطان لگا رہتا ہے۔ پس اگر انسان نیک عمل کر کے اس کے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کرے تو وہ عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ تمام مخلوقات مثلاً مسلمان ہی سہی اپنے مذاہب کے فرائض میں پابند ہیں مگر اس میں کوئی ترقی نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیک عمل کے بڑھانے کا خیال اُن کو نہیں ہوتا اور رفتہ رفتہ وہ عمل رسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ پس مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے تو کلمہ پڑھنے لگے۔ ہندوؤں کے گھر میں ہوتے تو رام رام کرتے۔

یاد رکھو بیعت کے وقت توبہ کے اقرار میں ایک برکت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ساتھ اُس کے دین کو دُنیا پر مقدم رکھنے کی شرط لگا لے تو ترقی ہوتی ہے۔ مگر یہ مقدم رکھنا تمہارے اختیار میں نہیں بلکہ امدادِ الٰہی کی سخت ضرورت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ (العنکبوت : ۷۰) کہ جو لوگ کوشش کرتے ہیں۔ ہماری راہ میں انجام کار راہنمائی پر پہنچ جاتے ہیں۔ جس طرح وہ دانہ تخم ریزی کا بدوں کوشش اور آبپاشی کے بے برکت رہتا بلکہ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تم بھی اس اقرار کو ہر روز یاد نہ کرو گے اور دُعائیں نہ مانگو گے کہ خدایا ہماری مدد کر تو فضلِ الٰہی وارد نہیں ہوگا اور بغیر امدادِ الٰہی کے تبدیلی ناممکن ہے۔ چور، بدمعاش، زانی وغیرہ جرائم پیشہ لوگ ہر وقت ایسے نہیں رہتے بلکہ بعض وقت ان کو ضرور پشیمانی ہوتی ہے۔ یہی حال ہر بدکار کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان میں نیکی کا خیال ضرور ہے۔ پس اس خیال کے واسطے اس کو امدادِ الٰہی کی بہت ضرورت ہے۔ اسی لیے پنجوقتہ نماز میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا حکم دیا۔ اس میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ اور پھر اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی عبادت بھی تیری ہی کرتے ہیں اور مدد بھی تجھ ہی سے چاہتے ہیں۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی ہر نیک کام میں قویٰ، تدابیر، جدوجہد سے کام لیں۔ یہ اشارہ ہے نَعْبُدُ کی طرف۔ کیونکہ جو شخص نِری دُعا کرتا اور جدوجہد نہیں کرتا وہ بہرہ یاب نہیں ہوتا۔ جیسے کسان بیج بو کر اگر جدوجہد نہ کرے تو پھل کا امیدوار کیسے بن سکتا ہے۔ اور یہ سنّت اللہ ہے۔ اگر بیج بو کر صرف دُعا کرتے ہیں تو ضرور محروم رہیں گے۔ مثلاً دو کسان ہیں ایک تو سخت محنت اور کلبہ رانی کرتا ہے۔ یہ تو ضرور زیادہ کامیاب ہوگا۔ دُوسرا کسان محنت نہیں کرتا یا کم کرتا ہے۔ اس کی پیداوار ہمیشہ ناقص رہے گی جس سے وہ شاید سرکاری محصول بھی ادا نہ کر سکے اور وہ ہمیشہ مفلس رہے گا۔ اسی طرح دینی کام بھی ہیں۔ انہیں میں منافق، انہیں میں نکمے، انہیں میں صالح، انہیں میں ابدال، قطب، غوث بنتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ

کے نزدیک درجہ پاتے ہیں۔ اور بعض چالیس چالیس برس سے نماز پڑھتے ہیں مگر ہنوز روزِ اوّل ہی ہے اور کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تیس روزوں سے کوئی فائدہ محسوس نہیں کرتے۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ ہم بڑے متقی اور مدت کے نماز خواں ہیں مگر ہمیں امدادِ الٰہی نہیں ملتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رسمی اور تقلیدی عبادت کرتے ہیں۔ ترقی کا کبھی خیال نہیں۔ گناہوں کی جستجو ہی نہیں سچّی توبہ کی طلب ہی نہیں۔ پس وہ پہلے قدم پر ہی رہتے ہیں۔ ایسے انسان بہائم سے کم نہیں۔ ایسی نمازیں خدا کی طرف سے وَیل لاتی ہیں۔ نماز تو وُہ ہے جو اپنے ساتھ ترقی لے آوے۔ جیسے طبیب کے زیرِ علاج ایک بیمار ہے۔ ایک نسخہ وہ دس روز استعمال کرتا ہے۔ پھر اس سے اس کو روز بروز نقصان ہو رہا ہے۔ جب اتنے دنوں کے بعد فائدہ نہ ہو تو بیمار کو شک پڑ جاتا ہے کہ یہ نسخہ ضرور میرے مزاج کے موافق نہیں اور یہ بدلنا چاہیے۔ پس رسم اور رسمی عبادت ٹھیک نہیں۔

دُعاؤں کی اہمیت

نمازوں میں دُعائیں اور درود ہیں۔ یہ عربی زبان میں ہیں، مگر تم پر حرام نہیں کہ نمازوں میں اپنی زبان میں بھی دُعائیں مانگا کرو؛ ورنہ ترقی نہ ہوگی۔ خدا کا حکم ہے کہ نماز وُہ ہے جس میں تضرّع اور حضورِ قلب ہو۔ ایسے ہی لوگوں کے گناہ دُور ہوتے ہیں، چنانچہ فرمایا اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ھود : ۱۱۵) یعنی نیکیاں بدیوں کو دُور کرتی ہیں۔ یہاں حسنات کے معنے نماز کے ہیں اور حضور اور تضرّع اپنی زبان میں مانگنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پس کبھی کبھی ضرور اپنی زبان میں دُعا کیا کرو اور بہترین دُعا فاتحہ ہے کیونکہ وُہ جامع دُعا ہے جب زمیندار کو زمینداری کا ڈھب آجاوے تو وہ زمینداری کے صراطِ مستقیم پر پہنچ جاوے گا اور کامیاب ہو جاوے گا۔ اسی طرح تم خُدا کے ملنے کی صراطِ مستقیم تلاش کرو اور دُعا کرو کہ یا الٰہی مَیں تیرا گنہگار بندہ ہوں اور اُفتادہ ہوں میری راہنمائی کر۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سب حاجتیں بغیر شرم کے خدا سے مانگو کہ اصل معطی وہی ہے۔ بہت نیک وہی ہے جو بہت دُعا کرتا ہے؛ کیونکہ اگر کسی بخیل کے دروازہ پر سوالی ہر روز جا کر سوال کرے گا تو آخر ایک دن اس کو بھی شرم آجاوے گی۔ پھر خدا تعالیٰ سے مانگنے والا جو بے مثل کریم ہے کیوں نہ پاتے؟ پس مانگنے والا کبھی نہ کبھی ضرور پا لیتا ہے۔ نماز کا دُوسرا نام دُعا بھی ہے۔ جیسے فرمایا اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مؤمن: ٦١) پھر فرمایا وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرة: ۱۸۷) جب میرا بندہ میری بابت سوال کرے۔ پس میں بہت ہی قریب ہوں۔ مَیں پکارنے والے کی دُعا کو قبُول کرتا ہوں جب وُہ پکارتا ہے۔ بعض لوگ اس کی ذات پر شک کرتے ہیں۔ پس میری ہستی کا نشان یہ ہے کہ تم مجھے پکارو اور مجھ سے مانگو۔ مَیں تمہیں پکاروں گا اور جواب دُوں گا اور تمہیں یاد کروں گا۔ اگر یہ کہو

کہ ہم پکارتے ہیں پر وہ جواب نہیں دیتا تو دیکھو کہ تم ایک جگہ کھڑے ہو کر ایک ایسے شخص کو جو تم سے بہت دُور ہے پکارتے ہو اور تمہارے اپنے کانوں میں کچھ نقص ہے۔ وہ شخص تو تمہاری آواز سُنکر تم کو جواب دیگا مگر جب وہ دُور سے جواب دے گا تو تم بہ باعث بہرہ پن کے سُن نہیں سکو گے۔ پس جُوں جُوں تمہارے درمیانی پردے اور حجاب اور دُوری دُور ہوتی جاوے گی، تو تم ضرور آواز کو سُنو گے۔ جب سے دُنیا کی پیدائش ہوئی ہے اس بات کا ثبوت چلا آتا ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رفتہ رفتہ بالکل یہ بات نابُود ہو جاتی کہ اس کی ہستی ہے بھی۔ پس خُدا کی ہستی کے ثبوت کا سب سے زبردست ذریعہ یہی ہے کہ ہم اس کی آواز کو سُن لیں یا دیدار یا گفتار۔ پس آج کل کا گفتار قائمقام ہے دیدار کا۔ ہاں جبتک خُدا کے اور اس سائل کے درمیان کوئی حجاب ہے اس وقت تک ہم سُن نہیں سکتے۔ جب درمیانی پردہ اُٹھ جاوے گا تو اُس کی آواز سُنائی دے گی۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ تیرہ سو برس سے خدا کا مکالمہ مخاطبہ بند ہو گیا ہے۔ اس کا اصل میں مطلب یہ ہے کہ اندھا سب کو ہی اندھا سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کی اپنی آنکھوں میں جو نُور موجود نہیں۔ اگر اسلام میں یہ شرف بذریعہ دُعاؤں اور اخلاص کے نہ ہوتا تو پھر اسلام کچھ چیز بھی نہ ہوتا۔ اور یہ بھی اور مذاہب کی طرح مُردہ مذہب ہو جاتا۔

اسلام کا خاص امتیاز

پس تم ان مُردوں کی طرف خیال مت کرو۔ جو خود بھی مُردہ اور اسلام کو بھی مُردہ بتاتے ہیں۔ یہ تو درحقیقت ایسا مذہب ہے کہ جس میں انسان ترقی کرتا ہوا فرشتوں سے مصافحہ جا کرتا ہے۔ اور اگر یہ بات نہ تھی تو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ : ۷) کیوں سکھایا؟ اس میں صرف جسمانی اموال کی طلب نہیں کی گئی بلکہ رُوحانی انعام کی درخواست ہے۔ پس اگر تم نے ہمیشہ اندھا ہی رہنا ہے تو پھر تم مانگتے کیا ہو؟ یہ دُعا فاتحہ ایسی جامع اور عجیب دُعا ہے کہ پہلے کبھی کسی نبی نے سکھلائی ہی نہیں۔ پس اگر یہ نرے الفاظ ہی الفاظ ہیں اور ان کو خدا تعالیٰ نے منظور نہیں کرنا تو ایسے الفاظ خُدا نے ہمیں کیوں سکھلائے۔ اگر تمہیں وہ مقام ملنا ہی نہیں تو ہم پانچ وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ خُدا کی ذات میں بُخل نہیں اور نہ انبیاء اس لیے آتے ہیں کہ ان کی پُوجا کی جاوے بلکہ اس لیے کہ لوگوں کو تعلیم دیں کہ ہماری راہ اختیار کرنے والے ہمارے ظل کے نیچے آ جاویں گے جیسے فرمایا اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران : ۳۲) یعنی میری پیروی میں تم خدا تعالیٰ کے محبُوب بن جاؤ گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر محبوب ہونے کی بدولت یہ سب اکرام ہوئے، مگر جب کوئی اور شخص محبوب بنے گا تو اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا؟ اگر اسلام ایسا مذہب

ہے تو سخت بیزاری ہے ایسے اسلام سے مگر ہرگز اسلام ایسا مذہب نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تو وہ مائدہ لائے ہیں کہ جو چاہے اس کو حاصل کرے۔ وہ نہ تو دُنیا کی دولت لائے اور نہ مہاجن بنکر آئے تھے۔ وہ تو خُدا کی دولت لائے تھے اور خود اس کے قاسم تھے۔ پس اگر وُہ مالِ دنیا نہیں تھا تو کیا وہ گٹھڑی واپس لے گئے؟ پر یہ سچ ہے جس اندھے کے پاس روشنی موجود نہیں وہ کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ مَیں روشنی رکھتا ہوں اور تقسیم کر سکتا ہوں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۷۳) انبیاء تو علیٰ وجہ البصیرۃ ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ بصیرت کسی کو نہیں ملے گی تو گویا یہ خود اِس دنیا سے اندھے ہی جائیں گے۔

اگر ان کا ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پر سچا ہوتا تو یہ یقین رکھتے کہ وہ آسمانی مال تقسیم کرنے آئے تھے اور ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ یہ اُمّت تمام اُمتّوں سے فوقیت حاصل کرے گی؛ حالانکہ مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی ماں کو وحی ہوتی تھی۔ اب بتاؤ کہ اُن کے مردوں کو بھی کبھی ایسی وحی ہوئی ہے۔ لاہور میں ایک مولوی سے میری بحث ہوئی محدّث کے لفظ پر۔ کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ محدّث وہ ہے جو خدا سے مکالمہ کر سکے اور یہ بات حضرت عمرؓ کے متعلق تھی تو اُس مولوی نے جواب دیا کہ چونکہ اسلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد مکالمۃ الٰہی نصیب نہیں۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو یہ عہدہ نصیب نہیں ہوا۔ گویا اس امت میں تو دجّال ہی آتے رہیں گے۔

مسیح موعود کی بعثت

مسیح کے متعلق جس زمانہ کی اطلاع احادیث وغیرہ میں دی گئی ہے وہ یہی زمانہ ہے۔ سورۂ نور اور بخاری میں مِنْکُمْ کا لفظ صاف ہے۔ آثار تمام نمودار ہو گئے ہیں۔ کسوف وخسوف رمضان میں ہو گیا۔ طاعون آ گئی۔ یہ کیسے کھُلے نشان تھے لیکن لوگ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ نہ تو یہ ہارتے ہیں اور نہ خُدا ہارنے والا ہے۔ آخر تم جانتے ہو کہ نتیجہ کیا ہو گا یہی کہ وہ پاک خدا جیتے گا۔ باوجود اس قدر کھُلے نشانات کے جواب یہ دیتے ہیں کہ تیس دجّالوں میں سے یہ بھی ایک دجّال ہے۔ او کم بختو! تمہارے حِصّہ میں دجّال ہی دجّال رہ گئے ہیں؟ بیرونی اور اندرونی بلائیں تم پر آئیں اور خُدا کی طرف سے بھی آیا تو دجّال ہی آیا۔ اوّل تو تم خود بخود مرتے جاتے تھے۔ اب ایسی حالت میں خُدا نے تم سے یہ سلوک کیا کہ مرتے کو مارنے کی تجویز ٹھہرائی۔ کیا خُدا کو تم سے کوئی ایسی ہی سخت عداوت تھی کہ سختی پر سختی کر رہا ہے۔ یہ انسانی غلطیاں ہیں تم لوگ ان سے ہوشیار رہو۔ خدا تعالیٰ بڑا کریم و رحیم ہے۔ جب کسی کپڑے پر ہفتہ گذر جاتا ہے تو فکر لگ جاتی ہے کہ اس کو صاف کرایا جاوے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دُنیا پر سو کی جگہ ایک سو بیس برس گذر گئے پر خُدا

نے تجدیدِ دین کی کوئی تجویز نہ کی اور بجائے تجدید کے دجّال بھیج کر اس کی تخریب کی۔ اس وقت تیس لاکھ مُسلمان عیسائی ہو چکا ہے۔ یہ وہ قوم تھی اگر اس میں سے ایک شخص بھی عیسائی ہوتا تھا تو حشر بپا ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف ایک اَور خبیث قوم نے سر اُٹھایا ہے وُہ مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر آریہ بنا رہی ہے، مگر ان ہمارے مسلمانوں کو یہی خیال آتا ہے کہ ابھی ہمارے اندر دجّال ہی پیدا ہوا ہے اور خُدا نے بھی ان کے ساتھ دھوکا کیا کہ دجّال کو صدی کے سر پر بھیجا تاکہ اُن کی رہی سہی امید بھی باقی نہ رہے۔ معلوم ہوا کہ تمہارے اندر بڑے بڑے خبث اور گناہ پوشیدہ ہیں جس کی تمہیں یہ سزا مل رہی ہے۔ خدا تعالیٰ نے تو فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ (الحجر: ۱۰) ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اسکی حفاظت کریں گے۔ یعنی جب اس کے معانی میں غلطیاں وارد ہوں گی تو اصلاح کے لیے ہمارے مامور آیا کرینگے۔ پس تم میرے اوپر خیال مت کرو بلکہ صدی کے ابتدا اور بیرونی حملوں اور اندرونی اعمال کو دیکھ کر تم خود غور و فکر کرو کہ آیا دجّال کی ضرورت ہے یا مہدی اور مسیح کی؟

تعصّب بُری بلا ہوتی ہے۔ تعصّب والوں نے تو کسی رسول کو بھی نہیں مانا ان کو دکاندار قرار دیا ہے؛ حالانکہ وُہ خدا کی طرف بُلاتے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ہمیشہ ساتھ رہی ہے اور رہے گی۔ قرآن کریم کی ابتداء بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہے۔ رحمٰن بے مانگے دینے والا اور رحیم محنت کو نہ ضائع کرنے والا۔ پس اس وقت رحمانیت اور رحیمیت کہاں گئی؟ سوچو تو سہی کہ یہ اس کے مناسب حال ہے یا کیا؟

اصل میں جب انسان تعصّب پر آتا ہے تو آنکھ دُھندلی ہو جاتی ہے اور جب اس مَیں ترقی کرتا ہے تو وُہ نُور چھین لیا جاتا ہے۔ پس ہدایت پانے کا طریق اشتہار بازی نہیں۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ تم ایک دفعہ بھی میرے پاس آتے ہو اور اپنے اعتراضات کا جواب پوچھا ہے یا کم سے کم میری تصانیف کو ہی دیکھا ہے؟ تو جواب دیں گے کہ میاں ہم کو ان باتوں کی فرصت نہیں۔ پھر تم نے جھٹ دجّال کا فتویٰ کیوں لگا دیا؟ پھر ہم نے دین میں کونسی تحریف کی ہے۔ تم مُنہ سے نماز اور روزہ کا نام لیتے ہو اور مَیں کہتا ہوں کہ ان کی رُوحانیت لو۔ صرف مَیں ہی نہیں کہتا، بلکہ وہ خُدا کہتا ہے جس نے مجھے مامور کیا ہے اور یہ اس لیے کہ تمہارے پوست میں کیفیت داخل ہو جاوے۔

ہاں تمہارے درمیان مسیح کا جھگڑا ضرور ہے لیکن خُدا کی کلام سے زیادہ سچا گواہ اَور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں دوسرے کے قول سے کیا غرض ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قولِ حق اور سچ ہیں مگر جو قرآنِ کریم کے خلاف نہ ہوں۔ پس ہمیں ایمان محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے قصّوں پر جو احادیث

میں درج ہیں قرآن کریم کو مقدم رکھیں۔ پس ہم تو قرآن کریم کو ترجیح دیں گے اور جو احادیث قوی اور صحیح ہیں وُہ ضرور قرآن کے ساتھ ہیں اور ہمارے دعویٰ میں ہماری مؤید ہیں۔ پس ہمارا اور ان لوگوں کا اور کوئی اختلاف نہیں۔ بجُز اس کے کہ یہ پوست پر قناعت کرتے ہیں اور ہم مغز کو چاہتے ہیں۔ مسیح کی موت کا قرآن نے خود فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ میں فیصلہ کر دیا ہے۔ اگر ہم قبول کریں کہ مسیح ناصری آجتک زندہ ہے تو ہمیں یہ بھی قبول کرنا پڑیگا کہ عیسائی بھی آجتک راہِ راست پر ہیں۔ اور اس کی قرآن کریم خود تردید کرتا ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم : ۹۱، ۹۲) مجھے میرے خُدا نے ہزار ہا وحیوں میں مامُور کیا ہے اور وہ وہی بات ہے جو تیرہ سو برس پہلے سے لکھی ہوئی تھی۔ ہمارا اور ان کا کوئی جھگڑا نہیں اگر شرم و حیا اور ایمان ہو۔ یہ بھی نہ سہی۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کُل لوگ مُسلمان ہو گئے تھے نہیں مگر وہی کہ جن کے حق میں سعادت تھی۔ پس ہمارا کام تو سمجھانا ہے۔ پس جو شخص مسیح کو زندہ مانتا ہے وہ جھُوٹا ہے اور خُدا کا منکر ہے اور جس کو خُدا نے مامُور کیا ہے اس کو تو تازہ علم اس کی وفات کا دیا ہے۔ پھر اگر اُنہوں نے مسیح کو ماننا تھا تو وہ حَکَم کس بات کا ہو گا اور ہر ایک مذہب والا اس کا فیصلہ کس طرح مانے گا۔ حَکَم کا لفظ تو صاف دلالت کر رہا ہے کہ ضرور ان لوگوں میں اختلاف اور اغلاط ہوں گے جن کا وہ آکر فیصلہ کرے گا۔ پس ہم تو تم سے سچا اتباعِ نبی کریم اور ترکِ اغلاط طلب کرتے ہیں اور بس۔

مخالفین سے نرمی کا سلوک ہونا چاہیے

پس ہمارے لوگ مخالفین سے سختی سے پیش نہ آیا کریں۔ ان کا درشتی کا نرمی سے جواب دیں۔ اور ملاطفت سے سلوک کریں۔ چونکہ یہ خیالات مدّتِ مدید سے ان کے دلوں میں ہیں رفتہ رفتہ ہی دُور ہونگے اس لیے نرمی سے کام لیں۔ اگر وہ سخت مخالفت کریں، تو اعراض کریں۔ مگر اس بات کے لیے اپنے اندر قوّتِ جاذبہ پیدا کرو۔ اور قوّتِ جاذبہ اس وقت پیدا ہوگی جب تم صادق مومن بنوگے اور اگر تم صادق نہیں تو تمہاری نصیحت ایسی ہے جیسے پرنالہ کا پانی موجبِ فساد ہوتا ہے پس صادق کے واسطے ورزش کی اشد ضرورت ہے جیسے ایک پہلوان کے سامنے تمہاری کیا ہستی ہے کہ مقابلہ کر سکو اگرچہ وہ بھی تمہارے جیسا آدمی تھا۔ جسمانی نشو و نما میں اس نے ترقی کی اور ورزش کر کے یہ طاقت حاصل کی۔ پس تم رُوحانی قویٰ میں ورزش کر کے روحانی پہلوان یعنی صادق مومن بنو۔ جو شخص اپنا نشو و نما نہیں کرتا وہ تو اپنے کنبہ کو بھی دُرست نہیں کر سکتا پس قوّتِ روحانی پیدا کرو۔ دیکھو نبی، رسُول سب ایک ایک ہو کر ہی آتے ہیں مگر وہ صادق اور جاذب تھے۔ مال کی غریبی اور کمزوری جُدا چیز ہے۔

روحانی قوت کی ضرورت

رُوحانی قوت ہونی چاہیے۔ ہاں کشش میں بھی وہی سعادت مند ہوتے

ہیں جن کو کچھ مناسبت ہوتی ہے۔ مثلاً انجن سرد ہے تو فائدہ نہیں دے سکتا ہے۔ اگر خوب گرم ہے تو سَو گاڑی بھی لے جاوے گا۔ پس گرم اور پُرتاثیر مومن بنو۔ اس ہماری جماعت کے واسطے خدا کا وعدہ ہے کہ دنیا میں پھیلے گی پھر اگر طاقت والے اور اس کے پھیلانے والے اور لوگ ہوں گے تو تم نے کیا حاصل کیا؟

اب سوال یہ ہوگا کہ طاقت کس طرح پیدا ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صادق اور پکا بندہ بن جاوے تاکہ کسی زلزلہ سے برگشتہ اور مُنہ پھیرنے والا نہ ہو۔ صحابہ کرامؓ سارے ہی باخدا اور عاقل تھے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُن سے بڑھ کر ایسے وفادار تھے کہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے آپ کو سانپوں اور درندوں اور خاردار کانٹوں والا جنگل اس کے درندے، حیوانات انسانی شکل میں دکھلائے گئے۔ پھر ملک بھی ایسا اس کے سپرد کیا کہ جس سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی شریر النفس نہ تھا۔ پھر آئے ایسے وقت پر کہ تمام مردہ اور فساد کی جڑھ تھے۔ جیسے فرمایا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم : ۴۲) اور گئے ایسے وقت پر کہ فرمایا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدة : ۴) الآیۃ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (النصر : ۲) اس کو معجزہ کہتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنی محبتِ الٰہی اور قوتِ جاذبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تھی۔ پس خدا تعالیٰ کے خاص بندوں اور غیروں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ قوتِ ایمانی اور استقامت ایسی ہو کہ کسی رکاوٹ شدید سے باز نہ رہے۔ اس صفت سے جس کو جتنا حصّہ ملا ہے اتنا ہی وہ برکت کا موجب ہوگا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی تبدیلی کے واسطے تین باتیں یاد رکھو:

(۱) نفسِ امّارہ کے مقابل پر تدابیر اور جدّوجہد سے کام لو۔ (۲) دعاؤں سے کام لو۔ (۳) سُست اور کاہل نہ بنو اور تھکو نہیں۔

ہماری جماعت بھی اگر بیج کا بیج ہی رہے گی تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جو ردّی رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو بڑھاتا نہیں۔ پس تقویٰ، عبادت اور ایمانی حالت میں ترقی کرو۔ اگر کوئی شخص مجھے دجّال اور کافر وغیرہ ناموں سے پکارتا ہے تو تم اس بات کی کچھ پروا بھی نہ کرو۔ کیونکہ جب خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہے تو مجھے ان کے ایسے بدکلمات اور گالیوں کا کیا ڈر ہے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کافر کہا تھا۔ ایک زمانہ ایسا آگیا کہ پکار اُٹھا کہ مَیں اس خدا پر ایمان لایا جس پر موسیٰ اور اس کے متبع ایمان لاتے ہیں۔ ایسے لوگ یاد رکھو کہ مخنث اور نامرد ہوتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ جیسے ایک بچہ بعض اوقات اپنی ماں اور باپ کو بھی ناسمجھی کی وجہ سے گالی دے دیتا ہے، مگر اس کے اس فعل کو کوئی بُرا نہیں سمجھتا۔

پس یاد رکھو کہ نری بیعت اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنا کچھ بھی سُودمند نہیں۔ جب کوئی شخص شدّتِ پیاس سے مرنے کے قریب ہو جاوے یا شدّتِ بھوک سے مرنے تک پہنچ جاوے تو کیا اس وقت ایک قطرہ پانی یا ایک

دانہ کھانے کا اس کو موت سے بچا لے گا؟ ہرگز نہیں۔ جس طرح اس بدن کو بچانے کے واسطے کافی خوراک اور کافی پانی بہم پہنچانے کے سوائے مفر نہیں۔ اسی طرح پُورے جہنّم سے تھوڑی سی نیکی سے تم بھی بچ نہیں سکتے۔ پس اس دھوکہ میں نہ رہو کہ ہم نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا ہے اب ہمیں کیا غم ہے۔ ہدایت بھی ایک موت ہے۔ جو شخص یہ موت اپنے اُوپر وارد کرتا ہے اس کو پھر نئی زندگی دی جاتی ہے اور یہی اصفیاء کا اعتقاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی ابتدائی حالت کے واسطے فرمایا۔ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ. (المائدۃ : ۱۰۶) یعنی پہلے اپنے آپ کو دُرست کرو۔ اپنے امراض کو دُور کرو۔ دُوسروں کا فکر مت کرو۔ ہاں رات کو اپنے آپ کو دُرست کرو۔ اور دن کو دُوسروں کو بھی ہدایت کر دیا کرو۔ خدا تعالیٰ تمہیں بخشے اور تمہارے گناہوں سے تمہیں مخلصی دے اور تمہاری کمزوریوں کو تم سے دُور کرے اور اعمالِ صالحہ اور نیکی میں ترقی کرنے کی توفیق دیوے[1]۔ آمین۔

۲ر نومبر ۱۹۰۴ء

بمقام سیالکوٹ

بیعت کی غرض

اس بیعت کی اصل غرض یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت میں ذوق و شوق پیدا ہو اور گناہوں سے نفرت پیدا ہو کر اس کی جگہ نیکیاں پیدا ہوں۔ جو شخص اس غرض کو ملحوظ نہیں رکھتا اور بیعت کرنے کے بعد اپنے اندر کوئی تبدیلی کرنے کے لیے مجاہدہ اور کوشش نہیں کرتا جو کوشش کا حق ہے اور پھر اس قدر دُعا نہیں کرتا جو دُعا کرنے کا حق ہے تو وہ اس اقرار کی جو خدا تعالےٰ کے حضور کیا جاتا ہے سخت بے حُرمتی کرتا ہے اور وہ سب سے زیادہ گنہگار اور قابلِ سزا ٹھہرتا ہے۔ پس یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بیعت کا اقرار ہی ہمارے لیے کافی ہے اور ہمیں کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ مثل مشہور ہے جوئندہ یابندہ جو شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس کے لیے کھولا جاتا ہے اور قرآن شریف میں بھی فرمایا گیا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۷۰) یعنی جو لوگ ہماری طرف آتے ہیں اور ہمارے لیے مجاہدہ کرتے ہیں۔ ہم اُن کے واسطے اپنی راہ کھول دیتے ہیں اور صراطِ مستقیم پر چلا دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص کوشش ہی نہیں کرتا وُہ کس طرح اس راہ کو پا سکتا ہے[2]۔ خدا یابی اور حقیقی کامیابی

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸-۳۹ صفحہ ۶ تا ۸ مورخہ ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء

[2] الحکم جلد ۸ نمبر ۴۱-۴۲ صفحہ ۶ مورخہ ۳۰ نومبر، ۱۰ دسمبر ۱۹۰۴ء

اور نجات کا بھی یہی گُر اور اصُول ہے۔ انسان کو چاہیے کہ خُدا تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرنے سے تھکے نہیں نہ درماندہ ہو اور نہ اس راہ میں کوئی کمزوری ظاہر کرے۔

تم لوگوں نے اس وقت خدا تعالیٰ کے حضور میرے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ توبہ تمہارے لیے باعثِ برکت ہونے کی بجائے لعنت کا موجب ہو جاوے کیونکہ اگر تم لوگ مجھے شناخت کر کے بھی اور خدا تعالیٰ سے اقرار کر کے بھی اس عہد کو توڑتے ہو تو پھر تم کو دوہرا عذاب ہے کیونکہ عمداً تم نے معاہدہ کو توڑا ہے۔ دُنیا میں جب کوئی شخص کسی سے عہد کر کے اُسے توڑتا ہے تو اس کو کس قدر ذلیل اور شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ وہ سب کی نظروں سے گِر جاتا ہے۔ پھر جو شخص خُدا تعالیٰ سے عہد اور اقرار کر کے توڑے وہ کس قدر عذاب اور لعنت کا مستحق ہو گا۔

پس جہانتک تم سے ہو سکتا ہے۔ اس اقرار اور عہد کی رعایت کرو۔ اور ہر قسم کے گناہوں سے بچتے رہو۔ پھر اس اقرار پر قائم اور مضبوط رہنے کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرتے رہو۔ وُہ یقیناً تمہیں تسلّی اور اطمینان دے گا اور تمہیں ثابت قدم کرے گا، کیونکہ جو شخص سچے دل سے خدا تعالیٰ سے مانگتا ہے اُسے دیا جاتا ہے۔

مَیں جانتا ہوں کہ تم میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جن کو میرے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے واسطے قسم قسم کے ابتلاء اور مشکلات پیش آئیں گے، لیکن مَیں کیا کروں یہ ابتلاء نئے نہیں۔ جب خدا تعالیٰ کسی کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور کوئی اس کی طرف جاتا ہے تو اس کے واسطے ضرور ہے کہ ابتلاؤں میں سے ہو کر گذرے۔ دُنیا اور اس کے رشتے عارضی اور فانی ہیں مگر خدا تعالیٰ کے ساتھ تو ہمیشہ کے لیے معاملہ پڑتا ہے پھر اس سے آدمی کیوں بگاڑے؟ دیکھو صحابہؓ کو کچھ تھوڑے ابتلاء پیش آتے تھے۔ ان کو اپنا وطن، مال و دولت، اپنے عزیز رشتہ دار سب چھوڑنے پڑے۔ لیکن اُنہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں ان چیزوں کو مری ہوئی مکھّی کے برابر بھی نہیں سمجھا۔ خدا تعالیٰ کو اپنے لیے کافی سمجھا۔ پر خُدا نے بھی ان کی کس قدر قدر کی۔ اس سے وہ خسارہ میں نہیں رہے بلکہ دُنیا و آخرت میں انہوں نے وہ فائدہ پایا جو اس کے بغیر انہیں مل سکتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اگر کوئی ابتلاء آوے تو گھبرانا نہیں چاہیے۔ ابتلاء مومن کے ایمان کو مضبوط کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت رُوح میں عجز و نیاز اور دل میں ایک سوزش اور جلن پیدا ہوتی ہے جس سے وہ خُدا تعالیٰ کی طرف رجُوع کرتا ہے اور اس کے آستانہ پر پانی کی طرح گداز ہو کر بہتا ہے۔ ایمانِ کامل کا مزا ہمّ و غم ہی کے دنوں میں آتا ہے۔ اس وقت اپنے اعمال کی اصلاح کی فکر کرو۔ خدا تعالیٰ سے اب تمہارا نیا معاملہ شروع ہوا ہے کیونکہ وُہ پچھلے گناہ سچی توبہ کے بعد بخش دیتا ہے اور توبہ سے یہ مراد نہیں کہ انسان زبان سے یہ کہہ دے اور اعمال میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ نہیں۔ توبہ یہی ہے کہ بدیوں اور خُدا کی نافرمانیوں کو قطعاً چھوڑ دے اور نیکیاں کرے

اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں اپنی زندگی بسر کرے۔

اب بے فکر رہنے کے دن نہیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کا تازیانہ ہوشیار کر رہا ہے۔ تم کو خوب معلوم ہے کہ طاعون نے اس ملک کو کیسا تباہ کیا ہے اور کس طرح پر فنا کا تصرف جاری ہے۔ اور ثابت ہو رہا ہے کہ دُنیا فانی ہے۔ اب بھی اگر انسان اپنے اعمال کو درست نہ کرے تو یہ اس کی کیسی غفلت اور بدنصیبی ہے۔ مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ تم ہرگز ہرگز بے فکر نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کے عذاب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت آجاوے اور وہ غافلوں کو ہلاک کر دیتا ہے جو دُنیا میں مست ہو جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بیباک اور شوخی اختیار کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ طاعون کے دن آتے ہیں اور معلوم نہیں کہ کون اس کے حملہ سے بچے۔ ہاں اس قدر میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے فضل و کرم سے محفوظ رکھتا ہے جو اپنے اندر سچی تبدیلی کر لیتے ہیں اور کسی قسم کا کھوٹ اور کجی دل میں باقی نہیں رکھتے۔ بسا اوقات جن شہروں میں طاعون پڑی ہے ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی جبتک تباہ نہیں کر لیتی اور یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ اس کے دورے بڑے بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ مجھ پر خدا تعالیٰ نے ایسا ہی ظاہر کیا ہے اور خُدا تعالیٰ کی کتابوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ شامتِ اعمال سے آتی ہے۔ مَیں اس وقت دیکھتا ہوں کہ دُنیا میں غفلت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ شوخی اور بے باکی خدا تعالیٰ کی کتابوں اور باتوں سے بہت ہو گئی ہے۔ دُنیا ہی دُنیا لوگوں کا مقصود اور معبود ٹھہر گئی ہے۔ اس لیے جیسا کہ پہلے سے کہا گیا تھا اور نبیوں کی معرفت وعدہ دیا گیا تھا۔ میرے اس زمانہ میں یہ طاعون لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے آئی ہے مگر افسوس ہے لوگ اس کو ابتک بھی ایک معمولی بیماری سمجھتے ہیں۔ مگر مَیں تمہیں کہتا ہوں کہ تم ان لوگوں کے ساتھ مت ملو بلکہ تم اپنے اعمال اور افعال سے ثابت کر کے دکھا دو کہ واقعی تم نے سچی تبدیلی کر لی ہے۔ تمہاری مجلسوں میں وہی ہنسی اور ٹھٹھا نہ ہو جو دُوسرے لوگوں کی مجلسوں اور محفلوں میں پایا جاتا ہے۔ یقیناً سمجھو کہ زمین و آسمان کا خالق ایک خدا ہے۔ وہی خُدا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی اور موت ہے۔ کوئی شخص دنیا میں کسی قسم کی راحت اور کوئی نعمت حاصل نہیں کر سکتا مگر اسی کے فضل اور کرم سے۔ ایک پتہ بھی اس کے فضل کے بغیر ہرا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہر وقت اسی سے سچا تعلق پیدا کرے اور اس کی رضا جوئی کی راہوں پر مضبوط قدم رکھے۔ اگر وہ اس بات کی پابندی کرے گا تو یقیناً اُسے کوئی غم نہیں ہے۔ ہر قسم کی راحت، صحت، عمر و دولت یہ سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے۔ جب انسان کا وجود ایسا نافع اور سُود مند ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرتا۔ جیسے باغ میں کوئی درخت عمدہ پھل دینے والا ہو تو اسے باغبان کاٹ نہیں ڈالتا بلکہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح نافع اور مفید وجود کو اللہ تعالیٰ بھی محفوظ رکھتا ہے جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (الرعد : ۱۸) جو لوگ دُنیا کے لیے

نفع رساں لوگ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں بڑھا دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں جو سچے ہیں اور کوئی ان کو جھٹلا نہیں سکتا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سچے اور فرمانبردار بندے ایسی بلاؤں سے محفوظ رہتے ہیں۔ پس اس بات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ نری بیعت اور اقرار سے کچھ نہیں بنتا، بلکہ انسان زیادہ ذمہ دار اور جوابدہ ہو جاتا ہے۔ اصل فائدہ کے لیے ضرورت ہے حقیقی ایمان اور پھر اُس ایمان کے موافق اعمالِ صالحہ کی۔ جب انسان یہ خوبی اپنے اندر پیدا کرتا ہے تو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ متقی حقیقی مومن اور اس کے غیر میں ایک امتیاز رکھ دیا جاتا ہے۔ اُسے ممتاز کیا جاتا ہے اور اس امتیاز کا نام قرآنِ شریف کی اصطلاح میں فرقان ہے۔ آخرت میں بھی مومن اسی فرقان سے شناخت کئے جائینگے اور کافر۔ فاسق۔ فاجر کے مُنہ سیاہ ہو جائینگے۔ اس دُنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ مومن ہمیشہ ممتاز رہتا ہے۔ اس کے اندر ایک سکینت اور اطمینان بخش رُوح ہوتی ہے، اگرچہ مومن کو دُکھ بھی اُٹھانے پڑتے ہیں اور قسم قسم کے مصائب اور شدائد کے اندر سے گذرنا پڑتا ہے خواہ لوگ اس کے کتنے ہی بُرے نام رکھیں اور خواہ اس کے تباہ اور برباد کرنے کے لیے کچھ بھی ارادے کریں، لیکن آخر وہ بچا لیا جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے اور اُسے عزیز رکھتا ہے۔ اس لیے دُنیا اس کو ہلاک نہیں کر سکتی۔ مومن اور اس کے غیر میں امتیاز ضرور ہوتا ہے اور یہ میزان خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ خُدا کی آنکھیں خوب دیکھتی ہیں کہ کون بد اور شریر ہے۔ خدا کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ پس تم دُنیا کی پروا نہ کرو۔ بلکہ اپنے اندر کو صاف کرو۔ یہ دھوکا مت کھاؤ کہ ظاہری رسم ہی کافی ہے۔ نہیں۔ امن اس وقت آتا ہے جب انسان سچے طور سے خدا تعالیٰ کے حرم میں داخل ہو۔

پس اب بڑی تبدیلی کا وقت ہے اور خدا تعالیٰ سے سچی صلح کے دن ہیں۔ بعض لوگ اپنی غلط فہمی اور شرارت سے اس سلسلہ کو بدنام کرنے کے لیے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں سے بھی بعض آدمی طاعون سے ہلاک ہوتے ہیں۔ میں نے بارہا اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ یہ سلسلہ منہاجِ نبوت پر واقع ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار پر جو عذاب آیا تھا وہ تلوار کا عذاب تھا۔ حالانکہ وہ اُن کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ صحابہؓ میں سے بعض شہید نہیں ہو گئے؟ اسی طرح پر یہ سچ ہے کہ اس سلسلہ میں سے بھی بعض لوگ طاعون سے شہید ہوتے ہیں مگر یہ بھی تو دیکھو کہ طاعون کے ذریعہ سے ہمارا نقصان ہوا ہے یا دوسروں کا؟ ہماری جماعت کی تو ترقی ہوتی گئی اور ہو رہی ہے اور میں پھر کہتا ہوں کہ جو لوگ نافع الناس ہیں اور ایمان، صدق و وفا میں کامل ہیں وہ یقیناً بچا لیے جاویں گے۔ پس تم اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کرو۔ اپنے رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو بھی سمجھاؤ اور یہی تلقین کرو اور دوستوں کے

ساتھ یہی شرطِ دوستی رکھو کہ وہ بدی سے بچیں۔

پھر مَیں یہ بھی کہتا ہوں کہ سختی نہ کرو اور نرمی سے پیش آؤ۔ جنگ کرنا اس سلسلہ کے خلاف ہے۔ نرمی سے کام لو اور اس سلسلہ کی سچائی کو اپنی پاک باطنی اور نیک چلنی سے ثابت کرو۔ یہ میری نصیحت ہے اس کو یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں استقامت بخشے۔ آمین۔

۳ نومبر ۱۹۰۴ء

سیالکوٹ سے واپسی پر بمقام وزیرآباد ریلوے اسٹیشن۔

ایک پادری سے گفتگو

وزیرآباد کے سٹیشن پر وہی ہجوم اور کثرتِ زائرین تھی جو پہلے تھی۔ حافظ غلام رسول صاحب نے پھر لیمونیڈ اور سوڈا واٹر کی دعوت اپنے بھائیوں کو دی۔

اس مرتبہ اس اسٹیشن پر ایک عجیب بات جو پیش آئی وہ یہ تھی کہ ڈسکہ کا مشنری پادری سکاٹ صاحب حضرت اقدس سے آکر ملا۔ پادری سکاٹ صاحب کے ساتھ ہمارے مکرم بھائی شیخ عبدالحق صاحب نومسلم کے بھی عیسائیت کے ایام میں دوستانہ تعلقات تھے۔ پادری صاحب نے حضرت اقدس کے پاس آکر پہلے سلسلۂ کلام شیخ عبدالحق ہی سے شروع کیا کہ آپ نے ہمارا ایک لڑکا لے لیا۔ اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ جبکہ ہم نے پہنچ کر اس گفتگو کو قلمبند کرنا شروع کیا۔

پادری سکاٹ۔ آپ میں اور عیسوی مذہب میں کیا اختلاف ہے؟

حضرت اقدس۔ موجودہ عیسوی مذہب اور ہم میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے، البتہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم اور مذہب اور ہمارے مذہب کے اصولوں میں اختلاف نہیں ہے۔ وہ بھی خُدا کی پرستش کرتے اور اس کی توحید کا وعظ اور تبلیغ کرتے تھے۔ اور دُوسرے تمام نبی بھی یہی تعلیم لیکر آئے تھے۔

پادری سکاٹ۔ آپ لوگوں میں تو بہت سے فرقے موجود ہیں؟

حضرت اقدس۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عیسائیوں

لہ الحکم جلد ۸ نمبر ۴۳، ۴۴ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۱۷ / ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء

میں کس قدر فرقے ہیں جو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں اور اصولوں میں بھی متفق نہیں۔ مسلمانوں کے فرقوں میں اگر کوئی اختلاف ہے تو فروعات اور جزئیات میں ہے۔ اصول سب کے ایک ہی ہیں۔

پادری سکاٹ۔ ان عیسائی فرقوں میں سے آپ کس کو حق پر سمجھتے ہیں؟

حضرت اقدس۔ میرے نزدیک تو راستباز وہی فرقہ تھا جو حضرت مسیحؑ اور اُن کے حواریوں کا تھا۔ اس کے بعد تو اس مذہب کی مرمت شروع ہو گئی اور کچھ ایسی تبدیلی شروع ہوئی کہ حضرت مسیحؑ کے وقت کی عیسویت اور موجودہ عیسویت میں کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔

پادری۔ اس کی خبر آپ کو کہاں سے ملی؟

حضرت اقدس۔ پیغمبروں کو خدا تعالیٰ ہی سے خبریں ملا کرتی ہیں۔ میں بھی خدا ہی سے خبریں پاتا ہوں اور اسی پر ایمان لاتا ہوں۔

پادری۔ اس میں شک نہیں کہ پیغمبروں کو خُدا سے ہی خبر ملتی ہے۔

اس مقام تک جب پہنچے تو پادری صاحب کی نظر ایڈیٹر الحکم پر پڑی جو اس گفتگو کو قلمبند کر رہا تھا۔ پادری صاحب اُسے دیکھ کر گھبرائے اور بولے کہ یہ کون نوٹ کر رہا ہے۔ جب ان کو یہ کہا گیا کہ یہ الحکم اخبار کا ایڈیٹر ہے جو اس سفر میں حضرت کے ساتھ ہے اور حالاتِ سفر قلمبند کر کے شائع کرے گا تو پادری صاحب بولے میں اب جاتا ہوں یہ تو شائع کر دیں گے۔ انہیں کہا گیا کہ کیا حرج ہے دُوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ مگر ہم سچ کہتے ہیں اور اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ پادری صاحب کی گھبراہٹ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہر چند وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس سلسلۂ کلام کو یہاں چھوڑ دیں مگر حاضرین نے انہیں سلسلہ کلام جاری رکھنے پر اصرار کیا اور کہا کہ آپ کو نہیں تو ہم لوگوں کو فائدہ پہنچ جاوے گا۔ اس اصرار پر انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور پھر بولے تو یہ بولے:

پادری۔ تمہارے بہت سے چیلے ہیں یہ حملہ نہ کر دیں۔

حضرت اقدس۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ خواہ مخواہ ایک قوم پر جس کو نیک چلنی، انکسار اور تواضع کی تعلیم دی جاتی ہے حملہ کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کہ میں ان میں موجود ہوں اور آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی ان میں سے بولتا بھی نہیں آپ یہ امّید کر سکتے ہیں۔ آپ جس طرح چاہیں جو چاہیں مجھ سے پوچھیں ان میں سے کوئی تمہیں مخاطب بھی نہیں کرے گا۔ ان کو یہ تعلیم نہیں دی جاتی۔

علاوہ ازیں چیلے کا لفظ ٹھیک نہیں ہے گو اس لفظ کے معنے اور مفہوم بُرا نہ ہو۔ لیکن ہر ایک قوم کو اسی لفظ اور نام سے پکارنا چاہیے جو وہ اپنے لیے پسند کرتی ہے۔ یہ لفظ چیلے کا ہندوؤں کے ساتھ مختص ہے۔

پادری۔ میں نے سُنا ہے۔ سیالکوٹ میں بڑی رونق تھی۔

حضرت اقدس۔ ہاں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔

پادری۔ آپ لوگوں کو صرف ہدایت دیتے ہیں یا فضل بھی؟

حضرت اقدس۔ میری ہدایت کچھ چیز نہیں جبتک اس کے ساتھ فضل نہ ہو۔ کوئی آدمی کبھی ہدایت نہیں پاسکتا جبتک آسمانی فضل بھی اس کی دستگیری نہیں کرتا ہے۔ وہ میری شناخت اُسے عطا کرتا ہے تب وُہ میرے پاس آتا ہے اور وہ ہدایت اور معرفت لیتا ہے جو مجھے خدا تعالیٰ نے دی ہے اور پھر اپنے فضل سے دی ہے۔

پادری۔ میں اس فضل کا ذکر نہیں کرتا جو آپ کو ملتا ہے بلکہ میں اس فضل کا ذکر کرتا ہوں جو ان کو ملتا ہے۔

حضرت اقدس علیہ السلام۔ میں بھی تو اس فضل کا ذکر کرتا ہوں جو اُن کو ملتا ہے۔ ان کو پہلے تو وہ فضل ہی ہے جو میرے پاس لاتا ہے۔ پھر جو فضل مجھے دیا جاتا ہے وہی فضل میری صحبت اور تعلق کی وجہ سے ان میں سرایت کرتا ہے۔ جس قدر اعتقاد بڑھے گا اسی قدر یہ لوگ اور ہر ایک مخلص ارادتمند اس فضل کو جذب کرے گا۔ ان لوگوں کا تعلق میرے ساتھ درخت کی شاخوں کی طرح ہے۔ جس جس قدر وہ شاخیں قریب ہیں اور اپنی سبزی اور زندگی میں تر و تازہ ہیں اسی قدر زیادہ وہ اس غذا کو جو جڑ کے ذریعہ درخت حاصل کرتا ہے یہ جذب کرتی ہیں۔ اگر کوئی شاخ خشک ہو تو ہر چند وہ درخت کے ساتھ تعلق بھی رکھتی ہو، لیکن اس غذا سے کوئی حصّہ نہیں پاسکتی۔ اسی طرح پر شاگرد اور مرید شاخوں کی طرح ہی ہوتے ہیں جس قدر کوئی تعلق، محبت اور حُسنِ ایمان رکھتا ہے اور جس قدر زیادہ صحبت میں رہتا ہے اسی کے موافق وہ حصّہ پاتے ہیں۔ اوّل فضل خود اس درخت میں بھی ہونا چاہیے۔ اگر اس میں ہی کوئی قوّت اور رُوح معرفت کی نہ ہوگی تو وہ دوسروں کو کیا پہنچا سکے گا۔

پادری۔ کس درخت کی شاخ؟

حضرت اقدس علیہ السلام۔ وُہ درخت جس کو خدا لگاتا ہے جو خُدا کی طرف سے آتا ہے جیسے میں خدا کی طرف سے آیا ہوں اور خُدا نے مجھے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔

پادری۔ میں آپ کے دعویٰ کا اصل مطلب نہیں سمجھا۔ کیا آپ مسیح کہلاتے ہیں؟

حضرت اقدس علیہ السلام۔ تعجب ہے۔ میرا دعویٰ تو عرصہ سے شائع ہو رہا ہے اور ولایت اور امریکہ تک لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں میں مطلب نہیں سمجھا۔ ہاں میں مسیح کہلاتا ہوں اور خُدا نے مجھے مسیح کہا اور مسیح کر کے بھیجا۔

پادری۔ وُہ تو ایک ہی مسیح ہے۔

حضرت اقدسؑ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں بخل نہیں ہے وہ ہزاروں ہزار مسیح بنا سکتا ہے؛ چنانچہ ایک میں نمونہ موجود ہوں جو زندہ مسیح ہے۔

پادری۔ اُنیس سو برس پیشتر آپ سے ایک مسیح دنیا میں آیا تھا اور وہی مسیح مشہور ہے جس کی طرف یہودیوں کے عہد نامے میں اشارہ ہے کہ مسیح آئے گا اور وہ اس کے منتظر تھے۔ اس کے سوا تو کوئی اَور مسیح نہیں۔

حضرت اقدس علیہ السلام۔ ہاں۔ انیس سو برس پیشتر ایک مسیح آیا تھا۔ مگر جس مسیح کا آپ ذکر کرتے ہیں یا جس کو مانتے ہیں اس کا ذکر یہودیوں کے عہد نامے میں کہیں نہیں ہے، کیونکہ وہ کسی خدا مسیح کے منتظر نہ تھے بلکہ ایک نبی کے منتظر تھے۔ اگر وہ کسی خدا یا خدا کے بیٹے کے منتظر ہوتے تو وہ اس کو مان لیتے۔

علاوہ بریں یہودیوں کے عہد نامہ میں جس مسیح کا ذکر ہے وہ نشان دو مسیحوں کی طرف جاتا ہے۔ ایک وہ جو مجھ سے پہلے آیا اور دُوسرا مَیں ہوں جو ساتویں ہزار میں آنے والا تھا۔ مسیح کی آمدِ ثانی کے تم لوگ بھی قائل ہو، لیکن دُوسری آمد کو تم نے اسی کی آمد سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس سے مراد کسی اور کا آنا تھا یعنی میرا آنا مراد تھا۔ دانیال نبی کی کتاب میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ اس امر کو بیان کیا ہے۔ یہ ساتواں ہزار ہے جو آپ کے دعویٰ کو باطل کرتا ہے کہ وہی آنے والا تھا۔ اس نے میری تصدیق کی؛ چنانچہ بڑے عیسائی فاضلوں نے مسیح کے آنے کا یہی زمانہ قرار دیا ہے اور آخر مایوس ہو کر امریکہ وغیرہ میں ایسے رسائل بھی شائع ہو گئے کہ دوبارہ آنے کا خیال غلط ہے۔ آمدِ ثانی سے مراد صرف کلیسیا ہی ہے۔ اگر یہ وقت آنے کا نہ تھا تو ان لوگوں کو کیا مصیبت پیش آئی تھی کہ وہ ایسی تاویلیں کرتے یا انکار کرتے۔ حقیقت میں آنے کا زمانہ یہی تھا۔ اور آنے والا آگیا مگر تھوڑے ہیں جو اسے دیکھتے ہیں۔ اب آپ خواہ قبول کریں یا نہ کریں اور کوئی مسیح تو آنے والا نہیں۔ جس کا آپ کو انتظار ہے وہ مر چکا اور مَیں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق آگیا۔

پادری۔ جو دھوکہ یہودیوں کو تھا وہی آپ کو ہے کہ ایک مسیح دُکھ اُٹھائے گا۔ دُوسرا بزرگی پائے گا۔

حضرت اقدس علیہ السلام۔ دراصل یہودیوں والا دھوکہ تو آپ کو لگا ہوا ہے کہ اگر آپ حضرت مسیح کے اپنے فیصلہ کو یاد رکھتے تو ٹھوکر نہ کھاتے۔ یہودیوں کو جو دھوکا لگا تھا۔ وہ یہی تو تھا کہ مسیح کے آنے سے پہلے ایلیا ہی کا آنا مانتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ وہی ایلیا آئے گا؛ حالانکہ مسیح نے اس کا فیصلہ یہ کیا کہ آنے والا ایلیا یوحنا کے رنگ میں آیا ہے چاہو تو قبول کرو۔ اب اگر دوبارہ آنا صحیح ہوتا تو پھر ایلیا ہی کو آنا چاہیے تھا۔ اسی طرح مسیح کی آمدِ ثانی ہے اس سے مراد وہ آپ ہی کیونکر ہو سکتے ہیں۔ اسی واسطے مَیں کہتا ہوں کہ آپ کو یہودیوں والا دھوکہ لگا ہے؛ ورنہ مَیں تو وہی مسیح ہوں جو آنے والا تھا اور میرا

وہی فیصلہ ہے جو ایلیا کے حق میں مسیح نے کیا۔

پادری۔ وُہ ایلیا تو آچکا۔

حضرت اقدس علیہ السلام۔ مَیں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ آچکا اگر تم یہ بتاؤ کہ کیا یوحنا کو ایلیا نہیں بنایا گیا۔ اب میرے معاملہ میں آپ کیوں ٹھوکر کھاتے ہیں اور مسیح کے فیصلہ کو حجت نہیں مانتے۔

پادری۔ آپ معاف کریں۔ مَیں جاتا ہوں۔

حضرت اقدس علیہ السلام۔ اچھا۔

اس کے بعد پادری صاحب تشریف لے گئے[1]

۵ نومبر ۱۹۰۴ء

بمقام قادیان۔ بعد نماز مغرب

طاعُون کی شدّت طاعون کے ذکر پر فرمایا کہ:

کسوف اور خسوف کے ساتھ ہی قرآن شریف میں اَیْنَ الْمَفَرُّ (القیامۃ: ۱۱) آیا ہے جس سے یہی مراد ہے کہ طاعون اس کثرت سے ہوگی کہ کوئی جگہ پناہ کی نہ رہے گی۔ میرے الہام میں عَفَتِ الدِّیَارُ مَحَلُّھَا وَ مُقَامُھَا کے یہی معنے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا وجود باعثِ ابتلاء ثابت ہوا ہے

حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود کی نسبت فرمایا کہ:

ان کا وجود دُنیا کے لیے ابتلاء ہی ثابت ہوا ہے۔ یعنی ابتلاء اور حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود کا گہرا تعلق ہے کیونکہ جو مُنکر ہوئے وہ بھی دوزخی بنے اور جو ان پر ایماندار ہیں وہ بھی دوزخ کے کنارے ہیں۔ جیسے کہ عیسائیوں کے عقائد اور عملی حالت سے واضح ہے۔ پھر مسلمان بھی ان پر ایمان رکھتے تھے وہ بھی

---

[1] الحکم جلد ۸ نمبر ۴۳، ۴۴ صفحہ ۵، ۶ مورخہ ۱۷/۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء

ملوک کے اور آسمان پر بٹھا کر مغضوب ہوئے۔ پس صرف مسیح کا وجود ہی اس قسم کا ہے کہ جس کا دوست بھی جہنم میں اور دشمن بھی جہنم میں۔ اس قسم کا ابتلا کسی اور نبی کے وجود کے ساتھ نہیں ہے[1]

۱۱ر نومبر ۱۹۰۴ء

ایک شخص کی طرف سے رقعہ پیش کیا گیا کہ یہ مولوی صاحب ہیں اور ان کا لڑکا فوت ہوگیا ہے۔ ان کو ہستی باری تعالیٰ پر شبہات پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ اپنی اصلاح کی تدبیر دریافت کرتے ہیں۔

فرمایا :

ان کی بے قراری کو اللہ تعالیٰ دُور کرے۔ دیکھو اگر کسی شخص کے سامنے دو بچے ہوں۔ ایک تو کسی اجنبی کا ہو اور دوسرا اس کا اپنا پیارا۔ تو کیا وہ اس اجنبی بچہ کی خاطر اپنے بچہ سے محبت چھوڑ دے گا۔ نہیں۔ بلکہ ہرگز نہیں۔ پس جب انسان مسلمان کہلاتا ہے جس کے معنے ہیں بالکل خدا کا ہو جانا اور کسی حالت میں اس سے بے وفائی نہ کرنا۔ پھر اولاد کے حق میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن : ۱۵) اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن : ۱۶) کہ مال اور اولاد تمہاری دشمن ہیں۔ ان سے ڈرتے رہو۔ کیونکہ اگر زندہ رہے تو ممکن ہے کہ نافرمان ہو۔ مُرتد ہو جاوے۔ بدکار ہو، چور یا ڈاکو بن جاوے۔ مر جاوے تو پھر ویسے ابتلا آ جاتا ہے۔ پس ہر حالت میں موجب فتنہ اور ابتلاء ہوتی ہے مگر جب مومن کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہوتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے کہ اگر یہ بچہ مر گیا ہے تو کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا۔ (البقرة : ۱۰۷)

دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۱ بچے فوت ہوئے۔ ایمان تو وہ ہوتا ہے جس میں لغزش نہ ہو اور ایسے ایمان والا خدا تعالیٰ کو بہت محبوب ہوتا ہے۔ ہاں اگر بچہ خدا سے زیادہ محبوب ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسا شخص خُدا پر ایمان کا دعویٰ کر سکے۔ اور وہ کیوں ایسا دعویٰ کرتا ہے۔ ہم نہیں جان سکتے کہ ہماری اولاد کیسی ہوں گی۔ صالح ہوں گی یا بد معاش۔ اور نہ اُن کے ہم پر کوئی احسان ہیں اور خُدا کے تو ہم پر لاکھوں لاکھ احسان ہیں۔ پس سخت ظالم ہے وہ شخص کہ اس خدا سے تعلق توڑ کر اولاد کی طرف تعلق لگاتا ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق کا بھی خیال رکھو۔ اگر خُدا پر تمہارا کامل ایمان ہو تو پھر تو تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ :۔

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

---

[1] الحکم نمبر ۴۰ جلد ۸ ۲/۱ مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۰۴ء

اور اس ایمان والے کے شیطان قریب بھی نہیں آتا۔ وہ بھی تو وہاں ہی آجاتا ہے جہاں اُس کو تھوڑی سی گنجائش مل جاتی ہے۔ جب خدا تعالیٰ کو مقدم رکھا جائے تو برکات کا نزُول ہوتا ہے۔ ہر کسی دوست سے اگر تم ادنیٰ باتوں میں بدعہدی اور جھوٹ اور عہد شکنی سے کام لو تو وہ تمہیں کبھی عزیز نہیں رکھے گا۔ پھر وہ تو رب العالمین اور احکم الحاکمین اور رب العزت ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (البقرۃ : ۱۵۶) یعنی ثمرات سے مراد اولاد ہے اور یہ خُدا کی طرف سے ابتلاء ہوتے ہیں اور یہی انسان کا امتحان ہوتا ہے۔ ہاں یہ باتیں اور کامل ایمان حاصل ہوتا ہے توبہ استغفار سے۔ اس کی کثرت کرو۔ اور رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (الاعراف : ۲۴) پڑھا کرو اور اس کی کثرت کرو۔ خدا تعالیٰ نعم البدل عطا کرے گا۔ خُدا کا دامن نہ چھوڑنے والا گنہگار ہو کر بھی بخشا جاتا ہے۔ ہاں تعلق توڑنا بری بات ہے اور یہ زہر قاتل ہے۔ پس توبہ استغفار کرو اور نمازوں میں دُعائیں کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارا پروردگار ہو۔ والسلام۔

بلا تاریخ

شہد اور ذیابیطس

ذیابیطس کی مرض کا ذکر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ :

اس سے مجھے سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس میں شیرینی کو سخت مضر بتلایا ہے۔ آج میں اس پر غور کر رہا تھا تو خیال آیا کہ بازار میں جو شکر وغیرہ ہوتی ہے اسے تو اکثر فاسق فاجر لوگ بناتے ہیں اگر اس سے ضرر ہوتا ہے تو تعجب کی بات نہیں۔ مگر عسل (شہد) تو خدا تعالیٰ کی وحی سے تیار ہوا ہے۔ اس لیے اس کی خاصیت دُوسری شیرینیوں کی سی ہرگز نہ ہوگی۔ اگر یہ ان کی طرح ہوتا تو پھر سب شیرینی کی نسبت شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ فرمایا جاتا۔ مگر اس میں صرف عسل ہی کو خاص کیا ہے۔ پس یہ خصُوصیت اس کے نفع پر دلیل ہے اور چونکہ اس کی تیاری بذریعہ وحی کے ہے اس لیے مکھی جو پھُولوں سے رَس چُوستی ہوگی تو ضرور مفید اجزاء کو ہی لیتی ہوگی۔ اس خیال سے مَیں نے تھوڑے سے شہد میں کیوڑا ملا کر اُسے پیا تو تھوڑی دیر کے بعد مجھے بہت فائدہ حاصل

؎ الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰، ۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء
نیز البدر جلد ۳ نمبر ۴۴، ۴۵ مورخہ ۲۴ نومبر، یکم دسمبر ۱۹۰۴ء

ہوا حتیٰ کہ مَیں نے چلنے پھرنے کے قابل اپنے آپ کو پایا اور پھر گھر کے آدمیوں کو لے کر باغ تک چلا گیا اور وہاں دس رکعت اشراق نماز کی ادا کیں۔

صفاتِ باری تعالیٰ خدا تعالیٰ کی ان صفات ربّ، رحمٰن، رحیم، مالک یوم الدین پر توجہ کی جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسا عجیب خدا ہے۔ پھر جن کا ربّ ایسا ہو گیا وہ کبھی نامُراد اور محروم رہ سکتا ہے؟ ربّ کے لفظ سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دُوسرے عالم میں بھی ربوبیت کام کرتی رہے گی۔

جہاں اسباب غیر مؤثر معلوم ہوں وہاں دُعا سے کام لے[1]

۲۴؍نومبر ۱۹۰۴ء

بوقتِ ظہر

ایک الہام اور ایک رؤیا حضرت اقدس علیہ السلام نے ذیل کی رؤیا سنائی

مَیں نے ایک سفید تہ بند باندھا ہوا ہے مگر وُہ بالکل سفید نہیں ہے۔ کچھ کچھ مَیلا ہے کہ اس اثناء میں مولوی صاحب نماز پڑھانے لگے ہیں اور اُنھوں نے سورہ الحمد جہر سے پڑھی ہے اور اس کے بعد اُنھوں نے یہ پڑھا۔

اَلْفَارِقُ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْفَارِقُ

اس وقت مجھے یہی معلوم ہوا کہ قرآنِ شریف میں سے ہی ہے۔ اور ایک اَور الہام ہوا:

روزِ نقصاں بر تو نہ آید

آریہ مذہب اور اس کے عقائد حضرت حکیم نور الدین صاحب اور مولوی عبد الکریم صاحب نے عرض کی بعض آریوں نے بہت ہی گندے کلمات قرآنِ شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھے ہیں۔ فرمایا کہ

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۴۴-۴۵ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴؍نومبر و یکم دسمبر ۱۹۰۴ء

ہانڈی میں جب اُبال آتا ہے تو پھر بہت جلدی بیٹھ جایا کرتا ہے۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہے۔ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اسلام جیسا مذہب جس خُدا نے پیش کیا ہے اُس کے مقابل پر اور بھی کوئی خدا مانا جا سکتا ہے۔ اسلام کا خُدا کل کمالات کا مالک ہے اور جبکہ رُوح اور اس کے خواص سب خود بخود ہیں تو پھر وُہ خدا کو کہہ سکتی ہے کہ تیرا مجھ پر کیا حق ہے جو تو مجھ کو کسی قسم کی سزا دے سکے۔ خُدا شناسی میں ان لوگوں کی حالت دہریوں سے ملتی ہے اور نیوگ میں تو کنجروں کو مات کر دیا ہے۔

انہوں نے ہر ایک بات پر اعتراض کا ٹھیکہ لے لیا ہے، حالانکہ ایک عارف آدمی اس بات کا ہرگز قائل نہ ہوگا کہ کُل اسرارِ اُلوہیت کو کوئی سمجھ سکے مثلاً اس قدر جو مخلوقات موجود ہے اور قسم قسم کے پتھر، بُوٹیاں اور اشیاء ہیں کیا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ مَیں نے ہر ایک کے خواص پر احاطہ کر لیا ہے اور جو کچھ مَیں نے معلوم کیا ہے اس سے بڑھ کر اب اور کوئی حکمتِ الٰہی اس میں ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے حق کے طالب کو چاہیے کہ وہ بات جس سے ایمان وابستہ ہوتا ہے اختیار کرے اور اُسے سمجھے اور دُوسری باتوں کے لیے اپنے نقصِ عقل کو تسلیم کرے۔ جُوں جُوں خُدا تعالیٰ بصیرت دے گا تُوں تُوں اس کا علم بڑھے گا۔ یہ نادانی ہے کہ انسان کے جسم کے اندر جس قدر قویٰ ہیں ان کی حکمت اور خواص پر تو نظر نہ کی جاوے اور بالوں کے ٹیڑھے ہونے یا اور اس قسم کی باتوں پر اعتراض کیا جاوے[1]۔

۲۹ نومبر ۱۹۰۴ء

کسی اہم کام کے لیے نماز توڑنا

افریقہ سے ڈاکٹر محمد علی خاں صاحب نے استفسار کیا کہ اگر ایک احمدی بھائی نماز پڑھ رہا ہو اور باہر سے اس کا افسر آ جاوے اور دروازہ کو ہلا ہلا کر اور ٹھونک ٹھونک کر پکارے اور دفتر یا دوائی خانہ کی چابی مانگے تو ایسے وقت میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے ایک شخص نوکری سے محروم ہو کر ہندوستان واپس چلا گیا ہے۔

جواب :۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ :

ایسی صورت میں ضروری تھا کہ وہ دروازہ کھول کر چابی افسر کو دے دیتا (یہ ہسپتال کا واقعہ

---

[1] البدر جلد ۳ نمبر ۴۴-۴۵ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۰۴ء

ہے اس لیے فرمایا[1]) کیونکہ اگر اس کے التوا سے کسی آدمی کی جان چلی جاوے تو یہ سخت معصیت ہوگی۔ احادیث میں آیا ہے کہ نماز میں چل کر دروازہ کھول دیا جاوے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ ایسے ہی اگر لڑکے کو کسی خطرہ کا اندیشہ ہو یا کسی موذی جانور سے جو نظر پڑتا ہو ضرر پہنچتا ہو تو لڑکے کو بچانا اور جانور کو مار دینا اس حال میں کہ نماز پڑھ رہا ہے گناہ نہیں ہے اور نماز فاسد نہیں ہوتی، بلکہ بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ گھوڑا کھل گیا ہو تو اُسے باندھ دینا بھی مُفسدِ نماز نہیں ہے۔ کیونکہ وقت کے اندر نماز تو پھر بھی پڑھ سکتا ہے[2]۔

نوٹ :۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اشد ضرورتوں کے لیے نازک مواقع پر یہ حکم ہے۔ یہ نہیں کہ ہر ایک قسم کی رفع حاجت کو مقدم رکھ کر نماز کی پروا نہ کی جاوے اور اسے بازیچۂ طفلاں بنا دیا جاوے ورنہ نماز میں اشغال کی سخت ممانعت ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک دل اور نیت کو بخوبی جانتا ہے[3]۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۰۴ء

بوقت ظہر

مریدانِ باصفا کی خاطر داری

حضرت اقدس بوقتِ ظہر تشریف لائے اور مولانا حکیم نورالدین صاحب کی علالتِ طبع کا حال خود ان سے دریافت کیا۔ غذا کے انتظام کے لیے تاکید فرمائی۔ حضرت مولوی صاحب نے عرض کی کہ ہر چند کوشش کی جاتی ہے مگر قدرت کی طرف سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن سے یہ انتظام قائم نہیں رہتا۔ شاید ارادۂ الٰہی ابھی اس امر کا خواہاں نہیں ہے کہ آرام ہو۔

اس اثنا میں ایک صاحب جن کو حکیم صاحب موصوف سے نہایت محبت اور اخلاص اور نیاز مندی کا تعلق ہے بول اُٹھے کہ آخر تدبیر کرنی چاہیے۔ قرآن شریف میں آیا ہے فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (النازعات:۶) حکیم صاحب نے ایک لطیف عارفانہ جواب یہ دیا کہ یہاں صیغہ مؤنث کا استعمال ہوا ہے ــــــ فَالْمُدَبِّرُوْنَ اَمْرًا۔ نہیں ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کا بڑا تعلق اِناث سے ہے (اور ان میں

---

[1] یہ نوٹ ڈائری نویس کا ہے۔ (مرتب)

[2] البدر جلد ۳ نمبر ۴۴، ۴۵ صفحہ ۴ مورخہ ۲۴ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۰۴ء

[3] یہ نوٹ ایڈیٹر صاحب کا معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (مرتب)

مزدور نقص ہوتا ہے) بہرحال یہ ایک عجیب نکتہ ہے۔ اس بحث کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی دلچسپی سے سُنا اور پھر خوراک کا انتظام ایک خاص صاحب کے سپرد فرما کر زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کہ:

یہ سب لوگ سُنتے ہیں اور گواہ ہیں کہ ہم نے اب تم کو ذمہ دار بنا دیا ہے۔ اب اس کا ثواب یا عذاب تمہاری گردن پر ہے[1]۔

---

۲۰ / دسمبر ۱۹۰۴ء

بوقتِ ظہر

اپنے نیک انجام پر پختہ یقین

ظہر کے وقت حضرت اقدس علیہ السلام تشریف لائے۔ مقدمہ کے ذکر پر فرمایا کہ:

خواہ کچھ ہی ہو ہم تو سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور اس پر راضی ہیں۔

ع ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

لیکن ہمارا ایمان جیسے خدا تعالیٰ کے ملائکہ اور کتب اور رُسل پر ہے ایسے ہی اس بات پر بھی ہے کہ انجام کار ہم ہی کامیاب ہوں گے؛ اگرچہ ایک دنیا ہماری مخالف کیوں نہ ہو۔

آج کل کے عقلمندوں کے نزدیک تو کسی کو اپنا دشمن بنانا غلطی ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ بھی حقّانیت کی ایک دلیل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک سے بھی نہ رکھی۔ سب سے بگاڑ لی۔ ان لوگوں کے نزدیک تو نعوذ باللہ آپؐ نے غلطی کی حالانکہ محض خدا تعالیٰ کے لیے سب سے بگاڑ لینا آپ کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے کہ جس سے آپ کی قوّتِ ایمانی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف مسیحؑ کو دیکھو کہ اس کی تعلیم سے جو کہ انجیلوں میں پائی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مشرب کسی کو ناراض کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ یہودیوں کو سُنایا گیا کہ مَیں توریت کا ایک شوشہ تک زیر و زبر کرنے نہیں آیا۔ اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ اُن کی خوشامد مدِّ نظر تھی۔ برخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو دیکھا جاوے تو کوئی بھی فرقہ اور مذہب رُوئے زمین پر ایسا نظر نہ آوے گا جس کو آپؐ نے دعوت نہ کی ہو اور جس کی غلطی نہ نکالی ہو (اور پھر ہر ایک

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۳ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

کے مقابلہ پر اپنے مظفر و منصور ہونے کا دعویٰ بھی کیا) بھلا بتلاؤ کہ جب تک خُدا پر پُورا بھروسہ اور یقین نہ ہو کب کوئی اس طرح سے کر سکتا ہے۔

خیر بات یہ ہے کہ درمیان میں کیا کیا مکروہات ہوں ہمیں اس کا علم نہیں مگر انجام بہرحال نیک ہے۔ الہاموں کی ترتیب میں مَیں یہ امر مدِّ نظر رکھتا ہوں کہ مکروہات کا مرتبہ اوّل رکھا جاتا ہے اور یہ سُنّت اللہ بھی ہے کیونکہ خوشحالی اور کامیابی بعد کو ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے اُن کے الہامات کی ترتیب بھی بعد کو ہی ہوتی ہے۔

عاقبت کا ذخیرہ تیار کرو

کچھ دنوں کا عرصہ گذرا کہ ایک صاحب بہت تھوڑی دیر کے لیے قادیان آئے۔ اور جلدی رُخصت ہونے لگے۔

حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ:

کچھ دن میرے پاس رہو اور عاقبت کا ذخیرہ تیار کر دو دنیا کے کام تو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے۔

؎ خیرے کُن اے فلاں وغنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۳ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

۲۹ر دسمبر ۱۹۰۴ء

تقریر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

برموقعہ جلسہ سالانہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۰۴ء

بعد نماز ظہر بمقام مسجد اقصیٰ

خاتمہ بالخیر کی کوشش کریں

میری طرف سے اپنی جماعت کو بار بار وہی نصیحت ہے جو میں پہلے بھی کئی دفعہ کر چکا ہوں کہ عمر چونکہ تھوڑی[1] اور عظیم الشان کام درپیش ہے، اس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ خاتمہ بالخیر ہو جاوے۔

خاتمہ بالخیر ایسا امر ہے کہ اس کی راہ میں بہت سے کانٹے ہیں۔ جب انسان دُنیا میں آتا ہے تو کچھ زمانہ اس کا بے ہوشی میں گذر جاتا ہے۔ یہ بے ہوشی کا زمانہ وہ ہے جبکہ وہ بچہ ہوتا ہے اور اس کو دنیا اور اس کے حالات سے کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالتا ہے تو ایک ایسا زمانہ آتا ہے کہ وہ بے ہوشی تو نہیں ہوتی، جو بچپن میں تھی لیکن جوانی کی ایک مستی ہوتی ہے جو اس ہوش کے دنوں میں بھی بے ہوشی پیدا کر دیتی ہے اور کچھ ایسا از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ نفسِ امّارہ غالب آ جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر تیسرا زمانہ آتا ہے[2] کہ علم

---

[1] البدر سے :۔ ”انسان کی عمر ناپائیدار ہے اس کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔“
البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ر مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

[2] البدر سے :۔ ”پس دو زمانے تو اس طرح مارے جاتے ہیں۔ پھر تیسرا زمانہ آتا ہے جو کہ پیرانہ سالی کا زمانہ ہوتا ہے۔“
البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

کے بعد پھر لاعلمی آجاتی ہے اور حواس میں اور دُوسرے قویٰ میں فتور آنے لگتا ہے۔ یہ پیرانہ سالی کا زمانہ ہے۔ بہت سے لوگ اس زمانہ میں بالکل حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور قویٰ بیکار ہو جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں میں جنون کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے بہت سے خاندان ہیں کہ ان میں ساٹھ یا ستر سال کے بعد انسان کے حواس میں فتور آجاتا ہے۔ غرض اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی قویٰ کی کمزوری اور طاقتوں کے ضائع ہو جانے سے انسان ہوش میں بے ہوش ہوتا ہے[1] اور ضعف وکاہل اپنا اثر کرنے لگتا ہے۔ انسان کی عمر کی تقسیم انہیں تین زمانوں پر ہے اور یہ تینوں ہی خطرات اور مشکلات میں ہیں پس اندازہ کرو کہ خاتمہ بالخیر کے لیے کس قدر مشکل مرحلہ ہے۔

بچپن کا زمانہ تو ایک مجبوری کا زمانہ ہے۔ اس میں سوائے لہو، لعب اور کھیل کُود اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے اور کوئی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ ساری خواہشوں کا منتہا کھانا پینا ہی ہوتا ہے۔ دُنیا اور اس کے حالات سے محض ناواقف ہوتا ہے۔ امورِ آخرت سے بکلی ناآشنا اور لاپروا ہوتا ہے۔ عظیم الشان اُمور کی اسے کوئی خبر ہی نہیں ہوتی۔ وہ نہیں جانتا کہ دُنیا میں اس کے آنے کی کیا غرض اور مقصد ہے۔ یہ زمانہ تو یوں گذر گیا۔ اس کے بعد جوانی کا زمانہ آتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اس زمانہ میں اس کے معلومات بڑھتے ہیں اور اس کی خواہشوں کا حلقہ وسیع ہوتا ہے، مگر جوانی کی مستی اور نفسِ امّارہ کے جذبات عقل مار دیتے ہیں اور ایسی مشکلات میں پھنس جاتا ہے اور ایسے ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ اگر ایمان بھی لاتا ہے تب بھی نفسِ امّارہ اور اس کے جذبات اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اُسے ایمان اور اس کے ثمرات سے دُور پھینک دینے کے لیے حملے کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو پیرانہ سالی کا زمانہ ہے وہ تو بجائے خود ایسا نکما اور ردّی ہوتا ہے۔ جیسے کسی چیز سے عرق نکال لیا جاوے اور اس کا پھوک باقی رہ جاوے۔ اسی طرح پر انسانی عمر کا پھوک بڑھاپا ہے۔ انسان اس وقت نہ دُنیا کے لائق رہتا ہے اور نہ دین کے۔ مخبوط الحواس اور مضمحل سا ہو کر اوقات بسر کرتا ہے۔ قویٰ میں وہ تیزی اور حرکت نہیں ہوتی جو جوانی میں ہوتی ہے اور بچپن کے زمانہ سے بھی گیا گذرا ہو جاتا ہے۔ بچپن میں اگرچہ شوخی، حرکت اور نشو و نما ہوتا ہے، لیکن بڑھاپے میں یہ باتیں نہیں۔ نشو و نما کی بجائے اب قویٰ میں تحلیل ہوتی ہے اور کمزوری کی وجہ سے سُستی اور کاہلی پیدا ہونے لگتی ہے۔

بچہ اگرچہ نماز اور اس کے مراتب اور ثمرات اور فوائد سے ناواقف ہو گا یا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے کسی عزیز کو دیکھ کر رِیس اور امنگ ہی پیدا ہو جاتی ہے، مگر اس پیرانہ سالی کے زمانہ میں تو اس کے بھی

---

[1] البدر سے "اور بچپن کے سے خواص اُن میں پائے جاتے ہیں"

البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

قابل نہیں رہتا۔[1]

حواسِ باطنی میں جس طرح اس وقت فرق آجاتا ہے حواسِ ظاہری میں بھی معمر ہو کر بہت کچھ فتور پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اندھے ہو جاتے ہیں۔ بہرے ہو جاتے ہیں۔ چلنے پھرنے سے عاری ہو جاتے ہیں اور قسم قسم کی مصیبتوں اور دُکھوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ غرض یہ زمانہ بھی بڑا ہی ردّی زمانہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی زمانہ ہے جو ان دونوں کے بیچ کا زمانہ ہے یعنی شباب کا جب انسان کوئی کام کر سکتا ہے، کیونکہ اس وقت قُویٰ میں نشوونما ہوتا ہے اور طاقتیں آتی ہیں، لیکن یہی زمانہ ہے جبکہ نفسِ امّارہ ساتھ ہوتا ہے اور وہ اس پر مختلف رنگوں میں حملے کرتا ہے اور اپنے زیرِ اثر رکھنا چاہتا ہے۔ یہی زمانہ ہے جو مؤاخذہ کا زمانہ ہے اور خاتمہ بالخیر کے لیے کچھ کرنے کے دن بھی یہی ہیں، لیکن ایسی آفتوں میں گھرا ہوا ہے کہ اگر بڑی سعی نہ کی جاوے تو یہی زمانہ ہے جو جہنم میں لے جائے گا اور شقی بنا دے گا۔ ہاں اگر عمدگی اور ہوشیاری اور پوری احتیاط کے ساتھ اس زمانہ کو بسر کیا جاوے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ خاتمہ بالخیر ہو جاوے کیونکہ ابتدائی زمانہ تو بے خبری اور غفلت کا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا مؤاخذہ نہ کرے گا۔ جیسا کہ اس نے خود فرمایا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرة : ۲۸۷) اور آخری زمانہ میں گو بڑھاپے کی وجہ سے سُستی اور کاہلی ہو گی، لیکن فرشتے اس وقت اس کے اعمال میں وہی لکھیں گے جو جوانی کے جذبات اور خیالات ہیں۔ جوانی میں اگر نیکیوں کی طرف مستعد اور خدا تعالیٰ کا خوف رکھنے والا، اس کے احکام کی تعمیل کرنے والا اور نواہی سے بچنے والا ہے تو بڑھاپے میں گو ان کے اعمال کی بجا آوری میں کسی قدر سُستی بھی ہو جاوے لیکن اللہ تعالیٰ اسے معذور سمجھ کر ویسا ہی اجر دیتا ہے۔[2]

---

[1] البدر سے :- ”پیرانہ سالی میں کسل اور کاہلی اس کے لاحقِ حال ہو جاتے ہیں۔ جہاں پڑا وہیں پڑا رہتا ہے۔ جہاں بیٹھا وہیں بیٹھا رہتا ہے۔“

البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

[2] البدر سے :- ”اگر اس نے یہ زمانہ خدا کی بندگی، اپنے نفس کی آراستگی اور خُدا کی اطاعت میں گذرا ہو گا تو اس کا اسے یہ پھل ملے گا کہ پیرانہ سالی میں جبکہ وہ کسی قسم کی عبادت وغیرہ کے قابل نہ رہے گا اور کسل اور کاہلی اسے لاحق حال ہو جاوے گی تو فرشتے اس کے نامۂ اعمال میں وہی نماز روزہ تہجد وغیرہ لکھتے رہیں گے جو کہ وہ جوانی کے ایام میں بجا لاتا تھا اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے۔ کہ اس کی ذاتِ پاک اپنے بندہ کو معذور جان کر باوجود اس کے کہ وہ عمل بجا نہیں لاتا پھر بھی وہی اعمال اس کے نام درج ہوتے رہتے ہیں۔

البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

ہر شخص بڈھے انسان کو دیکھتا ہے کہ وہ کیسا از خود رفتگی کا زمانہ ہے[1]۔ کوئی بات چشم دید کی طرح سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس لیے ان لوگوں پر خدا تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوتا ہے۔ جو ابتدائی زمانہ میں اس زمانہ کے لیے سعی کرتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں ان کے لیے وہی تقویٰ اور خدا تعالیٰ کی بندگی لکھی جاتی ہے۔ غرض آخر وہی ایک زمانہ جو جوانی کے جذبات اور نفسِ امّارہ کی شوخیوں کا زمانہ ہے کچھ کام کرنے کا زمانہ رہ جاتا ہے۔ اس لیے اب سوچنا چاہیے کہ وہ کیا طریق ہے جس کو اختیار کر کے انسان کچھ آخرت کے لیے کما سکے۔

خاتمہ بالخیر کے حصول کے تین ذرائع

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ زمانہ جو شباب اور جوانی کا زمانہ ہے ایک ایسا زمانہ ہے کہ نفسِ امّارہ نے اس کو ردّی کیا ہوا ہے لیکن اگر کوئی کارآمد ایام ہیں تو یہی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی قرآن شریف میں درج ہے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (یوسف : ۵۴) یعنی میں اپنے نفس کو بَری نہیں ٹھہرا سکتا کیونکہ نفسِ امّارہ بدی کی طرف تحریک کرتا ہے۔ اس کی اس قسم کی تحریکوں سے وہی پاک ہو سکتا ہے جس پر میرا ربّ رحم کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی بدیوں اور جذبات سے بچنے کے واسطے نری کوشش ہی شرط نہیں بلکہ دُعاؤں کی بہت بڑی ضرورت ہے نرا زُہدِ ظاہری ہی (جو انسان اپنی سعی اور کوشش سے کرتا ہے) کارآمد نہیں ہوتا جبتک خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم ساتھ نہ ہو اور اصل تو یہ ہے کہ اصل زہد اور تقویٰ تو ہے ہی وہی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ حقیقی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ اسی طرح ملتا ہے، ورنہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ بہت سے جامے بالکل سفید ہوتے ہیں اور باوجود سفید ہونے کے بھی وہ پلید ہو سکتے ہیں تو اس ظاہری تقوےٰ اور طہارت کی ایسی ہی مثال ہے[2]؛ تاہم اس حقیقی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ اور طہارت کے حصول کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اسی زمانہ شباب و جوانی میں انسان کوشش کرے جبکہ قویٰ میں قوّت اور طاقت اور دل میں

---

[1] البدر سے :- ”بوڑھوں کا دُنیا میں موجود ہونا جوانوں کے لیے عبرت کا مقام ہے مگر انسان کے دل پر اس قسم کا حجاب ہوتا ہے کہ وہ باوجود دیکھنے کے نہیں دیکھتا اور باوجود سُننے کے نہیں سُنتا ورنہ اس قسم کے نظاروں کو دیکھ کر وہ اپنی جوانی کے ایام میں خدا تعالیٰ سے اپنے تعلقات مضبوط کرے۔

البدر جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

[2] البدر میں ہے :- ”ہر ایک چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی زہد اور تقویٰ کا بھی ایک ظاہر ہوتا ہے اور اکثر لوگ بظاہر متّقی اور زاہد ہوتے ہیں لیکن جبتک خُدا کا فضل اور رحم بھی انسان کے شاملِ حال نہ ہو تب تک وہ اس کے کام نہیں آسکتا۔“ (البدر حوالہ مذکور۔)

ایک اُمنگ اور جوش ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں کوشش کرنا عقلمند کا کام ہے اور عقل اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دی ہے[1]۔

پہلا ذریعہ تدبیر

اس مقصد کے حاصل کرنے کے واسطے (جیسا کہ میں پہلے کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں) اول ضروری ہے کہ انسان دیدہ دانستہ اپنے آپ کو گناہ کے گڑھے میں نہ ڈالے ورنہ وہ ضرور ہلاک ہوگا۔ جو شخص دیدہ دانستہ بدراہ اختیار کرتا ہے یا کنوئیں میں گرتا ہے اور زہر کھاتا ہے وہ یقیناً ہلاک ہوگا۔ ایسا شخص نہ دُنیا کے نزدیک اور نہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ رحم ٹھہر سکتا ہے اس لیے یہ ضروری اور بہت ضروری ہے خصوصاً ہماری جماعت کے لیے (جس کو اللہ تعالیٰ نمونہ کے طور پر انتخاب کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ آنیوالی نسلوں کے لیے ایک نمونہ ٹھہرے) کہ جہانتک ممکن ہے بدصحبتوں اور بدعادتوں سے پرہیز کریں[2]۔ اور اپنے آپ کو نیکی کی طرف لگائیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنیکے واسطے جہانتک تدبیر کا حق ہے تدبیر کرنی چاہیے اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

یاد رکھو تدبیر بھی ایک مخفی عبادت ہے اس کو حقیر مت سمجھو۔ اسی سے وہ راہ کُھل جاتی ہے جو بدیوں سے نجات پانے کی راہ ہے۔ جو لوگ بدیوں سے بچنے کی تجویز اور تدبیر نہیں کرتے ہیں وہ گویا بدیوں پر راضی ہو جاتے ہیں اور اس طرح پر خدا تعالیٰ اُن سے الگ ہو جاتا ہے[3]۔

---

[1] البدر میں ہے۔ "عقلمند انسان کا یہ کام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اس زمانہ کے مفاسد پر غور کرے اور عقل اس لیے اُسے دی گئی ہے کہ وہ اس طوفانِ عظیم سے جو کہ لوگوں کی روحانیت کو تباہ کر رہا ہے اپنے آپ کو بچا وے۔"

البدر جلد۴ نمبر۱ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

[2] البدر سے : "اس قسم کی مجلسوں اور صحبتوں اور رفیقوں اور دوستوں سے پرہیز کرے جو کہ اس کی رُوحانیت پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔"

(البدر حوالہ مذکور)

[3] البدر سے : "تقویٰ اور نیکی کے حصول کے لیے تدابیر کی جستجو میں لگے رہنا یہ بھی ایک عبادت ہے اور جب انسان اس کوشش میں لگا رہتا ہے تو عادت اللہ یہی ہے کہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راہ کھول دی جاتی ہے لیکن جو شخص بدی سے بچنے کی اور نیکی کو عمل میں لانے کی تدبیر نہیں کرتا۔ سمجھو کہ وہ بدی پر راضی ہو گیا ہے اور ایسے آدمی سے بدی کا چھوڑنا محال ہو جاتا ہے۔"

(البدر حوالہ مذکور)

مَیں پھر کہتا ہوں کہ جب انسان نفسِ امارہ کے پنجہ میں گرفتار ہونے کے باوجود بھی تدبیروں میں لگا ہوا ہوتا ہے تو اس کا نفس امارہ خدا تعالیٰ کے نزدیک لوّامہ ہو جاتا ہے اور ایسی قابلِ قدر تبدیلی پالیتا ہے کہ گویا تو وہ امارہ تھا جو لعنت کے قابل تھا اور یا تدبیر اور تجویز کرنے سے وہی قابلِ لعنت نفسِ امارہ نفسِ لوّامہ ہو جاتا ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ خدا تعالیٰ بھی اس کی قسم کھاتا ہے[1]۔ یہ کوئی چھوٹا شرف نہیں ہے۔ پس حقیقی تقویٰ اور طہارت کے حاصل کرنے کے واسطے اوّل یہ ضروری شرط ہے کہ جہاں تک بس چلے اور ممکن ہو تدبیر کرو اور بدی سے بچنے کی کوشش کرو۔ بدعادتوں اور بد صحبتوں کو ترک کر دو۔ ان مقامات کو چھوڑ دو جو اس قسم کی تحریکوں کا موجب ہو سکیں جس قدر دُنیا میں تدابیر کی راہ کھلی ہے اس قدر کوشش کرو اور اس سے نہ تھکو نہ ہٹو۔

دوسرا ذریعہ دُعا

دُوسرا طریق حقیقی پاکیزگی کے حاصل کرنے اور خاتمہ بالخیر کے لیے جو خدا تعالیٰ نے سکھایا ہے[2] وہ دُعا ہے اس لیے جس قدر ہو سکے دُعا کرو۔ یہ طریق بھی اعلیٰ درجہ کا مجرب اور مفید ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) تم مجھ سے دُعا کرو مَیں تمہارے لیے قبول کروں گا۔ دُعا ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیے[3]۔ دُوسری قوموں کو دُعا کی کوئی قدر نہیں اور نہ انہیں اس پاک طریق پر کوئی فخر اور ناز ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ فخر اور ناز صرف اسلام ہی کو ہے دُوسرے مذاہب اس سے بکلّی بے بہرہ ہیں۔ مثلاً عیسائیوں نے جب یہ سمجھ لیا ہے کہ ایک انسان (جس کو انہوں نے خدا مان لیا) نے ہمارے لیے قربانی دے دی ہے۔ انہوں

---

[1] البدر سے : "پہلے امارہ تھا کہ سوائے بدی کے اُسے کچھ سُوجھتا ہی نہ تھا اور اب اس کی جنگ شروع ہو گئی ہے کبھی غالب ہوتا ہے کبھی مغلوب۔ ایک فعلِ بد کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر اس پر پچھتاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کی تلافی کیونکر ہو اور چونکہ وہ ملامت کرتا ہے اس لیے اس کا نام لوّامہ ہو جاتا ہے۔ خدا نے بھی اسی لیے اس کی قسم قرآن شریف میں کھائی ہے کیونکہ یہ اپنی حالت سے خدا کی طرف ایک رجوع ظاہر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے قریب ہو جاوے۔"

البدر جلد ۵ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۵ء

[2] البدر سے : "جو کہ دراصل سب سے مقدم ہے اور جس کی تعلیم خدا تعالیٰ نے بھی دی ہے۔"

(البدر حوالہ مذکور)

[3] البدر سے : "اصل بات یہ ہے کہ لوگ دُعا کی حقیقت سے بیخبر ہیں اور مسلمانوں نے بھی اس میں سخت ٹھوکر کھائی ہے کہ دُعا جیسی شے کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے ہیں۔" (البدر حوالہ مذکور)

نے اس پر بھروسہ کر لیا اور سمجھ لیا کہ ہمارے سارے گناہ اس نے اُٹھا لیے ہیں۔ پھر وہ کونسا امر ہے جو اس کو دعا کے لیے تحریک کرے گا۔ ناممکن ہے کہ وہ گدازشِ دل کے ساتھ دُعا کرے۔ دُعا تو وہ کرتا ہے جو اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کو سمجھتا ہے، لیکن جو شخص اپنے آپ کو بری الذمہ تصور کرتا ہے وہ دُعا کیوں کرے گا۔ اس نے تو پہلے ہی سمجھ لیا ہے کہ گناہ دُوسرے شخص نے اُٹھا لیے ہیں اور اس طرح پر اس کے ذمہ کوئی جواب دہی نہیں تو اس کے دل میں تحریک کس طرح ہوگی۔ اس نے اور شئے پر بھروسہ کر لیا ہے اور اس طرح پر اس طریق سے جو دُعا کا طریق ہے وہ دُور چلا گیا ہے۔[1]

غرض ایک عیسائی کے نزدیک دُعا بالکل بے سُود ہے اور وہ اس پر عمل نہیں کر سکتا۔ اس کے دل میں وُہ رقّت اور جوش جو دُعا کے لیے حرکت پیدا کرتا ہے نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح پر ایک آریہ جو تناسخ کا قائل ہے اور سمجھتا ہے کہ توبہ قبول ہی نہیں ہو سکتی اور کسی طرح پر اس کے گناہ معاف نہیں ہو سکتے وہ دُعا کیوں کرے گا؟ اس نے تو یہ یقین کیا ہوا ہے کہ جُونوں کے چکر میں جانا ضروری ہے اور بیل۔ گھوڑا۔ گدھا۔ گائے۔ کُتا۔ سؤر وغیرہ بننا ہے۔ وہ اس راہ کی طرف آئے گا ہی نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دُعا اسلام کا خاص فخر ہے اور مُسلمانوں کو اس پر بڑا ناز ہے۔

مگر یہ یاد رکھو کہ یہ دُعا زبانی بک بک کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ چیز ہے کہ دل خدا تعالیٰ کے خوف سے بھر جاتا ہے اور دعا کرنے والے کی رُوح پانی کی طرح بہہ کر آستانۂ الُوہیت پر گرتی ہے اور اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کے لیے قوی اور مقتدر خُدا سے طاقت اور قوت اور مغفرت چاہتی ہے اور یہ وہ حالت ہے کہ دُوسرے الفاظ میں اس کو موت کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ حالت میسر آ جاوے تو یقیناً سمجھو کہ بابِ اجابت اس کے لیے کھولا جاتا ہے اور خاص قوت اور فضل اور استقامت بدیوں سے بچنے اور نیکیوں پر استقلال کیلئے عطا ہوتی ہے یہ ذریعہ سب سے بڑھ کر زبردست ہے۔

اس زمانہ کے لوگ دعا کی تاثیرات کے منکر ہو گئے ہیں

مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ دعا کی حقیقت اور حالت سے محض ناواقف ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس زمانہ میں بہت سے لوگ اس سے منکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ ان تاثیرات کو نہیں پاتے اور منکر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو

---

[1] البدر سے: ”پس جسے کسی دوسری راہ پر بھروسہ ہے وُہ دُعا کی راہ پر کب آوے گا۔“
البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۵ء

ہونا ہی ہے پھر دُعا کی کیا حاجت ہے، مگر مَیں خوب جانتا ہوں کہ یہ تو نِرا بہانہ ہے انہیں چونکہ دُعا کا تجربہ نہیں اِن کی[۱] تاثیرات پر اطلاع نہیں اس لیے اس طرح کہہ دیتے ہیں، ورنہ اگر وہ ایسے ہی متوکّل ہیں تو پھر بیمار ہو کر علاج کیوں کرتے ہیں۔؟ خطرناک امراض میں مبتلا ہوتے ہیں تو طبیب کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ بلکہ مَیں سچ کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ چارہ کرنے والے یہی ہوتے ہیں۔ سید احمد خاں بھی دُعا کے منکر تھے، لیکن جب اُن کا پیشاب بند ہوا تو دہلی سے معالج ڈاکٹر کو بُلایا۔ یہ نہ سمجھ لیا کہ خود بخود ہی پیشاب کھل جاوے گا، حالانکہ وہی خدا ہے جس کے ملکوت میں ظاہری دُنیا ہے جبکہ دُوسرے اشیاء میں تاثیرات موجود ہیں تو کیا وجہ ہے کہ باطنی دُنیا میں تاثیرات نہ ہوں[۲]۔ جن میں سے دُعا ایک زبردست چیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کے قضا و قدر میں سب کچھ ہے مگر کوئی یہ تو بتائے کہ خدا تعالیٰ نے وُہ فہرست کس کو دی ہے جس سے معلوم ہو جاوے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ ان اسرار پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔ ظاہر میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص قبض سے بیمار ہے تو تربد یا کسٹرائیل جب اس کو دیا جاوے گا تو اسے اسہال آجاویں گے۔ اور قبض کھل جائے گی۔ کیا یہ اس امر کا بیّن ثبوت نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ نے تاثیرات رکھی ہوئی ہیں۔

اسی طرح پر اَور تدابیر کرنے والے ہیں۔ مثلاً زراعت کرنے والے اور یہی معالجات کرنے والے وہ خُوب جانتے ہیں کہ ان تدابیر کی وجہ سے اُنھوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور اشیاء میں مختلف اثر دیکھے ہیں پھر جبکہ ان چیزوں میں تاثیرات موجود ہیں تو کیا وجہ ہے کہ دُعاؤں میں جو وہ بھی مخفی اسباب اور تدابیر ہیں اثر نہ ہوں؟ اثر ہیں اور ضرور ہیں۔ لیکن تھوڑے لوگ ہیں جو ان تاثیرات سے واقف اور آشنا ہیں اس لیے انکار کر بیٹھتے ہیں۔

آدابِ دُعا

مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ چونکہ بہت سے لوگ دُنیا میں ایسے ہیں جو اس نقطہ سے جہاں دُعا اثر کرتی ہے دُور رہ جاتے ہیں اور وہ تھک کر دُعا چھوڑ دیتے ہیں اور خود ہی یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ دعاؤں میں کوئی اثر نہیں ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ یہ تو اُن کی اپنی غلطی اور کمزوری ہے۔ جب تک کافی وزن نہ ہو خواہ زہر ہو یا تریاق اس کا اثر نہیں ہوتا۔ کسی کو بھوک لگی ہوئی ہو اور وہ چاہے کہ ایک دانہ سے پیٹ بھرے یا تولہ بھر غذا کھائے تو کیا ہو سکتا ہے کہ وہ سیر ہو جاوے؟

---

[۱] الحکم جلد ۹ نمبر ۱ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۵ء

[۲] البدر سے: "ایک پہلو میں اس کی قدرت کے تصرفات مانتے ہیں اور دُوسرے میں جا کر انکار کرتے ہیں۔
البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۲ کالم اوّل مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۵ء

کبھی نہیں۔ اسی طرح جس کو پیاس لگی ہوتی ہے ایک قطرہ پانی سے اس کی پیاس کب بجھ سکتی ہے، بلکہ سیر ہونے کے لیے چاہیے کہ وہ کافی غذا کھاوے اور پیاس بجھانے کے واسطے لازم ہے کہ کافی پانی پیوے۔ تب جاکر اس کی تسلی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح پر دُعا کرتے وقت بے دلی اور گھبراہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے اور جلدی ہی تھک کر نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ اس وقت تک ہٹنا نہیں چاہیے جب تک دُعا اپنا پورا اثر نہ دکھائے۔ جو لوگ تھک جاتے اور گھبرا جاتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں کیونکہ یہ محروم رہ جانے کی نشانی ہے۔ میرے نزدیک دُعا بہت عمدہ چیز ہے[1] میں اپنے تجربہ سے کہتا ہوں خیالی بات نہیں۔ جو مشکل کسی تدبیر سے حل نہ ہوتی ہو اللہ تعالےٰ دُعا کے ذریعہ اُسے آسان کر دیتا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ دُعا بڑی زبردست اثر والی چیز ہے۔ بیماری سے شفا اس کے ذریعہ ملتی ہے۔ دُنیا کی تنگیاں مشکلات اس سے دُور ہوتی ہیں۔ دشمنوں کے منصوبے سے یہ بچا لیتی ہے اور وہ کیا چیز ہے جو دُعا سے حاصل نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کو پاک یہ کرتی ہے اور خدا تعالےٰ پر زندہ ایمان یہ بخشتی ہے۔ گناہ سے نجات دیتی ہے اور نیکیوں پر استقامت اس کے ذریعہ سے آتی ہے۔ بڑا ہی خوش قسمت وہ شخص ہے جس کو دُعا پر ایمان ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عجیب در عجیب قدرتوں کو دیکھتا ہے اور خدا تعالیٰ کو دیکھ کر ایمان لاتا ہے کہ وہ قادر کریم خدا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شروع قرآن ہی میں دُعا سکھائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان اور ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ (الفاتحۃ: ۲-۴) اس میں اللہ تعالیٰ کی چار صفات کو جو امّ الصفات ہیں بیان فرمایا ہے۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ذرّہ ذرّہ کی ربوبیّت کر رہا ہے۔ عالم اسے کہتے ہیں جس کی خبر مل سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز دُنیا میں ایسی نہیں ہے جس کی ربوبیت نہ کرتا ہو۔ ارواح اجسام وغیرہ سب کی ربوبیّت کر رہا ہے۔ وہی ہے جو ہر ایک چیز کے حسبِ حال اس کی پرورش کرتا ہے جہاں جسم کی پرورش فرماتا ہے وہاں رُوح کی سیری اور تسلّی کے لیے معارف اور حقائق وہی عطا فرماتا ہے۔

پھر فرمایا ہے کہ وہ رحمٰن ہے یعنی اعمال سے بھی پیشتر اس کی رحمتیں موجود ہیں۔ پیدا ہونے سے

---

[1] البدر سے: "انسان ہر وقت ایک سیلاب میں پڑا ہوا ہے۔ اور دُعا ہی ایک ایسی شے ہے جو کہ اس سے اس کو نجات دلا سکتی ہے۔" (البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۵ء)

پہلے ہی زمین، چاند، سُورج، ہوا، پانی وغیرہ جس قدر اشیاء انسان کے لیے ضروری ہیں موجود ہوتی ہیں۔

اور پھر وُہ اللہ رحیم ہے یعنی کسی کے نیک اعمال کو ضائع نہیں کرتا بلکہ پاداشِ عمل دیتا ہے۔

پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے یعنی جزا وہی دیتا ہے اور وہی یوم الجزاء کا مالک ہے۔ اس قدر صفات اللہ کے بیان کے بعد دُعا کی تحریک کی ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی ہستی اور ان صفات پر ایمان لاتا ہے، تو خواہ مخواہ رُوح میں ایک جوش اور تحریک ہوتی ہے اور دُعا کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے۔ اس کے بعد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی ہدایت فرمائی ہے[۱]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تجلیات اور رحمتوں کے ظہور کے لیے دُعا کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ اس لیے اس پر ہمیشہ کمربستہ رہو اور کبھی مت تھکو۔

غرض اصلاحِ نفس کے لیے اور خاتمہ بالخیر ہونے کے لیے نیکیوں کی توفیق پانے کے واسطے دُوسرا پہلو دُعا کا ہے۔ اس میں جس قدر توکّل اور یقین اللہ تعالیٰ پر کریگا اور اس راہ میں نہ تھکنے والا قدم رکھے گا اسی قدر عمدہ نتائج اور ثمرات ملیں گے۔ تمام مشکلات دُور ہو جائیں گی اور دُعا کرنے والا تقویٰ کے اعلیٰ محل پر پہنچ جائے گا یہ بالکل سچی بات ہے کہ جبتک خدا تعالیٰ کسی کو پاک نہ کرے کوئی پاک نہیں ہو سکتا۔ نفسانی جذبات پر محض خدا تعالیٰ کے فضل اور جذبہ ہی سے موت آتی ہے اور یہ فضل اور جذبہ دُعا ہی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ طاقت صرف دُعا ہی سے ملتی ہے۔

مَیں پھر کہتا ہوں کہ مسلمانوں اور خصوصاً ہماری جماعت کو ہرگز ہرگز دُعا کی بے قدری نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہی دُعا تو ہے جس پر مسلمانوں کو ناز کرنا چاہیے۔ اور دُوسرے مذاہب کے آگے تو دعا کے لیے گندے پتھر پڑے ہوئے ہیں[۲]۔ اور وہ توجہ نہیں کر سکتے۔ مَیں نے ابھی بیان کیا ہے کہ ایک عیسائی جو خونِ مسیح پر ایمان لاکر سارے

---

[۱] البدر سے: "ان صفات کے بیان کے بعد دُعا کی تحریک کی ہے کہ تو جو ربّ، رحمان اور رحیم ہے میری مشکل کشائی فرما اور صراطِ مستقیم دکھا جو تو اپنے پیارے برگزیدوں کو دکھاتا رہا ہے ہم تیری راہ بجز تیرے فضل کے نہیں پا سکتے۔" [البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۵ء]

[۲] البدر میں یوں لکھا ہے: "دُوسرے مسلمانوں کی طرح ہماری جماعت کو ہرگز دُعا کی بے قدری نہ کرنی چاہیے اور ان تمام پتھروں کو راستہ میں سے دُور کر دینا چاہیے جو کہ اس کی روک بنے ہوتے ہیں۔ جیسے پانی کے آگے پتھر ہوں تو وُہ رُک جاتا ہے۔ ایسے ہی دوسرے لوگوں نے گندے پتھر دُعا کی راہ میں ڈالے ہوتے ہیں اور وُہ ان کی اپنی بدکاریاں اور بدعقیدگیاں ہیں لیکن تم لوگوں کو ان کی مثال نہ ہونا چاہیے۔ اور تمہارا کوئی کاروبار دعا کے سوا نہ ہوا کرے۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے۔ (بقیہ ۲ حاشیہ اگلے صفحہ پر

گناہوں کو معاف شدہ سمجھتا ہے۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وُہ دُعا کرتا رہے۔ اور ایک ہندو جو یقین کرتا ہے کہ توبہ قبول ہی نہیں ہوتی اور تناسخ کے چکر سے رہائی ہی نہیں ہے وہ کیوں دُعا کے واسطے ٹکریں مارتا رہے گا۔ وُہ تو یقیناً سمجھتا ہے کہ کُتے، بِلے، بندر، سؤر بننے سے چارہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ یہ اسلام کا فخر اور مانتا ہے کہ اس میں دُعا کی تعلیم ہے اس میں کبھی سُستی نہ کرو اور نہ اس سے تھکو۔

پھر دُعا خدا تعالیٰ کی ہستی کا زبردست ثبوت ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ ایک جگہ فرماتا ہے۔ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرۃ: ۱۸۷) یعنی جب میرے بندے تجھ سے سوال کریں کہ خدا کہاں ہے اور اس کا کیا ثبوت ہے تو کہدو کہ وہ بہت ہی قریب ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی دُعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو مَیں اسے جواب دیتا ہوں۔ یہ جواب کبھی رؤیا صالحہ کے ذریعہ ملتا ہے اور کبھی کشف اور الہام کے واسطے سے۔ اور علاوہ بریں دعاؤں کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا قادر ہے کہ مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔

غرض دُعا بڑی دولت اور طاقت ہے اور قرآن شریف میں جابجا اس کی ترغیب دی ہے اور ایسے لوگوں کے حالات بھی بتاتے ہیں جنھوں نے دُعا کے ذریعہ اپنی مشکلات سے نجات پائی۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی جڑ اور ان کی کامیابیوں کا اصل اور سچا ذریعہ یہی دُعا ہے۔ پس مَیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی ایمانی اور عملی طاقت کو بڑھانے کے واسطے دعاؤں میں لگے رہو۔ دُعاؤں کے ذریعہ سے ایسی تبدیلی ہوگی جو خُدا کے فضل سے خاتمہ بالخیر ہو جاوے گا۔

تیسرا ذریعہ صُحبتِ صادقین

تیسرا پہلو[1] جو قرآن سے ثابت ہے وہ صُحبتِ صادقین ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ: ۱۱۹)

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ سوتے جاگتے دُعا کی عادت ڈالو اور اس سے غافل ہرگز نہ ہو عیسائیوں کی طرح ہرگز مت بنو کہ جنھوں نے کفارہ پر بھروسہ کرکے دُعا کی ضرورت کو معدوم کر دیا ہے۔

البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء

[1] البدر سے: "تیسرا پہلو حصولِ نجات اور تقویٰ کا صادقوں کی معیّت ہے جس کا حکم قرآنِ شریف میں ہے۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ یعنی اکیلے نہ رہو کہ اس حالت میں شیطان کا داؤ انسان پر ہوتا ہے بلکہ صادقوں کی معیّت اختیار کرو اور اُن کی جمعیّت میں رہو تاکہ ان کے انوار اور برکات کا پر تو تم پر پڑتا رہے۔ اور خانۂ قلب کے ہر ایک خس و خاشاک کو محبتِ الٰہی کی آگ سے جلا کر نورِ الٰہی سے بھر دے۔"

(البدر حوالہ مذکور)

یعنی صادقوں کے ساتھ رہو۔ صادقوں کی صحبت میں ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ ان کا نورِ صدق و استقلال دُوسروں پر اثر ڈالتا ہے اور اُن کی کمزوریوں کو دُور کرنے میں مدد دیتا ہے۔

یہ تین ذریعے ہیں جو ایمان کو شیطان کے حملوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور اُسے طاقت دیتے ہیں اور جبتک ان ذرائع سے انسان فائدہ نہیں اُٹھاتا اس وقت تک اندیشہ رہتا ہے کہ شیطان اس پر حملہ کرکے اسکے متاعِ ایمان کو چھین لے جاوے اسی لیے بہت بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم کو رکھا جاوے اور ہر طرح سے شیطانی حملوں سے احتیاط کی جاوے۔ جو شخص ان تینوں ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح نہیں کرتا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کسی اتفاقی حملہ سے نقصان اُٹھاوے۔

دفعِ شر کے بعد کسبِ خیر اصل مقصد ہے

لیکن یہ بات یاد رکھو کہ کتابوں میں جب لکھا جاتا ہے کہ بدیاں چھوڑ دو اور نیکیاں کرو تو بعض آدمی اتنا ہی سمجھ لیتے ہیں کہ نیکیوں کا کمال اسی قدر ہے کہ جو مشہور بدیاں ہیں مثلاً چوری، زنا، غیبت، بددیانتی، بدنظری وغیرہ موٹی موٹی بدیوں سے بچتے ہیں تو اپنے آپ کو سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے نیکی کے تمام مدارج حاصل کرلیے ہیں اور ہم بھی کچھ ہوگئے ہیں۔ حالانکہ اگر غور کرکے دیکھا جاوے تو یہ کچھ بھی چیز نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو چوری نہیں کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو ڈاکے نہیں مارتے یا خون نہیں کرتے یا بدنظری یا بدکاری کی بدعادتوں میں مبتلا نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایسے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ترکِ شر کیا ہے خواہ وہ عدمِ قدرت ہی کی وجہ سے ہو۔ قرآنِ شریف صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ انسان ترکِ شر کرکے سمجھ لے کہ بس اب مَیں صاحبِ کمال ہوگیا، بلکہ وہ تو انسان کو اعلیٰ درجہ کے کمالات اور اخلاقِ فاضلہ سے متصف کرنا چاہتا ہے کہ اس سے ایسے اعمال و افعال سرزد ہوں جو بنی نوع کی بھلائی اور ہمدردی پر مشتمل ہوں اور اُن کا نتیجہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاوے۔ مَیں اس بات کو بار بار کہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی اپنی ترقی اور کمالِ رُوحانی کی یہی انتہا نہ سمجھ لے کہ مَیں نے ترکِ بدی کی ہے۔ صرف ترکِ بدی نیکی کے کامل مفہوم اور منشا کو اپنے اندر نہیں رکھتی۔ بار بار ایسا تصوّر کرنا کہ مَیں نے خُون نہیں کیا خوبی کی بات نہیں کیونکہ خون کرنا ہر ایک شخص کا کام نہیں ہے۔ یا یہ کہنا کہ زنا نہیں کیا کیونکہ زنا کرنا تو کنجروں کا کام ہے نہ کہ کسی شریف انسان کا۔ ایسی بدیوں سے پرہیز زیادہ سے زیادہ انسان کو بدمعاشوں کے طبقے سے خارج کردے گا[1] اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر وہ

---

[1] البدر میں ہے : "جو شخص ان باتوں سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ بن گیا تو وہ سخت غلطی پر ہے کیونکہ جو چوری اور زنا نہیں کرتا تو آخر وہ ان کے بُرے انجام اور عذاب سے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جماعت (جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ شریف میں کیا ہے کہ انہوں نے ایسے اعمالِ صالحہ کیے کہ خدا تعالیٰ اُن سے راضی ہوگیا اور وُہ خدا تعالیٰ سے راضی ہوگئے) صرف ترکِ بدی ہی سے نہ بنی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگیوں کو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہیچ سمجھا۔ خُدا کی مخلوق کو نفع پہنچانے کے واسطے اپنے آرام و آسائش کو ترک کر دیا۔ تب جا کر وہ ان مدارج اور مراتب پر پہنچے کہ آواز آگئی۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ (البیّنۃ: ۹)

مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ کسبِ خیر تو بڑی بات ہے اور وہی اصل مقصد ہے، لیکن وہ تو ترکِ بدی میں بھی سُست نظر آتے ہیں اور ان کاموں کا تو ذکر ہی کیا ہے جو صلحا کے کام ہیں۔

پس تمہیں چاہیے کہ تم ایک ہی بات اپنے لیے کافی نہ سمجھ لو۔ ہاں اوّل بدیوں سے پرہیز کرو۔ اور پھر ان کی بجائے نیکیوں کے حاصل کرنے کے واسطے سعی اور مجاہدہ سے کام لو اور پھر خدا تعالیٰ کی توفیق اور اس کا فضل دُعا سے مانگو۔ جب تک انسان ان دونوں صفات سے مُتّصف نہیں ہوتا یعنی بدیاں چھوڑ کر نیکیاں حاصل نہیں کرتا وہ اس وقت تک مومن نہیں کہلا سکتا۔ مومن کامل ہی کی تعریف میں تو اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ فرمایا گیا ہے۔ اب غور کرو کہ کیا اتنا ہی انعام تھا کہ وہ چوری چکاری رہزنی نہیں کرتے تھے یا اس سے کچھ بڑھ کر مراد ہے؟ نہیں۔ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں تو وہ اعلیٰ درجہ کے انعامات رکھے ہیں جو مخاطبہ اور مکالمہ الٰہیہ کہلاتے ہیں[1]۔

اگر اسی قدر مقصود ہوتا جو بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ موٹی موٹی بدیوں سے پرہیز کرنا ہی کمال ہے تو اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی دُعا کی تعلیم نہ ہوتی جس کا انتہائی اور آخری مرتبہ اور مقام خدا تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ اور مخاطبہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا اتنا ہی تو کمال نہ تھا کہ وہ چوری چکاری نہ کیا کرتے تھے بلکہ وہ خُدا تعالیٰ کی محبت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ بھی تو محفوظ رہتا ہے۔ اس کا احسان کسی پر نہیں۔ اگر کرتا تو دُکھ پاتا۔ بدمعاشوں میں لکھا جاتا۔ کنجر کہلاتا۔ کیونکہ زنا کاری کنجروں کا کام ہے۔ اگر اس نے ان کاموں کو نہیں کیا، تو صرف اتنی بات ہوئی کہ بدمعاشوں کے رجسٹر سے اس کا نام کٹ گیا، لیکن نیکوں کے طبقے اور رجسٹر میں داخل بھی نہیں ہوا، اسی لیے خدا تعالیٰ نے عملِ صالح کی تاکید کی ہے کہ اگر وہ بدی سے بچتا ہے تو عملِ صالح کرکے نیکوں میں داخل ہو۔"

البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۵ء

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۵ء

صدق، وفا میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ پس اس دُعا کی تعلیم سے یہ سکھایا کہ نیکی اور انعام ایک الگ شئ ہے۔ جبتک انسان اُسے حاصل نہیں کرتا۔ اس وقت تک وہ نیک اور صالح نہیں کہلا سکتا اور منعم علیہ کے زمرہ میں نہیں آتا۔ اس سے آگے فرمایا غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ (الفاتحہ : ٧) اس مطلب کو قرآنِ شریف نے دُوسرے مقام پر یوں فرمایا ہے کہ مومن کے نفس کی تکمیل دو شربتوں کے پینے سے ہوتی ہے ایک شربت کا نام کافوری ہے اور دُوسرے کا نام زنجبیلی ہے۔ کافوری شربت تو یہ ہے کہ اس کے پینے سے نفس بالکل ٹھنڈا ہو جاوے اور بدیوں کے لیے کسی قسم کی حرارت اس میں محسوس نہ ہو۔ جس طرح پر کافور میں یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وُہ زہریلے مواد کو دبا دیتا ہے۔ اسی لیے اُسے کافور کہتے ہیں۔ اسی طرح پر یہ کافوری شربت گناہ اور بدی کی زہر کو دبا دیتا ہے اور وُہ موادِ ردّیہ جو اُٹھ کر انسان کی رُوح کو ہلاک کرتے ہیں ان کو اُٹھنے نہیں دیتا بلکہ بے اثر کر دیتا ہے۔ دُوسرا شربت زنجبیلی ہے جس کے ذریعہ سے انسان میں نیکیوں کے لیے ایک قوت اور طاقت آتی ہے اور پھر حرارت پیدا ہوتی ہے۔ پس اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحہ: ٦، ٧) تو اصل مقصد اور غرض ہے یہ گویا زنجبیلی شربت ہے اور غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ (الفاتحہ : ٧) کافوری شربت ہے۔

باریک اور مخفی بدیوں سے بچنے کی تلقین

اب ایک اور مشکل ہے کہ انسان موٹی موٹی بدیوں کو تو آسانی سے چھوڑ بھی دیتا ہے، لیکن بعض بدیاں ایسی باریک اور مخفی ہوتی ہیں کہ اوّل تو انسان مشکل سے انہیں معلوم کرتا ہے اور پھر ان کا چھوڑنا اُسے بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ محرقہ بھی گو سخت تپ ہے مگر اس کا علاج کُھلا کُھلا ہو سکتا ہے لیکن تپِ دق جو اندر ہی کھا رہا ہے اس کا علاج بہت ہی مشکل ہے۔ اسی طرح پر یہ باریک اور مخفی بدیاں ہوتی ہیں جو انسان کو فضائل کے حاصل کرنے سے روکتی ہیں۔ یہ اخلاقی بدیاں ہوتی ہیں جو ایک دُوسرے کے ساتھ میل ملاپ اور معاملات میں پیش آتی ہیں اور ذرا ذرا سی بات اور اختلافِ رائے پر دلوں میں بُغض، کینہ، حسد، ریا، تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے بھائی کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ چند روز اگر نماز سنوار کر پڑھی ہے اور لوگوں نے تعریف کی تو ریا اور نمود پیدا ہو گیا اور وہ اصل غرض جو اخلاص تھی جاتی رہی اور اگر خدا تعالیٰ نے دولت دی ہے یا علم دیا ہے یا کوئی خاندانی وجاہت حاصل ہے تو اس کی وجہ سے اپنے بھائی کو جس کو یہ باتیں نہیں ملی ہیں، حقیر اور ذلیل سمجھتا ہے۔ اور اپنے بھائی کی عیب چینی کے لیے حریص ہوتا ہے۔ اور تکبّر مختلف رنگوں میں ہوتا ہے۔ کسی میں کسی رنگ میں اور کسی میں کسی طرح سے۔ علماء علم کے رنگ میں اُسے ظاہر کرتے ہیں اور علمی طور پر نکتہ چینی کر کے اپنے بھائی کو گرانا چاہتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی

طرح عیب چینی کرکے اپنے بھائی کو ذلیل کرنا اور نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ رات دن اس کے عیبوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس قسم کی باریک بدیاں ہوتی ہیں۔ جن کا دُور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور شریعت ان باتوں کو جائز نہیں رکھتی ہے۔ ان بدیوں میں عوام ہی مبتلا نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ جو متعارف اور موٹی موٹی بدیاں نہیں کرتے ہیں اور خواص سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان سے خلاصی پانا اور مرنا ایک ہی بات ہے۔ اور جبتک ان بدیوں سے نجات حاصل نہ کرے۔ تزکیہ نفس کامل طور پر نہیں ہوتا اور انسان ان کمالات اور انعامات کا وارث نہیں بنتا جو تزکیہ نفس کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی جگہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان اخلاقی بدیوں سے ہم نے خلاصی پالی ہے، لیکن جب کبھی موقعہ آپڑتا ہے اور کسی سفیہ سے مقابلہ ہو جاوے تو انہیں بڑا جوش آتا ہے اور پھر وہ گند ان سے ظاہر ہوتا ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس وقت پتہ لگتا ہے کہ ابھی کچھ بھی حاصل نہیں کیا اور وہ تزکیہ نفس جو کامل کرتا ہے میسّر نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تزکیہ جس کو اخلاقی تزکیہ کہتے ہیں بہت ہی مشکل ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس فضل کے جذب کرنے کے لیے بھی وہی تین پہلو ہیں۔
اوّل مجاہدہ اور تدبیر۔ دُوم دُعا۔ سوم صُحبتِ صادقین۔

یہ فضلِ الٰہی انبیاء علیہم السّلام پر بدرجہ کمال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اوّل اُن کا تزکیہ اخلاقی کامل طور پر خود کر دیتا ہے۔ ان میں بداخلاقیوں اور رذائل کی آلائش رہ ہی نہیں جاتی۔ ان کی حالت تو یہانتک پہنچ جاتی ہے کہ سلطنت پاکر بھی وہ فقیر ہی رہتے ہیں۔ اور کسی قسم کا کبر ان کے پاس نہیں آتا۔

خُدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر تزکیہ نفس حاصل نہیں ہوتا

درحقیقت یہ گند جو نفس کے جذبات کا ہے اور بداخلاقی۔ کبر۔ ریا وغیرہ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اس پر موت نہیں آتی جبتک اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہو اور یہ موادِ ردیہ جل نہیں سکتے۔ جب تک معرفت کی آگ اُن کو نہ جلاتے۔ جس میں یہ معرفت کی آگ پیدا ہو جاتی ہے وہ ان اخلاقی کمزوریوں سے پاک ہونے لگتا ہے اور بڑا ہو کر بھی اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہے اور اپنی ہستی کو کچھ حقیقت نہیں پاتا۔ وہ اس نُور اور روشنی کو جو انوارِ معرفت سے اُسے ملتی ہے اپنی کسی قابلیت اور خوبی کا نتیجہ نہیں مانتا اور نہ اسے اپنے نفس کی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ وُہ اُسے خدا تعالیٰ ہی کا فضل اور رحم یقین کرتا ہے جیسے ایک دیوار پر آفتاب کی روشنی اور دُھوپ پڑکر اُسے منوّر کر دیتی ہے، لیکن دیوار اپنا کوئی فخر نہیں کر سکتی کہ یہ روشنی میری قابلیت کی وجہ سے ہے۔ یہ ایک دُوسری بات ہے کہ جس قدر وہ دیوار صاف ہوگی اسی قدر روشنی زیادہ صاف ہوگی، لیکن کسی حال میں دیوار کی ذاتی قابلیت اس روشنی کے لیے کوئی نہیں بلکہ اس کا

فخر آفتاب کو ہے اور ایسا ہی وہ آفتاب کو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ تُو اس روشنی کو اُٹھا لے۔ اسی طرح پر انبیاء علیہم السلام کے نفوسِ صافیہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فیضان اور فیوض سے معرفت کے انوار ان پر پڑتے ہیں اور ان کو روشن کر دیتے ہیں اسی لیے وہ ذاتی طور پر کوئی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ ہر ایک فیض کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسُوب کرتے ہیں اور یہی سچ بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا گیا کہ کیا آپؐ اعمال سے داخلِ جنّت ہوں گے تو یہی فرمایا کہ ہرگز نہیں[1]۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے۔ انبیاء علیہم السلام کبھی کسی قوّت اور طاقت کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے وُہ خُدا ہی سے پاتے ہیں اور اسی کا نام لیتے ہیں۔

ہاں ایسے لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے حالانکہ کروڑوں حصّہ نیچے کے درجہ میں ہوتے ہیں جو دو دن نماز پڑھ کر تکبّر کرنے لگتے ہیں اور ایسا ہی روزہ اور حج سے بجائے تزکیہ کے ان میں تکبّر اور نمود پیدا ہوتی ہے[2] یاد رکھو تکبّر شیطان سے آیا ہے اور شیطان بنا دیتا ہے۔ جبتک انسان اس سے دُور نہ ہو۔ یہ قبولِ حق اور فیضانِ اُلوہیت کی راہ میں روک ہو جاتا ہے کسی طرح سے بھی تکبّر نہیں کرنا چاہیے نہ علم کے لحاظ سے نہ دولت کے لحاظ سے نہ وجاہت کے لحاظ سے نہ ذات اور خاندان اور حسب نسب کی وجہ سے۔ کیونکہ زیادہ تر انہی باتوں سے یہ تکبّر پیدا ہوتا ہے اور جبتک انسان ان گھمنڈوں سے اپنے آپ کو پاک صاف نہ کرے گا۔ اس وقت تک وُہ خدا تعالیٰ کے نزدیک برگزیدہ نہیں ہو سکتا اور وہ معرفت جو جذبات کے مواد ردّیہ کو جلا دیتی ہے اس کو عطا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ شیطان کا حصّہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ شیطان نے بھی تکبّر کیا تھا اور آدم سے اپنے آپ کو بہتر سمجھا اور کہدیا: اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔ (الاعراف : ۱۳) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خدا تعالیٰ کے حضُور سے مردود ہو گیا اور آدم لغزش پر (چونکہ اسے معرفت دی گئی تھی) اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے لگا۔ اور خُدا تعالیٰ کے فضل کا وارث ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے دُعا کی۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف : ۲۴) یہی وہ سِر ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کو

---

[1] البدر میں ہے: "بلکہ خُدا کے فضل سے" (البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۳)

[2] البدر میں ہے: "ہاں انبیاء سے نیچے جو لوگ ہوتے ہیں ان میں کوئی رگ تکبّر کی رہ جاوے تو عجب نہیں۔ کیونکہ یہ تو وہ بلا ہے کہ انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بعض لوگ حاجی بھی بن آتے ہیں مگر تکبّر اور نخوت ان میں بدستور پائی جاتی ہے۔"

البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۵ء

کہا گیا کہ اے نیک اُستاد۔ تو اُنہوں نے کہا کہ تُو مجھے نیک کیوں کہتا ہے۔ اس پر آجکل کے نادان عیسائی تو یہ کہتے ہیں کہ ان کا مطلب اس فقرہ سے یہ تھا کہ تُو مجھے خدا کیوں نہیں کہتا، حالانکہ حضرت مسیح نے بہت ہی لطیف بات کہی تھی جو انبیاء علیہم السلام کی فطرت کا خاصہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ حقیقی نیکی تو خدا تعالیٰ ہی سے آتی ہے وہی اس کا چشمہ ہے اور وہیں سے وہ اُترتی ہے۔ وُہ جس کو چاہے عطا کرے اور جب چاہے سلب کرے۔ مگر ان نادانوں نے ایک عمدہ اور قابلِ قدر بات کو معیوب بنا دیا اور حضرت عیسٰیؑ کو متکبر ثابت کیا؛ حالانکہ وہ ایک منکسر المزاج انسان تھے۔

پاک ہونے کا طریق

پس میرے نزدیک پاک ہونے کا یہ عمدہ طریق ہے اور ممکن نہیں کہ اس سے بہتر کوئی اَور طریق مل سکے کہ انسان کسی قسم کا تکبّر اور فخر نہ کرے نہ علمی نہ خاندانی نہ مالی۔ جب خدا تعالیٰ کسی کو آنکھ عطا کرتا ہے تو وہ دیکھ لیتا ہے کہ ہر ایک روشنی جو ان ظلمتوں سے نجات دے سکتی ہے وہ آسمان سے ہی آتی ہے اور انسان ہر وقت آسمانی روشنی کا محتاج ہے۔ آنکھ بھی دیکھ نہیں سکتی جبتک سُورج کی روشنی جو آسمان سے آتی ہے نہ آئے۔ اسی طرح باطنی روشنی جو ہر ایک قسم کی ظُلمت کو دُور کرتی ہے اور اس کی بجائے تقویٰ اور طہارت کا نور پیدا کرتی ہے آسمان ہی سے آتی ہے۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ انسان کا تقویٰ، ایمان، عبادت، طہارت سب کچھ آسمان سے آتا ہے۔ اور یہ خدا تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے وہ چاہے تو اس کو قائم رکھے اور چاہے تو دُور کر دے۔

پس سچی معرفت اسی کا نام ہے کہ انسان اپنے نفس کو مسلوب اور لاشَیٔ محض سمجھے اور آستانۂ اُلوہیت پر گِر کر انکسار اور عجز کے ساتھ خدا تعالیٰ کے فضل کو طلب کرے۔ اور اس نُورِ معرفت کو مانگے جو جذباتِ نفس کو جلا دیتا ہے اور اندر ایک روشنی اور نیکیوں کے لیے قوّت اور حرارت پیدا کرتا ہے۔ پھر اگر اس کے فضل سے اس کو حصّہ مل جاوے اور کسی وقت کسی قسم کا بسط اور شرحِ صدر حاصل ہو جاوے تو اس پر تکبّر اور ناز نہ کرے بلکہ اس کی فروتنی اور انکسار میں اَور بھی ترقی ہو۔ کیونکہ جس قدر وہ اپنے آپ کو لاشَیٔ سمجھے گا اسی قدر کیفیات اور انوار خدا تعالیٰ سے اُتریں گے جو اس کو روشنی اور قوت پہنچائیں گے۔ اگر انسان یہ عقیدہ رکھے گا تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کی اخلاقی حالت عمدہ ہو جائے گی۔ دُنیا میں اپنے آپ کو کچھ سمجھنا بھی تکبّر ہے اور یہی حالت بنا دیتا ہے۔ پھر انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ دُوسرے پر لعنت کرتا ہے اور اُسے حقیر سمجھتا ہے۔

جماعتِ احمدیہ کے قیام کی غرض

مَیں یہ سب باتیں بار بار اس لیے کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جو اس جماعت کو بنانا چاہا ہے تو اس سے یہی غرض رکھی ہے کہ وہ حقیقی معرفت جو دُنیا میں گُم ہو چکی ہے اور وہ حقیقی تقویٰ و طہارت جو اس زمانہ میں پائی نہیں

جاتی۔ اسے دوبارہ قائم کرے۔

عام طور پر تکبر دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ علماء اپنے علم کی شیخی اور تکبر میں گرفتار ہیں۔ فقراء کو دیکھو تو ان کی بھی حالت اور ہی قسم کی ہو رہی ہے۔ ان کو اصلاح نفس سے کوئی کام ہی نہیں رہا۔ ان کی غرض و غایت صرف جسم تک محدود ہے۔ اس لیے اُن کے مجاہدے اور ریاضتیں بھی کچھ اور ہی قسم کی ہیں جیسے ذکر اَرّہ وغیرہ جن کا چشمہ نبوت سے پتہ نہیں چلتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ دل کو پاک کرنے کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں۔ صرف جسم ہی جسم باقی رہا ہوا ہے۔ جس میں رُوحانیت کا کوئی نام و نشان نہیں۔ یہ مجاہدے دل کو پاک نہیں کر سکتے اور نہ کوئی حقیقی نُور معرفت کا بخش سکتے ہیں۔ پس یہ زمانہ اب بالکل خالی ہے۔ نبوی طریق جیسا کہ کرنے کا تھا وہ بالکل ترک کر دیا گیا ہے اور اس کو بُھلا دیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وُہ عہدِ نبوت پھر آ جاوے اور تقویٰ اور طہارت پھر قائم ہو۔ اور اس کو اس نے اس جماعت کے ذریعہ چاہا ہے۔

پس فرض ہے کہ حقیقی اصلاح کی طرف تم توجہ کرو اسی طرح پر جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کا طریق بتایا ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

شریعت کے دو ہی بڑے حِصّے اور پہلو ہیں جن کی حفاظت انسان کو ضروری ہے۔ ایک حق اللہ، دُوسرے حق العباد۔ حق اللہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی اطاعت، عبادت، توحید، ذات اور صفات میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرنا۔ اور حق العباد یہ ہے کہ اپنے بھائیوں سے تکبر، خیانت اور ظُلم کسی نوع کا نہ کیا جاوے۔ گویا اخلاقی حِصّہ میں کسی قسم کا فتور نہ ہو۔ سُننے میں تو یہ دو ہی فقرے ہیں لیکن عمل کرنے میں بہت ہی مشکل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل انسان پر ہو تو وہ ان دونوں پہلوؤں پر قائم ہو سکتا ہے۔ کسی میں قوتِ غضبی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جب وُہ جوش مارتی ہے تو نہ اس کا دل پاک رہ سکتا ہے اور نہ زبان۔ دل سے اپنے بھائی کے خلاف ناپاک منصوبے کرتا ہے اور زبان سے گالی دیتا ہے۔ اور پھر کینہ پیدا کرتا ہے۔ کسی میں قوتِ شہوت غالب ہوتی ہے اور وہ اس میں گرفتار ہو کر حدود اللہ کو توڑتا ہے۔ غرض جب تک انسان کی اخلاقی حالت بالکل دُرست نہ ہو وہ کامل ایمان جو منعم علیہ گروہ میں داخل کرتا ہے اور جس کے ذریعہ سچّی معرفت کا نور پیدا ہوتا ہے اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ پس دن رات یہی کوشش ہونی چاہیے کہ بعد اس کے جو انسان سچا موحد ہو اپنے اخلاق کو درست کرے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس وقت اخلاقی حالت بہت ہی گری ہوئی ہے۔ اکثر لوگوں میں بدظنی کا مرض بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے نیک ظنی نہیں رکھتے اور ادنیٰ ادنیٰ سی بات پر اپنے دُوسرے بھائی کی نسبت بُرے بُرے خیالات کرنے لگتے ہیں اور ایسے عیوب اس کی طرف منسوب

کرنے لگتے ہیں کہ اگر وہی عیب اس کی طرف منسوب ہوں تو اس کو سخت ناگوار معلوم ہو۔ اس لیے اوّل ضروری ہے کہ حتی الوسع اپنے بھائیوں پر بدظنی نہ کی جاوے اور ہمیشہ نیک ظن رکھا جاوے، کیونکہ اس سے محبت بڑھتی ہے اور اُنس پیدا ہوتا ہے اور آپس میں قوت پیدا ہوتی ہے اور اس کے باعث انسان بعض دوسرے عیوب مثلاً کینہ۔ بغض۔ حسد وغیرہ سے بچا رہتا ہے۔

پھر مَیں دیکھتا ہوں کہ بہت سے ہیں جن میں اپنے بھائیوں کے لیے کچھ بھی ہمدردی نہیں۔ اگر ایک بھائی بُھوکا مرتا ہو تو دُوسرا توجہ نہیں کرتا اور اس کی خبرگیری کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یا اگر وہ کسی اَور قسم کی مشکلات میں ہے تو اِتنا نہیں کرتے کہ اس کے لیے اپنے مال کا کوئی حِصّہ خرچ کریں۔ حدیث شریف میں ہمسایہ کی خبرگیری اور اس کے ساتھ ہمدردی کا حکم آیا ہے بلکہ یہاں تک بھی ہے کہ اگر تم گوشت پکاؤ تو شوربا زیادہ کرو تاکہ اُسے بھی دے سکو۔ اب کیا ہوتا ہے اپنا ہی پیٹ پالتے ہیں، لیکن اس کی کچھ پروا نہیں۔ یہ مت سمجھو کہ ہمسایہ سے اتنا ہی مطلب ہے جو گھر کے پاس رہتا ہو۔ بلکہ جو تمہارے بھائی ہیں وہ بھی ہمسایہ ہی ہیں خواہ وہ سَو کوس کے فاصلے پر بھی ہوں۔

اخلاق ہی ساری ترقیات کا زینہ ہے

ہر شخص کو ہر روز اپنا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ کہاں تک ان امور کی پروا کرتا ہے اور کہاں تک وُہ اپنے بھائیوں سے ہمدردی اور سلُوک کرتا ہے۔ اس کا بڑا بھاری مطالبہ انسان کے ذمّہ ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ قیامت کے روز خدا تعالیٰ کہے گا کہ مَیں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ مَیں پیاسا تھا اور تُو نے مجھے پانی نہ دیا۔ مَیں بیمار تھا۔ تم نے میری عیادت نہ کی۔ جن لوگوں سے یہ سوال ہوگا وہ کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ تُو کب بُھوکا تھا جو ہم نے کھانا نہ دیا۔ تُو کب پیاسا تھا جو پانی نہ دیا اور تُو کب بیمار تھا جو تیری عیادت نہ کی۔ پھر خُدا تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فُلاں بندہ جو ہے وہ ان باتوں کا محتاج تھا مگر تم نے اس کی کوئی ہمدردی نہ کی۔ اس کی ہمدردی میری ہی ہمدردی تھی۔ ایسا ہی ایک اَور جماعت کو کہے گا کہ شاباش! تم نے میری ہمدردی کی۔ مَیں بھوکا تھا۔ تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ مَیں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا وغیرہ۔ وہ جماعت عرض کرے گی کہ اے ہمارے خُدا ہم نے کب تیرے ساتھ ایسا کیا؟ تب اللہ تعالیٰ جواب دیگا کہ میرے فلاں بندہ کے ساتھ جو تم نے ہمدردی کی وہ میری ہی ہمدردی تھی۔ دراصل خدا تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی کرنا بہت ہی بڑی بات ہے اور خدا تعالیٰ اس کو بہت پسند کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اَور کیا ہوگا کہ وہ اس سے اپنی ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔ عام طور پر دنیا میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کا خادم کسی اس کے دوست کے پاس جاوے اور وہ شخص اس کی خبر بھی نہ لے تو کیا وہ آقا جس کا کہ وہ خادم

ہے اس اپنے دوست سے خوش ہوگا؟ کبھی نہیں؛ حالانکہ اس کو تو کوئی تکلیف اس نے نہیں دی، مگر نہیں۔ اس نوکر کی خدمت اور اس کے ساتھ حُسنِ سلوک گویا مالک کے ساتھ حُسن سلوک ہے۔ خدا تعالیٰ کو بھی اس طرح پر اس بات کی چڑ ہے کہ کوئی اس کی مخلوق سے سرد مہری برتے۔ کیونکہ اس کو اپنی مخلوق بہت پیاری ہے۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے وہ گویا اپنے خُدا کو راضی کرتا ہے۔

غرض اخلاق ہی ساری ترقیات کا زینہ ہے۔ میری دانست میں یہی پہلو حقوق العباد کا ہے جو حقوق اللہ کے پہلو کو تقویت دیتا ہے۔ جو شخص نوعِ انسان کے ساتھ اخلاق سے پیش آتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کے ایمان کو ضائع نہیں کرتا۔ جب انسان خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے ایک کام کرتا ہے اور اپنے ضعیف بھائی کی ہمدردی کرتا ہے تو اس اخلاص سے اس کا ایمان قوی ہو جاتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نمائش اور نمود کے لیے جو اخلاق برتے جائیں وہ اخلاق خدا تعالیٰ کے لیے نہیں ہوتے اور ان میں اخلاص کے نہ ہونے کی وجہ سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح پر تو بہت سے لوگ سرائیں وغیرہ بنا دیتے ہیں۔ ان کی اصل غرض شہرت ہوتی ہے۔ اور اگر انسان خدا تعالیٰ کے لیے کوئی فعل کرے تو خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اُسے ضائع نہیں کرتا اور اس کا بدلہ دیتا ہے۔ میں نے تذکرۃ الاولیاء میں پڑھا ہے کہ ایک ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ بارش ہوئی اور کئی روز تک رہی۔ ان بارش کے دنوں میں میں نے دیکھا کہ ایک اسّی برس کا بوڑھا گبر ہے جو کوٹھے پر چڑیوں کے لیے دانے ڈال رہا ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ کافر کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں اس سے کہا کہ کیا تیرے اس عمل سے تجھے کچھ ثواب ہوگا؟ اس گبر نے جواب دیا کہ ہاں ضرور ہوگا۔ پھر وہی ولی اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جو میں حج کو گیا تو دیکھا کہ وہی گبر طواف کر رہا ہے۔ اس گبر نے مجھے پہچان لیا اور کہا کہ دیکھو ان دانوں کا مجھے ثواب مل گیا یا نہیں؟ یعنی وہی دانے میرے اسلام تک لانے کا موجب ہو گئے۔

حدیث میں بھی ذکر آیا ہے کہ ایک صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا کہ ایامِ جاہلیت میں میں نے بہت خرچ کیا تھا۔ کیا اس کا ثواب بھی مجھے ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جواب دیا کہ یہ اسی صدقہ وخیرات کا ثمرہ تو ہے کہ تُو مسلمان ہو گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کے ادنیٰ فعلِ اخلاص کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہمدردی اور خبر گیری حقوق اللہ کی حفاظت کا باعث ہو جاتی ہے۔

پس مخلوق کی ہمدردی ایک ایسی شئے ہے کہ اگر انسان اُسے چھوڑ دے اور اس سے دُور ہوتا جائے تو رفتہ رفتہ پھر وہ درندہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی انسانیت کا یہی تقاضا ہے اور وہ اسی وقت تک انسان ہے جب تک اپنے دُوسرے بھائی کے ساتھ مروّت، سلوک اور احسان سے کام لیتا ہے اور اس میں کسی

قسم کی تفریق نہیں ہے جیسا کہ سعدیؒ نے کہا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

یاد رکھو ہمدردی کا دائرہ میرے نزدیک بہت وسیع ہے۔ کسی قوم اور فرد کو الگ نہ کرے۔ مَیں آج کل کے جاہلوں کی طرح یہ نہیں کہنا چاہتا کہ تم اپنی ہمدردی کو صرف مسلمانوں سے ہی مخصوص کر دو۔ نہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ تم خدا تعالیٰ کی ساری مخلوق سے ہمدردی کرو۔ خواہ وہ کوئی ہو۔ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور۔ مَیں کبھی ایسے لوگوں کی باتیں پسند نہیں کرتا جو ہمدردی کو صرف اپنی ہی قوم سے مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں بعض اس قسم کے خیالات بھی رکھتے ہیں کہ اگر ایک شیرے کے مٹکے میں ہاتھ ڈالا جاوے اور پھر اس کو تلوں میں ڈال کر تِل لگائے جاویں تو جس قدر اس کو لگ جاویں۔ اس قدر دھوکا اور فریب دوسرے لوگوں کو دے سکتے ہیں۔ ان کی ایسی بیہودہ اور خیالی باتوں نے بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے اور اُن کو قریباً وحشی اور درندہ بنا دیا ہے۔ مگر مَیں تمہیں بار بار یہی نصیحت کرتا ہوں کہ تم ہرگز ہرگز اپنی ہمدردی کے دائرہ کو محدود نہ کرو۔ اور ہمدردی کے لیے اس تعلیم کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے یعنی اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (النحل : ۹۱) یعنی اوّل نیکی کرنے میں تم عدل کو ملحوظ رکھو۔ جو شخص تم سے نیکی کرے تم بھی اس کے ساتھ نیکی کرو۔

اور پھر دُوسرا درجہ یہ ہے کہ تم اس سے بھی بڑھ کر اس سے سلوک کرو۔ یہ احسان ہے۔ احسان کا درجہ اگرچہ عدل سے بڑھا ہوا ہے اور یہ بڑی بھاری نیکی ہے لیکن کبھی نہ کبھی ممکن ہے احسان والا اپنا احسان جتلا دے مگر ان سب سے بڑھ کر ایک درجہ ہے کہ انسان ایسے طور پر نیکی کرے جو محبت ذاتی کے رنگ میں ہو جس میں احسان نمائی کا بھی کوئی حصّہ نہیں ہوتا ہے جیسے ماں اپنے بچّہ کی پرورش کرتی ہے وہ اس پرورش میں کسی اجر اور صلے کی خواستگار نہیں ہوتی بلکہ ایک طبعی جوش ہوتا ہے جو بچّے کے لیے اپنے سارے سُکھ اور آرام قربان کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بادشاہ کسی ماں کو حکم دیوے کہ تُو اپنے بچّہ کو دُودھ مت پلا اور اگر ایسا کرنے سے بچہ ضائع بھی ہو جاوے تو اس کو کوئی سزا نہیں ہوگی تو کیا ماں ایسا حکم سُن کر خوش ہوگی؟ اور اس کی تعمیل کرے گی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تو اپنے دل میں ایسے بادشاہ کو کوسے گی کہ کیوں اس نے ایسا حکم دیا۔ پس اس طرح پر نیکی ہو کہ اسے طبعی مرتبہ تک پہنچایا جاوے۔ کیونکہ جب کوئی شے ترقی کرتے کرتے اپنے طبعی کمال تک پہنچ جاتی ہے اس وقت وہ کامل ہوتی ہے[1]۔

---

[1] البدر سے :۔ "طبعی جوش سے نوعِ انسان کی ہمدردی کا نام (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ نیکی کو بہت پسند کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق سے ہمدردی کی جاوے۔ اگر وہ بدی کو پسند کرتا تو بدی کی تاکید کرتا مگر اللہ تعالیٰ کی شان اس سے پاک ہے (سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمِ مجسّم تھے

بعض لوگ جن کو حق کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے۔ جب ایسی تعلیم سُنتے ہیں تو اور کچھ نہیں تو یہی اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام میں ہمدردی اگر ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائیاں کیوں کی تھیں؟ وہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جنگ کئے وہ تیرہ برس تک خطرناک دُکھ اُٹھانے کے بعد کئے اور وُہ بھی مدافعت کے طور پر۔ تیرہ برس تک اُن کے ہاتھوں سے آپ تکالیف اٹھاتے رہے۔ مُسلمان مرد اور عورتیں شہید کی گئیں۔ آخر جب آپ مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں بھی ان ظالموں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ تو خدا تعالیٰ نے مظلوم قوم کو مقابلہ کا حکم دیا اور وہ بھی اس لیے کہ شریروں کی شرارت سے مخلوق کو بچایا جائے اور ایک حق پرست قوم کے لیے راہ کھُل جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے لیے بدی نہیں چاہی۔ آپ تو رحم مجسّم تھے۔ اگر بدی چاہتے تو جب آپ نے پُورا تسلّط حاصل کر لیا تھا اور شوکت اور غلبہ آپ کو مل گیا تھا تو آپ اُن تمام اَئمۃ الکفر کو جو ہمیشہ آپ کو دُکھ دیتے رہتے تھے۔ قتل کروا دیتے اور اس میں انصاف اور عقل کی رُو سے آپ کا پلّہ بالکل پاک تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ عُرفِ عام کے لحاظ سے اور عقل اور انصاف کے لحاظ سے آپ کو حق تھا کہ ان لوگوں کو قتل کروا دیتے مگر نہیں، آپؐ نے سب کو چھوڑ دیا۔ آج کل جو لوگ غداری کرتے ہیں اور باغی ہوتے ہیں انہیں کون پناہ دے سکتا ہے۔ جب ہندوستان میں غدر ہو گیا تھا اور اس کے بعد انگریزوں نے تسلّط عام حاصل کر لیا تو تمام شریر باغی ہلاک کر دیئے گئے اور ان کی یہ سزا بالکل انصاف پر مبنی تھی۔ باغی کے لیے کسی قانون میں رہائی نہیں لیکن یہ آپ ہی کا حوصلہ تھا کہ اس دن آپ نے فرمایا کہ جاؤ تم سب کو بخش دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نوعِ انسان سے بہت بڑی ہمدردی تھی ایسی ہمدردی کہ اس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد بھی اگر کہا جاوے کہ اسلام دوسروں سے ہمدردی کی تعلیم نہیں دیتا تو اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوگا؟ یقیناً یاد رکھو کہ مومن متقی کے دل میں شر نہیں ہوتا جس قدر

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ :- ایتاءِ ذی القربیٰ ہے اور اس ترتیب سے خدا تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ اگر تم پورا نیک بننا چاہتے ہو تو اپنی نیکی کو ایتاءِ ذی القربیٰ یعنی طبعی درجہ تک پہنچاؤ۔ جبتک کوئی شئے ترقی کرتی کرتی اپنے اس طبعی مرکز تک نہیں پہنچتی تب تک وہ کمال کا درجہ حاصل نہیں کرتی۔"

البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۴ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۵ء

انسان متقی ہوتا جاتا ہے اسی قدر وہ کسی کی نسبت سزا اور ایذا کو پسند نہیں کرتا۔ مُسلمان کبھی کینہ ور نہیں ہو سکتا۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے کوئی دُکھ اور تکلیف جو وہ پہنچا سکتے تھے اُنہوں نے پہنچایا ہے، لیکن پھر بھی ان کی ہزاروں خطائیں بخشنے کو اب بھی تیار ہیں۔

جماعت کو خاص نصیحت

پس تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو۔ یاد رکھو کہ تم ہر شخص سے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، ہمدردی کرو اور بلا تمیز ہر ایک سے نیکی کرو کیونکہ یہی قرآن شریف کی تعلیم ہے۔ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا (الدھر: ۹) وہ اسیر اور قیدی جو آتے تھے اکثر کفّار ہی ہوتے تھے۔ اب دیکھ لو کہ اسلام کی ہمدردی کی انتہا کیا ہے۔ میری رائے میں کامل اخلاقی تعلیم بجز اسلام کے اور کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ مجھے صحت ہو جاوے تو میں اخلاقی تعلیم پر ایک مستقل رسالہ لکھوں گا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میرا منشا ہے وہ ظاہر ہو جاوے اور وہ میری جماعت کے لیے ایک کامل تعلیم ہو اور ابتغاء مرضات اللہ کی راہیں اس میں دکھائی جائیں۔ مجھے بہت ہی رنج ہوتا ہے جب میں آئے دن یہ دیکھتا اور سُنتا ہوں کہ کسی سے یہ سرزد ہوا اور کسی سے وہ۔ میری طبیعت ان باتوں سے خوش نہیں ہوتی۔ میں جماعت کو ابھی اس بچہ کی طرح پاتا ہوں جو دو قدم اُٹھاتا ہے تو چار قدم گرتا ہے، لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اس جماعت کو کامل کر دے گا۔ اس لیے تم بھی کوشش، تدبیر، مجاہدہ اور دُعاؤں میں لگے رہو کہ خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے کیونکہ اس کے فضل کے بغیر کچھ بنتا ہی نہیں۔ جب اس کا فضل ہوتا ہے تو وہ ساری راہیں کھول دیتا ہے۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳ صفحہ ۲ تا ۴ مورخہ ۲۴؍ جنوری ۱۹۰۵ء

۳۰ر دسمبر ۱۹۰۴ء

تقریر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

جو آپ نے بعد نماز جمعہ مسجد اقصیٰ میں فرمائی

چونکہ خاکسار ایڈیٹر کچھ دیر سے پہنچا تھا اس لیے جس قدر ضبط ہو سکا وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ سلسلہ تقریر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انقطاعِ دنیا اور حصولِ قُرب الی اللہ کے متعلق مضمون تھا۔ اور وہ تقریر یہ ہے :

اللہ تعالیٰ کو اپنا نصب العین بنائیں

انسان کو چاہیے کہ حسنات کا پلڑا بھاری رکھے۔ مگر جہانتک دیکھا جاتا ہے اس کی مصروفیت اس قدر دُنیا میں ہے کہ یہ پلڑا بھاری ہوتا نظر نہیں آتا۔ رات دن اسی فکر میں ہے کہ وہ کام دُنیا کا ہو جاوے۔ فلانی زمین مل جاوے فلاں مکان بن جاوے؛ حالانکہ اُسے چاہیے کہ افکار میں بھی دین کا پلڑا دُنیا کے پلڑے سے بھاری رکھے۔ اگر کوئی شخص رات دن نماز روزہ میں مصروف ہے تو یہ بھی اس کے کام ہرگز نہیں آسکتا۔ جب تک کہ خدا کو اس نے مقدم نہیں رکھا ہوا۔ ہر بات اور فعل میں اللہ تعالیٰ کو نصب العین بنانا چاہیے؛ ورنہ خُدا کی قبولیت کے لائق ہرگز نہ ٹھہرے گا۔ دُنیا کا ایک بُت ہوتا ہے جو کہ ہر وقت انسان کی بغل میں ہوتا ہے۔ اگر وہ مقابلہ اور موازنہ کر کے دیکھے گا تو اُسے معلوم ہوگا کہ طرح طرح کی نمائش اس نے دُنیا کے لیے بنا رکھی ہے اور دین کا پہلو بہت کمزور ہے؛ حالانکہ عمر کا اعتبار نہیں اور نہ علم ہے کہ اس نے ایک پل کے بعد زندہ بھی رہنا ہے کہ نہیں۔ شیخ سعدیؒ نے کیا عمدہ فرمایا ہے ؎

مکن تکیہ بر عمر ناپائیدار

اس وقت جس قدر لوگ کھڑے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ایک سال تک مَیں ضرور زندہ رہوں گا لیکن اگر خدا کی طرف سے علم ہو جاوے کہ اب زندگی ختم ہے تو ابھی سب ارادے باطل ہو جاتے ہیں پس خوب یاد رکھو کہ مومن کو دُنیا کا بندہ نہ ہونا چاہیے۔ ہمیشہ اس امر میں کوشاں رہنا چاہیے کہ کوئی بھلائی اس کے ہاتھ سے ہو جاوے۔

خدا تعالیٰ بڑا رحیم کریم ہے اور اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ تم دُکھ پاؤ۔ لیکن خوب یاد رکھو کہ جو اس سے عمداً دُوری اختیار کرتا ہے اس پر اس کا قہر ضرور ہوتا ہے۔ عادت اللہ اسی طرح سے چلی آتی ہے۔ نوحؑ کے زمانہ کو دیکھو اور لُوطؑ کے زمانہ کو دیکھو موسیٰؑ کے زمانہ کو دیکھو اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو دیکھو کہ اس وقت جن لوگوں نے عمداً خدا سے بُعد اختیار کیا ان کا کیا حال ہوا۔ ان لمبی آرزوؤں نے انسان کو ہلاک کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے۔ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (التکاثر ۲،۱) کہ اے لوگو جو تم خدا سے غافل ہو۔ دُنیا طلبی نے تم کو غافل کر دیا ہے یہانتک کہ تم قبروں میں داخل ہو جاتے ہو مگر غفلت سے باز نہیں آتے۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (التکاثر : ۴) مگر اس غلطی کا تم کو عنقریب علم ہو جائے گا۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (التکاثر : ۵) پھر تم کو اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ عنقریب تم کو علم ہو جاوے گا کہ جن خواہشات کے پیچھے تم پڑے ہو وہ ہرگز تمہارے کام نہ آویں گی اور حسرت کا موجب ہوں گی۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ (التکاثر : ۶) اگر تم کو یقینی علم حاصل ہو جاوے تو تم علم کے ذریعہ سے سوچکر اپنے جہنم کو دیکھ لو اور تم کو پتہ لگ جاوے کہ تمہاری زندگی جہنمی زندگی ہے اور جن خیالات میں تم رات دن لگے ہوئے ہو وہ بالکل ناکارہ ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح یہ باتیں لوگوں کے دل نشیں ہو جاویں مگر آخر کار یہی کہنا پڑتا ہے کہ اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہے جبتک خدا تعالیٰ خود ایک واعظ دل میں نہ پیدا کرے، تب تک فائدہ نہیں ہوتا۔ جب انسان کی سعادت اور ہدایت کے دن آتے ہیں تو دل کے اندر ایک واعظ خود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت اس کے دل کو ایسے کان مل جاتے ہیں کہ وہ دُوسرے کی بات کو سُنتا ہے۔ راتوں کو اور دنوں کو خوب سوچکر دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انسان بہت ہی بے بنیاد شے ہے اور اس کے وجود کی کوئی کَل بھی اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ایک آنکھ ہی پر نظر کرو کہ کس قدر باریک عضو ہے اگر ایک ذرا پتھر آ لگے تو فوراً نابینا ہو جاوے۔ پھر اگر یہ خدا کی نعمت نہیں ہے تو کیا ہے۔ کیا کسی نے ٹھیکہ لیا ہوا ہے کہ خُدا اُسے ضرور بینا ہی رکھے گا اور اسی پر سب قویٰ کا قیاس کرو کہ اگر آج کسی میں فرق آ جاوے تو انسان کی کیا پیش چل سکتی ہے۔ غرضکہ ہر آن اور پل میں اس کی طرف رجوع کی ضرورت ہے اور مومن کا گذارہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ جبتک اس کا دھیان ہر وقت اس کی طرف لگا نہ ہے۔ اگر کوئی ان باتوں پر غور نہیں کرتا اور ایک دینی نظر سے اُن کو وقعت نہیں دیتا تو وہ اپنے دنیوی معاملات پر ہی نظر ڈال کر دیکھے کہ کیا خُدا کی تائید اور فضل کے سوا کوئی کام اسکا چل سکتا ہے؛ اور کوئی منفعت دنیا کی وہ حاصل کر سکتا ہے؛ ہرگز نہیں۔ دین ہو یا دُنیا ہر ایک امر میں اُسے خدا کی ذات کی بڑی ضرورت ہے اور ہر وقت اس کی طرف احتیاج لگی ہوئی ہے۔ جو اس کا مُنکر ہے سخت غلطی پر ہے۔ خدا تعالیٰ کو تو اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہے کہ تم اس کی طرف میلان رکھو یا نہ۔ وہ فرماتا ہے۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ

لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان : ۷۸) کہ اگر اس کی طرف رجوع رکھو گے تو تمہارا ہی اس میں فائدہ ہوگا۔ انسان جس قدر اپنے وجود کو مفید اور کارآمد ثابت کرے گا اسی قدر اس کے انعامات کو حاصل کرے گا۔ دیکھو کوئی بیل کسی زمیندار کا کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو مگر جب وہ اس کے کسی کام بھی نہ آوے گا۔ نہ گاڑی میں جُتے گا نہ زراعت کرے گا نہ کنوئیں میں لگے گا تو آخر سوائے ذبح کے اور کسی کام نہ آوے گا۔ ایک نہ ایک دن مالک اُسے قصاب کے حوالے کر دے گا۔ ایسے ہی جو انسان خدا کی راہ میں مفید ثابت نہ ہوگا تو خُدا اس کی حفاظت کا ہرگز ذمہ دار نہ ہوگا۔ ایک پھل اور سایہ دار درخت کی طرح اپنے وجود کو بنانا چاہیے تاکہ مالک بھی خبر گیری کرتا رہے۔ لیکن اگر اس درخت کی مانند ہوگا کہ جو نہ پھل لاتا ہے اور نہ پتے رکھتا ہے کہ لوگ سایہ میں آ بیٹھیں تو سوائے اس کے کہ کاٹا جاوے اور آگ میں ڈالا جاوے اور کس کام آ سکتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی معرفت اور قرب حاصل کرے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات : ۵۷) جو اس اصل غرض کو مدِ نظر نہیں رکھتا اور رات دن دنیا کے حصول کی فکر میں ڈوبا ہوا ہے کہ فلاں زمین خرید لوں۔ فلاں مکان بنا لوں۔ فلاں جائداد پر قبضہ ہو جاوے۔ تو ایسے شخص سے سوائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کچھ دن مہلت دے کر واپس بُلا لے اور کیا سلوک کیا جاوے۔

خُدا تعالیٰ کے قُرب کے حصُول کی تڑپ

انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کے قُرب کے حصول کا ایک درد ہونا چاہیے جس کی وجہ سے اس کے نزدیک وہ ایک قابلِ قدر شئے ہو جاوے گا۔ اگر یہ درد اس کے دل میں نہیں ہے اور صرف دُنیا اور اس کے مافیہا کا ہی درد ہے تو آخر تھوڑی سی مہلت پا کر وہ ہلاک ہو جاوے گا۔ خدا تعالیٰ مہلت اس لیے دیتا ہے کہ وہ حلیم ہے لیکن جو اس کے حلم سے خود ہی فائدہ نہ اُٹھاوے تو اُسے وہ کیا کرے۔ پس انسان کی سعادت اسی میں ہے کہ وہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور تعلق بناتے رکھے۔ سب عبادتوں کا مرکز دل ہے۔ اگر عبادت تو بجا لاتا ہے مگر دل خُدا کی طرف رجُوع نہیں ہے تو عبادت کیا کام آوے گی۔ اس لیے دل کا رجُوعِ تام اس کی طرف ہونا ضروری ہے۔ اب دیکھو کہ ہزاروں مساجد ہیں۔ مگر سوائے اس کے کہ ان میں رسمی عبادت ہو اور کیا ہے؟ ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت یہودیوں کی حالت تھی کہ رسم اور عادت کے طور پر عبادت کرتے تھے اور دل کا حقیقی میلان جو کہ عبادت کی رُوح ہے ہرگز نہ تھا۔ اس لیے خُدا تعالیٰ نے ان پر لعنت کی پس اس وقت بھی جو لوگ پاکیزگیٔ قلب کی فکر نہیں کرتے تو اگر رسم و عادت کے طور پر وہ سینکڑوں ٹکریں مارتے ہیں ان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اعمال کے باغ کی سرسبزی پاکیزگیٔ قلب سے ہوتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس : ۱۰ و ۱۱) کہ وہی بامراد ہو

گا جو کہ اپنے قلب کو پاکیزہ کرتا ہے اور جو اُسے پاک نہ کرے گا بلکہ خاک میں ملا دیگا یعنی سفلی خواہشات کا اُسے مخزن بنا رکھے گا۔ وہ نامراد رہے گا۔ اس بات سے ہمیں انکار نہیں ہے کہ خُدا کی طرف آنے کے لیے ہزار ہا روکیں ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو آج صفحہ دُنیا پر نہ کوئی ہندو ہوتا نہ عیسائی۔ سب کے سب مسلمان نظر آتے لیکن ان روکوں کو دُور کرنا بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے۔ وہی توفیق عطا کرے تو انسان نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے۔ اس لیے آخر کار بات پھر اسی پر آٹھہرتی ہے کہ انسان اسی کی طرف رجوع کرے تاکہ قوت اور طاقت دیوے۔

کوشش کی برکت

دنیا میں جس قدر شور نفس پرستی اور شہوت پرستی وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ ان سب کا ماخذ نفسِ امّارہ ہی ہے لیکن اگر انسان کوشش کرے تو اسی امّارہ سے پھر وہ لوّامہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ کوشش میں ایک برکت ہوتی ہے اور اس سے بھی بہت کچھ تغیرات ہو جاتے ہیں۔ پہلوانوں کو دیکھو کہ وہ ورزش اور محنت سے بدن کو کیا کچھ بنا لیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ محنت اور کوشش سے نفس کی اصلاح نہ ہو سکے۔ نفس امّارہ کی مثال آگ کی ہے جو کہ مشتعل ہو کر ایک جوش طبیعت میں پیدا کرتا ہے جس سے انسان حدِ اعتدال سے گذر جاتا ہے۔ لیکن جیسے پانی آگ سے گرم ہو کر آگ کی مثال تو ہو جاتا ہے اور جو کام آگ سے لیتے ہیں وہ اس سے بھی لے لیتے ہیں مگر جب اسی پانی کو آگ کے اُوپر گرایا جاوے تو وہ اس آگ کو بجھا دیتا ہے کیونکہ ذاتی صفت اس کی آگ کو بجھانا ہے۔ وہ وہی رہے گی۔ ایسے ہی اگر انسان کی رُوح نفسِ امّارہ کی آگ سے خواہ کتنی ہی گرم کیوں نہ ہو مگر جب وہ نفس سے مقابلہ کرے گی اور اس کے اُوپر گرے گی تو اسے مغلوب کر کے چھوڑے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ خُدا کو ہر ایک بات پر قادرِ مطلق جانا جاوے اور کسی قسم کی بدظنی اس پر نہ کی جاوے۔ جو بدظنی کرتا ہے وہی کافر ہوتا ہے۔ مومن کی صفات میں سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو غایت درجہ قادر جانے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہت نیکیاں کرنے سے انسان ولی بنتا ہے۔ یہ نادانی ہے۔ مومن کو تو خُدا نے اوّل ہی ولی بنایا ہے جیسے کہ فرمایا ہے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (البقرۃ : ۲۵۸) اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ہزاروں عجائبات ہیں اور انہیں پر کھلتے ہیں جو دل کے دروازے کھول کر رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بخیل نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص مکان کا دروازہ خود ہی نہیں کھولتا تو پھر روشنی کیسے اندر آوے۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا تو اللہ تعالےٰ بھی اس کی طرف رجوع کرے گا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جہانتک بس چل سکے وہ اپنی طرف سے کوتاہی نہ کرے۔ پھر جب اس کی کوشش اس کے اپنے انتہائی نقطہ پہ پہنچے گی تو وُہ خُدا کے نُور کو دیکھ لے گا۔ وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ سُبُلَنَا۔ (العنکبوت : ۷۰) میں اس کی طرف اشارہ

ہے کہ جو حقِ کوشش کا اس کے ذمہ ہے اسے بجا لاتے۔ یہ نہ کرے کہ اگر پانی ۲۰ ہاتھ نیچے کھودنے سے نکلتا ہے تو وہ صرف دو ہاتھ کھود کر ہمت ہار دے۔ ہر ایک کام میں کامیابی کی یہی جڑ ہے کہ ہمت نہ ہارے۔ پھر اس اُمت کے لیے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر کوئی پورے طور سے دُعا و تزکیۂ نفس سے کام لے گا تو سب وعدے قرآن شریف کے اس کے ساتھ پورے ہو کر رہیں گے۔ ہاں جو خلاف کرے گا وہ محروم رہے گا، کیونکہ اس کی ذات غیور ہے۔ اس نے اپنی طرف آنے کی راہ ضرور رکھی ہے۔ لیکن اس کے دروازے تنگ بنائے ہیں۔ پہنچتا وہی ہے جو تلخیوں کا شربت پی لیوے۔ لوگ دُنیا کی فکر میں درد برداشت کرتے ہیں حتّٰی کہ بعض اسی میں ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے ایک کانٹے کی درد بھی برداشت کرنا پسند نہیں کرتے جبتک اس کی طرف سے صدق اور صبر اور وفاداری کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اُدھر سے رحمت کے آثار کیسے ظاہر ہوں۔

صدق دکھلاؤ

ابراہیم علیہ السلام نے صدق دکھلایا تو اُن کو ابوالانبیاء بنا دیا۔ میرے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ دن بہت سخت ہیں اور کسی نے اب تک نہیں سمجھا تو آئندہ سمجھ لیوے۔ مجھے الہام ہوا تھا۔

عَفَتِ الدِّیَارُ مَحَلُّھَا وَمُقَامُھَا

یہ ایک خطرناک کلمہ ہے جس میں طاعون کی خبر دی گئی ہے کہ انسان کے لیے کوئی مفر اور کوئی جائے پناہ نہ رہے گی۔ اس لیے میں تم سب کو گواہ رکھتا ہوں کہ اگر کوئی سچی تبدیلی نہ کرے گا تو وہ ہرگز اس لائق نہ ہو گا کہ مجھ کو دُعا کے لیے لکھے۔ جو لوگ خُدا کے بتلاتے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلیں گے وہی محفوظ رہیں گے۔ خُدا کا وعدہ ایسے ہی لوگوں کی حفاظت کا ہے جو سچی تبدیلی اپنے اندر کرتے ہیں۔ مطلق بیعت انسان کے کیا کام آسکتی ہے؟ پورا نسخہ جبتک نہ پیئے تو مریض کو فائدہ نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے پوری تبدیلی کرنی چاہیے۔ جہانتک ہو سکے دُعا کرو اور اللہ تعالیٰ سے کہو کہ وہ تم کو ہر ایک قسم کی توفیق عطا کرے[۱]

۳۱؍دسمبر ۱۹۰۴ء

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جناب مفتی محمد صادق صاحب کی

---

[۱] البدر جلد۴ نمبر۳ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۲۰؍جنوری ۱۹۰۵ء

نیز الحکم جلد۹ نمبر۴ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۳۱؍جنوری ۱۹۰۵ء

ملالتِ طبع کا حال استفسار فرماتے ہوئے فرمایا کہ
اگر دُودھ ہضم ہونے لگ جاوے تو بخار اُس سے بھی ٹوٹ جاتا ہے[1]۔

یکم جنوری ۱۹۰۵ء

ایڈیٹر البدر نے ایک خاکروب کاتب کی درخواست پیش کی کہ اس کا مذہب بھی خاکروبوں کا ہی ہے مگر فنِ کتابت سے واقف ہے اور کارخانہ البدر میں آنا چاہتا ہے چونکہ میری طبیعت کراہت کرتی ہے اس لیے حضور سے مشورتاً پُوچھتا ہوں۔ آپ نے تبسّم فرما کر فرمایا کہ:

کہ بات تو واقعی مکروہ معلوم ہوتی ہے[2]

۶؍ جنوری ۱۹۰۵ء

اپنے محبین کی صحت یابی کیلئے کثرت سے دُعا فرمانا

حضرت حکیم نُورالدین صاحب کی طبیعت بہت علیل رہی

چنانچہ اسی وجہ سے آپ کو درسِ قرآن ملتوی رکھنا پڑا حکیم صاحب کی طبیعت کی ناسازی دیکھ کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آپ کی صحت کے لیے کثرت سے دُعا شروع کی تو ۶؍ جنوری کو آپ نے تشریف لا کر فرمایا کہ میں دُعا کر رہا تھا کہ یہ الہام ہوا:

اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِشِفَآءٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ۔

یہ الہام ایک بار حضور کو اوّل بھی ہوا تھا[3]۔

---

* * *

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۵ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۵ء

[2] البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۵ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۵ء

[3] البدر جلد ۴ نمبر ۲ صفحہ ۵ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۵ء

۱۴؍جنوری ۱۹۰۵ء بوقتِ عصر

اِستخارۂ مسنونہ کی تلقین

محبی قاضی غلام حسین صاحب وٹرنری اسسٹنٹ حصار نے عرض کی کہ میری تنخواہ میں دس روپے اضافہ ہوا ہے اور بنگال سے ایک درخواست آئی ہے کہ انسپکٹری کی پوسٹ خالی ہے معہ روپیہ ماہوار ملیں گے اس لیے مشورۃً استفسار ہے کہ کونسی جگہ منظور کی جاوے۔ آپ نے فرمایا کہ؛

استخارۂ مسنونہ کے بعد جس طرف طبیعت کا میلان ہو وہ منظور کر لو[1]

۱۵؍جنوری ۱۹۰۵ء بوقتِ ظہر

الہامات کو ترتیب دینے کی ہدایت

ظہر کے وقت مقدمہ کی پیشگوئی کا اپنے الفاظ پر پورے ہونے کا ذکر رہا کہ خدا تعالیٰ نے جو جو بات جس جس طرح الہام فرمائی ویسی ہی پوری ہو کر رہی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ؛

ان سب الہاموں کو الگ الگ ترتیب دیکر اور کچھ لکھ کر پھر دُنیا کے سامنے پیش کیا جاوے تو امید ہے کہ کسی کی ہدایت کا موجب ہوں[2]۔

۱۷؍جنوری ۱۹۰۵ء

عیسائیت کا مستقبل

مفتی محمد صادق صاحب نے ولایت سے آیا ہوا ایک خط پیش کیا جو ایک یورپین شخص پال کلاتھیوس کی طرف سے انگریزی میں تھا اور جس میں اس نے لکھا تھا کہ مَیں نے اور میری بیوی نے آپ کی مرسلہ کتب کو سوائے اُس حصّہ کے جو کہ عربی یا ہندوستانی (کیونکہ مجھے ٹھیک علم نہیں) خط میں تھا اور جس کے لیے

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۴ صفحہ ۲ مورخہ یکم فروری ۱۹۰۵ء

[2] البدر جلد ۴ نمبر ۴ صفحہ ۲ مورخہ یکم فروری ۱۹۰۵ء

میری زباندانی کی قابلیت سردست نامکمل ہے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ ہمارا تعلق ایک چھوٹے سے گروہ سے ہے جس نے کہ یسوع کے خدائی کے خیال کو استعفیٰ دیدیا ہے اور اسے صرف ایک ہادی خیال کرتا ہے اور اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا گروہ ہے لیکن بحمداللہ کہ ترقی کر رہا ہے جو خیال ہمارا یسوع کی نسبت ہے۔ وہی زردشت۔ بدھ۔ محمد (دائمی برکت اور رحمت خدا کی اس پر نازل ہو) کی نسبت ہے۔ ہم ان گستاخ پادریوں کو کسی قسم کی مدد نہیں دیتے جو کہ لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کا مذہب پادریوں کے مذہب سے بہتر نہیں تو اُن ہی جیسا ضرور ہے۔

پرائمر جو کہ مَیں ارسال کروں گا۔ اگر آپ اس کے جواب میں مجھے کچھ زیادہ معلومات اپنے نئے مسیح کی نسبت اور خصوصیت سے کشمیر میں مسیح کی قبر کے ثبوت کی نسبت ارسال کریں گے تو مَیں بہت ہی مشکور ہوں گا۔

حضرت اقدس نے اس پر فرمایا کہ :

دراصل اب عیسویت سے دست برداری دُنیا میں شروع ہو گئی ہے اور اس مذہب کو جلا دینے والی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ آگ کا دستور ہے کہ وُہ اوّل ذرا سی شروع ہو کر پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ یہی حال اب عیسائیت کا ہو گا۔[١]

---

٢٨ / جنوری ١٩٠٥ء

حضرت شہزادہ عبداللطیف کے مریدین

حضور علیہ السلام فجر کے وقت تشریف لائے تو چند ایک احباب نے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ بعدازاں حضرت مولنا عبداللطیف صاحب شہید علیہ الرحمۃ کی جماعتِ مریدین کا تذکرہ ہوتا رہا کہ اب بعض لوگ ان میں سے آ آ کر بیعت کرتے جاتے ہیں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے اظہارِ مسرت فرمایا کیونکہ اس طریق سے ان کے وحشیانہ خیالات کی خود بخود اصلاح ہو رہی ہے۔[٢]

---

[١] البدر جلد ۴ نمبر ۴ صفحہ ۳ مورخہ یکم فروری ١٩٠٥ء

[٢] البدر جلد ۴ نمبر ۵ صفحہ ۲ مورخہ ۸ / فروری ١٩٠٥ء

یکم فروری ۱۹۰۵ء . بوقتِ ظہر

دو الہامات اور ایک رؤیا

ظہر کے وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لاتے تو ذیل کے الہامات و رؤیا سنائے:

۱- اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ۔

۲- اِنِّیْ مَعَ الرُّوْحِ مَعَکَ وَ مَعَ اَھْلِکَ۔

رؤیا

ایک کاغذ دکھایا گیا جس میں کچھ سطور فارسی خط میں ہیں اور سب انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ مطلب جن کا یہ سمجھ میں آیا کہ جس قدر روپیہ نکلتا ہے سب دیدیا جاوے گا۔

اس کے بعد سردی کی شدت کا ذکر رہا کہ رات کو برف جم گئی اور اکثر لڑکوں نے اس سے قلفیاں بنا کر کھائیں جس سے اکثر بیمار ہو گئے ہیں۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ:

اس کا استعمال اس موسم میں بہت مُضر ہے

برکت چاہنا

ایک شخص نے بیعت کی اور درخواست کی کہ تبرکاً مجھے کچھ پڑھایا جاوے۔ جسے میں پڑھتا رہا کروں۔ حضور علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے اُسے سورۃ الحمد ساری پڑھا دی۔[1]

---

۸ فروری ۱۹۰۵ء . بوقتِ ظہر

شرک سے پرہیز

ظہر کے وقت حضور علیہ السلام تشریف لاتے تو آپ کے ایک خادم آمدہ از کشمیر نے سربسجود ہو کر خدا تعالیٰ کے کلام اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کو اس کے ظاہری الفاظ پر پورا کرنا چاہا۔ اور نہایت گریہ و زاری سے اظہارِ محبت کیا۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے اس حرکت سے منع فرمایا اور کہا کہ:

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۵ صفحہ ۲ مورخہ ۸ فروری ۱۹۰۵ء

یہ مُشرکانہ باتیں ہیں ان سے پرہیز چاہیے

مباحثات کو بند فرمانا

ایک شخص کی درخواستِ مباحثہ پر فرمایا کہ :

حسبِ اعلامِ الٰہی ہم نے مباحثہ کا دروازہ بند کر دیا ہوا ہے۔ لیکن ہاں جس کا جی چاہے ازالہ شبہات کے لیے ہم سے کلام یا تحریر کر سکتا ہے۔ بحث میں تو فریقین کو ہار جیت کا خیال ہوتا ہے مگر اس میں یہ خیال نہیں ہوتا۔ بحث کے بند کرنے سے ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی اعتراض کرے یا سوال کرے یا اُسے کچھ وساوس ہوں تو اس کی طرف توجہ ہی نہ کی جاوے بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ جواب اور جواب الجواب اور پھر ہار جیت کا جو خیال لوگوں کو ہوتا ہے اس سے وہ اِحقاقِ حق سے دُور جا پڑتے ہیں، ورنہ سوالات اور ازالہ وساوس کے لیے دروازہ کھُلا ہے جس کا جی چاہے ہم سے پُوچھ سکتا ہے[1]

۹؍ فروری ۱۹۰۵ء

ظہر کے وقت تشریف لا کر طاعون کے ذکر پر فرمایا کہ :

سردی کی شدت میں یہ کم ہو جایا کرتی تھی مگر اب سردی کی شدت کے ساتھ اس کی بھی شدت ترقی کر رہی ہے، حالانکہ ابھی اس کی مزید ترقی کے ایام آنے والے ہیں[2]

۱۱؍ فروری ۱۹۰۵ء بعد نماز ظہر

انگریزوں کی حکومت میں رہنے کا مسئلہ

ظہر کی نماز ادا فرما کر حضرت اقدس تشریف لے گئے۔ لیکن جناب صاحبزادہ سراج الحق صاحب نعمانی کے

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۶ صفحہ ۳ مورخہ ۱۸؍ فروری ۱۹۰۵ء ۔ نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۷ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴؍ فروری ۱۹۰۵ء

[2] البدر جلد ۴ نمبر ۶ صفحہ ۳ مورخہ ۱۸؍ فروری ۱۹۰۵ء نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۷ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴؍ فروری ۱۹۰۵ء

اقارب میں سے ایک صاحب مولوی احمد سعید صاحب انصاری سہارنپوری برادر زادہ و شاگرد خلیفہ محی السنۃ و قامع البدعۃ حافظِ حدیث جناب مولانا شیخ محمد انصاری سہارنپوری مولدًا مکی مہاجرًا مرحوم، اِحقاقِ حق کے خیال سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس لیے صاحبزادہ صاحب نے حضورِ اقدس سے ان کی ملاقات کی درخواست کی۔ جس پر حضور علیہ السلام اسی وقت تشریف لے آئے اور تھوڑی دیر مجلس فرمائی۔

بعد استفسارِ اسم و سکونت و مختلف اذکار کے مسئلہ جہاد کا تذکرہ ہوا۔ جس میں ضمنًا بعض ان گروہوں کا ذکر بھی آگیا جو کہ ہر ایک کافر کو بذریعہ تلوار قتل کر دینے کو غزا قرار دیتے ہیں اور انگریزوں کے ملکوں میں رہنا بدعت اور کفر خیال کرتے ہیں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ :

اُن کا یہ خیال کہ ہم کفر کے اثر سے بچنے کے لیے الگ رہتے ہیں اور اگر انگریزوں کی رعیت ہو کر رہیں تو آنکھوں سے کفر اور شرک کے کام دیکھنے پڑیں اور مشرکانہ کلام کان سے سُننے پڑیں۔ میرے نزدیک دُرست نہیں ہے کیونکہ اس گورنمنٹ نے مذہب کے بارے میں ہر ایک کو اب تک آزادی دے رکھی ہے اور ہر ایک کو اختیار ہے کہ وہ امن اور سلامت روی سے اپنے اپنے مذہب کی اشاعت کرے۔ مذہبی تعصّب کو گورنمنٹ ہرگز دخل نہیں دیتی۔ اس کی بہت سی زندہ نظیریں موجود ہیں۔ ایک دفعہ خود عیسائی پادریوں نے ایک جھوٹا مقدمہ خون کا مجھ پر بنایا۔ ایک انگریز اور عیسائی حاکم کے پاس ہی وہ مقدمہ تھا اور اس وقت کا ایک لیفٹیننٹ گورنر بھی ایک پادری مزاج آدمی تھا مگر آخر اس نے فیصلہ میرے حق میں دیا اور بالکل بَری کر دیا۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ مَیں پادریوں کی خاطر انصاف کو ترک نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ابھی ایک مقدمہ فیصلہ ہوا ہے۔ پہلے تو وہ ہندو مجسٹریٹوں کے پاس تھا۔ نہیں معلوم کہ انہوں نے کس رُعب میں آکر بہت ہی واضح اور بیّن وجوہات کو نظر انداز کر دیا اور مجھ پر جرمانہ کیا۔ لیکن آخر جب اس کی اپیل ایک انگریز حاکم کے پاس ہوئی تو اس نے بَری کر دیا اور مجسٹریٹ کی کاروائی پر افسوس کیا اور کہا کہ جو مقدمہ اپنے ابتدائی مرحلہ پر خارج ہونے کے قابل تھا اس پر اس قدر وقت ضائع کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں ابھی تک عدل اور انصاف کا مادہ موجود ہے۔ اگر کسی قسم کا مذہبی تعصب یا بغض ہوتا تو کم از کم میرے ساتھ تو ضرور برتا جاتا۔ تین لاکھ کے قریب جماعت ہے۔ پھر افغانستان کے لوگ بھی آآ کر بیعت کرتے رہتے ہیں اور ایک نیا فرقہ ہونے کی وجہ سے بھی گورنمنٹ کی نظر اور توجہ اس طرف ہونی چاہیے تھی مگر دیکھ لو کہ قریب آٹھ کے ہمارے مقدمات ہوئے ہیں جن میں سے سوائے ایک دو کے باقی کُل مخالفین کی طرف سے ہم پر تھے مگر سب میں کامیابی ہم کو ہی حاصل ہوئی ہے۔ اور انگریزوں نے ہی ہمارے حق میں فیصلے دیئے ہیں؛ اگرچہ ہم ان سب کامیابیوں کو خُدا کی طرف

سے ہی سمجھتے ہیں کیونکہ اگر وہ نہ چاہتا تو یہ لوگ کیا کرتے۔ مگر جن لوگوں کے ذریعہ اور ہاتھوں سے اس کی نُصرت ہمارے شاملِ حال ہوئی وہ بھی قابلِ شکر کے ہیں۔ جہانتک میرا خیال بلکہ یقین ہے وہ یہ ہے کہ ابھی تک ان لوگوں میں تعصب نہیں ہے اور آئندہ کا حال خُدا کو معلوم ہے اور اسی لیے مَیں کہتا ہوں کہ اگر ان لوگوں کو خدمتِ دین ہی مطلوب ہے اور ان کی غرض خُدا کو راضی کرنا ہے تو چھپ کر بیٹھ رہنے سے کیا فائدہ؟ ان کو چاہیے کہ خدمتِ دین کا ایک پہلو ہاتھ میں لیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کسی قسم کی سختی ہرگز نہیں ہے۔ لوگوں کو تبلیغ اور اتمامِ حجت کریں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ واعظ لوگوں کو گورنمنٹ گرفت کرتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہاں جو لوگ مفسد ہوتے ہیں وہ ضرور خود ہی گرفت کے قابل ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ کا اس میں کیا قصور؟ اب تو عیسویت کا یہ حال ہے کہ اس پر خود بخود موت آ رہی ہے۔ خود اُن کے بڑے بڑے عالم اور فاضل تثلیث کے پکے دشمن ہو گئے ہیں اور نئی تعلیم نے اُن کے دلوں میں یہ بات کُوٹ کر بھر دی ہے کہ بناوٹی خُدا اب کام نہیں آسکتا۔ پادریوں کی یہ حالت ہے کہ صرف ٹکڑے کی خاطر کام کر رہے ہیں۔ ایک دن تنخواہ کو دیر ہو جاوے تو کام چھوڑ دیتے ہیں اور خود عیسائی مذہب کے ردّ میں کتابیں لکھتے ہیں۔

اس زمانہ کا جہاد

اب یہ زمانہ کسرِ صلیب کا ہے۔ تقریر کے مقابلہ پر تلوار سے کام لینا بالکل نادانی ہے۔ خُدا تعالیٰ قرآنِ شریف میں فرماتا ہے کہ جس طرح اور جن آلات سے کفار تم پر حملہ کرتے ہیں۔ انہی طریقوں اور آلات سے تم ان لوگوں کا مقابلہ کرو۔ اب ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے حملے اسلام پر تلوار سے نہیں ہیں بلکہ قلم سے ہیں۔ لہٰذا ضرور ہے کہ اُن کا جواب قلم سے دیا جاوے اگر تلوار سے دیا جاوے گا تو یہ اعتدا ہوگا جس سے خدا تعالیٰ کی صریح ممانعت قرآنِ شریف میں موجود ہے۔ اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرۃ: ۱۹۱) پھر اگر عیسائیوں کو قتل بھی کر دیا جاوے تو اس سے وہ وساوس ہرگز دُور نہ ہوں گے جو کہ دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ وہ اور پختہ ہو جاویں گے اور لوگ کہیں گے کہ واقع میں اہلِ اسلام کے پاس اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل کوئی نہیں ہے لیکن اگر شیریں کلامی اور نرمی سے ان کے وساوس کو دُور کیا جاوے تو امید ہے کہ وہ سمجھ جاویں گے اور ہم نے دیکھا ہے کہ بعض عیسائی لوگ جو یہاں آتے ہیں ان کو جب نرمی سے سمجھایا جاتا ہے تو اکثر سمجھ جاتے ہیں اور تبدیلِ مذہب کر لیتے ہیں (جیسے کہ ماسٹر عبدالحق صاحب نومسلم) پس ہماری رائے تو یہ ہے کہ جہانتک ہو سکے کمربستہ ہو کر دین کی خدمت میں مصروف ہوں کیونکہ یہ وقت اسی کام کے لیے ہے اگر اب کوئی نہیں کرتا تو اور کب کرے گا؟

بعض ایسے لوگ جن تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور دعاوی کی مفصل کیفیت نہیں پہنچی، تاہم وہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں اور بسبب دُور ہونے کے یقینی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اُن کے ذکر پر آپ نے فرمایا کہ:

نیک لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے، کیونکہ ان کو کامل علم نہیں ہے۔ اور علم اصل میں اسی کو کہتے ہیں جبکہ انسان کی واقفیت رؤیت کے قائمقام ہو۔

الہامات کے ذکر پر فرمایا کہ:

قضا و قدر کے اسرار چونکہ عمیق در عمیق ہوتے ہیں، اس لیے بعض وقت الہامات اور رؤیا کی تفہیم میں انسان کو غلطی لگ جاتی ہے۔

مذکورہ بالا تقریر فرما کر حضرت اقدس تشریف لے گئے مگر پھر بہت جلد تشریف لائے اور فرمایا کہ:

عصر کا وقت ہو گیا ہے۔ اذان دی جاوے۔

خاں صاحب شادی خاں اذان دینے گئے اور حضور علیہ السلام نے مجلس فرمائی۔

سچّے الہام کی علامات

چونکہ اس وقت اہل اسلام میں سے بھی بعض مخالف اور منکر حضرت مسیح موعود الہام کے مدعی ہیں اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم کو حضرت مرزا صاحب کے کاذب اور دجّال ہونے کے بارے میں خدا تعالیٰ سے وحی ہوئی ہے اور ادھر بعض مذاہب غیر از اسلام میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو کہ اپنے مذہب کی تصدیق کے بذریعہ الہام مدعی ہیں اس لیے ایسے دعاوی کے جواب میں حضور علیہ السلام نے ایک لطیف تقریر فرمائی جو کہ بہت ہی غور اور توجّہ کے قابل ہے۔

ہر ایک شخص اپنی حالت کے لحاظ سے معذور ہوتا ہے اس لیے ان میں فیصلہ کا ایک موٹا طریق ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں۔ اس وقت مختلف اقوام جن کا اسلام سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے الہام کے مدعی ہیں دس سال کا عرصہ گذرا کہ ایک دفعہ امرتسر سے ایک سکھ کا خط آیا کہ مذہبِ سکھ کے سچّا ہونے کی نسبت مجھے الہام ہوا ہے۔ اور ایسے ہی ایک انگریز نے الہ آباد سے لکھا کہ مجھے عیسویت کے سچّا ہونے کی نسبت الہام کے ذریعہ سے اطلاع دی گئی ہے۔ اور ایک مولوی عبد اللہ صاحب غزنوی جن کو مَیں نیک جانتا ہوں ان کی اولاد امرتسر میں ہے۔ اُن کو بھی دعویٰ الہام کا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں الہام ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ جھوٹا ہے

اور مرزا صاحب کاذب اور دجّال ہیں۔ پھر ادھر ہماری جماعت میں بھی ہزارہا ایسے آدمی ہیں جن کو الہام اور رؤیا کے ذریعہ سے یہ اطلاع ملی ہے اور خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے زبانِ مبارک سے تصدیق کی ہے کہ یہ سلسلہ منجانب اللہ ہے اور یہی ذریعہ ان کی بیعت کا ہوا ہے تو اب ان مختلف اقسام کے الہاموں میں جلدی سے فیصلہ کرنا تقویٰ سے بعید ہے۔ اس لیے مَیں جلدی کو پسند نہیں کرتا۔ انسان کو چاہیے کہ صبر اور دُعا سے کام لے اور تقویٰ کے پہلو کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا۔ (النحل : ۱۲۹) اس وقت خود اسلام میں کئی فرقے موجود ہیں۔ جو کہ ایک دُوسرے کی تردید کر رہے ہیں۔ پھر دُوسرے مذاہب کے حملے الگ ہیں۔ ایک کتاب "ترکِ اسلام" لکھی گئی تھی اور اب ایک "تہذیب الاسلام" لکھی گئی ہے جس میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم پر سخت فحش اور شرمناک حملے کئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کل مذاہب اور فرقوں میں ایک جنگ چل رہی ہے اور ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ پس ایسی حالت میں فیصلہ کرنا ایک آسان امر نہیں ہے۔ یا تو اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے کسی کو فہم دے اور رُشد عطا کرے اور یا انسان خود جلدی نہ کرے اور صبر اور دُعا سے کام لے تاکہ وقت پر حقیقت کھُل جاوے کہ خدا کی تائید اور نصُرت کس کے شاملِ حال ہے کیونکہ جھوٹے مذہب کے ساتھ اس کی نصُرت اور تائید کبھی شامل نہیں ہوسکتی۔ اگر جھوٹے مذہب کی بھی وہی خاطر خدا تعالیٰ کو ہو جو کہ سچے مذہب کی ہوتی ہے تو پھر سچ اور جھوٹ کا امتیاز کرنا محال ہو جاتے گا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جیسا کہ قرآنِ شریف میں درج ہے یہ جواب دیا کہ اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ (الانعام : ۱۳۶) کہ اگر تم لوگوں پر میرا سچا ہونا مشتبہ ہے تو تم بھی اپنی اپنی جگہ عمل کرو۔ مَیں بھی کرتا ہوں انجام پر دیکھ لینا کہ خدا کی تائید اور نصُرت کس کے شامل حال ہے جو امر خدا کی طرف سے ہوگا وہ بہرحال غالب ہو کر رہے گا۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ (یوسف : ۲۲) ان مختلف الہامات کے فیصلہ کے لیے بھی دراصل یہی معیار ہے کیونکہ ایک طرف تو اہلِ اسلام الہام کے مدعی ہیں دوسری طرف سکھ وغیرہ بھی۔ پس اگر یہ سب الہامات خدا کی طرف سے سمجھے جائیں تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا بھی بہت سے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ سب ایک ہی کا کلام ہے تو آپس میں ایک دوسرے کی ضد کیوں ہیں کہ وہی خُدا ایک کو کہتا ہے کہ فلاں شخص سچا ہے اور دُوسرے کو کہتا ہے کہ جھُوٹا ہے۔ پس اس میں فیصلہ کی جو آسان ترین راہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک قول ہوتا ہے اور ایک فعل۔ اگر قول میں اختلاف ہے تو اب فعل کی انتظار چاہیے۔ قول پر اگر فیصلہ کا مدار رکھا جاوے تو اس کی نظیر دُوسری جگہ نکل آتی ہے اور دُوسرا کہتا ہے کہ مجھے یہ الہام ہوا ہے کہ تم کذّاب ہو۔ لیکن فعل کو کہاں چھپائیں گے۔ اس کی مثال تو ایک سُورج کی ہے جس کی رؤیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔

قول سے مراد ہماری وحی الٰہی ہے اور فعل سے نُصرت اور تائیدات الٰہیہ۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ فعل کو دکھلاؤ تو یاد رہے کہ اس کا جلدی ظاہر کرنا ہمارا اپنا اختیار نہیں ہے اور کسی نبی کے اختیار میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ آیات اللہ کو جب چاہے دکھا دیوے۔ ہاں خلق اللہ کی خاطر ان کو اس قسم کے اضطراب ضرور ہوتے ہیں اور وہ خواہاں ہوتے ہیں مگر آخر آیات خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اپنے مصالح سے ان کو کھولتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بڑا اضطراب تھا تو خدا تعالیٰ نے وحی کی کہ تو آسمان پر زینہ لگا کر جا اُن کو نشان لا دے۔

اگر ہم کذاب اور دجّال ہیں تو صبر کرو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ (المومن : ۲۹) جب سے دُنیا قائم ہوئی ہے یہ کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ نے کاذب کی تائید کر کے سچّوں کو شکست دی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپؐ کے مقابلہ پر الہام کے مدعی موجود تھے اور وہ آپ کو جھوٹا خیال کرتے تھے۔ مسیلمہ کذاب بھی انہی میں تھا۔ اگر قول پہ مدار ہوتا تو اشتباہ رہتا مگر آخر فعلِ الٰہی نے فیصلہ کر دیا۔ دیکھ لو کہ اب کس کے دین کا نقارہ بج رہا ہے۔ کس کا نام روشن ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس کو برکت دی جاتی ہے وہ بڑھتا ہے وہ پھلتا اور پھولتا ہے اور اس کے دشمنوں پر اُسے فتح پر فتح ملتی ہے۔ لیکن جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا وہ مثل جھاگ کے ہوتا ہے جو کہ بہت جلد نابُود ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ جس کا مدار تقویٰ پر ہوگا اور جس کے خدا تعالیٰ کے ساتھ پاک تعلقات ہوں گے اسی کو نُصرت ہوگی۔ یہ صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں ہے کہ اس وقت اور مُلہم ہمیں جھوٹا قرار دیتے ہیں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو کہ مُلہم تھے اور وہ نبیوں کی تکذیب کرتے تھے تو اس وقت کے داناؤں نے یہی فیصلہ دیا تھا کہ جو سچا ہوگا اس کا کاروبار بابرکت ہوگا۔ پس اب بجُز اس بات کے اور فیصلہ نہیں نظر آتا کہ اگر قول میں پیچیدگی ہے تو فعل کو دیکھو، لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ مجھ سے یہ درخواست کہ فعل ظاہر ہو عبث ہے۔ میں تو ایک عاجز بندہ ہوں، یہ خدا کا کام ہے کہ جو فعل وہ چاہے ظاہر کر دے۔ مَیں کیا ہوں۔ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا کہ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ (العنکبوت : ۵۱) انبیاء کا کام بازیگروں کی طرح چھٹے بٹے دکھانا نہیں ہوتا۔ وہ تو خدا تعالیٰ کے پیغام رساں ہوتے ہیں۔ علمی بحث الگ ہے اور الہامی بحث الگ ہے۔ مختصر فیصلہ یہی ہے کہ اگر قول میں تعارض ہے تو فعل خود فیصلہ کر دے گا۔ ایک مفتری تحصیلدار گورنمنٹ سے عزّت نہیں پا سکتا اور گرفتار کیا جاتا ہے تو مفتری علی اللہ کیسے اس کا محبوب ہو سکتا ہے اور وہ کب اس کی تائید کر سکتا ہے۔ اگر سچے کی عزّت بھی ویسی ہو جیسے کہ

جھوٹے کی تو پھر دُنیا سے امان اُٹھ جاوے گا۔

پس یاد رکھو کہ قول کے اشتباہ فعل سے ہی دُور ہو سکتے ہیں۔ میرے ساتھ جو وعدے خدا تعالیٰ کے ہیں وُہ پچیس تیس سال پیشتر براہین میں درج ہو چکے ہیں اور بہت سے پُورے ہو گئے ہیں۔ جو باقی ہیں چاہو تو ان کا انتظار کرو۔

الہام میں دخلِ شیطانی بھی ہوتا ہے جیسے کہ قرآنِ شریف سے بھی ظاہر ہے، مگر جو شخص شیطان کے اثر کے نیچے ہو اُسے نصرت نہیں ملا کرتی۔ نُصرت اُسے ہی ملا کرتی ہے جو رحمان کے زیرِ سایہ ہو۔ ہم اپنی زبان سے کسی کو مفتری نہیں کہتے۔ جبکہ وحی شیطانی بھی ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ کسی سادہ لوح کو دھوکا لگا ہو۔ اس لیے ہم فعلِ الٰہی کی سند پیش کرتے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ پیش کی تھی اور خدا تعالیٰ نے فعل پر بہت مدار رکھا ہے۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيْلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ (الحاقۃ: ۴۵، ۴۶) میں فعل ہی کا ذکر ہے۔ پس جبکہ یہ مسنون طریق ہے تو اس سے کیوں گریز ہے۔ ہم لوگوں کے سامنے ہیں اور اگر فریب سے کام کر رہے ہیں تو خدا تعالیٰ ایسے عذاب سے ہلاک کریگا کہ لوگوں کو عبرت ہو جاوے گی اور اگر یہ خدا کی طرف سے ہے اور ضرور خدا کی طرف سے ہے تو پھر دوسرے لوگ ہلاک ہو جاویں گے۔[1]

۱۹ر فروری ۱۹۰۵ء بعد نماز مغرب

آج کا دن اپنی شان میں ایک مبارک دن تھا کیونکہ غالبًا سات ماہ کے بعد حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے مغرب اور عشاء کے درمیان مجلس فرمائی اور جو رسالہ درباره فتح مقدمہ حضور تصنیف فرما رہے ہیں۔ اس کے مجوّزہ مضامین کا مختصر تذکرہ فرمایا :

واجب الادا مہر کی ادائیگی

اس کے بعد ایک صاحب نے دریافت کیا کہ ایک شخص اپنی منکوحہ سے مہر بخشوانا چاہتا تھا مگر وہ عورت کہتی تھی تُو اپنی نصف نیکیاں مجھے دیدے تو بخش دُوں۔ خاوند کہتا رہا کہ میرے پاس حسنات بہت کم ہیں بلکہ بالکل ہی نہیں ہیں۔ اب وہ عورت مر گئی ہے خاوند کیا کرے؟

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۶ صفحہ ۳ و ۴ مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۰۵ء ۔ نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۷ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۰۵ء

حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا کہ :

اسے چاہیے کہ اس کا مہر اس کے وارثوں کو دیدے۔ اگر اس کی اولاد ہے تو وہ بھی وارثوں سے ہے۔ شرعی حصّہ لے سکتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس خاوند بھی لے سکتا ہے۔

ایک لطیف نکتہ

حضرت مولوی نورالدین صاحب نے اثناء گفتگو میں ذکر کیا کہ یہ ایک لطیف بات ہے کہ جس قدر مجدد گذرے ہیں ان کے نام کی محمد یا احمد کی جزو ضروری ہوتی رہی ہے۔ قسطنطنیہ میں عجیب قسم کے نام لوگوں کے ہوتے ہیں مگر وہ مہدی جس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا اس کے نام میں بھی محمدؐ کا لفظ تھا۔

معجزات میں افراط و تفریط

موجودہ زمانے کے حالات پر ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ :

ایک گروہ تو معجزات سے قطعی منکر ہے جیسے کہ نیچری اور آریہ وغیرہ۔ اس نے تفریط کا پہلو اختیار کیا ہے اور ایک گروہ وہ ہے جو کہ افراط کی طرف چلا گیا ہے جیسے کہ بعض لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کے معجزات بیان کیا کرتے ہیں کہ بارہ برس کی ڈوبی ہوئی کشتی نکالی اور حضرت عزرائیل کے ہاتھ سے آسمان پر جا کر قبض شدہ ارواح چھین لیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ دونوں فریقوں نے معجزہ کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے۔ معجزہ سے مراد فرقان ہے جو حق اور باطل میں تمیز کرکے دکھا دے اور خدا کی ہستی پر شاہد ناطق ہو[1]۔

---

۲۰ فروری ۱۹۰۵ء قبل از عشاء

خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر ہدایت حاصل نہیں ہوتی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عشاء کی نماز سے کچھ پیشتر تشریف لا کر مجلس فرمائی۔

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۷ صفحہ ۲ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۰۵ء
و الحکم جلد ۹ نمبر ۸ صفحہ ۷ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۵ء

خداتعالیٰ کے احسانات اور انعامات کا تذکرہ رہا۔ بعض کفار کی حالت پر آپ نے فرمایا کہ :

جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل انسان کے شاملِ حال نہ ہو تب تک اُسے ہدایت کی راہ نصیب نہیں ہوتی بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ موت تک کفر ہی پر راضی رہتے ہیں اور کبھی اُن کے دل میں خیال نہیں گذرتا کہ ہم غلطی پر ہیں حتیٰ کہ اسی میں مَر جاتے ہیں۔

اس پر حضرت مولوی عبدالکریم صاحب نے بیان کیا کہ چند یوم ہوتے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ان کے گاؤں کی آبادی چار سو باشندوں کی تھی۔ طاعون جو پڑی تو سب کے سب ہلاک ہو گئے صرف چالیس شخص بچے۔ اور ان میں سے بھی صرف نو کس تندرست تھے اور باقی کچھ نہ کچھ مریض ہی تھے۔ ان نو میں اُن کا چچا بھی تھا۔ ان کے دل میں آیا کہ اس قدر عبرتناک حادثہ موت کا چونکہ گاؤں میں گذرا ہے، ممکن ہے کہ چچا کا دل رقیق ہوا ہو۔ چلو اُسے چل کر تبلیغ کر آویں شاید ہدایت نصیب ہو۔ باوجود اس کے کہ لوگوں نے اس طاعون زدہ گاؤں میں جانے سے روکا مگر تبلیغِ حق کے جوش میں وہ چلے گئے اور جا کر اپنے چچا کو اس سلسلہ کی صداقت کی نسبت سمجھایا۔ چچا نے یہ جواب دیا کہ اگر یہ طاعون مرزے کی مخالفت کی وجہ سے ہے تو مجھے خوشی سے اس سے مرجانا قبول ہے۔ بیشک مجھے طاعون ہو۔ انجام یہ ہوا کہ وہ اور اس کا تمام بال بچہ تباہ اور ہلاک ہو گیا، مگر مخالفت پر برابر آمادہ رہا اور مرتے دم تک نہ مانا۔[1]

۲۱؍فروری ۱۹۰۵ء (مابین مغرب وعشاء)

فارغ نشینی اچھی نہیں

حسبِ دستور قریب ایک گھنٹہ کے حضور نے مجلس فرمائی۔ اوّل رسالہ زیرِ تصنیف کا ذکر رہا۔ پھر فرمایا کہ :

اوّل تو بوجہ علالتِ طبع کے فارغ نشینی رہی۔ اب خدا نے کچھ صحت عطا فرمائی ہے تو قلم میں بھی قوت آگئی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ صحت رکھے تو فارغ نشینی اچھی نہیں ہے۔ بندہ اگر خدمت ہی کرتا رہے تو خوب ہے۔

---

[1] البدر جلد ۴ نمبر ۶ صفحہ ۲ مورخہ ۵؍مارچ ۱۹۰۵ء
و الحکم جلد ۹ نمبر ۸ صفحہ ۶ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۵ء

دہریّت کو نبی کا وجود ہی جلا سکتا ہے

فرمایا کہ :

دہریہ پن کو اگر کوئی شئے جلا سکتی ہے تو وہ صرف انبیاء کا وجود ہے؛ ورنہ عقل دلائل سے وہاں کچھ نہیں بنتا۔ کیونکہ عقل کی حد سے تو پیشتر ہی گذر کر وہ دہریہ بنتا ہے۔ پھر عقل کی پیش اس کے آگے کب چل سکتی ہے۔

خُدا نمائی کی ضرورت

فرمایا کہ :

آج کل خدا نمائی کی بڑی ضرورت ہے۔ دراصل اگر دیکھا جاوے تو خُدا کی ہستی سے انکار ہو رہا ہے۔ بہت لوگوں کو یہ خیال ہے کہ کیا ہم خُدا کی ہستی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اپنے زعم میں تو سمجھتے ہیں کہ خُدا کو وہ مانتے ہیں لیکن ذرا غور سے ایک قدم رکھیں تو ان کو معلوم ہو کہ وہ درحقیقت قائل نہیں ہیں کیونکہ اور اشیاء کے وجود کے قائل ہونے سے جو حرکات اور افعال ان سے صادر ہوتے ہیں وہ خدا کے وجود کے قائل ہونے سے کیوں صادر نہیں ہوتے۔ مثلاً جب کہ وہ سم الفار سے واقف ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی مرجاتا ہے تو وُہ اس کے نزدیک نہیں جاتا اور نہیں کھاتا کیونکہ اُسے یقین ہے کہ مَیں اگر کھا لوں گا تو مرجاؤں گا۔ پس اگر خدا کی ہستی پر بھی یقین ہوتا تو وہ اسے مالک، خالق اور قادر جان کر نافرمانی کیوں کرتا؟ پس ظاہر ہے کہ بڑا ضروری مسئلہ ہستی باری تعالیٰ کا ہے اور قابلِ قدر وہی مذہب ہو سکتا ہے جو کہ اسے نئے نئے لباس میں پیش کرتا رہے تاکہ دلوں پر اثر پڑ سکے۔ دراصل یہ مسئلہ امّ المسائل ہے اور اسلام اور غیر مذاہب میں ایک فرقان ہے۔

عیسائیوں نے بھی فرقان کا دعویٰ کیا ہے کہ انجیل نے ایمانداروں کی فلاں فلاں علامت قرار دی ہے مگر اب وہ کسی میں بھی پائی نہیں جاتیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایمان کا نام و نشان نہیں مگر اسلام میں فرقان کی سب علامات موجود ہیں۔

براہینِ احمدیہ عہدِ عتیق ہے

جو براہینِ احمدیہ کا حِصّہ چھپ چکا ہے۔ اس پر ذکر چلا۔ فرمایا کہ :

اس میں خدا کی حکمت تھی؛ ورنہ اگر وہ چاہتا تو اسے ہم لکھتے ہی رہتے۔ لیکن خدا نے اب اوّل حِصّہ کو منقطع کر کے بائبل کے عہدِ عتیق کی طرح الگ کر دیا ہے، کیونکہ جو پیشگوئیاں اس میں درج ہیں وُہ اب اس اثنا میں پوری ہو رہی ہیں اور جو حِصّہ اس کا طبع ہو گا وہ عہدِ جدید ہو گا جس میں سابقہ حِصّہ کے

والے ہوں گے کہ خدا نے یوں فرمایا تھا اور وہ اس طرح پورا ہو کر رہا۔

سادگی سچائی کی دلیل ہے براہین میں ہم نے لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ آسمان سے آویں گے۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کئے کہ تناقض ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اسی براہین میں ہم نے تمام الہامات بھی درج کئے ہیں جن میں ہمارا نام مسیح رکھا گیا ہے اور پھر صرف نام ہی نہیں بلکہ جو کام مسیح نے آکر کرنا ہے اس کی نسبت بھی الہامات میری نسبت ہی درج ہیں۔ پس یہ تناقض تو سچائی کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر بناوٹ ہوتی تو تناقض نہ جمع کیا جاتا۔ کم بختوں کی نظر انسان کی غلطی پر تو پڑتی ہے اور خدا کے کلام پر جو اس میں درج ہے نہیں پڑتی۔

ایک الہام کل یا پرسوں آپ کو الہام ہوا :

إِنَّمَا أَمْرُكَ إِذَا أَرَدْتَ شَيْئًا أَنْ تَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ[لہ]

---

۳ مارچ ۱۹۰۵ء (قبل ظہر)

بعض نکات معرفت حافظ غلام رسول صاحب وزیر آبادی نے مولوی محمد ابراہیم صاحب کو حضرت اقدس حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور پیش کیا۔ مولوی موصوف نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے چند استفسار کئے۔ حضور نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا درج ذیل ہے :

سائل :۔ اطمینانِ قلب کیونکر حاصل ہو سکتا ہے ؟

حضرتِ اقدس :۔ قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسی شئے ہے جو قلوب کو اطمینان عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد : ۲۹) پس جہانتک ممکن ہو

[لہ] البدر جلد ۴ نمبر ۷ صفحہ ۲ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۰۵ء

[د] الحکم جلد ۹ نمبر ۸ صفحہ ۷ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۵ء

ذکر الٰہی کرتا رہے اسی سے اطمینان حاصل ہوگا۔ ہاں اس کے واسطے صبر اور محنت درکار ہے۔ اگر گھبرا جاتا اور تھک جاتا ہے تو پھر یہ اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ دیکھو ایک کسان کس طرح پر محنت کرتا ہے اور پھر کس صبر اور حوصلہ کے ساتھ باہر اپنا غلّہ بکھیر آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے والے یہی کہتے ہیں کہ اس نے دانے ضائع کر دیئے۔ لیکن ایک وقت آجاتا ہے کہ وہ ان بکھرے ہوئے دانوں سے ایک خرمن جمع کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ پر حسنِ ظن رکھتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اسی طرح پر مومن جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق پیدا کر کے استقامت اور صبر کا نمونہ دکھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس پر مہربانی کرتا ہے اور اُسے وہ ذوق شوق اور معرفت عطا کرتا ہے جس کا وہ طالب ہوتا ہے۔

یہ بڑی غلطی ہے جو لوگ کوشش اور سعی تو کرتے نہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ ہمیں ذوق شوق اور معرفت اور اطمینانِ قلب حاصل ہو جبکہ دنیوی اور سفلی امور کے لیے محنت اور صبر کی ضرورت ہے تو پھر خدا تعالیٰ کو پھونک مار کر کیسے پا سکتا ہے۔ دُنیا کے مصائب اور مشکلات سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیے۔ اس راہ میں مشکلات کا آنا ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مصائب کا سلسلہ دیکھو۔ کس قدر لمبا تھا۔ تیرہ سال تک مخالفوں سے دُکھ اٹھاتے رہے۔ مکّہ والوں کے دُکھ اُٹھاتے اُٹھاتے طائف گئے اور وہاں سے پتھر کھا کر بھاگے۔ پھر اور کوئی شخص ہے جو ان مصائب کے سلسلہ سے الگ ہو کر خدا شناسی کی منزلوں کو طے کرے؟

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی محنت اور مشقت نہ کرنی پڑے وہ بیہودہ خیال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں صاف فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۷۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دروازوں کے کھلنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ مجاہدہ اسی طریق پر ہو جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے۔ اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ اور اسوہ حسنہ ہے۔ بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور پھر سبز پوش یا گیروے پوش فقیروں کی خدمت میں جاتے ہیں کہ پھونک مار کر کچھ بنا دیں۔ یہ بیہودہ بات ہے۔ ایسے لوگ جو شرعی امور کی پابندیاں نہیں کرتے اور ایسے بیہودہ دعوے کرتے ہیں وہ خطرناک گناہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے بھی اپنے مراتب کو بڑھانا چاہتے ہیں کیونکہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور وہ مُشتِ خاک ہو کر خود ہدایت دینے کے مدعی ہوتے ہیں۔ اصل راہ اور گُر خدا شناسی کا دُعا ہے اور پھر صبر کے ساتھ دُعاؤں میں لگا رہے۔ ایک پنجابی فقرہ ہے ؎

جو منگے سو مر رہے مرے سو منگن جا

حقیقت میں جب تک انسان دعاؤں میں اپنے آپ کو اس حالت تک نہیں پہنچا لیتا کہ گویا اس پر موت وارد ہو جاوے۔ اس وقت تک بابِ رحمت نہیں کھُلتا۔ خدا تعالیٰ میں زندگی ایک موت کو چاہتی

ہے۔ جبتک انسان اس تنگ دروازہ سے داخل نہ ہو کچھ نہیں۔ خدا جوئی کی راہ میں لفظ پرستی سے کچھ نہیں بنتا، بلکہ یہاں حقیقت سے کام لینا چاہیے۔ جب طلب صادق ہوگی تو میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے محروم نہ کرے گا۔

سائل :- استقامت بھی تو ملنی چاہیے۔

حضرت اقدس :- ہاں یہ سچ ہے کہ استقامت ہونی چاہیے اور یہ استقامت بھی اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم ہی سے ملتی ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کا فقیر بھی ایک بخیل سے بخیل انسان کے دروازے پر جب دھرنا مارتا ہے تو کچھ نہ کچھ لے کر ہی اُٹھتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ تو کریم رحیم خدا ہے۔ یہ نا ممکن ہے کہ کوئی اس کے دروازے پر گرے اور خالی اُٹھے۔ اگر چاہتے ہو کہ ساری مرادیں پُوری ہو جاویں تو یہ تو اُس کے ہی فضل سے ہوں گی۔ بعض اوقات انسان کو یہ بھی دھوکا لگتا ہے کہ فلاں مُراد پوری نہیں ہوتی؛ حالانکہ بات یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ احتیاج سے ہی انسان کو بری کر دیتا ہے۔

لکھا ہے کہ ایک بادشاہ کا گذر ایک فقیر پر ہوا جس کے پاس صرف ستر پوشی کو چھوٹا سا پارچہ تھا مگر وُہ بہت خوش تھا۔ بادشاہ نے اس سے پُوچھا کہ تو اس قدر خوش کیوں ہے؟ فقیر نے جواب دیا کہ جس کی ساری ہی مرادیں پوری ہو جاویں وہ خوش نہ ہو تو اور کون ہو؟ بادشاہ کو بڑی حیرانی ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ کیا تیری ساری مرادیں پوری ہو گئی ہیں؟ فقیر نے کہا کہ کوئی مراد ہی نہیں رہی۔ حقیقت میں حصول دو ہی قسم کا ہوتا ہے۔ یا پالے یا ترک۔

غرض بات یہی ہے کہ "خدا یابی" اور "خُدا شناسی" کے لیے ضروری امر یہی ہے کہ انسان دُعاؤں میں لگا رہے۔ زنانہ حالت اور بُزدلی سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس راہ میں مردانہ قدم اُٹھانا چاہیے۔ ہر قسم کی تکلیفوں کے برداشت کرنے کو تیار ہونا چاہیے۔ خدا تعالیٰ کو مقدم کرے اور گھبرائے نہیں۔ پھر امید کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل دستگیری کرے گا اور اطمینان عطا فرماتے گا۔ ان باتوں کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان تزکیہ نفس کرے جیسا فرمایا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ (الشمس : ۱۰)۔

سائل :- دُعا جبتک دل سے نہ اُٹھے کیا فائدہ ہوگا؟

حضرت اقدس :- مَیں اسی لیے تو کہتا ہوں کہ صبر کرنا چاہیے۔ اور اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ خواہ دل چاہے یا نہ چاہے۔ کشاں کشاں مسجد میں لے آو۔ کسی نے ایک بزرگ سے پُوچھا کہ مَیں نماز پڑھتا ہوں مگر وساوس رہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ تُو نے ایک حصّہ پر تو قبضہ کر لیا۔ دوسرا بھی حاصل ہو جائے گا۔ نماز پڑھنا بھی تو ایک فعل ہے اس پر مداومت کرنے سے دُوسرا بھی انشاء اللہ مل جائے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ ایک فعل انسان کا ہوتا ہے اس پر نتیجہ مرتب کرنا ایک دُوسرا فعل ہوتا ہے جو اللہ تعالےٰ کا فعل ہے۔ سعی کرنا، مجاہدہ کرنا یہ تو انسان کا اپنا فعل ہے۔ اس پر پاک کرنا، استقامت بخشنا یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ بھلا جو شخص جلدی کرے گا کیا اس طریق پر وہ جلد کامیاب ہو جائے گا؟ یہ جلد بازی انسان کو خراب کرتی ہے۔ وُہ دیکھتا ہے کہ دُنیا کے کاموں میں بھی اتنی جلدی کوئی امر نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ آخر اس پر کوئی وقت اور میعاد گذرتی ہے۔ زمیندار بیج بو کر ایک عرصہ تک صبر کے ساتھ اس کا انتظار کرتا ہے۔ بچّہ بھی نو مہینے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ پہلی ہی خلوت کے بعد بچہ پیدا ہو جاوے تو لوگ اسے بیوقوف کہیں گے یا نہیں؟ پھر جب دنیوی امور میں قانونِ قدرت کو اس طرح دیکھتے ہو تو یہ کیسی غلطی اور نادانی ہے کہ دینی امور میں انسان بلا محنت و مشقت کے کامیاب ہو جاوے جس قدر اولیاء، ابدال، مرسل ہوتے ہیں انھوں نے کبھی گھبراہٹ اور بُزدلی اور بے صبری ظاہر نہیں کی۔ وہ جس طریق پر چلتے ہیں اسی راہ کو اختیار کرو اگر کچھ پانا ہے۔ بغیر اس راہ کے تو کچھ مِل نہیں سکتا۔ اور مَیں یقیناً کہتا ہوں۔ اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السّلام کو اطمینان جب نصیب ہوا ہے تو اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (المومن: ۶۱) پر عمل کرنے سے ہی ہوا ہے۔ مجاہدات عجیب اکسیر ہیں سیّد عبدالقادر رضی اللہ عنہٗ نے کیسے کیسے مجاہدات کئے۔ ہندوستان میں جو اکابر گذرے ہیں جیسے معین الدین چشتی اور فریدالدین رحمہم اللہ تعالیٰ۔ اُن کے حالات پڑھو تو معلوم ہو کہ کیسے کیسے مجاہدات ان کو کرنے پڑے ہیں۔ مجاہدہ کے بغیر حقیقت کھلتی نہیں۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں فقیر کے پاس گئے اور اس نے توجہ کی تو قلب جاری ہو گیا۔ یہ کچھ بات نہیں۔ ایسے ہندو فقراء کے پاس بھی جاری ہوتے ہیں۔ توجہ کچھ چیز نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ساتھ تزکیہ نفس کی کوئی شرط نہیں ہے۔ نہ اس میں کفر و اسلام کا کوئی امتیاز ہے۔ انگریزوں نے اس فن میں آجکل وہ کمال کیا ہے کہ کوئی دُوسرا کیا کرے گا۔ میرے نزدیک یہ بدعات اور محدثات ہیں۔

شریعت کی اصل غرض تزکیۂ نفس ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السّلام اسی مقصد کو لے کر آتے ہیں۔ اور وہ اپنے نمونہ اور اُسوہ سے اس راہ کا پتہ دیتے ہیں جو تزکیہ کی حقیقی راہ ہے۔ وُہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی محبت دلوں میں پیدا ہو اور شرحِ صدر حاصل ہو۔ مَیں بھی اسی منہاجِ نبوّت پر آیا ہوں۔ پس اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ مَیں کسی ٹوٹکے سے قلب جاری کر سکتا ہوں تو یہ غلط ہے۔ مَیں تو اپنی جماعت کو اسی راہ پر لے جانا چاہتا ہوں جو ہمیشہ سے انبیاء علیہم السّلام کی راہ ہے جو خدا تعالیٰ کی وحی کے ماتحت تیار ہوتی ہے۔ پس اَور راہ وغیرہ کا ذکر ہماری کتابوں میں آپ نہ پائیں گے اور نہ اس کی ہم تعلیم دیتے ہیں اور نہ ضرورت سمجھتے ہیں۔ ہم تو یہی بتاتے ہیں کہ نمازیں سنوار سنوار کر پڑھو اور دُعاؤں میں لگے رہو۔

سائل :- حضور نمازیں پڑھتے ہیں مگر منہیات سے باز نہیں رہتے اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا ہے۔

حضرت اقدس :- نمازوں کے نتائج اور اثر تو تب پیدا ہوں، جب نمازوں کو سمجھ کر پڑھو بجز کلام الٰہی اور ادعیہ ماثورہ کے اپنی زبان میں بھی دُعائیں کرو اور پھر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو یہی ایک امر ہے جس کی بار بار تاکید کرتا ہوں کہ تھکو اور گھبراؤ نہیں۔ اگر استقلال اور صبر سے اس راہ کو اختیار کرو گے تو انشاء اللہ یقیناً ایک نہ ایک دن کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہاں یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالےٰ ہی کو مقدم کرو اور دین کو دنیا پر ترجیح دو جب تک انسان اپنے اندر دُنیا کا کوئی حصّہ بھی پاتا ہے وہ یاد رکھے کہ ابھی وہ اس قابل نہیں کہ دین کا نام بھی لے۔ یہ بھی ایک غلطی لوگوں کو لگی ہوئی ہے کہ دنیا کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام جب دُنیا میں آتے ہیں۔ کیا انھوں نے دنیا کے لیے سعی اور مجاہدہ کیا ہے یا دین کے لیے؟ اور باوجود اس کے کہ اُن کی ساری توجہ اور کوشش دین ہی کے لیے ہوتی ہے۔ پھر کیا وہ دنیا میں نامراد رہے ہیں۔ کبھی نہیں۔ دنیا خود اُن کے قدموں پر آگری ہے۔ یہ یقیناً سمجھو کہ اُنھوں نے دُنیا کو گویا طلاق دے دی تھی۔ لیکن یہ ایک عام قانون قدرت ہے کہ جو لوگ خدا تعالےٰ کی طرف سے آتے ہیں وُہ دُنیا کو ترک کرتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ وُہ دُنیا کو اپنا مقصود اور غایت نہیں ٹھہراتے اور دُنیا ان کی خادم اور غلام ہو جاتی ہے جو لوگ برخلاف اس کے دُنیا کو اپنا اصل مقصود ٹھہراتے ہیں خواہ وہ دُنیا کو کسی قدر بھی حاصل کرلیں مگر آخر ذلیل ہوتے ہیں۔ سچی خوشی اور اطمینان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عطا ہوتا ہے۔ یہ مجرد دنیا کے حصول پر منحصر نہیں ہے۔ اس لیے ضروری امر ہے کہ ان اشیاء کو اپنا معبود نہ ٹھہراؤ۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اسی کو یگانہ و یکتا معبود سمجھو۔ جبتک انسان ایمان نہیں لاتا۔ کچھ نہیں اور ایسا ہی نماز روزہ میں اگر دُنیا کو کوئی حصّہ دیتا ہے تو وہ نماز روزہ اُسے منزلِ مقصود تک نہیں لے جاسکتا۔ بلکہ محض خُدا کے لیے ہو جاوے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام: ۱۶۳) کا سچا مصداق ہو تب مسلمان کہلائے گا۔ ابراہیمؑ کی طرح صادق اور وفادار ہونا چاہیے۔ جس طرح پر وہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گیا اسی طرح انسان ساری دنیا کی خواہشوں اور آرزوؤں کو جب تک قربان نہیں کر دیتا کچھ نہیں بنتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو ایک جذبہ پیدا ہو جاوے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ خود اس کا متکفل اور کارساز ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کبھی بدظنی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر نقص اور خرابی ہوگی تو ہم میں ہوگی۔

پس یاد رکھو کہ جبتک انسان خدا تعالیٰ کا نہ ہو جاوے بات نہیں بنتی اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتا ہے اس میں شتابکاری نہیں رہتی۔ مشکل یہی ہے کہ لوگ جلد گھبرا جاتے ہیں اور پھر شکوہ کرنے

لگتے ہیں۔

سائل :۔ ابتدائی منزل اس مقصد کے حصول کی کیا ہے؟

حضرت اقدس :۔ ابتدائی منزل یہی ہے کہ جسم کو اسلام کا تابع کرے۔ جسم ایسی چیز ہے جو ہر طرف لگ سکتا ہے۔ بتاؤ زمینداروں کو کون سکھاتا ہے جو جیٹھ ہاڑ کی سخت دُھوپ میں باہر جاکر کام کرتے ہیں اور سردیوں میں آدھی آدھی رات کو اُٹھ کر باہر جاتے اور ہل چلاتے ہیں۔ پس جسم کو جس طریق پر لگاؤ اسی طریق پہ لگ جاتا ہے۔ ہاں اس کے لیے ضرورت ہے عزم کی۔

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ مٹی کھایا کرتا تھا۔ بہت تجویزیں کی گئیں مگر وہ باز نہیں رہ سکتا تھا۔ آخر ایک طبیب آیا اس نے دعویٰ کیا کہ مَیں اس کو روک دوں گا؛ چنانچہ اس نے بادشاہ کو مخاطب کرکے کہا :

اَیُّهَا الْمَلِكُ اَیْنَ عَزْمُ الْمُلُوْكِ۔

یعنی اے بادشاہ! وہ بادشاہوں والا عزم کہاں گیا؟ یہ سُن کر بادشاہ نے کہا اب مَیں مٹی نہیں کھاؤں گا۔

پس عزم مومن بھی تو کوئی چیز ہے۔

سائل :۔ عزم کہتے تو آپ کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت اقدس :۔ بات یہ ہے کہ جب نفوسِ صافیہ کا جذب ہوتا ہے تو ممد و معاون بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ صحابہؓ کے دل اچھے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک رسُول بھی پیدا کر دیا۔ ایسا ہی کہتے ہیں کہ مکّہ سے جو مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس میں بھی یہی سِرّ تھا کہ وہاں کے اصلاح پذیر قلوب کا ایک جذب تھا[1]۔

۱۰؍مارچ ۱۹۰۵ء بوقت شب

پیرانہ سالی کے لحاظ سے عمدہ مجاہدہ

ایک صاحب نے عرض کی کہ ایک عرصہ سے میرے دل میں خواہش ہے کہ کشف کی حالت طاری ہو اور اگرچہ مَیں اپنے علم کی رُو سے جانتا ہوں کہ اس کا حاصل ہونا کوئی کمالات میں سے نہیں ہے مگر تاہم اس کا خیال ہرگز دُور نہیں ہوتا۔ اس لیے کچھ شفاعت فرماویں۔ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ :

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ صفحہ ۹، ۱۰ مورخہ ۱۰؍جولائی ۱۹۰۵ء

اس کا تعلق مجاہدات اور ریاضات سے ہے۔ لیکن اب آپ کی عمر ان کی متحمل نظر نہیں آتی۔ عالمِ شباب میں ایسے مجاہدات اور ریاضات انسان کر سکتا ہے جس سے اس پر یہ حالت جلد طاری ہو۔ پیرانہ سالی میں قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں۔ معدہ کام کرنے سے رہ جاتا ہے۔ اس لیے مجاہدات میں استقامت حاصل نہیں ہوتی۔ آپ کے مناسبِ حال اگر کوئی مجاہدہ ہے تو میری رائے میں یہ ہے کہ خلوت کے درمیان ذکرِ الٰہی اور توجہ الی اللہ کی کثرت کریں۔ غیر اللہ کو قلب سے دفع کرنا اور اللہ تعالیٰ کو اس کا مسکن بنا لینا آسان کام نہیں ہے۔ یہی بڑا مجاہدہ ہے۔ بے فائدہ مجلسوں اور قیل و قال سے الگ رہیئے۔ اور غفلت کے پردہ کو جو کہ انسان کی زندگی پر پڑے ہوتے ہیں اُن کو دُور کرنے کی کوشش کریں۔ پیرانہ سالی کے لحاظ سے یہ عمدہ مجاہدہ ہے جس سے تزکیہ نفس ہو سکتا ہے، کیونکہ اب اس عمر میں نوافل اور روزے وغیرہ کی برداشت مشکل ہے۔ اس کا مطلب اس شعر میں خوب بیان ہے۔

لب بہ بند و گوش بند و چشم بند
گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

کہ انسان اپنی زبان کو اور کانوں اور آنکھوں کو اپنے قابو میں ایسا کرے کہ سوائے رضائے حق کے اور اُن سے کوئی فعل صادر نہ ہو۔ انسانی زندگی میں جو بے اعتدالی ہوتی ہے اُسے اعتدال پر لانا بڑا کام ہے۔ اب اس وقت یہی مناسبِ حال ہے کہ خلوت بہت ہو اور ذکرِ الٰہی سے قلب غافل نہ ہو۔ اگر انسان اس کی مداومت اختیار کرے تو آخر کار قلب مؤثر ہو جاتا ہے اور ایک تبدیلی انسان اپنے اندر رکھتا ہے۔

کشف رؤیا کا اعلیٰ درجہ ہے

کشف کیا ہے یہ رؤیا کا ایک اعلیٰ مقام اور مرتبہ ہے اس کی ابتدائی حالت کہ جس میں غیبتِ حس ہوتی ہے۔ صرف اس کو خواب (رؤیا) کہتے ہیں جسم بالکل معطل بیکار ہوتا ہے اور حواس کا ظاہری فعل ساکت ہوتا ہے۔ لیکن کشف میں دُوسرے حواس کی غیبت نہیں ہوتی۔ بیداری کے عالم میں انسان وہ کچھ دیکھتا ہے جو کہ نیند کی حالت میں حواس کے معطل ہونے کے عالم میں دیکھتا تھا۔ کشف اسے کہتے ہیں کہ انسان پر بیداری کے عالم میں ایک ایسی ربودگی طاری ہو کہ وہ سب کچھ جانتا بھی ہو۔ اور حواسِ خمسہ اس کے کام بھی کر رہے ہوں اور ایک ایسی ہوا چلے کہ نئے حواس اُسے مل جاویں جن سے وہ عالمِ غیب کے نظارے دیکھ لے۔ وہ حواس مختلف طور سے ملتے ہیں۔ کبھی بصر میں، کبھی شامہ سُونگھنے میں، کبھی سمع میں، شامہ میں اس طرح جیسے کہ حضرت یوسفؑ کے والد نے کہا اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ۔ (یوسف ۹۵) (کہ مجھے یوسفؑ کی خوشبو آتی ہے۔ اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا) اس سے مراد وہی نئے حواس ہیں جو کہ یعقوبؑ کو اس وقت حاصل ہوئے اور انہوں نے معلوم کیا کہ یوسفؑ زندہ موجود ہے اور ملنے والا ہے۔ اس خوشبو کو دوسرے

پاس والے نہ سونگھ سکے کیونکہ اُن کو وہ حواس نہ ملے تھے جو کہ یعقوبؑ کو ملے۔ جیسے گڑ سے شکر بنتی ہے اور شکر سے کھانڈ اور کھانڈ سے دُوسری شیرینیاں لطیف در لطیف بنتی ہیں۔ ایسے ہی رؤیا کی حالت ترقی کرتی کرتی کشف کا رنگ اختیار کرتی ہے اور جب وہ بہت صفائی پر آجاوے تو اس کا نام کشف ہوتا ہے۔

کشف اور وحی میں فرق

لیکن وحی ایسی شئے ہے جو کہ اس سے بدرجہا بڑھ کر صاف ہے اور اس کے حاصل ہونے کے لیے مُسلمان ہونا ضروری ہے۔ کشف تو ایک ہندو کو بھی ہو سکتا ہے، بلکہ ایک دہریہ بھی جو خدا کو نہ مانتا ہو وہ بھی اس میں کچھ نہ کچھ کمال حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن وحی سوائے مُسلمان کے دُوسرے کو نہیں ہو سکتی۔ یہ اسی اُمّت کا حصّہ ہے کیونکہ کشف تو ایک فطرتی خاصہ انسان کا ہے اور ریاضت سے یہ حاصل ہو سکتا ہے خواہ کوئی کرے، کیونکہ فطرتی امر ہے جیسے جیسے کوئی اس میں مشق اور محنت کرے گا۔ ویسے ویسے اس پر اس کی حالتیں طاری ہوں گی اور ہر ایک نیک و بد کو رؤیا کا ہونا اس امر پر دلیل ہے۔ دیکھا ہوگا کہ سچی خوابیں بعض فاسق و فاجر لوگوں کو بھی آجاتی ہیں۔ پس جیسے اُن کو سچی خوابیں آتی ہیں ویسے ہی زیادہ مشق سے کشف بھی ان کو ہو سکتے ہیں۔ حتّٰی کہ حیوان بھی صاحبِ کشف ہو سکتا ہے لیکن الہام یعنی وحی الٰہی ایسی شئے ہے کہ جبتک خُدا سے پُوری صلح نہ ہو اور اس کی اطاعت کے لیے اس نے گردن نہ رکھ دی ہو تب تک وُہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (حٰمٓ السجدة : ۳۱) یہ اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ نزولِ وحی کا صرف اُن کے ساتھ وابستہ ہے جو کہ خُدا کی راہ میں مستقیم ہیں اور وہ صرف مُسلمان ہی ہیں۔ وحی ہی وہ شئے ہے کہ جس سے انا الموجود کی آواز کان میں آکر ہر ایک شک و شبہ سے ایمان کو نجات دیتی ہے اور بغیر جس کے مرتبہ یقینِ کامل کا انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن کشف میں یہ آواز کبھی نہیں سُنائی دیتی اور یہی وجہ ہے کہ صاحبِ کشف ایک دہریہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن صاحبِ وحی کبھی دہریہ نہیں ہوگا۔

اس مقام پر حضرت نورالدین صاحب حکیم الامّۃ نے عرض کی کہ حضور سائل کا منشا یہ ہے کہ یہ خواہش کسی طرح دل سے دُور ہو جاوے۔

خُدا کے برگزیدہ اور محبوب نے فرمایا کہ:

ان کے دل میں کشف کی جو عظمت بیٹھی ہوئی ہے جبتک وُہ دُور نہ ہوگی تو علاج کیسے ہوگا۔ اسی لیے تو مَیں فرق بیان کر رہا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک بوڑھی (خاکروبہ) آتی ہے۔ وہ بھی سچی خوابوں کا ایک

سلسلہ بیان کیا کرتی ہے لیکن اس سے اس کا عند اللہ مقرب ہونا یا صاحب کرامت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک مسلمان کا کشف جس قدر صاف ہوگا اس قدر غیر مسلم کا ہرگز صاف نہ ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ ایک مسلم اور غیر مسلم میں تمیز رکھتا ہے اور فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس : ۱۰) لیکن وحی کو کشف نہیں پاسکتا۔ یہ وحی کی ہی قدر ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے ارادہ سے اس کے لیے ایک شخص کو انتخاب کرتا ہے اور شرف مکالمہ بخشتا ہے اور ہر میدان میں اس کا حافظ و ناصر ہوتا ہے اور صاحب وحی کے تعلقات دن بہ دن خدا سے قائم ہوتے اور بڑھتے جاتے ہیں اور ایمان میں غیر معمولی ترقی روز مشاہدہ کرتا ہے۔[لہ]

۲۵؍مارچ ۱۹۰۵ء (بعد نماز عصر)

اپنی صداقت پر کمال یقین

عصر کی نماز سے پیشتر حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور صاحبزادہ سراج الحق صاحب نعمانی نے اپنے بڑے بھائی شاہ خلیل الرحمٰن صاحب سجادہ نشین سرساوہ کا خط سُنایا جس میں انہوں نے حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت بطور پیشگوئی لکھا تھا کہ وُہ جلد فوت ہو جائیں گے اور ان کے سلسلہ کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں کشفِ قبور کر سکتا ہوں اور کرا سکتا ہوں۔ اگر مرزا صاحب سچے ہیں تو وہ بھی مجھے کشفِ قبور کر کے دکھائیں وغیرہ۔ ملخصاً۔

حضرت اقدس نے سرسری طور پر اس کارڈ کو سُن لیا۔ پھر نمازِ عصر ادا فرمائی۔ بعد نماز عصر کوئی ایسی تحریک آپ کو ہوئی کہ آپ نے صاحبزادہ سراج الحق صاحب کو وہیں مسجد ہی میں بُلایا اور فرمایا جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے :

آپ ان کو اپنی طرف سے ایک خط لکھ دیں کہ یہ پیشگوئی جو آپ نے کی ہے اس سے میری تو برسوں کی مراد بر آئی۔ مَیں بھی چاہتا تھا کیونکہ اس سے سچائی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مہربانی کر کے اتنی تصریح کر دو کہ کیا وُہ (مرزا صاحب) آپ سے پہلے فوت ہوں گے یا پیچھے تاکہ پھر اس پیشگوئی کو آپ کی کرامت قرار دے کر شائع کر دیا جاوے۔ جب یہ پیشگوئی پوری ہوگی اس وقت دنیا دیکھے گی۔

[لہ] البدر جلد ۴ نمبر ۸ صفحہ ۲ مورخہ ۱۳؍مارچ ۱۹۰۵ء

نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۹ صفحہ ۹ مورخہ ۱۷؍مارچ ۱۹۰۵ء

پس آپ ہرگز دیر نہ کریں۔ بہت جلد اس امر کو لکھ بھیجیں۔ اور کشفِ قبور کا معاملہ تو بالکل بیہودہ امر ہے۔ جو شخص زندہ خُدا سے کلام کرتا ہے اور اس کی تازہ بتازہ وحی اس پر آتی ہے اور اس کے ہزاروں نہیں لاکھوں ثبوت بھی موجود ہیں۔ اس کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ مُردوں سے کلام کرے اور مُردوں کی تلاش کرے اور اس امر کا ثبوت ہی کیا ہے کہ فلاں مُردے سے کلام کیا ہے۔ یہاں تو لاکھوں ثبوت موجود ہیں۔ ایک ایک کارڈ اور ایک ایک آدمی اور ایک ایک روپیہ جو آتا ہے وُہ خُدا کا ایک زبردست نشان ہے۔ کیونکہ ایک عرصہ دراز پیشتر خُدا تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ :

یَأْتُوْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ وَیَأْتِیْکَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔

اور ایسے وقت فرمایا تھا کہ کوئی شخص بھی مجھے نہ جانتا تھا۔ اب یہ پیشگوئی کیسے زور شور سے پوری ہو رہی ہے۔ کیا اس کی کوئی نظیر بھی ہے؟ غرض ہمیں ضرورت کیا پڑی ہے کہ ہم زندہ خُدا کو چھوڑ کر مُردوں کو تلاش کریں[1]۔

۲۷؍ مارچ ۱۹۰۵ء (بوقت ظہر)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک اہم مکتوب

ظہر کی اذان ہو چکنے کے بعد اعلیحضرت تشریف لائے۔ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں نے شرفِ زیارت پایا۔ زاں بعد حضرت مخدوم الملت مولوی عبدالکریم صاحب نے بابو عطا الٰہی صاحب سٹیشن ماسٹر کی طرف سے حصولِ اجازت کے لیے عرض کیا۔ آپ نے بابو عطا الٰہی صاحب کو بُلا کر فرمایا کہ :

مئی، جُون، جولائی وغیرہ مہینوں میں کوئی موقعہ یہاں رہنے کے لیے نکالنا چاہیے آئندہ جب رُخصت لو تو ان مہینوں کو مدِّنظر رکھ لینا۔

اس کے بعد حضرت مخدوم الملت نے عرض کیا کہ مَیں نے حضور کا وُہ خط اخبار میں شائع کرنے کو دیدیا ہے اور اس پر ایک مضمون بھی لکھ دیا ہے۔

فرمایا :

بہت اچھا کیا ہے

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۱۱ صفحہ ۱۱ مورخہ ۳۱؍ مارچ ۱۹۰۵ء

جس خط کا حضرت مولوی عبدالکریم صاحب نے ذکر کیا۔ یہ خط الحکم جلد ۹ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۸ پر حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کے تشریحی مضمون کے ساتھ شائع ہوا ہے جو یہ ہے :

" مجی اخویم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مَیں ایک مدت سے بیماریوں میں رہا۔ اور اب بھی ان کا بقیہ باقی ہے۔ مَیں چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے جواب لکھوں مگر باعث بیماری کے لکھ نہ سکا۔ آپ کے پہلے خط کا ماحصل جس قدر مجھ کو یاد ہے یہ ہے کہ میری نسبت ......عہ کی جماعت کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا تھا کہ روپیہ کے خرچ میں بہت اسراف ہوتا ہے۔ آپ اپنے پاس روپیہ جمع نہ رکھیں اور یہ روپیہ ایک کمیٹی کے سپرد ہو جو حسبِ ضرورت خرچ کیا کریں اور یہ بھی ذکر تھا کہ اس روپیہ میں سے باغ کے چند خدمتگار بھی روٹیاں کھاتے ہیں۔ اور ایسا ہی اَور کئی قسم کے اسراف کی طرف اشارہ تھا جن کو مَیں سمجھتا ہوں آپ نے اپنی نیک نیتی سے جو کچھ لکھا بہتر لکھا۔ مَیں ضروری نہیں سمجھتا کہ اس کا رَدّ لکھوں۔ مَیں آپ کو خدا تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں جس کی قسم کو پُورا کرنا مومن کا فرض ہے اور اس کی خلاف ورزی معصیت ہے کہ آپ ...... تمام جماعت کو اور خصوصاً ایسے صاحبوں کو جن کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا ہے بہت صفائی سے اور کھول کر سمجھا دیں کہ اس کے بعد ہم ...... کا چندہ بکلّی بند کرتے ہیں اور ان پر حرام ہے اور قطعاً حرام ہے اور مثل گوشت خنزیر ہے کہ ہمارے کسی سلسلہ کی مدد کے لیے اپنی تمام زندگی تک ایک حبہ بھی بھیجیں۔ ایسا ہی ہر شخص جو ایسے اعتراض دل میں مخفی رکھتا ہے اس کو بھی ہم یہی قسم دیتے ہیں۔

یہ کام خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جس طرح وہ میرے دل میں ڈالتا ہے خواہ وہ کام لوگوں کی نظر میں صحیح ہے یا غیر صحیح، دُرست ہے یا غلط مَیں اسی طرح کرتا ہوں پس جو شخص کچھ مدد دے کر مجھے اسراف کا طعنہ دیتا ہے وہ میرے پر حملہ کرتا ہے۔ ایسا حملہ قابلِ برداشت نہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ مجھے کسی کی بھی پروا نہیں۔ اگر تمام جماعت کے لوگ متفق ہو کر چندہ بند کر دیں یا مجھ سے منحرف ہو جائیں تو وہ جس نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے وہ اَور جماعت ان سے بہتر پیدا کر دے گا جو صدق اور اخلاص رکھتی ہو گی۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ مجھے مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ یَنْصُرُكَ اللّٰهُ مِنْ عِنْدِهٖ ۔ یَنْصُرُكَ رِجَالٌ نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ یعنی خدا تیری اپنے پاس سے مدد کرے گا۔ تیری وہ مدد کریں گے جن کے دلوں میں ہم آپ وحی کریں گے اور الہام کریں گے۔ پس اس کے بعد مَیں ایسے لوگوں کو ایک مَرے ہوئے کیڑے کی طرح بھی نہیں سمجھتا جن کے دلوں میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور کیا وجہ کہ اُنھیں جبکہ مَیں ایسے خشک دل لوگوں کو چندہ کے لیے مجبور

عہ جس شخص کے نام یہ خط تھا اس کا اظہار نہیں کیا گیا (مُرتّب)

نہیں کرتا جن کا ایمان ہنوز نا تمام ہے۔ مجھے وہ لوگ چندہ دے سکتے ہیں جو اپنے سچے دل سے مجھے خلیفۃ اللہ سمجھتے ہیں۔ اور میرے تمام کاروبار خواہ اُن کو سمجھیں یا نہ سمجھیں ان پر ایمان لاتے اور ان پر اعتراض کرنا موجب سلبِ ایمان سمجھتے ہیں۔ مَیں تاجر نہیں کہ کوئی حساب رکھوں۔ مَیں کسی کمیٹی کا خزانچی نہیں کہ کسی کو حساب دُوں۔ مَیں بلند آواز سے کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص جو ایک ذرہ بھی میری نسبت اور میرے مصارف کی نسبت اعتراض دل میں رکھتا ہے اس پر حرام ہے کہ ایک کوڑی میری طرف بھیجے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ جبکہ خُدا مجھے بکثرت کہتا ہے گویا ہر روز کہتا ہے کہ مَیں ہی بھیجتا ہوں جو آتا ہے اور کبھی میرے مصارف پر وہ اعتراض نہیں کرتا تو دُوسرا کون ہے۔ جو مجھ پر اعتراض کرے۔ ایسا اعتراض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تقسیم اموالِ غنیمت کے وقت کیا گیا تھا۔ سو مَیں آپ کو دوبارہ کہتا ہوں کہ آئندہ سب کو کہدیں کہ تم کو اس خُدا کی قسم ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور ایسا ہی ہر ایک جو اس خیال میں شریک ہے کہ ایک حبّہ بھی میری طرف کسی سلسلہ کے لیے کبھی اپنی عمر تک ارسال نہ کریں۔ پھر دیکھیں کہ ہمارا کیا حرج ہوا؟ اب قسم کے بعد میرے پاس نہیں کہ اَور لکھوں۔

خاکسار مرزا غلام احمد

حلِ مشکلات کا طریق ایک شخص نے اپنی مشکلات کے لیے عرض کی فرمایا:

استغفار کثرت سے پڑھا کرو اور نمازوں میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ اَسْتَغِیْثُ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ پڑھو۔

پھر اس نے عرض کی کہ استغفار کتنی مرتبہ پڑھوں؟ فرمایا:

کوئی تعداد نہیں۔ کثرت سے پڑھو یہانتک کہ ذوق پیدا ہو جاوے اور استغفار کو منتر کی طرح نہ پڑھو بلکہ سمجھ کر پڑھو۔ خواہ اپنی زبان میں ہی ہو۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اے اللہ! مجھے گناہوں کے بُرے نتیجوں سے محفوظ رکھ اور آئندہ گناہوں سے بچا۔

زاں بعد خاکسار ایڈیٹر الحکم نے مولوی مشرف الدین احمد صاحب کے صاحبزادہ کے لیے دُعا کے واسطے عرض کیا۔ فرمایا:

اُن کا خط بھی آیا ہے۔ اُن کو لکھ دو کہ یاد دلاتے رہیں۔

ایک الہام

مولانا مولوی عبدالکریم صاحب نے بیان کیا کہ کل جب میں اُٹھا تو میری زبان پر یہ جاری تھا جو حضور کا الہام ہے "آگ سے ہمیں مت ڈرا۔ آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے۔"

اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ کل مجھے الہام ہوا تھا:

"چوہدری رُستم علی"

اس کے ساتھ اور کچھ نہیں تھا۔[1]

حضرت مُفتی محمد صادق کا تقرر بحیثیت ایڈیٹر اخبار البدر

۳۰؍مارچ ۱۹۰۵ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اِطّلاع

مَیں بڑی خوشی سے یہ چند سطریں تحریر کرتا ہوں کہ اگرچہ منشی محمد افضل مرحوم ایڈیٹر اخبار البدر قضائے الٰہی سے فوت ہوگئے ہیں مگر خُدا تعالیٰ کے شکر اور فضل سے ان کا نعم البدل اخبار کو ہاتھ آگیا ہے یعنی ہمارے سلسلہ کے ایک برگزیدہ رکن، جوان، صالح اور ہر ایک طور سے لائق جن کی خوبیوں کے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں یعنی مفتی محمد صادق صاحب بھیروی قائمقام منشی محمد افضل مرحوم ہوگئے ہیں۔

میری دانست میں خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم سے اس اخبار کی قسمت جاگ اٹھی ہے کہ اس کو ایسا لائق اور صالح ایڈیٹر ہاتھ آیا۔ خدا تعالیٰ یہ کام ان کے لیے مبارک کرے اور اُن کے کاروبار میں برکت ڈالے۔ آمین ثم آمین۔

خاکسار میرزا غلام احمد ۲۳ محرم الحرام ۱۳۲۳ھ علی صاحبہا التحیۃ والسلام

۳۰؍مارچ ۱۹۰۵ء[2]

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۱۳ صفحہ ۶ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۵ء

[2] البدر* جلد ۱ نمبر ۱ صفحہ ۱ مورخہ ۶؍اپریل ۱۹۰۵ء

* البدر کے نئے دور کی ابتدا جلد اوّل اور نمبر اوّل سے ہوئی (مُرتب)

یکم اپریل ۱۹۰۵ء (قبل ظہر)

اعلیٰحضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ظہر سے پیشتر تھوڑی دیر مجلس فرمائی۔ فرمایا:

عصر کے بعد میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے میں اس لیے شام کو آ نہیں سکتا۔

اپنے محبین سے شفقت اور ہمدردی

مولنا مولوی عبدالکریم صاحب سلمہ ربہ کو کثرتِ پیشاب کی دو تین دن سے پھر شکایت ہو گئی ہے اور آج اعلیحضرت نے ان کا قارورہ منگوا کر دیکھا تھا جو کثیر مقدار میں تھا۔ اس کے متعلق مولوی عبدالکریم صاحب کو مخاطب کر کے جو کچھ فرمایا اس سے آپ کی کمال شفقت اور ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے اس لیے میں خلاصۃً اسے اپنے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔ فرمایا:

میں آپ کا پیشاب دیکھ کر بہت حیران ہو گیا۔ میں نے تو اس کے بعد دُعا ہی شروع کر دی اور انشاء اللہ بہت دُعا کروں گا۔[1]

مجھے خود چونکہ کثرتِ پیشاب کی شکایت ہے میں جانتا ہوں کہ کس قدر تکلیف ہوتی دل گھٹتا ہے اور پنڈلیوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ بہت بے چینی اور گھبراہٹ ہو جاتی ہے۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس رسالہ[2] کو ختم کر لینے کے بعد کچھ دنوں تک صرف دُعا ہی میں لگا رہوں گا۔

میں نے جو گولی آپ کو بنا کر دی تھی وہ مفید ثابت ہوئی تھی۔ آپ اس کا استعمال کریں میں بھیجدوں گا اور ختم ہونے پر اَور دوا تیار ہو سکتی ہے۔ آپ دُودھ کثرت سے پیئیں۔ وہ اس مرض میں بہت مفید ہے اور میں انشاءاللہ بہت دُعا کروں گا۔ آپ کے پیشاب کو دیکھ کر مجھے تو حیرت ہی ہوئی کہ آپ کس طرح التزام کے ساتھ نمازوں میں آتے ہیں اور آپ کی آواز سے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کو شکایت ہے۔

اس پر حضرت مولنا عبدالکریم صاحب نے عرض کیا کہ حضور کی دُعا ہی ہے جو اس ہٹ اور استقلال

---

[1] البدر سے :- اگرچہ اپنی طبیعت بھی چنداں دُرست نہ تھی۔ تاہم آپ کے واسطے بہت دُعا کی ہے۔
البدر ※ جلد ۱ نمبر ۱ صفحہ ۶ مورخہ ۶ اپریل ۱۹۰۵ء

※ البدر کا نیا دور

[2] نصرۃ الحق یعنی براہین احمدیہ حصّہ پنجم مراد ہے۔ (مرتب)

سے مَیں حاضر ہوتا ہوں، ورنہ بعض اوقات قریب بہ غش ہو جاتا ہوں۔ پھر حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

مَیں بہت دُعا کروں گا

مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضور کی عافیت چاہیے۔ فرمایا:

عافیت ہو ہی جاتی ہے۔ جب مَیں آپ کے لیے دُعا کروں گا۔ حدیث میں آیا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ عَوْنِهٖ جو اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہو جاتا ہے۔[1]

دو الہامات

اس کے بعد فرمایا:

کل الہام ہوا تھا۔ مَحَوْنَا نَارَ جَهَنَّمَ[2]

اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ عجیب بات ہوتی ہے کہ بعض اوقات صرفی نحوی ایسی ترکیب پر اعتراض کر اُٹھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کے ماتحت تو نہیں ہے۔[3]

طاعون کو ہی نارِ جہنم کہا ہے۔ پہلے بھی ایک الہام ہوا تھا۔

يَأْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا أَحَدٌ

اس کے بعد آپ نے نمازِ ظہر جماعت کے ساتھ معمول کے موافق ادا کی اور آپ تشریف لے گئے۔[4]

---

[1] البدر میں ہے: ”فرمایا۔ جب دوستوں کی تکلیف سُن کر دُعا میں لگ جاتا ہوں تو اس میں خود عافیت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آچکا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ عَوْنِهٖ یعنی جو شخص اپنے بھائی کی اعانت میں مصروف ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ خود اس کی اعانت کرتا ہے۔“

البدر جلد ۱ نمبر ۱ صفحہ ۶ مورخہ ۶ ر اپریل ۱۹۰۵ء

[2] البدر سے: ”مَحَوْنَا نَارَ جَهَنَّمَ۔ ہم نے جہنم کی آگ کو محو کیا۔ فرمایا: اجتہادی طور پر ایسا خیال آتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اب قریباً طاعون کو دُنیا سے اُٹھانے والا ہے۔ واللہ اعلم۔ یا یہ کہ اس گاؤں سے اُٹھانے والا ہے۔“

البدر (سلسلہ جدید) جلد ۱ نمبر ۱ صفحہ ۳ مورخہ ۶ ر اپریل ۱۹۰۵ء

[3] البدر سے: ”اللہ تعالیٰ لوگوں کے محاورات اور صرف و نحو کے قواعد کے ماتحت نہیں ہے۔ اس کی مثالیں کتب الہامیہ اور انبیاء اور اولیاء کے الہامات میں بہت ہیں کہ ایجاد کردہ قواعد زبان کے برخلاف کئی عبارتیں اور فقرات نازل ہوتے رہے ہیں۔“

(البدر حوالہ مذکور)

[4] الحکم جلد ۹ نمبر ۱۳ صفحہ ۶ مورخہ ۱۷ر اپریل ۱۹۰۵ء

۳؍اپریل ۱۹۰۵ء

مُحبّین سے تعلقِ خاطر

سیّد حامد شاہ صاحب سیالکوٹی کے تقررِ مستقل بر عہدہ سپرنٹنڈنٹ دفتر صاحب ضلع کی خبر حضرت کی خدمت میں سُنائی گئی۔ آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ:

شاہ صاحب ایک درویش مزاج آدمی ہیں اور خدا تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

مولوی عبدالکریم صاحب کی علالتِ طبع کا ذکر تھا۔ حضرت نے ان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ:

مَیں نے آپ کے واسطے اس قدر دُعا کی ہے جس کی حد نہیں۔۱؎

۴؍اپریل ۱۹۰۵ء

ایک زور آور زلزلہ کا نشان

صُبح ۶¼ بجے یک دفعہ نہایت زور آور حملہ زلزلہ کا ہوا۔ تمام مکانات اور اشیاء ہلنے اور ڈولنے لگ پڑیں۔ لوگ حیران اور سراسیمہ ہوکر گھبرانے لگے۔ ایسے وقت میں خُدا کے مسیح کا حال دیکھنے کے لائق تھا، کیونکہ احادیث میں تو ہم پڑھا ہی کرتے تھے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے آسمانی اور زمینی واقعات پر خشیت اللہ کا بڑا اثر اپنے چہرے پر ظاہر فرماتے تھے۔ ذرا سے بادل کے نمودار ہونے پر آپ بے آرام سے ہو جاتے۔ کبھی باہر نکلتے اور کبھی اندر جاتے۔ غرض اس وقت بھی نبی اللہ نے ہر کہ عارف تر است ترساں تر والے مقولہ کو عملی رنگ میں بالکل سچا کرکے دکھایا۔ زلزلہ کے شروع ہوتے ہی آپ بمعہ اہلِ بیت اور بال بچہ کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دُعا کرنے میں شروع ہو گئے اور اپنے ربّ کے آگے سربسجود ہوئے۔ بہت دیر تک قیام۔ رکوع اور سجدہ میں سارا کنبہ کا کنبہ بمعہ خدام کے گرا رہا اور اللہ تعالیٰ کی بے نیازی سے لرزاں و ترساں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے تمام مکانات اور جانوں کو گرنے اور تلف ہونے سے محفوظ رکھا اور کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جیسا کہ دوسرے شہروں سے تباہی اور ہلاکت کی خبریں آرہی ہیں۔ بلکہ ایسے مکانات جن کے پردے صرف ایک ایک اینٹ کے تھے اور کچھ پھٹے ہوئے بھی تھے اور بعض اینٹیں اُکھڑی ہوئی یونہی پڑی

۱؎ البدر جلد ۱ نمبر ۱ صفحہ ۶ مورخہ ۶؍اپریل ۱۹۰۵ء

تھیں ان میں سے ایک اینٹ بھی نہیں گری چونکہ ہر دس منٹ کے بعد بار بار زلزلہ کا احساس ہوتا تھا اور تمام روز کچھ کچھ زلزلہ محسوس ہوتا رہا۔ اس واسطے حضور اقدس نے برعایت اسباب مناسب سمجھا کہ سہ منزلہ مکان میں رہنے کی بجائے اپنے باغ والے مکان میں ایک دو روز کے واسطے رہائش اختیار کریں؛ اگرچہ اس موقعہ پر کچھ خوف ہم سب کو دیکھنا پڑا ہے تاہم دراصل اس پاک مسیح کے قدموں کے طفیل کوئی امر ہمارے واسطے فائدہ سے خالی نہیں۔ اوّل تو ۳ر اپریل کی رؤیا اس سے پوری ہوئی جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دیکھی تھی[1]۔ اور کئی ایک کو سُنائی تھی۔

دوم اشتہار الوصیت میں جو ایک عظیم الشان پیشگوئی حضرت امام نے ابھی چند روز ہوئے شائع کی تھی۔ کہ ایک شورِ قیامت برپا ہے اور موتا موتی لگی ہوئی ہے اور لوگ چیخ رہے ہیں۔ وہ پُوری ہوئی۔ یہ اشتہار الوصیت اخبار الحکم مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۵ء اور اخبار البدر مورخہ ۵ر مارچ ۱۹۰۵ء اور ریویو آف ریلیجنز بابت ماہ مارچ ۱۹۰۵ء میں شائع ہو گیا تھا۔ اس زلزلہ کی خبر براہین احمدیہ میں بھی دی گئی تھی۔ غرض یہ ایک بڑا نشان ہے جو خُدا تعالیٰ نے ظاہر فرمایا۔ اسی زلزلہ کا ذکر تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ :

”یہ ایک قیامت ہے جو لوگ قیامت کے منکر ہیں وہ اب دیکھ لیں کہ کس طرح ایک ہی سیکنڈ میں ساری

حاشیہ : [1] یہ رؤیا البدر کے اسی پرچہ میں صفحہ ۲ پر درج ہے جو یہ ہے

رؤیا ”۳ر اپریل ۱۹۰۵ء۔ رؤیا۔ دیکھا کہ مرزا نظام الدین کے مکان پر مرزا سلطان احمد کھڑا ہے۔ اور سب لباس سرتاپا سیاہ ہے۔ ایسی گاڑھی سیاہی کہ دیکھی نہیں جاتی۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو سلطان احمد کا لباس پہن کر کھڑا ہے۔ اس وقت مَیں نے گھر میں مخاطب ہو کر کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ تب دو فرشتے اَور ظاہر ہو گئے اور تین کُرسیاں معلوم ہوئیں اور تینوں پر وہ تین فرشتے بیٹھ گئے اور بہت تیز قلم سے کچھ لکھنا شروع کیا جس کی تیز آواز سنائی دیتی تھی۔ اُن کے اس طرز کے لکھنے میں ایک رُعب تھا۔ مَیں پاس کھڑا ہوں کہ بیداری ہو گئی۔

اسی وقت حضرت اقدس نے یہ خواب سُنایا اور فرمایا کہ :

کوئی ہیبت ناک نشان ہونے والا ہے۔ اس کی تعبیر یوں ہے کہ سلطان احمد سے مراد ایسے دلائل اور براہین ہیں جو دلوں پر تسلط کرتے اور دلوں کو پکڑ لیتے ہیں اور نظام الدین سے مُراد ایسا نشان ہے جس سے دینِ اسلام کی صلاحیت ہو گی اور اس کا نظام دُرست ہو جائے گا۔ سیاہ کپڑے ظاہر کرتے ہیں کہ اب کوئی ڈرانے والا نشان ظاہر ہونے والا ہے اَور یہ جو کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ یہ ہماری دُعاؤں کا نتیجہ ہے کیونکہ نتیجہ بچے کو بھی کہتے ہیں“۔ البدر سلسلہ جدید جلد ا نمبر ا صفحہ ۳ مورخہ ۶ر اپریل ۱۹۰۵ء

دُنیا فنا ہو سکتی ہے۔ جب لوگوں کو بہت امن اور آسودگی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ خدا سے اِعراض کرتے ہیں۔ یہانتک کہ خدا کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا امن ایک خباثت کا پھوڑا ہے۔ یہ قیامت لوگوں کے واسطے عذاب مگر ہمارے واسطے مفید ہے۔"

پھر آپ نے سُلطان احمد کو دیکھنے والا رؤیا بیان کیا جو الہامات کے ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ اور میاں بشیر احمد اور شریف احمد کے خوابوں کا پھر ذکر کیا۔ اور براہین احمدیہ حِصّہ پنجم کے چھپنے کا ذکر کیا۔ جس کا نام نُصرت الحق ہے اور فرمایا :

"یہ قیامت ہمارے لیے نصرت الحق ہے۔ ہم صُبح یہی مضمون لکھ رہے تھے اور اس الہام پر پہنچے تھے جو براہین احمدیہ میں درج تھا کہ دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اس کو قبول نہ کیا۔ لیکن خُدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی کو ظاہر کر دے گا۔ ہم یہ الفاظ لکھ ہی رہے تھے اور اس کے پورا ہونے کے ثبوت آگے درج کرنے کو تھے کہ یک دفعہ زلزلہ ہوا۔ یہ ایک زور آور حملہ ہے اور پیشگوئی میں حملوں کا لفظ جمع ہے جو عربی میں تین پر اطلاق پاتا ہے۔ اس واسطے خوف ہے کہ طاعون اور زلزلہ کے سوائے خدا جانے تیسرا حملہ کونسا ہے جو ہماری سچائی کے ثبوت کے واسطے خدا تعالیٰ نے ظاہر فرمانا ہے اور ابھی خدا جانے کیا ہے باہر سے خبریں آئیں گی تو معلوم ہوگا کہ کس قدر تباہی ہوئی ہے۔ ہم نے کل ہی کہا تھا کہ خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہیبت ناک نشان ہونے والا ہے۔ یہ ایک ہلاکت کا نشان ہے جماعت کے سب لوگوں کو چاہیے کہ اپنی حالتوں کو درست کریں۔ توبہ و استغفار کریں اور تمام شکوک و شبہات کو دُور کر کے اور اپنے دلوں کو پاک و صاف کر کے دُعاؤں میں لگ جائیں اور ایسی دعا کریں کہ گویا مر ہی جائیں تاکہ خدا ان کو اپنے غضب کی ہلاکت کی موت سے بچائے۔ بنی اسرائیل جب گناہ کرتے تھے تو حکم ہوتا تھا کہ اپنے تئیں قتل کرو۔ اب اس اُمّتِ مرحومہ سے وہ حکم تو اُٹھایا گیا ہے مگر یہ اس کی بجائے ہے کہ دعا ایسی کرو کہ گویا اپنے آپ کو قتل ہی کر دو۔

یہ الہامات جو پہلے سے شائع ہو چکے ہیں کہ مکذبوں کو ایک نشان دکھایا جائے گا۔ اور یہ کہ ایک چونکا دینے والی خبر۔ یہ سب اب پُورے ہو گئے ہیں اور دیکھنے والوں کے واسطے کافی سے زیادہ سامان ایمان لانے کے پیدا ہو چکے ہیں[1]۔"

---

[1] البدر سلسلہ جدید جلد ۱ نمبر ۱ صفحہ ۶ مورخہ ۶ راپریل ۱۹۰۵ء

۵؍اپریل ۱۹۰۵ء

نصرۃ الحق کے ایام

سیّد امیر علی شاہ صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو مخاطب کرکے نہایت لطف و مہربانی کے ساتھ حضرت نے فرمایا کہ :

”آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی“

اُنھوں نے عرض کیا کہ حضور کے قدموں میں حاضری نصیب ہو تو پھر تکلیف کس بات کی یہاں تو جو ہو سب راحت ہی راحت ہے۔ حضرت نے فرمایا :

ہاں رحمتِ الٰہی کے دن ہیں۔ گو دُوسروں کے واسطے عذاب کے دن ہیں مگر ہمارے واسطے نصرۃ الحق کے ایام ہیں[1]۔

۷؍اپریل ۱۹۰۵ء

قادیان دارالامان

مختلف مقامات سے نہایت سخت تباہی اور سینکڑوں آدمیوں کے دب جانے اور مر جانے اور ہزاروں مکانات کے گر جانے اور زمینوں کے دھنس جانے کا ذکر ہو رہا تھا۔ بالمقابل اس کے قادیان میں جو امن رہا اس کے متعلق حضرت نے فرمایا کہ اس میں وہ وحی الٰہی بھی پُوری ہوئی جو مدّت ہوئی اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ :

امن است در مقامِ محبت سرائے ما

ان تباہیوں اور شہروں کے دبنے سے وُہ پیشگوئی بھی پوری ہوئی جس کو گیارہ ماہ ہوئے کہ شائع ہوئی تھی اور گورداسپور میں نازل ہوئی تھی کہ :

عَفَتِ الدِّیَارُ مَحَلُّھَا وَ مَقَامُھَا

یعنی سرائیں بھی تباہ ہوگئیں اور اصلی مقامات بُود وباش بھی مِٹ گئے اور ان کے نشان بھی مِٹ گئے۔

---

[1] البدر سلسلہ جدید جلد ۱ نمبر ۱ صفحہ ۶ مورخہ ۶؍اپریل ۱۹۰۵ء

باغ کے مکان میں منتقل ہونا

قادیان کے گاؤں سے بعض آدمیوں کے طاعون میں مبتلا ہونے اور بعض کے مرنے کا ذکر ہوا۔ حضرت نے فرمایا :

خُدا جانے ہمارے باہر آجانے میں کیا کیا حکمتیں ہیں اگر قادیان میں سو آدمی روز طاعون سے مرنے لگتا تب بھی ہم نے قادیان سے نہیں نکلنا تھا مگر اس میں خدا کی کوئی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایسی نئی بات پیدا ہوگئی یعنی سخت زلزلہ کے سبب سہ منزلہ مکانات کے گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس واسطے بموجب پابندئ شریعت اپنے آپ کو خطرناک جگہ سے محفوظ کرنے کے واسطے ہم باہر آگئے اور زلزلہ کی کیفیت ایسی ہے کہ ابتک محسوس ہوتا ہے۔ خدا نے دل میں پختہ طور سے یہی بات ڈال دی کہ اب باہر جانا چاہیے۔ طاعون کے لحاظ سے باہر آنا تو گناہ تھا مگر زلزلہ کے سبب خدا تعالیٰ نے یہ بات دل میں ڈال دی اور اس سے ہم کو بہت فائدہ اور آرام ہوا۔ کیونکہ باغ میں عمدہ ہوا اور خوشبودار پھولوں کے سبب مضامین کے لکھنے اور فکر اور تدابیر کے واسطے عمدہ موقعہ ملتا ہے اور صحت میں بہت ترقی محسوس ہوتی ہے اور درختوں کی چھاؤں کے نیچے دُعا کے واسطے عمدہ خلوت گاہ مل جاتی ہے جس کے سبب ہم باغ کے مکان میں آگئے۔

نشانات کی کثرت اور وسعت

فرمایا :

اب تو اس قدر نشانات ظاہر ہو رہے ہیں کہ گویا خدا اپنے آپ کو برہنہ کر کے دکھانا چاہتا ہے۔

فرمایا :

پہلے انبیاء کے معجزات تو خاص زمینوں اور خاص شہروں تک عموماً محدود ہوتے تھے مگر اب تو خدا تعالیٰ ایسے نشان اس سلسلہ کی تائید میں ظاہر کرتا ہے جو دُنیا بھر پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔[1]

۸ر اپریل ۱۹۰۵ء

فرمایا : "جب دُنیا مدِنظر ہو تو تطہیر مشکل ہے"[2]

---

[1] البدر سلسلہ جدید جلد ۱ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۳ر اپریل ۱۹۰۵ء

[2] البدر سلسلہ جدید جلد ۱ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۳ر اپریل ۱۹۰۵ء

۹؍اپریل ۱۹۰۵ء

سلسلہ کی مخالفت اور اللہ تعالیٰ کی چہرہ نمائی

پرچہ اہلحدیث امرتسر کا ذکر ہوا جس نے بہت سے بیجا حملے خدا کے سلسلہ پر کیے۔ حضرت اقدسؑ نے فرمایا :

کم علم آدمی تو معذور ہوتا ہے معاف بھی کیا جاتا ہے مگر تعجب ہے ان لوگوں پر جو علم رکھتے ہیں اور پھر بھی تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اندر ہی اندر کیا تیاری ہو رہی ہے اور ابھی زمین پر کیا ہونے والا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایسی تباہی لاتے گا جس کی خبر وحی الٰہی میں ہے تو پھر توبہ اور رجوع بھی فائدہ نہ دے گا۔ مبارک ہیں وُہ جو پہلے ایمان لائے اور پھر وُہ جو ان کے بعد آتے۔ ایسا ہی درجہ بدرجہ سب کا حصّہ ہے۔ دیکھو کس قدر قیامت کا نمونہ ہے مگر پھر بھی یہ لوگ باز نہیں آتے اور ناجائز باتیں کہتے ہیں لیکن ہماری جماعت کو چاہیے کہ ان کی باتوں کے سبب غمگین نہ ہوویں۔ یہ لوگ جیسے اہلحدیث وغیرہ ہیں۔ یہ ہمارے سلسلہ کی رونق ہیں۔ اگر اس قسم کے شور مچانے والے نہ ہوں تو رونق کم ہو جاتی ہے، کیونکہ جس نے مان لیا ہے وہ تو اپنے آپ کو فروخت کر چکا ہے۔ اور مثل مُردہ کے ہے۔ وُہ کیا بولے گا۔ وُہ تو زبان کھول ہی نہیں سکتا۔ اگر سارے ابوبکرؓ ہی بن جاتے تو پھر ایسی بڑی بڑی نصرتوں کی کیا ضرورت پڑتی۔ جو حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ظاہر ہوئی تھیں۔ دیکھو سُنّت اللہ یہی ہے کہ پہلے سخت گرمی پڑے پھر برسات ہو بس تم خوش ہو کہ ایسے آدمی دُنیا میں موجود ہیں جو اس نصرت اور فتح کو جو کروڑوں کوس دُور ہوتی ہے ایک دو کوس کے قریب کھینچ لاتے ہیں۔ اب ان معاملات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ آج کے الہامات پر غور کرو۔ اب بحث مباحثہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہماری طرف سے خدا تعالیٰ آپ جواب دینے لگا ہے تو خلافِ ادب ہے کہ ہم دخل دیں اور سبقت کریں۔ جس کام کو خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ وہ اس کو ناقص نہ چھوڑے گا۔ کیونکہ اب اگر امن ہو جائے اور کوئی نشان نہ دکھایا جائے تو قریب ہے کہ ساری دُنیا دہریہ بن جائے اور کوئی نہ جانے کہ خُدا ہے۔ لیکن خُدا اب اپنا چہرہ دکھائے گا۔

میر[1] کے لڑکے مُحمّد منظور کا رؤیا حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ فرمایا :

---

[1] حضرت مفتی محمد صادق صاحب کے لڑکے (مرتب) ؎

مومن کبھی رؤیا دیکھتا ہے اور کبھی اس کی خاطر کسی اَور کو دکھاتا ہے۔ ہم نے اس کی تعمیل میں چودہ ۱۴ بکرے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ سب جماعت کو کہدو کہ جس جس کو استطاعت ہے قربانی کردے۔

ایک پُرانا الہام

فرمایا کہ : ہمیں اس وقت اپنا پُرانا الہام یاد آیا ہے کہ :

وَتَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ فَجَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا

جو براہینِ احمدیہ میں درج ہے اور تجلّی کی اس کے ربّ نے پہاڑ پر یعنی مشکلات کے پہاڑ پر اور کر دیا اس کو پاش پاش اور گرا موسٰی بیہوش ہوکر۔ یعنی ایسی تجلّی ہیبت ناک تھی کہ اس کی ہیبت کا اثر موسٰی پر بھی پڑا۔

زلزلے کے پہلے دھکا کے وقت ہم دُعا کرتے ہوئے سجدے میں گر پڑے تھے۔ ایک ہیبت ناک صورت پیشِ نظر تھی جس کا ایک قوی اثر دل پر تھا۔ ایسا اثر تھا کہ گویا ایک صعق کی قسم تھی۔

آج کے الہام میں جو آئندہ زلزلہ کا خوف ہے معلوم نہیں کہ کب پورا ہو اور معلوم نہیں کہ زلزلہ سے مراد کس قسم کا عذاب ہے۔ عَفَتِ الدِّیَارُ مَحَلُّھَا وَمُقَامُھَا والا الہام کیسا پورا ہوا کہ شہر اور چھاؤنیوں کے نشان مٹ گئے۔ نہ خانہ رہا اور نہ صاحبِ خانہ۔

آریوں کے اخبار ڈیلی ٹائمز اور آریہ پتر کا اور اہلحدیث نے جو مخالفانہ ریمارکس کئے ہیں۔ ان کا ذکر آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ :

ان سب کو یہی جواب دے دو کہ ہم آسمانی فیصلہ کے منتظر ہیں۔ تمہارا جواب دینا پسند نہیں کرتے۔ تمہارا جو جی چاہے کہتے جاؤ۔

انبیاء کی تربیت آہستہ آہستہ ہوتی ہے

فرمایا :

تربیت انبیاء کی اسی طرح آہستہ آہستہ ہوتی چلی آئی ہے ابتدا میں جب مخالف دُکھ دیتے ہیں تو صبر کا حکم ہوتا ہے اور نبی صبر کرتا ہے یہانتک کہ دُکھ حد سے بڑھ جاتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ اب میں خود تیرے دشمنوں کا مقابلہ کروں گا۔ اب یقیناً جانو کہ وقت بہت قریب ہے اس وقت ہمیں وہ وحی الٰہی یاد آتی ہے

جو عرصہ ہوا کہ ہم پر نازل ہوئی تھی کہ:

قَرُبَ اَجَلُكَ الْمُقَدَّرُ۔ وَلَا نُبْقِيْ لَكَ مِنَ الْمُخْزِيَاتِ ذِكْرًا

ان مخالفوں کی مخالف باتوں کا کوئی نشان اور ذکر باقی نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس جماعت کو اپنی قدرتوں پر ایمان دلا دے۔ یہیں دلیار میں نشانات ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جماعت کو حفاظت میں رکھے۔[1]

۱۰/ اپریل ۱۹۰۵ء

ایک عارفانہ دُعا کثرتِ زلازل اور تباہیوں کا ذکر تھا۔ فرمایا:

ہم تو یہ دُعا کرتے ہیں کہ خُدا جماعت کو محفوظ رکھے اور دُنیا پر یہ ظاہر ہو جائے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) برحق رسول تھے اور خُدا کی ہستی پر لوگوں کو ایمان پیدا ہو جائے۔ خواہ کیسے ہی زلزلے پڑیں۔ پر خُدا کا چہرہ لوگوں کو ایک دفعہ نظر آجائے اور اس ہستی پر ایمان قائم ہو جائے۔

جماعت کا مستقبل آج رات کے الہام اِنَّ فِرْعَوْنَ ..... الخ کا ذکر تھا۔ فرمایا:

فرعون اور اس کے ساتھی تو یہ یقین کرتے تھے کہ بنی اسرائیل ایک تباہ ہو جانے والی قوم ہے اور اس کو ہم جلد فنا کر دیں گے۔ پر خُدا نے فرمایا کہ وہ ایسا خیال کرنے میں خطا کار تھے۔ ایسے ہی اس جماعت کے متعلق مخالفین و معاندین کہتے ہیں کہ یہ جماعت تباہ ہو جائے گی، مگر خدا تعالیٰ کا منشا کچھ اور ہے۔

فحاشی عذاب کا موجب ہے کانگڑہ کے متعلق بہت تباہی کا ذکر تھا۔ مولوی نور الدین صاحب نے عرض کی کہ اس جگہ فحش بہت تھا۔ فرمایا:

اسی واسطے وہاں عذاب بھی بہت ہوا۔[2]

---

[1] البدر سلسلہ جدید جلد ۱ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۳/ اپریل ۱۹۰۵ء

[2] البدر 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۱۱/اپریل سنہ ۱۹۰۵ء

کانگڑہ کی تباہی

وحیِ الٰہی عَفَتِ الدِّیَارُ کا ذکر تھا۔ حضرت مولوی نورالدین صاحب نے عرض کی کہ اَلدِّیَارُ سے مُراد کانگڑہ ویلی ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ شرک کا بڑا مکان ان دنوں میں وہی ہے۔ دو بڑی دیویوں کے مندر اس جگہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دو کو تباہ کیا اور بڑے پُرانے شرک کو دنیا سے مٹا دیا۔ حضرت نے فرمایا :

لوگ کہا کرتے تھے کہ خُدا نے کس طرح پہاڑ کو بنی اسرائیل کے اوپر کر دیا تھا یہ قصّہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اب کانگڑہ۔ دھرمسالہ مقامات کے لوگوں نے خوب سمجھ لیا ہو گا کہ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (البقرۃ : ۶۴) کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ ذرا سے زلزلے میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا پہاڑ اوپر آ گرا۔ پھر خُدا چاہے اس کو پیچھے ہٹا دے یا اُوپر گرا دے۔ یہ نیچریت زمانہ کے جہلاء کا جواب ہے جو خُدا نے زلزلہ کے ذریعہ سے دیا ہے امید ہے کہ اس قدر نظارے دیکھ کر بعض خوش قسمت لوگ سمجھ جائیں گے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

زلزلہ کا نشان

ایک اخبار والے کا ذکر آیا کہ وُہ لکھتا ہے زلزلے تو آیا ہی کرتے ہیں۔ اس میں مرزا صاحب کا کیا نشان ہوا۔ فرمایا :

یہ لوگ نابینا ہیں۔ نشان تو اس بات میں ہے کہ عین موقعہ پر ایک شخص نے قبل از وقت پیشگوئی کی اور دکھایا کہ یہی وقت ہے۔ خیر سب اندھے نہیں ہیں۔ سمجھنے والے سمجھ لیں گے کہ یہ کس قسم کا نشان ہے۔ ہزاروں برسوں کے جو معبد اور بُت چلے آتے تھے وہ اب سرنگوں ہو گئے ہیں۔ یہ نشان نہیں تو اَور کیا ہے ؟

فرمایا :

اِن بُتوں کا ٹوٹنا خدا تعالیٰ کی اس توحید کے قائم ہونے کے واسطے جس کے لیے ہم رات دن دُعائیں کرتے ہیں۔ ایک تفاؤل ہے۔

فرمایا :

اس الہام سے بھی جو ہم کو ہوا تھا کہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَھَقَ الْبَاطِلُ ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بت ٹوٹنے

والے ہیں کیونکہ قرآنِ شریف میں بھی یہ آیت بتوں کے ٹوٹنے اور اسلام کے غلبہ کے واسطے آئی ہے۔

فرمایا :

براہین احمدیہ بڑی کام آئی۔ وہ سب پہلوؤں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ کوئی نیا الزام اور ظن ایسا نہیں جن کا جواب پہلے سے اس کے اندر نہ دیا گیا ہو۔

بیماری کا ذکر تھا فرمایا :

مَیں تو سب کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ آگے اپنے اپنے اعمال ہیں۔

بدر[1] جلد ۱ نمبر ۳ صفحہ ۴ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۰۵ء

۱۴ اپریل ۱۹۰۵ء

نواب محمد علی خان صاحب کا خط آیا جس میں انہوں نے الحاح کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ مَیں اب لاہور میں ہرگز نہیں رہ سکتا۔ مجھے باغ کے کسی گوشہ میں جگہ دیدیں۔ عاجز راقم کو حکم دیا کہ : ان کو تحریر کر دو کہ آجائیں اور باغ کے کسی حصّہ میں جہاں چاہیں جگہ کریں۔

اس زمانہ کے بنی اسرائیل دھرمسالہ سے خبر آئی کہ اس جگہ اپنی جماعت کے جتنے آدمی تھے سب بچ گئے۔ فرمایا :

كَفَفْتُ عَنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ والی وحی ان کے معاملہ میں تو پوری ہو گئی۔ خُدا نے اس غریب جماعت کا نام اس وقت بنی اسرائیل رکھا ہے[2]۔

---

[1] اس نمبر سے اخبار کا نام "البدر" کی جگہ "بدر" رکھا گیا۔ (مُرتّب)

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۳ صفحہ ۲ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۰۵ء

۱۵؍اپریل ۱۹۰۵ء

آفات کی خبر فرمایا :

لوگ کچھ ہی کریں اور کچھ ہی لکھیں مگر جیسی آفت کی خبر خدا نے اب دی ہے۔ یہ جب ظاہر ہوگی تو بہرحال اُن کو ماننا ہی پڑے گا۔ کسی جگہ سے دس ہزار کے مرنے کی اور کسی جگہ سے تین ہزار کے مرنے کی خبر آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحی نے پہلے سے ہی خبر دی تھی کہ یہ سب کچھ تیرے لیے ہے لَكَ نُرِيَ اٰيَاتٍ اور ایسا ہی براہین احمدیہ میں درج ہیں۔ قُوَّةُ الرَّحْمٰنِ لِعُبَيْدِ اللّٰهِ الصَّمَدِ۔ اس جگہ ہمارا نام عبیداللہ اس لحاظ سے رکھا گیا ہے کہ ہم مخالفوں کی دُکھ دہی اور مصائب سے بہت ستائے گئے ہیں۔

کسی نے خبر سُنائی کہ بھاگسو میں کئی سو مر گئے اور جو باقی ہیں وہ بھوک سے مر رہے ہیں۔ اور سجان پُور میں بڑی تباہی آئی لیکن احمدی جماعت کا آدمی وزیرالدین ہیڈ ماسٹر بچ گیا۔ فالحمدللہ۔ فرمایا :

یہ نشان تو صرف ایک بیج بویا گیا ہے اور تخم ریزی ہے اور دُوسرا نشان اس سے بڑھ کر ہوگا۔ کفار میں بھی سعید فطرت ہوتے ہیں۔ آخر ہنود بھی اس طرف توجہ کریں گے۔[1]

۱۶؍اپریل ۱۹۰۵ء

امام الصلوٰۃ کے لیے ہدایت کسی شخص نے ذکر کیا کہ فلاں دوست نماز پڑھانے کے وقت بہت لمبی سُورتیں پڑھتے ہیں۔ فرمایا :

امام کو چاہیے کہ نماز میں ضعفاء کی رعایت رکھے

ایک انگریزی اخبار کا مضمون حضرت اقدس کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ محققین حیران ہیں کہ ان پہاڑوں سے یہ امید نہ تھی۔ فرمایا :

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۳ صفحہ ۲ مورخہ ۲۰؍اپریل ۱۹۰۵ء

عقلمندوں کو کس طرح خدا حیران کرتا ہے۔ ان ملکوں میں آتش فشانی کی کبھی امید نہ تھی بلکہ یہ پہاڑ امن کا سلسلہ سمجھا جاتا تھا۔[1]

۱۷؍اپریل ۱۹۰۵ء

اس زمانہ کے مسلمانوں سے خطاب فرمایا :

براہین احمدیہ میں ایک الہام یہ بھی درج ہے :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا

اس میں اس زمانہ کے لوگوں کو کہا گیا ہے کہ تم اصحابِ کہف کے قصہ پر کیا تعجب کرتے ہو وہ تو تین سو سال تک سوتے رہے تھے اور تم کو سوتے ہوئے تیرہ سو سال گذر گئے ہیں۔ اور اب بھی تم جاگنا نہیں چاہتے۔ اسی طرح غفلت میں سوئے ہوئے ہو اور کوئی جگانا چاہتا ہے تو اس کو بُرا کہتے ہو۔

دُعا کا اثر مولوی عبدالکریم صاحب کی علالتِ طبع کا ذکر تھا۔ فرمایا :

مَیں بہت دُعا کرتا ہوں۔ دُعا ایسی شئے ہے کہ جن امراض کو اطباء اور ڈاکٹر لاعلاج کہہ دیتے ہیں۔ ان کا علاج بھی دُعا کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

پیشگوئیوں کا صحیح مفسّر فرمایا :

پیشگوئیوں کا صحیح مفسّر خود زمانہ ہے۔ دیکھو اس زمانہ میں یاجُوج ماجُوج، دجّال، نزولِ مسیح وغیرہ کے متعلق تمام پیشگوئیاں صاف سمجھ میں آ گئی ہیں۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۳ صفحہ ۲ مورخہ ۲۰؍اپریل ۱۹۰۵ء

فرمایا:

رات کو ہم نے دیکھا کہ سخت زلزلہ آیا ہے۔ وہ زمانہ اصل میں قریب ہے۔ اچانک آئے گا۔ معلوم نہیں کہ کس وقت آجائے۔

خوابوں کے معاملات

ایک شخص کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے خواب میں مرزا صاحب کو اچھی صورت میں نہیں دیکھا۔ فرمایا کہ:

"انسان کو اپنے اندرونی حالات کے نقشے دکھائے جاتے ہیں۔ اپنے ہی حجب درمیان میں آجاتے ہیں۔"

حضرت مولوی نورالدین صاحب نے ذکر کیا کہ ہمارے اُستاد صاحب نے ایک شہر میں ایک دفعہ خواب میں اللہ تعالیٰ کو ایک بدصورت عورت کی شکل میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس شہر کے لوگوں نے میری ایسی بے عزتی کی ہے۔[1]

۱۹ر اپریل ۱۹۰۵ء

آتھم اور لیکھرام

فرمایا:

آتھم نے نرم دلی اختیار کی اس کے معاملہ میں تاخیر کی گئی۔ لیکھرام نے شوخی دکھائی اس کے معاملہ میں تقدیم کی گئی۔ یعنی مدت پیشگوئی ہنوز گذرنے نہ پائی تھی کہ وہ ہلاک ہوگیا۔[2]

قبل نمازِ ظہر عاجز[3] راقم سے دریافت کیا کہ آیا شیخ یعقوب علی صاحب اشتہار الندا ء کے انطباع کے انتظام کے واسطے لاہور چلے گئے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ صبح چلے گئے ہیں۔ فرمایا:

"ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ بھی جائیں اور پروف کو بغور پڑھ کر درست کر دیں۔"

چنانچہ حسب الحکم یہ عاجز شام کو لاہور چلا گیا اور چار روز کے بعد واپس دارالامان حاضر ہوا۔[4]

---

[1] و [2] بدر جلد ۱ نمبر ۳ صفحہ ۲ مورخہ ۲۰ر اپریل ۱۹۰۵ء

[3] یعنی حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ ﴿ (مرتّب)

[4] بدر جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۸ مورخہ ۲۷ر اپریل ۱۹۰۵ء

۲۴ / اپریل ۱۹۰۵ء

وساوس کا علاج

ایک شخص نے عرض کی کہ میرا دل آجکل ایسا ہو رہا ہے کہ نماز میں لذت اور رقت پیدا نہیں ہوتی اور نہایت سخت تکلیف میں رہتا ہوں خواہ مخواہ شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں اگرچہ ان کو بہت رد کرتا ہوں تاہم وساوس پیچھا نہیں چھوڑتے۔ فرمایا :

یہ بھی خدا تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ انسان ایسے وساوس کا مغلوب نہیں ہوتا۔ یہ بھی ثواب کی حالت ہے۔ نفس کی تین حالتیں ہیں۔ ایک تو نفسِ امّارہ ہے نفس امّارہ والے کو تو خبر ہی نہیں کہ بدی کیا شئے ہے۔ دوسرا نفس لوّامہ ہے جو بدی کرتا ہے پر بدی پر ہمیشہ گھبراتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے اور توبہ کرتا رہتا ہے۔ ایسا شخص نفس کا غلام نہیں ہے اور اس حالت میں ہونا ایک حد تک ضروری بھی ہے اس سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس میں بڑے بڑے ثواب ہیں یہانتک کہ اللہ تعالیٰ خود بخود نور اور سکینت نازل کرتا ہے۔ خدا کی رحمت کا وقت آتا ہے اور ایک ٹھنڈ پڑ جاتی ہے اور وہ بات ہوا ہو جاتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ تھک نہ جاوے۔ سجدہ میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ بہت پڑھا کرو۔ لیکن یاد رکھو کہ جلد بازی خوفناک ہے۔ اسلام میں انسان کو بہادر بننا چاہیے۔ برسوں کی محنت و مشقت کے بعد آخر شیطان کے حملے کمزور ہو جاتے ہیں اور وہ بھاگ جاتا ہے[1]۔

۲۵ / اپریل ۱۹۰۵ء

آئندہ آنیوالی آفات

اس الہام کا تذکرہ تھا کہ بھونچال آیا اور شدید آیا۔ فرمایا کہ :

بار بار زلزلہ کے متعلق جو الہامات ہوتے ہیں اور خوابیں آتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر کچھ ایسی تیاری ہو رہی ہے کہ یہ امر جلد ہونے والا ہے۔ بہت سی باتیں ہوتی ہیں کہ انسان ان کو دُور سمجھتا ہے مگر خُدا کے علم میں وہ بہت قریب ہوتی ہے۔ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِیْبًا (المعارج ۷، ۸) تم اسے دُور

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۸ مورخہ ۲۷ / اپریل ۱۹۰۵ء

دیکھتے ہو اور ہم قریب دیکھتے ہیں۔

بَغتَۃً آنیوالے عذاب

مرزا ظفر اللہ خاں صاحب ای۔ اے۔ سی گورداسپور کے ایک رشتہ دار کا ایک خط بنام سید امیر علی شاہ صاحب ڈپٹی انسپکٹر اٹاوہ پڑھا گیا۔ اس میں نہایت دردناک الفاظ میں زلزلہ سے گھر کے آدمیوں کی تباہی کا تذکرہ تھا اور لکھا تھا کہ میرے بیس رشتہ دار ایک دم میں فوت ہو گئے ہیں۔ جن میں عزیز بھائی اور پیاری بیوی بھی شامل تھی۔ حضرت نے فرمایا :

ابھی آگے آنیوالا اس سے بھی سخت نظر آتا ہے مگر لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ابھی تک ہنسی ٹھٹھے سے باز نہیں آتے۔ خدا کا دن اچانک آنے والا ہے۔

مولوی نورالدین صاحب نے عرض کی کہ انجیل میں لکھا ہے کہ وہ چور کی طرح آئے گا۔

فرمایا کہ :

ٹھیک ہے مگر چور کا لفظ کچھ زیب نہیں دیتا۔ قرآن شریف میں بہت مناسب لفظ ہے کہ بَغتَۃً یعنی اچانک آئے گا پہلے کچھ خبر نہ ہوگی۔

فرمایا :

شاید اس میں کچھ دیر ہو جائے تاکہ لوگ پوری طرح شوخیاں کریں اور اپنے واسطے عذاب کے سامان اچھی طرح جمع کریں پھر اچانک یہ آفت ان پر پڑے گی[1]

---

۲۸ اپریل ۱۹۰۵ء (بعد نماز جمعہ)

باہمی ہمدردی اور اُخوت کی تلقین

اعلیحضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مندرجہ ذیل تقریر باہم ہمدردی اور حقوقِ اخوت پر فرمائی :

میں صرف اس قدر بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری اس جماعت کو ایک قسم کا دھوکا لگا ہوا ہے۔ شاید

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۸ مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۰۵ء

اچھی طرح میری باتوں پر غور نہیں کی اور وہ غلطی اور دھوکا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہماری جماعت میں سے طاعون سے فوت ہو جاوے تو اس قدر بے رحمی اور سرد مہری سے پیش آتے ہیں کہ جنازہ اُٹھانے والا بھی نہیں ملتا۔ درحقیقت جیسا کہ قاضی امیر حسین صاحب نے لکھا ہے یہ مصیبت تو ماتم سے بھی بڑھ کر ہے۔ یاد رکھو۔ تم میں اس وقت دو اخوتیں جمع ہو چکی ہیں۔ ایک تو اسلامی اخوت اور دُوسری اس سلسلہ کی اخوت ہے۔ پھر ان دو اخوتوں کے ہوتے ہوئے گریز اور سرد مہری ہو تو یہ سخت قابلِ اعتراض امر ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر ایسے مسافر اپنے گھروں میں ہوتے تو وہ جو خارج از مذہب سمجھتے ہیں اور کافر کہتے ہیں اُن میں بھی اس قسم کی سرد مہری نہ ہوتی۔ لیکن یہ سرد مہری کیوں ہوتی ہے؟ دو باتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ افراط اور تفریط کا۔ اگر افراط اور تفریط کو چھوڑ کر اعتدال سے کام لیا جاوے تو ایسی شکایت پیدا نہ ہو۔ جبکہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (العصر:۴) اور تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد:۱۸) کا حکم ہے تو پھر ایسے مُردوں سے گریز کیوں کیا جاوے؟ اگر کسی کے مکان کو آگ لگ جاوے اور وہ پکار فریاد کرے تو جیسے یہ گناہ ہے کہ محض اس خیال سے کہ مَیں نہ جل جاؤں اس مکان کو اور اس میں رہنے والوں کو جلنے دے اور جا کر آگ بجھانے میں مدد نہ دے ویسے ہی یہ بھی معصیت ہے کہ ایسی بے احتیاطی سے اس میں کُود پڑے کہ خود جل جاوے۔ ایسے موقعہ پر احتیاط مناسب کے ساتھ ضروری ہے کہ آگ بُجھانے میں اس کی مدد کرے۔

پس اس طریق پر یہاں بھی سلوک ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جا بجا رحم کی تعلیم دی ہے۔ یہی اخوتِ اسلامی کا منشاء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ تمام مسلمان مومن آپس میں بھائی ہیں۔ ایسی صورت میں کہ تم میں اسلامی اخوت قائم ہو اور پھر اس سلسلہ میں ہونے کی وجہ سے دُوسری اخوت بھی ساتھ ہو۔ یہ بڑی غلطی ہوگی کہ کوئی شخص مصیبت میں گرفتار ہو اور قضاء و قدر سے اُسے ماتم پیش آ جاوے تو دوسرا تجہیز و تکفین میں بھی اس کا شریک نہ ہو۔ ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جنگ میں شہید ہوتے یا مجروح ہو جاتے تو مَیں یقین نہیں رکھتا کہ صحابہؓ انہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہوں یا پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اس بات پر راضی ہو جاتے کہ وہ ان کو چھوڑ کر چلے جاویں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ ایسی وارداتوں کے وقت ہمدردی بھی ہو سکتی ہے اور احتیاط مناسب بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اوّل تو کتاب اللہ سے یہ مسئلہ ملتا ہی نہیں کہ کوئی مرض لازمی طور پر دُوسرے کو لگ بھی جاتی ہے۔ ہاں جس قدر تجارب سے معلوم ہوتا ہے اُس کے لیے بھی نصِ قرآنی سے احتیاط مناسب کا پتہ لگتا ہے۔ جہاں ایسا مرکز وبا کا ہو کہ وہ شدت سے پھیلی ہوئی ہو۔ وہاں احتیاط کرے۔ لیکن اس کے بھی یہ معنے نہیں کہ ہمدردی ہی چھوڑ دے۔ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ انسان ایک میت سے اس قدر بُعد اختیار

کیسے میت کی ذلت ہو اور پھر اس کے ساتھ ساری جماعت کی ذلت ہو۔ آئندہ خوب یاد رکھو کہ ہرگز اس بات کو نہیں کرنا چاہیے۔ جبکہ خدا تعالیٰ نے تمہیں بھائی بنا دیا ہے تو پھر نفرت اور بُعد کیوں ہے؟ اگر وُہ بھی مرے گا تو اس کی بھی کوئی خبر نہ لے گا اور اس طرح پر اخوت کے حقوق تلف ہو جائیں گے۔

خدا تعالیٰ نے دو ہی قسم کے حقوق رکھے ہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ جو شخص حقوق العباد کی پروا نہیں کرتا وہ آخر حقوق اللہ کو بھی چھوڑ دیتا ہے کیونکہ حقوق العباد کا لحاظ رکھنا یہ بھی تو امر الٰہی ہے جو حقوق اللہ کے نیچے ہے۔

یہ خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ پر توکل بھی کوئی چیز ہے۔ یہ مت سمجھو کہ تم نری پرہیزوں سے بچ سکتے ہو جبتک خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق نہ ہو اور انسان اپنے آپ کو کارآمد انسان نہ بنا لے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ خواہ وہ ہزار بھاگتا پھرے۔ کیا وہ لوگ جو طاعون میں مبتلا ہوتے ہیں وہ پرہیز نہیں کرتے؟ مَیں نے سُنا ہے کہ لاہور میں نواب صاحب کے قریب ہی ایک انگریز رہتا تھا وہ مبتلا ہو گیا۔ حالانکہ یہ لوگ تو بڑے پرہیز کرنے والے ہوتے ہیں۔ نرا پرہیز کچھ چیز نہیں جبتک خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق نہ ہو۔ پس آئندہ کے لیے یاد رکھو کہ حقوقِ اخوت کو ہرگز نہ چھوڑو ورنہ حقوق اللہ بھی نہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ طاعون کا سلسلہ جو مرکز پنجاب ہو گیا ہے کب تک جاری رہے لیکن مجھے یہی بتایا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (الرعد: ۱۲) اللہ تعالیٰ کسی حالت میں قوم میں تبدیلی نہ کرے گا جبتک لوگ دلوں کی تبدیلی نہ کریں گے۔ ان باتوں کو سُن کر یُوں تو ہر شخص جواب دینے کو تیار ہو جاتا ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں۔ استغفار بھی کرتے ہیں۔ پھر کیوں مصائب اور ابتلا آ جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی باتوں کو جو سمجھ لے وہی سعید ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا کچھ اور ہوتا ہے سمجھا کچھ اور جاتا ہے اور پھر اپنی عقل اور عمل کے پیمانہ سے اسے ناپا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ ہر چیز جب اپنے مقررہ وزن سے کم استعمال کی جاوے تو وہ فائدہ نہیں ہوتا جو اس میں رکھا گیا ہے۔ مثلاً ایک دوائی جو تولہ کھانی چاہیے اگر تولہ کی بجائے ایک بُوند استعمال کی جاوے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا اور اگر روٹی کی بجائے کوئی ایک دانہ کھا لے تو کیا وہ سیری کا باعث ہو سکے گا؟ اور پانی کے پیالے کی بجائے ایک قطرہ سیراب کر سکے گا؟ ہرگز نہیں۔ یہی حال اعمال کا ہے۔ جب تک وہ اپنے پیمانہ پر نہ ہوں وہ اوپر نہیں جاتے ہیں۔ یہ سنّت اللہ ہے جس کو ہم بدل نہیں سکتے۔ پس یہ بالکل خطا ہے کہ اسی ایک امر کو پلّے باندھ لو کہ طاعون والے سے پرہیز کریں تو طاعون نہ ہوگا۔ پرہیز کرو جہاں تک مناسب ہے لیکن اس پرہیز سے باہمی اخوت اور ہمدردی نہ اُٹھ جاوے اور اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرو۔ یاد رکھو کہ مُردہ کی تجہیز و تکفین میں مدد

دینا اور اپنے بھائی کی ہمدردی کرنا صدقات خیرات کی طرح ہی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی خیرات ہے اور یہ حق العباد کا ہے جو فرض ہے۔ جیسے خدا تعالیٰ نے صوم و صلوٰۃ اپنے لیے فرض کیا ہے اسی طرح اس کو بھی فرض ٹھہرایا ہے کہ حقوق العباد کی حفاظت ہو۔ پس ہمارا کبھی یہ مطلب نہیں ہے کہ احتیاط کرتے کرتے اخوت ہی کو چھوڑ دیا جاوے۔ ایک شخص مسلمان ہو اور پھر سلسلہ میں داخل ہو اور اس کو یوں چھوڑ دیا جاوے جیسا کُتے کو۔ یہ بڑی غلطی ہے جس زندگی میں اخوت اور ہمدردی ہی نہ ہو وہ کیا زندگی ہے۔

پس ایسے موقعہ پر یاد رکھو کہ اگر کوئی ایسا واقعہ ہو جاوے تو ہمدردی کے حقوق فوت نہ ہونے پاویں۔ ہاں مناسب احتیاط بھی کرو۔ مثلاً ایک شخص طاعون زدہ کا لباس پہن لے یا اس کا پس خوردہ کھاوے تو اندیشہ ہے کہ وہ مبتلا ہو جاوے۔ لیکن ہمدردی یہ نہیں بتاتی کہ تم ایسا کرو۔ احتیاط کی رعایت رکھ کر اس کی خبرگیری کرو اور پھر جو زیادہ وہم رکھتا ہو وہ غسل کر کے صاف کپڑے بدل لے۔ جو شخص ہمدردی کو چھوڑتا ہے وہ دین کو چھوڑتا ہے۔ قرآن شریف فرماتا ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ الآیۃ (المائدہ : ۳۳) یعنی جو شخص کسی نفس کو بلاوجہ قتل کر دیتا ہے وہ گویا ساری دُنیا کو قتل کرتا ہے۔ ایسا ہی میں کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے اپنے بھائی کے ساتھ ہمدردی نہیں کی تو اس نے ساری دُنیا کے ساتھ ہمدردی نہیں کی۔ زندگی سے اس قدر پیار نہ کرو کہ ایمان ہی جاتا رہے۔ حقوقِ اخوت کو کبھی نہ چھوڑو۔ وہ لوگ بھی تو گذرے ہیں جو دین کے لیے شہید ہوتے ہیں۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات پر راضی ہے کہ وہ بیمار ہو اور کوئی اُسے پانی تک نہ دینے جاوے۔ خوفناک وہ بات ہوتی ہے جو تجربہ سے صحیح ثابت ہو۔ بعض مُلاں ایسے ہیں جنھوں نے صدہا طاعون سے مرے ہوئے مُردوں کو غسل دیا ہے اور انہیں کچھ نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے فرمایا ہے کہ یہ غلط ہے کہ ایک کی بیماری دُوسرے کو لگ جاتی ہے۔ وبائی ایام میں اتنا لحاظ کرے کہ ابتدائی حالت ہو تو وہاں سے نکل جاوے لیکن زور شور ہو تو مت بھاگے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو کہا تھا کہ تم ابوابِ متفرقہ سے داخل ہونا اس لحاظ سے کہ مبادا کوئی جاسوس سمجھ کر پکڑ نہ لے۔ احتیاط تو ہوئی لیکن قضاء و قدر کے معاملہ کو کوئی روک نہ سکا۔ وہ ابواب متفرقہ سے داخل ہوتے لیکن پکڑے گئے۔ پس یاد رکھو کہ سارے فضل ایمان کے ساتھ ہیں۔ ایمان کو مضبوط کرو۔ قطعِ حقوق معصیت ہے اور انسان کی زندگی ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ ایسا پرہیز اور بُعد جو ظاہر ہوا ہے وہ عقل اور انصاف کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ ایسے امور سے اپنے آپ کو بچاؤ جو تجربہ میں مضر ثابت ہوتے ہیں۔

یہ جماعت جس کو خدا تعالیٰ نمونہ بنانا چاہتا ہے اگر اس کا بھی یہی حال ہوا کہ ان میں اخوت اور ہمدردی نہ ہو تو بڑی خرابی ہوگی۔ میں دُوسرا پہلو نہ بیان کرتا لیکن مجھے چونکہ سب سے ہمدردی ہے اس لیے اسے بھی میں نے

بیان کرنا ضروری سمجھا یعنی جس کے ساتھ واقعہ ہو جاوے اس کے ساتھ بھی اور جو پیچھے ہوتے ہیں اُن کے ساتھ بھی۔

افسوس ہے میں خود نہیں آسکا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عصر کے بعد مجھے چکر آتا ہے۔ اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی جب تک انہوں نے نہیں لکھا بہرحال باہم ہمدردی ہو اور میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت سے اس طاعون کو اُٹھالے۔[1] آمین۔

گیارہ ماہ پہلے زلزلہ کی خبر

ذکر آیا[2] کہ ایک اخبار میں لکھا ہے کہ جوتشی نے پیشگوئی کی ہے کہ اب زلزلہ کا کوئی خوف نہیں۔ فرمایا:

یہ اور بھی خوشی کی بات ہے۔ خدا نہیں چاہتا کہ اپنے غیب کی خبر میں دُنیا داروں کو بھی شامل کرے۔ اب صاف ہو جائے گا کہ جوتشی سچے ہیں یا خدا کا کلام صحیح ہے۔ اگر یہ جوتشی اور علم طبقات الارض کے ماہر انگریز ایسے ہی دانا ہیں کہ وہ زلزلوں کی خبروں سے پہلے ہی واقف ہو جاتے ہیں تو یقیناً انہوں نے گورنمنٹ انگریزی سے بڑی عداوت کی جو اس کے متعلق پہلے سے اطلاع دے کر ہزاروں جانوں کو اور کروڑوں روپے کے مال کو تلف ہونے سے نہ بچالیا کیونکہ انہوں نے چھ ماہ پہلے خبر و اطلاع نہ دی کہ ایسی مصیبت آنیوالی ہے۔ ہم نے تو گیارہ ماہ پہلے خبر دے دی تھی کہ ایسی آفت آنیوالی ہے جس سے مکانات گر جائیں گے اور مٹ جائیں گے اور وہ ایک زلزلہ کا دھکا ہوگا۔ اس میں لفظ بھی ایک تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا دھکا ہی بہت تیز ہونے والا تھا۔ چنانچہ سب مکانات ایک دفعہ ہی گر گئے یہاں تک کہ جو برانڈوں میں تھے وہ دوڑ کر باہر نہیں آسکے اور جو لیٹے ہوئے تھے وہ بیٹھ نہیں سکے اور جو بیٹھے ہوئے تھے اُن کو کھڑا ہونے کا وقت نہیں ملا۔[3]

۲۹؍اپریل ۱۹۰۵ء

ایک رؤیا

گذشتہ رات کو ۲ بجنے میں سات منٹ باقی تھے جبکہ ہم نے یہ رؤیا دیکھا کہ زمین ہلتی ہے۔ پہلے ہم

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۱۵ صفحہ ۲ مورخہ ۳۰؍اپریل ۱۹۰۵ء و بدر جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱ و ۲ مورخہ ۴؍مئی ۱۹۰۵ء

[2] یہ ملفوظات بھی ۲۸؍اپریل ۱۹۰۵ء کے ہیں جو غالباً اسی دن کسی دوسرے وقت بیان ہوئے۔ (مُرتّب)

[3] بدر جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۸ مورخہ ۲۷؍اپریل ۱۹۰۵ء

نے خیال کیا کہ شاید ویسے ہی کچھ حرکت ہوئی ہے، مگر پھر زور سے ایک دھکا لگا تب یقین ہوا کہ زلزلہ ہے۔ اور میں گھر کے آدمیوں کو جگاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اُٹھو زلزلہ آیا۔ مبارک کو بھی اُٹھا لو۔ اور یہ بھی رؤیا میں کہتا ہوں کہ جوتشی کس قدر جھوٹے ہیں۔ پنڈت نے تو اخبار میں چھپوایا تھا کہ اب زلزلہ نہیں آئے گا۔ اس کے بعد بیداری ہوئی۔

آج رات کی رؤیا کا ذکر تھا کہ سخت زلزلہ آیا اور گھر کے آدمیوں کو جگاتے ہیں۔ فرمایا کہ :

آسمان پر ضرور کچھ تیاری معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ظاہر پر یہ بات محمول ہو اور ممکن ہے کہ اس سے مراد اور کوئی سخت آفت ہو۔ بعض دفعہ ویسے بھی زمینوں میں خسف ہو جاتا ہے۔ فرمایا :

اس میں مبارک کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہ امر ہمارے واسطے خیر و برکت کا موجب ہوگا۔ گو دوسروں کے واسطے اس میں مصائب اور شدائد ہوں۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اس واسطے ایک اَور اشتہار لکھا جاوے۔ بار بار کے سمجھانے سے ممکن ہے کہ کوئی آدمی سمجھ جاوے۔

ذکر آیا کہ لُدھیانہ میں ایک فحش گو نے پھر گالیاں دینے پر کمر باندھی ہے۔ فرمایا کہ :

اب ایسے لوگوں سے اعراض ہی اچھا ہے۔ ہم کیا جواب دے سکتے ہیں۔ خُدا خود ہی اب تو جواب دینے لگ پڑا ہے۔

نزولِ آفات کا سبب

ذکر ہوا کہ ایک شہر میں ایسا بگولہ آیا ہے کہ شہر کے ایک حِصّہ کو بالکل تباہ کر گیا ہے۔ اور دریائے بیاس کا پانی پہاڑ کے گرنے سے رُک گیا ہے اور خوف ہے کہ جب وہ یک دفعہ پھٹے گا تو بڑا سخت طوفان نازل ہوگا۔

فرمایا :

ہر طرف سے آفات کا سامنا ہے۔ چاروں عناصر انسان کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ کیونکہ اس نے خدا کی نافرمانی کی۔

فرمایا :

صرف باتوں سے کام پورا نہیں ہوتا۔ سنت اللہ ہمیشہ یہی ہے کہ نشانات دکھائے جاتے ہیں۔ الہامات کے الفاظ میں بھی استعارات ہوتے ہیں۔ زلزلہ سے مراد کبھی زلزلہ ہوتا ہے، کبھی آفتِ شدید۔

آج رات میں اس خیال میں سویا تھا کہ زلزلہ کا خواب اور الہامات ہونے۔

فرمایا :

ایمان والے مانتے ہیں پر دوسرے لوگ ہنسی ٹھٹھا کرتے ہیں۔ پیسہ اخبار بہت ہی شوخی کرتا ہے اور لوگوں کو خدا کے نشانوں سے غافل کرنا چاہتا ہے اور ان کو تھپک تھپک کر سلاتا ہے۔[1]

صدقہ وخیرات اور توبہ سے بلائیں دُور ہو جاتی ہیں

۳۰ر اپریل ۱۹۰۵ء آتھم کے متعلق کسی نے سوال کیا۔ فرمایا :

صدقہ و خیرات سے بلا دُور ہو جاتی ہے۔ اگر صدقہ سے عذاب میں تاخیر نہیں ہو جاتی تو پھر سارے پیغمبر نعوذ باللہ جھوٹے ٹھہرتے ہیں۔ یُونسؑ اور اس کی قوم کا قصہ پڑھو۔ آتھم تو آخر مر ہی گیا تھا مگر یُونس کی قوم تو توبہ کرنے سے بالکل بچ گئی۔ اگر وُہ باوجود اس قدر گریہ وزاری اور خاموشی کے مر جاتا تو پھر اس میں اور لیکھرام میں کیا فرق ہوتا؟ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ شوخ میں اور غیر شوخ میں فرق کر کے دکھا دے۔[2]

یکم مئی ۱۹۰۵ء

سچّا مُسلمان

ضلع مظفر گڈھ کا ایک عیسائی آپ کے ہاتھ پر توبہ کر کے مسلمان ہوا۔ اس کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا :

گذشتہ زندگی اور مذہب اور قوم کے طرز و طریق کے مطابق انسان میں بعض خصلتیں اور خواہشیں راسخ ہو جاتی ہیں اور بہت سے نفسانی فریب اندر ہی اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ سچّا مُسلمان وہ ہے کہ سب گندوں کی گٹھڑیاں اپنے سر سے پھینک کر اور اپنے آپ کو پاک صاف کر کے خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری اختیار کرے۔ کوئی غرض نفسانی درمیان نہ رکھے۔ رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض ہندو مسلمان ہوتے ہی کسی مُلّا سے ایک کاغذ لکھوا لیتے ہیں اور ان کی ساری عمر بھیک مانگنے میں گذر جاتی ہے۔ ان کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اسلام کیا شئے ہے۔ مُسلمان اس کو کہتے ہیں جو دنیا کے لوگوں سے مُنہ پھیر کر خدا کی طرف آ جاتے۔ مسلمان کو چاہیے کہ ایسا طریق اختیار کرے جس سے نفس کی ذلّت نہ ہو۔ تھوڑے پر قناعت کر لے۔ اللہ تعالیٰ کو راضی رکھے۔ راستی اور

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۸ مورخہ ۲۷ر اپریل ۱۹۰۵ء۔

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۶ صفحہ ۶ مورخہ ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء

صراطِ مستقیم پر پکا قدم رکھے؛ ورنہ اسلام میں آنا اس کے لیے مفید نہیں۔[1]

۲؍مئی ۱۹۰۵ء

قبل نمازِ ظہر

ایک نئی روشنی کے نوجوان جو بمبئی سے کسی تقریب پر لاہور آئے تھے اور وہاں سے حضرت اقدس کے شوقِ ملاقات میں قادیان تشریف لائے تھے۔ حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت ان کا حال دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا :

دین کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت

زمانہ میں بہت انقلاب ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ ایک طرف ایسے جھکے ہوتے ہیں کہ دُوسری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور اپنے دنیوی کاموں میں یا رسمی معاملات میں ایسے منہمک ہیں کہ دوسری جانب یا تو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے یا اس سے قطعاً نفرت رکھتے ہیں۔ لیکن جو بات خُدا کی طرف سے ہونے والی ہے وہ خواہ مخواہ ہو کر رہتی ہے۔ دیکھو ایک زور آور سیلاب جو آنیوالا ہوتا ہے اسکو کوئی کتنا ہی روکے بہرحال وُہ آ ہی جاتا ہے اور کسی کے روکنے سے رُک نہیں سکتا۔

حضرت کے اس نوجوان سے دریافت کرنے پر کہ آپ کتنے روز ہمارے پاس قیام کریں گے انہوں نے عرض کی کہ مجھے کل واپس جانا ضروری ہے۔ اس پر فرمایا کہ ؛

آپ اخلاص کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ آپ چند روز ٹھہرتے تو خوب ہوتا۔ مگر آپ کا وقت تنگ ہے۔ دوسرے پہلو کو بھی سمجھ لینا چاہیے ؎

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد

جیسا جیسا انسان کسی کام میں بڑھتا ہے ویسا ہی اُس کام کے بڑھنے اور زیادہ ہونے کے بھی راہ کُھلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسری طرف توجہ کرنے کے واسطے انسان کے پاس نہ وقت رہتا ہے اور نہ ہمت مگر رشید آدمی کے واسطے خدا تعالیٰ آپ ہی سامان مہیا کر دیتا ہے اور اس کے دل کے اندر ہی ایک واعظ پیدا کر دیتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کے

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۶ صفحہ ۶ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۰۵ء

واسطے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے دین میں فہم عطا کرتا ہے۔ آجکل لوگوں کو انگریزی تعلیم نے فریفتہ کر رکھا ہے اور اکثر لوگ ایسے ہیں کہ ان کو دوسرے گھر کا ایمان ہی نہیں اور اگر کسی کو ہے تو ایسا کہ ہونا نہ ہونا برابر ہے مگر اس وقت اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ اپنا چہرہ دکھلاوے۔ مخلوق کی قساوتِ قلبی انتہا تک پہنچ گئی ہے اور لوگوں نے نرمی سے فائدہ نہیں اُٹھایا اس واسطے وہ اب قہری نشان بھی دکھانا چاہتا ہے۔ سعید ہیں وہ لوگ جو قبل ایسے نشانات کے واقع ہو جانے کے ایمان لاویں ورنہ فرعون کی طرح آفت میں پڑ کر ایمان لانا مفید نہیں ہوتا۔ جو لوگ بعد میں ایمان لاتے ہیں وہ برگزیدہ پاک جماعت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ آپ کا ہمارے پاس آنا دو نتائج سے خالی نہیں۔ یا تو قبل از وقت آپ پر اثر پڑے یا بعد میں آپ کو حسرت ہو۔

(نوجوان - خدا کرے دوسری بات نہ ہو)

جس سلطنت کے نیچے لوگ رہتے ہیں اس کا اثر مخلوق پر ضرور ہی ہوتا ہے۔ لوگ اگرچہ بظاہر ایک مذہب رکھتے ہیں تاہم ان کا سارا رُخ دنیا کی طرف ہے اور خدا کی طاقتوں پر ایمان نہیں ہے، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنّتِ قدیمہ کے مطابق پھر جلوہ دکھائے۔ یہ زمانہ نوح کے زمانہ سے بہت ملتا ہے۔ اس وقت بھی لوگ اکثر دہریہ تھے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

كُنْتُ كَنْزًا مَّخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ

مَیں ایک مخفی خزانہ تھا۔ پھر مَیں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں

صرف انگریزی زبان میں کوئی کتنی ہی ترقی کرے اس کا نتیجہ بجز دُنیا کے اَور کچھ نہیں ہے۔ یُوں دیکھ لینا چاہیے کہ جو بچے ایسے ہیں کہ انکے ماں باپ ہر دو انگریز ہیں ان کا انگریزی میں کمال ان کو دین کے لیے کیا فائدہ دے سکتا ہے کیونکہ یہ زبان وہ نہیں جس کے ساتھ فخر کیا جا سکے۔ معاش بیشک انسان پیدا کر سکتا ہے۔ مگر معاش تو ایک مزدور بھی ویسی ہی پیدا کر لیتا ہے بلکہ وہ مزدور اچھا ہے کیونکہ اس کے ساتھ وساوس نہیں ہیں۔ ہمارا منشاء یہ نہیں کہ انگریزی نہ پڑھو۔ خود ہماری جماعت میں بہت انگریزی خوان ہیں اور بی۔ اے ایم۔ اے تک تعلیم یافتہ ہیں اور معزز سرکاری عہدوں پر ملازم ہیں لیکن ہمارا منشا یہ ہے کہ اس سے نیک فائدہ اٹھاؤ اور اس کے بُرے فلسفہ سے بچو جو انسان کو دہریہ بنا دیتا ہے۔

ہر شئے میں ایک اثر ہوتا ہے۔ چونکہ انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں اس قسم کی ہیں جو دہریت یا دہریت کی طرف جُھکے ہوئے خیالات اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اس واسطے بغیر کسی زبردست رُشد اور فضلِ الٰہی کے ہر ایک شخص اس سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے لیتا ہے۔ آجکل دُنیا کے لیے حد سے زیادہ زور لگایا جاتا ہے مگر معاش کے لیے سب دروازے کُھلے ہیں۔ افراط کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ دُنیا میں بہت لوگ ایسے ہیں کہ وہ خدا

پر ایمان رکھنے کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا آخرت کے لیے وہ اس قدر محنت اور جان خراشی کرتے ہیں جس قدر کہ وہ دُنیا کے لیے کر رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہی نہیں کہ اس طرف کا معاملہ بھی کبھی پڑے گا۔

نوجوان نے عرض کی کہ مَیں نے عربی بھی ساتھ ساتھ پڑھی ہے۔ حضرت نے فرمایا :

ہم تو صرف اتنے پر بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ کیا ہزاروں مولوی ایسے نہیں ہیں جو بڑے بڑے علوم عربیہ کی تحصیل کر چکے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس سلسلۂ حقّہ کی مخالفت کرتے ہیں اور وہ علوم اُن کے واسطے اور بھی زیادہ حجاب کا موجب ہو رہے ہیں۔ ہزاروں مولوی ہیں جو بجز گالیاں دینے کے اور کچھ کام نہیں رکھتے۔ بیشک معارفِ قرآنی کا ذخیرہ سب عربی میں ہے تاہم جب ایک مدت گذر جاتی ہے اور خدا کے ایک رسُول کو بہت زمانہ گذر جاتا ہے تب لوگوں کے ہاتھ میں صرف الفاظ ہی رہ جاتے ہیں جن کے معانی اور معارف کسی پر نہیں کھل سکتے جبتک کہ اللہ تعالیٰ ان کے واسطے کوئی چابی پیدا نہ کر دے۔ جب خُدا کی طرف سے راہ کھُلتا ہے تب کوئی منوّر قلب والا زندہ دل پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ صاحب حال ہوتا ہے اس واسطے اسکی تفسیر دُرست ہوتی ہے۔ زندہ دل کے سوا کچھ نہیں۔ یہ باتیں سیدھی ہیں مگر افسوس ہے کہ ان لوگوں کو سمجھ نہیں آتی۔

(نوجوان :۔ جہالت ہے۔)

خُدا کہتا ہے کہ حضرت مسیح فوت ہو گئے۔ حدیثِ نبوی سے بھی یہی ثابت ہے کہ فوت ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مُردوں میں دیکھا۔ پھر بھی ہمارے مخالف مولوی انکار کئے چلے جاتے ہیں۔

(نوجوان :۔ جہالت اور بدقسمتی۔) ۔

اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہماری ملاقات سے فائدہ دے[1]۔

---

۶ رمئی ۱۹۰۵ء

قبل ظہر

اللہ تعالیٰ سے چہرہ نمائی کے لیے دُعا

فرمایا کہ :

ہم تو زلزلہ کے وقت آئے تھے کہ باغ میں چل کر دُعا کریں۔ اب محض اس وجہ سے ٹھہرے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۶ صفحہ ۶ مورخہ ۱۱ رمئی ۱۹۰۵ء

سنے جو خبر دی ہے اس کے متعلق کچھ اور معلوم ہو جاوے کہ وہ قریب ہے یا دُور۔ اگر معلوم ہوا کہ دُور ہے تو پھر ایک ماہ کے بعد واپس چلے جاویں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ ایسے وقت آئے گا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو گی بلکہ لوگ ہماری تکذیب کر چکے ہوں گے کہ وہ پیشگوئی جھوٹی نکلی۔ قرآن شریف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ (الانعام: ۴۵) یہ عادت اللہ ہے کہ ایسے وقت عذاب آتا ہے جب لوگ اُسے بالکل بھُول جاتے ہیں۔ ایسا ہی ان الہامات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ چھُپ کر آؤں گا۔ گویا ہر شخص کا دل یقین کرے گا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے بَغْتَةً کا یہی منشا ہے۔

طبقات الارض والے اور جوتشی سب مل ملا کر فیصلہ کر دیں کہ کوئی زلزلہ نہیں آئے گا۔ پھر خدا تعالیٰ کی وحی کی اَور بھی عظمت ظاہر ہو گی۔ حقیقت میں اگر وہ بھی یہی رائے دیتے کہ زلزلہ آئے گا تو ہماری بات مشتبہ ہو جاتی اور کمزور سمجھی جاتی۔ لیکن اب تو ان لوگوں نے اقرار کر لیا ہے کہ زلزلہ نہیں آئے گا۔

فرمایا :

اگر اب خدا تعالیٰ چُپ رہے تو پھر دہریہ پن کے سوا کوئی اَور مذہب نہ ہو گا۔ اگر اس وقت اس کی چہرہ نمائی کی ضرورت نہیں ہے تو پھر کب ہو گی۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر میں دُعا کی تھی کہ اے اللہ اگر تُو نے آج اس گروہ کو ہلاک کر دیا تو تیری کبھی عبادت نہ ہو گی۔ یہی دُعا آج ہمارے دل سے بھی نکلتی ہے۔ پس یقیناً یاد رکھو کہ اب اگر خدا تعالیٰ دستگیری نہ کرے تو سب ہلاک ہو جائیں اور یہ بالکل سچّی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اگر نہ ہو تو قطعِ یقین ہو جاتا ہے۔ بچّہ کو اگر دُودھ نہ ملے تو وہ کب تک جیتے گا۔ آخر بِسک کر مر جائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے انقطاعِ امداد ہو تو انسان چونکہ کمزور اور ضعیف ہے جیسا کہ فرمایا۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (نساء : ۲۹) پس وہ بھی آخر رُوحانی طور پر مَر جائے گا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے براہینِ احمدیہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اگر خدا ایسا نہ کرتا تو دُنیا میں اندھیرا پڑ جاتا۔ اصل یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائیدیں اور اس کے تازہ بتازہ نشان ظاہر ہوتے ہیں تو ایمانی حالت دُرست اور مضبوط رہتی ہے ورنہ شیطانی علوم نے کچھ ایسا دخل کر لیا ہے کہ وہ دلوں سے قہری سیاست کے بغیر جو آسمان سے اُترتی ہے نکل ہی نہیں سکتے ان کے لیے ایسی قہری ضرب چاہیے کہ شیطان چیخ کر نکل جاوے۔ اللہ تعالیٰ رحیم ہے۔ پس وہ اپنے بندوں پر ان نشانوں کے ذریعہ فضل کر رہا ہے اور اُن کے ایمانوں کو طاقت دے رہا ہے۔

فرمایا :

۵؍ مئی کو مَیں نے ایک جامن کا پتہ توڑا۔ اس پر ہر جگہ غور سے دیکھا تو یہی لکھا ہوا پایا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ[لہ]

۱۵؍ مئی ۱۹۰۵ء

سلسلہ کا مُستقبل

فرمایا :

انبیاء کی زندگی وہی ہوتی ہے جو ابتلاء بھی ساتھ ہو۔ چُپ چاپ کی زندگی جو امن کے ساتھ کھاتے پیتے گذر جائے وہ عمدہ زندگی نہیں ہوتی۔ محنتوں اور مشقتوں کے بعد سرٹیفیکیٹ ملا کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ جو خُدا نے جاری کیا ہے۔ یہ اب ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا خواہ ہماری محنتوں سے یہ کام پورا ہو خواہ قضاء و قدر سے ایسے امور پیدا ہو جائیں جو اس کام کو پُورا کر دیں۔

زلزلہ کے متعلق اشتہار شائع کرنے کا مقصد

فرمایا :

ہم نے زلزلہ کے متعلق جو اشتہار شائع کیا ہے یہ مخلوقِ الٰہی کی خیر خواہی کے واسطے ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی کے گھر کو آگ لگے اور کوئی جا کر اسے اطلاع دے۔ ہر ایک خطرناک بات جو آئندہ ہونے والی ہوتی ہے جب اس سے کسی کو اطلاع دی جاوے تو ممکن ہے کہ اس کو تشویش ہو۔ مگر یہ اطلاع اس کی بہتری کے واسطے ہے تاکہ آئندہ تباہی سے وہ بچ جاوے۔

بہلول پور علاقہ لائل پور سے ایک خط پڑھا گیا جس میں لکھا تھا کہ ۱۱؍ مئی کی رات کو یہاں ایسا زلزلہ آیا کہ پہلے ایسا سخت نہ آیا تھا۔ ذکر آیا کہ اس سے نجومیوں کی بات غلط ہوئی جنھوں نے کہا تھا کہ اب

لہ الحکم جلد ۹ نمبر ۱۶ صفحہ ۸ مورخہ ۱۰؍ مئی ۱۹۰۵ء

لہ ولنعم ما قیل :-

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار   ہر ورق دفتریست معرفت کردگار   (ایڈیٹر)

ان تاریخوں میں کوئی زلزلہ نہیں آوے گا۔

ابتلاؤں کا مقصد خدا کے بندوں پر ابتلاء کے آنے کا ذکر تھا۔ فرمایا:

ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے۔ بعض فتوحات کا مدار ابتلاؤں پر ہوتا ہے۔ کسی کی گریہ وزاری بعض دفعہ راہ کھول دیتی ہے۔ مثنوی میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک دفعہ کھانے کو نہ تھا۔ وہ بزرگ اور اس کے ساتھی سب بھوکے تھے۔ اتنے میں ایک لڑکا حلوہ بیچتا ہوا وہاں سے آ گذرا۔ اس بزرگ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اس سے حلوہ چھین لو۔ چنانچہ آدمیوں نے ایسا کیا اور وہ حلوہ بزرگ نے اور اس کے ساتھیوں نے کھا لیا۔ وہ لڑکا بہت رویا۔ اور چلّایا۔ آدمیوں نے سوال کیا کہ اس میں کیا حکمت تھی کہ بچہ کا حلوہ چھین لیا۔ فرمایا کہ یہی اس بچہ کی پونجی تھی۔ وُہ بہت درد کے ساتھ رویا ہے اور اس کا رونا موجب کشائش اور فتوح کا ہوا ہے جو ہماری دُعائیں نہیں ہو سکتی تھیں؛ چنانچہ اس بچہ کو اس کے حق سے بہت زیادہ دے کر راضی کیا گیا۔

اسی طرح بعض ابتلاء صرف اس واسطے آتے ہیں کہ انسان اس رُتبہ کو جلد حاصل کرے جو اُس کے واسطے مقدّر ہے۔

ذکر تھا کہ ۱۴ر اپریل گذر گئی ہے جس کے واسطے انگریز نے پیشگوئی زلزلہ کی کی تھی۔ اب لوگوں کو تسلّی ہو گئی۔ فرمایا:

لوگ منجّم پرست ہیں۔ خدا پرست نہیں ہیں

سُبْحَانَ اللّٰہ کے معنی ایک شخص نے اپنا خواب سُنایا کہ مَیں سُبْحَانَ اللّٰہ پڑھتا ہوں۔ فرمایا:

سُبْحَانَ اللّٰہ کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خلافِ وعدہ اور کذب اور دیگر تمام منقصتوں سے پاک ہے وُہ اپنے وعدوں کو سچا کرتا اور پیشگوئیوں کو پورا کرتا ہے[ـہ]

[ـہ] بدر جلد ۱ نمبر ، صفحہ ، مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۰۵ء

۱۶ رمئی ۱۹۰۵ء

فرمایا :

سورہ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ میں زلزلہ کے واسطے صاف پیشگوئی ہے کہ زمین پر سخت زلزلہ آئے گا۔ اور زمین اندر کی چیزیں باہر نکال پھینکے گی۔

پہاڑوں کی ساخت

فرمایا :

قرآن شریف میں آیا ہے کہ پہاڑ زمین کی میخیں ہیں۔ نادان اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے۔ اس زلزلہ نے اس اعتراض کو بھی صاف کیا ہے۔ ان آتش فشانیوں اور زلزلوں کا موجب یہ پہاڑ ہی ہوا کرتے ہیں جب پہاڑوں پر تباہی پڑتی ہے تو سب پر تباہی پڑتی ہے۔ پہاڑ امن پانے امن کا مرکز بنا ہوا ہے۔[1]

۱۷ رمئی ۱۹۰۵ء

معالج کے لئے ہدایت

ایک ڈاکٹر صاحب کا ذکر آیا کہ انہوں نے ایک بیماری کو خوفناک بتایا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تندرست ہے۔ فرمایا :

یہ لوگ ایسی غلطیاں کھاتے ہیں۔ ہمارے مسلمان اطبا۔ میں کیا عمدہ بات ہے کہ لکھا ہے کہ نبض دیکھنے سے پہلے طبیب یہ پڑھا کرے۔ سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (البقرة:۳۳) تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں سوا اس کے جو تو نے ہم کو سکھایا تحقیق تو علم اور حکمت والا ہے۔[2]

۲۴ رمئی ۱۹۰۵ء

ایک خادم نے عرض کی کہ مخالف حضور کی نسبت جھوٹی خبریں بیماری وغیرہ کی شائع کرتے رہتے

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۶ صفحہ ۷ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۵ء

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۶ صفحہ ۷ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۵ء

ہیں اور ہمیں سناتے ہیں۔ فرمایا :

مخالفین خواہ مخواہ ایسی بات کرتے ہیں جس سے تم کو اشتعال پیدا ہو اور لڑائی ہو جائے۔ ایسے فتنوں سے بچنا چاہیے اور صبر کرنا چاہیے۔ جو شخص کسی پر تہمت لگاتا ہے وہ مرتا نہیں جب تک کہ اس میں گرفتار نہ ہو جائے۔

ایک خادم نے عرض کی کہ تمام قسم کے دردوں کے واسطے عمدہ علاج ہے کہ بھُربھُری ریت ہو۔ اس پر الحمد لکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا :

یہ توجہ کی ایک قسم ہے مگر یاد رکھو کہ دُعا جیسی پاک صاف شرک سے خالی کوئی توجہ نہیں۔ دُوسری قسم کی توجہوں میں انسان کا بھروسہ اشیاء پر ہوتا ہے۔ جب قبلہ حقیقی کی طرف توجہ نہ ہو تو پھر بے فائدہ ہے۔

فرمایا :

انگریزی میں سونے کو گولڈ کہتے ہیں جس کے لکھنے میں انگریزی حروف ج۔ د۔ ل استعمال ہوتے ہیں۔ یہ عربی لفظ دجال کا مقلوب ہے۔ عربی میں دجال سونے کو کہتے ہیں۔

اس زمانہ کی سہولتیں ہماری خادم ہیں

اس زمانہ کے عجائبات کا تذکرہ تھا کہ ریل تار ڈاک وغیرہ کس قدر سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں فرمایا:

اسی واسطے ہم کو الہام ہوا۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّكَ سُهُوْلَةً کیا ہم نے تیرے ہر امر میں سہولت نہیں کر دی۔ حقیقت میں یہ اشیاء کسی کے لیے ایسی مفید نہیں ہوئیں جیسی کہ ہمارے واسطے ہوئی ہیں۔ ہمارا مقابلہ دین کا ہے اور ان اشیاء سے جو نفع ہم اُٹھاتے ہیں وہ دائمی رہنے والا ہے۔ لوگ بھی چھاپے خانوں سے فائدے اٹھاتے ہیں لیکن اُن کے اغراض دنیوی اور ناپائیدار ہیں۔ برخلاف اس کے ہمارے معاملات دینی ہیں۔ اس واسطے یہ چھاپے خانے جو اس زمانہ کے عجائبات ہیں دراصل ہمارے ہی خادم ہیں۔

ایک الہام

فرمایا :

آج رات یہ وحی ہوئی

اُرِيْدُ مَا تُرِيْدُوْنَ

مَیں ارادہ کرتا ہوں جو تم ارادہ کرتے ہو۔ چونکہ ہمارے ارادے دوستوں کے واسطے مشترک ہیں جن کے لیے ہم دُعائیں کرتے ہیں اس واسطے اس میں سب کے واسطے بشارت ہے۔ یہ وحی قبولیتِ دُعا کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی تمہارے ارادے کے موافق ہمارا ارادہ ہے۔

حضرت مولوی نورالدین صاحب نے عرض کی کہ یہ قرآنِ شریف کی اس وحی کے مطابق ہے کہ
أَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرۃ: ۱۱۶)

قبولیتِ دُعا کے اوقات

شیخ رحمت اللہ صاحب کو فرمایا کہ:

ہم آپ کے واسطے دُعا کرتے ہیں آپ بھی اس وقت دُعا کیا کریں۔ ایک تو رات کے تین بجے تہجد کے واسطے خوب وقت ہوتا ہے۔ کوئی کیسا ہی ہو تین بجے اُٹھنے میں اس کے لیے ہرج نہیں۔ اور دوسرا جب اچھی طرح سورج چمک اُٹھے تو اس وقت ہم بیت الدعا میں بیٹھتے ہیں۔ یہ دونوں وقت قبولیت کے ہیں۔ نماز میں تکلیف نہیں۔ سادگی کے ساتھ اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں دُعا کرے۔

صلوٰۃ اور دُعا میں فرق

فرمایا:

ایک مرتبہ مَیں نے خیال کیا کہ صلوٰۃ میں اور دُعا میں کیا فرق ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اَلصَّلٰوۃُ ھِیَ الدُّعَاءُ۔ اَلصَّلٰوۃُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ یعنی نماز ہی دُعا ہے۔ نماز عبادت کا مغز ہے۔ جب انسان کی دُعا محض دنیوی اُمور کے لیے ہو تو اس کا نام صلوٰۃ نہیں لیکن جب انسان خدا کو ملنا چاہتا ہے اور اس کی رضا کو مدِّنظر رکھتا ہے اور ادب انکسار تواضع اور نہایت محویت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر اس کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ تب وہ صلوٰۃ میں ہوتا ہے۔ اصل حقیقت دُعا کی وہ ہے جس کے ذریعہ سے خدا اور انسان کے درمیان رابطہ تعلق بڑھے۔ یہی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اور انسان کو نامعقول باتوں سے ہٹاتی ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ انسان رضائے الٰہی کو حاصل کرے۔ اس کے بعد روا ہے کہ انسان اپنی دنیوی ضروریات کے واسطے بھی دُعا کرے۔ یہ اس واسطے روا رکھا گیا ہے کہ دنیوی مشکلات بعض دفعہ دینی معاملات میں حارج ہو جاتے ہیں۔ خاص کر خامی اور کچ پنے کے زمانہ میں یہ امور ٹھوکر کا موجب بن جاتے ہیں۔ صلوٰۃ کا لفظ پُرسوز معنے پر دلالت کرتا ہے جیسے آگ سے سوزش پیدا ہوتی ہے۔ ویسی ہی گدازش دُعا میں پیدا ہونی

چاہیئے جب ایسی حالت کو پہنچ جائے جیسے موت کی حالت ہوتی ہے تب اس کا نام صلوٰۃ ہوتا ہے۔

نماز میں وساوس کی وجہ

ایک شخص نے سوال کیا کہ مجھے نماز میں وساوس اور اِدھر اُدھر کے خیالات بہت پیدا ہوتے ہیں۔ فرمایا :

اس کی اصل جڑ امن اور غفلت ہے۔ جب انسان خدا تعالیٰ کے عذاب سے غافل ہو کر امن میں ہو جاتا ہے تب وساوس ہوتے ہیں۔ دیکھو زلزلے کے وقت اور کشتی میں بیٹھ کر جب کشتی خوفناک مقام پر پہنچتی ہے۔ سب اللہ اللہ کرتے ہیں اور کسی کے دل میں وساوس پیدا نہیں ہوتے۔

مخالفین کا وجود بھی ضروری ہے

ذکر آیا کہ بعض جگہ مخالفین ہماری جماعت کے لوگوں کو بہت دُکھ دیتے ہیں اور بڑی بڑی ایذا رسانی کرتے ہیں۔ فرمایا :

خدا تعالیٰ کے آگے کسی کا نابود کرنا مشکل نہیں۔ لیکن جس کی طاقتیں بڑی ہوتی ہیں اس کا حوصلہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ لیکن ایسے آدمیوں کا وجود بھی ضروری ہے۔ اعداء کا وجود انبیاء کے واسطے بہت مفید ہوتا ہے۔ قرآن شریف کے جو تیس سیپارے ہیں۔ اس کے اکثر حصہ کے نزول کا سبب اعداء ہی ہوتے — اگر سب ابوبکرؓ کی طرح آمنّا وصدّقنا کہنے والے ہوتے تو چند آیتوں پر سلسلہ ختم ہو جاتا۔ درخت کے واسطے جیسے صاف پانی کی ضرورت ہے ویسے ہی کچھ کھاد کے لیئے گند کی بھی ضرورت ہے۔ بہت سی آسمانی سرگرمی انہی لوگوں کی شرارتوں پر منحصر ہے۔ کوئی بھی نبی نہیں جس کے اعداء نہیں ہوئے۔ نبی کے نفس کے واسطے یہ امر بہتر ہے کیونکہ اس طرح اس کی توجہ بڑھتی ہے اور معجزات تائید و نصرت زیادہ ہوتے ہیں اور جماعت کے واسطے بھی مفید ہے کہ وہ پکے ہو جاتے ہیں۔ خُدا کو دیر نہیں لگتی کہ لاکھوں کروڑوں کو ایک آن میں تباہ کر دے لیکن ضرورت کے سبب مخالفین کا وجود قائم رکھا جاتا ہے۔ جس شہر میں خاموشی سی ہو اس جگہ جماعت ترقی نہیں کپڑتی۔ خدا کی حکمتوں کو ہر ایک شخص نہیں پہچان سکتا[1]۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۸ صفحہ ۴ مورخہ ۲۵ ؍مئی ۱۹۰۵ء

* * *

۲۶ر مئی ۱۹۰۵ء

چند الہامات اور ایک رؤیا

فرمایا:

گھر میں طبیعت علیل تھی۔ بہت سردرد۔ بخار اور کھانسی بھی تھی۔ لوگوں کے لیے ابتلاء کا خوف ہوتا ہے۔ میں نے رات بہت دُعا کی (شیخ رحمت اللہ صاحب کو مخاطب کرکے) آپ کے لیے بھی دُعا کی تھی۔ پہلے تو ایک مشتبہ سا الہام ہوا معلوم نہیں کس کے متعلق ہے اور وہ یہ ہے: (۱) شَرُّ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ (ترجمہ) شرارت ان لوگوں کی جن پر تُو نے انعام کیا (۲) مَیں اُن کو سزا دُوں گا (۳) مَیں اس عورت کو سزا دُوں گا۔ معلوم نہیں یہ کس کے متعلق ہے۔ اس کے بعد گھر والوں کے متعلق یہ الہام ہوا:

رَدَّ اِلَیْهَا رَوْحُهَا وَرَیْحَانُهَا۔ اِنِّیْ رَدَدْتُ اِلَیْهَا رَوْحُهَا وَرَیْحَانُهَا

رؤیا:۔ اسی وقت جبکہ مذکورہ بالا الہام ہوا۔ دیکھا کہ کسی نے کہا کہ آئندہ زلزلہ کی یہ نشانی ہے۔ جب مَیں نے نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ اس ہمارے خیمہ کے سر پر سے جو باغ کے قریب نصب کیا ہوا ہے ایک چیز گری ہے۔ خیمہ کی چوب کا اُوپر کا سِرا وہ چیز ہے[1]۔ جب مَیں نے اُٹھایا تو وہ ایک لونگ ہے جو عورتوں کے ناک میں ڈالنے کا ایک زیور ہے۔ اور ایک کاغذ کے اندر لپٹا ہوا ہے۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ یہ ہمارے ہی گھر کا مدت سے کھویا ہوا تھا اور اب مِلا ہے اور زمین کی بلندی سے ملا ہے اور یہی نشانی زلزلہ کی ہے[2]۔

آج کی تازہ وحی رَدَّ اِلَیْهَا رَوْحُهَا وَرَیْحَانُهَا کا ذکر تھا فرمایا:

اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ تمام سماوی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی امر کے ضرور آئندہ پورا ہو جانے کے متعلق کسی پیشگوئی کو ظاہر فرماتے وقت ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے مثلاً قرآنِ شریف میں آیا ہے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ (اللھب: ۲) ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور خود بھی ہلاک ہو گیا۔ یہ وحی الٰہی بطور پیشگوئی کے ایسے وقت میں نازل ہوئی تھی جبکہ ابولہب

---

[1] نقل مطابق اصل (مرتّب)

[2] ۲۶ر مئی یہاں تک کی ڈائری جو صبح کے وقت کی معلوم ہوتی ہے بدر جلد ۱ نمبر ۸ صفحہ ۲ پر درج ہے۔ اس کے بعد کی ڈائری جو صفحہ ۴ پر درج ہے شام کی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (مرتّب)

چنگا بھلا پھرتا تھا لیکن آسمان پر اس کے لیے ہلاکت کا حکم ہو چکا تھا۔ اس واسطے یہ بات ایسے طور پر بیان کی گئی کہ یہ کام ہو چکا ہے۔ پہلے ایک معاملہ آسمان پر ہو جاتا ہے اور پھر زمین پر اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہمارا الہام عَفَتِ الدِّیَارُ والا تھا یعنی مٹ گئے گھر۔ اگرچہ گیارہ ماہ پہلے یہ زلزلہ کی پیشگوئی تھی؛ تاہم چونکہ آسمان پر یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ زلزلہ ضرور آئے گا اس واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مکانات عارضی اور مستقل سب گر گئے اور نشان مٹ گئے۔ جو لوگ مثلاً پیسہ اخبار کے نامہ نگار وغیرہ اعتراض کرتے ہیں وہ اس محاورہ سے ناواقف اور جاہل ہیں یا جان بوجھ کر تعصب کے ساتھ ضد کرتے ہیں) ورنہ یہ محاورہ سب زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ آتھم کے متعلق جب ہم نے پیشگوئی کی تھی تو اس نے اسی مجلس میں کہا تھا کہ میں تو مر گیا۔ باوجود عیسائی ہونے کے وہ ادب کا بہت لحاظ رکھتا تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ ڈرتا رہا اور میعاد کے اندر مرنے سے بچ گیا۔ ابولہب کے متعلق صاف پیشگوئی مکہ میں کی گئی تھی کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ حالانکہ وہ جنگ بدر کے بعد طاعون سے مرا تھا۔

فرمایا :

روح و ریحان سے مراد ہر قسم کی آسائش اور آسودگی ہوتی ہے۔[1]

مبارک مُنہ کے مبارک الفاظ معنًا

(مرقومہ شیخ عبدالرحیم صاحب)

بوقت ۹[2] بجے آپ باہر تشریف لائے۔ شیخ رحمت اللہ صاحب نو وارد اور مولوی صاحبان اور دیگر احباب مجلس موجود تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں آپ نے فرمایا کہ :

ہم خُدا کے مرسلین اور مامورین کبھی بزدل نہیں ہوا کرتے بلکہ سچے مومن بھی بزدل نہیں ہوتے۔ بزدلی ایمان کی کمزوری کی نشانی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پر مصیبتوں نے بار بار حملے کئے مگر انہوں نے کبھی بُزدلی نہیں دکھائی۔ خُدا تعالیٰ اُن کی نسبت فرماتا ہے۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (الاحزاب ۲۴) یعنی جس ایمان پر انہوں نے کمرِ ہمت باندھی تھی اس کو بعض نے تو نبھا دیا اور بعض منتظر ہیں کہ کب موقعہ ملے اور

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۸ صفحہ ۴ مورخہ ۲۵* مئی ۱۹۰۵ء ۔ (* معلوم ہوتا ہے یہ پرچہ ۲۸ مئی کے بعد شائع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۶ تا ۲۸ مئی کی ڈائری اس میں چھپی ہے۔ (مرتب)

[2] اس ڈائری پر تاریخ نہیں لکھی۔ اندازاً ۲۴ تا ۲۶ مئی ۱۹۰۵ء کی معلوم ہوتی ہے۔ ان دنوں میں شیخ رحمت اللہ صاحب قادیان میں موجود تھے۔ (مرتب)

سرخرو نکلے اور انہوں نے کبھی کم ہمتی اور بُزدلی نہیں دکھائی۔

سب سے بڑھ کر راحت دُعا کے متعلق آپ نے فرمایا کہ :

اِدھر کی جاتی ہے اور اُدھر جواب ملتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہو سکتی ہے اور یہی مابہ الامتیاز امر ہوتا ہے جو مامورین اور دُوسروں میں رکھ دیا جاتا ہے۔

استجابتِ دُعا کا ایک وقت ہوتا ہے فرمایا :

شیخ صاحب مَیں آپ کے لیے پانچ وقت دُعا کرتا ہوں لیکن استجابت کا ایک وقت ہوتا ہے انسان کو بعض وقت ایک ہی سمت مقصود ہوتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ مومن کے لیے دُنیا اور آخرت میں سنوار چاہتا ہے۔ اس لیے بعض وقت ابتلا آجاتے ہیں جو بالآخر بابرکت ہوتے ہیں۔ بعض انسانی کمزوریوں کا علاج یہ مصائب ہوتے ہیں۔ انسان میں بیشک بعض کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں جن کو یہ سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن میری دُعائیں ایسی ہوتی ہیں کہ محلِ قبولیت تک پہنچتی ہیں۔ وقت شرط ہے۔

پھر ایک طرف مخاطب ہو کر فرمایا :

مَیں آپ کے لیے دُعا کرتا ہوں لیکن کل کے امر میں مَیں نے خیال کیا تو مَیں نے سمجھا کہ شاید یہی امور میری دُعا کی استجابت میں مانع ہوں مگر آپ کے لکھنے پر مجھے اصل واقعہ کی حقیقت معلوم ہوئی۔ دُعا کی قبولیت میں تاخیر ڈالنے والے یا دُعا کے ثمرات سے محروم کرنے والے بعض مکروہات ہوتے ہیں جن سے انسان کو بچنا لازم ہے۔

مصائب دُنیا میں آکر آخرت میں موجبِ مدارج ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ثواب ملتا دیکھ کر بعض لوگ کہیں گے کہ کاش ہمارے وجود بھی قینچیوں سے کاٹے جاتے اور ہم بھی یہ معاوضے حاصل کرتے۔ سب سے بڑھ کر مصائب انبیاء پر آتے ہیں۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو زندگی میں کیا کیا تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ غرضیکہ گھبرانا نہیں چاہیے۔

اپنے الہامات پر یقینِ کامل ہمیں زلزلے کے متعلق پورا اطمینان ہے۔ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ

دَنیعَنّ اللّٰہ رَمی ہمارے اشتہارات کے شائع ہونے کے بعد الہام ہوا ہے۔ جس سے خُدا تعالیٰ کا ارادہ قطعی ثابت ہوتا ہے۔ ہم نے جو کچھ اخراجات ہزاروں تک خیمے وغیرہ منگوا کر کئے ہیں۔ وہ دھوکے کی بنا پر نہیں کئے۔ ہمیں خدا کی باتوں پر ایمان ہے۔ تاریخ کا مقرر نہ ہونا یا وقت کی کمی بیشی پیشگوئی کے ظاہر ہونے کی وقعت میں کچھ کمی نہیں ڈال سکتے۔ قرآن شریف اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (الانبیاء : ۱۱۰) (میں نہیں جانتا کہ عذاب کے نزول کا وقت قریب ہے یا بعید) صاف بتاتا ہے کہ ہر ایک عذاب کی مقررہ تاریخ نہیں بتائی جاتی۔[1]

---

۲۷ مئی ۱۹۰۵ء

ایک جلیل القدر الہام

عَبْدُ الْقَادِرِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ۔ اَدْرِیْ رِضْوَانَہٗ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

پہلی وحی کے متعلق فرمایا کہ :

خُدا اپنی کچھ قدرتیں میرے واسطے ظاہر کرنے والا ہے۔ اس واسطے میرا نام عبد القادر رکھا۔ رضوان کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ کوئی فعل دنیا میں خدا کی طرف سے ایسا ظاہر ہونے والا ہے جس سے ثابت ہو جائے اور دُنیا پر روشن ہو جائے کہ خُدا مجھ پر راضی ہے۔ دُنیا میں بھی جب بادشاہ کسی پر راضی ہوتا ہے، تو فعلی رنگ میں بھی اس کی رضامندی کا کچھ اظہار ہوتا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی رضا پر دلالت کرنے والے افعال دیکھتا ہوں۔ مومن کو اللہ تعالیٰ کی رضا بہت پیاری ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ مومنین جب بہشت میں داخل کئے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اب مانگو جو کچھ مانگنا چاہتے ہو تو وہ عرض کریں گے کہ اے رب تو ہم پر راضی ہو جا۔ جواب ملے گا۔ اگر میں راضی نہ ہوتا تو تم کو بہشت میں کس طرح داخل کرتا۔[2]

---

۲۸ مئی ۱۹۰۵ء

ایک رؤیا شیخ رحمت اللہ صاحب کی ایک گھڑی میرے پاس ہے اور ایک ایسی چیز جیسے ترازو

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۸ صفحہ ۶ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء

کے دو پڑے ہوتے ہیں مثل چھوہروں کی ہنگی کے۔ میں ایک ڈولی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ پھر کسی نے میاں شریف احمد کو اس میں بٹھا دیا اور اس کو چکر دینا شروع کیا۔ اتنے میں گھڑی گر گئی اور اس جگہ قریب ہی گری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کو تلاش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ محمد حسین نالش کر دے۔

فرمایا کہ :-

خیال گذرتا ہے کہ شاید گھڑی سے مراد وہ ساعت ہے جو زلزلہ کی ساعت ہے جو معلوم نہیں۔ واللہ اعلم۔ اور وہ رحمت کی ساعت ہے یعنی یہ ساعت ہمارے واسطے رحمتِ الٰہی کا موجب ہوگی۔[1]

بلا تاریخ[2]

القول الطیب

خدمتِ والدین

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کی والدہ یہاں آئی ہوئی ہیں۔ اُنہوں نے اپنی والدہ کی پیری اور ضعف کا اور اُن کی خدمت کا جو وہ کرتے ہیں ذکر کیا۔ حضرت نے فرمایا :-

والدین کی خدمت ایک بڑا بھاری عمل ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ دو آدمی بڑے بدقسمت ہیں۔ ایک وُہ جس نے رمضان پایا اور رمضان گذر گیا پر اس کے گناہ نہ بخشے گئے اور دُوسرا وہ جس نے والدین کو پایا اور والدین گذر گئے اور اس کے گناہ بخشے نہ گئے۔ والدین کے سایہ میں جب بچہ ہوتا ہے تو اس کے تمام ہم و غم والدین اُٹھاتے ہیں۔ جب انسان خود دینوی اُمور میں پڑتا ہے تب انسان کو والدین کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآنِ شریف میں والدہ کو مقدم رکھا ہے، کیونکہ والدہ بچہ کے واسطے بہت دُکھ اُٹھاتی ہے۔ کیسی ہی متعدی بیماری بچہ کو ہو۔ چیچک ہو، ہیضہ ہو، طاعون ہو۔ ماں اس کو چھوڑ نہیں سکتی۔

ہماری لڑکی کو ایک دفعہ ہیضہ ہو گیا تھا ہمارے گھر سے اس کی تمام قے وغیرہ اپنے ہاتھ پر لیتی تھیں۔ ماں سب تکالیف میں بچہ کی شریک ہوتی ہے۔ یہ طبعی محبت ہے جس کے ساتھ کوئی دُوسری محبت مقابلہ نہیں کر

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۲۵ رمئی ۱۹۰۵ء

[2] القول الطیب کے زیرِ عنوان ڈائری پر گو کوئی تاریخ درج نہیں لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ یہ مئی کے آخری ایام یعنی ۲۷ تا ۳۱ رمئی ۱۹۰۵ء تک کے ملفوظات ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (خاکسار مرتب)

سکتی۔ خدا تعالیٰ نے اسی کی طرف قرآنِ شریف میں اشارہ کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل : ۹۱)۔

اخلاق کی انتہا۔

ادنیٰ درجہ عدل کا ہوتا ہے۔ جتنا لے اتنا دے۔ اس سے ترقی کرے تو احسان کا درجہ ہے جتنا لے وہ بھی دے اور اس سے بڑھ کر بھی دے۔ پھر اس سے بڑھ کر ایتاء ذی القربیٰ کا درجہ ہے یعنی دُوسروں کے ساتھ اس طرح نیکی کرے جس طرح ماں بچہ کے ساتھ بغیر نیّت کسی معاوضہ کے طبعی طور پر محبّت کرتی ہے۔ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ ترقی کر کے ایسی محبت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ انسان کا ظرف چھوٹا نہیں۔ خُدا کے فضل سے یہ باتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ بلکہ یہ وسعتِ اخلاق کے لوازمات میں سے ہے۔ مَیں تو قائل ہوں کہ اہل اللہ یہاں تک ترقی کرتے ہیں کہ مادری محبت کے اندازہ سے بھی بڑھ کر انسان کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

ایک بڑھیا کا ذکر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے روز بغیر اس کے کہ اس کو کسی نے خبر دی ہو خود بخود کہنے لگی کہ آج ابوبکرؓ مر گیا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ تجھ کو کس طرح سے معلوم ہوا۔ اس نے کہا کہ ہر روز مجھ کو آپ حلوہ کھلایا کرتے تھے اور وہ وعدہ میں تخلّف کرنے والے ہرگز نہ تھے چونکہ آج وہ حلوہ کھلانے نہیں آئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوت ہو گئے ہیں؛ ورنہ وہ ضرور مجھے حلوہ کھلانے آج بھی آتے۔ دیکھو۔ اخلاقی حالت کہاں تک وسعت کر سکتی ہے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ ان اخلاق پر دوسرے لوگ قادر نہیں ہو سکتے۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مجرم پکڑا ہوا آیا تو وہ آپ ہی رُعب سے کانپتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ تُو کیوں اتنا ڈرتا ہے مَیں تو ایک بڑھیا کا بیٹا ہوں۔ معمولی انسانوں کے یہ اخلاق نہیں ہوتے۔ عرب کی قوم کئی پُشتوں تک کینہ رکھنے والی تھی۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن پر غلبہ پایا تو باوجود اس قدر دُکھوں کے جو اُن سے اٹھائے تھے سب کو معاف کر دیا۔ دنیوی حکومت رحم نہیں کر سکتی۔ انگریزوں نے باغیوں کو کس طرح پھانسی دیا اور قتل کیا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب باغیوں کو یکدفعہ معاف کر دیا۔ کسی نبی کو ایسی پوری کامیابی نہیں ہوئی جیسی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ اپنے وعدہ کی زمین تک نہ پہنچ سکے اور راستہ میں ہی فوت ہو گئے اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ اے موسیٰ تُو اور تیرا خُدا مل کر مخالفوں سے جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا کہ ہم تیرے ساتھ چلیں گے؛ اگرچہ سمندر میں گریں اور قتل کئے جائیں۔

قاعدہ ہے کہ نبی کا پَرتَو اُمّت پر بھی پڑتا ہے۔ جب اُستاد کامل ہوتا ہے ایسے ہی شاگرد بھی بنتے ہیں۔ جیسے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت، افعال و اعمال اور کامیابی کی نظیر نہیں ویسے ہی صحابہؓ کی بھی نظیر

نہیں۔ صحابہؓ باوجود قلیل ہونے کے جدھر جاتے فتح پاتے۔ صحابہؓ ایسے تھے جیسے کسی برتن کو دھو کر بالکل صاف ستھرا کر دیا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی آلائش کا شائبہ نہیں رہتا۔ ان کی ایسی محنت اور اخلاص تھا تو خدا تعالیٰ نے پھر بدلہ بھی ایسا دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرتؐ کا خلیفہ بنایا۔

شیعوں کی غلطی

اس جگہ شیعوں نے بڑی غلطی کھائی ہے کہ خلافت کا حق حضرت علیؓ کو تھا۔ بدقسمت نہیں دیکھتے کہ خدا تعالیٰ نے کیا فیصلہ کیا جو وقت وعدوں کے پورا ہونے کا تھا۔ اس وقت خُدا نے ایک منافق اور اہلِ بیت کے دشمن کو کیوں گدی پر بٹھا دیا۔ میں جانتا ہوں کہ اس قوم نے بھی عیسائیوں کی طرح ایک غلو کیا ہے اور اس غلو کا باعث اصلی نامرادی ہے جو ابتدا میں حاصل ہوئی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ یسوع کو ظاہری بادشاہت حاصل ہوگی ان کو جب اس معاملہ میں ناکامی حاصل ہوئی تو انہوں نے یسوع کی صفت میں غلو کر کے یسوع کو خدا ہی بنا دیا ایسا ہی قومِ شیعہ بھی حضرت علیؓ کو وہ درجہ دیتے ہیں جو خدا نے نہ چاہا کہ اُن کو دے۔ خدا تعالیٰ کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ اس کے دل کی حالت کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر اُن کے پاس نورِ ایمان ہوتا تو ایسی بات نہ بولتے۔ کیا اس وقت خُدا کمزور تھا اور وہ بدلہ لے نہ سکتا تھا یا خدا پالیسی باز تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو طاقتور دیکھ کر خاموش رہا۔[1]

۳؍جون ۱۹۰۵ء

بچوں کی وفات پر صبر کی تلقین

عاجز[2] راقم کی لڑکی سعیدہ بیگم بعمر تین سال آٹھ ماہ بعارضہ ام الصبیان فوت ہوئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے معہ جماعت باغ میں جنازہ پڑھا اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا:

اولاد جو پہلے مرتی ہے وُہ فرط ہوتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تھی کہ جس کی کوئی اولاد نہیں مرتی وہ کیا کرے گا؟ فرمایا میں اپنی اُمّت کا فرط ہوں۔ فرمایا:

آپ صبر کریں۔ اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس کے عوض میں لڑکا دے گا۔ صبر تو خواہ مخواہ ہی کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیوں

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۹ صفحہ ۲ مورخہ یکم جون ۱۹۰۵ء

[2] حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ (مرتب)

کے معاملات بھی مشکل ہوتے ہیں۔ اَلْخَیْرُ فِیْ مَا وَقَعَ۔

اِنْشَاءَ اللہ کہنے کا مقصد فرمایا :

نفسِ انشاء اللہ تعالیٰ کہنے میں انسان اپنی کمزوری کا اظہار کرتا ہے کہ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کام کروں لیکن خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو امید ہے کہ کر سکوں گا۔

ایمان کی جڑ نماز ہے فرمایا :

جس طرح بہت دھوپ کے ساتھ آسمان پر بادل جمع ہو جاتے ہیں اور بارش کا وقت آجاتا ہے۔ ایسا ہی انسان کی دُعائیں ایک حرارتِ ایمانی پیدا کرتی ہیں اور پھر کام بن جاتا ہے۔ نماز وہ ہے جس میں سوزش اور گدازش کے ساتھ اور آداب کے ساتھ انسان خدا کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے۔ جب انسان بندہ ہو کر لاپرواہی کرتا ہے تو خُدا کی ذات بھی غنی ہے۔ ہر ایک اُمت اس وقت تک قائم رہتی ہے جبتک اس میں توجہ الی اللہ قائم رہتی ہے۔ ایمان کی جڑ بھی نماز ہے۔ بعض بیوقوف کہتے ہیں کہ خُدا کو ہماری نمازوں کی کیا حاجت ہے۔ اے نادانو! خدا کو حاجت نہیں مگر تم کو تو حاجت ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری طرف توجہ کرے۔ خدا کی توجہ سے بگڑے ہوئے کام سب دُرست ہو جاتے ہیں۔ نماز ہزاروں خطاؤں کو دُور کر دیتی ہے اور ذریعہ حصولِ قربِ الٰہی ہے۔

مسیح موعود کے دو بازو فرمایا :

یہ اخبار (الحکم و بدر) ہمارے دو بازو ہیں۔ الہامات کو فوراً ملکوں میں شائع کرتے ہیں اور گواہ بنتے ہیں۔

روزہ اور نماز فرمایا

روزہ اور نماز ہر دو عبادتیں ہیں۔ روزے کا زور جسم پر ہے اور نماز کا زور رُوح پر ہے۔ نماز سے ایک

سوز وگداز پیدا ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ افضل ہے۔ روزے سے کشوف پیدا ہوتے ہیں مگر یہ کیفیت بعض دفعہ جوگیوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن روحانی گدازش جو دعاؤں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شامل نہیں۔[1]

۱۱؍ جون ۱۹۰۵ء

زلزلہ کی پیشگوئی کے متعلق بعض اعتراضات کے جوابات

فرمایا :

ایک شخص نے اعتراض کیا ہے کہ زلزلے کے واسطے جب تک تاریخ نہ ہو تب تک یہ پیشگوئی کچھ نہیں۔

فرمایا :

اس کا یہ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بَغْتَةً یعنی یہ واقعہ اچانک ہونیوالا ہے جبکہ کسی کو بھی خبر نہ ہوگی۔ اس واسطے اب تاریخ کا سوال بے فائدہ ہے اللہ تعالیٰ اگر تاریخ بتلا دے تو یہ امر پہلے الہام کے مخالف ہوگا۔

علاوہ اس کے خدا چاہتا ہے کہ نیکوں کو بچائے اور بدوں کو ہلاک کرے اگر وقت اور تاریخ بتلائی جائے تو ہر ایک شریر سے شریر اپنے واسطے بچاؤ کا سامان کر سکتا ہے۔ اگر وقت کے نہ بتلانے سے پیشگوئی قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے، تو پھر تو قرآنِ شریف کی پیشگوئیوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی اس قسم کے لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ (یونس : ۴۹) یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔ ہمیں وقت اور تاریخ بتلاؤ۔ مگر بات یہ ہے کہ وعید کی پیشگوئیوں میں تعیّن نہیں ہوتا؛ ورنہ کافر بھی بھاگ کر بچ جاتے۔

فرمایا :

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حوادث اور زلزلے تو آیا ہی کرتے ہیں پھر یہ پیشگوئی کیا ہوئی۔ قیامت تک زلزلہ اور حادثہ تو کوئی نہ کوئی آتے ہی گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس پیشگوئی میں صریح الفاظ ہیں کہ یہ امر ہماری تائید میں اور ہماری زندگی میں ہونے والا ہے جس کو اس زمانہ کے لوگ دیکھیں گے اور پھر تخصیص یہ ہے کہ یہ حادثہ ایسا سخت ہوگا جس کو نہ کسی نے پہلے دیکھا نہ سنا۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۰ صفحہ ۲ مورخہ ۸؍ جون ۱۹۰۵ء

فرمایا :

ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ عَفَتِ الدِّیَارُ مَحَلُّهَا وَ مُقَامُهَا ایک کافر کا شعر ہے جو آپ کو الہام ہوا۔ تو پھر یہ معجزہ کس طرح ہوا ؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو خود قرآن شریف کی آیات مثلاً فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (المومنون: ۱۵) قبل وحیِ قرآن کے دوسروں کے منہ پر یہ الفاظ جاری تھے، چنانچہ یہی بات اُن بدبختوں کے واسطے موجب ارتداد ہوئی۔ دوم یہ الفاظ جس شاعر کے ہیں وہ کافر نہ تھا بلکہ مسلمان ہوگیا تھا۔ سوم۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ الفاظ جب تک ایک شاعر کے شعر کے طور پر تھے تب تک اُن میں کوئی معجزہ نہ تھا لیکن جب خدا نے اپنی وحی کے لیے اُن کو استعمال فرمایا تب یہ معجزہ بن گئے۔ پہلے تو یہ ایک گذشتہ قصہ تھا مگر اب کلامِ الٰہی اور ایک پیشگوئی اور معجزہ بن گیا۔

فرمایا :

کتاب براہینِ احمدیہ حصہ پنجم میں میں کچھ اشعار لکھ رہا تھا اور گھر سے قریب ہی سوئے ہوئے تھے کہ اچانک وہ اُٹھے اور ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے ؎

صوفیا سب ہیچ ہے تیری طرح تیری تراہ

ہم نے اس الہامی مصرعہ کو بھی ان اشعار کے درمیان درج کر دیا ہے۔

تثلیث کسی نے ذکر کیا کہ عیسائیوں نے تثلیث پر چند نئے رسالے لکھے ہیں اور اب تثلیث کا نام ثالوث رکھا ہے۔ فرمایا :

یہ زمانہ ہی ان کے ثالوث کا فیصلہ کر جائے گا۔

تبرکات کچھ تبرکات کا ذکر تھا۔ فرمایا :

تبرکات کا ہونا مسلمانوں کے آثار میں پایا جاتا ہے۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر کے بال ایک شخص کو دیئے تھے۔ ہمیں الہام ہوا ہے کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔[1]

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۰ صفحہ ۲ مورخہ ۸ رجون ۱۹۰۵ء

۱۳ر جون ۱۹۰۵ء

صالح اولاد کی خواہش کرنا چاہیے

قاضی غلام حسین صاحب وٹرنری اسسٹنٹ حصار حاضرِ خدمت ہوئے۔ چند روز ہوتے قاضی صاحب کا لڑکا چند روز کی عمر پاکر فوت ہو چکا ہے۔ اس پر فرمایا :

جو بچہ مر جاتا ہے وہ فرط ہے۔ انسان کو عاقبت کے لیے بھی کچھ ذخیرہ چاہیے۔ میں لوگوں کی خواہشِ اولاد پر تعجب کیا کرتا ہوں۔ کون جانتا ہے اولاد کیسی ہوگی۔ اگر صالح ہو تو انسان کو دُنیا میں کچھ فائدہ دے سکتی ہے اور پھر مستجاب الدعوات ہو تو عاقبت میں بھی فائدہ دے سکتی ہے۔ اکثر لوگ تو سوچتے ہی نہیں کہ اُن کو اولاد کی خواہش کیوں ہے اور جو سوچتے ہیں وہ اپنی خواہش کو بیانتک محدود رکھتے ہیں کہ ہمارے مال و دولت کا وارث ہو اور دُنیا میں بڑا آدمی بن جاوے۔ اولاد کی خواہش صرف اس نیت سے درست ہو سکتی ہے کہ کوئی ولدِ صالح پیدا ہو جو بندگانِ خدا میں سے ہو لیکن جو لوگ آپ ہی دُنیا میں غرق ہوں وہ ایسی نیت کہاں سے پیدا کر سکتے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ خدا سے فضل مانگتا رہے تو اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے۔ نیت صحیح پیدا کرنی چاہیے ورنہ اولاد ہی عبث ہے۔ دُنیا میں ایک بے معنی رسم چلی آتی ہے کہ لوگ اولاد مانگتے ہیں اور پھر اولاد سے دُکھ اُٹھاتے ہیں۔ دیکھو حضرت نوحؑ کا لڑکا تھا کس کام آیا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان جو اس قدر مرادیں مدِ نظر رکھتا ہے اگر اس کی حالت اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہو تو خدا اس کی مرادوں کو خود پوری کر دیتا ہے اور جو کام مرضیٔ الٰہی کے مطابق نہ ہوں ان میں انسان کو چاہیے کہ خود خدا کے ساتھ موافقت کرے۔

شافی مطلق

ایک بیمار اور اس کے علاج کا ذکر تھا۔ فرمایا :

ہر ایک مرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلط ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ مرض ہٹ جاتا ہے۔

ایمانداری

ایک مد کے متعلق فنڈ کا تذکرہ تھا۔ فرمایا :

خدا تعالیٰ سمیع و علیم ہے۔ اس سے دُعا کرتے رہو۔ خدا تعالیٰ برکت دیگا۔ اس رمز کا سمجھنا ایمانداری ہے۔[1]

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۱ صفحہ ۲ مورخہ ۱۵ر جون ۱۹۰۵ء

۱۴ر جون ۱۹۰۵ء

خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں سب کچھ ہے

ایک شخص بیمار ملنے کے واسطے آیا۔ اس کے معالجہ کا ذکر تھا۔ فرمایا:

خدا تعالیٰ کے نزدیک کوئی بات اَنہونی نہیں ہے۔ میر صاحب کا لڑکا محمد اسحاق سخت بیمار ہوا۔ ڈاکٹر نے مایوسی ظاہر کی ہم نے دُعا کی۔ الہام ہوا:

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ

یہ خدا کا رحم ہے کوئی بھی اس سے دُور نہیں۔ دُنیا سرائے فانی ہے اور معمولی موت فوت لگی ہوئی ہے۔ خدا اس کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن جہاں کوئی پیچ پڑ جاتا ہے اور دین پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہاں تو خدا تعالیٰ اپنا قانون بھی بدل دیتا ہے اور معجزہ نمائی کرتا ہے۔ یوں تو مرنا کوئی حرج یا دُکھ کی بات نہیں جن کو ہم کہتے ہیں کہ مر گیا ہے وہ دُوسرے جہان میں چلا جاتا ہے۔ اور وہ جہان نیک آدمیوں کے لیے بہت عمدہ ہے مگر جہاں کوئی اعتراض دین کے لیے مزاحم ہوتا ہے وہاں خدا تعالیٰ عجائبات ظاہر کرتا ہے۔ دنیوی حکام بھی ایسا کرتے ہیں کہ کسی اہم ملکی ضرورت کے وقت قانون کی بھی پروا نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ اس نے دو گھر بنائے ہیں۔ اِدھر سے اُٹھا کر اُدھر آباد کر دیتا ہے۔

ھُوَ الشَّافِیْ

طب اور معالجات کا تذکرہ تھا۔ فرمایا:

یہ سب ظنّی باتیں ہیں۔ علاج وہی ہے جو خدا تعالیٰ اندر ہی اندر کر دیتا ہے جو ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ علاج یقینی ہے وہ اپنے مرتبہ اور حیثیت سے آگے بڑھ کر قدم رکھتا ہے۔ بقراط نے لکھا ہے کہ میرے پاس ایک دفعہ ایک بیمار آیا۔ میں نے بعد دیکھنے حالات کے حکم لگایا کہ یہ ایک ہفتہ کے بعد مر جائے گا۔ تیس سال کے بعد میں نے اس کو زندہ پایا۔

بعض ادویہ کو بعض طبائع کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ اسی بیماری میں ایک کے واسطے ایک دوا مفید پڑتی ہے اور دُوسرے کے واسطے ضرر رساں ہوتی ہے۔ جب بڑے دن ہوں تو مرض سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اگر مرض سمجھ میں آ جائے تو پھر علاج نہیں سوجھتا۔ اسی واسطے مسلمان جب ان علوم کے وارث ہوئے تو انہوں نے ہر اَمر میں ایک بات بڑھائی۔ نبض دیکھنے کے وقت سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (البقرۃ : ۳۳) کہنا شروع

کیا اور نسخہ لکھنے کے وقت ھُوَ الشَّافِی لکھنا شروع کیا۔

اسلام کی بے مثال تائید

حضرت کی خدمت میں مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے نے پالم پور کے ایک انگریز کا خط پڑھ کر سُنایا جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اسلام کے ساتھ دل چسپی ہے اور آپ کے رسالہ میں جیسی اسلام کی تائید ہے ایسی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔[1]

۱۷؍جون ۱۹۰۵ء

کشفِ صحیح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہو سکتی ہے

ذکر آیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ مَیں بھی تابعین میں سے ہوں کیونکہ ایک جن نے زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پایا تھا مَیں نے اس سے ملاقات کی۔ فرمایا:

اس سے بہتر کشفِ صحیح ہے جو بیداری کا حکم رکھتا ہے جو لوگ بذریعہ کشفِ صحیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل کرتے ہیں وُہ اصحاب میں سے ہیں۔[2]

۲۶؍جون ۱۹۰۵ء

ہمارا دارومدار خدا تعالیٰ کے حکم پر ہے

ایک دوست[3] نے تحریک کی کہ جاپان میں تہذیب کی بہت ترقی ہوئی ہے اور عیسائی لوگ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ تمام جاپانی عیسائی ہو جائیں۔ آریوں نے بھی لاہور میں جاپانی زبان سیکھنے کے واسطے

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۱ صفحہ ۲ مورخہ ۱۵؍جون ۱۹۰۵ء ۔ [2] بدر جلد ۱ نمبر ۱۱ صفحہ ۲ مورخہ ۱۵؍جون ۱۹۰۵ء*

* معلوم ہوتا ہے بدر کا یہ نمبر جس پر ۱۵؍جون ۱۹۰۵ء کی تاریخ درج ہے، ۱۷؍جون ۱۹۰۵ء کے بعد شائع ہوا ہے۔ کیونکہ ۱۷؍جون کی ڈائری اس میں درج ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۔ (مرتب)

[3] الحکم نے لکھا ہے کہ خواجہ کمال الدین صاحب وکیل نے یہ ذکر کیا تھا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۲ صفحہ ۱۰) (مرتب)

ایک مدرسہ قائم کیا ہے اور جاپان میں کئی آدمی بھیجے ہیں۔ اگر مناسب ہو تو سلسلہ حقہ کی اس ملک میں اشاعت کے واسطے تجویز کی جائے۔ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ہر نبی اور رسول کا آخری زمانہ اس کے سلسلہ کی نصرت کا وقت ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کا پہلا بہت سا حصہ مصائب اور تکالیف میں گذرا تھا اور فتوحات اور نصرت کا زمانہ آپ کی عمر کا آخری حصہ ہی تھا۔ ہم بھی اپنی عمر کا بہت سا حصہ طے کر چکے ہیں۔ اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اب خدا کے وعدوں کے پورا ہونے کے دن ہیں۔ ہماری حالت وہ ہے کہ عدالت میں مدت سے کسی کا مقدمہ پیش ہے اور اب فیصلہ کے دن قریب ہیں۔ ہمیں مناسب نہیں کہ اور طرف توجہ کر کے اس فیصلہ میں گڑبڑ ڈال دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس فیصلہ کو دیکھ لیں۔ اس ملک میں جو جماعت تیار ہوئی ہے ابھی تک وہ بھی بہت کمزور ہے۔ بعض ذرا سے ابتلا سے ڈر جاتے ہیں اور لوگوں کے سامنے انکار کر دیتے ہیں اور پھر بعد میں ہم کو خط لکھتے ہیں کہ ہمارا انکار دلی نہیں ہے۔ گو ایسے لوگ اس آیت کی ذیل میں آجاتے ہیں۔ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (النحل : ۱۰۷) تاہم جن کے دلوں میں حلاوتِ ایمانی پورے طور سے بیٹھ جائے وہ ایسا فعل نہیں کر سکتے۔ فی الحال موجودہ معاملات میں ہی توجہ اور دعا کی بہت ضرورت ہے اور ہم خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ اب معاملہ دور ہو جانے والا نہیں۔ ایسے معاملات میں آریوں کے ساتھ ہماری کوئی مناسبت نہیں ہو سکتی۔ وہ قوم کو بڑھانا چاہتے ہیں اور ہم دنیا میں تقویٰ اور نیکی کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم آریوں کی نقل کرنا چاہیں تو ان کی پیروی ہمارے لیے منحوس ہوگی۔ اور ہم کو وحی کرنے والے گویا دہی ٹھہریں گے۔ اگر خدا تعالیٰ جاپانی قوم میں کسی تحریک کی ضرورت سمجھے گا تو خود ہم کو اطلاع دے گا۔ عوام کے واسطے امور پیش آمدہ میں استخارہ ہوتا ہے اور ہمارے واسطے استخارہ نہیں۔ جب تک پہلے سے خدا تعالیٰ کا منشاء نہ ہو ہم کسی امر کی طرف توجہ کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارا دارو مدار خدا تعالیٰ کے حکم پر ہے۔ انسان کی اپنی کی ہوئی بات میں اکثر ناکامی ہی حاصل ہوتی ہے۔ اگر خدا چاہے گا تو اس ملک میں طالبِ اسلام پیدا کر دے گا جو خود ہماری طرف توجہ کریں گے۔ اب آخری زمانہ ہے۔ ہم فیصلہ سننے کے انتظار میں ہیں۔ ہاں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ میں اپنی جماعت کے سب لوگوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ یہ دن بہت نازک ہیں۔ خدا سے ہراساں و ترساں رہو۔ ایسا نہ ہو کہ سب کیا ہوا برباد ہو جائے۔ اگر تم دوسرے لوگوں کی طرح بنو گے تو خدا تم میں اور ان میں کچھ فرق نہ کرے گا۔ اور اگر تم خود اپنے اندر نمایاں فرق پیدا نہ کرو گے تو پھر خدا بھی تمہارے لیے کچھ فرق نہ رکھے گا۔ عمدہ انسان وہ ہے جو خدا کی مرضی کے مطابق چلے۔ ایسا انسان ایک بھی ہو تو اس کی خاطر ضرورت پڑنے پر خدا ساری دنیا کو بھی غرق کر دیتا ہے۔ لیکن اگر ظاہر کچھ اور ہو اور باطن کچھ اور تو ایسا انسان منافق ہے اور منافق کافر سے بدتر ہے۔ سب سے پہلے دلوں کی تطہیر کرو۔ مجھے

سب سے زیادہ اس بات کا خوف ہے۔ ہم نہ تلوار سے جیت سکتے ہیں اور نہ کسی اور قوت سے۔ ہمارا ہتھیار صرف دُعا ہے اور دلوں کی پاکیزگی۔ اگر ہم اپنے آپ کو دُرست نہ کریں گے تو ہم سب سے پہلے ہلاک ہوں گے۔ اگر خدا نہ چاہے تو جاپان میں کیا رکھا ہے؟ ہاں زبان سیکھنے میں کوئی حرج نہیں، داشتہ آید بکار۔ اگر ہمیں خدا کا حکم ہو تو بغیر زبان سیکھنے کے آج ہی چل پڑیں۔ ہم ایسے معاملات میں کسی کے مشورہ پر نہیں چل سکتے۔ خدا کے منشا کے قدم بقدم چلنا ہمارا کام ہے۔[1]

بدر جلد ۱ نمبر ۱۳ صفحہ ۲ مورخہ ۲۹ رجون ۱۹۰۵ء

دُعا کی طاقت

یکم جولائی ۱۹۰۵ء

کچھ بیماروں کا ذکر تھا۔ فرمایا:

میرا مذہب بیماریوں کے دُعا کے ذریعہ سے شفا کے متعلق ایسا ہے کہ جتنا میرے دل میں ہے اتنا میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ طبیب ایک حد تک چل کر ٹھہر جاتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے مگر اس کے آگے خدا دُعا کے ذریعہ سے راہ کھول دیتا ہے۔[2] خداشناسی اور خدا پر توکل اسی کا نام ہے کہ جو حدیں لوگوں نے مقرر کی ہوئی ہیں اُن سے آگے بڑھ کر رجا پیدا ہو ورنہ اس میں تو آدمی زندہ ہی مر جاتا ہے۔ اس جگہ سے اللہ تعالیٰ کی شناخت شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے ایسے معاملات میں مولوی رُومی کا یہ شعر بہت پسند آیا ہے ؎

اے کہ خواندی حکمتِ یونانیاں
حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں

عام لوگوں کے نزدیک جب کوئی معاملہ یاس کی حالت تک پہنچ جاتا ہے تب خدا تعالیٰ اندر ہی اندر تصرفات شروع کرتا ہے اور معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

دُعا کے واسطے بہت لوگوں کے خطوط آتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے جو دُعا کے واسطے لکھتا ہے دعا کرتا ہوں۔ لیکن اکثر لوگ دُعا کی فلاسفی سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ دُعا کے ٹھیک ٹھکانہ پر پہنچنے کے واسطے کس قدر توجہ

---

[1] اس سلسلہ میں نیز دیکھئے ۴ر اگست ۱۹۰۵ء کی ڈائری۔

[2] بدر میں ہے۔ ”ہمارا تو اصل مذہب یہی ہے کہ اگر تمام دُنیا کے طبیب ناامید ہو جائیں اور موت کا فتویٰ لگائیں پھر بھی رُوحانی اسباب کے میسّر آنے پر اور کافی توجہ کے پیدا ہونے پر دُعا قبول ہو کر شفا ہو جاتی ہے۔“

بدر جلد ۱ نمبر ۱۴ صفحہ ۲ مورخہ ۶ رجولائی ۱۹۰۵ء

اور محنت درکار ہے۔ دراصل دُعا کرنا ایک قسم کی موت کا اختیار کرنا ہوتا ہے۔

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۳ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۵ء

۴ر جولائی ۱۹۰۵ء

اس زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ

عاجز[2] نے ایک اخبار ولایت کا پیش کیا جس میں عیسویت پر کچھ لے دے کی ہوئی تھی۔ فرمایا

عیسائیت تو خود بخود مٹتی جاتی ہے لیکن بڑا فتنہ اس زمانہ کا دہریت والی سائنس ہے خدانخواستہ اگر اس کو دیرپا مہلت مل گئی تو پھر ساری دُنیا دہریہ ہونے کو آمادہ ہو جائے گی۔ سائنس کا اور مذہب کا اس وقت مقابلہ ہے۔ عیسویت ایک کمزور مذہب ہے اس واسطے سائنس کے آگے فوراً گر گیا ہے لیکن اسلام طاقتور ہے۔ یہ اس پر غالب آئیگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بدر جلد ۱ نمبر ۱۴ صفحہ ۲ مورخہ ۶ر جولائی ۱۹۰۵ء

۶ر جولائی ۱۹۰۵ء

طبعی علوم سے خدا پہچانا نہیں جاسکتا

فرمایا:

جب خدا کے ساتھ انسان اپنا معاملہ دُرست کرتا ہے تو خدا اس پر نعمت وارد کرتا ہے ورنہ جھوٹے

---

[1] بدر سے:- "مگر ہم اس معاملہ میں لاچار ہیں کہ ایسی توجہ پیدا ہو جائے یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے ہو سکتا ہے پیغمبرِ خُدا صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں قبول ہوتی تھیں لیکن اصحاب میں سے ایک نوجوان تازہ شادی کردہ جب سانپ سے ڈسا جا کر مر گیا۔ اور دُوسروں نے عرض بھی کی کہ اس کے واسطے دُعا کی جائے تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ۔ اپنے بھائی کو دفن کر دو۔ لوگ دُعا کے اصل راز کو نہیں سمجھتے۔" بدر جلد ۱ نمبر ۱۴ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۵ء

[2] حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ (مُرتّب)

پر لعنت کی مار پڑتی ہے۔ جُھوٹا فلسفہ اور طبعی علوم ہمیشہ سے چلے آتے ہیں مگر ان سے خُدا نہیں پہچانا جا سکتا۔

خدا تعالیٰ کی صفتِ خلق

ایک آریہ مخاطب تھا۔ فرمایا :

خدا سب کا خالق ہے اور ہمیشہ سے خالق ہے۔ قرآن شریف سے بھی ثابت ہوتا ہے اور اسلام کا یہی مذہب ہے کہ "لَمْ يَزَلْ خَالِقًا" مگر اس کا خلق ہمیشہ ایک قسم کا نہیں کہ ہم کہیں کہ انسان ہی پیدا ہوتے رہے یا بندر ہی پیدا ہوتے رہے بلکہ وہ ہمیشہ سے گوناگوں خلقت کا خالق ہے جس کی حد ہم نہیں پا سکتے۔ جس طرح خالق ازلی ہے اس کی پیدائش بھی ازلی ہے۔

آدم سے پہلے بھی مخلوق تھی

آریہ نے سوال کیا کہ اسلام کے مطابق تو دُنیا آدم سے شروع ہوئی یعنی چھ ہزار سال سے۔ حضرت نے فرمایا :

یہ غلط ہے۔ اسلام اور قرآن شریف کا یہ مذہب نہیں کہ دُنیا چھ ہزار سال سے ہے یہ تو عیسائی لوگوں کا عقیدہ ہے مگر قرآن شریف میں تو خدا تعالیٰ نے آدم کے متعلق فرمایا ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرۃ : ۳۱) اب ظاہر ہے کہ خلیفہ اس کو کہتے ہیں کہ جو کسی کے پیچھے آوے اور اس کا جانشین ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق تھی۔ آدم اس کا قائم مقام اور جانشین ہوا۔

آریوں کے عقائد کا رد

مَیں یہ نہیں قبول کر سکتا کہ انسان بار بار کُتّے۔ بِلّے اور سُوّر بنتا رہتا ہے۔ نہ مَیں یہ قبول کر سکتا ہوں کہ کوئی انسان ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے۔ مَیں اس خُدا کو جانتا ہوں کہ جب انسان اس کے سامنے پاک دل کے ساتھ سچی صلح کے واسطے آتا ہے تو وہ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس پر رحم کرتا ہے۔ جو پوری قربانی دیتا ہے اور اپنی زندگی خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ خُدا ضرور اُسے قبول کر لیتا ہے۔ بندر اور سؤر بننے کا عقیدہ تو انسان کی کمر توڑ دیتا ہے۔ مُسلمان ہونے کے یہ معنے ہیں کہ انسان اپنی تمام عقلی اور اعتقادی غلطیوں سے دست بردار ہو جائے۔

بدر جلد ۱ نمبر ۱۴ صفحہ ۲ مورخہ ۶؍جولائی ۱۹۰۵ء

۲۰؍جولائی سنہ ۱۹۰۵ء

ایک خواب کی تعبیر

مولوی عبدالکریم صاحب نے اپنا ایک خواب عرض کیا کہ میرے کپڑے کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا آگ لگ گئی ہے پانی ڈالا تو کپڑا بالکل صاف نکل آیا گویا اس کو کچھ آنچ نہ پہنچی تھی۔ فقط۔ مولوی صاحب کے والد صاحب بیمار ہیں۔

حضرت نے فرمایا :

ان کی صحت کی طرف اشارہ ہے[1]

۲۲؍جولائی سنہ ۱۹۰۵ء

دُعا کی حدود

خانصاحب ذوالفقار علی خاں کی زوجہ کلاں کی وفات کا ذکر آیا۔ عاجز[2] کو حکم دیا کہ ہماری طرف سے اُن کو تعزیت نامہ لکھ دیں۔ کہ

صبر کریں موت فوت کا سلسلہ دُنیا میں لگا ہوا ہے۔ صبر کے ساتھ اجر ہے۔

فرمایا :

قبولیتِ دُعا حق ہے لیکن دُعا نے کبھی سلسلہ موت فوت کو بند نہیں کر دیا۔ تمام انبیاء کے زمانہ میں یہی حال ہوتا رہا ہے۔ وُہ لوگ بڑے نادان ہیں جو اپنے ایمان کو اس شرط سے مشروط کرتے ہیں کہ ہماری دُعا قبول ہو اور ہماری خواہش پوری ہو۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآنِ شریف میں آیا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ۔ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (الحج : ۱۲) بعض لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایک کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ اگر اس کو بھلائی پہنچے تو اس کو اطمینان ہو جاتا ہے اور اگر کوئی فتنہ پہنچے تو مُنہ پھیر لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دُنیا اور آخرت کا نقصان ہے اور یہ نقصان ظاہر ہے۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۶ صفحہ ۳ مورخہ ۲۰؍جولائی سنہ ۱۹۰۵ء

[2] حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ (مرتب)

فرمایا: صحابہؓ کے درمیان بھی بیوی بچوں والے تھے اور سلسلہ بیماری اور موت فوت کا بھی ان کے درمیان جاری تھا۔ لیکن ان میں ہم کوئی ایسی شکایت نہیں سُنتے جیسے کہ اس زمانہ کے بعض نادان شکایت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ دنیا کی محبت کو طلاق دے چکے تھے۔ وہ ہر وقت مرنے کے لیے تیار تھے تو پھر بیوی بچوں کی ان کو کیا پرواہ تھی۔ وہ ایسے امور کے واسطے کبھی دُعائیں نہ کرواتے تھے اور اسی واسطے ان میں کبھی ایسی شکائتیں بھی نہ پیدا ہوتی تھیں۔ وہ دین کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کرچکے ہوئے تھے۔

بدر جلد ۱ نمبر ۱۶ صفحہ ۳ مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء

---

۲۴ جولائی ۱۹۰۵ء

صبر کی تلقین پشاور کے دو دوست پیش ہوئے۔ ان کے متعلق ذکر ہوا کہ مخالفین نے ان کو بہت ہی دُکھ دیا ہے۔ فرمایا:

صبر کرنا چاہیے۔ ایسے موقعہ پر صبر کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔

بدر جلد ۱ نمبر ۱۶ صفحہ ۳ مورخہ ۲۰[1] جولائی ۱۹۰۵ء

حضرت خلیفۃ اللہ علیہ السلام کی پُر درد بات

تمام ہم و غم دین کے لیے ہونا چاہیے پرسوں[2] میں نے ایک دوست کی نسبت عرض کیا کہ بعض ابتلاؤں کا اندیشہ زیادہ ہوگیا ہے اور غم و ہم کے اُن کے دل پر غالب آنے کا خوف ہے۔ فرمایا:

مَیں نے دُعا تو بہت کی ہے اور التزاماً کرتا ہوں لیکن مجھے بھی فکر رہتی ہے کہ ہر شخص دنیا کے غم و ہم میں گرفتار

---

[1] معلوم ہوتا ہے۔ ۲۰ جولائی کا پرچہ ۲۴ جولائی کے بعد شائع ہوا ہے کیونکہ اس پرچہ میں ۲۲ اور ۲۴ جولائی کی ڈائری شائع ہوئی ہے۔ (مرتب)

[2] حضرت مولوی عبدالکریم صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ ملفوظات ۲۶ جولائی ۱۹۰۵ء کو لکھے جو ۲۷ جولائی ۱۹۰۵ء کے بدر میں "حضرت خلیفۃ اللہ علیہ السلام کی پُر درد بات" کے عنوان سے شائع ہوئے اس لحاظ سے یہ ۲۴ جولائی کے بیان فرمودہ ہیں کیونکہ ۲۶ تاریخ کو اگر پرسوں کا حوالہ دیا جائے تو ۲۴ ہی بنتا ہے۔ (مرتب)

ہے۔ دین کے غم وہم کا موقعہ انہیں کب ملے گا۔ اس زندگی میں مصائب کا آنا ضروری ہے اور انسان کی زندگی کے محدود اوقات میں کوئی نہ کوئی وقت کسی حادثہ اور رنج کا نشانہ ہوتا ہے۔ اگر اسی طرح ایک شخص کی رُوح دُنیا کے بگڑے ہوئے معاملات کی فکر میں پیچ وتاب کھاتی رہے تو وہ وقتِ صافی اسے کب میسّر آئے گا جبکہ اس کا سارا غم وہم دین ہوگا۔ وہ جماعت جس نے بیعت میں اقرار کیا ہے کہ وہ دین کو دُنیا پر مقدّم رکھیں گے وہ بھی اگر اسی دلدل میں دن رات پھنسے ہیں تو بتائیں وہ اس نازک عہد کے ایفاء کی طرف کب توجہ فرمائیں گے۔

فرمایا :

مَیں تو حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ جب سے مجھے ہوش ہے مَیں دُنیا کے ہم وغم میں کبھی مبتلا نہیں ہوا۔

فرمایا :

جب میری عمر غالباً پندرہ برس کی ہوگی ایک کھتری سے مَیں نے کہا جو حضرت والد صاحب کے حضور میں بیٹھا ہوا اپنی تلخ کامیابیاں اور نامرادیاں بیان کرتا اور سخت کُڑھ رہا تھا۔ مَیں نے کہا۔ لوگ دُنیا کے لیے کیوں اس قدر دُکھ اُٹھاتے اور اس کے غم وہم میں گرفتار ہیں۔ اس نے کہا تم ابھی بچّہ ہو۔ جب گرہستی ہوگے تب تمہیں ان باتوں کا پتہ لگے گا۔ فرمایا۔ ایک عرصہ کے بعد جب غالباً میری عمر چالیس کے قریب ہوگی کسی تقریب سے پھر اسی کھتری سے گفتگو کا اتفاق ہوا۔ مَیں نے کہا۔ اب بتاؤ اب تو مَیں گرہستی ہوں۔ اس نے کہا۔ تم تو ویسے ہی ہو۔

فرمایا :

ہر شخص اپنے دل میں جھانک کر دیکھے کہ دین و دُنیا میں سے کس کا زیادہ غم اس کے دل پر غالب ہے۔ اگر ہر وقت دل کا رُخ دنیا کے اُمور کی طرف رہتا ہے تو اُسے بہت فکر کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ کلماتِ الٰہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی۔

فرمایا : کاش لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ جس شخص کا تمام ہم وغم دین کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے دُنیا کے ہم وغم کا اللہ تعالیٰ متکفّل ومتولّی ہوجاتا ہے۔ فرمایا۔ میں نے کبھی نہیں سُنا اور نہ کوئی کتاب گواہی دیتی ہے کہ کبھی کوئی نبی بھوکا مرا ہو یا اس کی اولاد دروازوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہو۔ ہاں دُنیا کے ملوک اور امراء اور اغنیاء کا یہ بُرا حال اکثر سُنا گیا ہے کہ اُن کی اولاد نے دربدر ٹکڑے مانگے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی سنتِ مستمرہ ہے کہ کبھی کوئی کامل مومن بسترِ نرم سے خاکسترِ گرم پر نہیں بیٹھا اور نہ اس کی اولاد کو روزِ بد دیکھنا نصیب ہوا۔ اگر لوگ ان باتوں پر پختہ ایمان لے آئیں اور سچّا اور پاک بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کریں تو ہر قسم کی رُوحانی خودکشی اور دلی جلن سے رہائی پا جائیں۔

فرمایا : اکثر لوگوں کو اولاد کی آرزو بھی اس خیال سے لگی رہتی ہے کہ کوئی اُن کی مُردار دنیا کا وارث پیدا ہوجائے۔ نہیں جانتے کہ اگر وہ بدکار و ناہنجار نکلے تو اُن کا کمایا ہوا روپیہ اور اندوختہ فسق و فجور میں ان کا

معاون ہوگا اور انکی سیاہ کاریوں کا ثواب[لہ] اُن کے نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا رہے گا۔ فرمایا: اولاد کی آرزو کے لیے حضرت زکریا علیہ السلام کا سا دل درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں اس کا ذکر کرنا اس لیے ہے کہ حضرت زکریاؑ کی دعا ولدِ صالح کے لیے مومنوں کے لیے اُسوہ ٹھہر جاتے۔ فرمایا: زندگی ناقابلِ اعتبار ہے۔ فرصت بہت کم ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ دین کی فکر میں لگ جائے۔ اس سے بہتر نسخہ عمر بڑھانے اور برکت کا نہیں۔

بدر جلد ۱ نمبر ۱۷ صفحہ ۲ مورخہ ۲۷ / جولائی ۱۹۰۵ء

۲۶ / جولائی ۱۹۰۵ء

بوقت نماز فجر

اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا موقع

آج صبح تین بجے کے قریب زلزلہ کا سخت دھکا لگا۔ صبح کی نماز میں حضرت تشریف لائے۔ فرمایا:

کل میں دُعا کر رہا تھا کہ ایسے لوگ شرارتوں میں بڑھ رہے ہیں اور غفلت نے اُن کے قلوب موٹے کر دیئے ہیں کہ اگر یونہی سکون و قرار رہا تو ان کا استہزاء ترقی کر جائے گا۔ اس سلسلہ کو جاری رہنا چاہیے۔ فرمایا:

اب ان مادہ پرست منکرانِ قدرتِ الٰہی کا مقابلہ اللہ تعالیٰ سے آپڑا ہے۔ یہ حکم لگاتے ہیں کہ کوئی آفت آنے والی نہیں۔ آخر میں فرمایا کہ:

ہماری جماعت کے لیے اب عمدہ وقت ہے کہ ایک تبدیلی اپنے اندر پیدا کریں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی اُن کے لیے تبدیلی کرے۔

فرمایا:

خدا تعالیٰ کا معاملہ انسان کے ساتھ اس کے گمان اور تبدیلی کے اندازہ پر ہوتا ہے سو خدا تعالیٰ پر نیک گمان رکھو اور دُعا اور اُمید میں کبھی نہ تھکو اور نہ مایوس ہو۔

[لہ] حاشیہ :- بمعنی اجر۔ بدلہ (مرتب)

ایک الہام اور اس کی تشریح

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ

ترجمہ :- مَیں ایک مخفی خزانہ تھا پھر مَیں نے چاہا کہ مَیں پہچانا جاؤں

فرمایا :

یہ صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہے کسی زمانہ میں کوئی ایک صفت ظاہر ہوتی ہے اور کسی زمانہ پوشیدہ رہتی ہے جب ایک اصلاح کا زمانہ دُور پڑ جاتا ہے اور لوگوں میں خُدا شناسی نہیں رہتی تو اللہ تعالیٰ پھر اپنی معرفت کو ظاہر کرنے کے واسطے ایک ایسا آدمی پیدا کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اس کی معرفت دُنیا میں پھیلتی ہے لیکن جس زمانہ میں وہ مخفی ہوتا ہے اس زمانہ میں عابدوں کی عبادت اور زاہدوں کے زُہد بھی ادھورے اور نکمّے رہ جاتے ہیں۔ یہ الہام براہینِ احمدیہ میں بھی درج ہے۔ لیکن اب پھر اس کے خاص ظہور کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے دوبارہ یہ الہام ہوا ہے۔

باطنی عالمِ اسباب

فرمایا :

دُعا اور توجہ میں ایک رُوحانی اثر ہے جس کو طبعی لوگ جو صرف مادی نظر رکھنے والے ہیں نہیں سمجھ سکتے سنّت اللہ میں دقیق در دقیق اسباب کا ذخیرہ ہے جو دُعا کے بعد اپنا کام کرتا ہے۔ نیند کے واسطے طبعی اسباب رطوبات کے بیان کئے جاتے ہیں مگر بہت دفعہ آزمائش کی گئی ہے کہ بغیر رطوبات کے اسباب کے ایک نیند سی آجاتی ہے اور ایک حالت طاری ہوتی ہے جس میں سلسلہ الہامات کا وارد ہوتا ہے اور وہ بعض اوقات ایسا لمبا سلسلہ ہوتا ہے کہ انسان بار بار اپنے ربّ سے سوال کرتا ہے اور ربّ جواب دیتا ہے۔ ایسا ہی بعض مادی لوگوں نے چند ظاہر اسباب کو دیکھ کر فتویٰ لگایا ہے کہ اب زلازل کا خاتمہ ہے اور دو سو سال تک یہاں کوئی زلزلہ نہیں آنے گا۔ لیکن یہ لوگ دراصل اللہ تعالیٰ کے باریک رازوں اور اسباب سے بے خبر ہیں۔ وہ ظاہر عالمِ اسباب کو جانتے ہیں لیکن اس کا ایک باطنی عالمِ اسباب بھی ہے ؎

فلسفی کو منکرِ حنّانہ است
از حواسِ اولیاء بیگانہ است

اس جہان کے لوگ جب فتنہ و فساد کی کثرت کو دیکھ کر اس کی اصلاح سے عاجز آجاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ

اپنے خاص بندوں کو ایسے قویٰ عطا کرتے ہیں جن کی توجہ سے سب کام دُرست ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دُعا کے ذریعہ سے عمریں بڑھ جاتی ہیں۔

انبیاء خلقت کی ہدایت کے واسطے بہت توجہ کرتے ہیں۔ اسی کی طرف قرآن شریف میں اشارہ ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (الکھف : ۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق کی ہدایت کا اس قدر غم تھا کہ قریب تھا کہ اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔

ظاہری قیل و قال سے کچھ نہیں ہوتا۔ اندرونی صفائی اور رُوحانیت کی ضرورت ہے[1]۔

---

۲۸ ؍ جولائی ۱۹۰۵ء

محترمہ فاطمہ زوجہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کا ذکرِ خیر

حضرت مولوی نورالدین صاحب کی زوجہ کلاں جن کا نام فاطمہ تھا بتاریخ ۲۸ ؍ جولائی ۱۹۰۵ء بروز جمعہ بعد نمازِ جمعہ اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئیں ...... مرحومہ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ سچا اخلاص اور ایمان تھا۔ کہا کرتی تھیں کہ یہ مولوی صاحب کا احسان ہے کہ ہم نے خدا کے مسیح کو شناخت کر لیا لیکن اب تو میرے دل میں خدا کے رسول کی اس قدر محبت ہے کہ اگر کوئی بھی اس سے پھر جائے میں اس سے مُنہ نہیں پھیر سکتی۔

بعد از عصر مرحومہ کا جنازہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بمعہ جماعت کثیر باہر میدان میں پڑھا۔ نمازِ جنازہ میں دُعا کو بہت ہی لمبا کیا۔

قبل از عشاء حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں حضرت نے خود ہی مرحومہ کا ذکر کیا۔ فرمایا :

”وہ ہمیشہ مجھے کہا کرتی تھیں کہ میرا جنازہ آپ پڑھائیں اور مَیں نے دل میں پختہ وعدہ کیا ہوا تھا کہ کیسا ہی بارش یا آندھی وغیرہ کا بھی وقت ہو مَیں ان کا جنازہ پڑھاؤں گا۔ آج اللہ تعالیٰ نے ایسا موقعہ دیا کہ طبیعت بھی دُرست تھی اور وقت بھی صاف میسّر آیا اور مَیں نے خود جنازہ پڑھایا۔“

عاجز[2] نے عرض کی ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ میری وفات جمعہ کے دن ہو۔ فرمایا :

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۷ صفحہ ۲ مورخہ ۲۷ ؍ جولائی ۱۹۰۵ء [2] حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ (مرتّب)

"ہاں وہ ایسا کہا کرتی تھیں۔ خدا تعالیٰ نے یہ خواہش بھی ان کی پوری کر دی۔ چند روز ہوتے ابھی ہم باغ میں تھے کہ وہ ایک دن سخت بیمار ہو گئیں اور قریب موت کے حالت پہنچ گئی تو کہنے لگیں کہ آج تو منگل ہے اور ہنوز جمعہ دُور ہے اور ابھی عبدالحی کی آمین بھی نہیں ہوئی۔ قدرتِ خدا اُس وقت طبیعت بحال ہو گئی اور پھر خواہش کے مطابق عبدالحی کی آمین کی خوشی بھی دیکھی اور آخر جمعہ کا دن بھی پایا۔

فرمایا : یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک بزرگ کسی شہر میں بہت بیمار ہو گئے اور موت تک حالت پہنچ گئی تب اپنے ساتھیوں کو وصیت کی کہ مجھے یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرنا۔ دوست حیران ہوتے کہ یہ عابد زاہد آدمی ہیں۔ یہودیوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی کیوں خواہش کرتے ہیں شاید اس وقت حواس دُرست نہیں رہے۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ بزرگ نے کہا کہ تم میرے فقرہ پر تعجب نہ کرو۔ مَیں ہوش سے بات کرتا ہوں اور اصل واقعہ یہ ہے کہ تیس سال سے مَیں دُعا کرتا ہوں کہ مجھے موت طوس کے شہر میں آوے پس اگر آج مَیں یہاں مر جاؤں تو جس شخص کی تیس سال کی مانگی ہوئی دُعا قبول نہیں ہوئی وُہ مُسلمان نہیں ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ اس صورت میں مُسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہو کر اہلِ اسلام کو دھوکا دُوں اور لوگ مجھے مسلمان جان کر میری قبر پر فاتحہ پڑھیں۔ قدرتِ خداوندی وہ اس وقت تندرست ہو گیا اور پھر دس پندرہ سال کے بعد شہر طُوس میں بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔

فرمایا : مرحومہ نے اپنی عمر میں بہت شدائد اور مصائب اُٹھائے۔ کتنی اولاد مر گئی۔ یہ مصائب جو قضا و قدر سے انسان پر پڑتے ہیں اس کی کمی پوری کر دیتے ہیں جو انسان سے اعمالِ حسنہ میں رہ جاتی ہے۔

جب حضرت کے ہاں صاحبزادہ میاں بشیر احمد تولّد ہوئے تھے تو حضرت نے مرحومہ کو فرمایا تھا کہ یہ تمہارا بیٹا ہے۔ اس واسطے بشیر احمد کے ساتھ مرحومہ کو خاص محبت تھی۔ صاحبزادہ بشیر احمد جنازہ کے ساتھ اور دفن کے وقت اس طرح موجود رہے کہ اُن کا چہرہ اس اندرونی محبت کو ظاہر کرتا تھا۔[1]

۲۹؍ جولائی ۱۹۰۵ء (قبل از عشاء)

دُعاؤں کی قبولیت کے لوازمات

بعد نماز مغرب حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے گئے اور عشاء کی نماز کی اذان ہوتے

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۷ صفحہ ، مورخہ ۲۷؍ جولائی ۱۹۰۵ء

ہی تشریف لاکر شہ نشین پر اجلاس فرما ہوئے۔ شیخ مظہر الدین صاحب انسپکٹر پولیس پشاور چند روز سے اپنی محترمہ ہمشیرہ صاحبہ کو لے کر آتے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب کی ہمشیرہ ایک صدمہ رسیدہ خاتون ہے اور متواتر موت کے صدموں نے انہیں سخت شکستہ خاطر بنا دیا ہے۔ وہ اپنے معزز بھائی کے ہمراہ اس غرض سے دارالامان آئی ہوئی تھیں کہ حضرت اقدس سے دُعا کرائیں تاکہ دردرسیدہ دل پر سکینت کا نزول ہو اور آپ کی پُر اثر نصائح سے اطمینانِ خاطر ہو۔ حضرت مخدوم الملت نے حضرت حکیم الامت کے اشارہ سے شیخ صاحب کے لیے اجازت چاہی کہ وہ ایک ضروری کام اور تفکر کی وجہ سے جلد جانا چاہتے ہیں۔ فرمایا :

میں نے آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کو بہت کچھ سمجھایا ہے اور اُن کے لیے دُعا بھی کی ہے۔ اور وعدہ بھی کیا ہے کہ دُعا کروں گا۔ ہاں اتنی بات ہے کہ آپ یاد دلاتے رہیں۔ میں نے اُن کو کہہ دیا تھا کہ مولویانہ وعظ و نصیحت سے آپ کے دل کو تسلی نہیں ہوگی۔ یہ تسلی تو خدا تعالیٰ کی ہی طرف سے آئے گی کیونکہ جس نے دل بنایا ہے وہ دل پر اثر ڈال سکتا ہے اور یہ سب کچھ دعاؤں سے ہی ممکن ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ انہیں بہت فائدہ ہوا ہے۔

فرمایا : دُعاؤں میں جو خود بخدا ہو کر توجہ کی جاوے تو پھر ان میں خارقِ عادت اثر ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دُعاؤں میں قبولیت خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے اور دُعاؤں کے لیے بھی ایک وقت جیسے صبح کا ایک خاص وقت ہے اس وقت میں خصوصیت ہے وہ دُوسرے اوقات میں نہیں۔ اسی طرح پر دُعا کے لیے بھی بعض اوقات ہوتے ہیں جبکہ ان میں قبولیت اور اثر پیدا ہوتا ہے۔

فرمایا : عام انسان صدموں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ انبیاء علیہم السلام ہی کے قلوب ہوتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے صدمات اور مشکلات کو برداشت کرتے ہیں اور ذرہ بھی نہیں گھبراتے۔

فرمایا : بعض مقام ایسے ہوتے ہیں کہ تقریر سے دل تسلی پکڑتا ہے لیکن بعض مقام ایسے ہوتے ہیں کہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کام کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کام میں صدہا مخفی اَسرار ہوتے ہیں جن کو انسان کبھی سمجھ لیتا ہے اور کبھی نہیں۔ انسان کو چونکہ آخرت کے ذخیرہ کی ضرورت ہے اور بعض اوقات انسان کے افعال ایسے نہیں ہوتے جو آخرت میں کام دیں اس لیے اللہ تعالیٰ قضاء و قدر سے اس کا تدارک کر دیتا ہے جس طرح پر انسان روزہ رکھتا ہے تو اس روزہ کے ساتھ سحری بھی ہے اور اس میں اس کو اجازت ہے کہ جو چاہے سو کھائے لیکن قضاء و قدر کا جو روزہ ہے اس کے لیے کونسی سحری ہے؟

ایک الہام فرمایا :

آج اللہ تعالیٰ نے میرا ایک اور نام رکھا ہے جو پہلے کبھی سنا بھی نہیں۔ تھوڑی سی غنودگی ہوئی اور الہام ہوا۔

" مُحمّد مُفلح "

وراء الوراء اسباب زلزلہ کے متعلق مختلف ذکر ہوتے رہے۔ فرمایا :

اموری کا پتہ رکھنا چاہیے تاکہ جب پیشگوئی پوری ہو تو اس کو بھی اشتہار بھیجا جاوے۔

فرمایا :

عام لوگوں کا علم یہیں تک محدود ہے کہ عام اسباب مادیہ کے تحت تحریکات ہوتی ہیں۔ لیکن اسی حد تک ختم کر دینا یہ سخت غلطی ہے۔ قضاء و قدر کے اسباب بعض اوقات وراء الوراء ہوتے ہیں اور ان کا تعلق محض کُنْ فَیَکُوْنُ سے ہی ہوتا ہے جسے دوسرے لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اگر یہ اسباب اسی حد تک ہوتے جہاں تک یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں تو پھر تو گویا خدائی ہی کو اپنے قبضہ میں لے آتے۔ پہلی اُمتوں پر جو جو عذاب آئے ہیں۔ اگر ان کے حکماء کو اُن کے اسباب کی خبر ہوتی تو وہ اُن کو بچا کیوں نہ لیتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اسباب وراء الوراء رہتے۔ مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اس خارقِ عادت نشان سے بہت سے لوگ سیدھے ہو جائیں گے۔[1]

۳۰ر جولائی ۱۹۰۵ء قبل از عشاء۔

مسیح موعود اور آپ کے مخالفین میں فرق حسبِ معمول جب اعلیٰحضرت قبل عشاء تشریف لائے تو سب سے اوّل لودھی ننگل کے متصل آئے ہوئے چار آدمیوں نے بیعت کی۔ بعد بیعت تذکرہ ہوا کہ موضع تیجہ متصل لودھی ننگل میں مولوی ثناء اللہ امرتسری گیا تھا۔ وہاں اس نے مجمع عام میں اثنائے وعظ میں کہا کہ مرزا صاحب کے مرید لا الٰہ الا اللہ مرزا غلام احمد رسول اللہ۔ یہ کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس پر ایک مخالف مگر انصاف پسند شخص نے

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۷ صفحہ ۳ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء

کھڑے ہو کر کہا کہ مولوی صاحب اگر یہ کلمہ مرزا صاحب کی کسی تصنیف سے نکال دیں تو میں پانچسو روپیہ ابھی آپ کو نقد انعام دیتا ہوں۔ یہ تحدی سُنکر مولوی صاحب چکرائے اور اکثر لوگ بیزار ہو کر حلقہ وعظ سے اُٹھ گئے مولوی صاحب اپنا سا مُنہ لے کر واپس آئے۔

حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

ہمارے اور ہمارے مخالفوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو لاکر امت بناتے ہیں اور ہم اُمّت کو مسیح بناتے ہیں[1]

بلا تاریخ

صحیح علم کی ضرورت اور اس کے حصول کا ذریعہ

قوّتِ ذوق شوقِ علم سے پیدا ہوتی ہے جبتک علم اور معرفت نہ ہو کیا ہو سکتا ہے۔ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ : ۱۱۵) کی دُعا میں یہی ایک سِرّ ہے کیونکہ جس قدر آپ کا علم وسیع ہوتا گیا اسی قدر آپ کی معرفت اور آپ کا ذوق شوق ترقی کرتا گیا پس اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں اُسے ذوق شوق پیدا ہو تو اُس کو اللہ تعالیٰ کی نسبت صحیح علم حاصل کرنا چاہیے اور یہ علم کبھی حاصل نہیں ہوتا جبتک انسان صادق کی صحبت میں نہ رہے اور اللہ تعالیٰ کی تازہ بہ تازہ تجلّیات کا ظہور مشاہدہ نہ کرے۔

کامل وفاداری کی ضرورت

اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح اور سچّا تعلّق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان پورا وفادار اور مخلص ہو۔ جو شخص وفادار نہیں اگر وہ ہر روز اس قدر روتا رہے کہ اس کے آنسوؤں کا چھپڑ لگ جاوے تو بھی اللہ تعالےٰ کے نزدیک اس کی کوئی قدر نہیں ہے اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ تمہارا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ کامل وفاداری کا نمونہ ہو۔

موت کا واعظ

انسان کی عجیب حالت ہے کہ اگر کہیں سانپ نِکلے تو اس سے دہشت کھاتا ہے اور جس اندر کی بابت اُسے گمان ہو کہ یہاں سانپ ہے وہاں جاتے ہوئے ڈرتا

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۵ء ؛ [2] جو ہر۔

ہے۔ لیکن ہزاروں تجارب موت فوت کے اس کے سامنے ہیں اور پھر بھی نصیحت نہیں پکڑتا؛ ورنہ ایک موت ہی کا واعظ اس کی اصلاح کے لیے کافی تھا۔

جھوٹے قصّوں پر ایمان کا نتیجہ

جھوٹے قصّوں سے جھوٹا بھروسہ پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر اصلیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جیسے کیمیا کی وہمی باتوں کے بھروسہ میں انسان اگلی دولت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ جھوٹے خیالات اور خیالی قصّوں کا بھی اثر ایمان پر ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآنِ شریف کو جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے چھوڑتے ہیں وہ آخر اسی مرض میں گرفتار ہو کر اپنا ایمان ضائع کر لیتے ہیں۔ قرآن شریف میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو انسان کو دھوکا دے۔

اصل میں انسان کے ایمان کی تازگی اسی وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اللہ تعالیٰ ہی پر ایمان لاتا ہے اسی وقت اس کے گناہ دُور ہونے لگتے ہیں۔ حقیقی ایمان جب تک پیدا نہیں ہوتا گناہ کی زہر سے انسان بچ نہیں سکتا۔ میرے نزدیک ایمان کی شناخت کا یہی بڑا معیار ہے اور ہر شخص اپنے ایمان کو اس پر آزما سکتا ہے اس لیے دلیل ظاہر ہے کہ جو لوگ سم الفار کو زہر سمجھتے ہیں وُہ اُسے نہیں کھاتے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کو کھا کر ہلاک ہو جائیں گے۔ اسی طرح ہر گناہ بھی ایک زہریلا پھل ہے جسے کھاتے ہی انسان مر جاتا ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو تو انسان اس پھل کے نزدیک جانے سے ڈرتا ہے۔ اصل پر اس کی ہلاکت کی تاثیر دل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ بے حیائی اور کھُلی بدکاری کی بیماری جو دُنیا میں پھیل رہی ہے یہ دہریت کے روگ سے شروع ہوئی ہے اور اس کی جڑ کفارہ کے جھوٹے فسانے ہیں۔

دُنیا پرستی کی وجہ

دُنیا پرستی کی حد ہو گئی ہے۔ ہر شخص دُنیا ہی کا شیدائی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جدھر آنکھ اُٹھاتا ہے ابنائے دُنیا ہی کو دیکھتا ہے۔ چونکہ ایسے مخلصوں کی نظیر میں بہت ہی کم ہیں جو خدا تعالیٰ کے ساتھ کامل تعلقات کا نمونہ ہوں اس لیے اس طرف توجہ ہی نہیں۔ برخلاف اس کے دُنیا پرستوں کی نظیریں نظر آتی ہیں۔ اس لیے ہر شخص اس طرف کو جھکتا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف بہت ہی کم لوگ آتے ہیں کیونکہ خُدا کی راہ اختیار کرنا دُنیا سے باہر ہو جانا ہے۔ جبتک انسان ایک موت اختیار نہیں کر لیتا اس راہ سے داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا ہے۔ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا[۱]۔

---

[۱] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۷ صفحہ ۳ مورخہ ۳۱ ؍جولائی ۱۹۰۵ء

یکم اگست ۱۹۰۵ء

دربار شام

سڑوعہ ضلع ہوشیارپور سے آتے ہوئے دو بھائی داخلِ بیعت ہوئے۔ فرمایا:
بیعت میں داخل ہونیوالوں کے اسماء کو باقاعدہ لکھا جاوے۔ اگر یہ سب نام لکھے جائیں تو ان مشکلات کا سامنا نہ ہو جو بعض وقت پیش آتی ہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے ایک خط کا ذکر ہوا جو انہوں نے منشی حسین بخش صاحب تحصیلدار پنڈی گھیپ حال رخصتی قادیان کے نام لکھا۔ فرمایا:-
معلوم نہیں وُہ کونسی بدی تھی جس نے اسکو سلسلہ کی شناخت سے محروم رکھا تاہم جب تک وہ زندہ ہے ہم اس پیشگوئی کی کوئی تاویل نہیں کرتے جو اس کے متعلق ہے کہ وہ آخر رجوع کرے گا۔ مَیں جانتا ہوں کہ اوائل میں وہ بڑا اخلاص ظاہر کیا کرتا تھا۔ بٹالہ کے سٹیشن پر خود اس نے حامد علی سے لوٹا لے کر مجھے وضو کرایا اور جب مَیں اُٹھتا تو میرا جوتا اُٹھا کر آگے رکھ دیتا تھا۔ اس میں دوسرے مولویوں کی نسبت ایک بات تو ہے وہ یہ کہ کسی بات کو مان لے تو دلیری کے ساتھ اس کا اعلان کر سکتا ہے۔

مثیلِ مسیح

فرمایا: مَیں حیران ہوں کہ میرا معاملہ تو بالکل صاف تھا۔ تین باتیں تھیں۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسٰی بھی تسلیم کر لیا اور امت کے مثلِ یہود ہو جانے کا بھی اقرار کر لیا۔ اور عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (حدیث) کو بھی تسلیم کیا۔ ان ساری باتوں کو تو مثیل کے طور پر مانا لیکن مسیح کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہی آئے گا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟
یہ تو ایسی ہی مثال ہے جیسے دو بھائی ہیں۔ جب ان میں کوئی تقسیم ہو تو ہر ایک قسم کی چیزیں انہیں دی جاتی ہیں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں یہودیوں کے مثیل مانتے ہیں تو اس میں کیوں موت پڑتی ہے کہ ایک مسیح بھی تسلیم کر لیں۔

فرمایا: مَیں دیکھتا ہوں۔ براہین میں میرا نام اصحاب الکہف بھی رکھا ہے۔ اس میں یہ سِر ہے کہ جیسے وہ مخفی تھے اسی طرح پر تیرہ سو برس سے یہ راز مخفی رہا اور کسی پر نہ کُھلا۔ اور ساتھ اس کے جو رقیم کا لفظ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مخفی ہونے اس کے ساتھ ایک کتبہ بھی ہے۔ اور وہ کتبہ یہی ہے کہ تمام نبی

اس کے متعلق پیشگوئی کرتے چلے آتے ہیں۔[1]

۳؍ اگست ۱۹۰۵ء

خدا تعالیٰ کی تازہ وحی

رؤیا میں دیکھا کہ ایک لفافہ ہے جس میں کچھ پیسے ہیں۔ کچھ پیسے اس میں سے نکل کر باہر سامنے بھی پڑے ہیں۔ اس کے بعد الہام ہوا:

"تیرے لیے میرا نام چمکا"

فرمایا: اس الہام سے پہلے اگرچہ خواب میں پیسے دیکھے گئے جو کسی جھگڑے یا غم پر دلالت کرتے ہیں مگر وحیِ الٰہی صریح لفظوں میں دلالت کرتی ہے کہ اس کے بعد کوئی نشان ظاہر ہوگا جس کے واقعہ سے خدا تعالیٰ اپنے نام اور اپنی ہستی کو لوگوں پر ظاہر کرے گا۔[2]

الہام کا دروازہ کھلا ہے

فرمایا۔ جیسا ہمارے علماء کا عقیدہ ہے کہ اب الہام کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔ اگر یہ سچ ہوتا تو ایک عارف طالب تو زندہ ہی مرجاتا۔ خدا بخیل نہیں ہے۔ اس نے خود صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحۃ : ۷) کی دُعا سکھائی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ان نعمتوں کا دروازہ کھلا ہے۔ افسوس ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب غزنوی کا بھی یہی مذہب تھا کہ ہم نہیں جانتے کہ ہمیں جو الہام ہوتا ہے وہ شیطانی ہے یا الہامی[3] ہے۔ ہمیں تعجب آتا ہے کہ ان لوگوں کا ایسے الہام اور اس عقیدہ کے بعد کیا حال ہوتا ہے۔ اگر اس پر عمل کریں تو ممکن ہے شیطان کے فرمان کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر نہ کریں تو یہ شُبہ ہے کہ خُدا تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں۔ یہی حال الٰہی بخش اکونٹنٹ کے الہامات کا ہے۔ اُن سے تو موسیٰ کی ماں ہی اچھی رہی جس نے خدا تعالیٰ کے کلام پر ایمان قائم کرکے اپنے بچے کو دریا میں رکھ دیا۔[4]

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۸ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍ اگست ۱۹۰۵ء

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۳؍ اگست ۱۹۰۵ء
نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۲۸ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍ اگست ۱۹۰۵ء

[3] غالباً یہ لفظ "الٰہی" ہے جو کاتب کی غلطی سے "الہامی" لکھا گیا ہے۔ (مرتب)

[4] بدر جلد ۱ نمبر ۱۸ صفحہ ۲ مورخہ ۳؍ اگست ۱۹۰۵ء

دربارِ شام

(نوٹ از ایڈیٹر) شام کی تاریکی قلمبند کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی اس لیے میں نے خداداد قوتِ حافظہ کی مدد سے اپنے الفاظ میں اس روئداد کو لکھا ہے جو بزرگ اس اجلاس میں موجود تھے وہ اسے پڑھ کر انشاء اللہ سمجھ لیں گے کہ میں اس کے لکھنے میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوا ہوں۔

والحمد للہ علیٰ ذالک (ایڈیٹر الحکم)

انبیاء کے کلام میں عجز وانکسار کا اظہار

سلسلہ کلام اس امر سے شروع ہوا کہ تمام نبیوں اور راستبازوں کے کلام میں عجز وانکسار کے الفاظ اور اپنی کمزوری کا اظہار پایا جاتا ہے اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو اشتہار متعلقہ زلزلہ میں اس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان پر مولوی محمد حسین بٹالوی نے اعتراض کیا ہے۔ اعلیحضرت نے میرے معزز بھائی مفتی محمد صادق صاحب کو غالباً بائبل میں ایسے مقامات دیکھنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا۔ اس کا ذکر مفتی صاحب نے کیا۔ اس پر اعلیحضرت نے فرمایا:

اس قسم کے الفاظ تمام نبیوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کی معرفت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کے مقام کو شناخت کرتے ہیں۔ اس لیے نہایت انکسار اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ نادان جن کو اس مقام کی خبر نہیں ہے۔ وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں؛ حالانکہ یہ ان کی کمال معرفت کا نشان ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (النصر ۲-۴) آیا ہے۔ اس میں صاف فرمایا ہے تو استغفار کر۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے یہی مراد ہے کہ تبلیغ کا جو عظیم الشان کام تیرے سپرد تھا۔ دقائقِ تبلیغ کا پورا پورا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اس لیے اگر اس میں کوئی کمی رہی ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دے۔ یہ استغفار تو نبیوں اور راستبازوں کی جان بخش اور عزیز چیز ہے۔ اب اس پر نادان اور کوتاہ اندیش عیسائی اعتراض کرتے ہیں۔ جہاں استغفار کا لفظ اُنہوں نے سُن لیا۔ جھٹ اعتراض کر دیا؛ حالانکہ اپنے گھر میں دیکھیں تو مسیح کہتا ہے کہ مجھے نیک مت کہہ۔ اس کی تاویل عیسائی یہ کرتے ہیں کہ مسیح کا منشاء یہ تھا کہ مجھے خدا کہے۔ یہ کیسے تعجب کی بات ہے۔ کیا مسیح کو ان کی والدہ مریم یا اُن کے بھائی خدا کہتے تھے جو وہ یہی آرزو اس شخص سے رکھتے تھے کہ وہ بھی خُدا کہے۔ اُنہوں نے یہ لفظ تو اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے بھی نہیں سُنا تھا۔ وہ بھی اُستاد۔ اُستاد ہی کہا کرتے تھے۔ پھر یہ آرزو اس غریب سے کیونکر ان کو ہوئی۔ کیا وہ خوش

ہوتے تھے کہ کوئی انہیں خدا کہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اُن کو نہ کسی نے اوستاد[1] کہا اور نہ انھوں نے کہلوایا۔

پھر ایک اَور توجیہہ کرتے ہیں کہ دراصل وُہ شخص منافق تھا۔ اس لیے حضرت مسیح گویا خفا ہوئے کہ تو نیک کیوں کہتا ہے کیونکہ تو مجھے نہیں جانتا۔ یہ بھی بالکل غلط بات ہے کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ منافق تھا۔

غرض اصل بات یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اپنی عبودیت کا اعتراف کرتے رہتے ہیں اور دعاؤں میں لگے رہتے ہیں۔ احمق ان باتوں کو عیب سمجھتے ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کو دیکھا جاوے تو پھر ایسے احمق اعتراض کرنے والے تو خدا جانے کیا کیا کہیں۔ جیسے۔ اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ[2]۔

گرمیوں کو روحانی ترقی کے ساتھ مناسبت ہے

ایک مخلص نے پہاڑ پر جانے کے لیے اجازت چاہی۔ اس کے متعلق تذکرہ آنے پر فرمایا:-

اللہ تعالیٰ کے وعدے بالکل سچے ہیں جبکہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کوئی عذاب شدید آنے والا ہے تو اس کا کوئی وقت تو ہمیں معلوم نہیں ہے اس لیے بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ پہاڑوں پر کیا ہے۔ ہم تو گرمیاں یہاں ہی بسر کرتے ہیں کوئی ایسی تکلیف نہیں ہوتی۔ بلکہ مَیں ایک مرتبہ ڈلہوزی گیا۔ کسی مقدمہ کی تقریب تھی۔ جب مَیں وہاں پہنچا تو خلافِ عادت دیکھا نہ گرمی ہے نہ پسینہ آتا ہے۔ بارش ہوتی ہے اور بادل گھروں میں اندر گھس آتے۔ ہر وقت اندر بیٹھے رہنا نہ چلنے پھرنے کے لیے موقعہ ہے۔ اگر ہر روز چائے نہ پئیں تو اسہال آجائیں۔ ایک دو دن مَیں نے گذارے پھر سخت تکلیف محسوس ہونے لگی اور مَیں جب تک پٹھانکوٹ نہ پہنچ گیا طبیعت میں نشاط اور انشراح پیدا نہ ہوا۔ ان کو لکھ دو کہ وہ یہاں آجائیں۔ اگر بارش ہوتی رہی تو یہاں بھی موسم اچھا ہے اور ۱۵ ستمبر تک تو امید ہے موسم میں بڑی تبدیلی ہو جاتے گی۔

فرمایا: مَیں دیکھتا ہوں کہ گرمیوں کو بھی رُوحانی ترقی کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے مکہ جیسے شہر میں پیدا کیا اور پھر آپ ان گرمیوں میں تنہا غارِ حرا میں جا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے وہ کیسا عجیب زمانہ ہو گا۔ آپؐ ہی ایک پانی کا مشکیزہ اُٹھا کر لے جاتے ہوں گے۔

---

[1] کاتب کی غلطی ہے یہ لفظ "خُدا" ہونا چاہیے۔ (مرتب)

[2] ترجمہ:۔ اے اللہ میرے اور میری خطاؤں کے درمیان اسی طرح بُعد اور دُوری پیدا فرما دے جس طرح مشرق اور مغرب کے درمیان تُو نے بُعد پیدا فرمایا ہے۔ (مرتب)

انبیاء کی خلوت پسندی

اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُنس اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو پھر دُنیا اور اہلِ دُنیا سے ایک نفرت اور کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالطبع تنہائی اور خلوت پسند آتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی حالت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی محبت میں آپ اس قدر فنا ہو چکے تھے کہ آپ اس تنہائی میں ہی پوری لذت اور ذوق پاتے تھے ایسی جگہ میں جہاں کوئی آرام کا اور راحت کا سامان نہ تھا اور جہاں جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہو آپ وہاں کئی کئی راتیں تنہا گذارتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کیسے بہادر اور شجاع تھے۔ جب خدا تعالیٰ سے تعلق شدید ہو تو پھر شجاعت بھی آ جاتی ہے اس لیے مومن کبھی بُزدل نہیں ہوتا۔ اہلِ دُنیا بُزدل ہوتے ہیں۔ اُن میں حقیقی شجاعت نہیں ہوتی ہے۔

اس بات کو سُن کر خدا تعالیٰ سے جس قدر تعلقات شدید ہوتے ہیں اور ایسے لوگ تنہائی اور خلوت کو پسند کرتے ہیں بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پھر ان نبیوں اور رسولوں کے بیوی بچے کیوں ہوتے ہیں؟ وُہ بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا اعتراض کرنے والے نہیں سوچتے کہ ان لوگوں کی تو ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص تو کسی کے دروازے پر بھیک مانگنے جاوے اور ایک اس کا دوست ہو اور وہ محض اس سے ملنے ہی کے لیے گیا ہو۔ اب اگر وہ دوست اپنے دوست کے سامنے پلاؤ وغیرہ لا کر رکھ دیتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اس دوست کو تو اس کے کھانے میں لذت آتی ہے اور وہ گدا جو ہے اس کو خشک روٹی کا ٹکڑا دے دیا جاتا ہے۔ اگر زیادہ ٹھہرے تو پھر دھکے دے کر باہر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ معاملہ دوست سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے زیادہ قیام اور اس کے کھانے پینے سے خود اُسے ایک لذت آتی ہے۔

یہی حال ان نبیوں اور ماموروں کا ہوتا ہے۔ ان کے سامنے جو کچھ آتا ہے وُہ اُن کی نفسانی خواہشوں کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ وہ تو ساری لذت اور راحت اللہ تعالیٰ ہی کے ذکر اور شغل میں پاتے ہیں اور فی الحقیقت تنہائی ہی کو پسند کرتے ہیں جہاں وہ اپنے محبوب سے اپنے دل کی آرزوئیں اور تمنائیں پیش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس حالت میں کوئی ان کو دیکھ نہ سکے علاوہ بریں یہ تعلقات ان کی تکمیل کے لیے ہوتے ہیں۔ میں نے بارہا بیان کیا ہے کہ اخلاق کے سارے پہلو پورے نہیں ہوتے جب تک ظلم کی حالتیں پیش نہ آئیں۔ نبیوں اور رسولوں کے لیے شدائد اور مشکلات بھی آتے ہیں اور یہ مشکلات بھی ان کے اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسے تمام اخلاق کا اظہار ہوا ہے کسی دُوسرے کو یہ موقع نہیں ملا۔ مکہ معظمہ میں جبتک آپؐ رہے تو ہر قسم کی تکالیف اور مشکلات کا سامنا رہا جس میں آپؐ کے کمالِ صبر اور رضا بالقضا کے

پہلو کا ظہور ہوا۔ پھر جب آپؐ فاتح ہوکر ایک بادشاہ کی حیثیت سے داخل ہوئے تو حالانکہ آپ ان سب کو قتل کرسکتے تھے اور اس قتل میں حق پر بھی تھے لیکن باوجود مقدرت کے ان سب کو معاف کر دیا جس سے آپؐ کے کمال ایثار، سخاوت، عفو اور درگذر کا ثبوت مل گیا۔ حضرت مسیح کو یہ موقعہ نصیب نہیں ہوا۔ اور وہ ان دونوں پہلوؤں کو ظاہر نہیں کرسکے۔[1]

۵؍ اگست ۱۹۰۵ء

دربارِ شام

سلسلہ کے لیے کشش

حضرت حجۃ اللہ کے تشریف فرما ہوتے ہی ایک حاجی صاحب درد نے پیش ہوکر بیعت کی درخواست کی جس پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ ایک دو دن کے بعد کر لینا۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام یوں شروع ہوا کہ :

کثرت کے ساتھ لوگ اس سلسلہ میں داخل ہو رہے ہیں بظاہر اس کے وجوہ اور اسباب کا ہمیں علم نہیں۔ ہماری طرف سے کون سے واعظ مقرر ہیں جو لوگوں کو جا کر اس طرف بُلاتے ہیں یہ محض خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک کشش لگی ہوئی ہوتی ہے جس کے ساتھ لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ یہی حال یہاں بھی ہے کہ اس نے ایک کشش رکھ دی ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو پہنچانا چاہتا ہے اس حد تک اس نے کشش رکھ دی ہے۔

مشروط بیعت

پھر ذکر آیا کہ بعض لوگ بیعت کے خطوط بھیجتے ہیں تو اُن میں درج ہوتا ہے کہ ہمارا فلاں کام ہو جاوے یا اس قدر روپیہ مل جاوے تو بیعت کریں گے۔

اس پر فرمایا :-

ایسی شرائط والے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔ صدیقی فطرت والے تو کسی نشان یا معجزہ کا طلب کرنا اپنی ہتکِ شان سمجھتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کون سے نشانات دیکھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عرب کی موجودہ حالت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی مصلح آوے۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا تو آپؐ کے اخلاق اور آپؐ کی راستبازی ہی ایک عظیم الشان معجزہ ان کے واسطے ہوگئی اور انہوں نے دعویٰ کے

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۸ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۱۰؍ اگست ۱۹۰۵ء

سُنتے ہی قبول کر لیا۔ ایسے لوگوں کے لیے کسی نشان کی حاجت نہیں ہوئی۔ جو لوگ اس قسم کی شرائط پیش کرتے ہیں کہ اس قدر آمدنی ہو جاوے تو ایمان لائیں گے وہ گویا یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان لا کر اللہ تعالیٰ پر یا اس کے رسول پر احسان کرتے ہیں۔ وہ احمق نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کو اُن کی پروا کیا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہدایت کی راہ ان کو بتائی۔ اور اپنے مامور کو ہدایت کے واسطے بھیجا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا صاف احسان ہے۔ وُہ اُلٹا خُدا تعالیٰ پر احسان رکھنا چاہتے ہیں۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نشان اللہ کے پاس ہیں۔ اور دوسری جگہ فرماتا ہے۔ زمین و آسمان میں نشان ..... ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ کیسے بیوقوف ہیں جو اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ وقت کسی نبی کی ضرورت کا ہے یا نہیں — حالتِ زمانہ خود اس پر شہادت دیتی ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر اور وہ نشان چاہتے ہیں؟

ہر شخص اس امر کا محتاج ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو اور وہ اطمینان کے ساتھ اس دنیا سے جاوے۔ جب اس امر کی ضرورت ہے تو یہ شرط کیسی بیہودہ اور فضول ہے کہ وہ کام ہو یا اس قدر آمدنی ہو تو بیعت کروں گا۔ ضرورت جو ہر وقت مدِنظر ہونی چاہیے وہ تو حسنِ انجام کی ضرورت ہے۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ یہ باتیں کیوں ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ کی عظمت دل پر نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ کے جلال و جبروت کا دل پر اثر ہو اور اس کی ہستی پر ایمان ہو تو دل ڈر جاوے اور یہ فسق و فجور اور شرور نفسانی جس میں دُنیا مبتلا ہے اس سے نجات پا جائیں اور اس کی طرف آنے میں ایسی شرطیں نہ لگائیں۔

کیسی حیرانی کی بات ہے۔ کیا بیمار طبیب کے پاس جا کر اُسے کچھ نذرانہ دیتا ہے یا اس سے یہ شرط کرتا ہے کہ اگر مَیں اچھا ہو جاؤں تو مجھے اس قدر نذرانہ دینا؟

جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ خُدا تعالیٰ کی طرف آتے ہی نہیں۔ ان کا مقصد اور غرض تو وہ کمبخت دُنیا ہوتی ہے جس کو وہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کے دل میں یہ سوز و گداز اور جلن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہو اور اس کی طرف دلی رجُوع اور توجہ ہو جاوے اگر یہ قلق اور کرب پیدا ہو تو ایسی باتیں نہ کریں کیونکہ بیمار خواہ جسمانی ہو یا رُوحانی جب وہ اپنی مرض کو محسوس کر لیتا ہے تو وہ بے اختیار ہو کر تڑپتا پھرتا ہے اور طبیب کے کہنے پر اس قدر ایمان لاتا ہے کہ جو کچھ وہ دیدے اسے اپنی بہتری کے لیے کھا لیتا ہے۔ یہ عجیب بات کہ آنا تو دین کی طرف اور اس کے لیے دُنیا کی شرط لگانا!!!

بعض لوگ اس قسم کے بھی ہوتے ہیں کہ ذرا دُنیا کا کوئی ابتلا پیش آجاوے تو سارا جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے ہی لوگ ہماری جماعت میں داخل ہوں تو ان سے کیا فائدہ اور صحابہؓ سے کیا مقابلہ صحابہؓ کی عجیب حالت تھی۔ اُن کے بیوی بچّے بھی تھے۔ پھر بھی ہزاروں خدا تعالیٰ کی راہ میں مارے گئے۔ اگر

وہ دین کو دُنیا پر مقدم نہ کر لیتے تو کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنی جانوں کو اس طرح پر خدا کی راہ میں دیدیتے۔ لکھا ہے کہ ایک صحابی کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں اور وہ کھا رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ دوسرا شہید ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے نفس کو سخت ملامت کی کہ تیرا بھائی شہید ہو گیا ہے اور تُو ابھی باقی ہے۔ یہ تھی ان لوگوں کی ایمانی حالت۔

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ دین کے ساتھ دُنیا جمع نہیں ہو سکتی۔ ہاں خدمتگار کے طور پر تو بیشک ہو سکتی ہے لیکن بطور شریک کے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ یہ کبھی نہیں سُنا گیا کہ جس کا تعلقِ صافی اللہ تعالیٰ سے ہو وہ ٹکڑے مانگتا پھرے۔ اللہ تعالیٰ تو اس کی اولاد پر بھی رحم کرتا ہے۔ جب یہ حالت ہے تو پھر کیوں ایسی شرطیں لگا کر ضدیں جمع کرتے ہیں۔ ہماری جماعت میں وہی شریک سمجھنے چاہئیں جو بیعت کے موافق دین کو دنیا پر مقدم کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص اس عہد کی رعایت رکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف حرکت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو طاقت دے دیتا ہے۔

صحابہؓ کی حالت کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے ان کو پاک صاف کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو دیکھو کہ آخر وہ اسلام میں آکر کیسے تبدیل ہو گئے۔ اسی طرح پر ہمیں کیا خبر ہے کہ ہماری جماعت میں وہ کون سے لوگ ہیں جن کے ایمانی قویٰ ویسے ہی نشوونما پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے۔ اگر ایسے لوگ نہ ہوں جن کے قویٰ نشوونما پا کر ایک جماعت قائم کرنے والے ہوں تو پھر سلسلہ چل کیسے سکتا ہے۔ مگر یہ خوب یاد رکھو کہ جس جماعت کا قدم خدا کے لیے نہیں اس سے کیا فائدہ؟ خدا کے لیے قدم رکھنا امرِ سہل بھی ہے جبکہ خدا تعالیٰ اس پر راضی ہو جاوے اور رُوح القدس سے اس کی تائید کرے۔ یہ باتیں پیدا نہیں ہوتی ہیں۔ جب تک اپنے نفس کی قربانی نہ کرے اور نہ اس پر عمل ہو۔ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النّٰزعٰت : ۴۱، ۴۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہشتی زندگی اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ہوائے نفس کو روک دیں۔ صوفیوں نے جو فنا وغیرہ الفاظ سے جس مقام کو تعبیر کیا ہے وہ یہی ہے کہ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى کے نیچے ہو۔[1]

۷؍اگست ۱۹۰۵ء قبل از عشاء

باربار ہونے والے الہامات

ایک شخص کا سوال پیش ہوا کہ ایک جگہ مُبَارِكٌ وَّ مُبَارَكٌ وَّكُلُّ اَمْرٍ مُّبَارَكٍ يُّجْعَلُ فِيْهِ والا الہام

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۸ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۵ء

چھوٹی مسجد کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے اور دوسری جگہ وہی الہام بڑی مسجد کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے۔

حضرت نے فرمایا :

بعض الہام بار بار کئی دفعہ ہوتے ہیں اور ہر دفعہ وہ جُدا شان رکھتے ہیں إِنِّي مُهِينٌ مَّنْ أَرَادَ إِهَانَتَكَ والا الہام بہت دفعہ ہوا ہے اور ہر دفعہ اس کا ظہور کسی نئے رنگ میں ہوا ہے۔ ہر دفعہ اہانت کنندہ اور اہانت یافتہ کوئی نیا وجود ہوتا رہا ہے۔ ایسا ہی الہام إِنِّي مَعَ الْأَفْوَاجِ آتِيْكَ بَغْتَةً بہت کثرت سے ہوا ہے۔ اور ہمیشہ خدائی فوجوں کی نصرت سے ایک نیا معجزہ پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح اکثر الہامات بار بار ہوتے ہیں اور ہر دفعہ کوئی نیا رنگ رکھتے ہیں۔ اسی طرح قرآنِ شریف میں بھی بہت سی آیات ہیں جو اپنے اپنے موقعہ پر جُدا مطابقت رکھتی ہیں، اگرچہ ظاہر الفاظ ایک ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن: ۳۰) لیکن وہ مقامات کتب مجھے دکھانے چاہئیں جن پر یہ سوال پیدا ہوا ہے۔

حقیقتِ رُوح القدس

کسی شخص کا سوال پیش ہوا کہ آپ نے جبرائیل کے متعلق جو تحریر کی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا خیال بھی سید احمد کی طرح ہے کہ رُوح الامین انسان کے اندر ہی ہے اور اس کے سوائے کوئی اور رُوح القدس اور جبرائیل نہیں۔ فرمایا :

یہ بالکل غلط ہے۔ سید احمد کے ساتھ اس معاملہ میں ہمارے خیال کو کوئی مطابقت نہیں۔ ہمارا منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُوح الامین کا نزُول انسان پر اس وقت ہوتا ہے جبکہ انسان خود تقدّس اور تطہّر کے درجہ کو حاصل کر کے اپنے اندر بھی ایک حالت پیدا کرتا ہے جو نزُولِ رُوح الامین کے قابل ہوتی ہے۔ اس وقت گویا ایک رُوح الامین ادھر ہوتا ہے تب ایک اُدھر سے آتا ہے۔ یہ بات ہم اپنے حال اور اپنے تجربہ سے کہتے ہیں نہ کہ صرف قال ہی قال ہے۔ اس کی بجلی کے ساتھ خوب مثال مطابق آسکتی ہے۔ جب کسی جسم میں خود بھی بجلی ہوتی ہے تو آسمانی بجلی اُس پر اثر کرتی ہے۔ تدبّر سے دیکھا جاتے تو قرآنِ شریف سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

خلوت میں عبادات اور دعا کا لُطف

آجکل سخت گرمی پڑنے اور برسات کے نہ ہونے کا ذکر تھا۔ فرمایا :

ایسے موقعہ پر نمازِ استسقاء کا پڑھنا سنّت ہے۔ مَیں جماعت کے ساتھ بھی سنّت ادا کروں گا۔ مگر میرا

ارادہ ہے کہ باہر جا کر علیحدگی میں نماز پڑھوں اور دُعا کروں۔ خلوت میں اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کرنے اور دُعا مانگنے کا جو لُطف ہے وہ لوگوں میں بیٹھ کر نہیں ہے۔ اور بھی دُعاؤں کا ذخیرہ ہے۔ اسی مطلب کے واسطے مَیں نے باغ میں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی ہے جس کو مسجد البیت کہنا چاہیے۔

فرمایا: پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دو رنگ کے تھے۔ ایک ظاہر اور ایک مخفی۔ آپؐ کی پہلی عبادت وہی تھی جو آپؐ نے غارِ حرا میں کی۔ جہاں کئی کئی دن ویرانہ پہاڑی کی غار میں جہاں ہر طرح کے جنگلی جانور اور سانپ چیتے وغیرہ کا خوف ہے دن رات اللہ تعالیٰ کے حضوُر میں عبادت کرتے تھے اور دُعائیں مانگتے تھے۔

قاعدہ ہے کہ جب ایک طرف کی کشش بہت بڑھ جاتی ہے تو دُوسری طرف کا خوف دل سے دُور ہو جاتا ہے۔ بعض عورتوں کو جو بہت ہی ڈرنے والی طبیعت کی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ کسی بچے کی بیماری کے وقت اندھیری راتوں میں ضرورتاً ایسی جگہ جاتی ہیں جہاں دن کو نکلنا ان کے واسطے دشوار ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ زلزلہ کے وقت خوف سے اُونچے مکان سے نیچے کُودنے لگا۔ لوگوں نے پکڑ لیا۔

جب خوفِ الٰہی اور محبت غالب آتی ہے تو باقی تمام خوف اور محبتیں زائل ہو جاتی ہیں ایسی دُعا کے واسطے علیحدگی بھی ضروری ہے۔ اسی پورے تعلق کے ساتھ انوار ظاہر ہوتے ہیں اور ہر ایک تعلق ایک سِتر کو چاہتا ہے۔

ایک ہی خواہش فرمایا :

آجکل حبس اور گرمی اور برسات کی کمی کسی امر کی تمہید ہے جو آگے ظاہر ہوگا۔ معلوم نہیں کہ کیا ہونیوالا ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہر چہ بادا باد۔ مگر خُدا کی ہستی دُنیا پر ثابت ہو جائے اور دینِ اسلام کی حقیقت ظاہر ہو جائے خواہ کسی طرح سے ہو۔

وفاتِ مسیح اجماعی مسئلہ ہے

ایک شخص نے سوال کیا کہ اسلامی کتب میں حیاتِ مسیح کی بات کہاں سے آگئی ؟

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ :

کہ یہ بات ایسی ہی ہے جیسا کہ ہند کے مُسلمان رسومِ شادی و مرگ اب تک پُرانے ہندوؤں کی طرح ادا کرتے ہیں۔ جب بہت سے عیسائی اور یہودی مسلمان ہوئے تو کچھ پرانے خیالات کا بقیہ ساتھ لاتے۔

وہی خیالات مُسلمانوں میں منتقل ہوکر اور احادیث کی غلط فہمی بھی ساتھ مل کر یہ فاسد عقیدہ پیدا ہوگیا اور کتابوں میں درج ہوگیا؛ ورنہ صدرِ اسلام میں اس کا نام ونشان نہ تھا، بلکہ تمام نبیوں کی موت پر اجماع تھا لیکن ان لوگوں میں بھی بہتیرے ایسے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت کے قائل ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ تو تین دن تک مرے رہے۔ کوئی کہتا ہے کہ سات دن تک مرے رہے اور کوئی ہمیشہ کے لیے ان کا مرجانا مانتا ہے۔ بہرحال اصل اجماعِ اسلامی وہ ہے جو صحابہؓ کے درمیان ہوا۔ صحابہؓ میں سب سے پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا کہ تمام انبیاء فوت ہوچکے ہیں۔ بغیر اس کے صحابہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرنے کے بعد کبھی صبر نہیں آسکتا تھا۔ یہ مبارک اجماع حضرت ابوبکرؓ کے ذریعہ سے ہوا۔ اور اگر کسی کو یہ وہم تھا بھی کہ کوئی نبی زندہ ہے تو وُہ بھی دُور ہوگیا اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا صدمہ صحابہؓ کے دل سے اُٹھا کہ نبی تو سب مرا ہی کرتے ہیں۔ اگر کسی فردِ واحد کو قصورِ درایت کے سبب کچھ غلطی لگی ہوئی تھی تو وہ بھی دُور ہوگئی۔ خود خدا تعالیٰ کے کلام میں اس امر کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ کوئی آسمان پر نہیں جاتا۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار نے آسمان پر چڑھنے کا معجزہ طلب کیا تو فرمایا: قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل : ۹۴) یعنی بشر رسول کبھی کوئی آسمان پر نہیں چڑھا۔ اور فرمایا۔ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ (آل عمران : ۱۴۵) یعنی کوئی نبی نہیں جو فوت نہیں ہوچکا۔ پس اگر یہ نبی مرجائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم دین سے پھر جاؤ گے۔ کتبِ سماوی اور تاریخِ زمانہ بھی یہی شہادت دیتی ہیں۔ کوئی نظیر ایسی نہیں کہ پہلے کوئی دو چار نبی آسمان پر گئے ہوں۔ خود مسیح نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ یوحنا ہی الیاس ہے۔ ہاں جس طرح آدمؑ۔ موسیٰؑ۔ نوحؑ اور دُوسرے نبی آسمان پر گئے اسی طرح بیشک حضرت عیسیٰ بھی گئے تھے؛ چنانچہ شبِ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو آسمان پر دیکھا۔ حضرت عیسیٰ کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ افسوس ہے کہ ان لوگوں کی قوتِ شامہ ہی ماری گئی ہے خود زمانہ کی حالت سے بُو آتی ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا عیسائیت کی پہلی اینٹ ہے۔ بعض لوگ میری نسبت اعتراض کرکے کہتے ہیں کہ مَیں نے بھی براہین میں ایسا ہی لکھا تھا مگر وہ نہیں سمجھتے کہ یہی بات ہماری صداقت کی گواہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کوئی منصوبہ بازی نہیں کرتے۔ خود اسی کتاب براہین میں ہمارا نام مسیح رکھا گیا اور خدا تعالیٰ کے تمام وعدے اسی کے اندر ہیں۔ اگر یہ غلطی مجھ سے براہینِ احمدیہ میں صادر نہ ہوتی تو ایک بناوٹ معلوم ہوسکتی تھی[1]۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۹ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰/اگست ۱۹۰۵ء

۸ر اگست سنہ ۱۹۰۵ء

دربارِ شام

موجودہ دنیا کی حالت

فرمایا :

آج مَیں نے بارش کے لیے دُعا کی تھی۔ دُعا کے ساتھ ہی دل میں یہ خیال گذرا کہ یہ حبس اور امساکِ باراں اللہ تعالیٰ کے قضاء و قدر کے موافق ہے اور اس میں دخل دینا مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے :

"دُنیا میں ایک نذیر آیا لیکن دُنیا نے اسے قبول نہ کیا۔ پر خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔"

ہر قسم کے مصائب شدائد اس کے زور آور حملوں میں آتے ہیں اور یہ سب ایک قسم کی پیشگوئیاں ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے بہر حال ہمارے لیے مفید ہے۔ کیا عجب کہ قحط کے رنگ میں بھی کوئی حملہ ظاہر ہونے والا ہو۔

فرمایا : دُنیا کی حالت اور رنگ دیکھا جاوے تو وہ بہت کچھ بدلا ہوا ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ایسی حالت ہو گئی ہے کہ گویا حُسنِ ظن کا موقعہ ہی نہیں رہا۔ کیونکہ اگر ہر پہلو سے بدظنی ہی ظاہر ہو تو انسان کہاں تک اس پر حسن ظن کرے گا۔ مَیں حیران ہوتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ دُنیا میں سوائے دہریّت، مکر و فریب کے اور کوئی بات نظر نہیں آتی۔ بالکل طبیعتیں دُنیا ہی پر مائل ہو گئی ہیں یہاں تک کہ دین کا کام بھی اگر کوئی اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو اس میں بھی ان باتوں کا دخل ہے۔ یا تو وہ محض دُنیا کا لالچ ہے یا دُنیا کی ملونی ہے۔ ایسی حالت میں مَیں نے سوچا ہے کہ اگر کوئی مرتا ہے تو پھر مرے۔

مَیں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ تو اور اور باتوں کے لیے روتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ اَور باتوں کو چھوڑو مجھے تو اس کا فکر ہو رہا ہے کہ خدا کی ہستی ہی پر ان کو یقین نہیں رہا۔

اس مقام پر حضرت حکیم الامت نے عرض کی کہ کل مَیں نے اپنے درس میں ایک موقعہ پر اپنی جماعت کو خطاب کر کے کہا کہ سُنو! تم نے اس سلسلہ میں داخل ہو کر کیا لیا ؟ دُنیا تو تم پر لعنت بھیجتی ہے اگر خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی تمہارا معاملہ صاف نہ ہو۔ اور باہم بغض، کینہ اور دشمنی رہی تو پھر خدا سے کیا لیا ؟

حضرت اقدس نے فرمایا :

خدا سے کیا لینا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بالکل سچ ہے۔

حضرتِ منشی احمد جان کا ذکرِ خیر

منشی احمد جان صاحب مرحوم و مغفور مشہور صوفی لودھیانوی کے ذکرِ خیر میں حضرت حکیم الامت نے عرض کیا کہ انہوں نے طبِ رُوحانی کے سلسلہ میں اور بھی دو تین جلدیں لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن حضور کے دعویٰ کو سُن کر اُنہوں نے اس طریق کو چھوڑ دیا اور اسے محض کھیل تماشہ قرار دیا۔ جس سے مجھے ان کے ساتھ بڑی محبت ہو گئی۔

حضرت حجۃ اللہ نے فرمایا :

مجھے بھی اُنہوں نے ایسا ہی خط لکھا تھا

دُعا ہی اصلیت ہے

غرض آپ کا ذکرِ خیر ہوتا رہا۔ ان کے اخلاص کے ذکر میں توجّہ اور سلبِ امراض کے علم کا ذکر ہوا۔ اس پر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام میں جو طریقِ شفا کا رکھا ہے وہ تو دُعا ہی کا طریق ہے۔ اپنے نفس اور توجہ پر بھروسہ کرنا یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے۔ لیکن جب انسان خدا سے دُعا کرتا ہے تو یہ سب باتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ اور انسان پھر اصل پناہ کی طرف دوڑتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ دُعا ہی اصلیت ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ زرا خبط ہے۔

دُعا کی عجیب عجیب تاثیریں میں نے تجربہ کی ہیں۔ ایک بار میں دردِ دانت سے سخت تکلیف میں تھا عمردراز نام ایک گرداور ہمارے ہاں آیا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ دانت کے درد کا علاج بھی آپ کو معلوم ہے۔ اس نے کہا۔ علاجِ دنداں اخراجِ دنداں۔ میں نے جب یہ بات سُنی تو خیال کیا کہ دانت کا نکلوانا بھی ایک عذاب ہی ہے۔ میں اس وقت ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا اور درد کی بیقراری کی وجہ سے سر چارپائی کی پائنتی پر رکھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے ذرا سی غنودگی ہوئی اور الہام ہوا وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔ اور اس کے ساتھ ہی معاً درد جاتا رہا۔

میں یقیناً جانتا ہوں کہ دُعا کے سلسلہ میں ہزار ہا خزائن معارف کے مخفی ہیں۔ جو شخص دوسری طرف توجہ کرے گا وہ ان خزائن سے محروم رہ جائے گا کیونکہ جب انسان اس راہ کو جس پر سایہ دار درخت ہوں اور پانی کا سامان ہو چھوڑ دے تو وہ ان تمام آرام کے سامانوں سے محروم رہے گا یا نہیں کسی کے پہلو میں دو دل تو نہیں ہو سکتے ایک ہی طرف توجہ کرے گا۔

فِرَقِ ضالہ نے اسی وجہ سے نقصان اُٹھایا کہ حقیقی راہ کو اُنھوں نے چھوڑ دیا۔ شیعہ وغیرہ جو حسین حسین پکارتے رہے اسی سبب سے محروم رہے کہ اُنھوں نے انسان کو بُت بنا لیا۔ اور ان کے سینہ میں وُہ

نورِ عرفان کا نہ رہا۔

اس کے بعد حضور اپنے زمانہ طالب علمی اور شیعہ اُستاد کے بعض حالات بیان فرماتے رہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ قوم کہاں تک حقائق و معارف سے محروم رہ گئی۔[1]

۹؍اگست ۱۹۰۵ء

دربارِ شام

حقیقی دین سے محروم رہ جانے کا باعث

پشاور سے ایک نوجوان ہندو حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کے واسطے آیا ہوا تھا۔ اس نے مختصراً اپنے حالات بیان کیے کہ کس طرح پر الحکم کے پڑھنے اور ایک احمدی کی صحبت نے اُسے مشتاقِ زیارت بنایا۔ اس تحریک پر حضرت حجۃ اللہ نے ذیل کی تقریر فرمائی:

سب سے بڑی بات تو دین ہے جس کو حاصل کر کے انسان حقیقی خوشحالی اور راحت کو حاصل کرتا ہے۔ دُنیا کی زندگی تو بہرحال گذر ہی جاتی ہے ؎

شبِ تنور گذشت و شبِ سمور گذشت

یعنی راحت اور رنج دونوں گذر جاتے ہیں لیکن دین ایک ایسی چیز ہے کہ اس پر چل کر انسان خدا تعالیٰ کو راضی کر لیتا ہے۔ یقیناً جانو کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک راضی نہیں ہوتا اور نہ کوئی شخص اس تک پہنچ سکتا ہے جب تک صراطِ مستقیم پر نہ چلے۔ وہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات صفات کو شناخت کرے اور ان راہوں اور ہدایتوں پر عملدرآمد کرے جو اس کی مرضی اور منشاء کے موافق ہیں۔ جب یہ ضروری بات ہے تو انسان کو چاہیے کہ دین کو دُنیا پر مقدم کرے اور یہ کچھ مشکل امر نہیں۔ دیکھو انسان پانچ سات روپیہ کی خاطر جو دُنیا کی ادنیٰ ترین خواہش ہے اپنا سر کٹا لیتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا خیال ہو اور اسے راضی کرنا چاہے تو کیا مشکل ہے۔

انسان حقیقی دین سے کیوں محروم رہ جاتا ہے اس کا بڑا باعث قوم ہے۔ خویش و اقارب دوستوں اور

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۰ صفحہ ۱۱ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۵ء

قوم کے تعلقات کو ایسا مضبوط کر لیتا ہے کہ وہ ان کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ یہ نجات کا دروازہ اس پر کھل سکے۔ یہ ایک قسم کی نامردی اور کمزوری ہے لیکن یہ شہیدوں اور مَردوں کا کام ہے کہ ان تعلقات کی ذرا بھی پروا نہ کرے اور خدا تعالیٰ کی طرف قدم اُٹھائے۔

بعض کمزور فطرت لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت ہی کرنی ہے خواہ کسی مذہب میں ہوں۔ مگر وُہ نہیں جانتے کہ آج جس قدر مذاہب موجود ہیں ان میں کوئی بھی مذہب بجُز اسلام کے ایسا نہیں جو اعتقادی اور عملی غلطیوں سے مبّرا ہو۔ وہ سچّا اور زندہ خُدا جس کی طرف رجُوع کر کے انسان کو حقیقی راحت اور روشنی ملتی ہے جس کے ساتھ تعلق پیدا کر کے انسان اپنی گناہ آلود زندگی سے نجات پاتا ہے۔ وہ اسلام کے سوا نہیں مل سکتا۔ یہی پہلا زینہ ہر قسم کی رُوحانی ترقیوں کا ہے۔ اگر اس کی توفیق مل جائے تو پھر خدا اس کا اور وہ خدا کا ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب ایک شخص محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی قسم کی نفسانی اغراض کے بغیر ایک قوم سے قطع تعلق کرتا ہے اور خدا ہی کو راضی کرنے کے لیے دوسری قوم میں داخل ہوتا ہے تو ان تعلقات قومی کے توڑنے میں سخت تکلیف اور دُکھ ہوتا ہے مگر یہ بات خُدا تعالیٰ کے نزدیک بڑی قابل قدر ہے اور یہ ایک شہادت ہے جس کا بڑا اجر اللہ تعالیٰ کے حضُور ملتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال : ۸) یعنی جو شخص ایک ذرّہ برابر بھی نیکی کرتا ہے اُسے بھی ضائع نہیں کرتا بلکہ اجر دیتا ہے تو پھر جو شخص اتنی بڑی نیکی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے ایک موت اپنے لیے روا رکھتا ہے اسے اجر کیوں نہ ملے؟ جو شخص خدا تعالیٰ کے لیے اپنے تعلقات کو توڑتا ہے وہ فی الحقیقت ایک موت اختیار کرتا ہے کیونکہ اصل موت بھی ایک قسم کا قطع تعلق ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے لیے ان تعلقات کو توڑنا جو اپنی قوم اور خویش و اقارب سے ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔ بسا اوقات یہ روک بڑی زبردست روک انسان کو خدا کی طرف آنے کے لیے ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دوستوں کا ایک گروہ ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی اور دُوسرے رشتہ دار ہیں ان کی محبت اور تعلقات نے اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی صداقت اور سچائی کو تسلیم کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بجز اس کے نجات نہیں۔ لیکن ان تعلقات کی بنا پر اقرار کرتا ہے کہ یہ راہ جس پر مَیں چلتا ہوں خطرناک اور گندی راہ ہے مگر کیا کریں جہنّم میں پڑنا منظور ان قومی تعلقات کو کیونکر چھوڑ دیں۔ ایسے لوگ نہیں جانتے کہ یہ صرف زبان سے کہنا تو آسان ہے کہ جہنم میں پڑنا منظور۔ اگر انہیں اس دُکھ درد کی کیفیت معلوم ہو تو پتہ لگے۔ ایک آنکھ میں ذرا درد ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس قدر تکلیف ہے۔ پھر جہنّم تو وہ جہنّم ہے جس کی بابت قرآنِ شریف میں آیا ہے۔ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (طٰهٰ : ۷۵) ایسے لوگ سخت غلطی

پر ہیں۔ اس کا تو فیصلہ آسان ہے۔ دنیا میں دیکھ لے کہ کیا وہ دُنیا کی بلاؤں پر صبر کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں تو پھر یہ کیونکر سمجھ لیا کہ عذاب جہنم کو برداشت کریں گے۔

بعض لوگ تو دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں مگر یہ لوگ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یقیناً سمجھو کہ جہنم کا عذاب بہت ہی خطرناک ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرما دیا ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران : ۸۶) یعنی جو شخص اسلام کے سوا کسی اَور دین کا خواستگار ہو وہ آخر کار ٹوٹے میں رہے گا۔

جس طرح پر انسان کا ایک حُلیہ ہوتا ہے اور وہ اسی سے شناخت کیا جاتا ہے اسی طرح پر اللہ تعالےٰ کی ذات اور اس کے صفات بھی ایک طرح پر واقع ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ مختلف مذاہب والے خدا تعالیٰ کی جو شکل اور صفات پیش کرتے ہیں وہ سب کی سب درست ہوں۔ عیسائی، ہندو، چینی ہر ایک جدا جدا صفات پیش کرتا ہے پھر کون عقلمند یہ مان لے گا کہ ہر ایک اپنے اپنے بیان میں سچا ہے۔

سچے مذہب کی علامات

ماسوا اس کے سچائی کے خود انوار و برکات ہوتے ہیں یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ وہ نشانات اور انوار و برکات کس خدا کو مان کر ملتے ہیں اور کس دین میں وہ پائے جاتے ہیں۔ ایک شخص ایک نسخہ کو استعمال کرتا ہے اگر اُس نسخہ میں کوئی خوبی اور اثر ہے تو صاف ظاہر ہے کہ چند روز کے استعمال کے بعد ہی اس کی مفید تاثیریں معلوم ہونے لگیں گی۔ لیکن اگر اس میں کوئی خوبی اور تاثیر نہیں ہے تو خواہ ساری عمر اُسے استعمال کرتے جاؤ کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ اس معیار پر اسلام اور دوسرے مذاہب کی سچائی اور حقیقت کا بہت جلد پتہ لگ جاتا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی تاثیر اور انوار و برکات کے لیے کسی گذشتہ قصّہ کا حوالہ نہیں دیتا اور نہ صرف آئندہ کے وعدہ ہی پر رکھتا ہے بلکہ اس کے پھل اور آثار ہر وقت اور ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں اور اسی دنیا میں ایک سچا مسلمان اُن ثمرات کو کھا لیتا ہے۔

بتلاؤ ایسے مذاہب انسان کو کیا امید دلا سکتے ہیں جن میں توبہ تک منظور نہیں۔ ایک گناہ کر کے جب تک کروڑوں جُون میں نصیب نہ ہو لیں خدا تعالیٰ سے صلح ہی نہیں ہو سکتی وہاں کیا پائے گا۔ اس کی رُوح کو راحت اور تسلّی کیونکر مل سکے گی۔ مذہب کی سچائی کی بڑی علامت یہ ہے کہ اس راہ سے دُور افتادہ خدا تعالیٰ کے نزدیک آ جاتا ہے۔ جیسے جیسے وہ نیک عمل کرتا جاوے۔ اسی اسی قدر تاریکی دُور ہو کر معرفت اور روشنی آتی جاوے اور انسان خود محسوس کر لے کہ وہ نجات کی ایک یقینی راہ پر جا رہا ہے۔ اس کی ہدایتیں ایسی صاف اور واضح ہوں کہ انسان ان کے ماننے اور اس پر عمل کرنے میں اٹکے نہیں۔

بھلا یہ بھی کوئی تعلیم اور اصول ہے کہ ذرہ ذرہ کو خدا قرار دے دیا جاوے جیسے خدا ازلی ابدی ہے۔ اسی طرح پر ذراتِ عالم اور ارواح کو بھی ازلی ابدی تسلیم کیا جاوے۔ اگر ایسا کوئی خدا ہے کہ جس نے ایک ذرہ بھی کسی قسم کا پیدا نہیں کیا تو اس پر بھروسہ کیسا؟ اور اس کا ہم پر حق کیا ہے جو عبادت کریں کیونکہ عبادت کے لیے حق بھی تو ہونا چاہیے جب کوئی حق ہی نہ ہو تو ایک ذرہ ذرہ اُسے کہہ سکتا ہے کہ تیرا ہم پر کیا حق ہے اس عقیدہ کو رکھ کر انسان کس طرح پر خدا پرست ہو سکتا ہے بلکہ میرے نزدیک خدا تعالیٰ کی ہستی پر دلیل ہی قائم نہیں ہو سکتی۔ اگر آریوں سے کوئی دہریہ پوچھے کہ پرمیشر کی ہستی کا کیا ثبوت ہے تو اس کا جواب وہ کیا دے سکتے ہیں۔ کیونکہ صانع کو مصنوعات سے شناخت کرتے ہیں جبکہ مصنوعات ہی کا وجود نہیں تو صانع کا وجود کہاں سے آیا۔ جیو اور پرکرتی کو جو خود بخود تسلیم کرتے ہیں تو پھر اُن کے جوڑنے جاڑنے کے لیے کیا حاجت ہو سکتی ہے۔ اس طرح پر کوئی دلیل اللہ تعالیٰ کی ہستی پر اُن کے ہاتھ میں نہیں اور جبتک اس کی ہستی پر کوئی دلیل نہ ہو کس طرح کوئی مان لے کہ وہ ہے۔

ماسوا اس کے ان لوگوں کا یہ بھی اصول نہیں کہ خدا رحم کرنیوالا ہے۔ ہر شخص کی اس ہستی پر توجہ ہوتی ہے جسے رحیم۔ کریم۔ فیاض تسلیم کرے۔ لیکن انھوں نے یہ مانا ہوا ہے کہ بغیر کرموں کے پھل کے اَور کچھ عطا ہی نہیں کر سکتا۔ اگر کرموں پر ہی سارا مدار ہے تو اس خدا پر کیا بھروسہ اور کیا امید جس کا ذرہ بھر بھی احسان نہیں ہے۔

یہ تمام امور ہیں جب انسان ان کو بنظرِ غور دیکھتا ہے تو اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ سوائے اسلام کے دُوسروں میں سچی ہدایتیں نہیں ملتی ہیں۔

ماسوا اس کے ایک اَور بڑی بات قابلِ غور ہے کہ اسلام میں بہت بڑی خاصیت یہ ہے کہ انسان جس مطلب کے لیے بنایا گیا ہے وہ اسلام کے سوا حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ کیا ہے؟ یہ کہ خدا تعالےٰ کی محبت بڑھے اور اس کی معرفت ترقی کرے جس سے وُہ ایک کامل شوق ذوق کے ساتھ اس کی عبادت کرے۔ لیکن یہ مطلب کبھی پورا نہیں ہو سکتا جبتک تعلیم اور ہدایت کامل نہ ہو اور پھر اس تعلیم اور ہدایت پر عمل کرنے کے جو نتائج اور ثمرات ہیں ان کا نمونہ موجود نہ ہو جس کو دیکھ کر معلوم ہو کہ خدا قادر خدا ہے۔

یہ ساری باتیں اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان پُرغور مطالعہ کرتا ہے۔ عقلمند اور سعید کے دل میں تو اللہ تعالیٰ خود ہی ایک واعظ پیدا کر دیتا ہے اور وہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں اسی طرح امتیاز کر لیتا ہے جس طرح پر تاریکی اور نُور میں کر لیتا ہے لیکن بعض شخص ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے دل پر ایک مُہر ہوتی ہے وہ حقیقت تک پہنچنے کی سعی نہیں کرتے بلکہ بیہودہ اعتراض کرتے ہیں۔ سعادت خدا تعالیٰ کی عطا اور بخشش ہے کوئی شخص جبتک رُوحِ حق اور راستی سے مناسبت نہیں رکھتا ہے اس طرف آ ہی نہیں سکتا اور یہ

خدا تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے۔

اگر کوئی کہے کہ اعمال سے شناخت ہو سکتا ہے کہ کونسا مذہب سچا ہے تو وہ لوگ جو راہزنی اور قزاقی کرتے ہیں اُن سے پُوچھا جاوے تو وہ اُسے مکروہ خیال نہیں کرتے بلکہ ایک شکار سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اور لوگ جو فسق و فجور میں مبتلا ہیں وُہ بُرا نہیں سمجھتے۔ یہ کوئی بات نہیں ہے۔ اصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور فیض کے برکات اور انوار ساتھ ہوں۔

غرض اوّل یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق غور کرے اور سمجھے۔ سب سے اوّل اسی کا فرض ہے اور یہ سمجھ ملنا اس کے فضل پر موقوف ہے۔ پھر دعا کرے اور نیک صحبت میں رہے اور یہ بھی خیال کرے کہ عمر کا کوئی اعتبار نہیں بعض لوگ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ فلاں وقت اس نیکی کو کریں گے مگر وہ اس انتظار ہی میں رہتے ہیں اور موت آ جاتی ہے۔ اس لیے نیکی کے اختیار کرنے میں دیر نہیں چاہیے۔[1]

۱۰؍ اگست ۱۹۰۵ء

قبل از عشاء

سچی اور آسمانی تہذیب

ذکر آیا کہ ایک انگریزی اخبار میں مضمون نکلا ہے کہ اسلام ہند میں نہیں پھیلا کیونکہ ہندو خود مہذب تھے اور کسی مہذب قوم میں اسلام پھیل نہیں سکتا۔ فرمایا :

یہ جھوٹ ہے ہندوستان میں سوائے چند ایک قوموں کے جو باہر سے آئی ہیں (قریش۔ مُغل۔ پٹھان) باقی سب ہند کے باشندے ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا مثلاً شیخ۔ خواجگان۔ زمینداروں کی سب اقوام وغیرہ۔ یہ سب پہلے ہندو تھے۔

فرمایا : عیسائیوں کا عجیب طریقہ ہے۔ اگر کثرت دکھائی جاوے تو کہتے ہیں جبراً مُسلمان ہوئے اور اگر کثرت نہ دکھائی جاوے تو کہتے ہیں اسلام کا کچھ اثر نہ ہوا۔ فرمایا : تہذیب بھی ان کا اپنا بنایا ہوا ایک لفظ ہے جس کے معنے ان کی اصطلاح میں سوائے اس کے نہیں کہ انسان خدا کی مقرر کردہ رسموں کو توہین سے دیکھے اور دُنیا پرستی اور دہریہ پن کی طرف جُھک جائے۔ سچی تہذیب وہ ہے جو قرآن شریف نے سکھلائی ہے[2] جس کے ذریعہ سے رُوحانی زندگی حاصل ہوتی ہے اور انسان اور حیوان میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور جسکے

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۱۷؍ اگست ۱۹۰۵ء

[2] الحکم سے :- "آسمانی تہذیب تو اور ہے جس میں ایمان تقویٰ۔ دیانت۔ صلاحیت اور نیک کرداری شامل ہے۔ مگر اُن کے نزدیک دنیا کے جوڑ توڑ، ہر قسم کے مکر و فریب کا نام تہذیب ہے۔ یہ تہذیب اُن کے ہی نصیب رہے ہم اس کو لینا نہیں چاہتے۔ چند بے ہودہ رسوم و عادات

ذریعے سے رُوحانی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اور انسان اور حیوان میں فرق معلوم ہوتا ہے اور جس کے ذریعے سے سچے اور جھوٹے مذہب میں ایک امتیاز پیدا ہوتا ہے اور انسان کو سفلی زندگی سے دل سرد ہو کر عالم جاودانی کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک تہذیب اس کا نام ہے کہ انسان دنیا کا کیڑا بن جاوے۔ خدا کو بُھول جاوے اور ظاہری اسباب کی پرستش میں لگ جائے۔ مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک تہذیب یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ پر پورا بھروسہ ہو جائے اور اس کی عظمت اور ہیبت دل میں بیٹھ جائے اور دل کو سچی پاکیزگی حاصل ہو جائے۔

یورپ میں جب عیسائیت پھیلی تھی تو اس وقت یورپ کس قدر تاریکی اور سخت بُت پرستی میں مبتلا تھا۔ پھر ان وحشی قوموں پر عیسائیت کا کیا اثر ہوا۔ صرف یہ کہ ایک بُت پرستی کی جگہ دوسری بُت پرستی قائم ہوگئی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ :- کا نام جو اخلاق سے گری ہوئی ہیں تہذیب نام رکھتے ہیں اور خدائی رسوم و آداب کی توہین اور استخفاف کرتے ہیں حالانکہ ان رسوم و عادات کے نتائج اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں جن سے سوسائٹی میں امن، اخلاق اور نیک اعمال پیدا ہوتی ہے۔ اپنی رسُوم و عادات کو جن کے نتائج بد ہیں پسندیدہ سمجھتے ہیں:

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء

لہ حاشیہ :- الحکم سے : ”مکرمی مفتی محمد صادق صاحب نے بیان کیا کہ مسٹر بیک نے ایک مرتبہ علیگڑھ کالج کے طلباء کے سامنے تہذیب پر لیکچر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر تم راستہ میں چلو تو لیڈی تمہارے دائیں طرف ہو اور اگر کوئی تار وغیرہ آجاوے تو اس کو پاؤں سے دبا کر لیڈی کو آرام سے گذرنے دو۔ کھانا کھاؤ تو اپنی بیوی کے ساتھ نہیں بلکہ تمہاری بیوی کسی اور کے ساتھ کھائے اور تم کسی غیر کی بیوی سے۔ فرمایا :

یہ تہذیب ان کو ہی مبارک ہو۔ قرآنِ شریف نے ہی سچّی تہذیب دُنیا کو سکھائی ہے۔ یہ تہذیب وہ ہے جس سے انسانیت آتی ہے اور انسان اور حیوان کے درمیان مابہ الامتیاز حاصل ہوتا ہے اور پھر سچّے اور جھوٹے مذاہب کے درمیان مابہ الامتیاز عطا ہوتا ہے۔ اگر یہ تہذیب کسی کو نہیں ملی تو اسے تہذیب سے کوئی حِصّہ ہی نہیں ملا۔ یہ دُنیا کے کیڑے ہیں۔ اباحت سے ملی ہوئی باتوں کا نام تہذیب

خُدا تعالیٰ کا ارادہ

اسلام نے وحشیوں کو حقیقی انسانیت تک پہنچایا۔ اُن کے اندر توحید کی رُوح پھُونک دی مگر انجیل کی تعلیم نے صرف یہ سکھایا کہ ایک انسان کو خدا بنانے کے پہلے رغبت دی اور شراب اور سوّر کھلایا اور خدا تعالیٰ کی سچی عبادت سے آزاد کر کے اباحت کا دروازہ کھولا پس چونکہ عیسائی مخلوق پرستی اور آزادی کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لیے نہیں چاہتے کہ سچا دین زمین پر پھیلے. مگر خُدا کے ارادہ کو کون پلٹ سکتا ہے۔ ان لوگوں کی لڑائی ارادۂ الٰہی کے ساتھ ہے۔ انسانی کوششوں سے اب یہ جنگ فتح نہیں ہو سکتی۔ مگر خدا تعالیٰ سب پر قادر و توانا ہے جس نے زمین و آسمان بنایا۔ وہ قادر ہے کہ نیا زمین و آسمان بنا دے۔ عرب کی پہلی حالت کہ وہ کس گند میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے تھے دیکھ کر اور پھر ان کی پچھلی حالتِ اسلامی دیکھ کر تسلّی ہوتی ہے کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔ ساری دنیا پر اثر ڈالنا اور اُن کو اباحت کے گندے خیالات سے نکال کر اسلام کا پاک جامہ پہنانا انسانی کام نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی دنیا کی اصلاح فرما سکتا ہے

ہماری کوششیں تو بچوں کا کھیل ہے نہ لوگوں کے دلوں سے ہم وہ گند نکال سکتے ہیں جو آجکل دُنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے نہ کمال محبتِ الٰہی کا اُن کے اندر بھر سکتے ہیں۔ نہ اُن کے درمیان باہمی کمالِ اُلفت پیدا کر سکتے ہیں جس سے وہ سب مثل ایک وجود کے ہو جائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے؛ چنانچہ قرآنِ شریف میں صحابہؓ

بقیہ ❀ حاشیہ ❀ صفحہ ❀ گذشتہ ❀ :- قرار دیتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے جس تہذیب کے پھیلنے کا ارادہ فرمایا ہے اسے اب کوئی روک نہیں سکتا۔ جیسے جب کوئی بڑا بھاری سیلاب آتا ہے تو اس کے آگے کوئی بند نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس سیلاب سے بھی بڑھ کر زبردست ہے۔ کون ہے جو اُس کے آگے بند لگائے۔ خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ دنیا میں سچی تہذیب اور رُوحانیت پھیلے اور یہ اس کے بالمقابل عیسائیت کے گندے خیالات پھیلانا چاہتے ہیں۔ اب خدا تعالیٰ سے اُن کی لڑائی ہے۔ معلوم ہو جائے گا کہ اس کا انجام کیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ وہی خدا ہے جس نے زمین و آسمان بنایا ہے۔ وہ چاہے تو نئے سرے سے اس زمین و آسمان کو بنا سکتا ہے۔ اب اسی کا کام ہے کہ وہ دُنیا پر اثر ڈال دے۔

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۵ء

کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (الانفال ۶۳، ۶۴) وہ خدا جس نے اپنی نصرت سے اور مومنوں سے تیری تائید کی اور ان کے دلوں میں ایسی اُلفت ڈالی کہ اگر تو ساری زمین کے ذخیرے خرچ کرتا تو بھی ایسی الفت پیدا نہ کر سکتا لیکن خدا نے ان میں یہ اُلفت پیدا کر دی۔ وہ غالب اور حکمتوں والا خدا ہے جس خُدا نے پہلے یہ کام کیا وہ اب بھی کر سکتا ہے۔ آئندہ بھی اسی پر توکّل ہے جو کام ہونے والا ہوتا ہے اس میں خدا کے فضل کی رُوح پھُونکی جاتی ہے جیسا کہ باغبان اپنے باغ کی آبپاشی کرتا ہے تو وہ تروتازہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ اپنے مرسلین کے سلسلہ کو ترقی اور تازگی عطا فرماتا ہے۔ جو فرقے صرف اپنی تدبیر سے بنتے ہیں ان کے درمیان چند روز میں ہی تفرقے پیدا ہو جاتے ہیں جیسا کہ برہمو تھوڑے دن تک ترقی کرتے کرتے آخر رُک گئے اور دن بدن نابُود ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی بنا صرف انسانی خیال پر ہے۔

ہماری جماعت کے متعلق خدا تعالیٰ کے بڑے بڑے وعدے ہیں۔ کوئی انسانی عقل یا دُور اندیشی یا دنیوی اسباب ان وعدوں تک ہم کو نہیں پہنچا سکتے[1]۔ اللہ تعالیٰ خود ہی سب اسباب مہیا کر دے گا۔ تب یہ کام انجام کو پہنچے گا۔ اگر بالفرض ہماری جماعت کی تعداد بیس پچیس لاکھ تک پہنچ کر ٹھہر جائے تو پھر بھی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ اتنی تعداد سکھوں کی بھی ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ساری دُنیا اس جماعت سے بھر جائے اور یہ انسان کا کام نہیں۔ انسان کی زندگی کا تو ایک دم کا اعتبار نہیں۔ وہ کیا کر سکتا ہے۔

---

[1] حاشیہ:- الحکم سے:- "یہ لوگ جو ہمارے مخالف ہیں۔ اسی قیاس پر ہماری جماعت کو سمجھتے ہیں جیسے برہمو وغیرہ فرقوں کو سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اس فرقہ اور قوم کو سمجھتے ہیں کہ یہ بھی کسی شخص کی خیالی تجویزوں کا نتیجہ ہے مگر مَیں جانتا ہوں کہ خُدا نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے اور اسی کے فضل سے اس کا نشوونما ہو رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کا ارادہ نہ ہو کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اور نہ اس کا نشوونما ہو سکتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کے لیے چاہتا ہے تو وہ قوم بیج کی طرح ہوتی ہے جیسے قبل از وقت بیج کے نشوونما اور اس کے آثار کوئی نہیں سمجھ سکتا اس قوم کی ترقیوں کو بھی محال اور ناممکن سمجھتے ہیں۔

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۵ء

* * *

نبی کا بڑا معجزہ

لیکن خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔ دراصل بڑا معجزہ یہی ہے کہ فرستادہ کی ملت فانی باطل نہ ہو جائے۔ حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدہا معجزات ہیں لیکن سب سے بڑا یہی ہے کہ جس بات کا دعویٰ کیا تھا اُس کو پورا کر دکھایا۔ طبیب حاذق اسی طرح پہچانا جاتا ہے کہ بڑے بڑے بیمار اس سے شفا پائیں تب ہی اس کا دعویٰ سچا ثابت ہو[1]

صحابہ کرام کی مثالی وفاداری

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت قوم عرب کے تمدن اور اخلاق اور رُوحانیت کا کیا حال تھا۔ گھر گھر میں جنگ اور شراب نوشی اور زنا اور لوٹ مار۔ غرض ہر ایک بدی موجود تھی۔ کوئی نسبت اور تعلق خُدا کے ساتھ اور اخلاق فاضلہ کے ساتھ کسی کو حاصل نہ تھا۔ ہر ایک فرعون بنا پھرتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے جب اسلام میں داخل ہوئے تو ایسی محبتِ الٰہی اور وحدت کی رُوح ان میں پیدا ہو گئی کہ ہر ایک خدا کی راہ میں مرنے کے لیے تیار ہو گیا[2]۔ انہوں نے بیعت کی حقیقت کو ظاہر کر دیا اور اپنے عمل سے اس کا نمونہ دکھا دیا۔ اب تو بعض لوگ بیعت میں داخل ہوتے ہیں تو ذرا سے ابتلاء سے گھبرا جاتے ہیں۔ مال اور جسمانی آرام سے بڑھ کر جان پیاری ہوتی ہے۔ صحابہؓ نے سب سے پہلے اپنی عزیز جان کو فدا کیا[3]۔ برخلاف اس کے یسُوع کے شاگردوں میں کوئی بات نہیں دیکھتے جس سے یسُوع کی کامیابی پر دلیل پکڑی جائے۔ پطرس نے انکار کیا[4]، بلکہ لعنت کی۔ یہودا نے گرفتار کرایا۔ باقی بھاگ گئے۔ معلوم ہوتا ہے اُن کے ہادی میں کچھ کشش نہ

---

[1] حاشیہ :- الحکم سے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنے دعویٰ کے موافق کر دکھایا اس کی تو کوئی نظیر ہی نہیں ملتی۔"
الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۵ء

[2] حاشیہ :- الحکم سے "کیا کوئی اس قوم کی نسبت خیال کر سکتا تھا کہ یہ قوم باہم متحد ہو گی اور خدا تعالیٰ سے ایسا قوی تعلق پیدا کریں گے کہ باوجودیکہ یہ فرعون سیرت ہیں لیکن اس کی اطاعت میں ایسے محو اور فنا ہوں گے کہ جان عزیز کو بھی اُس کی راہ میں دیدیں گے۔ غور کرو کہ کیا یہ آسان امر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایک ایسی قوم میں ایسی محبتِ الٰہی کا پیدا کر دینا کہ وہ مرنے کو تیار ہو جائیں خود آپؐ کے اعلیٰ درجہ کی قوتِ قدسی کو ظاہر کرتا ہے۔"
الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۵ء

[3] حاشیہ :- الحکم سے "اگر کوئی کشش نہ تھی تو اس درجہ تک وہ کیونکر پہنچے۔"
الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۵ء

[4] حاشیہ: الحکم سے "پطرس نے آخری وقت پر جو مدد کا وقت تھا انکار کر دیا" (الحکم حوالہ مذکور)

تھی کہ اُن کو برائی اور منتشر ہونے سے روک سکتی۔ یہ خدا کا فضل ہے جس پر چاہے کرے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ایک کشش اور جذب ہے وہ جذب خدا تعالیٰ اپنے کامل نبی میں رکھ دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے کس قدر وفاداری کا نمونہ دکھایا۔ جس کی نظیر نہ پہلے تھی نہ آگے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن خدا چاہے تو وہ پھر بھی ویسا ہی کر سکتا ہے۔ ان نمونوں سے دوسروں کے لیے فائدہ ہے۔ اس جماعت میں خدا تعالیٰ ایسے نمونے پیدا کر سکتا ہے[1]۔

خدا تعالیٰ نے صحابہؓ کی تعریف میں کیا خوب فرمایا ہے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰہَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ (الاحزاب: ۲۴) مومنوں میں ایسے مرد ہیں جنھوں نے اس وعدہ کو سچا کر دکھایا جو انہوں نے خدا کے ساتھ کیا تھا سو اُن میں سے بعض اپنی جانیں دے چکے اور بعض جانیں دینے کو تیار بیٹھے ہیں صحابہؓ کی تعریف میں قرآن شریف سے آیات اکٹھی کی جائیں تو اس سے بڑھ کر کوئی اُسوہ حسنہ نہیں[2] ؛

---

[1] الحکم سے : "اللہ تعالیٰ چاہے تو ہر ایک وقت میں ایسا ہو سکتا ہے۔ مولوی عبد اللطیف (رضی اللہ عنہ) نے بھی ایسا کامل نمونہ دکھایا۔"

(الحکم حوالہ مذکور)

[2] الحکم سے : "جس سلسلہ میں کوئی نمونہ نہ ہو وہ سلسلہ قابلِ تعریف نہیں ہو سکتا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا نمونہ دکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بڑی تعریف کی ہے ...... بنی اسرائیل میں شہرت یافتہ دو ہی نبی تھے۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دُوسرے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان دونوں میں سے کسی کے نمونہ کا ذکر کر کے طبیعت خوش نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ کی قوم ان کو ہی سنگسار کرنے کو آمادہ ہو جاتی تھی اور اکثر ان کے ساتھ جھگڑتے اور انکار کر دیتے تھے۔ وہ سرکش اور کج طبع قوم تھی۔ اور حضرت عیسیٰ کے صحابہ کا وہ حال تھا جو مَیں نے ابھی بیان کیا کہ آخری وقت انکار کر دیا۔ اس تقریر کے بعد صحابہ کرامؓ کی اس محبت و اخلاص کا ذکر فرماتے رہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رکھتے تھے۔ اس ضمن میں یہ ذکر آ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر وہ کس قدر بے قرار ہو گئے تھے۔ انہیں قرار نہیں آیا۔ جب تک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھ کر سب انبیاء علیہم السلام کی وفات پر اجماع نہ کرا لیا۔ فرمایا : یہ کیا ہی مبارک اجماع تھا۔ اگر یہ اجماع نہ ہوتا تو

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

غیر معمولی موسم کا نشان آسمان پر گرد و غبار سے بارش نہ ہونے اور موسم میں ایک غیر معمولی رنگ رہنے کا ذکر تھا۔ فرمایا:

ایک دن سخت گرمی اور لوگوں کی گھبراہٹ کو دیکھ کر میں دُعا کرنے لگا تھا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ یہ جو کچھ کر رہا ہے ہماری ہی تائید میں کر رہا ہے۔ آج اگر طاعُون اٹھ جاتے۔ زلزلوں سے امن ہو جاتے اور فصلیں خوب پک جائیں تو پھر لوگوں کا یہی کام ہوگا کہ امن پاکر ہم کو گالیاں دینے میں مصروف ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَیں زور آور حملوں سے تیری سچائی کو ظاہر کر دوں گا۔ یہی اس کے حملے ہیں۔ پس ہم ان حملوں کو روکنے کے واسطے کیوں دُعا کریں؟ دُنیا کے آرام میں ہمارا آرام نہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ہمارے لیے ہی ہو رہا ہے اور ہمیشہ سے عادت اللہ اسی طرح جاری ہے۔ جب ہمارے ہر اَمر کا متولی خدا تعالیٰ ہے تو ہمیں کیا غم ہے۔ جو ہوگا کوئی نشان ہی ہوگا۔

بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۰۵ء

حاشیہ صفحہ گذشتہ:- بڑا بھاری فتنہ اسلام میں پیدا ہوتا۔ اسلام میں سب سے پہلا اجماع مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران : ۱۴۵) ہی پر ہوا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا منشا تو اس صدمہ ہی کو دُور کرنا تھا اور وہ مرگِ یاراں جشنے دارد ہی سے دُور ہوتا تھا۔ اگر اس آیت کے استدلال میں حضرت مسیح کو مُستثنیٰ کیا جاتا تو صحابہؓ کے درد کا کیا علاج ہوتا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسیح سے کم درجہ پر تھے جو زندہ نہ رہتے۔ قَدْ خَلَتْ کے معنے تو خود اس آیت میں اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ نے کر دیئے ہیں۔ کیا اس میں رفع بجسدہ العنصری بھی کہیں لکھا ہے؟ غرض جس طرح پر کسی کی قوتِ شامہ ماری جاوے تو اُسے خوشبو کا حاسہ نہیں رہتا اسی طرح پر ان لوگوں کی ایمانی قوتِ شامہ مرگئی ہے جو مسیح کو زندہ آسمان پر لے جاتے ہیں۔ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر حالت بہت خطرناک ہے۔ یہی عقیدہ ان کی خدائی کی پہلی اینٹ قرار دیا گیا ہے۔

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۵ء

۱۱ر اگست ۱۹۰۵ء

(دربار شام)

تناسخ

حضرت حکیم الامت کا بچہ عبد القیوم بیمار تھا۔ گذشتہ شب کو اسے تکلیف تھی۔ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کا حال پُوچھ رہے تھے۔ اسی ذکر میں حضرت حکیم الامت نے کہا کہ مَیں اس سوال پر سوچتا رہا کہ آریہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ بچوں کو جو دکھ یا تکالیف پہنچتی ہیں یہ ان کے پچھلے جنم کا نتیجہ ہے۔ اس تحریک پر حضرت اقدس نے ذیل کی تقریر فرمائی:

یہ تو بالکل بیہودہ عقیدہ ہے[1]۔ اوّل تو یہ بھی قابلِ غور اَمر ہے کہ آیا بچے اس قدر تکلیف محسوس بھی کرتے ہیں یا نہیں جس قدر ماں باپ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ حِس بھی عقل کے ساتھ ہی بڑھتی ہے۔ اور علاوہ بریں بچہ بھی جو بہشت میں داخل ہوگا تو کسی حق ہی سے ہوگا اس لیے اس قسم کی تکالیف اُٹھاتا ہے[2]۔

تکالیف اور شدائد کا فلسفہ

اصل بات یہ ہے کہ انسانی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ زدوکوب ہی سے دُرست ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت انسان کی تکمیل چاہتی ہے اور خود عبودیت کا بھی تقاضا ہے کہ کسی نہ کسی طرح تکمیل کرے۔ اس لیے منجملہ تکمیل کی صورتوں کے ایک شدائد اور مصائب بھی ہیں۔

[1] حاشیہ:۔ بدر سے: "بچوں کی تکلیف سے تناسخ نکالنا بڑی نادانی کی بات ہے۔"

بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷ر اگست ۱۹۰۵ء

[2] حاشیہ:۔ بدر سے "یہ مانا گیا ہے کہ جن باتوں میں حیوانات انسانوں سے مشترک ہیں ان میں حیوان وہ لذّت نہیں اُٹھا سکتا۔ ایسا ہی بچے کے واسطے اس قدر احساس نہیں ہے جس قدر بڑے کے واسطے ہے۔ لیکن اگر ہم مان لیں کہ اس کو درحقیقت تکلیف ہے اور اس کے ماں باپ وغیرہ بھی کوئی نہیں ہے جن کی طرف وہ تکلیف منسوب ہوسکے۔ تب بھی اس سے تناسخ نہیں نکل سکتا، کیونکہ نرا پاک ہونا اور معصوم ہونا کسی کو فضل کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ تکالیف بنی آدم کے واسطے اجر کا موجب ہیں اور دُوسرا عالم ساتھ ہی موجود ہے جو کہ جاودانی امن اور آرام کا عالم ہے اور وہ اس عالم سے صرف ایک انتقال سے پیدا ہوتا ہے۔ اِدھر آدمی آنکھ بند کرتا ہے اُدھر کھول دیتا ہے۔ بچوں کے لیے دُوسرے عالم میں اجر ہے۔"

بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷ر اگست ۱۹۰۵ء

انبیاء علیہم السلام جو بالکل معصوم اور مقدس وجود ہوتے ہیں وہ بھی تکالیف اور شدائد کا نشانہ بنتے ہیں[۱] اور ایسے مصائب ان پر آتے ہیں کہ اگر کسی اور پر آئیں تو وہ برداشت ہی نہ کر سکے۔ ہر طرف سے ان کے دشمن اُٹھتے ہیں۔ کوئی باتوں سے دُکھ دیتا ہے۔ کوئی حکامِ وقت کے ذریعہ تکلیف دینے کا منصوبہ کرتا ہے کوئی قوم کو اس کے برخلاف اکساتا ہے۔ غرض ہر پہلو سے اس کو تکلیف دی جاتی ہے اور ہر طرح کی بے آرامی اور حُزن وغم اُن پر آتا ہے۔ باوجود اس کے ان ساری باتوں کا کچھ بھی اثر اُن پر نہیں ہوتا اور وہ پہاڑ کی طرح جنبش نہیں کرتے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ گنہگار ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر کوئی ایسا خیال کرے تو اس سے بڑھ کر بیہودگی اور کیا ہوگی۔ بچوں کی تکالیف کا مسئلہ انبیاء علیہم السلام کے مسئلہ سے خوب حل ہوتا ہے۔ معصومیت کے لحاظ سے بچہ سمجھو۔ یہ مصائب عبودیت کی تکمیل کے لیے ہیں[۲]۔ اور عالمِ آخرت کے لیے مفید ہیں۔ اگر ایسی حالت ہوتی کہ مرنے کے بعد بچہ کی رُوح مفقود ہو جاتی تو بھی اعتراض کا موقعہ ہوتا۔ لیکن جب جاودانی عالم اور ابدی راحت موجود ہے۔ تو پھر یہ سوال ہی کیوں ہے؟ اگر یہ سوال ہے کہ بغیر تکلیف کے اس ابدی راحت میں داخل کر دے تو پھر کہیں گے کہ معاصی کا بکھیڑا کیوں ہے اس کے ساتھ ہی داخل کر سکتا تھا[۳]۔ اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں غنی بے نیاز ہے۔ انسان کو نجات اور ابدی آسائش کے حصول کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ جب تک وہ تکالیف اور شدائد نہیں اُٹھاتا۔ راحت اور آسائش نہیں پا سکتا۔

یہ شدائد دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وُہ ہیں جو انسان خود مجاہدات کرتا ہے۔ اپنے نفس کے ساتھ

---

[۱] بدر سے : صرف خدا کی ایک ذات ہے جو تکمیل کے لیے کسی ذریعے کی محتاج نہیں۔

(بدر حوالہ مذکور)

[۲] بدر سے : مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک بیماری ایسی ہوتی ہے کہ جب آدمی کو کوئی مارتا ہے تب تک آرام رہتا ہے۔ جب چھوڑ دیا جاتے تو تب اعضاء شکنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی انسان کو رُوحانی طور پر مار کھانے کی بیماری ہے۔

(بدر حوالہ مذکور)

[۳] بدر سے : اگر کوئی سوال کرے کہ خدا نے یہ مصائب کا سلسلہ کیوں رکھ دیا۔ وہ بغیر اس کے کسی کو بہشت میں داخل کر سکتا تھا تو یہ فضول سوال ہے۔ ہم خدا کی ایک سنّت کو دیکھتے ہیں کہ وُہ اس طرح سے جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں غنی ہے اور انسان کمزور ہے۔ اُس نے انسان

جنگ کرتا ہے اور اس طرح پر اکثر تکالیف میں سے ہو کر گذرتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قضاء و قدر خود اس پر کچھ تکالیف نازل کر دیتی ہے اور اس ذریعے سے اسے صاف کرتی ہے۔ اس طریق میں بچے اور انبیاء علیہم السلام کے نفوسِ قدسیہ ہوتے ہیں۔ وہ بے گناہ اور معصوم ہوتے ہیں اس پر بھی مصائب اور شدائد ان پر آتے ہیں وہ محض ان کی تکمیل اور ان کے اخلاق اور صدق و وفا کے اظہار کے لیے۔

انسان کے لیے سعی اور مجاہدہ ضروری چیز ہے اور اس کے ساتھ مصائب اور مشکلات بھی ضروری ہیں۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم : ۴۰) جو لوگ سعی کرتے ہیں وہ اس کے ثمرات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اسی طرح پر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور نفس کی قربانی کرتے ہیں۔ ان پر الٰہی قرب و انوار و برکات اور قبولیت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور بہشت کا نقشہ ان پر کھولا جاتا ہے۔

یہ لوگ[1] اس راہ سے بے خبر ہیں اور ان انعامات سے بے بہرہ۔ اس لیے ایسے گندے اور بیہودہ اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تو نجات کسی کو ملتی ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تناسخ مان بیٹھے ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ اس عالم کی تکالیف کا اجر دُوسرے عالم میں ملتا ہے۔ جس طرح پر انبیاء و رسل کو ملتا ہے اسی طرح پر دُوسرے لوگوں کو ملتا ہے۔ سنت اللہ یہی ہے۔ اور انسانی کمزوری ضروری تھی تاکہ وہ خدا کا ہمسر نہ ہو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر کے مظہرِ تجلیاتِ الٰہیہ ہوتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصائب اور شدائد اٹھاتے اور بہت سی ماریں کھائے[2]۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کی سچائی تجربہ سے ثابت ہو رہی ہے۔ پس جب ایک واقعہ تجربہ سے ثابت ہو جاوے تو اس پر بحث فضول ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ کے واسطے یہی رکھا ہے کہ یا تو وہ خود مجاہدات اور ریاضات سے ترقی کرتا ہے یا آسمانی قضاء و قدر اس سے یہ تکمیل کرا دیتی ہے "

بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء

[1] بدر میں ہے :۔ " آریہ کمبخت اندھے ہی چلے آئے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرا عالم بھی موجود ہے انسان خدا نہیں۔ اس میں کمزوریاں ہیں اور یہ کمزوریاں اس واسطے ہیں کہ وہ خدا کے برابر نہ کہلائے "

(بدر حوالہ مذکور)

[2] بدر سے : " جو لوگ مجاہدات کرتے ہیں تکالیف پر صبر کرتے ہیں۔ ان کو بڑے درجات ملتے ہیں اُن میں اور ان کے غیر میں ایک امتیاز اور فرقان رکھا جاتا ہے۔ وہ قضاء و قدر کا نشانہ بنتے ہیں اور ماریں کھاتے ہیں۔ پھر بڑا فضلِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہوتا ہے۔ (بدر حوالہ مذکور)

فرمایا: تناسخ کی دلیل میں جو امیر اور مفلس کا تفاوت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک بیہودہ بات ہے۔ اس لیے کہ غنی کے لیے زکوٰۃ اور صدقات رکھے ہیں کہ وہ ادا کرے اور مفلس کے لیے صبر رکھا ہے اور دونوں کے لیے اجر ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی نے دو چار کوس کا راستہ طے کرنا ہو۔ ایک شخص کے پاس تو عمدہ عمدہ کھانے ہوں اور دوسرے کے پاس ستو ہی ہوں۔ دونوں ہی اس راستہ کو طے کریں گے اور منزلِ مقصود پر جا کر اپنے اعمال کے موافق فائدہ اُٹھائیں گے[1]۔

تناسخ پر تو اس قدر اعتراض ہوتے ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک طرف تو یہ لوگ ناطہ رشتہ میں دُور دراز کی گوتوں اور ذاتوں کا لحاظ کرتے ہیں[2]۔ دُوسری طرف اگر بچہ کی ماں یا بہن اس کی چھوٹی عمر میں مر جاوے اور کسی دُوسری جگہ جنم لے کر اس کے ساتھ بیاہی جاوے تو اس کے روکنے کا کیا انتظام ہے[3]؟

اور پھر تناسخ کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ جرائم کے انواع بھی تجویز کریں۔ کیونکہ جس کثرت سے کیڑے کوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب جرائم ہی کی وجہ سے ہوں گے؟ اور پھر ہر جُون کا گناہ الگ چاہیے۔ اس قسم کے بہت سے اعتراض اس مسئلہ پر وارد ہوتے ہیں[4]۔

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۴ مورخہ ۱۷؍ اگست ۱۹۰۵ء

---

[1] حاشیہ ✽: بدر میں ہے:- "آگے جا کر وہ دونوں برابر ہیں"۔
بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷؍ اگست ۱۹۰۵ء

[2] حاشیہ ✽: بدر سے:- "دُور سے اپنے لیے بیوی تلاش کرتے ہیں جہاں قرابت کا کوئی شائبہ نہ پایا جاتا ہو"۔ (بدر حوالہ مذکور)

[3] حاشیہ ✽: بدر سے: "اس صورت میں یہ ضرور تھا کہ پرمیشر ایسا کرتا کہ ہر ایک شخص کے پیدا ہونے کے وقت اس کے گلے میں ایک لمبی فہرست لٹکی ہوئی ہوتی کہ فلاں فلاں مرد اور عورت کے ساتھ اس کا یہ رشتہ ہے"۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ صفحہ ۶ مورخہ ۱۷؍ اگست ۱۹۰۵ء)

[4] حاشیہ ✽: بدر میں ہے۔ "ایک نہیں ایسے ہزاروں اعتراض تناسخ پر وارد ہوتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا بھی ایک کم بختی ہے۔ برسات میں تھوڑی دیر میں لاکھوں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں تو کیا برسات میں گناہ بہت کیا جاتا ہے؟ پھر جس قدر کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض دنیا میں موجود ہیں زمین کے اندر اور زمین کے اوپر ہوا میں اور درختوں پر اور سمندر میں غرض جس قدر اقسام جانوروں کے ہیں چاہیے کہ اسی قدر اقسام گناہوں کے شمار کئے جاویں مثلاً گائے بہ نسبت کتے

۱۴ راگست ۱۹۰۵ء

(دربار شام)

ایک نومسلم صاحب رحیم آباد[لہ] سے آئے ہوئے تھے۔ حضرت حکیم الامت نے ان کی زبانی بیان کیا کہ وہ پنڈت دیانند صاحب کے ساتھ سات سال تک رہے ہیں۔ پھر خود نومسلم صاحب نے بیان کیا کہ مَیں نے ویدوں کو ایشورانند سے پڑھا ہے۔

حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ آپ کے قبولِ اسلام کی کیا تقریب ہوئی۔ جواباً کہا کہ اصل تو آپ کی پیشگوئیوں پر میری نظر تھی اور اس کے بعد دیوریا کے مباحثہ میں مجھ پر اسلام کی سچائی واضح ہوگئی اور مَیں مُسلمان ہوگیا۔

معراج کی حقیقت

اس کے بعد انھوں نے سوال کیا کہ معراج کے متعلق حضور کی کیا رائے ہے؟ کیا وہ جسمانی تھا یا رُوحانی؟ اس کے جواب میں حضرت اقدس نے ذیل کی تقریر فرمائی:

فرمایا: جبتک انسان بے خبر ہوتا ہے اس کی باتیں نِری اٹکلیں ہی ہوتی ہیں۔ ایسا ہی معراج کے متعلق لوگوں کا حال ہے۔ وہ اس کی حقیقت اور اصلیت سے بیخبر ہیں۔ ہم تو معراج کو بالکل بیداری تسلیم کرتے ہیں ہاں ایک بیداری دنیا داروں کی ہے اور ایک بیداری عارفوں، صادقوں، نبیوں اور خدارسیدہ لوگوں کی بیداری ہوتی ہے اور ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل اور تمام صادقوں اور عارفوں کے سردار ہیں اس لحاظ سے یہ مرتبہ بھی آپ کا سب سے بڑھا ہوا ہے۔ معراج ایک کشفی معاملہ تھا۔ یہ بھی یاد رہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- کے آرام میں ہے۔ گائے کی ہندو پُوجا بھی کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گائے بنانے والا گناہ ایسا سخت نہیں جیسا وہ گناہ ہے جس کے ارتکاب سے انسان کُتّے کی جُون میں ڈالا جاتا ہے۔ پس آریوں کے ذمّہ ہے کہ جس قدر انواع جانداروں کے ہیں اسی قدر انواع گناہ کے ثابت کریں۔" (بدر جلد ۱ نمبر ۲۰ صفحہ ۶ مورخہ ۱۷ راگست ۱۹۰۵ء)

[لہ] حاشیہ :- بدر میں ہے :- "گیا سے ایک نومسلم آئے ہیں۔"

بدر جلد ۱ نمبر ۲۱ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۰۵ء

کشف دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک کشف ایسا ہوتا ہے کہ اس میں غیبتِ حس زیادہ ہوتی ہے۔ دُوسرا کشف ایسا ہوتا ہے کہ وہ بالکل بیداری کے رنگ میں ہوتا ہے اور دراصل ہوتی ہی بیداری ہے۔ اس قسم کے کشف کو خواب کبھی کہہ ہی نہیں سکتے، بلکہ ایسے کشف کو خواب کہنا ایسی ہی غلطی ہے جیسے کوئی دن کو رات کہہ دے۔ اس حالتِ کشف میں صاحبِ کشف وہ دیکھتا ہے جو دُوسرے نہیں دیکھ سکتے اور وہ اسرار مشاہدہ کرتا ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتے۔ اس بیداری میں (جو عام لوگوں کی حالت ہوتی ہے) اس بیداری کے مقابلہ میں صدہا پردے اور حجاب ہیں۔ اگر اس کو اندھا کہیں تو زیادہ مناسب ہے اور اگر بہرہ کہیں تو زیادہ موزوں ہے۔ لیکن اس کشفی بیداری میں اعلیٰ درجہ کی بینائی اور شنوائی عطا ہوتی ہے۔ جس میں صاحبِ کشف وہ حالات دیکھتا ہے جو کسی نے نہ دیکھے ہوں اور وہ باتیں سُنتا ہے جو کبھی نہ سُنی ہوں۔ پس اس قسم کی بیداری کے ساتھ وہ معراج تھا اور ایک لطیف اور رُوحانی جسم کے ساتھ تھا۔

انسان کے جسم دو ہیں۔ ایک زمینی اور دوسرا آسمانی جسم ہے۔ زمینی جسم کے متعلق قرآنِ شریف میں آیا ہے۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا (المرسلٰت : ۲۶) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا معراج جس جسم کے ساتھ ہوا وہ آسمانی جسم تھا۔ وہ معراج قابلِ تعریف نہیں جو عوام مانتے ہیں۔ چونکہ ہر شخص اپنی حد تک بات کرتا ہے۔ بچہ اس حد تک ہی کہتا ہے جو کھیل تک محدود ہو۔ کم علم اپنی حد تک۔ اسی طرح یہ لوگ چونکہ اس حقیقت سے محض ناواقف ہیں اس لیے اعتراض کرتے ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ ایسا کشفی رنگ تھا کہ اس کو ہرگز خواب نہیں کہہ سکتے۔ یہ سچی بیداری تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو وہ کمال حاصل ہوا۔ اور یہ حاصل نہیں ہو سکتا جبتک کامل درجہ کا تقدس اور تطہر نہ ہو۔

اس تقریر کو سُن کر شیخ عبدالحق صاحب (جو اس نومُسلم کا نام ہے) نے کہا۔ یہ تو بالکل سچ ہے۔ افسوس یہ مخالف مولوی منبروں پر چڑھ کر کہتے ہیں کہ وہ معراج سے ہی مُنکر ہیں۔ اس پر پھر حضرت اقدس نے سلسلہ تقریر شروع کیا۔ فرمایا :

اسلام اور دُوسرے مذاہب میں مابہ الامتیاز

جو کچھ اسلام کا زیور تھا جس پر اسلام کو ہمیشہ ناز تھا اور جو اسلام اور دُوسرے مذاہب میں مابہ الامتیاز تھا اس سے یہ لوگ بالکل بے خبر ہیں۔ اسلام کے سوا جس قدر مذاہب دنیا میں موجود ہیں۔ اُن کی یہ حالت ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنے محبوب کی بڑی تعریف کرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہدے کہ ہاں ایک آنکھ اس کی نہیں اور دوسرا ساری تعریفیں کرنے کے بعد کہدے کہ اس کی شنوائی نہیں یا ایک ٹانگ نہیں۔ غرض کوئی نہ کوئی نقص ضرور مانتے ہیں۔ پورے طور پر کامل محبوب تسلیم نہیں کرتے۔ اسلام میں یہ خوبی

ہے کہ اس نے احسن طور پر خدا تعالیٰ کو دکھایا ہے اور کبھی انسان شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ جس قسم کا خدا انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے وہ ایسا ہی اسلام میں پائے گی۔ کوئی نقص اور کمزوری اس میں نہیں ہے۔ اسلام ایسا مذہب ہے جو ایک ہی زندہ اور ابدی مذہب ہے، کیونکہ اس کی تاثیرات اور پھل ہمیشہ تازہ بتازہ موجود رہتے ہیں، لیکن ہمارے مخالف علماء اسلام کی عام خوبیاں تو بیان کرتے ہیں کہ وہ توحید کی تعلیم دیتا ہے، لیکن ایک اعلیٰ درجہ کی خوبی کا اِنکار کرتے ہیں۔ ایسا تو ایک برہمو بھی کر سکتا ہے۔ فرض کرو کہ اگر ایک برہمو کہے کہ بے شک لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تعلیم عمدہ ہے اور مَیں بھی مانتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کی صفات بھی مانتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان لاتا ہوں اور تمہاری طرح ہم بھی تناسخ کے نقص بیان کرتے ہیں اور اس کی تردید کرتے ہیں۔ باوجود ان باتوں کے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت سے انکار کرتا ہے تو کیا اس کی اتنی باتیں قابلِ قدر ہو سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ اسلام کی جو اعلیٰ درجہ کی خوبی تھی وہ تو اس نے فروگذاشت کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا یقینی ثبوت اور زندہ ثبوت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت ہی تھی۔ جب اسے وہ نہیں مانتے تو معلوم ہوا کہ باقی جو کچھ ہے وہ بھی محض خیالی امر ہے۔ اسی طرح پر ہمارے مخالف علماء کی حالت ہو رہی ہے۔ وہ چیز جو مَیں دنیا کو دینی چاہتا ہوں وہ ان کے پاس نہیں اور اس سے وہ غفلت کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان جبتک اللہ تعالیٰ کی ہستی کو سمجھ نہیں لیتا اور اَنَا الْمَوْجُوْد ہونے کی آواز نہیں سن لیتا نفسِ امّارہ پر غالب نہیں آتا۔ اسلام کی اصل غرض یہی تھی جو اَب مفقود ہو چکی تھی۔ اسی کے اِحیاء کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ دُنیا میں جس قدر کوئی کسی سے خوف کرتا ہے یا کسی کی طرف رغبت کرتا ہے۔ وہ معرفت کا ثمرہ ہوتا ہے۔ دیکھو اگر کسی کو یہ معلوم ہو کہ اس سوراخ میں سانپ ہے تو وہ کبھی اس میں ہاتھ نہیں ڈالتا بلکہ رات کے وقت اس مکان میں بھی داخل نہ ہوگا۔ ایسا ہی اگر معلوم ہو کہ یہاں ایک خزانہ مخفی ہے تو اس کی طرف التفات پیدا ہوگی۔ اندھیرے میں اگر ایک چیز کو بکرا سمجھتا ہے تو جبتک اُسے بکرا سمجھتا ہے پاس کھڑا رہے گا، لیکن یونہی جب یہ خیال ہوگا کہ وہ شیر ہے پھر وہاں نہیں رہ سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کی محبت اور خوف معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی آدمی دانستہ زہر نہیں کھا سکتا۔ سنکھیا خواہ شہد میں بھی ملا ہوا ہو پھر بھی کوئی اسے نہیں کھائے گا کیونکہ جانتا ہے کہ اس کو ہلاک کرنیوالی زہر ہے۔ لیکن اسی طرح پر گناہ بھی ایک زہر ہے جو انسان کی رُوح کو ہلاک کرتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایمان رکھتا ہے تو پھر بڑی دلیری اور جرأت سے گناہ کیوں کرتا ہے۔ اگر اسے یہ معرفت ہو کہ کوئی محاسب بھی ہے تو اس قدر دلیری نہ کرے۔ یہ دلیری اور جرأت

عدم معرفت کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

غرض اسلام اور دُوسرے مذاہب میں جو امتیاز ہے وہ یہی ہے کہ اسلام حقیقی معرفت عطا کرتا ہے جس سے انسان کی گُناہ آلود زندگی پر موت آجاتی ہے اور پھر اُسے ایک نئی زندگی عطا کی جاتی ہے جو بہشتی زندگی ہوتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر قرآنِ شریف سے اعراض صوری یا معنوی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس میں اور اُس کے غیروں میں فرقان رکھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین اور ایمان پیدا ہوتا ہے۔ اس کی قدرتوں کے عجائبات وہ مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کی معرفت بڑھتی ہے۔ اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور اس کو وہ حواس اور قویٰ دیئے جاتے ہیں کہ وہ ان چیزوں اور اسرارِ قدرت کو مشاہدہ کرتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھتے وہ ان باتوں کو سُنتا ہے کہ اوروں کو اُس کی خبر نہیں اسی لیے فرمایا مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل:۷۳) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے لیے انسان اسی عالم سے حواس لے جاتا ہے۔ اسی جگہ سے وہ بصارت لے جاتا ہے جو وہاں کی اشیاء اور عجائبات کو دیکھے اور یہاں ہی سے وہ شنوائی لے جاتا ہے جو سُنے۔ گویا جو اس جہان میں وہاں کی باتیں دیکھتا اور سُنتا نہیں وہ وہاں بھی نہیں دیکھ سکے گا۔

یہ تھا مابہ الامتیاز اسلام اور دُوسرے مذاہب کے درمیان جس کو میرے مخالف پیش نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ نے اسی فرقان کو دے کر مجھے بھیجا ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ جبکہ یہ مابہ الامتیاز ہے تو کیوں ہر شخص نہیں دیکھ لیتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سنّت اللہ اسی طرح پر واقع ہوئی ہے کہ یہ بات بجز مجاہدہ، توبہ اور تبدیلِ تام کے نہیں ملتی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۷۰) یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے انہی کو یہ راہ ملے گی۔ پس جو لوگ خدا تعالیٰ کے وصایا اور احکام پر عمل نہ کریں بلکہ اُن سے اعراض کریں اُن پر یہ دروازہ کس طرح کھل جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یہاں ایک خزانہ مدفون ہے اور دس بارہ دن کی محنت کے بعد نکل سکتا ہے اور کوئی شخص محنت تو کرے نہیں اور یہ کہے کہ خزانہ مل جاوے۔ کیونکر ملے گا؟ اسی طرح پر یہ خزانہ اللہ تعالیٰ نے اسلام میں رکھا ہے لیکن اس خزانہ کی کلید احکام اور ہدایتوں پر عمل ہے۔ اس کی وصیت اور ہدایت پر عمل کرنا اور محض خدا کے لیے نفس کو روک رکھنا یہ کنجی ہے اور اسلام ہی میں یہ ملتی ہے۔ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (اٰل عمران:۸۶) اسلام ایک چشمہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر جا بیٹھا ہے اور مُنہ رکھ کر اس سے سیراب ہو کر نہیں پیتا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ اس چشمہ کا کیا قصور ہے؟ اگر کوئی شخص آفتاب کی طرف سے اپنے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتا ہے تو ضرور ہے کہ اس کے کمرہ میں تاریکی آجاوے اس میں آفتاب کا کوئی قصور نہیں۔ اس لیے جب تک انسان سچا مجاہدہ اور محنت نہیں

کرتا وہ معرفت کا خزانہ جو اسلام میں رکھا ہوا ہے اور جس کے حاصل ہونے پر گناہ آلود زندگی پر موت وارد ہوتی ہے۔ انسان خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور اس کی آوازیں سُنتا ہے اُسے نہیں مِل سکتا؛ چنانچہ صاف طور پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النّٰزعٰت : ۴۱، ۴۲) یہ تو سہل بات ہے کہ ایک شخص متکبرانہ طور پر کہدے کہ مَیں اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہوں اور باوجود اس دعویٰ کے اس ایمان کے آثار اور ثمرات کچھ بھی پیدا نہ ہوں یہ نِری لاف زنی ہوگی۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کی پرواہ نہیں کرتا۔

اصل بات یہی ہے کہ یہ دولت مجاہدہ اور محنت کے بغیر ہاتھ نہیں آتی ہے اور اُن راہوں پر چلنا سب کے لیے ضروری ہے۔ یہاں تک کہ انبیاء و رُسل کے لیے بھی یہی راہ ہے۔ ان کو جو فتوحات دیئے جاتے ہیں وہ اسی راہ سے ملتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام تو اس راہ میں فنا ہو جاتے ہیں اور وہی حالت ہوتی ہے جب ان سے معجزات صادر ہوتے ہیں۔ وہ عام لوگوں سے بالکل نرالی قوم ہوتی ہے۔ ہر شخص تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ اس کی عزت اور شہرت ہو۔ برخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام اپنے نفس کو بالکل بھُلا دیتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ ہی کی عزت اور عظمت کے بھُوکے پیاسے ہوتے ہیں۔ خدا تعالےٰ کی عظمت اور جبروت کے اظہار کے لیے وُہ ہر قسم کی ذلّت کے برداشت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ تمام دکھوں اور مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں مگر ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ ان کی ساری خواہشیں اور آرزوئیں اسی ایک بات پر آکر ختم ہو جاتی ہیں کہ کسی طرح پر اہلِ دنیا خدا تعالےٰ پر ایمان لاویں۔ انہیں سخت تکلیف پہنچتی ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ مُشرک اور خدا تعالیٰ سے دُور لوگ اپنے بتوں اور معبودوں کی ایسی تعریف کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی ہونی چاہیے۔ ایسا ہی وہ اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ لوگ ہر قسم کے فسق و فجور اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف سے مُنہ موڑیں۔ ایسی صورت میں اُن کے دل پر قلق اور کرب کا استیلاء ہوتا ہے۔ پس جب اُن کے دُکھوں اور تکالیف کا اندازہ حد سے گذر جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ پھر گوارا نہیں کرتا کہ وہ اس طرح پر دُکھ اُٹھائیں۔ اس لیے وہ کرامت یا نشان ظاہر کرتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ راستباز دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو انبیاء و رُسل۔ یہ تو اعلیٰ درجہ کے راستباز اور مقدّس وجود ہیں۔ دوسری قسم کے وہ راستباز ہیں جو عام مومن ہوتے ہیں۔ لیکن اُن میں کچھ نہ کچھ بقایا نفس بھی موجود ہوتا ہے۔ ان دوسرے درجہ کے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ خوارق کا حصّہ دے دیتا ہے۔ لیکن بڑے نشانوں کی مستحق وہی قوم انبیاء و رُسل کی ہے جو کسی صورت میں بھی خدا تعالیٰ کے غیر کا جلال نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی مصیبت اور دُکھ اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے خلاف نہ دیکھ سکتے

ہیں نہ سُن سکتے ہیں۔ میرا ایمان یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کا طوفان جو آیا اس طوفان سے پہلے ایک طوفان خود نُوح پر بھی آیا۔ تب وہ طوفان آیا جس نے لوگوں کو غرق کیا۔ اسی طرح پر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون غرق ہوا مگر اس سے پہلے مُوسیٰ علیہ السلام نے ایک سخت مصیبت دیکھی جو لوگوں کی نظر سے مستور تھی مگر وہ ایسی مصیبت تھی کہ اُسے اُن کا ہی دل برداشت کر سکتا تھا اور ایسی بھاری مصیبت تھی جس نے یہ نمونۂ غرق دکھایا۔ نوح علیہ السلام کا غم خیال کرو کہاں تک پہنچا ہوگا جو خدا تعالیٰ کا غضب اس طرح پر بھڑکا۔

یقیناً سمجھو کہ یہ قوم ایک عجیب قوم ہوتی ہے۔ لوگوں کے ہم و غم اپنے گھر کے دائرہ کے اندر ہوتے ہیں۔ بیوی بچوں کا غم ہوا یا اپنی عزت و دولت کے لیے۔ اور اسی لیے خدا تعالیٰ ان کی پروا نہیں کرتا لیکن اس قوم کے غموں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف مخلوق کی ہمدردی انہیں ہم و غم میں مبتلا کرتی ہے۔ دُوسری طرف اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان بلند کرنے کے لیے کڑھتے ہیں اور یہ بات تکلّف یا بناوٹ سے پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی فطرت ہی اس قسم کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اس قوم کو اس رنگ میں گویا آگ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتا کہ وہ غم میں مر جاویں۔ وہ دیکھتا ہے کہ ان کا غم محض اس کے لیے ہے۔ اُن سے اگر پُوچھا جاوے کہ وہ کیوں اس قدر غم کھاتے ہیں تو بتلا نہیں سکتے کیونکہ ان کے تعلقات ذاتیہ ہوتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے لیے وہ طبعی طور پر بے قرار ہوتے ہیں۔ اور اس میں اُن کے نفس کا کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔ کامل نفوس کے تعلقات جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں وہ اس قسم کے ہیں کہ اگر بہشت دوزخ بھی نہ ہو تب بھی وُہ دُور نہیں ہو سکتے۔ غرض انسان اس کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کے لیے کس کس قسم کے قلق و کرب میں رہتے ہیں۔ جب یہ اضطراب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر آسمانی نشان ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ خدا تعالےٰ بے پرواہ ہے۔ اگر ساری دُنیا اس کی حمد و ستائش کرے اور کوئی بھی اس کی خلاف ورزی نہ کرے تو اس کی شانِ رُبوبیت اور اُلوہیت میں کچھ بھی زیادتی نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اگر سب کے سب فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں۔ مگر بات یہ ہے کہ جب ایک انسان اس کے لیے ہی کھپتا ہے تو آخر اُسے اپنی مستور ذات کو ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ یہی سِرّ ہے اس حدیث میں کُنْتُ كَنْزًا مَّخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے ماموروں اور رسولوں کا قلق۔ کرب حد سے بڑھتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے مجاہدات کا اتنا ہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں بلکہ دنیا پر بھی احسان کر جاتے ہیں کیونکہ اسے بھی دکھا دیتے ہیں۔

پس نرے چھلکے پر کفایت کر لینا کافی نہیں ہے۔ ایسی متاع چُرائی جا سکتی ہے لیکن جو متاعِ حقیقی

اسلام پیش کرتا ہے جو اس کے اور اس کے غیروں میں مابہ الامتیاز ہے اُسے کوئی چُرا نہیں سکتا۔ یہ بات ہے جو ہم پیش کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ موجود ہے اور اُس کے امتیازی نشان ظاہر ہوتے ہیں۔ اسلام کے ثمرات اب بھی ایسے ہی ہیں۔ اگر کوئی ان پھلوں کو نہیں کھاتا تو اسلام کا کیا قصور؟ طبیب اگر ایک نسخہ بتا دے اور کوئی اسے استعمال نہ کرے تو اس میں طبیب کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اسلام میں یہ ایسی نعمت ہے جو کسی اَور دین میں نہیں مل سکتی۔ اسی کی طرف اشارہ کرکے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (المائدۃ : ۴) لیکن یہ نعمت نہیں مل سکتی جبتک اس طرف قدم نہ اُٹھا دے۔ اور افسوس کہ ہمارے مخالف اس نعمت کی طرف متوجہ نہیں۔[1]

---

۱۴ اگست ۱۹۰۵ء

(دربار شام)

اُولوالامر کون ہے شیخ عبدالحق صاحب آریہ نومُسلم نے اجازت چاہی۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ کچھ دن اَور رہو۔ دین کی تپش اور تلاش انسان کو مقدم ہونی چاہیے۔

اس پر انہوں نے ذیل کا سوال کیا اس کا جو جواب حضرت اقدس نے دیا وہ بھی درج ہے :

سوال : اولوالامر سے کیا مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر ایک مولوی اولوالامر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کوئی نہیں۔

جواب از حضرت اقدس : اصل بات یہ ہے کہ اسلام میں اس طرح پر چلا آیا ہے کہ اسلام کے بادشاہ جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت ہے ان کی اطاعت کرنی چاہیے وہ بھی ایک قسم کے اولوالامر ہوتے ہیں۔ لیکن اصل اولوالامر وہی ہوتے ہیں جن کی زندگی پاک ہوتی ہے اور ایک بصیرت اور معرفت جن کو ملتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے امر پاتے ہیں۔ یعنی ماموراِلٰہی۔

بادشاہوں کے پاس حکومت ہوتی ہے وہ انتظامی امور میں تو پُورا دخل رکھتے ہیں لیکن دینی امور کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔ سچے اولوالامر وہی ہیں جن کے اتباع سے معرفت کی آنکھ ملتی ہے اور انسان معصیت سے دُور ہوتا ہے۔ ان دونوں باتوں کا لحاظ اولوالامر میں رکھو۔ اگر کوئی شخص بادشاہِ وقت کی بغاوت کرے تو اس کا نتیجہ

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۴ تا ۶ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء

اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا کیونکہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا اور اللہ تعالیٰ فتنہ کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح پر ماُمور کی مخالفت کرے تو سلبِ ایمان ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی مخالفت سے لازم آتا ہے کہ مخالفت کرنے والا خدا تعالیٰ کی مخالفت کرتا ہے۔

سوال : پھر اس وقت جو مولوی ہیں کیا اُن کو اولوالامر سمجھیں؟

جواب : او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔

اصل بات یہ ہے کہ جبتک اللہ تعالیٰ کسی کی آنکھ نہ کھولے آنکھ کھُلتی نہیں۔ ان لوگوں نے دین صرف چند رسُوم کا نام سمجھ رکھا ہے، حالانکہ دین رسُوم کا نام نہیں ہے۔ ایک زمانہ وہ ہوتا ہے جبکہ یہ باتیں محض رسم اور عادت کے طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ یہ لوگ اسی قسم کے ہو رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جن کو نماز اور روزہ سکھایا گیا تھا ان کا اور مذاق تھا وہ حقیقت کو لیتے تھے اور اسی لیے جلد مستفیض ہوتے تھے۔ پھر مدت کے بعد وہی نماز اور روزہ جو اعلیٰ درجہ کی طہارت اور خدا رسی کا ذریعہ تھا ایک رسم اور عادت سمجھا گیا۔ پس اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اصل امرِ دین کو جو مغز ہے تلاش کرے۔

سچے مذہب کی خصُوصیات

یاد رکھو انسان کو اللہ تعالیٰ نے تعبّد ابدی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس لیے اس کو چاہیے کہ اسی میں لگا رہے۔ اس جہان کی جس قدر چیزیں ہیں۔ بیوی، بچے، احباب، رشتہ دار، مال و دولت اور ہر قسم کے املاک ان کا تعلق اسی جہان تک ہے۔ اس جہان کو چھوڑنے کے ساتھ ہی یہ سارے تعلقات قطع ہو جاتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ ہے اور اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی اس کی ضرورت ہے اس لیے سچا تعلق اسی کے ساتھ ہونا چاہیے کیونکہ نجاتِ ابدی اسی کے ساتھ وابستہ ہے جو خدا تعالیٰ کی معرفت، محبت اور صدق، وفاداری کے تعلق پیدا کرنے سے ملتی ہے۔ یہاں تک تو سب مذاہب متفق ہیں وہ نجات کا یہی ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ باتیں حاصل کیونکر ہوں؟ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مذاہب کا تفرقہ شروع ہوتا ہے۔ اب جس مذہب نے حصولِ نجات کے عمدہ وسائل پیدا کئے ہیں اور جو مذہب تاثیر اور جذب اور کشش اپنے اندر رکھتا ہے وہ سچا ہے لیکن جس مذہب کے اندر وہ تاثیر اور جذب نہیں جس کی عملی تاثیروں کا کوئی نمونہ پایا نہیں جاتا وہ خواہ خدا تعالیٰ کو واحد ہی کہے، لیکن جھوٹا ہے۔ یہ توحید اس کی محض قال کے رنگ میں ہے۔ حالی کیفیت اس میں پائی نہیں جاتی۔ حالی کیفیت تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ غیر کا وجود بالکل نابود ہو جاوے۔ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنے والا ہو۔ اسی سے ہر ایک امید و خوف ہو۔ جبتک یہ بات عملی طور پر پیدا نہ ہو نرے قال سے کچھ نہیں بنتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو واحد سمجھتا ہے پھر دوسرے سے بھی تعلق رکھتا ہے تو توحید کہاں رہی؟

یا خدا تعالیٰ کو رازق مانتا ہے مگر کسی دوسرے پر بھی بھروسہ کرتا ہے یا دوسرے سے محبت کرتا ہے یا کسی سے امید اور خوف رکھتا ہے تو اس نے واحد کہاں مانا؟ غرض ہر پہلو سے اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے سے توحیدِ حقیقی متحقق ہوتی ہے مگر یہ اپنے اختیار میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی ہستی پر کامل یقین سے پیدا ہوتی ہے۔

یک طرفہ خیال رفتہ رفتہ ضائع ہو جایا کرتے ہیں مثلاً ایک شخص خیال کرے کہ اس چوبارہ کے اندر آدمی ہے۔ جب وہ بیدار ہوگا تو اس کو کھولے گا لیکن جب اس پر دو دن، چار دن، مہینہ دو مہینے یہاں تک کہ کئی برس گذر جاویں اور کوئی آواز نہ دے نہ کھڑکا ہو تو آخر اسے اپنا اعتقاد بدلنا پڑے گا اور خیال پیدا ہونے لگے گا کہ اگر اس کے اندر کوئی آدمی ہوتا تو ضرور بولتا معلوم ہوا کہ کوئی آدمی ہے ہی نہیں۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ جو ان آنکھوں سے پوشیدہ ہے اس کی بابت بھی طالبِ حق چاہتا ہے کہ اس کا پورا پتہ لگے تاکہ ایمان ترقی کرے ضرور ہے کہ اس کی قدرتوں کے عجائبات نظر آویں۔ اس کی آواز بھی سنائی دے اور اس کے سُننے کا پتہ لگے۔ لیکن اگر کسی بات کا پتہ ہی نہیں چلتا تو پھر رفتہ رفتہ ایمان کمزور ہو کر انسان دہریہ ہو جاتے گا۔

یہ تو سب اہلِ مذاہب مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے اور ہماری دُعائیں سُنتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ وہ جس طرح پر سنتا ہے کیا یہ ضرور نہیں کہ اسی طرح پر بولتا بھی ہو۔ اگر بولتا نہیں تو پھر اس کا سُننا بھی باطل ہوگا اور پھر دُوسرے صفات بھی باطل ہو جائیں گے۔ آریہ بھی اتنا تو مانتے ہیں کہ وہ سُنتا ہے، لیکن جب ہم پُوچھتے ہیں کہ کیا وہ سُنتا[1] بھی ہے۔ تو یہاں آکر خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو پھر یہ کیوں کر مان لیا جاوے کہ اس کے کان تو ہیں مگر زبان نہیں۔ یہ تو ادھورا خدا ہے۔

سچا علم اور مذہب وہی ہو سکتا ہے جو خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت دے جو سُننے کا ثبوت دیتا ہے وہ بولنے کا بھی دیتا ہے۔ اس معیار پر اگر صرف اسلام ہی ہے جو سچا ثابت ہوگا آریہ کہتے ہیں کہ کسی قدیم زمانے میں بولتا تھا اب نہیں بولتا۔ مگر ہم کہتے ہیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ پہلے بولتا تھا؟ ایسا ہی عیسائیوں کا بھی حال ہے وہ بھی اس بات کا ثبوت نہیں دے سکتے کہ خدا بولتا ہے۔ ہاں ہم کہتے ہیں کہ جس طرح خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ وہ دیکھتا ہے اور سُنتا ہے اسی طرح ہم یقین رکھتے ہیں اور اپنے تجربہ سے کہتے ہیں کہ وہ بولتا بھی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس کی آواز سُننے کے لیے خود تمہارے کان بھی کھُلے ہوئے ہونے چاہئیں۔ اگر تم اپنے کان

---

[1] کاتب کی غلطی ہے۔ دراصل یہ فقرہ یوں ہونا چاہیے : ”کیا وُہ بولتا بھی ہے؟“
(مرتب)

میں روئی دے دو گے تو ہرگز نہیں سُن سکتے۔ یا آفتاب اور ماہتاب کے نُور سے بھاگ کر کسی تہہ خانہ میں چھُپ جاؤ تو روشنی کیونکر آسکے گی؟ ہر چیز کے حصُول کے لیے ایک قانون ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس قانون کو چھوڑ کر اور اس سے منحرف ہو کر اُسے حاصل کرنا چاہے تو حاصل نہیں کر سکتا۔ مثلاً آنکھ۔ کان میں جو قوتیں ہیں اگر اُن سے کام نہ لے تو اثر نہیں رہتا۔ اسی طرح پر خُدا تعالیٰ نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ انسان اوّل اپنے دل کو پاک کرے اور نفسانی خواہشوں کی مخالفت کرے۔ اس سے درمیانی گرد و غبار اُٹھ جائے گا اور ثابت ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ سُنتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے۔ جو لوگ عارف ہوتے ہیں، اُن پر یہ باتیں کھُل جاتی ہیں وُہ اسی دُنیا میں خُدا تعالیٰ کی صفات کو مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو شخص ان صفات کو دیکھتا نہیں وہ صرف طوطے کی طرح رٹتا ہے۔ آریوں نے جو صفائی کی ہے وہ تو پہلے سے بھی گیا گذرا والا معاملہ ہوا ہے۔ اگر انصاف سے دیکھا جاوے تو زبانی لاف و گزاف کچھ نہیں کر سکتی۔ مَیں یقیناً کہتا ہوں کہ ان لوگوں کے سارے دعوے باطل ہیں اس لیے کہ اُن کو رؤیت کی توفیق نہیں ملی ہے۔ جس پر اس جہان کی کھڑکی نہیں کھُلی وُہ کیا دیکھے گا۔؟

پنڈت دیانند نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ نِری اٹکل ہے۔ جیسا ایک اندھا کسی کو ہاتھ لگا کر اس کے متعلق بیان کرتا ہے، اسی طرح سے اُنھوں نے کیا ہے۔ محض اپنے مذہب کے تعصب کی جہالت سے کہا جو کچھ کہا۔ اس کی وہ آنکھیں نہیں تھیں جو وہ اس عالم کے عجائبات کو مشاہدہ کرتا۔ اس کو بالکل خبر نہیں کہ خدا کیا ہے اور اس کی صفات کیا ہیں۔

یہ بھی یاد رکھو کہ جس چیز کے صفات دُور ہو جائیں تو وہ چیز بھی جاتی رہتی ہے۔ پھُول کی صورت نوعی بھی جاتی رہے گی، جب اس کے خواص اور صفات نہ ہوں۔ اسی طرح پر آریوں کے قول کے بموجب پرمیشر ہی کا وجود نہیں رہتا جبکہ یہ مان لیا جاوے کہ اس کے صفات نہیں کیونکہ وہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی سے بولتا بھی ہے جب بولتا نہیں تو سُننے پر کیا دلیل ہوگی۔ اسی طرح قدرت بھی باطل ہوئی۔ خدا تعالیٰ کے صفات قدیم سے چلے آتے ہیں۔ جب ایک صفت باطل ہوئی تو ممکن ہے کوئی دوسری بھی باطل ہو جاوے۔ سچا مذہب وہی ہے جو زندہ خدا کو پیش کرے اور وہ اسلام ہے۔

ہمارے مخالف اسلام کا اقرار کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ وہ اسلام کی اس قابلِ قدر خوبی سے انکار کرتے ہیں۔ جب سے اسلام ہوا ہے اس میں ہمیشہ عملی نمونے رہے ہیں لیکن وہ انکار کرتے ہیں کہ اب نہیں۔ افسوس۔

فرمایا : ایک اور بڑی خرابی ہوتی ہے کہ انسان میں علم ہو سمجھ ہو۔ پھر دنیا کے خیال اس پر غالب ہو جائیں تو اس طرح پر دینی سرگرمی نہیں رہتی وہ مُردہ یا منافق ہو جاتا ہے اس لیے اس جماعت میں ملنے والا تو وہ ہوگا جو ہر قسم کے مصائب اور شدائد کا نشانہ بننے کو آمادہ ہو۔ لیکن محبت ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جیسے ایک مست

اُونٹ پر جس قدر بوجھ چاہو۔ لاد دو۔

فرمایا : قوی القلب آدمی ہو۔ تو یہی نہیں کہ وہ مخالفوں کے شور و شر سے امن پاتا ہے بلکہ اللہ تعالےٰ اس میں جذب اور کشش رکھ دیتا ہے۔

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ صفحہ ۶، مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۵ء

۲۶؍اگست ۱۹۰۵ء

آج نمازِ ظہر میں مسجد مبارک میں قبل از نماز ذکر آیا کہ جاپان میں اسلام کی طرف رغبت معلوم ہوتی ہے اور بعض ہندی مُسلمانوں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا ہے۔ اس پر فرمایا :

جاپان میں اسلام کی تبلیغ

جن کے اندر خود ہی اسلام کی رُوح نہیں وہ دُوسروں کو کیا فائدہ پہنچائیں گے۔ جب یہ قائل ہیں کہ اب اسلام میں کوئی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ خدا اس سے کلام کرے اور وحی کا سلسلہ بند ہے تو یہ ایک مُردہ مذہب کے ساتھ دُوسرے پر کیا اثر ڈالیں گے۔ یہ لوگ صرف اپنے پر ظلم نہیں کرتے بلکہ دُوسروں پر بھی ظلم کرتے ہیں کہ اُن کو اپنے بد عقائد اور خراب اعمال دکھا کر اسلام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ اُن کے پاس کونسا ہتھیار ہے جس سے یہ غیر مذاہب کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔ جاپانیوں کو عُمدہ مذہب کی تلاش ہے۔ اُن کی بوسیدہ اور ردّی متاع کو کون لے گا۔ چاہیے کہ اس جماعت میں سے چند آدمی اس کام کے واسطے تیار کیے جائیں جو لیاقت اور جرأت والے ہوں اور تقریر کرنے کا مادہ رکھتے ہوں[1]

بدر جلد ۱ نمبر ۲۱ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴؍اگست ۱۹۰۵ء

۱۹؍اگست ۱۹۰۵ء

ایک شخص نے اپنا خواب عرض کیا کہ فلاں آدمی نے مجھے خواب میں ایسا کہا۔ فرمایا :

خواب کا تعین ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ جس کو خواب میں دیکھا جاتا ہے اس سے مراد کوئی اَور شخص ہوتا ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں نیز دیکھئے ۲۶؍جون ۱۹۰۵ء کی ڈائری۔

مسیح علیہ السلام کے بارہ میں قتل و صلیب کی نفی

کسی شخص نے اعتراض کیا کہ قرآن شریف میں حضرت مسیح کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (النسآء : ۱۵۸) نہ قتل کیا اور نہ صلیب دیا۔ اس میں قتل کا ذکر پہلے ہے اور صلیب کا پیچھے، حالانکہ پہلے کسی کو صلیب پر چڑھایا جاتا ہے اور بعد میں صلیب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قتل ہو جاتے۔ برخلاف اس کے قرآن شریف میں قتل کا ذکر پہلے ہے اور صلیب کا پیچھے ہے۔ فرمایا :-

اوّل تو یہود کا اعتراض جو قرآن شریف میں درج ہے وہ یہی ہے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ (النسآء : ۱۵۸) یعنی ہم نے مسیح کو قتل کیا۔ چونکہ انہوں نے قتل کا لفظ بولا تھا۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے پہلے لفظ قتل کی ہی نفی کی۔ دوم یہ کہ یہود میں دو روایتیں تھیں۔ ایک یہ کہ ہم نے یسوع کو تلوار سے قتل کر دیا ہے اور دُوسرا یہ ہے کہ اس کو صلیب پر مارا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہر دو کی جدا جدا نفی کی۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہودیوں کی بعض پُرانی کتب میں یہ بھی لکھا ہے کہ یسُوع کو پہلے سنگسار کیا گیا تھا اور جب وہ مر گیا تو بعد میں اس کو کاٹھ پر لٹکایا گیا یعنی پہلے قتل ہوا اور پیچھے صلیب۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی نفی کی اور فرمایا کہ یہود جھوٹے ہیں۔ نہ حضرت مسیح اُن کے ہاتھوں قتل ہوئے اور نہ صلیب کے ذریعے سے مارے گئے۔

اسلام کی صداقت پر ایک بھاری دلیل

فرمایا :

خدا تعالیٰ کے صفات کا جو کامل اکمل نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے وہ اسلام کی صداقت پر ایک بڑی بھاری دلیل ہے۔ باقی تمام مذاہب اس معاملہ میں ناقص ہیں کہ وُہ خدائی صفات کا سروپا پوری طرح بیان کر سکیں اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی تمام مذاہب خدا تعالیٰ کی کمال طاقتوں کے صفات سے مُنکر ہیں۔ مثلاً آریہ کہتے ہیں کہ وہ کلام نہیں کرتا چُپ ہے۔ عیسائیوں کا بھی یہی مذہب ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ کسی کو نجات دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کی تعریف کرے اور کہے کہ وہ ایسا خوبصورت ہے اور ایسا طاقتور ہے مگر بہرہ ہے۔ سُن نہیں سکتا اور گُونگا ہے کچھ بولتا نہیں۔ چڑچڑا ہے۔ ہم کو نجات دینا نہیں چاہتا۔ بہشت میں بھیجتا ہے تو بھی ایک گناہ باقی رکھ لیتا ہے جس سے پھر جلد سانپ، بچھو، کُتے، سوٴر کی جون میں ڈال دیتا ہے۔ ان دینوں میں یہ برکت نہیں کہ انسان پاکیزگی حاصل کر کے خدا سے اَنَا الْمَوْجُوْد کی آواز کوئی سُن سکے۔ اسی واسطے یہ لوگ غفلت کی تاریکی میں پڑے ہوتے ہیں۔

مجاہدہ کی اہمیّت

فرمایا : جو لوگ خدا کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ سچّی توبہ کے ساتھ اس کے آگے

جُھک جاتے ہیں اُن کو خُدا مِل جاتا ہے مگر جو لوگ اس کے بتلائے ہوئے راہ پر نہیں چلتے اور اس میں محنت نہیں کرتے اُن کے واسطے مشکل ہے کہ وہ اس بات کو پا سکیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اس طرح ہے کہ ایک باپ نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ فلاں مقام میں ایک خزانہ دفن ہے اور وہ زمین کے اندر اتنے ہاتھ گہرائی پر ہے۔ جبتک اس کو کھودنے کی محنت نہ کی جاوے وہ کس طرح اُن کو مِل سکتا۔[1]

۳۱؍اگست ۱۹۰۵ء

ایک رؤیا اور اس کی تعبیر

۳۱؍اگست کی رات کو مَیں نے دیکھا کہ عبداللہ سنوری میرے پاس آیا ہے اور وُہ ایک کاغذ پیش کرکے کہتا ہے کہ اس کاغذ پر مَیں نے حاکم سے دستخط کرانا ہے اور جلدی جانا ہے۔ میری عورت سخت بیمار ہے اور کوئی مجھے پوچھتا نہیں۔ دستخط نہیں ہوتے۔ اس وقت مَیں نے عبداللہ کے چہرہ کی طرف دیکھا تو زرد رنگ اور سخت گھبراہٹ اس کے چہرہ پر ٹپک رہی ہے مَیں نے اس کو کہا کہ یہ لوگ رُکے ہوتے ہیں۔ نہ کسی کی سفارش مانیں اور نہ کسی کی شفاعت۔ مَیں تیرا کاغذ لے جاتا ہوں۔ آگے جب کاغذ لے کر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص مٹھن لال نام جو کسی زمانہ میں بٹالہ میں اکسٹرا اسسٹنٹ تھا کُرسی پر بیٹھا ہوا کچھ کام کر رہا ہے اور گرد اس کے عملہ کے لوگ ہیں۔ مَیں نے جا کر کاغذ اس کو دیا اور کہا کہ یہ ایک میرا دوست ہے اور پُرانا دوست ہے اور واقف ہے اس پر دستخط کر دو۔ اُس نے بلا تامل اسی وقت لیکر دستخط کر دیئے۔ پھر مَیں نے واپس آکر وہ کاغذ ایک شخص کو دیا اور کہا خبردار ہوش سے پکڑو ابھی دستخط کیلے ہیں اور پُوچھا کہ عبداللہ کہاں ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ کہیں باہر گیا ہے۔ بعد اس کے آنکھ کھُل گئی اور ساتھ پھر غنودگی کی حالت ہوگئی۔ تب مَیں نے دیکھا کہ اس وقت مَیں کہتا ہوں۔ مقبول کو بلاؤ اس کے کاغذ پر دستخط ہوگئے ہیں۔

یہ جو مٹھن لال دیکھا گیا ہے۔ ملائک طرح طرح کے تمثلات اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ مٹھن لال سے مُراد ایک فرشتہ تھا۔ سنوری سے یہ مراد ہے۔ سنور عربی میں بلّی کو کہتے ہیں اور تعبیر کی رُو سے بلّی ایک بیماری کا نمونہ ہے۔ عبداللہ سنوری سے مراد ہوئی وہ عبداللہ جو بیمار ہے۔

فرمایا:

طِب تو ظاہری محکمہ ہے۔ ایک اس کے وراء محکمہ پردہ میں ہے جبتک وہاں دستخط نہ ہو۔ کچھ نہیں ہوتا۔[2]

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۱ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴؍اگست ۱۹۰۵ء

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۲۲ صفحہ ۲ و ۳ مورخہ ۳۱؍اگست ۱۹۰۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

وعلیٰ عبدہٖ المسیح الموعود

ملفوظات

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

از یکم ستمبر ۱۹۰۵ء[۱]

اطمینان قلب

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد : ۲۹) اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے قلوب اطمینان پاتے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت اور فلاسفی یہ ہے کہ جب انسان سچے اخلاص اور پوری وفاداری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور ہر وقت اپنے آپ کو اس کے سامنے یقین کرتا ہے۔ اس سے اس کے دل پر ایک خوف عظمتِ الٰہی کا پیدا ہوتا ہے وہ خوف اس کو مکروہات اور منہیات سے بچاتا ہے اور انسان تقویٰ اور طہارت میں ترقی کرتا ہے یہانتک کہ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ اس پر نازل ہوتے ہیں اور وہ اس کو بشارتیں دیتے ہیں اور الہام کا دروازہ اس پر کھولا جاتا ہے۔ اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کو گویا دیکھ لیتا ہے

---

[۱] یہ ملفوظات ۱۲؍ستمبر ۱۹۰۱ء کے ہیں لیکن ۱۰؍ستمبر ۱۹۰۵ء میں چھپنے کی وجہ سے یہاں درج کئے جا رہے ہیں

اور اس کی وراء الوراء طاقتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر اس کے دل پر کوئی ہم و غم نہیں آسکتا اور طبیعت ہمیشہ ایک نشاط اور خوشی میں رہتی ہے۔ اسی لیے دُوسرے مقام پر آیا ہے۔ لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ : ۶۳) اگر کوئی ہم و غم واقع بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے الہام سے اس کے لیے خارجی اسباب اُن کے دُور کرنے کے پیدا کر دیتا ہے۔ یا خارقِ عادت صبر اُن کو عطا کرتا ہے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقامِ دَنَا فَتَدَلّٰی

دَنَا فَتَدَلّٰی (النجم : ۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی شان میں آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اُوپر کی طرف ہو کر نوعِ انسان کی طرف جُھکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا کمال اعلیٰ درجہ کا کمال ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی اور اس کمال میں آپؐ کے دو درجے بیان فرماتے ہیں۔ ایک صعود، دُوسرا نزول۔ اللہ تعالیٰ کی طرف تو آپؐ کا صعود ہوا یعنی خدا تعالیٰ کی محبت اور صدق و وفا میں ایسے کھینچے گئے کہ خود اس ذاتِ اقدس کے دُنُوّ کا درجہ آپؐ کو عطا ہوا۔ دُنُوّ۔ اَقْرَب سے ابلغ ہے۔ اس لیے یہاں یہ لفظ اختیار کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے فیوضات اور برکات سے آپؐ نے حصّہ لیا تو پھر بنی نوع پر رحمت کے لیے نزول فرمایا۔ یہ وہی رحمت تھی جس کا اشارہ مَآاَرْسَلْنٰکَ اِلَّارَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء : ۱۰۸) میں فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسم قاسم کا بھی یہی سِرّ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں اور پھر مخلوق کو پہنچاتے ہیں پس مخلوق کو پہنچانے کے واسطے آپ کا نزول ہوا۔ اس دَنَا فَتَدَلّٰی میں اسی صعود اور نزول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے علوِّ مرتبہ کی دلیل ہے[2]۔

پیشگوئیوں میں استعارات

انبیاء علیہم السلام کے آنے کے وقت دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو استعارات کو حقیقت پر محمول کر لیتے ہیں اور حقیقت کو استعارہ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ گروہ ان کی شناخت سے محروم رہ جاتا ہے لیکن ایک اور گروہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی تائید سے اصل حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ وہ استعارہ کو استعارہ اور حقیقت کو حقیقت ٹھہراتے ہیں۔ جیسے یہودیوں نے مسیح کی آمد کے وقت ملاکی نبی

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۲ صفحہ ۸ مورخہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۰۵ء

[2] یہ ملفوظات بھی کسی پرانی تاریخ کے ہیں گمان پر تاریخ اور سن درج نہیں۔ (مرتب)

کے صحیفہ کی بنا پر کہا کہ مسیح کے آنے کی یہ نشانی ہے کہ اس سے پہلے ایلیا آسمان سے آوے۔ مسیح علیہ السلام سے جب انہوں نے یہی سوال کیا تو انہوں نے اس پیشگوئی کو تو تسلیم کر لیا لیکن یہ فیصلہ کر لیا کہ آنے والے ایلیا سے مراد یحییٰ ہے۔ یہودی اس فیصلہ کو سن کر یحییٰ کے پاس پہنچے۔ وہ اس مباحثہ سے بکلّی بے خبر اور ناواقف تھے۔ انہوں نے ایلیا ہونے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کی مخالفت اور بھی تیز ہو گئی اور انہوں نے اصل حقیقت سے بے خبر رہ کر ظاہر الفاظ پر زور دیا اور اس طرح پر خدا تعالیٰ کے ایک سچّے نبی کا انکار کر دیا۔ نہ صرف انکار کیا بلکہ ہر طرح سے اس کی بے حرمتی کرنے کی کوشش کی اور آخر خدا تعالےٰ کے نزدیک ایک مغضوب اور لعنتی قوم ٹھہر گئے۔

اب غور کرو اگر ایلیاء کا آنا دُرست تھا اور حضرت یحییٰ کی شکل میں ایلیا کا بروزی رنگ میں آنا درست نہیں تو ہمارے مخالف مُسلمان بتائیں کہ ملاکی نبی کے صحیفہ کی پیشگوئی کو مدِ نظر رکھ کر حضرت عیسیٰ کی نبوّت کا کیا ثبوت ہے؟ پھر یقیناً وہ نبوّت ثابت نہیں ہو سکتی اور دُوسری مشکل یہ پڑتی ہے کہ حضرت عیسیٰ جو مُردوں کو زندہ کرنے والے تھے کیوں انہوں نے ایلیا کو زندہ نہ کر لیا؟ اس سے دو باتیں اور بھی ثابت ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ اللہ تعالےٰ کی یہ عادت اور سنّت نہیں کہ وہ مُردوں کو دوبارہ دنیا میں بھیجے اور زندہ کرے۔ دوسری یہ کہ مسیح نے کوئی مُردہ زندہ نہیں کیا۔ پس خوب غور کرو اگر بروزی آمد ایلیا کی مراد نہ ہو گی تو مسیح کی نبوّت جاتی رہے گی اور پھر اس کی زد اسلام اور قرآن شریف پر پڑے گی۔

آنے والا مسیح آچکا ہے

اس وقت مسیح کے آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر دوسری وجوہ اور ضروریات کو چھوڑ دیا جاوے تو سلسلہ مماثلت موسوی کے لحاظ سے بھی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بعد چودھویں صدی میں آئے تھے۔ غرض مَیں تو بروز کی ایک نظیر پیش کرتا ہوں، لیکن جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں خود حضرت مسیح ہی دوبارہ آئیں گے انہیں بھی تو کوئی نظیر پیش کرنی چاہیئے اور اگر وہ نہیں کر سکتے اور یقیناً نہیں کر سکتے تو پھر کیوں ایسی بات کرتے ہیں جو محدثات میں داخل ہے۔ محدثات سے پرہیز کرو۔ کیونکہ وہ ہلاکت کی راہ ہے۔ یہودیوں پر غضب الٰہی اسی وجہ سے نازل ہوا کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے ایک رسول کا انکار کر دیا۔ اور اس انکار کے لئے ان کو یہ مصیبت پیش آئی کہ انہوں نے استعارہ کو حقیقت پر حمل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مغضوب قوم ٹھہر گئی۔ اس کا ہم شکل مقدمہ اب بھی پیش ہے مجھے مسلمانوں کی حالت پر افسوس آتا ہے کہ ان کے سامنے یہودیوں کی ایک نظیر پہلے سے موجود ہے اور پانچ وقت یہ اپنی نمازوں میں غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحہ: ۷) کی دُعا کرتے ہیں اور یہ بھی بالاتفاق مانتے ہیں کہ

اس سے مراد یہود ہیں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس راہ کو یہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔ ایک ہی رنگ کا مقدمہ جب کہ ایک پیغمبر کے حضور فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب اس فیصلہ کے خلاف مسیح کو خود آسمان سے یہ کیوں آتارتے ہیں؟ آپ ہی مسیح نے ایلیا کے مقدمہ کا فیصلہ کیا اور ثابت کر دیا کہ دوبارہ آمد سے بروزی آمد مراد ہوتی ہے اور ایلیا کے رنگ میں یحییٰ آیا۔ مگر اب یہ مسلمان اس نظیر کے ہوتے ہوئے بھی اس وقت تک راضی نہیں ہوتے جبتک خود مسیح کو آسمان سے نہ اُتار لیں لیکن میں کہتا ہوں کہ تم اور تمہارے سب معاون مِل کر دُعائیں کرو کہ مسیح آسمان سے اُتر آوے پھر دیکھ لو کہ وُہ اُترتا ہے یا نہیں۔ میں یقیناً کہتا ہوں کہ اگر ساری عمر ٹکریں مارتے رہو اور ایسی دُعائیں کرتے کرتے ناک بھی رگڑے جاویں تب بھی وہ آسمان سے نہیں آئے گا، کیونکہ آنے والا تو آچکا۔

پھر میں کہتا ہوں کہ یہی وقت تو ہے جو اُسے آسمان سے اُترنا چاہیے اگر اُترنا ہے کیونکہ تمہارے خیال میں ایک مفتری اور کاذب مدعی مسیح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اگر فی الواقعہ یہی سچ ہے کہ مسیح نے آسمان سے آنا ہے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اب اُسے اُتارے تاکہ دُنیا گمراہ نہ ہو کیونکہ ایک کثیر جماعت تو مجھے مسیح موعود تسلیم کر چکی ہے۔ اگر اس وقت وہ نہ آیا تو پھر کب آئے گا؟ کیا ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کاذبوں اور مفتریوں کی مدد کرے؟ اگر ایسا کبھی ہوا ہے تو نظیر پیش کرو اور پھر بتاؤ کہ راستبازوں کی سچائی کا کیا معیار ہے؟

مسئلہ وفاتِ مسیح میں کون حق پر ہے

اس مقدمہ میں خوب غور کر کے دیکھ لو کہ حق پر کون ہے؟ عقل اور فراست ہمارے ساتھ ہے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم بھی ہمارے ساتھ ہیں کیونکہ آپؐ نے معراج کی رات حضرت مسیح کو مُردوں میں دیکھا پھر صحابہؓ کا اجماع مسیح کی وفات پر ہو چکا ہے۔ قرآن شریف میری تائید کرتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاص تائیداتِ سماویہ سے میرے دعویٰ کو سچا کیا۔ ہزاروں ارضی اور سماوی نشان میری سچائی کے ظاہر کئے۔ اس قدر شواہد اور دلائل کے ہوتے ہوتے میں کیونکر تسلیم کر لوں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں صحیح ہے جبکہ خدا تعالیٰ کی کھُلی کھُلی وحی مجھے مسیح موعود ٹھہراتی ہے۔ پھر میں ملّانوں کی بات مانوں یا خدا تعالیٰ کی وحی پر ایمان لاؤں؟ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ خُدا تعالیٰ کی وحی کو میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا خواہ ساری دُنیا میری دشمن ہو جاوے اور ایک بھی شخص میرے ساتھ نہ ہو۔

میں خدا تعالیٰ کے تازہ بتازہ کلام کو کیونکر جھُٹلا سکتا ہوں۔ پھر ایسی حالت میں کہ اس کی روشن تائیدیں میرے ساتھ ہیں۔

اگر قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح کے فیصلہ کو یہ سب دھکے دیتے ہیں تو دیں۔ خدا تعالیٰ خود اُن سے مطالبہ اور محاسبہ کرے گا۔

نزولِ ایلیا

ایک اَور عجیب بات ہے کہ جب ہم ایلیا کا قصہ پیش کرتے ہیں اور یہودیوں کا اعتراض سُناتے ہیں جو حضرت مسیح پر اُنہوں نے کیا تو اَور کچھ جواب نہیں آتا تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ کتابیں محرّف مبدّل ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی۔ قومی تواتر اور تاریخ کو کیا کہو گے؟ وہ بھی تو کوئی چیز ہے اسے کیونکر ردّ کرو گے؟ اگر قومی تاریخ اور تواتر بھی ردّ کرنے کے قابل ہے تو پھر بڑے بڑے عظیم الشان بادشاہوں کے وجود پر کیا دلیل ہوگی؟ یقیناً کوئی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قومی تواتر اور تاریخ کو ہم کبھی نہیں چھوڑ سکتے اور یہ مسئلہ نزولِ ایلیا کا ایسا ہے کہ یہودی اور عیسائی بالاتفاق اس کو مانتے ہیں۔ خود حضرت مسیح بھی اس پیشگوئی کے قائل تھے۔ اگر یہ پیشگوئی صحیح نہ تھی تو ان کو اس کی تاویل کرنے کی کیا حاجت تھی؟ وہ سِرے سے اس کا انکار ہی کر دیتے اور کہہ دیتے کہ یہ جو ملاکی نبی کی کتاب میں لکھا ہوا تم پیش کرتے ہو بالکل غلط ہے۔ مگر نہیں اُنہوں نے اس کو صحیح تسلیم کیا اور پھر اس کی تاویل کی۔

یہودی تو یہاں تک چلاتے ہیں کہ ایک یہودی کی کتاب میرے پاس ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر قیامت کو ہم سے مواخذہ ہوگا تو ہم ملاکی نبی کی کتاب کھول کر رکھ دیں گے۔

غرض نزولِ ایلیا کا مسئلہ بڑا صاف اور یقینی مسئلہ ہے اور خود حضرت مسیح کی زبان سے فیصلہ پا چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی آمد کا بھی ذکر کر دیا ہے مگر افسوس ہے لوگ سمجھتے ہوئے نہیں سمجھتے مگر کب تک انکار کریں گے۔ آخر یہ سچائی روزِ روشن کی طرح کھُل جائے گی اور قومیں اس طرف رجُوع کریں گی اسی طرح جیسے مسیح ابنِ مریم کے لیے ہوا۔

توحید کا ایک ثبوت

اللہ تعالیٰ کی توحید پر یوں تو ہزاروں دلائل ہیں لیکن ایک دلیل بڑی عام اور صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ وضعِ عالم میں ایک کرویت واقع ہوئی ہے اور کرویت میں توحید ہی پائی جاتی ہے۔ پانی کا قطرہ لو تو وہ بھی گول ہے۔ زمین کی شکل بھی گول ہے۔ آگ کا شعلہ بھی گول ہی ہے۔ ایسا ہی ستارے بھی گول ہیں۔ اگر تثلیث دُرست ہوتی تو چاہیے تھا کہ ان اشیاء کی اشکال صُوَر بھی سہ گوشی اور مثلث نما ہوتیں اسی طرح پر اللہ تعالیٰ نے آدم سے ایک سلسلہ شروع کیا اور آدم پر اُسے ختم کیا۔ چنانچہ مسیح موعود کا نام بھی آدم رکھا ہے چونکہ یہ آدم نئی قسم کا ہے اس لیے اس کے ساتھ شیطانی جنگ بھی نئے ہی قسم کی ہے۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۲ صفحہ ۸ مورخہ ۱۰؍ ستمبر ۱۹۰۵ء

۷؍ستمبر ۱۹۰۵ء

وحی کا ایک طریق

فرمایا کہ :

بعض دفعہ وحی اس طرح بھی نازل ہوتی ہے کہ کوئی کاغذ یا پتھر وغیرہ دکھایا جاتا ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے۔

فرمایا :

اللہ تعالیٰ کے نشان اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان میں قدرت اور غیب ملا ہوا ہوتا ہے۔ اور انسان کی طاقت نہیں ہوتی کہ اُن کو ظاہر کر سکے۔

حضرت مولوی عبدالکریم سیالکوٹی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی علالت

فرمایا :

مولوی صاحب کی زیادہ علالت کے وقت مَیں بہت دُعا کرتا تھا۔ اور بعض نقشے میرے سامنے آتے جن سے ناامیدی ظاہر ہوتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا موت کا وقت ہے اور ظاہر طب کی رُو سے بھی معاملہ خوفناک تھا کیونکہ ذیابیطس والے کو سرطان ہو جائے تو پھر بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس دُعا میں مَیں نے بہت تکلیف اُٹھائی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بشارت نازل کی اور عبداللہ سنوری والا خواب مَیں نے دیکھا جس سے نہایت درجہ غمناک دل کو تشفی ہوئی جو گذشتہ اخبار میں چھپ چکا ہے[1]۔

اُمت کی تشبیہ عورت سے

اس دُعا میں مَیں نے ایک شفاعت کی تھی جیسا کہ خواب کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے کہ یہ شخص میرا دوست ہے۔ خداتعالیٰ کی قدرت اور اس کا عالم الغیب ہونا ظاہر ہونا تھا کہ مولوی صاحب بچ گئے۔

خداتعالیٰ کی کتب میں نبی کے ماتحت اُمت کو عورت کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ایک جگہ نیک بندوں کی تشبیہ فرعون کی عورت سے دی گئی ہے اور دُوسری جگہ عمران کی بیوی سے مشابہت دی گئی ہے۔ اناجیل میں بھی مسیح کو دُولہا اور اُمت کو دُلہن قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُمت

---

[1] حضور کا یہ کشف ۳۱؍اگست کی ڈائری میں چھپ چکا ہے۔ (مرتب)

کے واسطے نبی کی ایسی ہی اطاعت لازم ہے جیسی کہ عورت کو مرد کی اطاعت کا حکم ہے۔ اسی واسطے ہماری رؤیا میں عبداللہ نے کہا کہ میری بیوی بیمار ہے۔

ایک رؤیا کی تعبیر

عبداللہ نبی کا نام ہے۔ قرآن شریف میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا نام عبداللہ آیا ہے۔ مٹھن سے مراد وہ لذّت اور راحت صحت کی ہے جو بیماری کی تلخی کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ مقبول سے مراد ہے کہ دُعا قبول ہوگئی۔ یہ سب گہرے استعارات ہیں اور تمثلات ہیں۔ جبتک آسمان پر نہ ہو زمین پر کچھ ہو نہیں سکتا۔ مولوی صاحب کا اس بیماری سے صحت پانا ایک بڑا معجزہ ہے۔

مطالعہ کتب کی تلقین

سب دوستوں کے واسطے ضروری ہے کہ ہماری کتب کم از کم ایک دفعہ ضرور پڑھ لیا کریں، کیونکہ علم ایک طاقت ہے اور طاقت سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ جس کو علم نہیں ہوتا مخالف کے سوال کے آگے حیران ہو جاتا ہے

مولوی محمد حسین بٹالوی کے متعلق ایک رؤیا

مولوی محمد حسین بٹالوی کا ذکر تھا۔ ایک دوست نے عرض کی کہ کہیں مرنے کے وقت توبہ کرے گا۔ فرمایا:

اللہ تعالیٰ ہر شَے پر غالب ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہماری جُوتیاں جھاڑ کر آگے رکھتا تھا۔ ہم کو وضو کرانا ایک بڑا ثواب جانتا تھا۔ براہین کا ریویو اس نے خود بخود لکھا۔ ہماری درخواست نہ تھی۔ تعجب نہیں کہ وہ کسی وقت پہلی حالت پر پھر لوٹ آئے جیسا کہ ہم رؤیا میں دیکھ چکے ہیں۔ بعض خوابیں مدت کے بعد پُوری ہوتی ہیں۔ یہ رؤیا چھپ چکا ہے جس میں مَیں نے دیکھا تھا کہ وہ ایک چھوٹا لڑکا ہے ننگا۔ رنگ سیاہ اور بدشکل ہے۔ مَیں نے اس کو اشارہ سے بُلایا۔ تب وہ آیا۔ اور میرے گلے لگا اور پورے قد کا ہوگیا اور اس پر لباس بھی ہے اور رنگ سفید ہے۔ تب مَیں نے کہا کہ آپ کا ہمارا اس قدر مقابلہ رہا ممکن ہے کہ قلم سے یا زبان سے کوئی سخت لفظ نکل گیا ہو تم بخش دو۔ اس نے کہا اچھا مَیں نے بخشا۔ تب مَیں نے کہا کہ تم نے جو ایذا ہم کو دی تھی وہ بھی ہم نے بخش دی۔ تب ہم نے اس کی دعوت کی جس کو اس نے کچھ تردّد کے بعد قبول کیا اور ایک شخص جان کندن میں ہے۔ تب مَیں نے کہا کہ یہ مقدر تھا کہ جس دن

یہ شخص مرے اس دن تم توبہ کرو۔

انبیاء کے ساتھ ہجرت بھی ہے

آج کے الہام مَسِیْرُ الْعَرَب کا ذکر تھا۔ فرمایا :

اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ عرب میں چلنا۔ شاید مقدر ہو کہ ہم عرب جائیں۔ مُدّت ہوئی کہ کوئی پچیس چھبیس سال کا عرصہ گذرا ہے ایک دفعہ مَیں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک شخص میرا نام لکھ رہا ہے تو آدھا نام اُس نے عربی میں لکھا ہے اور آدھا انگریزی میں لکھا ہے۔ انبیاء کے ساتھ ہجرت بھی ہے۔ لیکن بعض رؤیا نبی کے اپنے زمانہ میں پُورے ہوتے ہیں اور بعض اولاد یا کسی متبع کے ذریعہ سے پورے ہوتے ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قیصر و کسریٰ کی کنجیاں ملی تھیں تو وہ ممالک حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوئے۔[1]

۱۲/ستمبر ۱۹۰۵ء

الہام اِنِّیْ مُهِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِهَانَتَكَ

آج کے الہام اِنِّیْ مُهِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِهَانَتَكَ کا ذکر تھا۔ فرمایا :

بڑے بڑے مکفّرین اور ایذا دہندہ جو ہیں اُن کو خدا تعالیٰ ہمارے سامنے ہی اس زمین سے ناکام اُٹھا رہا ہے اور ان کی مُرادوں کے برخلاف دن بدن اس سلسلہ کو ترقی دے رہا ہے۔ ابتداء میں جن لوگوں نے بہت زور شور سے مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اُن میں سے کوئی چودہ پندرہ ایسے یاد ہیں جو ہماری مخالفت کے معاملہ میں ناکام مر چکے ہیں۔ اُن میں سے مولوی غلام دستگیر قصوری تھا جو مکہ سے کفر کا فتویٰ لایا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں۔ لکھوکے کا مولوی محمد اور عبدالحی۔ رشید احمد گنگوہی۔ لدھیانہ کے تین مولوی۔ سید احمد خاں جو کہتا تھا کہ ہماری تحریریں بے فائدہ ہیں۔ محمد عمر۔ مولوی شاہ دین لُدھیانوی۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۳ صفحہ ۲ مورخہ ۷/ستمبر ۱۹۰۵ء
نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۳۲ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰/ستمبر ۱۹۰۵ء

نذیر حسین دہلوی۔ محمد حسین بھینی۔ مولوی محمد اسمٰعیل علیگڈھی۔ رسل بابا امرتسری جس نے جلدی معجزہ دیکھنا ہو اُسے چاہیے کہ دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرے یا تو سخت مخالف بنے یا محبت کا کمال تعلق پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو تیری اہانت کرے گا اس کی مَیں اہانت کروں گا اور جو تیری اعانت کرے گا اس کی مَیں اعانت کروں گا۔ معمولی طور پر مخالفت کرنے والا اور اپنے کاروبار میں چلنے پھرنے والا ماخوذ نہیں ہوتا کیونکہ خدا حلیم اور کریم ہے وہ اس طرح نہیں پکڑتا۔

کذبِ باری تعالیٰ کا مسئلہ

بعض لوگوں کا اعتقاد ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (الاحقاف : ۳۴) اس واسطے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ جھوٹ بولے۔ ایسا اعتقاد بے ادبی میں داخل ہے۔ ہر ایک امر جو خدا تعالےٰ کے وعدہ اس کی ذات جلال اور صفات کے برخلاف ہے وہ اس کی طرف منسوب کرنا بڑا گناہ ہے۔ جو امر اس کی صفات کے برخلاف ہے اُن کی طرف اس کی توجہ ہی نہیں۔

ادریس علیہ السلام کا آسمان پر جانا

صدیق حسن خاں نے ادریسؑ کے آسمان پر جانے کی تکذیب کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر وہ آسمان پر گیا تو اس کی موت کس طرح سے ہوگی کیونکہ سب کا مرنا زمین پر ضروری ہے۔ تعجب ہے کہ مسیح کے معاملہ میں یہ بات اس کو سمجھ نہیں آئی۔ اگر خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو موت نہیں دی اور ویسے ہی آسمان پر اُٹھا لیا ہے تو لفظ رفع کا قرآن شریف میں کافی تھا۔ رفع سے پہلے توفّی کا لفظ لانے کی پھر کوئی ضرورت نہ تھی۔ آسمان پر جانے کا مفہوم تو لفظ رفع سے ہی پوری طرح نکل سکتا تھا۔

غالی اہلِ تشیّع کے ایک عقیدہ کی تردید

بعض اہلِ تشیّع کا عقیدہ ہے کہ امام حسین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے افضل ہیں اور اس پر دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ امام حسین کو شہادت کا درجہ ملا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ملا تھا۔ یہ ایک غلط خیال ہے کیونکہ شہادت صرف امام حسین کو نصیب نہیں ہوئی بلکہ ہزارہا اصحاب کو ہوئی۔ اس میں سب برابر ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے ہاتھ سے قتل نہ کیا جانا ایک بڑا بھاری معجزہ ہے اور قرآن شریف کی صداقت کا ثبوت ہے کیونکہ قرآن شریف کی یہ پیشگوئی ہے کہ وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ

النَّاسِ (المائدۃ : ۶۸) اور پہلی کتابوں میں یہ پیشگوئی درج تھی کہ نبی آخر زمان کسی کے ہاتھ سے قتل نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں فضیلت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ثابت ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی پاک کتاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے افضل قرار دیا۔ امام حسین نے یہ کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ میں سب سے افضل ہوں۔ نہ ان کی کسی تحریر سے اور نہ کسی تقریر سے ایسی بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ تمام امت سے افضل ہیں۔ اور اگر ان کا کوئی ایسا دعویٰ ہوتا تب بھی ماننے کے قابل نہ تھا کیونکہ قرآن شریف کے برخلاف تھا۔ امام حسین کی شہادت سے بڑھ کر حضرت مولوی عبد اللطیف صاحب کی شہادت ہے، جنہوں نے صدق اور وفا کا نہایت اعلیٰ نمونہ دکھایا اور جن کا تعلق شدید بوجہ استقامت سبقت لے گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ لوگوں کے مراتب اور درجات کیا ہیں۔ اسی لئے مجھے الہام کیا ہے۔ اِنِّیْ فَضَّلْتُکَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ۔ اگر سارا زمانہ ایک طرف ہو جاوے اور میں اکیلا ایک طرف رہ جاؤں تب بھی خدا تعالیٰ کے الہام کے بالمقابل کسی کا کہنا مان نہیں سکتا۔ اگر امام حسین کو یہ وحی ہوئی تھی کہ وہ قیامت تک سب سے افضل ہیں تو دوسری وحی اسی خدا نے اس کے برخلاف مجھے کس طرح کر دی۔ اگر یہ وحی شیطانی ہے تو دن رات خدا تعالیٰ کی تائید اور نصرت اس کے ساتھ کیوں ہے۔ عجب خدا ہے جو پچیس تیس سال سے مُفتری کو مُہلت دیتا ہے بلکہ دن بدن اس کے سلسلہ کو ترقی دیتا ہے اور اس کے مخالفوں کو ہلاک کرتا ہے۔ اسی طرح سارے انبیاء کی صداقت پر شُبہ پڑ سکتا ہے۔ افتراء اور کذب تو ایک مکروہ اور غیر طبعی امر ہے۔ انسان کب تک اس کو اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارے دشمن تو ہمیشہ منتظر رہتے ہیں کہ یہ اب مارے گئے اور اب ہلاک ہوئے مگر ہر دفعہ ان کو ندامت اُٹھانی پڑتی ہے ہر طرح سے ایذا دیتے ہیں قتل کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ہمارے قتل کے جواز کے فتوے دیتے ہیں۔ خوُن کے مقدمات بناتے ہیں مگر خدا تعالیٰ ہر امر میں بقول اُن کے کاذب کی طرفداری کرتا ہے۔ ہماری دشمنی کے سبب ان کی شریعت بھی بدل گئی۔ خدا تعالیٰ جو صادق کا معاون ہوا کرتا تھا اب اُن کے نزدیک کاذب کا معاون ہونے لگا۔ یہ عداوت ان کو کشاں کشاں کہاں لے جائے گی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ عناد اُن کو رفتہ رفتہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے حلقہ سے باہر نکال دے گا۔ صادق کے لیے ایک امر مابہ الامتیاز ہوتا ہے اگر وُہ نہیں تو انبیاء کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے۔[1]

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۴ صفحہ ۲ مورخہ ۱۴؍ستمبر ۱۹۰۵ء

نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ صفحہ ۵ مورخہ ۱۷؍ستمبر ۱۹۰۵ء

۱۳؍ ستمبر ۱۹۰۵ء

اس زمانہ کے لوگوں کی حالت

فرمایا:

اگر بعض لوگ خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے دُعا کی تھی تو بارش ہو گئی۔ مگر اُن کی یہ دُعائیں قابلِ قدر نہیں ہیں کیونکہ یہ صرف مصیبت کے وقت کا رونا ہے اور مصیبت کے ذرا ہٹنے کے بعد پھر وہی سخت دلی اُن میں پائی جاتی ہے۔ اس بارش پر بھی خوش نہیں ہونا چاہیے۔ جو بات الہامِ الٰہی سے ہم کو معلوم ہوئی ہے وہ یہی ہے کہ اس زمانہ کے لیے دن خیر کے نہیں ہیں اور یہ سچ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ان بلاؤں کو نازل نہ کرے تو پھر دین کی خیر نہیں۔ تین قسم کے لوگ ہیں۔ خواص۔ اوسط درجہ کے لوگ اور عوام۔ خواص تو دہریہ مذہب بن رہے ہیں۔ ان کو دین کی کچھ پروا نہیں بلکہ دین پر ہنسی ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اوسط درجہ کے لوگ خواص کے تابع ہیں۔ عوام مثل وحشیوں کے ہیں۔ تمام دُنیا کی حالت اس وقت بگڑی ہوئی ہے۔ مقدمہ والے ہیں تو جھوٹے گواہوں کے بنانے میں مصروف ہیں۔ زمیندار ہے تو شریعت کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ ملازم ہے تو اپنی ملازمت کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ تاجر ہے تو اپنی تجارت میں قسما قسم کے دھوکوں میں مصروف ہے۔ جب تک لوگ تقویٰ اختیار نہیں کریں گے خدا تعالیٰ ہرگز اُن پر راضی نہ ہوگا اور نہ یہ بلائیں اُن کے سر سے ٹلیں گی۔[1]

۱۶؍ ستمبر ۱۹۰۵ء

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کے بارہ میں ایک دوست کا خواب

شیخ نور احمد صاحب جالندھر سے اور منشی نبی بخش صاحب کوئٹہ سے حضرتِ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نور احمد صاحب نے اپنا ایک خواب عرض کیا کہ میں نے دیکھا کہ مولوی عبدالکریم صاحب مسجد میں کھڑے ہیں

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۴ صفحہ ۲ مورخہ ۱۴؍ ستمبر ۱۹۰۵ء
نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ صفحہ ۵ مورخہ ۱۷؍ ستمبر ۱۹۰۵ء

اور وعظ کرتے ہیں۔ اور یہ آیت پڑھتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (البقرة : ٦)

فرمایا :

اس سے بظاہر مولوی صاحب کی صحت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

فرمایا : یہ مرض مہلک ہے اور آثارِ مرض بھی خطرناک ہیں، لیکن دُعا بہت کی گئی ہے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جب وہ چاہتا ہے ایک تنکے سے شفا ہو جاتی ہے اور جب وہ نہیں چاہتا لاکھ دوائی بے سُود ہے۔

ہم سب کے واسطے دعا کرتے ہیں

میاں نبی بخش صاحب نے عرض کی کہ ایک ہندو نے مجھے تاکید کی تھی کہ میرے واسطے حضرت سے دُعا کرائیں۔ **فرمایا :**

ہندو یا کسی اَور مذہب کا آدمی جو دُعا کے واسطے درخواست کرے ہم سب کے واسطے دُعا کرتے ہیں۔

ذکر آیا کہ ایک شخص نے اپنے بیٹے کا نام استغفراللہ رکھا ہے۔ **فرمایا :**

اچھا ہے جتنی دفعہ اس کو بُلاتے گا خدا تعالیٰ سے استغفار کرتا رہے گا۔

قریب رہنے والے ہمیشہ نشانات دیکھتے رہتے ہیں

مولوی نورالدین صاحب کے صاحبزادہ عبدالحی کا ذکر تھا کہ اس کے متعلق پہلے سے خبر دی تھی۔ **فرمایا :۔**

اجنبی دشمن اور دُور رہنے والا کیا حاصل کرسکتا ہے جو لوگ قریب رہتے ہیں وہ ہمیشہ نشانات دیکھتے رہتے ہیں۔ پاس رہنے والے تو آپ بیتی کے نشان بھی دیکھ لیتے ہیں۔

اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ

صُبح ایک دوست نے عرض کی کہ میرے گھر سے خبر آئی ہے کہ تمہارا لڑکا سخت بیمار ہے۔ جلد آؤ مگر بیماری کی تفصیل نہیں لکھی حضُور دُعا فرمادیں **فرمایا :**

مَیں دُعا کروں گا لیکن بعض دفعہ عورتیں صرف بُلانے کے واسطے بھی ایسا لکھ دیا کرتی ہیں۔ چنانچہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم اس جگہ قادیان میں تھے کہ میر ناصر نواب صاحب کے گھر سے خط آیا کہ والدہ اسحاق فوت ہو گئی ہیں اور اسحاق بھی قریب المرگ ہے۔ یہ خط اسحاق کے بھائی کا لکھا ہوا تھا جو اس وقت بہت چھوٹی عمر کا تھا۔ مَیں اس خط کو پڑھ کر بہت پریشان ہوا۔ کیونکہ اس وقت ہمارے گھر میں بیمار تھے۔ بخار چڑھا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اُن کو والدہ کی وفات کی خبر سُنانا ہرگز مناسب نہ تھا۔ مَیں اسی فکر میں تھا کہ الہام ہوا اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ جس سے مَیں نے سمجھ لیا کہ یہ صرف بُلانے کا بہانہ ہے، ورنہ دراصل خیر ہے۔ اس وقت مولوی عبدالکریم صاحب اس جگہ تھے اُن کو سنایا گیا۔ اور حافظ حامد علی کو بھی سُنایا گیا اور اسی کو وہاں بھیجا گیا تو بات وہی نکلی جو خدا تعالےٰ نے بذریعہ الہام ہم کو بتلائی تھی۔

شیخ نور احمد صاحب نے عرض کی کہ اس دن مَیں بھی اسی جگہ تھا اور اس واقعہ کا گواہ ہوں۔[1]

قبل دوپہر

بینکوں کا سُود اشاعتِ اسلام کے لیے خرچ کرنا جائز ہے

جب سے حضرت مولنا مولوی عبدالکریم صاحب کی طبیعت ناساز ہوئی ہے اور نیز اکثر احباب رخصت لے کر آئے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا معمول سا ہو گیا ہے کہ قبل دوپہر تشریف لا کر مسجد میں بیٹھتے ہیں اور مناسب موقعہ کلام فرماتے ہیں۔ ۱۴/ستمبر کو شیخ نور احمد صاحب جالندھری چوہدری نصر اللہ خاں صاحب پلیڈر سیالکوٹ سے آئے ہوئے تھے۔ اور بھی کئی احباب بیرون جات سے آئے ہوئے تھے۔ شیخ نور احمد صاحب نے بینک کے سُود کے متعلق تذکرہ کیا کہ بینک والے ضرور سود دیتے ہیں[2] پھر اسے کیا کیا جاوے؟

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۵ صفحہ ۲ مورخہ ۲۲/ستمبر ۱۹۰۵ء
نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ صفحہ ۲ مورخہ ۲۴/ستمبر ۱۹۰۵ء

[2] **حاشیہ** :۔ بدر سے ۔ "اور بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر روپیہ جمع کرنے والا سُود سے فائدہ نہ اُٹھائے تو بینک والوں سے ایسا روپیہ مشنری عیسائی اشاعتِ دینِ عیسوی کے واسطے لے لیتے ہیں۔ بدر جلد ۱ نمبر ۲۶ صفحہ ۴ مورخہ ۲۹/ستمبر ۱۹۰۵ء

اس پر فرمایا :

ہمارا یہی مذہب ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہمارے دل میں ڈالا ہے کہ ایسا روپیہ اشاعتِ دین کے کام میں خرچ کیا جاوے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ سُود حرام ہے لیکن اپنے نفس کے واسطے۔ اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں جو چیز جاتی ہے وہ حرام نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ حُرمت اشیاء کی انسان کے لیے ہے نہ اللہ تعالےٰ کے واسطے۔ پس سُود اپنے نفس کے لیے، بیوی بچوں، احباب، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے لیے بالکل حرام[1] ہے۔ لیکن اگر یہ روپیہ خالصتاً اشاعتِ دین کے لیے خرچ ہو تو حرج نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام بہت کمزور ہوگیا ہے اور پھر اُس پر دُوسری مصیبت یہ ہے کہ لوگ زکوٰۃ بھی نہیں دیتے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اس وقت دو مصیبتیں واقع ہو رہی ہیں اور دو حُرمتیں روا رکھی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ زکوٰۃ جس کے دینے کا حکم تھا وہ دیتے نہیں اور سُود جس کے لینے سے منع کیا تھا وہ لیتے ہیں۔ یعنی جو خدا تعالیٰ کا حق تھا وہ تو دیا نہیں اور جو اپنا حق[2] نہ تھا اُسے لیا گیا۔

جب ایسی حالت ہو رہی ہے اور اسلام خطرناک ضعف میں مُبتلا ہے تو مَیں یہی فتویٰ دیتا ہوں کہ ایسے سُودوں کی رقمیں جو بینک سے ملتا ہے یک مشت اشاعتِ دین میں خرچ کرنی چاہئیں مَیں نے جو فتویٰ دیا ہے وہ عام نہیں ہے ورنہ سُود کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ مگر اس ضعفِ اسلام کے زمانہ میں جبکہ مالی ترقی کے ذریعے پیدا نہیں ہوئے اور مُسلمان توجہ نہیں کرتے ایسا روپیہ اسلام کے کام میں لگنا حرام نہیں ہے۔

قرآن شریف کے مفہوم کے موافق جو حُرمت ہے وُہ یہی ہے کہ وہ اپنے نفس کے لیے اگر خرچ ہو تو حرام ہے۔ یہ بھی یاد رکھو جیسے سُود اپنے لیے دُرست نہیں کسی اور کو اس کا دینا بھی دُرست نہیں — ہاں خدا تعالےٰ کے قبضہ میں ایسے مال کا دینا دُرست ہے اور یہی اس کا طریق ہے کہ وہ صرف اشاعتِ

---

[1] حاشیہ :- سُود کا روپیہ بالکل حرام ہے کہ کوئی شخص اپنے نفس پر خرچ کرے۔ اور کسی قسم کے بھی ذاتی مصارف میں خرچ کرے یا اپنے بال بچے کو دے یا کسی فقیر مسکین کو دے۔ کسی ہمسایہ کو دے یا مسافر کو دے۔ سب حرام ہے۔ سُود کے روپیہ کا لینا اور خرچ کرنا گناہ ہے۔

[2] حاشیہ : اپنا جو حق نہ تھا وہ لیتے ہیں اور خدا تعالےٰ کا جو حق تھا وہ بھی نہیں دیتے اور اپنے اندر دو گناہ ایک ہی وقت میں جمع کرتے ہیں۔

بدر جلد ا نمبر ۲۶ صفحہ ۴ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء

اسلام میں خرچ ہو۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے جہاد ہو رہا ہو اور گولی بارود کسی فاسق فاجر کے ہاں ہو۔ اس وقت محض اس خیال سے رُک جانا کہ یہ گولی بارود مال حرام ہے ٹھیک نہیں۔ بلکہ مناسب یہی ہوگا کہ اس کو خرچ کیا جاوے۔ اس وقت تلوار کا جہاد تو باقی نہیں رہا اور خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں ایسی گورنمنٹ دی ہے جس نے ہر ایک قسم کی مذہبی آزادی عطا کی ہے۔ اب قلم کا جہاد باقی ہے۔ اس لیے اشاعتِ اسلام میں ہم اس کو خرچ کرسکتے ہیں۔

موجودہ مُسلمانوں کی حالت

فرمایا:

مُسلمانوں کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔ ہر ایک قسم کی علمی اور عملی کمزوریاں ان میں آگئی ہیں۔ ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہیں۔ جرائم پیشہ کثرت کے ساتھ مسلمان ہیں جیلخانوں میں جا کر دیکھو جس قدر شدید اور سنگین جرائم ہیں ان کے مرتکب مسلمان نظر آئیں گے۔ اب یہ کس قدر عار کی بات ہے۔

غرباء سے ہمدردی اور حقوق العباد کی ادائیگی کی تلقین

زکوٰۃ کیا ہے؟ تُؤْخَذُ مِنَ الْاُمَرَاءِ وَتُرَدُّ اِلَى الْفُقَرَاءِ۔ امراء سے لے کر فقراء کو دی جاتی ہے۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی ہمدردی سکھائی گئی تھی۔ اس طرح سے باہم گرم سرد ملنے سے مُسلمان سنبھل جاتے ہیں۔ امراء پر یہ فرض ہے کہ وہ ادا کریں۔ اگر نہ بھی فرض ہوتی تو بھی انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ غرباء کی مدد کی جاوے۔ مگر اب مَیں دیکھتا ہوں کہ ہمسایہ اگر فاقہ مرتا ہو تو پروا

---

[1] حاشیہ: بدر میں یہ عبارت درج ہے:۔ "اس کی مثال اس طرح سے ہے کہ گولی بارود کا چلانا کیسا ہی ناجائز اور گناہ ہو لیکن جو شخص اسے ایک جانی دشمن پر مقابلہ کے واسطے نہیں چلاتا وہ قریب ہے کہ خود ہلاک ہو جاتے۔ کیا خدا تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ تین دن کے بھوکے کے واسطے سؤر بھی حرام نہیں بلکہ حلال ہے۔ پس سُود کا مال اگر ہم خدا کے لیے لگائیں تو پھر کیونکر گناہ ہو سکتا ہے۔ اس میں مخلوق کا حِصّہ نہیں لیکن اعلائے کلمۂ اسلام میں اور اسلام کی جان بچانے کے لیے اس کا خرچ کرنا ہم اطمینان اور ثلج قلب سے کہتے ہیں کہ یہ بھی فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ (البقرۃ: ۱۷۴) میں داخل ہے۔ یہ ایک استثناء ہے اسلام کے واسطے ہزاروں حاجتیں ایسی پڑتی ہیں جن میں مال کی ضرورت ہے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۹۔ صفحہ ۴)

نہیں اپنے عیش و آرام سے کام ہے۔ جو بات خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالی ہے میں اس کے بیان کرنے سے نہیں رُک سکتا۔ اگر کسی کا ہمسایہ فاقہ میں ہو تو اس کے لیے شرعاً حج جائز نہیں۔ مقدم ہمدردی اور اس کی خبر گیری ہے کیونکہ حج کے اعمال بعد میں آتے ہیں مگر آجکل عبادات کی اصل غرض اور مقصد کو ہرگز مدّنظر نہیں رکھا جاتا بلکہ عبادات کو رسوم کے رنگ میں ادا کیا جاتا ہے اور وہ نری رسمیں ہی رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں حاجیوں کے متعلق بدظنیاں پیدا ہوئی ہیں۔ کہتے ہیں ایک اندھی عورت بیٹھی تھی۔ کوئی شخص آیا تو اس کی چادر چھین کر لے گیا۔ وہ عورت چلائی کہ بچہ حاجیا! میری چادر دے جا۔ اس نے پُوچھا کہ مائی تُو یہ تو بتا کہ یہ کیونکر تجھے معلوم ہوا کہ مَیں حاجی ہوں۔ اس نے کہا تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے کام حاجی ہی کرتے ہیں پس اگر ایسی ہی حالت ہو تو پھر ایسے حج سے کیا فائدہ؟

حج میں قبولیت ہو کیونکر جبکہ گردن پر بہت سے حقوق العباد ہوتے ہیں۔ ان کو تو ادا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰٮهَا (الشمس: ۱۰) فلاح نہیں ہوتی جب تک نفس کو پاک نہ کرے اور نفس تب ہی پاک ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی عزت اور ادب کرے اور ان راہوں سے بچے جو دُوسرے کے آزار اور دُکھ کا موجب ہوتی ہیں۔ انسان میں ہمدردی اعلیٰ درجہ کا جوہر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (اٰل عمران: ۹۳) یعنی تم ہرگز ہرگز اس نیکی کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی پیاری چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

یہ طریق اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا نہیں کہ مثلاً کسی ہندو کی گائے بیمار ہو جاوے اور وہ کہے کہ اچھا اس کو مُنس (راہِ خدا پر دینا) دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ باسی اور سڑی بُسی روٹیاں جو کسی کام نہیں آسکتی ہیں فقیروں کو دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے خیرات کر دی ہے۔ ایسی باتیں اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں اور نہ ایسی خیرات مقبول ہو سکتی ہے۔ وہ تو صاف طور پر کہتا ہے۔ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ۔ حقیقت میں کوئی نیکی نیکی نہیں ہو سکتی جب تک اپنے پیارے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کے دین کی اشاعت اور اس کی مخلوق کی ہمدردی کے لیے خرچ نہ کرو۔

(اس موقعہ پر ایک بھائی نے عرض کی کہ حضور بعض فقیر بھی کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی باسی روٹی دیدو۔ پھٹا پُرانا کپڑا دے دو۔ وہ مانگتے ہی پُرانا اور باسی ہیں) فرمایا:

کیا تم نئی دے دو گے؟ وہ کیا کریں۔ جانتے ہیں کہ کوئی نئی نہیں دے گا۔ اس لیے وہ ایسا سوال

کرتے ہیں۔ جہاں تک ہوسکے مخلوق کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کرو۔ یاد رکھو۔ شریعت کے دو ہی قسم کے حقوق ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اگر کوئی بدقسمت نہ ہو تو حقوق اللہ پر قائم ہونا سہل ہے اس لیے کہ وہ تم سے کھانے کو نہیں مانگتا اور کسی قسم کی ضرورت اسے نہیں وُہ تو صرف یہی چاہتا ہے کہ تم اسے وحدہٗ لاشریک خدا سمجھو۔ اس کی صفات کاملہ پر ایمان لاؤ اور اس کے مُرسلوں پر ایمان لاکر ان کی اتباع کرو، لیکن حقوق العباد میں آکر مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں نفس دھوکہ دیتا ہے ۔ ایک بھائی کا حق ہے اور اس کے دبا لینے کا فتویٰ دیتا ہے۔ مقدمات ہوتے ہیں تو چاہتا ہے کہ شریک کو ایک حبّہ نہ ملے سب کچھ مجھ ہی کو مل جاوے۔ غرض حقوق العباد میں بہت مشکلات ہیں۔ اس لیے جہاں تک ہوسکے اس کی بڑی رعایت اور حفاظت کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آدمی دُوسرے کے حقوق تلف کرنے والا ٹھہرے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل اور توفیق سے ملتا ہے جس کے لیے دُعا کی بڑی ضرورت ہے۔

جاپانیوں کے لیے ایک جامع کتاب کی ضرورت ہے

یہاں تک آپ نے بیان فرمایا تھا کہ اور احباب تشریف لے آئے۔ حضرت حکیم الامت بھی آگئے۔ اس لیے سلسلہ کلام بند کردیا اور پھر آپ نے مکرراً مسئلہ سُود بینک کے متعلق فرمایا جو میں اُوپر درج کر آیا ہوں۔ زاں بعد جاپان اور اشاعتِ اسلام کے مضمون پر سلسلہ کلام شروع ہوگیا جس کا مفہوم درج ذیل ہے۔

(ایڈیٹر الحکم)

مجھے معلوم ہوا ہے کہ جاپانیوں کو اسلام کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی ایسی جامع کتاب ہو جس میں اسلام کی حقیقت پورے طور پر درج کردی جاوے گویا اسلام کی پوری تصویر ہو جس طرح پر انسان سراپا بیان کرتا ہے اور سر سے لے کر پاؤں تک کی تصویر کھینچ دیتا ہے[1]۔ اسی طرح سے اس کتاب

---

[1] حاشیہ :- بدر سے :- اسلام کا پورا نقشہ کھینچا جاوے کہ اسلام کیا ہے۔ صرف بعض مضامین مثلاً تعدّد ازدواج وغیرہ پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنا ایسا ہے۔ جیسا کہ کسی کو سارا بدن نہ دکھایا جاتے اور صرف ایک اُنگلی دکھا دی جاوے۔ یہ مفید نہیں ہوسکتا۔ پوری طرح دکھانا چاہیے کہ اسلام میں کیا کیا خوُبیاں ہیں اور پھر ساتھ ہی دیگر مذاہب کا حال بھی لکھ دینا چاہیے۔ وہ لوگ بالکل بے خبر ہیں کہ اسلام کیا شئے ہے۔ تمام اصول فروع اور اخلاقی حالات کا ذکر کرنا چاہیے۔ اس کے واسطے ایک مستقل کتاب لکھنی چاہیئے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں اسلام کی خوبیاں دکھائی جاویں۔ اس کی تعلیم کے سارے پہلوؤں پر بحث ہو اور اس کے ثمرات اور نتائج بھی دکھاتے جاویں۔ اخلاقی حصہ الگ ہو اور ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جاوے۔

فرمایا :

یہ قلم کے جہاد کا زمانہ ہے

میرے نزدیک تو یہ ضرورت ایسی ضرورت ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہے۔ اُسے بھی چاہیے کہ وہ اپنا روپیہ اس دینی جہاد میں صرف کردے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچوں نمازیں اکٹھی پڑھنی پڑی تھیں۔ لیکن اب چونکہ تلوار کا جہاد نہیں بلکہ صرف قلم کا جہاد رہ گیا ہے۔

اس لیے اسی ذریعہ سے اس میں ہمت، وقت اور مال کو خرچ کرنا چاہیے۔ خوب سمجھ لو کہ اب مذہبی لڑائیوں کا زمانہ نہیں۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جو لڑائیاں ہوئی تھیں اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ جبراً مسلمان بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ لڑائیاں بھی دفاع کے طور پر تھیں۔ جب مسلمانوں کو سخت دُکھ دیا گیا اور مکہ سے نکال دیا گیا اور بہت سے مسلمان شہید ہو چکے تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اسی رنگ میں ان کا مقابلہ کرو۔ پس وہ حفاظت خود اختیاری کے رنگ میں لڑائیاں کرنی پڑیں مگر اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ ہر طرح سے امن اور آزادی ہے۔ ہاں اسلام پر جو حملے ہوتے ہیں وہ قلم کے ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قلم ہی کے ذریعہ ان کا جواب دیا جاوے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ایک مقام پر فرماتا ہے کہ جس قسم کی تیاریاں تمہارے مخالف کرتے ہیں تم بھی ویسی ہی تیاریاں کرو۔ اب کفار کی تیاریاں جو اسلام کے خلاف ہو رہی ہیں اُن کو دیکھو وہ کس قسم کی ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ فوجیں جمع کرتے ہوں۔ نہیں بلکہ وہ تو طرح طرح کی کتابیں اور رسالے شائع کرتے ہیں[لہ]۔ اس لیے ہمارا بھی فرض ہے

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ :۔ جس کو پڑھ کر وہ لوگ دُوسری کتاب کے محتاج نہ رہیں ؀

بدر جلد ۱ نمبر ۲۶ صفحہ ۴ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء

[لہ] حاشیہ :۔ بدر میں ہے : "پادری لوگ طرح طرح کے مکر و فریب کے ساتھ اسلام کے برخلاف کتابیں شائع کرتے ہیں اور غلط باتیں افترا پردازی سے لکھتے ہیں جب تک ان خبیث باتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ہونا ثابت نہ کیا جاتے اسلام کی اشاعت کس طرح ہو سکتی ہے۔ پس ہم اس بات سے شرم نہیں کرتے کوئی قبول کرے یا نہ

کہ ہم بھی ان کے جواب میں قلم اٹھائیں اور رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ انکے حملوں کو رد کریں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ بیماری کچھ ہو اور علاج کچھ اور کیا جاوے۔ اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ ہمیشہ غیر مفید اور بُرا ہوگا۔

یقیناً یاد رکھو کہ اگر ہزاروں جانیں بھی ضائع کر دی جائیں اور اسلام کے خلاف کتابوں کا ذخیرہ بدستور موجود ہو تو اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اصل یہی بات ہے کہ ان کتابوں کے اعتراضوں کا جواب دیا جاوے۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پاک کیا جاوے۔ مخالفوں کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ۔کرے۔ میرا مذہب جس پر خدا تعالیٰ نے مجھے قائم کیا ہے اور جو قرآن شریف کا مفہوم ہے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس، عیال، اطفال، دوست، عزیز کے واسطے اس سُود کو مباح نہیں کر سکتے بلکہ یہ پلید ہے اور اس کا گناہ[※] حرام ہے۔ لیکن اس ضعف اسلام کے زمانہ میں جبکہ دین مالی امداد کا سخت محتاج ہے۔ اسلام کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ جیساکہ ہم نے مثال کے طور پر بیان کیا ہے کہ جاپانیوں کے واسطے ایک کتاب لکھی جاوے۔ اور کسی فصیح بلیغ جاپانی کو ایک ہزار روپیہ دے کر ترجمہ کرایا جائے اور پھر اس کا دس ہزار نسخہ چھاپ کر جاپان میں شائع کر دیا جاوے۔ ایسے موقعہ پر سُود کا روپیہ لگانا جائز ہے، کیونکہ ہر ایک مال خدا کا ہے اور اس طرح پر وہ خُدا کے ہاتھ میں جائے گا مگر بایں ہمہ اضطرار کی حالت میں ایسا ہوگا اور بغیر اضطرار یہ بھی جائز نہیں۔

ایک دوست نے عرض کی کہ اگر اس طرح سے ایک خاص امر کے واسطے سُود کے روپے کمانے کی اجازت دی گئی ہو تو لوگوں میں اس کا رواج وسیع ہو کر عام قباحتیں پیدا ہو جائیں گی۔ فرمایا کہ: بیجا عذر تراشنے کے واسطے تو بڑے حیلے ہیں۔ بعض شریر لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ (النساء: ۴۴) کے یہ معنے کر دیتے ہیں کہ نماز نہ پڑھو۔ ہمارا منشاء صرف یہ ہے کہ اضطراری حالت میں جب خنزیر کھانے کی اجازت نفسانی ضرورتوں کے واسطے جائز ہے تو اسلام کی ہمدردی کے واسطے اگر انسان دین کو ہلاکت سے بچانے کے واسطے سُود کے روپے کو خرچ کرے تو کیا قباحت ہے۔ یہ اجازت مختص المقام اور مختص الزمان ہے۔ یہ نہیں کہ ہمیشہ کے واسطے اس پر عمل کیا جائے جب اسلام کی نازک حالت نہ رہے تو پھر اس ضرورت کے واسطے بھی سُود لینا ویسا ہی حرام ہے کیونکہ دراصل سود کا عام حکم تو حُرمت ہی ہے۔ بدر جلد ۱ نمبر ۲۶ صفحہ ۴ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء

[※] سہو کاتب ہے فقرہ یوں چاہیے (اُس کا استعمال حرام ہے۔" مرتب)۔

طرف سے جو کارروائی ہو رہی ہے اس کا انسداد بجز قلم کے نہیں ہو سکتا۔ یہ نری خام خیالی اور بیہودگی ہے جو مخالف تو اعتراض کریں اور اس کا جواب تلوار سے ہو۔ خدا تعالیٰ نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی جو مسیح موعود کے وقت میں اس قسم کے جہاد کو حرام کر دیا۔ اس ملک میں تو عیسائیوں کی ایسی تحریریں شائع ہوتی ہی رہتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ فتنہ اسی مُلک میں ہے مگر معلوم ہوا ہے کہ دُوسرے ملکوں میں بھی اس قسم کی شرارتیں ہو رہی ہیں۔ مصر اور بلادِ شام بیروت وغیرہ میں بھی ایسی تحریریں شائع کی جاتی ہیں یہانتک کہ لغت تک کی کتابوں میں شرارتیں کی جاتی ہیں۔

اس مقام پر حضرت حکیم الامت نے عرض کیا کہ حضور فقہ اللغۃ ثعلبی کی ایک کتاب ہے۔ اُسے عیسائیوں نے چھاپا ہے۔ اس میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی اَہْلِہٖ لکھ دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہی نکال دیا ہے۔ یہانتک دشمنی مدنظر ہے۔

پھر جاپان میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ پر فرمایا :

مَیں دوسری کتابوں پر جو لوگ اسلام پر لکھ کر پیش کریں بھروسہ نہیں کرتا۔ کیونکہ ان میں خود غلطیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ان غلطیوں کو ساتھ رکھ کر اسلام کے مسائل جاپان یا دوسری قوموں کے سامنے پیش کرنا اسلام پر ہنسی کرانا ہے۔ اسلام وہی ہے جو ہم پیش کرتے ہیں۔ ہاں اشاعتِ اسلام کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس پر اگر وہ روپیہ جو بینکوں کے سُود سے آتا ہے خرچ کیا جاوے تو جائز ہے کیونکہ وہ خالص خدا کے لیے ہے۔ خُدا تعالیٰ کے لیے وہ حرام نہیں ہے۔ جیسے مَیں نے ابھی کہا ہے کہ کسی جگہ کا سکہ وباردود ہو وہ جہاد میں خرچ کرنا جائز ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ بلا تکلف سمجھ میں آجاتی ہیں کیونکہ بالکل صاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سؤر کو حرام کیا ہے لیکن بایں ہمہ فرماتا ہے۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (البقرۃ : ۱۷۴) جب اضطراری حالت میں محض اپنی جان بچانے کی خاطر سؤر کا کھانا جائز ہے تو کیا ایسی حالت میں کہ اسلام کی حالت بہت ضعیف ہو گئی ہے اور اس کی جان پر آبنی ہے۔ اس کی جان بچانے کے لیے محض اعلائے کلمۂ اسلام کے لیے سُود کا روپیہ خرچ نہیں ہو سکتا؟ میرے نزدیک یقیناً خرچ ہو سکتا ہے اور خرچ کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا ظاہر کرنا مقصودِ خاطر ہو فرمایا :

دُنیا تو ایسی ہے کہ ؎
کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد

اللہ تعالیٰ کا یہ ایک سربستہ راز ہے جو کسی پر نہیں کھُلا کہ موت کس وقت آجاوے۔ پھر جب موت آگئی تو سب مال و اسباب یہاں کا یہاں ہی رہ جاتا ہے اور بعض اوقات اُس کے وارث وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اگر مرنے والا زندہ ہوتا تو ایک حبّہ بھی ان کو دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر کیسی غلطی ہے کہ انسان اپنے مال کو ایسی جگہ خرچ نہ کرے جو اس کے لیے ہمیشہ کے واسطے راحت اور آسائش کا موجب ہو جاوے۔ مَیں حیران ہوتا ہوں جب یورپ کی طرف دیکھتا ہوں کہ ایک عاجز انسان کو خدا بنانے کے لیے ان میں اس قدر جوش اور سرگرمی ہے اور ہم میں خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے ظاہر کرنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔ یہ کس قدر بدقسمتی ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقدم کریں۔ اگر اُسے خوش کریں تو سب کچھ مل سکتا ہے۔ مگر ان کی یہی تو بدقسمتی ہے کہ وہ اس کو ناراض کر رہے ہیں۔ مجھے بہت ہی افسوس ہوتا ہے جب مَیں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے ایک سچا دین اسلام عطا کیا تھا مگر انہوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ خدا جانے یہ بے پروائی کیا نتیجہ پیدا کرے۔ دین کی کچھ بھی پروا اور غیرت نہیں۔ باہم اگر جنگ جدل ہے تو اس میں شیخی۔ ریا۔ عُجب مقصود ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا جلال اور اس کی عظمت لیکن جو شخص ہر امر میں اللہ تعالیٰ کو مقدم کرے اور اس کے دین کی حمیت اور غیرت میں ایسا محو ہو کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا ظاہر کرنا اس کا مقصود خاطر ہو۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے دفتر میں صدیق کہلاتا ہے۔

ہم جس طریق پر اسلام کو پیش کر سکتے ہیں دُوسرا نہیں کر سکتا۔ مگر مشکلات یہ ہیں کہ ہماری جماعت کا بہت بڑا حصہ غربا کا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ باوجودیکہ یہ غربا کی جماعت ہے تاہم مَیں دیکھتا ہوں کہ ان میں صدق ہے اور ہمدردی ہے اور وہ اسلام کی ضروریات سمجھ کر حتی المقدور اس کے لیے خرچ کرنے سے فرق نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ساتھ ہو تو کام بنتا ہے اور ہم اس کے فضل کے امیدوار ہیں۔

اللہ تعالیٰ اسلام کو تمام حملوں سے بچائے گا

جس طرح پر ایک طُوفان قریب آتا ہو تو انسان کو فکر ہوتا ہے کہ یہ طُوفان تباہ کر دے گا اسی طرح پر اسلام پر طوفان آرہے ہیں۔ مخالف ہر وقت ان کوششوں میں لگے ہوتے ہیں کہ اسلام تباہ ہو جاوے لیکن مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو ان تمام حملوں سے بچائے گا اور وہ اس طوفان میں بھی اس کا بیڑا سلامتی سے کنارہ پر پہنچا دے گا۔

راتوں کی دعائیں ہی مشکلات کو ختم کریں گی

انبیاء علیہم السلام کے حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کو مشکلات نظر آتی تھیں تو بجز اس کے اور کوئی صورت نہ ہوتی تھی کہ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں کرتے تھے۔ قوم تو "صُمٌّ بُکْمٌ" ہوتی ہے۔ وُہ ان کی باتیں سنتی نہیں بلکہ تنگ کرتی اور دُکھ دیتی ہے۔ اس وقت راتوں کی دُعائیں ہی کام کیا کرتی تھیں۔ اب بھی یہی صورت ہے۔ باوجود یکہ اسلام ضعف کی حالت میں ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی بحالی کے لیے پوری کوشش کی جاوے لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ ہم جب سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر طرح سے ہماری مخالفت کے لیے سعی کی جاتی ہے۔ یہ میری مخالفت نہیں خدا تعالےٰ سے جنگ ہے۔ مَیں تو یہاں تک یقین رکھتا ہوں کہ اگر میری طرف سے کوئی کتاب اسلام پر جاپان میں شائع ہو تو یہ لوگ میری مخالفت کے لیے جاپان بھی جا پہنچیں۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو خدا تعالیٰ چاہتا ہے۔

وُہ شخص بڑا ہی مبارک اور خوش قسمت ہے جس کا دل پاک ہو اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے اظہار کا خواہاں ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو دوسروں پر مقدم کر لیتا ہے۔ جو لوگ میری مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا اور ہمارا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے ہے۔ وہ ہمارے اور ان کے دلوں کو خوب جانتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کس کا دل دُنیا کے نمود اور نمائش کے لیے ہے اور کون ہے جو خدا تعالیٰ ہی کے لیے اپنے دل میں سوز و گداز رکھتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کا باعث آپؐ کے دل کی طہارت تھی

یہ خوب یاد رکھو کہ کبھی رُوحانیت صعود نہیں کرتی جبتک دل پاک نہ ہو۔ جب دل میں پاکیزگی اور طہارت پیدا ہوتی ہے تو اس میں ترقی کے لیے ایک خاص طاقت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے ہر قسم کے سامان مہیا ہو جاتے ہیں اور وہ ترقی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھو کہ بالکل اکیلے تھے اور اس بیکسی کی حالت میں دعویٰ کرتے ہیں یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ (الاعراف : ۱۵۹) کون اس وقت خیال کر سکتا تھا کہ یہ دعوےٰ ایسے بے یار و مددگار شخص کا بار آور ہوگا۔ پھر ساتھ ہی اس قدر مشکلات آپ کو پیش آئے کہ ہمیں ان کا ہزارواں حصّہ بھی نہیں آئے۔ وہ زمانہ تو ایسا زمانہ تھا کہ سکھا شاہی سے بھی بدتر تھا۔ اب تو گورنمنٹ کی طرف سے پورا امن اور آزادی ہے۔ اس وقت ایک چالاک آدمی ہر قسم کی منصوبہ بازی سے جو کچھ بھی چاہتا دُکھ پہنچاتا۔ مگر مکّہ جیسی جگہ میں اور

پھر عربوں جیسی وحشیانہ زندگی رکھنے والی قوم میں آپؐ نے وہ ترقی کی جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

مخالفوں میں سے ہی خدا کی مرضی پوری کرنے والے پاک دل نکلیں گے

اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ خود ان کی مذہبی تعلیم اور عقاید کے خلاف انہیں سُنایا کہ یہ لات اور عزّیٰ جن کو تم اپنا معبود قرار دیتے ہو یہ سب پلید اور حطبِ جہنّم ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کون سی بات عربوں کی ضدی قوم کو جوش دلانے والی ہو سکتی تھی۔ لیکن انہیں عربوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے نشوونما پایا اور ترقی کی۔ انہیں میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے بھی نکل آئے۔ اس سے ہمیں امید ہوتی ہے کہ انہیں مخالفوں سے وہ لوگ بھی نکلیں گے جو خدا تعالیٰ کی مرضی پُورا کرنے والے اور پاک دل ہوں گے اور یہ جماعت جو اس وقت تک تیار ہوئی ہے آخر انہیں میں سے آئی ہے۔

کئی دفعہ میر صاحب[1] نے ذکر کیا کہ دِلّی سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے مگر میرے دل میں یہی آتا ہے کہ یہ بات دُرست نہیں۔ دِلّی میں بھی بعض پاک دل ضرور چھُپے ہوئے ہوں گے۔ جو آخر اس طرف آئیں گے اللہ تعالیٰ نے جو ہمارا تعلق دلّی سے کیا ہے یہ بھی خالی از حکمت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہم کبھی نا امید نہیں ہو سکتے۔ آخر خود میر صاحب بھی دِلّی ہی کے ہیں[2]۔ غرض یہ کوئی نا امید کرنے والی بات نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا پاک اور کامل نمونہ ہمارے سامنے ہے کہ مکّہ والوں نے کیسی مخالفت کی اور پھر اسی مکّہ میں سے وہ لوگ نِکلے جو دُنیا کی اصلاح کرنے والے ٹھہرے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں میں سے تھے۔ وُہ ابوبکر رضی اللہ عنہ جن کی بابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ابوبکر کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس بات سے ہے جو اس کے دل میں ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں مکّہ والوں میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ بڑے بھاری مخالف تھے یہانتک کہ ایک مرتبہ مشورہ قتل میں بھی شریک اور قتل کے لیے مقرر ہوتے لیکن آخر خدا تعالیٰ نے ان کو وہ جوش اظہارِ اسلام کا دیا کہ غیر قومیں بھی ان کی تعریفیں کرتی ہیں اور ان کا نام عزّت سے

---

[1] میر ناصر نواب صاحب رضی اللہ عنہ مراد ہیں ۔ (مرتب)

[2] حضرت حکیم الامت مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا منشی عبدالعزیز صاحب بابو محمد اسمٰعیل صاحب وغیرہ بھی دہلوی ہی ہیں۔

لیتی ہیں۔

غرض ہم کو وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے۔ باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے جب تک پورے کامیاب نہیں ہو گئے۔ اور آپؐ نے
اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (النصر: ۲، ۳)
کا نظارہ دیکھ نہیں لیا۔

آج ہمارے مخالف بھی ہر طرح کی کوشش ہمارے نابود کرنے کی کرتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے اور انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ جس قدر مخالفت اس سلسلہ کی انہوں نے کی ہے اسی قدر ناکامی اور نامرادی ان کے شامل حال رہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو بڑھایا ہے۔ یہ تو خیال کرتے اور رائے لگاتے ہیں کہ یہ شخص مر جاوے گا اور جماعت متفرق ہو جاوے گی۔ یہ فرقہ بھی دوسرے فرقہ برہموؤں وغیرہ کی طرح ہے کہ جن میں کوئی کشش نہیں ہے اس لیے اس کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو جاوے گا مگر وہ نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ نے خود ارادہ فرمایا ہے کہ اس سلسلہ کو قائم کرے اور اُسے ترقی دے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرقے نہ تھے۔ اس وقت ان کے مخالف بھی یہی سمجھتے ہوں گے کہ بس اب ان کا خاتمہ ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اُن کو کیسا نشوونما دیا اور پھیلایا۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ اگر کوئی فرقہ تھوڑی سی ترقی کر کے رُک جاتا ہے تو کیا ایسے فرقوں کی نظیر موجود نہیں جو عالم پر محیط ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ارادوں پر نظر کر کے حکم کرنا چاہیے۔ جو لوگ رہ گئے اور اُن کی ترقی رُک گئی ان کی نسبت ہم یہی کہیں گے کہ وہ اس کی نظر میں مقبول نہ تھے۔ وہ اس کی نہیں بلکہ اپنی پرستش چاہتے تھے مگر میں ایسے لوگوں کو نظیر میں پیش کرتا ہوں جو اپنے وجود سے جل جاویں اور اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت اور جلال کے خواہشمند ہوں۔ اس کی راہ میں ہر دکھ اور موت کے اختیار کرنے کو آمادہ ہوں۔ پھر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تباہ کر دے؟ کون ہے جو اپنے گھر کو خود تباہ کر دے؟ اُن کا سلسلہ خدا تعالیٰ کا سلسلہ ہوتا ہے اس لیے وہ خود اسے ترقی دیتا ہے اور اس کے نشوونما کا باعث ٹھہرتا ہے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دُنیا میں ہوتے ہیں۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان میں سے کون تباہ ہوا؟ ایک بھی نہیں۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجموعی طور پر دیکھو کیونکہ آپ جامع کمالات تھے ساری قوم آپؐ کی دشمن ہو گئی اور اس نے قتل کے منصوبے کئے۔ مگر آپؐ کی اللہ تعالیٰ نے وہ تائید کی جس کی نظیر دُنیا میں نہیں ملتی۔

ایک دفعہ اوائل دعوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری قوم کو بُلایا۔ ابوجہل وغیرہ سب ان میں شامل تھے[1]۔ اہل مجمع نے سمجھا تھا کہ یہ مجمع بھی کسی دنیوی مشورہ کے لیے ہوگا۔ لیکن جب ان کو اللہ تعالیٰ کے آنے والے عذاب سے ڈرایا گیا تو ابوجہل[2] بول اُٹھا تَبًّا لَّكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا ۔

غرض باوجود اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ صادق اور امین سمجھتے تھے مگر اس موقعہ پر انہوں نے خطرناک مخالفت کی اور ایک آگ مخالفت کی بھڑک اٹھی، لیکن آخر آپ کامیاب ہو گئے اور آپؐ کے مخالف سب نیست و نابود ہو گئے۔

ترقی کرنے کے گُر

فرمایا :

لوگ چاہتے ہیں کہ ترقی ہو مگر وہ نہیں جانتے کہ ترقی کس طرح ہوا کرتی ہے۔ دُنیاداروں نے تو یہی سمجھ لیا ہے کہ یورپ کی تقلید سے ترقی ہوگی۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ ترقی ہمیشہ راستبازی سے ہوا کرتی ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نمونہ رکھا ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کا نمونہ دیکھو۔ ترقی اسی طرح ہوگی جیسے پہلے ہوئی تھی۔ اور یہ بالکل سچّی بات ہے کہ پہلے جو ترقی ہوئی وہ صلاح اور تقویٰ اور راستبازی سے ہوئی تھی۔ وہ اللہ تعالےٰ کی رضا کے جویا ہوتے اور اس کے احکام کے تابع ہوتے۔ اب بھی جب ترقی ہوگی۔ اسی طرح ہوگی۔

سید احمد خاں قومی قومی کہتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ایک بیٹے کی بھی اصلاح نہ کر سکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعویٰ کرنا اور چیز ہے اور اس دعویٰ کی صداقت کو دکھانا اَور بات۔ اصل یہی ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں سکھایا ہے۔ جبتک مُسلمان قرآن شریف کے پُورے متّبع اور پابند نہیں ہوتے وہ کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتے۔ جس قدر وہ قرآن شریف سے دُور جا رہے ہیں اسی قدر وہ ترقی کے مدارج اور راہوں سے دُور جا رہے ہیں۔ قرآن شریف پر عمل ہی ترقی اور ہدایت کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجارت، زراعت اور ذرائع معاش سے جو حلال ہوں، منع نہیں کیا۔ مگر ہاں اس کو مقصود بالذات قرار نہ دیا جاوے بلکہ اس کو بطور خادمِ دین رکھنا چاہیے۔ زکوٰۃ سے بھی یہی منشا ہے کہ وہ مال خادمِ دین ہو۔

---

[1] یہاں حضرت اقدس نے سارا واقعہ بیان فرمایا۔ (ایڈیٹر)

[2] ابولہب نے یہ بات کہی تھی۔ ڈائری نویس یا کاتب کی غلطی سے ابوجہل لکھا گیا ہے ۔ (مرتب)

قومی ترقی کا راز

خوب یاد رکھو کہ اصل طریق ترقی کا یہی ہے۔ جبتک قوم اللہ تعالیٰ کے لیے قدم نہیں اُٹھاتی اور اپنے دلوں کو پاک وصاف نہیں کرتی کبھی ممکن نہیں کہ یہ قوم ترقی کر سکے۔ یہ خیال محض غلط ہے کہ صرف انگریزی پڑھنے اور انگریزی لباس پہننے اور شراب پینے اور فسق و فجور میں مبتلا ہونے سے ترقی ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہلاک کرنے کی راہ ہے۔ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جو قوم رہتی تھی کیا وہ معاش اور آسائش کے سامان نہ رکھتے تھے؟ کیا وہ انگریزی ہی پڑھے ہوئے تھے؟ اسی طرح لُوط علیہ السلام کے زمانہ میں بھی معاش کے ذریعے تھے۔ اسی طرح اس زمانہ میں بھی معاش کے بعض ذریعے ہیں جن میں سے ایک یہ زبان بھی ہے جو معاش کا ذریعہ سمجھی گئی ہے لیکن وہ زبان جو خدا تعالیٰ کی زبان ہے۔ اُسے اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کی کنجی بنایا ہے۔ جب انسان تعصب سے پاک ہو کر تدبر سے قرآن شریف کو دیکھے گا اور اعراض صوری اور معنوی سے باز رہے گا بلکہ دعاؤں میں لگا رہے گا۔ تب ترقی ہوگی۔

یہ لوگ جو قومی ترقی قومی ترقی کا شور مچا رہے ہیں۔ میں ان کی آوازوں کو سُنکر حیران ہوا کرتا ہوں کہ شاید ان کو مرنا ہی بھُولا ہوا ہے اور ناپائیدار زندگی کو انہوں نے مقدّم کر لیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ یورپ جیسے امیر کبیر بن جاویں۔ ہم منع نہیں کرتے کہ حدِ مناسب تک کوئی کوشش نہ کرے۔ مگر افراط تو مذموم امر ہے۔ افسوس ان ترقی چاہنے والوں کے نزدیک عملی طور پر ہر ایک بدی حلال ہے یہاں تک کہ زنا بھی۔ جیسا کہ یورپ کا عملی طرز بتا رہا ہے۔ اگر یہی ترقی ہے تو پھر ہلاکت کیا ہوگی؟ پس تم اپنی نیتوں کو صاف کرو۔ اللہ تعالےٰ کو رضامند کرو۔ دعاؤں میں لگے رہو اور دین کی اشاعت کے لیے دُعا کرو۔ پھر منع نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس قسم کی استعداد اور مناسبت معاش کے لیے دی ہے اس سے کام لو۔ زراعت ہو یا ملازمت یا تجارت کرو مگر یہ نہیں کہ اس کو مقصود بالذات سمجھ کر دل اس سے لگا لو۔ بلکہ دل اس سے ہمیشہ اداس رکھو اور اسے ایک ابتلا سمجھو اور دُعا کرتے رہو کہ خدا تعالیٰ وہ زمانہ لا دے کہ فراغت کا زمانہ یادِ الٰہی کے لیے میسّر آدے۔ میری غرض اور تعلیم تو یہ ہے۔ جو اس پر مخالفت کرے اس کا اختیار ہے ہنسی کرے اختیار ہے مگر حق یہی ہے۔

جو لوگ آزاد مشرب ہیں وہ ایسی باتوں پر سخت ہنسی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اطفال کے درجہ پر ہیں اور ہمیں تیرہ سو برس پیچھے لے جاتے ہیں مگر جن میں تقویٰ ہو اور موت کو یاد رکھتے ہیں وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں میں سے حق پر کون ہے؟

مَیں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ جب تک صحت ہے اس وقت تک یہ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں لیکن

جب ذرا مبتلا ہوتے ہیں تو ہوش میں آجاتے ہیں۔ نیچری مذہب کے لیے اسی قدر مستحکم ہوگا جس قدر دُنیوی آسائش و آرام میسر ہوگا۔ جس قدر مصائب ہوں گے ڈھیلا ہوتا جائے گا۔ جو شخص دنیوی وجاہت اور عُہدہ پاتا ہے اور قوم میں ایک عزت دیکھتا ہے وہ کیا سمجھ سکتا ہے کہ دین کیا چیز ہے۔؟

جو گروہ نمازوں میں تخفیف کرنی چاہتا ہے اور روزوں کو اڑانا چاہتا ہے اور قرآن شریف کی ترمیم کرنے کا خواہشمند ہے۔ اگر اُسے ترقی ہو تو تم سمجھ لو کہ انجام کیا ہو۔

اس کے ضمن میں آپ نے نواب محمد حیات خاں مرحوم کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح پر قبل از وقت مجھے اس کی بحالی کی اطلاع دی جس کی میں نے اس کو بھی خبر دیدی تھی۔ لیکن جب بحال ہوگیا تو پھر وہ ساری باتیں جو معطلی کے زمانہ میں تھیں بھول گئیں۔[1]

۱۷؍ستمبر ۱۹۰۵ء

حقِ محنت کی ادائیگی

فرمایا :

خدا تعالیٰ کی طلب میں جو شخص پوری کوشش نہیں کرتا وہ بھی کافر ہے۔ ہر ایک چیز کو جب اس کی حدِ مقررہ تک پہنچایا جاتا ہے تب اس سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسے اس زمین میں چالیس ۴۰ یا پچاس ہاتھ کھودنے سے کنواں تیار ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف چار پانچ ہاتھ کھود کر چھوڑ دے اور کہہ دے کہ یہاں پانی نہیں ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس شخص نے حقِ محنت کا ادا نہیں کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت

(قبل از ظہر)

فرمایا : یہ جو قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے فَبِهُدٰىهُمُ

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ صفحہ ۹ تا ۱۱ مورخہ ۲۴؍ستمبر ۱۹۰۵ء

اِقْتَدِهْ (الانعام : ۹۱) پس ان کی یعنی گذشتہ نبیوں کی جن کا اُوپر ذکر آیا ہے اقتدا کر۔ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس قدر گذشتہ انبیاء ہوئے انہوں نے مخلوق کی ہدایت مختلف پہلوؤں سے کی اور مختلف قسم کی ان میں خوبیاں تھیں کسی میں کوئی خوبی اور کمال تھا اور کسی میں کوئی۔ اور ان تمام نبیوں کی اقتداء کرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ ان تمام متفرق خوبیوں کو اپنے اندر جمع کر لینا چاہیے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو شخص جامع ان تمام خوبیوں کا ہے جو متفرق طور پر تمام انبیاء میں پائی جاتی ہیں وہ تمام متفرق کمالات اپنے اندر جمع رکھتا ہے اس لیے وہ تمام انبیاء سے افضل ہے کیونکہ ہر ایک کی خوبی اس میں موجود ہے۔ اور وہ تمام متفرق خوبیوں کا جامع ہے۔ مگر پہلے اس سے کوئی نبی ان تمام خوبیوں کا جامع نہ تھا۔[1]

۲۰؍ستمبر ۱۹۰۵ء

(بوقت صبح)

انجام بخیر ہے فرمایا :

طب کے ظنی امور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پاس جو یقین ہوتا ہے وہ کہاں ؟
پیشگوئیوں کا معاملہ مخفی رکھا جاتا ہے تاکہ تکالیف کا ثواب انسان حاصل کرے۔ درمیانی دُکھ ہیں اور انجام بخیر ہے۔

حضرت مفتی محمد صادق صاحب کی ایک رؤیاء اور اس کی تعبیر

عاجز[2] راقم نے اپنی رؤیاء بیان کی کہ " میں رات مولوی عبدالکریم صاحب کے واسطے بہت دُعا کرتا تھا تو تھوڑی غنودگی میں ایسا معلوم ہوا کہ میں کہتا ہوں یا کوئی کہتا ہے

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۵ صفحہ ۲ مورخہ ۲۲؍ستمبر ۱۹۰۵ء

[2] حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ (مرتب)

"بلاؤں میں چندرے مارے گئے۔" فرمایا :

"مبشر ہے"

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب کی ایک رؤیا۔ اور اس کی تعبیر

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب نے اپنا ایک خواب عرض کیا کہ کوئی کہتا ہے کہ مولوی صاحب کو خیر ہے۔ استغفار اور لاحول پڑھنا چاہیے اور پھر میں نے ایک آواز سُنی۔ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ۔ فرمایا :

"لاحول سے یہ مراد ہے کہ بغیر فضلِ الٰہی کے کوئی حیلہ باقی نہیں رہا۔ اور سَلَامٌ عَلَیْکُمْ سے مراد سلامتی ہے۔" فرمایا :

"سب اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں جہاں حکم ہوتا ہے وہاں چڑھائی کرتے ہیں۔"

مصائب گناہوں کا کفّارہ ہوتے ہیں

مولوی عبدالکریم صاحب کی بیماری کا اور اُن کے متعلق دعا کا ذکر کرتے ہوئے شیخ رحمت اللہ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا :

"آپ کے واسطے بھی پانچ وقت نماز میں دُعا کی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ تکالیف سے اپنے بندوں کو ثواب دے۔ عبادات میں جو قصور رہ جاتے ہیں ان کا ازالہ قضاء و قدر کے مصائب سے ہو جاتا ہے کیونکہ عبادت کی تکلیف میں تو انسان اپنا رگ پٹھا آپ بچا لیتا ہے۔ سردی ہو تو وضو کے لیے پانی گرم کر لیتا ہے۔ کھڑا نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھ لیتا ہے۔ لیکن قضاء و قدر سے جو آسمانی مار پڑتی ہے وہ رگ پٹھہ نہیں دیکھتی۔

دُنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ دُنیا میں ہمیشہ کی خوشی صرف کافر کو حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے لیے عذاب کا گھر آگے ہے۔ لیکن مومن کے لیے ایسی زندگی ہوتی ہے کہ کبھی آرام اور کبھی تکلیف۔ ہاں جان بخیر چاہیے۔

یہ مصائب گناہ کا کفّارہ ہوتے ہیں۔ کرب اور گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں ؎ خدا داری چہ غم داری۔ خدا تعالیٰ پر پورا ایمان اور بھروسہ ہو تو پھر انسان کو تنور میں ڈال دیا جاوے اُسے کوئی غم نہیں ہوتا۔

تکالیف کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر راحت ہے۔ جیسا بچہ پیدا ہونے کے وقت عورت کو تکلیف ہے بلکہ ساتھ والے بھی روتے ہیں۔ لیکن جب بچہ پیدا ہوگیا تو پھر سب کو خوشی ہے۔ ایسا ہی مومن پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک تکلیف اور دُکھ کا وقت آتا ہے تاکہ وہ آزمایا جائے اور صبر اور استقامت کا اُجر پائے۔ اصل میں تکالیف کے دن ہی مبارک دن ہوتے ہیں۔ انبیاء تکالیف کے ساتھ موافقت کرتے ہیں۔ ہر ایک شخص پر نوبت بہ نوبت یہ دن آتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اصل ہے یا نہیں۔ مولوی رُومی نے خوب فرمایا ہے ؂

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است　　زیر آں گنج کرم بنہادہ است

حدیث میں آیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی سے پیار کرتا ہے تو اُسے کچھ دُکھ دیتا ہے۔ انبیاء کے معجزات انہیں مصائب کے زمانہ کی دُعاؤں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ خدا تعالےٰ کا اپریشن ہے جو ہر صادق کے واسطے ضروری ہے۔

قبل از ظہر

دعاؤں کی تلقین

فرمایا :

آگے پھر طاعون کے دن آرہے ہیں۔ نہیں معلوم کون بچے گا اور کون مرے گا ؟ آجکل توبہ کرنی چاہیے اور راتوں کو اُٹھ کر دُعائیں کرنی چاہئیں تاکہ خدا تعالےٰ اس وقت کے عذاب سے بچائے۔ قادیان کے قریب دو گاؤں طاعون سے ملوث ہیں۔

دُعا کے ذریعہ ہی مشکلات حل ہوتی ہیں

فرمایا :

اللہ تعالےٰ مخفی ہے۔ مگر وہ اپنی قدرتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ دُعا کے ذریعہ سے اس کی ہستی کا پتہ لگتا ہے۔ کوئی بادشاہ یا شہنشاہ کہلائے۔ ہر شخص پر ضرور ایسے مشکلات پڑتے ہیں جن میں انسان بالکل عاجز رہ جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت دُعا کے ذریعہ سے مشکلات حل ہو سکتے ہیں۔

چراغ الدین جمونی جموں والے چراغ الدین کا ذکر تھا کہ عیسائیوں کے ساتھ بہت تعلق محبت رکھتا ہے۔

فرمایا:

بد قسمت اور بد بخت آدمی ہے۔ اسلام ایسے گندوں کو باہر پھینکتا جاتا ہے۔

عیسائیوں پر ایک سوال یورپ کی شراب نوشی کا ذکر تھا۔ فرمایا:

حقیقی تہذیب شراب خور کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ انجیل کی کسی آیت نے سؤر کو بر خلاف توریت کے حلال نہیں کیا مگر یہ لوگ کثرت سے سؤر بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔

جب شریعتِ توریت قابلِ عمل نہیں اور باوجود بہت سی اشیاء کی حرمت کے جن کا حکم توریت میں موجود ہے۔ عیسائیوں کے واسطے ضروری نہیں کہ ان احکام پر عمل کریں تو پھر رشتہ ناطہ کے معاملہ میں اس قدیم شریعت پر عمل کرنے کی کیا حاجت ہے اور بہن یا سالی وغیرہ سے شادی کرنا انجیل کے کس حکم کے برخلاف ہے۔

خدا تعالیٰ کا حلم بعض لوگوں کے بدیوں اور شرارتوں میں حد سے بڑھ جانے کا ذکر تھا۔ فرمایا:

اللہ تعالیٰ بڑا حلیم اور کریم ہے اور اس کے کام نہایت آہستگی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ معصیت میں پڑے ہوئے لوگوں کو وہ مہلت دیتا ہے اور لوگ اس پر حیران ہوتے اور گھبراتے ہیں۔ لیکن گذشتہ واقعاتِ زمانہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں پر جب عذاب آتا ہے نہایت سخت آتا ہے۔ زمانہ میں راحت کے دن بہت ہیں مگر آخر کار گرفتاری کا بھی ایک دن آ ہی جاتا ہے اور اس وقت ایسا پکڑا جاتا ہے کہ اس کے دکھ کو دیکھ کر سخت سے سخت دل آدمی بھی دردناک ہو جاتا ہے۔

ہاں مشو مغرور از حلمِ خدا
دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

* * *

قبل نمازِ ظہر

دُعا کا اثر

جیسا اثر دُعا میں ہے ویسا اور کسی شئے میں نہیں ہے مگر دُعا کے واسطے پُورا جوش معمولی باتوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ معمولی باتوں میں تو بعض دفعہ دعا کرنا گستاخی معلوم ہوتی ہے اور طبیعت صبر کی طرف راغب رہتی ہے۔ ہاں مشکلات کے وقت دُعا کے واسطے پورا جوش دل میں پیدا ہوتا ہے تب کوئی خارقِ عادت امر ظاہر ہوتا ہے۔

کہتے ہیں دہلی میں ایک بزرگ تھا۔ بادشاہِ وقت اس پر سخت ناراض ہو گیا۔ اس وقت بادشاہ کہیں باہر جاتا تھا۔ حکم دیا کہ واپس آکر میں تم کو ضرور پھانسی دُوں گا اور اپنے اس حکم پر قسم کھائی۔ جب اس کی واپسی کا وقت قریب آیا تو اس بزرگ کے دوستوں اور مریدوں نے غمگین ہو کر عرض کی کہ بادشاہ کی واپسی کا وقت اب قریب آگیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ہنوز دلّی دُور است۔ جب بادشاہ ایک دو منزل پر آگیا تو انہوں نے پھر عرض کی۔ مگر اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہنوز دلّی دُور است۔ یہاں تک کہ بادشاہ عین شہر کے پاس آگیا اور شہر کے اندر داخل ہونے لگا۔ تب لوگوں نے اس بزرگ کی خدمت میں عرض کی کہ اب تو بادشاہ شہر میں داخل ہونے لگا ہے۔ یا داخل ہو گیا ہے مگر پھر بھی اس بزرگ نے یہی جواب دیا کہ ہنوز دلّی دُور است۔ اسی اثنا میں خبر آئی کہ جب بادشاہ دروازہ شہر کے نیچے پہنچا تو اُوپر سے دروازہ گرا اور بادشاہ ہلاک ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بزرگ کو کچھ منجانب اللہ معلوم ہو چکا تھا۔

ایسا ہی شیخ نظام الدینؒ کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ کا سخت عتاب ان پر ہوا۔ اور حکم ہوا کہ ایک ہفتہ تک تم کو سخت سزا دی جائے گی۔ جب وُہ دن آیا تو وہ ایک مُرید کی ران پر سر رکھ کر سوتے تھے۔ اس مرید کو جب بادشاہ کے حکم کا خیال آیا تو وُہ رو دیا۔ اور اس کے آنسو شیخ پر گرے جس سے شیخ بیدار ہوا اور پُوچھا کہ تُو کیوں روتا ہے۔ اس نے اپنا خیال عرض کیا اور کہا کہ آج سزا کا دن ہے۔ شیخ نے کہا کہ تم غم مت کھاؤ ہم کو کوئی سزا نہ ہو گی۔ مَیں نے ابھی خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مارکھنڈ گائے مجھے مارنے کے واسطے آئی ہے۔ مَیں نے اس کے دونوں سینگ پکڑ کر اس کو نیچے گرا دیا ہے۔ چنانچہ اسی دن بادشاہ سخت بیمار ہوا۔ اور ایسا سخت بیمار ہوا کہ اسی بیماری میں مر گیا۔

یہ تصرّفاتِ الٰہی ہیں جو انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ جب وقت آجاتا ہے تو کوئی نہ کوئی تقریب پیدا ہو جاتی ہے۔ سب دل خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے تصرّف کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے اِذن کے بغیر تو کوئی جان بھی نہیں نکل

سکتی خواہ کیسے ہی شدید عوارض ہوں۔ نا امید ہونے والا بُت پرست سے بھی زیادہ کافر ہے۔

آئندہ طاعون سے بچنے کا علاج

عاجز[1] راقم نے اپنا آج کا خواب عرض کیا کہ طاعون بہت پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ اور کوئی کہتا ہے یا میں کہتا ہوں کہ جو آجکل رات کو اُٹھ کر دُعا کرے گا وہ اس سے آئندہ طاعون کے وقت بچایا جاتے گا۔ فرمایا:

یہ بالکل سچ ہے۔ راتوں کو اُٹھ کر بہت دُعائیں کرنی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ آنے والے عذاب سے اپنے فضل و کرم سے محفوظ رکھے۔

جانوروں کی پرورش میں حفاظت کی ضرورت

فرمایا:

ایک نجاست خور گائے ہوتی ہے جس کو جلالہ کہتے ہیں۔ اس کا گوشت حرام لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کے جانور مثل بھیڑ، مرغی کی پرورش میں حفاظت کرنی چاہیے اور ان کو نجاست خوری سے بچانا چاہیئے۔[2]

---

۲۳ ستمبر ۱۹۰۵ء

(قبل دوپہر)

چراغ الدین جمونی اور اس کی تصنیف

آج اتفاق سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں میاں چراغ دین ساکن جموں کا ذکر اس تقریب پر شروع ہو گیا کہ اس نے ایک کتاب منارۃ المسیح حال میں شائع کی ہے جس میں اسلام کی سخت ہتک کی گئی ہے۔ اس کتاب کے تذکرہ پر اعلیٰحضرت علیہ الصلوٰۃ

---

[1] حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ ۔ (مرتب)

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۲۶ صفحہ ۳ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء

والسلام نے فرمایا کہ :

وُہ اسلام کا سخت مخالف ہے۔ ہر امر میں اس نے حضرت مسیح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دی ہے پھر یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام اور عیسائیت میں صلح کرانے آیا ہوں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ اسلام اور عیسائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور وہ صلح کراتا ہے۔ مجھے اس کتاب میں بہت گالیاں دی ہیں۔

کشمیر میں بنی اسرائیل اور مسیح علیہ السلام کی قبر

مسیح کی قبر واقع کشمیر کا ذکر تھا۔ اس کے متعلق جو کچھ فرمایا۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

بہت سے شواہد اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ یہ مسیح علیہ السلام ہی کی قبر ہے۔ اور یہاں نہ صرف ان کی قبر ہی ہے بلکہ میں یقین رکھتا ہوں کہ ان کے بعض دوستوں کی قبریں بھی اسی جگہ ہیں۔ اوّل یوسف آسف کا نام ہی اس پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ اپنے وطن میں باغی ٹھہرائے گئے تھے۔ اس لیے اس گورنمنٹ کے تحت حکومت میں کسی جگہ رہ نہ سکتے تھے۔ پس اللہ تعالےٰ نے ان پر رحم کرکے پسند کیا کہ شام جیسا سرد ملک ہی ان کے لیے تجویز کیا جہاں وہ ہجرت کرکے آگئے اور یہودیوں کی دس تباہ شدہ قومیں جن کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ وہ بھی چونکہ یہاں ہی آباد تھیں۔ اس لیے اس فرض تبلیغ کو ادا کرنے کے لیے بھی یہاں اُن کا آنا ضروری تھا۔ اور پھر یہاں کے دیہات اور دُوسری چیزوں کے نام بھی بلادِ شام کے بعض دیہات وغیرہ سے ملتے جلتے ہیں۔

(اس موقعہ پر مفتی محمد صادق صاحب نے عرض کی حضور کاشیر کا لفظ خود موجود ہے۔ یہ لفظ اصل میں کاشیر ہے۔ م تو ہم لوگ ملا لیتے ہیں۔ اصل کشمیری کاشیر بولتے ہیں اور کاشیر کہلاتے ہیں۔ اور آشیر عبرانی زبان میں مُلک شام کا نام ہے اور ک بمعنے مانند ہے۔ یعنی شام کی مانند۔ پھر اور بہت سے نام ہیں۔)

حضرت نے فرمایا کہ :

وہ سب نام جمع کرو تاکہ ان کا حوالہ کسی جگہ دیا جاوے۔

اسی سلسلہ کلام میں فرمایا کہ :

اکمال الدین جو پرانی کتاب ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ انیس سو برس کا ایک نبی ہے۔ پھر کشمیریوں کے رسم و رواج وغیرہ یہودیوں سے ملتے ہیں۔ برنیئر فرانسیسی سیاح نے بھی ان کو بنی اسرائیل

ہی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ تھوما حواری کا ہندوستان میں آنا ثابت ہے۔

(اس مقام پر مفتی صاحب نے عرض کی کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ جب حضرت مریم بیمار ہوئیں تو انہوں نے تھوما سے جو اس وقت ہندوستان میں تھا۔ ملنا چاہا۔ چنانچہ ان کے تابوت کو ہندوستان میں پہنچایا گیا اور وہ تھوما سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور اسکو برکت دی اور پھر تھوما نے اس کا جنازہ پڑھا۔ اس ذکر پر کہا گیا کہ کیا تعجب ہے اگر فی الحقیقت یہ ایک ذریعہ اختیار کیا گیا ہو بیٹے کے پاس آنے کا۔ اس کے متعلق مختلف باتیں ہوتی رہیں)۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي پر ایک اعتراض کا جواب

مندرجہ بالا سلسلہ کلام میں آپ نے فرمایا کہ:

ہم جب مسیح کی موت کے لیے آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي (المائدۃ: ۱۱۸) پیش کرتے ہیں تو اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام اگر واقعہ صلیب کے بعد کشمیر چلے آئے تھے تو پھر اُن کو بجائے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي کے یہ کہنا چاہیے تھا کہ جب تُو نے مجھے کشمیر پہنچا دیا۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض ایک مغالطہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر سے زندہ اُتر آتے اور موقعہ پاکر وہ وہاں سے کشمیر کو چلے آتے۔ لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مخالفوں کا حال تو پوچھا نہیں۔ وہ تو ان کی اپنی اُمت کا حال پُوچھتا ہے۔ مخالف تو بدستور کافر کذاب تھے۔

دُوسرے یہاں مسیح علیہ السلام نے اپنے جواب میں یہ بھی فرمایا ہے مَادُمْتُ فِيهِمْ (المائدۃ: ۱۱۸) مَیں جب تک ان میں تھا۔ یہ نہیں کہا مَادُمْتُ فِي أَرْضِهِمْ۔ مَادُمْتُ فِيهِمْ کا لفظ تقاضا کرتا ہے کہ جہاں مسیح جائیں وہاں ان کے حواری بھی جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کا ایک مامور و مُرسل ایک سخت حادثہ موت سے بچایا جاوے اور پھر وہ خدا تعالیٰ کے اِذن سے ہجرت کرے اور اس کے پیرو اور حواری اسے بالکل تنہا چھوڑ دیں اور اس کا پیچھا نہ کریں۔ نہیں بلکہ وہ بھی اُن کے پاس یہاں آئے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دفعہ ہی سارے نہ آئے ہوں بلکہ متفرق طور پر آگئے ہوں؛ چنانچہ تھوما کا تو ہندوستان میں آنا ثابت ہی ہے اور خود عیسائیوں نے مان لیا ہے۔ اس قسم کی ہجرت کے لیے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی نظیر موجود ہے؛ حالانکہ مکّہ میں آپؐ کے وفادار اور جاں نثار خدام موجود تھے۔ لیکن جب آپؐ نے ہجرت کی تو صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے لیا۔ مگر اس کے بعد جب آپ مدینہ پہنچ گئے تو دوسرے اصحاب بھی یکے بعد دیگرے وہیں جا پہنچے۔ لکھا

ہے کہ جب آپؐ ہجرت کر کے نکلے اور غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے تو دشمن بھی تلاش کرتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ اُن کی آہٹ پا کر حضرت ابو بکرؓ گھبرائے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ : ۴۰) کہتے ہیں کہ وہ نیچے اُتر کر اس کو دیکھنے بھی گئے۔ مگر خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ غار کے مُنہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک نے کہا کہ یہ جالا تو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی) پیدائش سے بھی پہلے کا ہے۔ اس لیے وہ واپس چلے آتے یہی وجہ ہے کہ جو اکثر اکابر عنکبوت سے محبت کرتے آئے ہیں۔

غرض جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود ایک گروہِ کثیر کے اس وقت ابو بکرؓ ہی کو ساتھ لینا پسند کیا اسی طرح پر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے صرف تھوما کو ساتھ لے لیا اور چلے آئے۔ پس جب حواری ان کے ساتھ تھے تو پھر کوئی اعتراض نہیں رہتا۔

دوسرا سوال اس پر یہ کرتے ہیں کہ جب کہ وہ ستّاسی سال تک زندہ رہے تو ان کی قوم نے ترقی کیوں نہ کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا ثبوت دینا ہمارے ذمّہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں ترقی کی ہوگی لیکن حوادث روزگار نے ہلاک کر دیا ہوگا۔ کشمیر میں اکثر زلزلے اور سیلاب آتے رہتے ہیں۔ مدّت دراز کے بعد قوم بگڑ گئی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک قوم تھی۔ اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (المومنون : ۵۱) کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ وہ شام ہی میں تھا۔ مَیں کہتا ہوں یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن شریف خود اس کے مخالف ہے اس لیے کہ اٰوٰى کا لفظ تو اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں ایک مصیبت کے بعد نجات ملے اور پناہ دی جاوے۔ یہ بات اس رُومی سلطنت میں رہ کر انہیں کب حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ تو وہاں رہ سکتے ہی نہ تھے۔ اس لیے لازمی طور پر انہوں نے ہجرت کی۔

زندگی لائقِ اعتبار نہیں فرمایا :

زندگی اعتبار کے لائق نہیں۔ اس پر مختلف امراض اور خصوصاً طاعون نے اور بھی خوف پیدا کر دیا ہے۔

(قبل نمازِ عصر)

اصل طریق دعا ہے حضرت مخدوم الملّت[1] کی بیماری کا تذکرہ تھا۔ ایک بزرگ نے

---

[1] حضرت مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ (مرتب)

باتوں ہی باتوں میں حکایتاً عن الغیر ذکر کیا کہ بعض مسمریزم کے عامل توجہ سے مرض کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر بدل دینے کے دعوے کرتے ہیں۔ اس پر فرمایا:

یہ کچھ چیز نہیں۔ میری طبیعت اس سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اصل طریق دُعا ہے۔ اس سے بہتر اَور کوئی راہ نہیں ہے۔ مَیں تو اس کے سوا دوسرے طریقوں کو ایسا سمجھتا ہوں جیسے قَے کے ساتھ کسی بیماری کا علاج کیا جاوے۔ پس کون پسند کرتا ہے کہ قَے کے ساتھ علاج ہو۔ سچا اور خداشناسی کا جو طریق ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے استعمال کیا وہ یہی دُعا ہے۔[1]

۲۴؍ستمبر ۱۹۰۵ء

(قبل دوپہر)

مومن کا بھروسہ خدا تعالیٰ پر ہوتا ہے

مخدوم[2] الملت کی بیماری کے تذکرہ پر مندرجہ ذیل تقریر فرمائی:

اگر انسان کا وجود اللہ تعالیٰ کے بغیر ہوتا تو کچھ شک نہیں بڑی مصیبت ہوتی، مگر اب تو ذرہ ذرہ کی حفاظت وہ ایک ذات کر رہی ہے۔ پھر کس بات کا غم اور خوف ہے۔ اس کی قدرتیں عجیب ہیں اور اس کے تصرفات بے نظیر۔ قادر خدا کو مان کر مومن کبھی غمگین نہیں ہوتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اسی میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ مومن اور غیر مومن میں ایمان ہی کا تو فرق ہے۔ دہریہ مزاج اور اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لانے والے کی زندگی اس وقت تک عمدہ اور بے خوف و خطر ہوتی ہے جب تک اس پر مصائب اور مشکلات کا حملہ نہیں ہوتا لیکن جب خفیف سی مشکلات بھی آکر ظاہر ہوتی ہیں تو اس کی عقل ماردیتی ہیں اور وہ ان کی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کی امید اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہی نہیں اور اسباب اُسے مایوس کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں ذرا ذرا سی بات خلافِ مزاج پیش آجانے پر بعض اوقات یہ لوگ خودکشیاں کر لیتے ہیں۔ یورپ میں جہاں دہریوں کی کثرت ہے وہاں اس قدر خودکشیاں ہوتی ہیں کہ کسی اَور مُلک میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ وہ ہم و غم اور مصائب کی برداشت نہیں

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ صفحہ ۴، ۵ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

[2] حضرت مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی رضی اللہ عنہ (مرتب)

کر سکتے۔ ان کے دل کمزور ہو جاتے ہیں۔ لیکن بر خلاف اس کے مومن قوی دل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا بھروسہ خدا تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ اس پر اگر مصائب آئیں تو وہ اس کو پست ہمت نہیں بنائیں بلکہ وہ مصائب میں اور بھی قدم آگے بڑھاتا ہے۔ اس کا ایمان پہلے سے اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور سچ پوچھو تو ایمان کا مزہ اور لذت انہیں دنوں میں آتی ہے اور ایمان انہیں ایام کے لیے ہوتا ہے۔ صحت کی حالت میں جبکہ نہ کوئی مالی غم ہو نہ جانی بلکہ ہر قسم کی آسائش اور امن ہو اس وقت کافر اور غیر کافر کی حالت یکساں ہو سکتی ہے لیکن مصیبت اور بیماری اور دُوسری مشکلات میں ان باتوں کا امتحان ہو جاتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ کون اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق رکھتا ہے اور اس کی قدرتوں پر ایمان لاتا ہے اور کون اس کا شکوہ کرتا ہے اور اس سے ناراض ہوتا ہے۔

ایمان کا کامل معیار

مصیبت اور دُکھ ایمان کا ایک کامل معیار ہے اسی سے پہچانا جاتا ہے کہ کون صبر کرتا ہے۔ صبر کیا ہے؟ یہ بھی ایمان ہی کا نتیجہ ہے۔ مصیبتوں میں جب مومن صبر کرتا ہے تو یہ صبر بھی ایک نئے رنگ کا صبر معلوم ہوتا ہے کہ کافر اس صبر میں مشابہت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ خدا تعالیٰ کا معاملہ بھی ایک نئے رنگ کا معاملہ ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایک نیا خدا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس پر ایمان لا کر معرفت میں ترقی ہوتی ہے۔

جب مشکلات اور مصائب کی وجہ سے مومن دعائیں کرتا ہے تو دو فائدے ہوتے ہیں ایک تو وُہ مصائب بجائے خود اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ان دعاؤں کے ذریعہ ان سے نجات بھی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ پر اور اس کی قدرتوں پر ایمان بڑھتا ہے۔ مصیبت سے انسان کی زندگی کبھی خالی نہیں رہ سکتی۔ کسی نہ کسی رنگ میں کوئی نہ کوئی مصیبت انسان پر آ ہی جاتی ہے۔ خواہ بیماری کے رنگ میں ہو خواہ عزت و آبرو کے متعلق ہو یا مال و اسباب کی صورت میں ہو لیکن مومن کی مصیبت اس پر سہل ہو جاتی ہے اور اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ وہ اس مصیبت کو اپنے لیے خدا تعالےٰ سے تعلقات بڑھانے کا ایک ذریعہ یقین کرتا ہے اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوتا ہے مگر وہی مصیبت بے ایمانوں کے لیے عذاب کے رنگ میں ہو جاتی ہے۔ کبھی دوسرے کو مصیبت میں دیکھ کر خوش نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ تو ایک عبرت کا مقام ہے۔ خود بھی اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ تسکین دِہ ہے

یہ بھی یاد رکھو کہ مصیبت کے زخم کے لیے کوئی مرہم ایسا تسکین دِہ اور آرام بخش نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے وہ سخت سے سخت مشکلات اور مصائب میں بھی

اندر ہی اندر تسلی اور اطمینان پاتا ہے وہ اپنے قلب میں تلخی اور عذاب کو محسوس نہیں کرتا۔ نہایت کار اس مصیبت کا انجام یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تقدیر مبرم ہے تو موت آجاوے۔ لیکن اس سے کیا ہوا؟ دُنیا کوئی ایسی جگہ تو ہے ہی نہیں جہاں کوئی ہمیشہ رہ سکے۔ آخر ایک دن اور وقت سب پر آتا ہے کہ اس دُنیا کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر اگر اُسے موت آگئی تو ہرج کیا ہوا؟ مومن کے لیے تو موت اَور بھی راحت رسل اور وصالِ یار کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور اس کی قدرتوں پر بھروسہ کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اگلا جہان اس کے لیے اَبدی راحت کا ہے۔ پس نری مصیبت خواہ بیماری کی ہو یا کسی اَور قسم کی تکلیف عذاب کا موجب نہیں ہو سکتی بلکہ وہ مصیبت دُکھ دینے والا عذاب ٹھہرتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور بھروسہ نہ ہو۔ ایسے شخص کو البتہ سخت عذاب ہوتا ہے اور اگر کوئی یہ خیال کرے کہ موت ہی نہ آوے تو یہ خیال خام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا کو ناپائیدار قرار دیا ہے۔ ایسے شخص کے لیے دوسرے جہان میں سخت دردناک جہنّم ہو گا جس کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔

موت کی حقیقت

موت آنے والی ہے اس سے کسی کو چارہ نہیں یقیناً سمجھو کہ اس پیالہ کے پینے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ خدا تعالیٰ کے تمام برگزیدہ بندوں اور انبیاء و رسل کو بھی اس راہ سے گذرنا پڑا تو اُور کون ہے جو بچ جاوے۔ حکیم اور فلاسفر جو سخت دل ہوتے ہیں اُن کو بھی یہ بات سُوجھ گئی ہے اور انہوں نے اعتراف کیا بلکہ موت کو ضروری سمجھا ہے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ زمین تو ربع مسکون ہے اور اس میں بہت ہی تھوڑا حصہ آباد ہے۔ اگر وہ تمام لوگ جو ابتدائے آفرینش سے پیدا ہوتے اب تک زندہ رہتے تو ان کے رہنے کو کوئی جگہ اور مقام نہ ملتا۔ یہاں تک کہ وہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے۔ پس اس قدر کثرت خود چاہتی ہے کہ موت ہو تاکہ پہلے چلے جاویں تو دُوسروں کے لیے جگہ ہو۔ موت کو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مر کر انسان بالکل گم ہو جاتا ہے نہیں بلکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کوٹھڑی سے نکل کر انسان دُوسری کوٹھڑی میں چلا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت کسی قدر خواب سے سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ خواب بھی گویا ہمشیرۂ موت ہے۔ خواب میں بھی ایک قسم کا قبضِ رُوح ہی ہوتا ہے۔ دُوسروں کے خیال میں جو سونے والے کے پاس بیٹھے ہیں وہ بالکل بے خبری اور محویت کے عالم میں ہیں۔ لیکن خواب دیکھنے والا معاً دُوسرے عالم میں ہوتا ہے۔ اور وہ سیاحت کر رہا ہوتا ہے۔ اب بظاہر اس کے حواس اور قویٰ سب معطّل ہوتے ہیں۔ لیکن سونے والا اور خواب دیکھنے والا خوب جانتا ہے کہ اس کے حواس اور قویٰ سب کام میں لگے ہوتے

ہیں۔ اسی طرح پر مرنے والا موت کے بعد اپنے آپ کو معاً دوسرے عالم میں دیکھتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جب موت آتی ہے تو وہ شخص جس نے اپنی عمرِ عزیز کو دنیا کے حصول میں ہی ضائع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ چونکہ ابھی بہت سے کاموں کو نا تمام اور ادھورا پاتا ہے۔ اس لیے اس پر حسرت اور افسوس کا استیلاء ہو جاتا ہے اور وہ موت اسے تلخ گھونٹ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ انسان دلبستگی پیدا نہ کرے اور اپنے اوقات کو ضائع نہ کرے۔ ہر لحظہ کو غنیمت سمجھ کر اور یقین کرے کہ شاید ابھی موت آجاوے مرنے کے واسطے تیار رہنا چاہیے۔ جب اس تیاری کی فکر دامنگیر رہے گی تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان اپنے تعلقات کو بڑھائے گا اور اس دوسرے جہان میں آرام پانے کا خیال کرے گا۔

یہ خوب یاد رکھو کہ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جیسے زمیندار اپنی فصل کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے لیے ہر قسم کے دُکھ اور تکالیف اُٹھاتا ہے۔ اسی طرح پر مومن کو اس کی حفاظت کے لیے کرنا چاہیے۔ تاکہ دُوسرے جہاں میں آرام پاوے۔ اگر اب بے پروائی کرے گا اور وقت کی قدر نہیں کرے گا تو پھر اس کو اس وقت سخت افسوس اور حسرت ہوگی۔ جب اس جہان سے رخصت ہو کر دوسرے عالم میں جانا پڑے گا اور وہاں اس کے لیے بجز دُکھ اور درد کے اَور کیا ہوگا؟ اس دُنیا میں وہ اس دنیا کے ہم و غم میں مبتلا رہا اور اُس عالم میں اس ہم و غم کے نتائج ہیں۔

موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے

جو شخص اس عالم کے ہم و غم میں مبتلا ہو رہا ہے اور دُوسرے عالم کا اسے کوئی فکر بھی نہیں۔

اگر اسے یکدفعہ ہی پیغام موت آجاوے تو خیال کرو اس کا کیا حال ہوگا؟ موت تو ایک بازی گاہ ہے ہمیشہ ناگاہ آتی ہے اور جسے آتی ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں تو قبل از وقت جاتا ہوں۔ ایسا خیال اسے کیوں پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ چونکہ خیالات اَور طرف لگے ہوئے تھے اور وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اگر تیاری ہو تو قبل از وقت نہ سمجھے بلکہ ہر وقت اسے قریب اور دروازہ پر یقین کرے۔ اس لیے تمام راستبازوں نے یہی تعلیم دی ہے کہ انسان ہر وقت اپنا محاسبہ کرتا رہے اور آزماتا رہے کہ اگر اس وقت موت آجاوے تو کیا وہ تیار ہے یا نہیں؟ حافظ نے کیا اچھا کہا ہے ؎

چہ کارِ عمر ناپیدا است بارے آں اولیٰ
کہ روزِ واقعہ پیشِ نگارِ خود باشیم

ان کا مطلب یہی ہے کہ ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے۔ اور کسی وقت بھی اس تیاری سے بے فکر

اور غافل نہ ہونا چاہیے ورنہ عذاب ہوگا۔ یہ بالکل صاف بات ہے کہ جو شخص ہر وقت سفر کی تیاری میں ہے اور کمر بستہ بیٹھا ہے۔ اگر یکایک اُسے سفر کرنا پڑے تو اُسے کوئی تکلیف اور گھبراہٹ نہ ہوگی لیکن اگر اس نے کبھی یہ خیال بھی نہیں کیا تو پھر ایسے موقع پر سخت گھبراہٹ کا سامنا ہوگا۔ ایک شاعر نے کیا اچھا کہا ہے ؎

وَلَمْ یَتَّفِقْ حَتّٰی مَضٰی فِیْ سَبِیْلِهٖ
وَکَمْ حَسَرَاتٍ فِیْ بُطُوْنِ الْمَقَابِرِ

یعنی اس وقت تک اس امر سے اتفاق نہ کیا یہاں تک کہ کوچ کرنا پڑا۔ تب اقرار کیا کہ بہت ساری حسرتیں قبروں میں دفن کی گئی ہیں۔

مگر یہ بات اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر میسّر نہیں ہوسکتی کہ انسان غفلت کی زندگی چھوڑ کر عالمِ آخرت کی تیاری میں لگا رہے۔ سُننے کو تو ہر ایک کان سُن سکتا ہے کیونکہ سُننا سہل ہے مگر عمل کرنے کے لیے مشکل پڑتی ہے۔ انسان کی عادت میں داخل ہے کہ جبتک ایک مجلس میں بیٹھا ہے۔ اس مجلس کی باتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن جب وہاں سے اُٹھتا ہے اور مجلس منتشر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ باتیں بھی بھول جاتی ہیں گویا وہ وہیں تک کے لیے تھیں۔ ایسے لوگ سخت نقصان اُٹھاتے ہیں اور دفعۃً موت کے آجانے پر انہیں بہت کچھ حسرت اور افسوس کرنا پڑتا ہے۔ موت انہیں کی اچھی ہوتی ہے جو مرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔

فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عطّاری کی دوکان کیا کرتے تھے۔ ایک دن صبح ہی صبح جب آکر انھوں نے دوکان کھولی تو ایک فقیر نے آکر سوال کیا۔ فریدالدین نے اس سائل کو کہا کہ ابھی بوہنی نہیں کی۔ فقیر نے ان کو کہا کہ اگر تُو ایسا ہی دُنیا کے دھندوں میں مشغول ہے تو تیری جان کیسے نکلے گی۔ فریدالدین نے اس کو جواب دیا کہ جیسے تیری نکلے گی۔ فقیر یہ سُنکر وہیں لیٹ گیا اور کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ اور اس کے ساتھ ہی جان نکل گئی۔ فریدالدین نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو بہت متاثر ہوا۔ اسی وقت ساری دکان لُٹا دی اور ساری عمر یادِ الٰہی میں گذار دی۔ یہ تیاری ہوتی ہے۔ تیاری میں رنج نہیں ہوتا۔ کش مکش ہو تو پھر رنج اور افسوس ہوتا ہے۔

صوفیاء اور مولوی

فرمایا :

صوفیوں کی جو کتابیں ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں موت کا خیال دامنگیر رہا ہے۔

لیکن وجودیوں کے نام سے جو لوگ گذرے ہیں وہ عموماً محجوب رہے ہیں۔ بہت ہی کم جو دراصل وہ بھی فقیر تھے۔ وہ تو اس حجاب سے بچے ہیں ورنہ اہل تصوف سے عموماً الگ رہے ہیں اور ایسے پاکباز لوگوں پر کفر ہی کے فتوے دیتے رہے جو دنیا سے انقطاع کرنے والے تھے۔ صوفی تو ایسے ہیں جیسے ہر وقت کوئی مرنے کو تیار رہتا ہے۔ ان کی کتابوں کو پڑھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ان سے خوشبو آتی ہے کہ وہ صاحب حال ہیں صاحب قال نہیں۔ اگر فراستِ صحیحہ ہو تو انسان ان باتوں کو سمجھ لیتا ہے۔ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فتوح الغیب بڑی ہی عمدہ کتاب ہے۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ بدعات سے پاک ہے۔ بعض کتابیں صوفیوں کی اس قسم کی بھی ہیں کہ ان میں بدعات بھی داخل ہو گئی ہیں لیکن یہ کتاب بہت ہی عمدہ ہے۔

وحدتِ وجودی کا فتنہ

فقیروں میں بھی ایک آفت پڑی ہے یعنی بعض فقیر تو ہوئے مگر وحدت وجودی ہو گئے اور خود ہی خدا بن بیٹھے۔ ہمارے ملک میں دوآبہ (بست جالندھر) میں اکثر وجودی ہیں۔ اور جو وجودی کہلاتے ہیں ان کا مذہب عموماً اباحتی دیکھا گیا ہے۔ اور حقیقت میں اس مذہب کا خاصہ اور اثر ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے متصف نہیں مانتا جو قرآن شریف میں بیان ہوئی ہیں اور اپنے اور خدا تعالیٰ میں کوئی فرق نہیں کرتا بلکہ خود ہی خدا بنتا ہے۔ وہ اگر اباحتی نہ ہو تو اور کیا ہو۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ دوزخ اور بہشت پر ایمان بھی لاتے ہیں اور ایمان لا کر بھی سمجھتے ہیں کہ ہم ہی خدا ہیں۔ اور ایک اور بڑی غلطی ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہیں اور وہ یہ ہے کہ اپنے مذہب کو اکابر سے منسوب کرتے ہیں۔

وحدتِ شہودی

اصل یہ ہے کہ مذہب دو ہیں۔ وجودی اور شہودی۔ وجودیوں نے فلسفیوں کی طرح یہ سمجھ لیا ہے کہ انسان کے سوا خدا کچھ نہیں ہے یا خدا کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر شہودی اس کے سوا ہیں اور وہ ٹھیک ہیں۔ جنہوں نے استیلاءِ محبت اور تجلیاتِ صفاتِ الٰہی سے ایسا معلوم کیا کہ خدا ہے۔ انہوں نے اس کی ہستی اور وجود کے سامنے اپنی ہستی اور وجود کی نفی کر لی۔ اور 'مُن تُو شدم تو مَن شدی' کے مصداق ہوئے۔ حقیقت میں محبت کے ثمرات میں سے نفیٔ وجود ضروری ہے۔ اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قرآن شریف سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو فنا فی اللہ کہلاتا ہے۔ لیکن وجودیوں کا یہ حال نہیں۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ گویا انہوں نے ڈاکٹروں کی طرح تشریح کر کے خدا تعالیٰ کو دیکھ لیا ہے۔ تب ہی تو یہ خود بھی خدا بنتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط اور

بیہودہ امر ہے۔ اللہ تعالیٰ تو صاف فرماتا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (الانعام : ۱۰۴) وجودیوں کا یہ مذہب ہے کہ ہم ہی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھتے ہیں اور ہم ہی سچے موحد ہیں۔ باقی سب مشرک ہیں۔ اس کا نتیجہ عوام میں یہ ہوا کہ اباحت پھیل گئی اور فسق و فجور میں ترقی ہو گئی، کیونکہ وہ اسے حرام نہیں سمجھتے اور نماز روزہ اور دُوسرے اوامر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اس سے اسلام پر بہت بڑی آفت آئی ہے۔

میرے نزدیک وجودیوں اور دہریوں میں انیس اور بیس کا فرق ہے

یہ وجودی سخت قابلِ نفرت اور قابلِ کراہت ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ جس قدر گدیاں ہیں ان میں سے شاید ایک بھی ایسی نہیں ہوگی جو یہ مذہب نہ رکھتی ہو۔ سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا فرقہ جو قادری کہلاتا ہے وہ بھی وجودی ہو گئے ہیں؛ حالانکہ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ وجودی نہ تھے۔ ان کا طرزِ عمل اور ان کی تصنیفات اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی عملی تصدیق دکھاتی ہیں۔

علماء صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صرف پڑھنے کے لیے ہے لیکن اس کے اثرات اور نتائج کچھ نہیں۔ مگر وہ عملی طور پر دکھاتے ہیں کہ ان منعم علیہ لوگوں کے نمونے اس اُمت میں ہوتے ہیں۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ گو ایسے لوگ تھوڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ہیں ضرور جو خدا تعالیٰ سے کامل محبت کرتے ہیں اور اسی دُنیا میں رہ کر انقطاع اور سفرِ آخرت کی تیاری کرتے ہیں۔ یہ اُمور ایسے ہی لوگوں کے حصہ میں آتے ہیں۔ جیسے سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔ مگر اب برخلاف ان کے وجودیوں کی کثرت ہے اور اسی وجہ سے فسق و فجور میں ترقی ہے۔

اس دنیا میں معرفت اور بصیرت حاصل کرنے کا نسخہ

قرآن شریف کی تعلیم کا خلاصہ مغز کے طور پر یہی بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اس قدر استیلاء کرے کہ ماسوی اللہ جل جاوے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے گناہ جلتے ہیں اور یہی وہ نسخہ ہے جو اسی عالم میں انسان کو وہ حواس اور بصیرت عطا کرتا ہے جس سے وُہ اُس عالم کی برکات اور فیوض کو اِس عالم میں پاتا ہے اور معرفت اور بصیرت کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو اس زمرہ سے الگ ہیں۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (بنی اسرائیل : ۷۳) اور ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمایا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن : ۴۷) یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونے

سے ڈرتے ہیں ان کو دو جنت ملتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک جنت تو وہ ہے جو مرنے کے بعد ملتی ہے۔ دوسری جنت اسی دُنیا میں عطا ہوتی ہے اور یہی جنت اس دُوسری جنت کے ملنے اور عطا ہونے پر بطور گواہ واقعہ ٹھہر جاتی ہے۔ ایسا مومن دُنیا میں بہت سے دوزخوں سے رہائی پاتا ہے۔ مختلف قسم کی بداخلاقیاں یہ بھی دوزخ ہی ہیں۔ جن چیزوں سے شدید تعلق ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ایک قسم کا دوزخ ہی ہے۔ کیونکہ پھر ان کو چھوڑنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً مال سے محبت ہو اور اسے چور لے جائیں تو اُسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ یہانتک کہ بعض اوقات ایسے لوگ مر ہی جاتے ہیں یا ان کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پر اور جن فانی اشیاء سے محبت ہے وہ اگر تلف ہو جائیں یا مر جاویں تو اُس کو سخت رنج اور صدمہ ہوتا ہے۔

مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کا ایک دوست مر گیا۔ جس کے غم میں وہ رو رہا تھا۔ اس سے پوچھا گیا تُو کیوں روتا ہے تو اس نے کہا کہ میرا ایک نہایت ہی عزیز مر گیا۔ اس نے کہا کہ تُو نے مرنے والے سے دوستی ہی کیوں کی؟

اصل بات یہ ہے کہ مفارقت تو ضروری ہے اور جُدائی ضروری ہوگی۔ یا یہ خود جائے گا یا وہ جس سے دوستی اور محبت کی ہے۔ پس وہ مفارقت عذاب کا موجب ہو جائے گی لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتے ہیں اور ان فانی اشیاء کے دلدادہ اور گردیدہ نہیں ہوتے وہ اس عذاب سے بچا لیے جاتے ہیں۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

دشتِ دُنیا جُز دَد و جز دام نیست
جُز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفع الی السماء کی حقیقت

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ہمارا اصل منشا اور آنے کی غرض یہ نہیں کہ عیسٰی فوت ہو گیا۔ یہ تو ایک سچائی تھی جو ہم نے پیش کی۔ اللہ تعالےٰ نے ہم پر یہی ظاہر کیا۔ ہم نے اسی طرح اس کو دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ہمیں حضرت عیسٰی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ایک رسُول اور پیغمبر ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر نہیں گئے ہم کو اُن کی تذلیل منظور نہیں مگر ہم کیا کریں۔ اصل بات ہی یہ ہے۔ جو امر ہم کسی نبی اور رسُول کے لیے نہیں مانتے۔ ہم کیونکر ان کے ساتھ اسے مختص کریں۔ ہاں ہم کو بخل نہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جس جسم کے ساتھ دوسرے پیغمبر آسمان پر گئے ہیں حضرت عیسٰی بھی اسی جسم کے ساتھ گئے ہیں۔ مگر ان لوگوں

کی غلطیوں اور خود تراشیدہ خیالات کو کیسے مان لیں۔

یہ خوب یاد رہے کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر رُوح بلا جسم ہرگز نہیں مانتے۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ وہاں جسم ہی کے ساتھ ہی ہیں۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ یہ لوگ جسم عنصری کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ وہ جسم وہی ہے جو دُوسرے رسولوں کو دیا گیا ہے۔ دوزخیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَآءِ (الاعراف : ۴۱) یعنی کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاویں گے اور مومنوں کے لیے فرماتا ہے۔ مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ (صٓ : ۵۱) اب ان آیات میں لَهُمْ کا لفظ اجسام کو چاہتا ہے تو کیا یہ سب کے سب پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ جاتے ہیں؟ نہیں۔ ایسا نہیں۔ جسم تو ہوتے ہیں مگر وہ وہ جسم ہیں جو مرنے کے بعد دیئے جاتے ہیں۔ ایسا ہی فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (الفجر : ۳۰، ۳۱) بھی اجسام کو چاہتا ہے۔ پھر تیسری شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت ہے۔ معراج میں آپؐ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت یحییٰ کے ساتھ دیکھا۔ وہاں آپؐ نے رُوحیں تو نہ دیکھی تھیں۔ یعنی جسم صرف حضرت عیسیٰ کا ہو اور باقی نبیوں کی رُوحیں تھیں اور مسیح ہی کا جسم تھا۔

سچی اور بالکل سچی اور صاف بات یہی ہے کہ اجسام ضرور ملتے ہیں لیکن یہ عنصری اجسام یہاں ہی رہ جاتے ہیں یہ اُوپر نہیں جا سکتے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے جواب میں فرمایا۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل : ۹۴) یعنی ان کو کہہ دے میرا رب اس سے پاک ہے جو اپنے وعدوں کے خلاف کرے جو وہ پہلے کر چکا ہے میں تو صرف ایک بشر رسول ہوں۔ سُبْحَانَ کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ سابق جو وعدے ہو چکے ہیں ان کی خلاف ورزی وہ نہیں کرتا۔ وہ وعدہ کیا ہے؟ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (البقرۃ : ۳۷) اور ایسا ہی فرمایا أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا (المرسلات : ۲۶) اور پھر فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ۔ (الاعراف : ۲۶) ان سب آیتوں پر اگر یکجائی نظر کی جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جسم جو کھانے پینے کا محتاج ہے آسمان پر نہیں جاتا۔ پھر ہم دُوسرے نبیوں سے بڑھ کر مسیح میں یہ خصوصیت کیونکر تسلیم کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار نے شرارت سے یہی سوال کیا تھا کہ آپؐ آسمان پر چڑھ جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے وہ آیات سُن چکے تھے جن میں اس امر کی نفی کی گئی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اب اقرار کریں تو اعتراض کا موقعہ ملے۔ لیکن وہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام تھا۔ اس میں اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ان کو یہی جواب ملا۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل : ۹۴)

یعنی ان کو کہدو کہ ایسا معجزہ اللہ تعالیٰ کے قول کے خلاف ہے اور وہ اس سے پاک ہے کہ اپنے پہلے قول کے خلاف کرے۔

غرض یہ کس قدر موٹی باتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بار بار پیش کی ہیں۔ مگر تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ یہ ان کو سمجھتے نہیں اور خواہ مخواہ حضرت مسیح میں ایسی خصوصیت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو دُوسروں میں نہیں ہے۔ قرآن شریف کی یہ تعلیم اور بخاری اور مسلم کو دیکھو اور صحاح کو پڑھو وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت موجود ہے۔ آپؐ نے حضرت مسیح کو یحییٰ کے ساتھ دیکھا ویسے ہی حضرت مسیح کو اس وقت ان میں کوئی خاص بات نہ تھی جو بطور جسم کے الگ ہو۔ یعنی ان کا تو جسم ہو اور حضرت یحییٰ کی مجرد رُوح ہو۔ جب قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح شہادت موجود ہے پھر یہ نرالا جسم کیسا؟ اگر نرالا نہیں تو بسم اللہ ہم ایمان لاتے ہیں کہ وہ جسم جو مرنے کے بعد دیا جاتا ہے وہ مسیح کو بھی دیا گیا۔ پھر نزاع لفظی نکلی۔ یہ ہم کبھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ مسیح کو کوئی الگ جسم دیا جاوے کیونکہ یہ شرک ہے۔ ہم جسم کے قائل ہیں لیکن اس جسمِ عنصری کے قائل نہیں۔ انجیل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلالی جسم تھا اور ایسا جسم مرنے کے بعد ملتا ہے۔ ہمارا مذہب یہی ہے کہ بہشت میں بھی جسم ہوں گے۔

نعماءِ بہشت کی حقیقت

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ جو لکھا ہے کہ بہشت میں دُودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہاں گایوں کا ایک گلّہ ہوگا اور بہت سارے گوالے ہوں گے جو دُودھ دوہ دوہ کر ایک نہر میں ڈالتے رہیں گے یا بہت سے چھتے شہد کی مکھیوں کے ہوں گے اور پھر ان کا شہد جمع کر کے نہروں میں گرایا جاوے گا۔ یہ مطلب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو مجھ پر ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات نہ ہوگی۔ اگر یہی خربوزہ اور تربوز یا انار ہوں گے تو پھر یہ بات ہی کیا ہوئی؟ کافر بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے یہاں اس دنیا میں کھا لیے۔ تم نے آگے جا کر کھائے۔ اس کی حقیقت جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھولی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (البقرۃ: ۲۶) یعنی جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل بجالاتے ہیں وہ ان باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اس آیت میں بہشت کی حقیقت اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ گویا جو رشتہ نہروں کو باغ کے ساتھ ہے۔ وہی تعلق اور رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جس طرح پر کوئی باغ یا درخت بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح پر کوئی ایمان

بغیر اعمالِ صالحہ کے زندہ اور قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر ایمان ہو اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو ایمان ایک ہیچ ہے اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہو تو وہ اعمال ریاکاری ہیں۔ پس قرآن شریف نے جو بہشت پیش کیا ہے اس کی حقیقت اور فلاسفی یہی ہے کہ وہ اس دُنیا کے ایمان اور اعمال کا ایک ظل ہے اور ہر شخص کی بہشت اس کے اپنے اعمال اور ایمان سے شروع ہوتی ہے اور اس دُنیا میں ہی اس کی لذت محسوس ہونے لگتی ہے اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ اور نہریں نظر آتی ہیں۔ لیکن عالمِ آخرت میں یہی باغ کھُلے طور پر محسوس ہوں گے اور ان کا ایک خارجی وجود نظر آجائے گا۔ قرآن شریف سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کی آبپاشی اعمالِ صالحہ سے ہوتی ہے بغیر اس کے وہ خشک ہو جاتا ہے۔ پس یہاں دو باتیں بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ بہشت باغ ہے۔ دوسرا ان درختوں کی نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے۔ قرآن شریف کو پڑھو اور اوّل سے آخر تک اس پر غور کرو تب اس کا مزہ آئے گا کہ حقیقت کیا ہے۔ ہم مجاز اور استعارہ ہرگز پیش نہیں کرتے بلکہ یہ حقیقت الامر ہے۔ وہ خدا تعالیٰ جس نے عدم سے انسان کو بنایا ہے اور جو خلقِ جدید پر قادر ہے وہ یقیناً انسان کے ایمان کو اشجار سے متمثّل کر دے گا اور اعمال کو انہار سے متمثّل کرے گا اور واقعی طور پر دکھا دے گا یعنی ان کا وجود فی الخارج بھی نظر آئے گا۔

اس کی مختصر سی مثال یوں بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جیسے انسان خواب میں عمدہ اور شیریں پھل کھاتا ہے اور ٹھنڈے اور خوشگوار پانی پیتا ہے اور فی الواقعہ وہ پھل اور آبِ سرد ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن میں کوئی دوسرا امر نہیں ہوتا۔ پھلوں کو کھا کر سیری ہوتی اور پانی پی کر فی الواقعہ پیاس دُور ہوتی ہے لیکن جب اُٹھتا ہے تو نہ اُن پھلوں کا کوئی وجود ہوتا ہے اور نہ اس پانی کا۔ اسی طرح پر جیسے اس حالت میں اللہ تعالیٰ ان اشیاء کا ایک وجود پیدا کر دیتا ہے۔ عالمِ آخرت میں بھی ایمان اور اعمالِ صالحہ کو اس صورت میں متمثّل کر دیا جائے گا۔ اسی لیے فرمایا ہے۔ هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ (البقرۃ: ۲۶) اس کے اگر یہ معنے کریں کہ وہ جنتی جب ان پھلوں اور میووں کو کھائیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ وہ پھل اور خربوزے یا تربوز یا انار ہیں جو ہم نے دُنیا میں کھائے تھے تو یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح پر تو وہ لذّت بخش چیز نہیں ہو سکتے اور نعماءِ جنّت کی حقارت ہے۔ اگر کوئی شخص مثلاً کشمیر میں جاوے اور وہاں کی ناشپاتیاں کھا کر کہے کہ یہ تو وہی ناشپاتیاں ہیں جو پنجاب میں کھائی تھیں تو صریح ان ناشپاتیوں کی حقارت ہے۔ پس اگر بہشت کی نعماء کی بھی یہی مثال ہے تو یہ خوشی نہیں بلکہ اُن سے بیزاری ہے۔ اس لیے اس کا یہ مفہوم اور مطلب نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بہشتی لوگ جو اس دُنیا میں بڑے عابد اور زاہد تھے جب وہ اپنے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے

متمثلات سے لطف اُٹھائیں گے تو اُن کو وُہ ایمانی لذت آجائے گی اور ان مجاہدات اور اعمال صالحہ کا مزا آجائے گا جو اس عالم میں انہوں نے کئے تھے اس لیے وہ کہیں گے ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرۃ:۲۶)

محبت الٰہی کی لذات

غرض جس قدر قرآن شریف کو کوئی تدبر اور غور سے پڑھے گا اسی قدر وہ اس حقیقت کو سمجھ لے گا کہ ان لذات کا تمثیلی رنگ میں فائدہ اٹھائے گا محبت الٰہی کی لذات ہیں۔ لذت کا لفظ جو مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے وہ جسمانی لذت کے مفہوم سے ہزارہا درجہ زیادہ رُوحانی لذت میں رکھتا ہے۔ اگر اس کی محبت کی لذت میں غیر معمولی سیری اور سیرابی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے محب جسمانی لذات کو ترک کیوں کریں۔ یہاں تک کہ بعض اس قسم کے بھی ہو گذرے ہیں جنہوں نے سلطنت تک کو چھوڑ دیا چنانچہ ابراہیم ادھم نے سلطنت چھوڑ دی۔ اور انبیاء علیہم السّلام نے ہزاروں لاکھوں مصائب کو برداشت کیا۔ اگر وہ لذت اور ذوق اس محبت الٰہی کی تہہ میں نہ تھا جو انہیں کشاں کشاں لیے جاتا تھا تو پھر کیا بات تھی کہ اس قدر مصائب کو انہوں نے خوشی کے ساتھ اُٹھا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس درجہ میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لیے آپؐ کی زندگی کا نمونہ بھی سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دُنیا کی ساری نعمتیں اور عزتیں پیش کیں۔ مال و دولت، سلطنت، عورتیں۔ اور کہا کہ آپؐ ہمارے بتوں کی مذمت نہ کریں۔ اور یہ توحید کا مذہب پیش نہ کریں۔ اس خیال کو جانے دیں۔ وہ دُنیا دار تھے۔ ان کی نظر دنیا کی فانی اور بے حقیقت لذتوں سے پرے نہ جا سکتی تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ تبلیغ انہیں اغراض کے لیے ہوگی مگر آپؐ نے ان ساری باتوں کو ردّ کر دیا۔ اور کہا کہ اگر دائیں بائیں آفتاب اور ماہتاب بھی لاکر رکھ دو تب بھی مَیں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر اس کے بالمقابل انہوں نے آپؐ کو وہ تکالیف پہنچائیں جن کا نمونہ کسی دوسرے شخص کی تکالیف میں نظر نہیں آتا۔ لیکن آپؐ نے ان تکالیف کو بڑی لذت اور سرور سے منظور کیا، مگر اس راہ کو نہ چھوڑا۔ اب اگر کوئی لذت اور ذوق نہ تھا تو پھر کیا وجہ تھی جو ان مصائب اور مشکلات کو برداشت کیا؟ وہ وہی لذت تھی جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں ملتی ہے اور جس کی مثال اور نمونہ کوئی پیش نہیں کیا جا سکتا۔

جماعت کے قیام کا مقصد محبتِ الٰہی کو پیدا کرنا ہے

خدا تعالیٰ نے اس وقت ایک صادق کو بھیج کر چاہا ہے کہ ایسی جماعت تیار کرے جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ بعض کچے لوگ داخل ہو جاتے ہیں اور پھر ذرا سی دھمکی ملتی ہے اور لوگ ڈراتے ہیں تو پھر خط لکھ دیتے ہیں کہ کچھ تقیہ کر لیا ہے۔ بتاؤ انبیاء علیہم السلام

اس قسم کے تقیہ کیا کرتے ہیں؟ کبھی نہیں۔ وہ دلیر ہوتے ہیں اور انہیں کسی مصیبت اور دُکھ کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ جو کچھ لے کر آتے ہیں اسے چھپا نہیں سکتے خواہ ایک شخص بھی دُنیا میں ان کا ساتھی نہ ہو۔ وہ دنیا سے پیار نہیں کرتے۔ ان کا محبوب ایک ہی خدا ہوتا ہے۔ وہ اس راہ میں ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ قتل ہوں اس کو پسند کرتے ہیں۔ اس سے سمجھ لو کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلق کا مزا اور لُطف نہیں تو پھر یہ گروہ کیوں مصائب اٹھاتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو پڑھو کہ کفار نے کس قدر دُکھ آپؐ کو دیئے۔ آپؐ کے قتل کا منصوبہ کیا گیا۔ طائف میں گئے تو وہاں سے خون آلود ہو کر پھرے۔ آخر مکہ سے نکلنا پڑا۔ مگر وہ بات جو دل میں تھی اور جس کے لیے آپؐ مبعوث ہوئے تھے اُسے ایک آن کے لیے بھی نہ چھوڑا۔

یہ مصائب اور تکالیف کبھی برداشت نہیں ہو سکتیں جب تک اندرونی کشش نہ ہو۔ ایک غریب انسان کے لیے دو چار دشمن بھی ہوں وہ تنگ آ جاتا ہے اور آخر صلح کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر وہ جس کا سارا جہاں دشمن ہو وہ کیونکر اس بوجھ کو برداشت کرے گا۔ اگر قوی تعلق نہ ہو۔ عقل اس کو قبول نہیں کرتی۔

مختصر یہ کہ خدا تعالیٰ کی محبت کی لذت ساری لذتوں سے بڑھ کر ترازو میں ثابت ہوتی ہے پس وہ لذات جو بہشت میں ملیں گی۔ یہ وہی لذتیں ہیں جو پہلے اُٹھا چکے ہیں۔ اور وہی ان کو سمجھتے ہیں جو پہلے اٹھا چکے ہیں۔

نعماءِ جنت کیونکر ہوں گی

اگر کہو کہ وہ نعمتیں کیوں کر ہوں گی؟ تو اس کا جواب صاف ہے۔ اللہ تعالیٰ خلقِ جدید پر قادر ہے۔ خود انسان کا اپنا وجود بھی خیالی ہے۔ جس قطرہ سے پیدا ہوتا ہے وہ کیا چیز ہے؟ پھر خیال کرو کہ اس سے کیسا اچھا انسان بناتا ہے۔ کیسے عقلمند، خوب صورت۔ بہادر۔ پھر وہی خدا ہے جو دوسرے عالم میں خلقِ جدید کرے گا۔ دیکھنے میں وہ لذات اور میوہ جات ہمرنگ ہوں گے لیکن کھانے میں ایسے لذیذ ہوں گے کہ نہ کسی آنکھ نے ان کو دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی زبان نے ان کو چکھا اور نہ وہ کسی خیال میں گذرے۔

بہشت کی لذات کی کیفیت

بہشت کی لذات میں ایک اور بھی خوبی ہے جو دُنیا کی لذتوں میں اور جسمانی لذتوں میں نہیں ہے۔ مثلاً انسان روٹی کھاتا ہے تو دوسری لذتیں اسے یاد نہیں رہتی ہیں۔ مگر بہشت کی لذات نہ صرف جسم ہی کیلئے ہوں گی بلکہ رُوح کے لیے بھی لذت بخش ہوں گی۔ دونوں لذتیں اس میں اکٹھی ہوں گی اور پھر اس

میں کوئی کثافت نہ ہوگی اور سب سے بڑھ کر جو لذت ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا مگر دیدارِ الٰہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہاں ہی سے تیاری ہو۔ اور اس کے دیکھنے کے لیے یہاں ہی سے انسان آنکھیں لے جاوے۔ جو شخص یہاں تیاری کر کے نہ جاوے گا وہ وہاں محروم رہے گا چنانچہ فرمایا مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖۤ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی (بنی اسرائیل: ۷۳) اس کے یہ معنے نہیں کہ جو لوگ یہاں نابینا اور اندھے ہیں وہ وہاں بھی اندھے ہوں گے۔ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ دیدارِ الٰہی کے لیے یہاں سے حواس اور آنکھیں لے جاوے اور ان آنکھوں کے لیے ضرورت ہے تبتّل کی، تزکیۂ نفس کی اور یہ کہ خدا تعالیٰ کو سب پر مقدم کرو۔ اور خُدا تعالیٰ کے ساتھ دیکھو، سُنو اور بولو۔ اسی کا نام فنا فی اللہ ہے اور جبتک یہ مقام اور درجہ حاصل نہیں ہوتا نجات نہیں۔

خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

ہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق قوی اور محبت صافی تب ہو سکتی ہے جب اس کی ہستی کا پتہ لگے۔ دُنیا اس قسم کے شبہات کے ساتھ خراب ہوتی ہے۔ بہت سے تو کھلے طور پر دہریہ ہو گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو دہریہ تو نہیں ہوئے مگر ان کے رنگ میں رنگین ہیں اور اسی وجہ سے دین میں سُست ہو رہے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے رہیں تا ان کی معرفت زیادہ ہو اور صادقوں کی صحبت میں رہیں جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی قُدرت اور تصرف کے تازہ بتازہ نشان دیکھتے رہیں۔ پھر وہ جس طرح پر چاہے گا اور جس راہ سے چاہے گا معرفت بڑھا دے گا اور بصیرت عطا کرے گا اور ثلجِ قلب ہو جاتے گا۔

یہ بالکل سچ ہے کہ جس قدر اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی عظمت پر ایمان ہوگا۔ اسی قدر اللہ تعالیٰ سے محبت اور خوف ہوگا ورنہ غفلت کے ایام میں جرائم پر دلیر ہو جاتے گا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کی عظمت اور جبروت کا رُعب اور خوف ہی دو ایسی چیزیں ہیں جن سے گناہ جل جاتے ہیں اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان جن اشیاء سے ڈرتا ہے، پرہیز کرتا ہے۔ مثلاً جانتا ہے کہ آگ جلا دیتی ہے اس لیے آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ یا مثلاً اگر یہ علم ہو کہ فلاں جگہ سانپ ہے تو اس راستہ سے نہیں گذرے گا۔ اسی طرح اگر اس کو یہ یقین ہو جاوے کہ گناہ کا زہر اس کو ہلاک کر دیتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی عظمت سے ڈرے اور اس کو یقین ہو کہ وہ گناہ کو ناپسند کرتا ہے اور گناہ پر سخت سزا دیتا ہے تو اس کو گناہ پر دلیری اور جرأت نہ ہو۔ زمین پر پھر اس طرح سے چلتا ہے جیسے مُردہ چلتا ہے۔ اس کی رُوح ہر وقت خدا تعالیٰ کے پاس ہوتی ہے۔

یہ امور ہیں جو ہم اپنی جماعت میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی ہی اشاعت ہمارا مقصود ہے۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں اور کھول کر کہتا ہوں کہ انہیں امور کی پابندی سے مسلمان مسلمان ہوں گے اور اسلام دُوسرے ادیان پر غالب آئے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ مسیح کی موت یا مسیح موعود ہونے کے امور کو ہماری راہ میں نہ ڈال دیتا تو ہمیں کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ عیسیٰ کہلاتے مگر مَیں کیا کر سکتا ہوں۔ جب خود اس نے مجھے اس نام سے پکارا اور اس کی اشاعت اور اعلان پر مجھے حکم دیا۔ مَیں خوب جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے لیے مجھے عیسیٰ کہلانے کی کچھ بھی حاجت نہ تھی اور منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے اس کی کچھ بھی حاجت نہیں اور نہ قرآن شریف میں یہ لکھا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی چاہا اور اس لیے چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور عظمت کا اظہار ہو اور ایک عاجز انسان جس کو غلطی سے خدا بنا لیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت دنیا پر کُھل جاوے۔

اللہ تعالیٰ کی برکات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض بند نہیں ہوں گے

مَیں یہ بھی ظاہر کرتا ہوں کہ ہم نیکی کے ثمرات کو محدود نہیں کرتے اور نہ خدا تعالیٰ کے فضل اور فیوض کی حد بندی کرتے ہیں کہ وہ اب ختم ہو گئے ہیں اور کسی دوسرے کو نہیں مِل سکتے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی بات کی کمی نہیں ہے اور کوئی شخص بھی جو مجاہدہ کرے اور اس راہ پر جو اس نے بتائی ہے چلے محروم نہیں رہ سکتا۔ ہاں یہ بالکل سچ ہے کہ جو کچھ ملے گا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اور کامل اطاعت اور اتباع سے ملے گا۔ اگر یہ مان لیا جاوے کہ بس اب خدا تعالیٰ کے برکات کا دروازہ بند ہے تو اللہ تعالیٰ کو یا تو بخیل ماننا پڑے گا اور یا یہ کہنا پڑے گا کہ خاتمہ ہو گیا۔ مگر سبحان ربی۔ وہ اس قسم کے نقصوں سے پاک ہے۔ جو شخص سچے دل سے خدا تعالیٰ کے حضور آتا ہے وہ خالی نہیں جاتا۔ پاکیزہ قلب ہونے کی ضرورت ہے ورنہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ: ۶-۷) کی تعلیم اور تاکید بے فائدہ ہو جاتی ہے۔ اگر وہ انعام اکرام اب کسی کو ملنے ہی نہیں ہیں تو پھر پانچ وقت اس دُعا کے مانگنے کی کیا حاجت ہے؟ یہ بڑی غلطی ہے جو مسلمانوں میں پھیل گئی ہے، حالانکہ یہی تو اسلام کا حُسن اور خوبی تھی کہ اس کے برکات اور فیوض اور اس کی پاک تعلیم کے ثمرات تازہ بتازہ بہت مِل سکتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کے ثمرات

تمام صوفیوں اور اکابرانِ اُمت کا یہی مذہب ہے بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ

کامل متبع ہو سکتا ہی نہیں۔ جب تک بروزی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کو اپنے اندر نہ رکھتا ہو اور حقیقت میں یہ بات صحیح بھی ہے کیونکہ کامل اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لازم ہے کہ اس کے ثمرات اپنے اندر پیدا کرے۔ جب ایک شخص کامل اطاعت کرتا ہے اور گویا اطاعتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں محو اور فنا ہو کر گُم ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے ایک شیشہ جو مصفّا کیا ہوا ہو اور تمام و کمال عکس اس میں پڑے۔

مَیں کبھی اللہ تعالیٰ کے فضل اور برکات اور ان تاثیرات کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع سے ملتی ہیں محدود نہیں کر سکتا بلکہ ایسا خیال کرنا کفر سمجھتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ بہشت میں ایک مقام ہے جو مجھے ہی ملے گا۔ ایک صحابی یہ سُنکر رو پڑا۔ آپؐ نے جو پُوچھا کہ تُو کیوں رو پڑا؟ تو اس نے کہا یا رسُول اللہ مجھے آپؐ کے ساتھ محبت ہے۔ جب آپؐ اس مقام میں ہوں گے تو مَیں کہاں ہوں گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ تُو میرے ساتھ ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے اس کے وجود کو اپنے اندر لے لیا۔

غرض یہ یقیناً یاد رکھو کہ کامل اتباع کے ثمرات ضائع نہیں ہو سکتے۔ یہ تصوف کا مسئلہ ہے۔ اگر ظلّی مرتبہ نہ ہوتا تو اولیاءِ امت تو مر جاتے۔ یہی کامل اتباع اور بروزی اور ظلّی مرتبہ ہی تو تھا جس سے بایزیدؒ محمد کہلایا اور اس کہنے پر ستّر مرتبہ کفر کا فتویٰ ان کے خلاف دیا گیا اور انہیں شہر بدر کیا گیا۔

مختصر یہ کہ لوگ ہماری مخالفت کرتے ہیں انہیں اس بات کا علم نہیں اور وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کاش وہ ان حالی کیفیات سے واقف ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر اور حقیقت ان لوگوں نے سمجھی ہی نہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی تاثیرات اور ثمرات بھی باقی نہیں ہیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ثبوت ہی کیا ہے؟ اور اسلام کی فضیلت ہی کیا؟ اور اس شریعت کے اتباع کی حاجت ہی کیا جبکہ اس کے نتائج اور برکات ہم کو مل نہیں سکتے۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ ایک بیہودہ اور کفریہ خیال ہے۔ اسلام کی اتباع کے ثمرات اب بھی اور ہمیشہ مل سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات میں بخل نہیں اور نہ اس کے ہاں کسی بات کی کمی۔

بعض آدمی اپنی بیوقوفی اور شتابکاری سے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ کیا ہم نے ولی بننا ہے۔ میرے نزدیک ایسے لوگ کفر کے مقام پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو سب کو ولی کہتا ہے اور سب کو ولی بنانا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی ہدایت کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ تم منعَم علیہ گروہ کی مانند ہو جاؤ۔ جو کہتا ہے کہ مَیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اللہ تعالیٰ پر بخل کی تہمت لگاتا ہے اور اس لیے یہ

کلمہ کفر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا مقام تو یہ تھا کہ آپ محبوب الٰہی تھے۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے دوسرے لوگوں کو بھی اس مقام پر پہنچنے کی راہ بتائی جیسا کہ فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران : ۳۲) یعنی ان کو کہہ دو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ محبوب الٰہی بن جاؤ تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنا لے گا۔ اب غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع محبوب الٰہی بنا دیتی ہے تو پھر اور کیا چاہیے؟ مگر اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو شناخت نہیں کیا۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (الانعام : ۹۲)۔

ایسا ہی شیعہ ہیں۔ انہوں نے فقط اتنا ہی سمجھ لیا ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے رو پیٹ لینا ہی نجات کے واسطے کافی ہے۔ یہ کبھی ان کو خواہش نہیں ہوتی کہ ہم امام حسین رضی اللہ عنہ کی اتباع میں ایسے کھوئے جاویں کہ خود حسین بن جاویں! حالانکہ اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اس وقت تک نجات نہیں جب تک انسان نبی کا روپ نہ ہو جاوے۔ وہ انسان جو اپنے مراتب اور مدارج میں ترقی نہیں چاہتا وہ مخنثوں کی طرح ہے۔ مَیں کھول کر کہتا ہوں کہ جس قدر انبیاء و رسل گذرے ہیں ان سب کے کمالات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے آنے کی غرض اور غایت ہی یہی تھی کہ لوگ اس نمونہ اور اُسوہ پر چلیں۔

موت و حیاتِ مسیح کا مسئلہ

یہ امور ہیں جن کی وجہ سے ہم کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ موت و حیاتِ مسیح کا مسئلہ تو یُونہی راہ میں آگیا۔ بہت سے مصالح الٰہی تھے جو یہ مسئلہ پیش آگیا؛ ورنہ اصل مقاصد اور اغراض ہماری بعثت کے اور ہیں۔ ہاں یہ مسئلہ چونکہ تعلیمِ الٰہی کے خلاف تھا۔ اور اس میں توحید کے مصفّٰی چشمہ کو مکدّر کرنے والے اجزا موجود تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ازالہ کر دیا اور صاف کر دیا کہ سب نبی فوت ہو گئے ہیں۔ مسیح علیہ السلام میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو دُوسرے نبیوں کو نہ ملی ہو۔

مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ مسیح جسم کے ساتھ آسمان پر گیا ہے۔ لیکن مَیں یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ دوسرے نبی جسم کے بغیر آسمان پر گئے ہیں۔ جس قسم کے جسم ان کو عطا ہوئے ہیں وہی جسم مسیح کو دیا گیا ہے اور یہ وہ جسم ہے جو مرنے کے بعد عطا ہوتا ہے۔ یہ پرانی باتیں ہیں نئی نہیں۔ چونکہ انہوں نے قرون ثلاثہ کی باتیں بُھلا دی ہیں۔ اس لیے بار بار کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادے غلطی پر تھے۔ مَیں نہیں کہتا کہ وہ غلطی پر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ وہ زمانہ فیج اعوج ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل پر بھی کفار ایسا ہی کہتے تھے کہ یہ ہمارے باپ دادوں کے خلاف ہے۔ یہ باپ دادوں کی سند صحیح نہیں ہو سکتی۔ ایک زمانہ قرونِ ثلاثہ کے بعد گذرا ہے جس کو شیطانی زمانہ کہتے ہیں یہ درمیانی زمانہ ہزار سال

سال کا زمانہ ہے۔ جس قدر خرابیاں اور فسق و فجور پھیلا ہے۔ اس زمانہ میں ہی پھیلا ہے۔ اگر صحابہ کرامؓ ہوتے تو وہ بھی شناخت نہ کرسکتے۔ اس زمانہ کا تو حوالہ دینا ہی عقلمندی نہیں۔ وفاتِ مسیح کا مسئلہ تو ایسا صاف ہو چکا ہے کہ اب کوئی عقل اس کے خلاف تجویز نہیں کرسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ فوت ہو گئے۔ خود مسیح نے اپنی وفات کا اقرار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو مُردوں میں دیکھا اور پھر صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پہلا اجماع اسی پر کیا اور فیصلہ کر دیا۔ صحابہؓ کا اجماع غلطی پر نہیں ہو سکتا کیونکہ صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے کی فضیلت ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران : ۱۴۵) میں کہتے ہیں کہ خَلَتْ کے معنے موت کے نہیں۔ مگر یہ تو ان کی غلطی ہے اس لیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے خَلَتْ کے معنے کر دیئے ہیں اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (آل عمران : ۱۴۵) اگر اس کے سوا کوئی اور معنے ہوتے جو یہ کرتے ہیں تو پھر رفع الجسد العنصری بھی ساتھ ہوتا۔ مگر قرآن شریف میں تو ہے نہیں پھر ہم کیونکر تسلیم کریں۔ ایسی صورت میں درمیانی زمانہ کی شہادت کو ہم کیا کریں؟ اور پھر تعجب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی اسی مذہب کے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اس کی وفات کا اقرار کیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اگر میرا نام عیسٰے رکھا تو اس میں اسلام کا کیا بُرا ہوا؟ یہ تو اسلام کا فخر ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فخر ہوا کہ وہ شخص جسے چالیس کروڑ انسان خدا سمجھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کا ایک فرد ان کمالات کو پا لیتا ہے بلکہ اس سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے لکھا ہے کہ ہارون رشید نے مصر کا علاقہ ایک حبشی کو دیدیا۔ کسی نے پُوچھا تو جواب دیا کہ یہ وہی مصر ہے جس کی حکومت سے فرعون نے خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اسی طرح پر مسیح کی خدائی پر زد مارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے مسیح بنا دیا تا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علوِّ شان اس سے ظاہر ہو۔

مَسِّ شیطان کی حقیقت

مَیں حیران ہوتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں نے مسیح کو بہت سی خصوصیتیں ایسی دے رکھی ہیں جو اَور کسی کو نہیں دی گئیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ مَسِّ شیطان سے وہی پاک ہے حالانکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ کسی نبی کو بھی مَسِّ شیطان نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کے راستباز اَور صادق بندوں میں سے بھی کسی کو مَسِّ شیطان نہیں ہوتا۔ مطلب اس سے اَور تھا۔ اور انہوں نے کچھ اور سمجھ لیا۔ اگر صاف یہ اعتقاد رکھا جاوے کہ مسیح ہی مَسِّ شیطان سے پاک تھے اور کوئی پاک نہ تھا تو یہ تو کلمۂ کفر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہودی مریم علیہا السلام کو معاذ اللہ زانیہ اور حضرت مسیح کو نعوذ باللہ ولد الزنا

کہتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کے اس الزام سے بریت کی اور مریم کا نام صدیقہ رکھا۔ اور حضرت مسیح کے لیے کہا کہ وہ مسِ شیطان سے پاک ہے۔

اولاد دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو مسِ شیطان سے ہو وہ ولد الحرام کہلاتی ہے۔ دوسری وہ جو رُوح القدس کے مَس سے ہو۔ وہ ولد الحلال ہوتی ہے۔ یہودیوں کا اس پر زور تھا کہ مسیح پر ناجائز پیدائش کا الزام لگاتے تھے اور ان کے ہاں یہ لکھا تھا کہ ولد الحرام سات پُشت تک بھی خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ان کے اس شبہ اور الزام کا جواب ضروری تھا۔ اس لیے ان کے متعلق یہ کہا گیا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مَسِ شیطان سے پاک نہ تھے۔ ایسا اعتقاد کُفر صریح ہے۔ کیا کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت آمنہ کی نسبت ایسا الزام لگایا؟ کبھی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ مخالفوں نے امین اور صادق تسلیم کیا۔ برخلاف اسکے مسیح اور ان کی والدہ کی نسبت یہودیوں کے بیہودہ الزام تھے۔ خود عیسائیوں نے انسائیکلوپیڈیا میں مان لیا ہے کہ نعوذ باللہ وہ ولد الحرام تھے۔ پھر ایسی صورت میں کس قدر ضروری تھا کہ اس کا ازالہ ہوتا۔ اب یہ ہمارے مخالف اندھے ہو کر ان کی خصوصیت بتاتے ہیں اور منبروں پر چڑھ کر بیان کرتے ہیں؛ حالانکہ یہ تو حضرت مسیح کا ایک داغ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دھویا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ مثلاً اگر ایک شخص کے چہرہ پر سیاہی کا داغ ہو اور اسے صاف کر دیا جاوے تو یہ کیسی حماقت ہو کہ ایک شخص جس کے چہرہ پر وہ داغ ہی نہیں بلکہ خوبصورت اور روشن چہرہ رکھتا ہو اس سے اس سیاہی کے داغ والے کو افضل کہا جاوے۔ صرف اس لیے کہ اس کا داغ صاف ہوا ہے۔

اس قسم کی غلطیوں میں ہمارے مخالف مبتلا ہیں۔ ہم ان پر صبر کرتے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور ملت پر زد نہ ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تو جب آسمان پر جانے کا معجزہ مانگا جاوے تو انہیں قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ (بنی اسرائیل: ۹۴) کا جواب ملے اور مسیح کیلئے تجویز کر لیا جاوے کہ وہ آسمان پر چڑھ گئے۔

ایسی خصوصیتوں کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اسے خدا بنایا جاوے۔ پھر توحید کہاں رہی؟ انہوں نے تو ان چالیس کروڑ کی مدد کی جو اسے خدا بنا رہے ہیں۔ افسوس ان لوگوں نے اصل شریعت کو چھوڑ دیا اور عجوبہ پسند ہو گئے۔

احیاءِ موتیٰ کا مسئلہ

میرے متعلق یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ مسیح نے مُردے زندہ کئے تھے انہوں نے کتنے کئے ہیں؟ میں اس کا کیا جواب دوں۔ پہلے یہ تو معلوم

کریں کہ مسیح نے کتنے مُردے زندہ کئے تھے؟ پھر اس کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ مجھ سے پہلے ہے میں تو آپؐ کا ایک خادم ہوں۔ آپؐ کے پاس ایک مُردہ کی بابت کہا گیا جس کو سانپ نے کاٹا تھا اور کہا کہ اس کی نئی شادی ہوئی ہے آپ اسے زندہ کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔ کہ اپنے بھائی کو دفن کرو۔

اگر حقیقی مُردے زندہ ہو سکتے تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزہ دیا جاتا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ بعض اوقات سخت امراض میں مبتلا اور ایسی حالت میں کہ اس میں آثارِ حیات مفقود ہوں اللہ تعالیٰ اپنے ماموروں اور مرسلوں کی دعاؤں کی وجہ سے انہیں شفا دے دیتا ہے۔ اس قسم کا احیاء ہم مانتے ہیں اور یہاں بھی ہوا ہے اور اس کے سوا دوسری حیات رُوحانی حیات ہے۔ غرض یہ دو قسم کا احیاء موتیٰ ہم مانتے ہیں۔ رُوحانی طور پر مسیح کا اثر بہت کم ہوا کیونکہ یہودیوں نے مانا نہیں اور جنہوں نے مانا اور ان کی تکمیل نہ ہوئی۔ ایک نے لعنت بھیج دی، دوسرے نے پکڑوا دیا اور باقی بھاگ گئے۔ ہاں جسمانی طور پر بعض کے لیے دعائیں کیں اور وہ مریض اچھے ہو گئے۔ اب بھی ہو رہے ہیں۔

غرض ہماری اصل غرض اور مقصد اور تعلیم وہ ہے جس کا میں ذکر کر آیا ہوں۔ یہ امور وفاتِ مسیح وغیرہ ہماری راہ میں آ گئے جو مشرکین کا غلبہ توڑنے کے لیے مصلحتِ الٰہی نے ایسا ہی پسند فرمایا کہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے آخری سلسلہ میں مسیح آیا تھا ویسے ہی یہاں بھی ضروری تھا کہ مسیح آتا چنانچہ آ گیا۔

بعض یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مثیلِ موسیٰ تھا اس لیے یہاں بھی مثیلِ مسیح ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہاں موسیٰ ہوتا تو شُبہ پڑ جاتا۔ لیکن یہاں الیاس کی نظیر موجود تھی اس لیے یہاں مسیح ہی کہہ دیا۔

اصل مقصد فرمایا:

ہماری جماعت کو قیل و قال پر محدود نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اصل مقصد نہیں۔ تزکیہ نفس اور اصلاح ضروری ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور کیا ہے[1]

خواب کی حقیقت خواب کی فلاسفی بیان کرنے کی خاطر ایڈیٹر صاحب "الحکم" نے حضرت

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ صفحہ ۵ تا ۱۲ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء

مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک مکتوب گرامی حاشیہ میں شائع کیا ہے، جو درج ذیل ہے۔ یہ مکتوب کس کے نام تھا۔ اس کا ایڈیٹر صاحب نے ذکر نہیں کیا۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مشفقی مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی خواب کے آثار یوں ہی نظر آتے ہیں کہ انشاء اللہ رؤیا صالحہ و واقعہ صحیح ہوگا۔ مگر اس بات کے لیے کہ مضمونِ خواب حیزِ قوت سے حدِ فعل میں آوے بہت سی محنتیں درکار ہیں۔ خواب کے واقعات اس پانی سے مشابہ ہیں کہ جو ہزاروں من مٹی کے نیچے زمین کی تہہ تک میں واقع ہے جس کے وجود میں تو کچھ شک نہیں لیکن بہت سی جانکنی اور محنت چاہیے تا وہ مٹی پانی کے اوپر سے بکلی دور ہو جاتے اور نیچے سے پانی شیریں اور مصفا نکل آوے۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ صدق اور وفا سے خدا تعالیٰ کو طلب کرنا موجب فتحیابی ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (العنکبوت : ۷۰)

گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر
آرے شود ولیک بخونِ جگر شود
گرچہ وصالش نہ بکوشش دہند
ہر قدر اے دل کہ توانی بکوش

آپ کی ملاقات کے لیے میں بھی چاہتا ہوں مگر وقت مناسب کا منتظر ہوں۔ بے وقت حج بھی فائدہ نہیں کرتا۔ اکثر حاجی جو بڑی خوشی سے حج کرنے کو جاتے ہیں اور پھر دل سخت ہو کر آتے ہیں۔ اس کا یہی باعث ہے کہ انہوں نے بے وقت بیت اللہ کی زیارت کی اور بجز ایک کوٹھہ کے اور کچھ نہ دیکھا اور اکثر مجاورین کو صدق اور صلاح پر نہ پایا۔ دل سخت ہو گیا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ملاقاتِ جسمانی سے بھی کئی قسم کے ابتلاء پیش آجاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

آپ کے سوالات کا جواب جو اس وقت میرے خیال میں آتا ہے، مختصر طور پر عرض کیا جاتا ہے۔

آپ نے پہلا سوال یہ کیا ہے کہ پورا پورا علم جیسا بیداری میں ہوتا ہے۔ خواب میں کیوں نہیں ہوتا۔ اور خواب کا دیکھنے والا اپنی خواب کو خواب کیوں نہیں سمجھتا؟ سو آپ پر واضح ہو کہ خواب اس حالت کا نام ہے جب بباعثِ غلبۂ رطوبتِ مزاجی جو دماغ پر طاری ہوتی ہے۔ حواس ظاہری و باطنی اپنے کاروبار معمولی سے معطل ہو جاتے ہیں۔ پس جب خواب کو تعطل حواس لازم ہے تو ناچار جو علم اور امتیاز اور تیقظ بذریعہ حواس انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ حالتِ خواب میں بباعث تعطل حواس نہیں رہتا کیونکہ جب حواس

بوجہ غلبہ رطوبت مزاجی معطل ہوجاتے ہیں تو بالضرورت اس فعل میں بھی فتور آجاتا ہے پھر بعلت اس فتور کے انسان نہیں سمجھ سکتا کہ مَیں خواب میں ہوں یا بیداری میں لیکن ایک اور حالت ہوتی ہے کہ جس سے اربابِ طلب اور اصحابِ سلوک کبھی کبھی متمتع اور محظوظ ہوجاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ بباعث دوام مراقبہ و حضور و استیلاءِ شوق و غلبۂ محبت ایک حالت غیبت حواس ان پر وارد ہوجاتی ہے جس کا یہ باعث نہیں ہوتا کہ دماغ پر رطوبت مستولی ہو بلکہ اس کا باعث صرف ذکر اور شہود کا استیلاء ہوتا ہے۔ اس حالت میں چونکہ تعطل حواس بہت کم ہوتا ہے۔ اس جہت سے انسان اس بات پر متنبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی قدر بیدار ہے خواب میں نہیں اور نیز اپنے مکان اور اس کی تمام وضع پر بھی اطلاع رکھتا ہے۔ یعنی جس مکان میں ہے اس مکان کو برابر شناخت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگوں کی آواز بھی سنتا ہے اور کل مکان کو بچشمِ خود دیکھتا ہے۔ صرف کسی قدر بجذبہ غیبی غیبتِ حس ہوتی ہے۔ اور جو انسان خواب کی حالت میں اپنی رؤیا میں اپنے تئیں بیدار معلوم کرتا ہے۔ یہ علم بذریعہ حواس نہیں بلکہ اس علم کا منشاء فقط رُوح ہے۔

دُوسرا سوال آپ کا یہ ہے کہ فناءِ اتم اَعنی غایت المواج و نہایت الوصال میں علم حق رہتا ہے یا نہیں۔

اوّل سمجھنا چاہیئے کہ فنا اتم عین وصال کا نام نہیں۔ بلکہ امارات اور آثارِ وصال میں سے ہے کیونکہ فنا اتم مراد اس حالت سے ہے کہ طالب حق خلق اور ارادت اور نفس سے بکلّی باہر ہوجاوے اور فعل اور ارادت الٰہی میں بکلی کھویا جاوے۔ یہانتک کہ اسی کے ساتھ دیکھتا ہو اور اسی کے ساتھ سنتا ہو۔ اور اسی کے ساتھ پکڑتا ہو اور اسی کے ساتھ چھوڑتا ہو۔ پس یہ تمام آثار وصال کے ہیں نہ عین وصال کے اور عین وصال ایک بیچوں اور بیچگوں نور ہے کہ جس کو اہل وصال شناخت کرتے ہیں مگر بیان نہیں کرسکتے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب طالبِ کمال وصال کا خدا تعالیٰ کے لیے اپنے تمام وجود سے الگ ہوجاتا ہے۔ اور کوئی حرکت اور سکون اس کا اپنے لیے نہیں رہتا بلکہ سب کچھ خدا کے لیے ہوجاتا ہے تو اس حالت میں اس کو ایک رُوحانی موت پیش آتی ہے جو بقا کو مستلزم ہے۔ پس اس حالت میں گویا وہ بعد موت کے زندہ کیا جاتا ہے اور غیراللہ کا وجود اس کی آنکھ میں باقی نہیں رہتا۔ یہانتک کہ غلبہ شہود ہستی الٰہی سے وہ اپنے وجود کو بھی نابود ہی خیال کرتا ہے۔ پس یہ مقامِ عبودیت و فنا اتم ہے جو غایت سیر اولیاء ہے اور اسی مقام میں غیب سے باذن اللہ ایک نور سالک کے قلب پر نازل ہوتا ہے جو تقریر اور تحریر سے باہر ہے۔ غلبہ شہود کی ایک ایسی حالت ہے کہ جو علم الیقین اور عین الیقین کے مرتبہ سے برتر ہے۔ صاحب شہود تام کو ایک علم تو ہے مگر ایسا علم جو اپنے ہی نفس پر وارد ہوگیا ہے جیسے کوئی آگ میں جل رہا ہے۔ سو اگرچہ وہ بھی جلنے کا ایک علم رکھتا

ہے مگر وہ علم الیقین اور عین الیقین سے برتر ہے۔ کبھی شہود تام بے خبری تک بھی نوبت پہنچا دیتا اور حالت سُکر اور بیہوشی کی غلبہ کرتی ہے۔ اس حالت سے یہ آیت مشابہ ہے فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (الاعراف : ۱۴۴) لیکن حالت تام وہ ہے جس کی طرف اشارہ ہے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (النجم : ۱۸) یہ حالت اہلِ جنّت کے نصیب ہوگی۔ پس غایت یہی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القیامۃ : ۲۳، ۲۴)

خاکسار مرزا غلام احمد۔ ۱۸ ؍ مارچ ۱۸۸۳ء مطابق ۸ جمادی الاوّل ۱۳۰۰ھ والله اعلم بالصواب ؎

---

۲۶ ؍ ستمبر ۱۹۰۵ء

قبل دوپہر

یہاں رہیں اور ان ایام کی قدر کریں

یہ بھی غنیمت ہے کہ انسان اس جگہ کی صحبت کو غنیمت سمجھے جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہاں آنے یا رہنے سے دنیاوی کاروبار میں حرج ہوگا وہ بیمار ہے۔ اسے اس بیماری کا علاج کرنا چاہیئے۔ دُنیا کے کام تو کبھی ختم نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں جبتک خود انسان خدا تعالیٰ سے توفیق پاکر ان کا خاتمہ نہ کر دے۔

ابھی ہماری جماعت کو سمجھنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔ رفتہ رفتہ تحریک ہوتی ہے کسی مجمع میں کوئی تحریک ہوگئی اور کسی میں کوئی۔ اس لیے جبتک یہاں انسان ایک عرصہ تک نہ رہے یا کثرت کے ساتھ نہ آتا رہے کم فائدہ ہوتا ہے اور یہ بڑی خامی اور بے قدری ہوتی ہے اور سلسلہ کی بدنامی کا موجب ہوتا ہے۔ جب ایک شخص سلسلہ میں داخل ہوتا ہے اور وہ توجہ کے ساتھ ان مسائل پر جو ہم پیش کرتے ہیں نظر نہیں کرتا اور پھر اگر اس سے کوئی سوال کرتا ہے تو اُسے چُپ ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہماری کتابوں کو غور سے پڑھیں اور فکر کریں اور یہاں رہیں اور ان ایام کی قدر کریں۔

جو لوگ اس سلسلہ میں داخل ہوتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا یہ دن وہ نہیں ہیں جن کے لیے بہت سے سعید لوگ حسرت کرتے چلے گئے ہیں اور یہ امور کتابوں میں درج ہیں کہ کس طرح پر ہزاروں رُوحیں اس آرزو میں اس دُنیا سے رخصت ہوئیں کہ وہ مسیح موعود کے زمانہ کو پالیتیں مگر اس زمانہ کے لوگ جس طرح پر ان ایام کی قدر نہیں کرتے اور مخالفت سے پیش آتے ہیں کیا تعجب اگر وہ یہ زمانہ پاتے تو وہ سیر ہو جاتے۔

؎ الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ صفحہ ۵ تا ۱۲ مورخہ ۱۰ ؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء

اسی طرح پر آجکل لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو ہم اس طرح خدمت کرتے اور یہ اخلاص دکھاتے اور یہ کرتے اور وہ کرتے۔ لیکن سچ یہی ہے کہ اگر یہ لوگ اس وقت ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے جو آجکل ہمارے ساتھ کر رہے ہیں۔ زمانہ کی معاصرت بھی ایک روک ہے اس سے لوگوں کے دل تنگ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک رنگ کا ابتلا ہے۔

ایمان کی سلامتی کے لیے باطن پر نظر رکھنی ضروری ہے

ذوالنون مصری ایک باکمال شخص تھا اور اس کی شہرت باہر دور دور پہنچی ہوئی تھی۔ ایک شخص اس کے کمال کو سُنکر اس کے ملنے کے واسطے گیا اور گھر پر جاکر اسے پکارا تو اس کو جواب ملا کہ خدا جانے کہاں ہے۔ کہیں بازار میں ہوگا۔ وہ جب بازار میں ان کی تلاش کرتا ہوا پہنچا تو وہ بازار میں معمولی طور پر سادگی سے کچھ سودا خرید رہا تھا۔ لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ذوالنون ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ پست قامت آدمی ہے۔ معمولی سا لباس ہے۔ چہرہ پر کچھ وجاہت نہیں۔ معمولی آدمیوں کی طرح بازار میں کھڑا ہے اس سے اس کا سارا اعتقاد جاتا رہا اور کہا کہ یہ تو ہماری طرح ایک معمولی آدمی ہے۔ ذوالنون نے اس کو کہا کہ تو کس لیے میرے پاس آیا ہے جبکہ تیرا ظاہر پر خیال ہے۔ ذوالنون نے اس کے مافی الضمیر کو دیکھ لیا۔ اس لیے کہا کہ تیری نظر ظاہر پر ہے۔ تجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

ایمان تب سلامت رہتا ہے کہ باطن پر نظر رکھی جاوے۔ کہتے ہیں لقمان بھی سیاہ منظر تھے یہی وجہ ہے جو لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں اور برگزیدوں کے پاس ارادت سے جانا سہل ہے لیکن ارادت سے واپس آنا مشکل ہے کیونکہ ان میں بشریت ہوتی ہے۔ اور ان کے پاس جانے والے لوگوں میں سے اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے دل میں اس کی ایک فرضی اور خیالی تصویر بنا لیتے ہیں، لیکن جب اس کے پاس جاتے ہیں تو وہ اس کے برخلاف پاتے ہیں جس سے بعض اوقات وہ ٹھوکر کھاتے ہیں اور ان کے اخلاص اور ارادت میں فرق آجاتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر بیان کر دیا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (حٰمٓ السجدۃ: ۷) یعنی کہدو کہ بیشک میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں یہ اس لیے کہ وہ لوگ اعتراض کرتے تھے وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ (الفرقان: ۸) اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ ان کو آخر یہی جواب دیا گیا کہ یہ بھی ایک بشر ہے اور بشری حوائج اس کے ساتھ ہیں۔ اس سے پہلے جس قدر نبی اور رسول آئے وہ بھی بشر ہی تھے۔ یہ بات انہوں نے بنظرِ استخفاف کہی تھی۔ وہ

جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی بازاروں میں عموماً سودا سلف خریدا کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نقشہ تھا وہ تو نری بشریت تھی جس میں کھانا پینا۔ سونا۔ چلنا۔ پھرنا وغیرہ تمام امور اور لوازم بشریت کے موجود تھے۔ اس واسطے ان لوگوں نے رد کر دیا۔ یہ مشکل اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ اپنے دل سے ہی ایک خیالی تصویر بنا لیتے ہیں کہ نبی ایسا ہونا چاہیے اور چونکہ اس تصویر کے موافق وہ اسے نہیں پاتے اس لحاظ سے ٹھوکر کھاتے ہیں۔ یہ مرض یہاں تک ترقی کر گیا ہے کہ بعض شیعوں کا بعض اُئمہ کی نسبت خیال ہے کہ وہ مُنہ کے راستہ پیدا ہوئے تھے لیکن یہ باتیں ایسی ہیں کہ ایک عقلمند ان کو کبھی قبول نہیں کر سکتا بلکہ ہنسی کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جو شخص گذر جاوے اس کی نسبت جو چاہو تجویز کر لو کہ وہ آسمان سے اُترا تھا یا مُنہ کے راستہ پیدا ہوا تھا لیکن جو موجود ہیں ان میں بشری کمزوریاں موجود ہیں۔ وہ روتا بھی ہے۔ کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی ہے۔ غرض ہر قسم کی بشری ضرورتوں اور کمزوریوں کو اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کو دیکھ کر ان لوگوں کو جو انبیاء و رسل کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی جو اللہ تعالیٰ کو ان کے اس قسم کے اعتراضوں کا رد کرنا پڑا اور قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (حٰمٓ السجدۃ:۷) کہنا پڑا۔ یعنی مجھ میں بشریت کے سوا جو امر تمہارے اور میرے درمیان فارق اور مابہ الامتیاز ہے۔ وہ یہ ہے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی وحی آتی ہے۔ دوسری جگہ قرآن شریف میں یہ اعتراض بھی منقول ہوا ہے کہ یہ تو بیویاں کرتا ہے۔ اس کے جواب میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں جو بیوی نہ رکھتا ہو۔ غرض ایسی باتوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

خانہ کعبہ کی تجلّیات اور انوار و برکات ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتے

اسی طرح پر بعض لوگ حج کو جاتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں بڑا جوش اور اخلاص ہوتا ہے۔ لیکن جس جوش اور تپاک سے جاتے ہیں اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہی جوش اور اخلاص لے کر واپس نہیں آتے بلکہ واپس آنے پر بسا اوقات پہلے سے بھی گئے گذرے ہو جاتے ہیں۔

سہل است رفتن بارادت
مشکل است آمدن بارادت

واپس آکر ان کے اخلاق میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ وہ تبدیلی کچھ اُلٹی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ وہ جانے سے پہلے سمجھتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں ایک عظیم الشان تجلّی نور کی ہوگی۔ اور وہاں سے انوار و برکات نکلتے ہوں گے اور وہاں فرشتوں کی آبادی ہوگی لیکن جب وہاں جاتے ہیں۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ

خانہ کعبہ جس کی تصویر انہوں نے اپنے خیال اور ذہن سے کچھ اَور ہی قسم کی تجویز کی تھی وہ محض ایک کوٹھہ ہے اور اس کے ہمسایہ میں جو لوگ رہتے ہیں ان میں بعض جرائم پیشہ بھی ہیں وہ دنگا فساد بھی کر لیتے ہیں اور اکثر ان میں ایسے مُفسد طبع دیکھے جاتے ہیں کہ بعض خام طبیعت کے آدمی انہیں دیکھ کر متردّد ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر وہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ یہاں کی ساری آبادی کا یہی حال ہے۔ اور کُل عرب ایسے ہی ہیں اور اس طرح پر ان کے دل میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ نہ وہاں وہ تجلی انوار و برکات کی دیکھتے ہیں جو انہوں نے بطور خود تجویز کر لی تھی اور نہ ملائک کی بستی پاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ خود خام طبع ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ یہ ان کی اپنی غلطی ہے جو وہ ایسا سمجھ لیتے ہیں اس میں خانہ کعبہ کا کیا قصور؟ یہ کوئی ضروری امر نہیں ہے کہ خانہ کعبہ میں سارے قطب اور ابدال اور اولیاءاللہ ہی رہتے ہوں۔ خانہ کعبہ نے اس وقت بھی تو گذارہ کر ہی لیا تھا۔ جب اس کے چاروں طرف بُت پرست ہی بُت پرست رہتے تھے اور خود خانہ کعبہ بُتوں سے بھرا ہوا تھا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ خانہ کعبہ انوار و برکات کی تجلی گاہ ہے اور اس کی بزرگی میں کوئی کلام اور شُبہ نہیں۔ پہلی کتابوں میں بھی اس کی بزرگی کا ذکر ہے۔ مگر یہ تجلّیات اور انوار و برکات اس ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آ سکتے۔ اس کے لیے دوسری آنکھ کی حاجت ہے۔ اگر وہ آنکھ کھُلی ہو تو یقیناً انسان دیکھ لے گا کہ خانہ کعبہ میں کس قسم کے برکات نازل ہو رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ بُتوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے زائرین میں ابوجہل جیسے شریر تھے۔ پھر ان سے مقابلہ کر کے اگر ایسے خام طبع لوگ کوئی بات کہتے تو انہیں شرمندہ ہونا پڑتا کیونکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو وہ لوگ جو بیت اللہ کے جوار میں رہتے ہیں۔ عوام سے ہزارہا درجہ اچھے ہیں اور یہ امر مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت میں کثرت کے ساتھ ان میں نیک اور اچھے لوگ ہیں اور ان کو دیکھ کر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ خانہ کعبہ کی مجاورت نے ان کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔

یہ تو قانون قدرت ہی نہیں کہ دنیا میں آ کر فرشتے آباد ہوں۔ پھر ایسا خیال کرنا کیسی غلطی اور نادانی ہے۔ انسانیت کے لازم حال زلّات تو ضرور ہیں۔ پس مکّہ میں جب انسان آباد ہیں تو ان کی کمزوریوں پر نظر کر کے مکّہ کو بدنام کرنا یا اس کی بزرگی اور عظمت کی نسبت شک کرنا بڑی غلطی ہے۔ سچ یہی ہے کہ کعبہ کی بزرگی اور نورانیت دوسری آنکھوں سے نظر آتی ہے جیسا کہ سعدیؔ نے فرمایا ہے

چو بیت المقدس دروں پُر ز تاب
رہا کردہ دیوار بیروں خراب

موجودہ زمانہ کے پیرزادے اور مشائخ

اولیاء اللہ کی بھی ایسی ہی حالت ہوتی ہے کہ ان میں تکلفات نہیں ہوتے بلکہ وہ بہت ہی سادہ اور صاف دل لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے لباس اور دُوسرے امور میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع نہیں ہوتا مگر اس وقت اگر پیرزادوں اور مشائخوں کو دیکھا جاوے تو ان میں بڑے بڑے تکلفات پائے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی قول اور فعل ایسا نہ پاؤ گے جو تکلف سے خالی ہو گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُمّتِ محمدیہ ہی میں سے نہیں ہیں۔ ان کی کوئی اَور ہی شریعت ہے۔ ان کی پوشاک دیکھو تو اس میں خاص قسم کا تکلف ہوگا۔ یہانتک کہ لوگوں سے ملنے جُلنے اور کلام میں بھی ایک تکلف ہوتا ہے۔ ان کی خاموشی محض تکلف سے ہوتی ہے۔ گویا ہر قسم کی تاثیرات کو وہ تکلف ہی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہے۔ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (صٓ : ۸۷) اور ایسا ہی دوسرے تمام انبیاء و رسل جو وقتاً فوقتاً آئے وہ نہایت سادگی سے کلام کرتے اور اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے قول و فعل میں کوئی تکلف اور بناوٹ نہ ہوتی تھی مگر اِن کے چلنے پھرنے اور بولنے میں تکلف ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن کی اپنی شریعت جُدا ہے۔ جو اسلام سے الگ اور مخالف ہے۔

بعض ایسے پیر بھی دیکھے گئے ہیں جو بالکل زنانہ لباس رکھتے ہیں یہاں تک کہ رنگین کپڑے پہننے کے علاوہ ہاتھوں میں چُوڑیاں بھی رکھتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کے بھی بہت سے مُرید پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ان سے پُوچھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کب ایسی زنانہ صورت اختیار کی تھی تو اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ وہ ایک نرالی شریعت بنانا چاہتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کو چھوڑ کر اپنی تجویز اور اختیار سے ایک راہ بنانا چاہتے ہیں۔

مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں شعائر اسلام میں سے نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں نے یہ امور بطور رُسوم ہندوؤں سے لئے ہیں اور نہ صرف یہی بلکہ اَور بھی بہت سی باتیں ہیں جو انہیں سے لی گئی ہیں جیسے دم کشی وغیرہ۔

خوب سمجھو کہ یہ امور اسلام کے بالکل برخلاف ہیں اور ان سے کوئی بھی مطلب اور مُراد حاصل نہیں ہوسکتی۔ اصل غرض تو انسان کی یہ ہونی چاہیے تھی کہ دل پاک ہو جاوے۔ اور ہر قسم کے گند اور ناپاک مواد جو رُوح کو تباہ کرتے ہیں دُور ہو جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے فیضان اور برکات نازل ہونے لگیں۔ اگر یہ امر حاصل نہیں تو پھر نرے تکلفات کو لے کر کیا کرو گے۔ تمہارا مقصود ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ جس طرح ممکن ہو دل صاف ہو جاوے اور عبُودیّت کا منشا اور مقصد پورا ہو اور خطرناک زہر جو گناہ کی زہر

ہے جس سے انسان کی رُوح ہلاک ہوجاتی ہے اس سے نجات ملے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک صاف اور سچّا تعلق پیدا ہوجاوے، مگر یہ باتیں بہ تکلف سے پیدا نہیں ہوسکتی ہیں۔ ان کے حصول کا ذریعہ تو وہی اسلام ہے جس میں سادگی ہے۔

یقیناً یاد رکھو کہ اسلام میں اللہ تعالیٰ نے ایسی سادگی رکھی ہے کہ اگر دوسری قوموں کو اس کی حقیقت پر اطلاع ہو تو وہ اس کی سادگی پر رشک کریں۔ ایک سچّے مُسلمان کے لیے کچھ ضرور نہیں کہ ہزار دانہ کی تسبیح اس کے ہاتھ میں ہو۔ اور اس کے کپڑے بھگوے یا سبز یا اور کسی قسم کے رنگین ہوں اور وہ خُدا رسی کے لیے دم کشی کرے یا اور اسی قسم کے چِلّے حوالے کرے۔ اس کے لیے ان امور کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ سب امور زائدہ ہیں اور اسلام میں کوئی امر زائد نہیں ہوتا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اسلام چاہتا ہے۔ کہ تم اندرونی طور پر بڑی بڑی ترقیاں کرو اور اپنے اندر خصوصیتیں پیدا کرو۔ بیرونی خصوصیتیں نِری ریاکاریاں ہیں اور ان کی غرض بجُز اس کے اَور کچھ نہیں کہ لوگوں پر ظاہر کیا جاوے۔ کہ ہم ایسے ہیں اور وہ رجُوع کریں۔

حضرت امام غزالی کے زمانہ کے پیرزادے اور فقراء

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے پیرزادوں اور فقیروں کے عجیب عجیب حالات لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسوس ہے بڑی اَبتری پھیل گئی ہے کیونکہ یہ فقیر جو اس زمانہ میں پائے جاتے ہیں وہ فقیر اللہ نہیں ہیں بلکہ فقیر الخلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہر حرکت و سکون، لباس خورو نوش اور کلام میں حکمت پر عمل کرتے ہیں۔ مثلاً کپڑوں کے لیے وہ دیکھتے ہیں کہ اگر ہم عام غریبوں کی طرح گزی گاڑھے کے کپڑے پہنیں تو وہ عزت نہ ہوگی جو امراء سے توقع کی جاتی ہے وہ ہم کو کم حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ سمجھیں گے۔ لیکن اگر اعلیٰ درجہ کے کپڑے پہنتے ہیں تو پھر وہ ہم کو کامل دنیادار سمجھ کر توجہ نہ کریں گے اور دُنیا دار ہی قرار دیں گے اس لیے اس میں یہ حکمت نکال لی کہ کپڑے تو اعلیٰ درجہ کے اور قیمتی اور باریک لے لیے۔ لیکن ان کو رنگ دے لیا جو فقیری کے لباس کا امتیاز ہوگئے۔

اسی طرح حرکات بھی عجیب ہوتی ہیں۔ مثلاً جب بیٹھتے ہیں تو آنکھیں بند کر کے بیٹھتے ہیں اور اس حالت میں لب ہل رہے ہیں گویا اس عالم ہی میں نہیں ہیں حالانکہ طبیعت فاسد ہوتی ہے۔ نمازوں کا یہ حال ہے کہ بڑے آدمیوں سے ملیں تو بہت ہی لمبی لمبی پڑھتے ہیں اور بطور خود سرے سے ہی نہ پڑھیں۔ ایسا ہی روزوں میں عجیب عجیب حالات پیش آتے ہیں مثلاً یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ نفلی روزے ہم رکھتے ہیں وہ یہ طریق اختیار کرتے ہیں کہ جب کسی امیر کے ہاں گئے اور وہاں کھانے کا وقت

آگیا اور کھانا رکھا گیا تو یہ کہدیتے ہیں کہ آپ کھائیے مجھے کچھ عذر ہے۔ اس کے معنے دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ مجھے روزہ ہے۔ اس طرح پردہ گویا اپنے روزوں کو چھپاتے ہیں اور دراصل اس طرح پر ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ظاہر کریں کہ ہم نفلی روزے رکھتے ہیں۔

غرض انہوں نے اپنے زمانہ کے فقراء کے اس قسم کے بہت سے گند لکھے ہیں۔ اور صاف طور لکھا ہے کہ ان میں تکلفات بہت ہی زیادہ ہیں۔ ایسی حالت اِس زمانہ میں بھی قریب قریب واقع ہوگئی ہے۔ جو لوگ ان پیروں اور پیرزادوں کے حالات سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ قسم قسم کے تکلفات اور ریاکاریوں سے کام لیتے ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اسی سے امید رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے لیے درست کرتا ہے اور اس طرح پر درست کرتا ہے جس طرح پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے لیکن جو شخص مخلوق سے ڈرتا اور مخلوق سے امید رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو مخلوق کے لیے درست کرتا ہے۔ خدا والوں کو مخلوق کی پروا نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے مرے ہوئے کیڑے سے بھی کمتر سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ ان بلاؤں میں نہیں پھنستے[1]۔ اور دراصل وہ ان کو کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کے ساتھ ہوتا ہے اور وہی اس کی تائید اور نصرت فرماتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ خدا اپنی مخلوق کو خود اس کے ساتھ کر دے گا۔ یہی سِرّ ہے کہ انبیاء علیہم السلام خلوت کو پسند کرتے ہیں اور مَیں یقیناً اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ وہ ہرگز ہرگز پسند نہیں کرتے کہ باہر نکلیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو مجبور کرتا ہے اور پکڑ کر باہر نکالتا ہے۔

مامورین اور مرسلین کا استغناء

دیکھو موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے مامور کرنا چاہا اور فرعون کی طرف ہدایت اور تبلیغ کی خاطر بھیجنے کی بشارت دی تو انہوں نے عذر شروع کر دیا کہ مَیں نے اُن کا ایک خون کیا ہوا ہے بھائی کو بھیج دیا جاوے۔ یہ کیا بات تھی؟ یہ ایک قسم کا استغناء اور اہلِ عالم سے الگ رہنے کی زندگی کو پسند کرنا تھا۔ یہی استغناء ہر مامور اور مُرسل کو ہوتا ہے اور وہ اس تنہائی کی زندگی کو بہت پسند کرتا ہے اور یہی ان کے اخلاص کا نشان ہوتا ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے لیے منتخب کرتا ہے کیونکہ وہ ان کے دل پر نظر کرکے خوب دیکھ لیتا ہے کہ اس میں غیر کی طرف قطعاً توجہ نہیں ہوتی اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور تعمیلِ امرِ ہی کو اپنی زندگی اور حیات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۷ صفحہ ۴، ۵ مورخہ ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء

آں کس کہ ترُا شناخت جہاں راچہ کُنَد
فرزند وعیال وخانماں راچہ کُنَد
دیوانہ کنی و ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو دو جہاں راچہ کُنَد

اس کے دل میں بڑا بننے سے طبعًا نفرت اور کراہت ہوتی ہے۔ مگر وہ لوگ جو خود اس قسم کی کبریائی کی بیہودہ خواہشوں کے غلام اور اسیر ہوتے ہیں وہ اپنے نفس پر قیاس کرکے ان کی نسبت بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا بننے کی خواہشوں سے ایسے دعوے کرتے ہیں حالانکہ وہ اتنا نہیں دیکھتے کہ ان کا دعویٰ تو ان پر ایک آفتوں اور مصائب کا طوفان لے آتا ہے اور ان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔ ہر طرف سے ان کی مخالفت کے لیے ہاتھ اور زبان چلتی ہے اور کوئی دقیقہ اُن کو دُکھ دینے میں اُٹھا نہیں رکھا جاتا۔ پھر یہ کیسی بے انصافی اور ظلم ہے کہ ان کی نسبت یہ وہم کیا جاوے کہ وہ خواہش کبریائی سے ایسا کرتے ہیں۔ یہ بہتانِ عظیم ہے وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا جلال اور اس کی عظمت کے اظہار اور اس کی کبریائی کے اعلان کو پسند کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنی جان ایک جان کیا ہزار جان بھی دینے کو تیار ہوتے ہیں۔ افسوس اہلِ دُنیا ان کے حالات سے بے خبر اور ناواقف ہوتے ہیں اس لیے اس قسم کے اعتراض کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مصالح پسند فرماتے ہیں کہ ان کو باہر نکالا جاوے اور وہ دُنیا کے سامنے نکلیں اور وہ خدا جو اہلِ دنیا سے مخفی ہوتا ہے ان کے وجود میں نظر آوے۔

انبیاء کو اللہ تعالیٰ عظمت عطا کرتا ہے

یہ بھی یاد رکھو کہ جس چیز سے انسان نفرت کرتا ہے وہی اس کو دیتا ہے اور جس کی طرف بھاگتا ہے اس سے محروم کیا جاتا ہے۔ انبیاء ورسل کا گروہ ہرگز ہرگز اپنی جاہ وحشمت کو نہیں چاہتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے مصالح کی بنا پر انہیں عطا کرتا ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گذرے ہیں اور اس لحاظ سے ان سب کو گویا ایک ہی سمجھو کیونکہ سب کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن میں سے کسی ایک کو بھی ذلیل اور خوار نہیں کیا اس لیے کہ اُن کی ذلت اللہ تعالیٰ کی ذلت ہے۔ (تَعَالیٰ شَانُہٗ) جو لوگ ان کے خلاف کرتے ہیں اور مخلوق کو عظمت دیتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی کبریائی کی رِدا مخلوق کو پہناتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں مردُود ہوتے ہیں۔

انبیاء میں مخلوق سے ہمدردی

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک طرف انبیاء ورُسل اور خدا تعالیٰ کے مامورین اہلِ دُنیا سے نفور

ہوتے ہیں اور دوسری طرف مخلوق کے لیے ان کے دل میں اس قدر ہمدردی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے بھی خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور خود ان کی جان جانے کا اندیشہ ہوتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآن شریف میں فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء) یہ کس قدر ہمدردی اور خیر خواہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں فرمایا ہے کہ تو ان لوگوں کے مومن نہ ہونے کے متعلق اس قدر ہم و غم نہ کر۔ اس غم میں شاید تو اپنی جان ہی دے دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمدردی مخلوق میں کہاں تک بڑھ جاتے ہیں۔ اس قسم کی ہمدردی کا نمونہ کسی اَور میں نہیں پایا۔ یہاں تک کہ ماں باپ اور دُوسرے اقارب میں بھی ایسی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔

مخلوق تو انہیں کاذب اور مفتری کہتی ہے اور وہ مخلوق کے لیے مرتے ہیں۔ یقیناً یاد رکھو کہ یہ ہمدردی والدین میں بھی نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ جب دیکھتے ہیں کہ اولاد سرکش اور نافرمان ہے یا اَور نقص اس میں پاتے ہیں تو آخر اسے چھوڑ دیتے ہیں مگر انبیاء رسل کی یہ عادت نہیں وہ مخلوق کو دیکھتے ہیں کہ اُن پر حملہ کرتی اور ستاتی ہے لیکن وہ اس کے لیے دُعا کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ہدایت کے لیے اس قدر دعا کرتے تھے جس کا نمونہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے دل میں ایک پیاس لگا دی تھی کہ لوگ مُسلمان ہوں اور خدائے واحد کے پرستار ہوں۔

انبیاء کی جذب و کشش اور اس کے اثرات

جسقدر کوئی نبی عظیم الشّان ہوتا ہے اسی قدر یہ پیاس زیادہ ہوتی ہے اور یہ پیاس جسقدر تیز ہوتی ہے اسی قدر جذب اور کشش اسمیں ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء اور جمیع کمالات نبوت کے مظہر تھے اسی لیے یہ پیاس آپ میں بہت زیادہ تھی اور چونکہ یہ پیاس بہت تھی اسی وجہ سے آپ میں جذب اور کشش کی قوت بھی تمام راستبازوں اور ماموروں سے بڑھ کر تھی جس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اَور کیا ہوگا کہ آپؐ کی زندگی ہی میں کل عرب مسلمان ہوگیا۔ یہ کشش اور جذب جو مامورین کو دیا جاتا ہے وہ مستعد دلوں کو تو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ان لوگوں کو جو اس سے حِصّہ نہیں رکھتے دشمنی میں ترقی کرنے کا موقعہ دیتا ہے ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست　　　در باغ لالہ روید و در شورہ بوم وخس

اسی طرح پر انبیاء علیہم السّلام کی خاصیّت ہوتی ہے کہ مومن اور کافر ان کے طفیل سے اپنے کفر اور ایمان میں کمال کرتے ہیں۔ لکھا ہے کہ ابو جہل کا کفر پورا نہ ہوتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نہ آتے۔ پہلے اس کا کفر مخفی تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر اس کا اظہار ہوگیا۔ اسی طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدق بھی مخفی تھا جو اس وقت ظاہر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے روحانی

دعوت کی۔ ایک نے اس دعوت کو قبول کیا اور دوسرے نے انکار کر دیا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا (البقرۃ : ۱۱) انبیاء و رُسل اُس خباثت اور شقاوت کو جو اُن کے اندر ہوتی ہے ظاہر کر دیتے ہیں۔ قرآن شریف نے انبیاء و رسل کی بعثت کی مثال مینہ سے دی ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا۔ (الاعراف : ۵۹)

یہ تمثیل اسلام کی ہے۔ جب کوئی رُسول آتا ہے تو انسانی فطرتوں کے سارے خواص ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان کے ظہور کا یہ خاصہ اور علامات ہیں کہ مخلص سعید الفطرت اور مستعد طبیعت کے لوگ اپنے اخلاص اور ارادت میں ترقی کرتے ہیں اور شریر شرارت میں بڑھ جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب خبیث اور منکر گروہ نے شرارتیں کرنی شروع کیں اور دُکھ اور ایذا رسانی کے منصوبے کیے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ کیسی کیسی خبیث روحیں ہیں۔ ایک وہ لوگ تھے کہ انہوں نے آپؐ کی راہ میں سر کٹوا ڈالے۔ ان کے حالات اور واقعات کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ان میں کیسا اخلاص اور ارادت تھی۔ فی الحقیقت اُن کا اُسوہ اُسوۂ حَسَنہ ہے۔ یہانتک کہ ان میں سے اگر کسی کا ایک ضرب سے سر نہیں کٹا تو اس کو شک ہوا کہ شہید نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں کیسے فدا تھے۔ لکھا ہے کہ ایک صحابی نے اپنے مخالف کو ایک تلوار ماری۔ اس کے نہ لگی مگر اپنے لگی۔ دُوسرے نے کہا کہ شہید نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے اور پوچھا کہ کیا شہید نہیں ہوا؟ آپؐ نے فرمایا۔ دو اجر ملیں گے۔ ایک یہ کہ دشمن پر حملہ کیا اور دوسرا اس لیے کہ اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کے لیے خطرہ میں ڈالا۔ اس قسم کا ایمان ان لوگوں کا تھا۔ پس جب تک اس قسم کا اخلاص اور استقامت اللہ تعالیٰ کے لیے حاصل نہ ہو کچھ نہیں بنتا۔

مَیں اپنی جماعت میں صحابہ کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہوں

مَیں یہی نمونہ صحابہ کا اپنی جماعت میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو وہ مقدم کرلیں اور کوئی امر ان کی راہ میں روک نہ ہو۔ وہ اپنے مال و جان کو ہیچ سمجھیں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ بعض لوگوں کے کارڈ آتے ہیں۔ کسی تجارت یا اَور کام میں نقصان ہوا یا اَور کسی قسم کا ابتلا آیا تو جھٹ شبہات میں پڑ گئے۔ ایسی حالت میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اصل مطلب اور مقصد سے وہ کس قدر دُور ہیں۔ غور کرو کیا فرق ہے صحابہؓ میں اور ان لوگوں میں۔ صحابہؓ یہ چاہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کو راضی کریں خواہ اس راہ میں کیسی ہی سختیاں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ اگر کوئی مصائب اور مشکلات میں نہ پڑتا اور

اسے دیر ہوتی تو وہ روتا اور چلاتا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ ان ابتلاؤں کے نیچے خدا تعالیٰ کی رضا کا پروانہ اور خزانہ مخفی ہے۔

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است　　زیر آں گنج کرم بنہادہ است

قرآن شریف ان کی تعریف سے بھرا ہوا ہے۔ اسے کھول کر دیکھو۔ صحابہؓ کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا عملی ثبوت تھا۔ صحابہؓ جس مقام پر پہنچے تھے اس کو قرآن شریف میں اس طرح پر بیان فرمایا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (الاحزاب : ۲۴) یعنی بعض ان میں سے شہادت پا چکے اور انہوں نے گویا اصل مقصود حاصل کر لیا۔ اور بعض اس انتظار میں ہیں کہ چاہتے ہیں کہ شہادت نصیب ہو۔ صحابہؓ دُنیا کی طرف نہیں جھکے کہ عمریں لمبی ہوں اور اس قدر مال و دولت ملے اور یوں بے فکری اور عیش کے سامان ہوں۔ مَیں جب صحابہؓ کے اس نمونہ کو دیکھتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی کمال فیضان کا بے اختیار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کس طرح پر آپ نے انکی کایا پلٹ دی اور اُنہیں بالکل رُو بخدا کر دیا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بَارِكْ وَسَلِّمْ۔

خلاصہ یہ کہ ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے جویا اور طالب رہیں اور اسی کو اپنا اصل مقصود قرار دیں۔ ہماری ساری کوشش اور تگ و دو اللہ تعالیٰ کے رضا کے حاصل کرنے میں ہونی چاہیے۔ خواہ وہ شدائد اور مصائب ہی سے حاصل ہو۔ یہ رضائے الٰہی دنیا اور اس کی تمام لذات سے افضل اور بالاتر ہے۔

شہادت کی حقیقت

یہ بھی یاد رکھو کہ یہی شہادت نہیں کہ ایک شخص جنگ میں مارا جائے بلکہ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے لیے ہر دُکھ درد اور مصیبت کو اٹھانے کے لیے مستعد رہتا ہے اور اٹھاتا ہے وہ بھی شہید ہے۔ شہید کا مقام وہ مقام ہے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کو گویا دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی ہستی اس کی قدرتوں اور تصرفات پر وہ اس طرح ایمان لاتا ہے جیسے کسی چیز کو انسان مشاہدہ کر لیتا ہے۔ جب اس حالت پر انسان پہنچ جاوے۔ پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس میں راحت اور لذت محسوس کرتا ہے۔ شہادت کا ابتدائی درجہ خدا کی راہ میں استقلال اور ثباتِ قدم ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص نہ مَرا اللہ کی راہ میں اور نہ تمنا کی مر گیا وہ نفاق کے شعبہ میں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کامل مومن نہیں ہوتا جبتک اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرنا دُنیا کی زندگی سے وہ مقدم نہ کرے۔ پھر یہ کیسا گراں مرحلہ ہے ان لوگوں کے

لیے جنہوں نے دُنیا کی حیات کو عزیز سمجھا۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں مرنے کے یہ معنے نہیں کہ انسان خواہ مخواہ لڑائیاں کرتا پھرے بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام اور اَوامر کو اسکی رضا کو اپنی تمام خواہشوں اور آرزوؤں پر مقدم کرے اور پھر اپنے دل میں غور کرے کہ کیا وہ دنیا کی زندگی کو پسند کرتا ہے یا آخرت کو اور خدا کی راہ میں اگر اس پر مصائب اور شدائد بھی پڑیں تو وہ ایک لذت اور خوشی کے ساتھ انہیں برداشت کرے اور اگر جان بھی دینی پڑے تو تردد نہ ہو۔

اصل غرض مقامِ رضا کا حصول ہے

پس یہی وہ امر ہے جو مَیں اپنی جماعت میں پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ ان میں صحابہؓ کا نمونہ قائم ہو۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ جب کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں کہ جن میں دُنیا اور اس کی خواہشوں کا ذکر ہوتا ہے اور لکھا جاتا ہے کہ میرے لیے فلاں امر کے واسطے دُعا کرو۔ میری فلاں آرزو پُوری ہو جاتے۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو محض خدا کی رضا ہی کو مقدم کرتے ہیں اور اسی کی ہی خواہش اور آرزو کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ مکر سے لکھتے ہیں یعنی پہلے تو ذکر کرتے ہیں کہ آپ دُعا کریں کہ ہمارے دل میں ذوق شوق عبادت کا پیدا ہو جاوے اور یہ ہو اور وہ ہو۔ پھر آخر میں اپنی دنیوی خواہشوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ مَیں ایسی بدبودار تحریروں کو شناخت کر لیتا ہوں کہ ان کی اصل غرض کیا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے اور وہ نیات کو خوب دیکھتا ہے۔ اس طرح پر تو گویا خدا کو دھوکہ دینا ہے۔ اس طریق کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے۔ تمہیں چاہیے کہ خالصۃً اللہ کے لیے ہو جاؤ۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کو مقدم کرو گے تو یقیناً سمجھو دنیا میں بھی ذلیل اور خوار نہیں رہو گے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے لیے غیرت ہوتی ہے وہ خود ان کا تکفل فرماتا ہے اور ہر قسم کی مشکلات سے انہیں نجات اور مخلصی عطا فرماتا ہے۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر تم میں وہ تخم بویا گیا جو صحابہؓ میں بویا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ ہر طرح اپنے فضل کرے گا۔ ایسے شخص پر کوئی شخص حملہ نہیں کر سکتا۔ اس امر کو خوب یاد رکھو۔ اگر خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا اور مضبوط تعلق ہو جاوے تو پھر کسی کی دشمنی کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ مَیں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے نزدیک عیسٰی یا موسیٰ کا دعویٰ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اصل غرض تو یہ ہے کہ میں مقامِ رضا حاصل کرنا چاہتا ہوں اور یہی سب کو کرنا چاہیے یہ اس کا فضل اور محض فضل ہے کہ وہ اپنے انعامات سے حِصّہ دے اور اس کے حضور کوئی کمی اور اس کی ذات میں کوئی بُخل نہیں۔ یہ کبھی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک جو شخص ایسا گمان کرتا ہے۔ وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اگر انبیاء و رسل کے انعامات کو حاصل نہیں کر سکتا تو پھر دُنیا میں انکے آنے سے کیا فائدہ اور کیا حاصل؟ خدا تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرنے والوں اور راستبازوں کی ساری اُمیدوں

کا خُون ہو جاوے۔ اور وہ تو گویا زندہ ہی مَر جاویں مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص پر وہی انعام کر سکتا ہے جو اس نے اپنے برگزیدہ بندوں پر کیے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس قسم کا دل اور اخلاص لے کر اس کے حضور آؤ۔

مسیح کا نام دیئے جانے کی حکمت

مَیں نے از خود کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ مَیں اپنی خلوت کو پسند کرتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے مصالح نے ایسا ہی چاہا اور اس نے خود مجھے باہر نکالا۔ چونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب کسی شخص کو اس کی مناسب عزت سے بڑھ کر عظمت دی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس عظمت کا دشمن ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اسکی توحید کے خلاف ہے۔ اسی طرح پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے وہ عظمت تجویز کر دی گئی تھی جس کے وہ مستحق نہ تھے۔ یہانتک کہ انہیں خدا بنا دیا گیا اور خانہ خدا خالی ہو گیا۔ عیسائیوں سے پوچھ کر دیکھ لو۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ عیسٰی مسیح ہی خود خدا ہے۔ اب جس انسان کو اس قدر عظمت دی گئی اور اسے خدا بنایا گیا۔ (نعوذ باللہ) اور اس طرح پر خدا کا پہلو گم کر دیا گیا تو کیا خدا تعالیٰ کی غیرت مخلوق کو اس انسان پرستی سے نجات دینے کے لیے جوش میں نہ آتی؟ پس اس تقاضا کے موافق اس نے مجھے مسیح کر کے بھیجا تاکہ دنیا پر ظاہر ہو جاوے کہ مسیح بجز ایک عاجز انسان کے اَور کچھ نہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ اس کفر کی اصلاح کرے اور اس کے لیے یہی راہ اختیار کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے ایک فرد کو اسی نام سے بھیج دیا تا ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اظہار ہو اور دُوسری طرف مسیح کی حقیقت معلوم ہو۔ یہ ایسی موٹی بات ہے کہ معمولی عقل کا انسان بھی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ دیکھو اگر ایک بڑے آدمی کو معمولی اردلی سے مشابہت دی جاوے تو وہ چڑتا ہے یا نہیں؟ پھر کیا خدا تعالیٰ میں اتنی بھی غیرت نہیں کہ ایک عاجز انسان کو اس کی اُلوہیت کے عرش پر بٹھایا جاوے اور مخلوق تباہ ہو اور وہ انسداد نہ کرے؟ خود اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ مسیح نے ہرگز ایسا دعویٰ نہیں کیا کہ مَیں خدا ہوں۔ اگر وہ ایسا دعویٰ کرے تو مَیں جہنّم میں ڈال دُوں۔ ایک مقام پر یہ بھی فرمایا ہے کہ مسیح سے اس کا جواب طلب ہو گا کہ کیا تُو نے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خُدا بنا لو۔ تو حضرت مسیح اس مقام پر اس سے اپنی بریّت ظاہر کریں گے اور آخر یہ کہیں گے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدة : ۱۱۸) یعنی جبتک مَیں ان میں زندہ رہا تھا۔ مَیں نے ہرگز نہیں کہا۔ ہاں جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو پھر تُو آپ ان کا نگران تھا۔ اس سے پہلے مَادُمْتُ فِيْهِمْ کا لفظ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ جبتک حضرت مسیح زندہ رہے ان کی قوم میں یہ بگاڑ پیدا نہیں ہوا۔ ساری ضلالت بعد وفات ہوئی ہے۔ اگر حضرت مسیح ابھی تک زندہ ہیں تو پھر

یہ ماننا پڑے گا کہ عیسائی نہیں بگڑے بلکہ حق پر ہیں۔ پس غور کرکے بتاؤ اسلام کی حقانیت پر یہ کس قدر خطرناک حملہ ہوگا۔ کیونکہ جب ایک سچا مذہب موجود ہے اور اس میں کوئی خرابی ہی پیدا نہیں ہوئی تو پھر جو کچھ وہ کہتے ہیں مان لینا چاہیئے۔ مگر نہیں خدا تعالیٰ کا کلام حق ہے کہ یہی سچ ہے کہ وہ مر گئے اور عیسائی مذہب بھی اُن کے ساتھ ہی مر گیا اور اس میں کوئی رُوحِ حق اور حقیقت کی نہیں رہی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ اس دنیا میں نہیں آئیں گے کیونکہ وہ عیسائیوں کے بگڑنے کا اقرار اپنی موت کے بعد کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے آنا تھا تو وہ یہ جواب نہ دیتے ورنہ یہ جواب اللہ تعالیٰ کے حضور جھوٹ سمجھا جاوے گا۔ اور ربّ العرش العظیم کے حضور حلف دروغی ہوگی کیونکہ اس صورت میں تو انہیں کہنا چاہیے تھا کہ میں گیا اور جاکر ان صلیبوں کو توڑا اور ان میں پھر توحید قائم کی وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ میرا دعویٰ جو اللہ تعالیٰ کے ایماء اور حکم صریح سے کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے عظیم الشان مصالح اور حکمت سے ایسا ہی چاہا ہے تاکہ مسیح کی عظمت کو توڑا جاوے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا ہے۔ یہودی خدا تعالیٰ کی برگزیدہ قوم کہلاتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے شریعت کی بے حرمتی کی اور وہ حد سے زیادہ بگڑ گئے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت نے نہ چاہا کہ اُن میں نبوت کا سلسلہ رہے اور نبوت کو خاندان بنو اسمٰعیل میں منتقل کرکے ختم کر دیا جیسا کہ خود حضرت عیسیٰؑ نے بھی باغ والی تمثیل میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہودیوں کی اس شوخی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ذلت کی مار ماری گئی۔ اب وہ ہر سلطنت کے ماتحت ذلیل ہیں بلکہ بعض سلطنتوں سے کئی دفعہ نکالے گئے ہیں۔ اب جبکہ یہود پر ذلت پڑ چکی اور نبوّت ان کے خاندان سے منتقل ہو چکی۔ تو کیا یہ انتقال نبوت تنزل کے طور پر تھا اور ناقص تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر یہودی ناز کر سکتے ہیں اور وہ یہ پیش کر سکتے ہیں کہ ہم پر یہ فضل ہوا۔ اور وہ انعام ہوا۔

منجملہ اس کے ایک یہ بھی کہ توریت کی خدمت اور اس کے استحکام کے لیے برابر خلفاء و رسل آتے رہے۔ لیکن قرآن شریف کو یہ مرتبہ حاصل نہ ہوا (نعوذ باللہ من ذالک) سوچ کر بتاؤ۔ کہ کیا یہ اسلام کی بے عزّتی اور نقص کی دلیل ہوگی یا اس کے لیے عظمت کا ذریعہ؟

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے مخالفوں نے میری مخالفت میں یہاں تک غلو کیا ہے کہ اسلام کی بھی سخت ہتک کر لینی انہوں نے گوارا کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاتم الانبیاء اور تمام نبیوں سے افضل اور اکمل تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) معاذ اللہ ناقص نبی ٹھہرایا۔ جب یہ تسلیم کر لیا اور اپنا عقیدہ بنا لیا کہ اب کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو اللہ تعالیٰ سے شرفِ مکالمہ پا سکے

اور خدا تعالیٰ اس کے ہاتھ پر تائیدی نشان ظاہر کر سکے تو تم خود بتاؤ کہ اس عقیدہ سے اسلام کا کیا باقی رہتا ہے؟ اگر خدا تعالیٰ پہلے بولتا تھا مگر اب نہیں بولتا تو اس کا ثبوت کیا ہے کہ وہ پہلے بولتا تھا۔ اگر خدا تعالیٰ پہلے خارقِ عادت تصرفات دکھاتا تھا مگر اب نہیں دکھاتا تو اس کا کیا ثبوت ہے؟ قصے کہانیاں کون قوم بیان نہیں کرتی۔ افسوس ان کو تعصب نے ایسا اندھا کر دیا ہے کہ کچھ بھی ان کو سجھائی نہیں دیتا اور میری مخالفت میں یہ اسلام کو بھی ہاتھ سے دیتے ہیں۔

مسیح ناصری کے اس امت میں آنے کے عقیدہ کے نقصانات

غرض اگر یہودی ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کے مصداق ہو چکے ہیں اور نبوت اس خاندان سے منتقل ہو چکی ہے تو پھر یہ ناممکن ہے کہ مسیح دوبارہ اسی خاندان سے آوے۔ اگر یہ تسلیم کیا جاوے گا تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ادنیٰ نبی مانا جاوے اور اس امت کو بھی ادنیٰ اُمت، حالانکہ یہ قرآن شریف کے منشا کے صریح خلاف ہے کیونکہ قرآن شریف نے تو صاف طور پر فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (اٰلِ عمران: ۱۱۱) پھر اس اُمت کو خیر الامت کی بجائے شر الاُمت کہو گے؟ اور اس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ پر حملہ ہوگا۔ مگر یقیناً یہ سب جھوٹ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ اعلیٰ درجہ کی تھی اور ہے اس لیے کہ وہ اب تک اپنا اثر دکھا رہی ہے اور تیرہ سو سال گذرنے کے بعد مطہر اور مقدس وجود پیدا کرتی ہے۔

اسلام کی برکات اور تاثیرات اب بھی جاری ہیں

اللہ تعالیٰ کا انتقالِ نبوت سے یہی منشاء تھا کہ وہ اپنا فضل و کمال دکھانا چاہتا تھا جو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ: ۶) میں۔ یعنی اے اللہ ہم پر وہ انعام و اکرام کر جو پہلے نبیوں اور صدیقوں شہیدوں اور صالحین پر تو نے کئے ہیں ہم پر بھی کر۔ اگر خدا تعالیٰ یہ انعام و اکرام کر ہی نہیں سکتا تھا اور ان کا دروازہ بند ہو چکا تھا تو پھر اس دعا کی تعلیم کی کیا ضرورت تھی؟ اسرائیلیوں پر تو یہ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اگر یہاں بھی بند ہو گیا تو پھر کیا فائدہ ہوا؟ اور کس بات میں بنی اسرائیل پر اس امت کو فخر ہوا؟ جو خود اندھا ہے وہ دوسرے اندھے پر کیا فخر کر سکتا ہے؟

اگر وحی، الہام، خوارق یہودیوں پر بند ہو چکے ہیں تو پھر یہ بتاؤ کہ یہ دروازہ کسی جگہ جا کر کھلا بھی یا نہیں؟ ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ نہیں ہم پر بھی یہ دروازہ بند ہے۔ یہ کیسی بدنصیبی ہے۔ پانچ وقت

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (الفاتحہ : ۶) کی دُعا کرتے ہیں اور اس پر بھی کچھ نہیں ملتا۔ تعجب! اللہ تعالیٰ کا خود ایسی تعلیم کرنا تو یہ معنے رکھتا ہے کہ مَیں تم پر انعام و اکرام کرنے کے لیے تیار ہوں جیسے کسی حاکم کے سامنے پانچ امیدوار ہوں اور وہ ان میں سے ایک کو کہے کہ تم یہاں حاضر رہو تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ اس کو ضرور کام دیا جاوے گا۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا تعلیم کی اور پانچ وقت یہ یہ پڑھی جاتی ہے مگر ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ اس کا کچھ بھی اثر اور نتیجہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ قرآن شریف کی ہتک اور اسلام کی ہتک نہیں؟ میرے اور ان کے درمیان یہی امر دراصل متنازع فیہ ہے۔ مَیں یہ کہتا ہوں کہ اسلام کے برکات اور تاثیرات جیسے پہلے تھیں ویسے ہی اب بھی ہیں۔ وہ خدا اپنے تصرفات اب بھی دکھاتا ہے اور کلام کرتا ہے۔ مگر یہ اس کے مقابلہ میں کہتے ہیں کہ اب یہ دروازہ بند ہو چکا ہے اور خدا تعالیٰ خاموش ہو گیا وہ کسی سے کلام نہیں کرتا۔ دُعاؤں میں تاثیر اور قبولیت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تاثیرات پیچھے رہ گئی ہیں اب نہیں۔ افسوس ان پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف اور خدا تعالیٰ کی قدر نہیں کی۔

اسلام زندہ مذہب اور ہماری کتاب زندہ کتاب اور ہمارا خدا زندہ خدا اور ہمارا رسُول زندہ رسُول۔ پھر اس کے برکات، انوار اور تاثیرات مُردہ کیونکر ہو سکتی ہیں؟ مَیں اس مخالفت کی کچھ پروا نہیں کر سکتا۔ ان کی مخالفت کے خیال سے مَیں خدا تعالےٰ اور اس کے رسُول اور اس کی کتاب کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

کیا اُمت میں وحی والہام کا دروازہ بند ہے

لاہور میں عبدالحکیم نام ایک شخص سے میری گفتگو ہوئی۔ اس نے کہا کہ الہام پہلی اُمتوں کا خاصہ تھا۔ یہاں تک کہ عورتوں کو وحی ہوتی تھی مگر اس اُمت میں یہ دروازہ بند ہے۔ کیسے شرم کی بات ہے۔ کیا یہ اُمت بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی گئی گذری ہو گئی اور خدا تعالیٰ نے اس کے لیے یہی چاہا ہے کہ وہ خیر الامم کہلا کر بھی محروم رہے؟

اس عبدالحکیم نے تو یہاں تک کہدیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی محدَّث نہ تھے۔ وہ بھی صرف ان کو ایک خوش کرنے کی بات تھی۔ محدَّث وہ بھی نہ تھے۔

مختصر یہ کہ اس قسم کی ہتک اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لوگ کرتے ہیں۔ پھر مَیں ان کی مخالفت کی کیا پروا کروں؟ یہ لوگ اسلام کے دوست نہیں۔ دشمن ہیں۔ اگر بقول ان کے سب بے نصیب ہیں تو پھر کیا فائدہ؟ ہزار اِتباع کریں۔ معرفت نہ بڑھے گی تو کوئی احمق اور نادان ہی ہوگا جو اس پر

بھی اتباع ضروری سمجھے۔ حضرت عیسیٰ کا آنا نہ آنا تو امر ہی الگ ہے۔ اس سوال کو پیچھے چھوڑ دو۔ پہلے یہ تو فیصلہ کرو کہ کیا اس اُمت پر بھی وہ برکات اور فیوض ہوں گے یا نہیں؟ جب یہ فیصلہ ہوئے تو پھر عیسیٰ کی آمد کا سوال جھٹ حل ہو سکتا ہے۔

یہ لوگ جن مہلکات میں پھنسے ہوتے ہیں۔ وہ بہت خطرناک مرض ہے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہوگی کہ اس اُمت کی نسبت باوجود خیر الامم ہونے کے یہ یقین کر لیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل شرفِ مکالمہ سے محروم ہے۔ اور خواہ ساری عمر کوئی مجاہدہ کرتا رہے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا (نعوذ باللہ) جیسے کہدیا جاوے کہ خواہ ہزار ہاتھ تک کھودتے چلو مگر پانی نہیں ملے گا۔ اگر یہ سچ ہے جیسا کہ ہمارے مخالف کہتے ہیں تو مجاہدہ اور دُعا کی کیا حاجت ہے؟ کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ جس کو ممکن الحصول سمجھتا ہے۔ اسے تلاش کرتا ہے اور اس کے لیے سعی کرتا ہے اور اگر اسے یہ خیال اور یقین نہ ہو تو وہ مجاہدہ اور سعی کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ جیسے ہُما یا عنقا کی کوئی تلاش نہیں کرتا۔ اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ یہ چیزیں ناممکن الحصول ہیں۔ پس اسی طرح جب یہ یقین کر لیا کہ اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف ملنے کا ہی نہیں اور خوارق اب دیئے ہی نہیں جا سکتے۔ تو پھر مجاہدہ اور دُعا جو اس کے لیے ضروری ہیں۔ محض بیکار ہوں گے اور اس کے لیے کوئی جرات نہ کرے گا اور اس اُمت کے لیے نعوذ باللہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل : ۷۲) صادق آئے گا اور اس سے خاتمہ کا بھی پتہ لگ جائے گا کہ وہ کیسا ہوگا کیونکہ اس میں تو کوئی شک و شُبہ ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ جہنمی زندگی ہے۔ پھر آخرت میں بھی جہنم ہی ہوگا اور اسلام ایک جھوٹا مذہب ٹھہرے گا اور نعوذ باللہ خدا تعالیٰ نے بھی اس امت کو دھوکا دیا کہ خیر الامت بنا کر پھر کچھ بھی اسے نہ دیا۔

اس قسم کا عقیدہ رکھنا ہی کچھ کم بدقسمتی اور اسلام کی ہتک نہ تھی کہ اس پر دوسری مصیبت یہ آئی کہ اس کے لیے وجوہات اور دلائل پیدا کرنے لگے؛ چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ دروازہ مکالمات و مخاطبات کا اس وجہ سے بند ہو گیا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب : ۴۱) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اس لیے آپ کے بعد یہ فیض اور فضل بند ہو گیا مگر ان کی عقل اور علم پر افسوس آتا ہے کہ یہ نادان اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر ختمِ نبوت کے ساتھ ہی معرفت اور بصیرت کے دروازے بھی بند ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) خاتم النبیین تو کجا نبی بھی ثابت نہ ہوں گے۔ کیونکہ نبی کی آمد اور بعثت تو اس غرض کے لیے ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ پر ایک یقین اور

بصیرت پیدا ہو اور ایسا ایمان ہو جو لذیذ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے تصرفات اور اس کی قدرتوں اور صفات کی تجلی کو انسان مشاہدہ کرے اور اس کا ذریعہ بھی اس کے مکالمات و مخاطبات اور خوارقِ عادات ہیں لیکن جب یہ دروازہ ہی بند ہو گیا تو پھر اس بعثت سے فائدہ کیا ہوا؟

مَیں بڑے افسوس سے کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز ہرگز قدر نہیں کی اور آپ کی شانِ عالی کو بالکل نہیں سمجھا ورنہ اس قسم کے بیہودہ خیالات یہ نہ تراشتے اس آیت کے اگر یہ معنے جو یہ پیش کرتے ہیں تسلیم کر لیے جاویں تو پھر گویا آپ کو نعوذ باللہ ابتر ماننا ہو گا۔ کیونکہ جسمانی اولاد کی نفی تو قرآن شریف کرتا ہے اور رُوحانی کی یہ نفی کرتے ہیں تو پھر باقی کیا رہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان کمال اور آپ کی قوتِ قدسیہ کا زبردست اثر بیان کرتا ہے کہ آپ کی روحانی اولاد اور رُوحانی تاثیرات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ آئندہ اگر کوئی فیض اور برکت کسی کو مل سکتی ہے تو اسی وقت اور اسی حالت میں مل سکتی ہے جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع میں کھویا جاوے اور فنافی الرسول کا درجہ حاصل کرے۔ بُدوں اسکے نہیں اور اگر اسکے سوا کوئی شخص ادّعائے نبوت کرے تو وہ کذّاب ہو گا۔ اس لیے نبوتِ مستقلہ کا دروازہ بند ہو گیا اور کوئی ایسا نبی جو بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور ورزش شریعت اور فنافی الرسول ہونے کے مستقل نبی صاحبِ شریعت نہیں ہو سکتا۔ ہاں فنافی الرسول اور آپ کے امتی اور کامل متبعین کے لیے یہ دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

اسی لیے براہین میں یہ الہام درج ہے۔

كُلُّ بَرَكَةٍ مِّنْ مُّحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَبَارَكَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ

یعنی یہ مخاطبات اور مکالمات کا شرف جو مجھے دیا گیا ہے یہ محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا طفیل ہے اور اسی لیے یہ آپ ہی سے ظہور میں آ رہے ہیں۔ جس قدر تاثیرات اور برکات و انوار ہیں وہ آپ ہی کے ہیں۔

اب حضرت عیسٰی کے لیے تم خود فتویٰ دو کہ اس کے متعلق تم کیا سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو۔ کیا یہ مانتے ہو کہ اس کو جو کچھ دیا جائے گا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اُمتی ہونے اور آپ کی کامل اتباع کی وجہ سے نصیب ہو گا یا پہلے سے انہیں دیا گیا ہے؟

یہ مانتے ہیں کہ وہ توریت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا متبع تھا۔ پھر یہ تو توریت کا فخر ہوا نہ کہ قرآن مجید کا۔ پھر کیسی بیہودگی ہے کہ ایسا عقیدہ رکھا جاوے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید

کی ہتکِ شان کا موجب ہو۔ اس لیے یہ ضرور ہے کہ آنے والا مسیح اسی اُمّت سے ہو اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برکت اور تعلیم پائے اور آپؐ ہی کے فیض اور ہدایت سے روشنی حاصل کرے۔

اُمّتی کی حقیقت

مَیں نے دیکھا ہے کہ ہمارے مخالف اس موقعہ پر چالاکی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ آنے والا عیسٰی اُمّتی ہوگا۔ یہ مصیبت انہیں بخاری اور مسلم سے آئی کیونکہ اس میں اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ اور اَمَّکُمْ مِنْکُمْ لکھا ہوا ہے۔ اس لیے حضرت عیسٰی کو اُمّتی بناتے ہیں مگر نہیں سمجھتے کہ اُمّتی تو وہ ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بغیر گمراہ تھا جو رُشد اور ہدایت اس نے پائی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتّباع اور تعلیم سے پائی۔ مگر یہ وہ تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پہلے گمراہ تھے اور اب بھی گمراہ ہیں۔ جس وقت آئیں گے اس وقت آپ کی ہدایت اور تعلیم پر عمل کرنے سے وہ درجہ اور عزّت انہیں ملے گی۔ پھر اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ کا مفہوم اس صورت میں تو درست نہ ٹھہرا۔

افسوس کا مقام ہے کہ ان لوگوں نے قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر غور کرنا چھوڑ دیا ہے اور جو حَکَم ہو کر آیا تھا اسکا انکار کر دیا۔ پھر ان کو سمجھ آوے تو کیونکر۔

اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ صاف طور پر یہی ظاہر کرتا تھا کہ آنے والا امام تم میں سے ہی ہوگا مگر یہ اس پر راضی نہیں ہوتے۔ یہ اُمّت کو شرّ الاُمم اور یہودی بنا کر تو خوش ہو جاتے ہیں لیکن مسیح اور امام کا آنا اس اُمّت سے تسلیم نہیں کرتے۔ اب یا تو حضرت مسیح کی نسبت یہ اقرار کریں کہ وہ گمراہ ہیں (معاذ اللہ) جیسا کہ عیسائیوں نے اقرار کر لیا کہ وہ ملعون ہیں (نعوذ باللہ) عیسائیوں نے لعنتی تو ان کو کہہ دیا مگر لعنت کے مفہوم سے بے خبر ہیں۔ اگر ان کو پہلے خبر ہوتی کہ لعنت کا یہ مفہوم ہے تو کبھی نہ کہتے۔ مَیں نے فتح مسیح کو لکھا کہ لعنت کا مفہوم تو یہ ہے کہ ملعون رانْدۂ درگاہ ہو اور خدا اس سے بیزار اور وہ خدا سے بیزار ہو اور شیطان سے جا ملے۔ اب بتاؤ کہ تم مسیح کے لیے یہ لفظ تجویز کرتے ہو؟ تو آخر وہ جواب نہ لکھ سکا۔ اور حقیقت میں اس کا جواب ہے ہی نہیں۔ انہوں نے غلطی سے لعنت کے مفہوم سے بے خبر رہ کر یہ لفظ ان کے لیے تراش لیا۔ اب جو خبر ہوئی تو فکر پڑی کہ کیا کیا جاوے[1]۔

اسی طرح پر اگر یہ لوگ اُمّتی کے مفہوم پر نظر ڈالیں اور غور کریں تو غلطی نہ کھائیں۔ کیونکہ اُمّتی کے معنے یہی ہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان و برکات سے مستفیض ہو۔ اور ترقی کرے۔

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ صفحہ ۳ تا ۶ مورخہ ۳۱؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

لیکن جس کے لیے یہ کہتے ہیں وہ تو پہلے ہی پیغمبر ہے۔ اس کو کونسا موقعہ ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ کرے۔

مسیح موعود کی نبوّت

پھر نبی کے لفظ پر بھی بحث کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دعویٰ نبوّت ہے۔ مَیں کہتا ہوں یہ تو نری لفظی نزاع ہے نبی تو خبر دینے والے کو کہتے ہیں اب جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مخاطبات اور مکالمات ہوتے ہیں۔ اس کا کیا نام رکھا جاوے گا۔ اور یہ نبوّت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہی طفیل اور اتباع کا نتیجہ ہے۔ مَیں اس کو کفر اور لعنت سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ کئے بغیر کوئی شخص نبوّت کے چشمہ سے حصّہ لیتا ہے اور مستقل نبوّت کا مدّعی ہے۔ یہ نرے دھوکے ہیں جو ان لوگوں کو لگے ہوئے ہیں اور بعض باوجودیکہ اس امر کو بخوبی سمجھتے ہیں لیکن جہلاء اور عوام کو بھڑکانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں تاکہ وہ میری کتابوں سے بیزار ہو جائیں اور انہیں پڑھ کر فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔

مسیح علیہ السلام کے لیے تجویز کردہ خصوصیات

کاش یہ لوگ سمجھتے کہ انہوں نے حضرت مسیح کے لیے جو خصوصیتیں تجویز کی ہیں ان کا نتیجہ کیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ مسِّ شیطان سے وہی پاک ہے اور رُوح القدس کے سایہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر وہی گئے ہیں اور کوئی دُوسرا اس میں شریک نہیں۔ پھر وہی آسمان سے اُترے گا اور قیامت کے قریب آخری قاضی وہی ہوں گے اور پھر یہ بھی خصوصیت کہ دو ہزار برس ہونے کو آئے وہ اب تک آسمان پر ہیں اور کھانے پینے اور دیگر حوائج انسانی کے محتاج نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بھوک سے پتھر پیٹ پر باندھ لیتے مگر ان کو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ کوئی اثر زمانہ کا اس پر نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پر بیماری کا اثر ہو مسیح پر بالکل نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شیب اور پیرانہ سالی کے آثار ظاہر ہوں مگر مسیح ان سے بھی محفوظ ۔ اب سوچو اور بتاؤ کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ یقیناً یہی نتیجہ ہوگا کہ انہیں ساری دنیا سے الگ اور نرالا مانا جاوے یا دوسرے الفاظ میں ان کو خدا ہی کہا جاوے اس لیے کہ ایسی خصوصیتیں یقیناً انہیں خدا بناتی ہیں اور عیسائی اس کو پیش کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و برکات جاری ہیں

غرض اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دے کر اُن کے الزاموں سے اُن کو بَری کیا تھا تاکہ اُن کو زک دے اور پھر اس سلسلہ محمدیہ

کو قائم کرکے بتا دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا فضل جس طرف وہ چاہتا ہے آتا ہے خواہ اسرائیلیوں میں ہو خواہ اسماعیلیوں میں۔ اب تو یہودیوں کے ہاتھ میں نِرا حسد ہے۔ لیکن اگر وہ دیکھیں کہ ان کے کمالات کا سلسلہ بند نہیں ہوا تو پھر نِری رسالت سے کیا حسد۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود عدم وجود معاذ اللہ برابر ہو جاتے گا۔ کیونکہ آپؐ کے کمالاتِ فیوض اور برکات کا سِلسلہ بجائے آگے چلنے کے انہیں پر ختم ہو گیا۔

مجھے سخت تعجب آتا ہے کہ یہ لوگ میری مخالفت میں کچھ ایسے اندھے ہو رہے ہیں کہ وہ اس کے انجام اور نتائج سے بالکل بے خبر اور بے پروا ہو رہے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اگر آپ کا سلسلہ آپ سے ہی شروع ہو کر آپ ہی پر ختم ہو گیا تو آپ اَبتَر ٹھہریں گے (معاذ اللہ) حالانکہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (الکوثر: ۴) یعنی تجھے تو ہم نے کثرت کے ساتھ رُوحانی اولاد عطا کی ہے جو تجھے بے اولاد کہتا ہے وہی اَبتَر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسمانی فرزند تو کوئی تھا نہیں۔ اگر رُوحانی طور پر بھی آپ کی اولاد کوئی نہیں تو ایسا شخص خود بتاؤ کیا کہلاوے گا؟ میں تو اس کو سب سے بڑھ کر بے ایمانی اور کُفر سمجھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس قسم کا خیال بھی کیا جاوے۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر: ۲) کسی دوسرے نبی کو نہیں کہا گیا۔ یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا خاصہ ہے۔ آپؐ کو اس قدر رُوحانی اولاد عطا کی گئی جس کا شمار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ قیامت تک یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ رُوحانی اولاد ہی کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نبی ہیں کیونکہ آپؐ کے انوار و برکات کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جیسے اولاد میں والدین کے نقوش ہوتے ہیں اسی طرح رُوحانی اولاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اور فیوض کے آثار اور نشانات موجود ہیں۔ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِّاَبِيْهِ۔

اُمّتِ محمدیہ کا شرف

صوفیوں نے اس حدیث عُلَمَآءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ کو صحیح مانا ہے اور فی الحقیقت یہ صحیح ہے اور یہودیوں پر اسی سے مار پڑتی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس اُمّت کو ایسا شرف عطا فرمایا کہ علماءِ اُمّت کو انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ٹھہرایا۔ علماء کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۹) یعنی بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس کے بندوں میں سے وہی عالم ہیں۔ ان میں عبودیتِ تامہ اور خشیت اللہ اس حد تک پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے ایک علم اور معرفت سیکھتے ہیں اور اسی سے فیض پاتے ہیں اور یہ مقام اور درجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اِتّباع اور آپ سے پوری محبت سے ملتا ہے یہانتک کہ

انسان بالکل آپ کے رنگ میں رنگین ہو جاوے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران: ۳۲)

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس اتباع کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ پس اب اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ جب تک انسان کامل متبع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ سے فیوض و برکات پا نہیں سکتا اور معرفت اور بصیرت جو اس کی گناہ آلود زندگی اور نفسانی جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کر دے عطا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ ہیں جو عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ کے مفہوم کے اندر داخل ہیں۔

غرض ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمایا کہ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ اور دوسری طرف اس اُمت کو كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (آل عمران: ۱۱۱) کہا تاکہ یہودیوں پر رد ہو۔ مگر میرے مخالف عجیب بات کہتے ہیں کہ یہ اُمت باوجود خیر الامت ہونے کے پھر شر الامت ہے۔ بنی اسرائیل میں تو عورتوں تک کو شرفِ مکالمہ الٰہیہ دیا گیا۔ مگر اس اُمت کے مرد بھی خواہ کیسے ہی متقی ہوں اور خدا تعالیٰ کی رضا جوئی میں مریں اور مجاہدہ کریں مگر ان کو حصّہ نہیں دیا جائے گا اور یہی جواب ان کے لیے خدا کی طرف سے ہے کہ بس تمہارے لیے مُہر لگ چکی۔ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گستاخی اور اس پر سُوءِ ظن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور اسلام کی ہتک کیا ہوگی۔ دُوسری قوموں کو ملزم کرنے کے لیے یہی تو زبردست اور بے مثل اَوزار ہمارے ہاتھ میں ہے اور اسی کو تم ہاتھ سے دیتے ہو۔

سلسلہ موسوی اور سلسلہ محمدیہ میں مشابہت

پھر ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو سلسلے قائم کیے تھے۔ پہلا سلسلہ سلسلۂ موسوی تھا۔ دوسرا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ یعنی محمدی سلسلہ۔ اور اس دُوسرے سلسلہ کو مثیل ٹھہرایا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مثیلِ موسیٰ کہا گیا تھا۔ توریت کی کتاب استثناء میں یہی لکھا تھا کہ تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی اُٹھاؤنگا اور قرآن شریف میں یہ فرمایا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل: ۱۶) یعنی بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شاہد ہے۔ اسی طرح یہ رسُول بھیجا گیا ہے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسُول بھیجا گیا تھا (یعنی موسیٰ کی طرح) اب غور کرو کہ اس میں كَمَا کا لفظ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں بھی کمالات و برکات کی کمی نہ ہوگی۔

پھر سورہ نور میں آیت استخلاف میں بھی یہی كَمَا کا لفظ آیا۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (النور : ۵۶) اسی اُمّت کے اب مومنین اور اعمال صالحہ بجالانے والوں سے خلافت کا وعدہ کیا گیا اسی طرح پر جس طرح بنی اسرائیل میں خلفاء کئے گئے تھے۔ یہاں بھی وہی کَمَا کا لفظ موجود ہے۔ ایک طرف تو اس سلسلہ کو سلسلہ موسویہ کا مثیل ٹھہرایا۔ دُوسری جگہ سلسلہ موسوی کی طرح خلفاء بنانے کا وعدہ کیا۔ پھر کیا دونوں سلسلوں کا طبعی توافق ظاہر نہیں کرتا کہ اس اُمّت میں خلفاء اسی رنگ کے قائم ہوں؟ ضرور کرتا ہے۔

اور اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں کہ سلسلہ موسویہ میں تیرھواں خلیفہ مسیح تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سلسلہ محمّدیہ میں تیرھواں خلیفہ مسیح نہ کہلاتے؟ اس لیے ضرور تھا کہ آنے والے کا نام مسیح رکھا جاتا۔ یہی سِر ہے جو خُدا تعالیٰ نے اس اُمّت میں بھی ایک مسیح کا وعدہ کیا۔

بعض نادان اعتراض کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تو مثیل موسیٰ رکھا ہے۔ مگر آخر میں آنے والے خلیفہ کا نام عیسیٰ رکھا ہے مثیلِ عیسیٰ نہیں رکھا اس لیے وہ آپ ہی آجائے گا۔

اس قسم کے اعتراض بظاہر دھوکا دہ ہیں اور ممکن ہے کہ وہ آدمی جو اصل حالات سے واقف نہیں۔ اس کو سُنکر گھبرا جاوے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تو مثیل موسیٰ ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ توریت کی کتاب استثناء میں مثیل موسیٰ ہی کہا گیا تھا۔ پس اگر آپ موسیٰ ہونے کا دعویٰ کرتے تو کتاب والے کہتے کہ ہمیں تو مثیل موسیٰ کا وعدہ دیا گیا ہے نہ کہ موسیٰ کا۔ اس لیے ان کو توجہ دلانے کے واسطے وہی لفظ رکھا جو وہاں موجود تھا مگر یہاں اس کے خلاف بات تھی۔ پہلی کتابوں سے اور انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ آئے گا۔ مگر جب یہ ثابت ہو چکا کہ وہ وفات پاچکے ہیں اور آچکے ہیں تو کوئی خیال بھی نہیں کرے گا کہ وہ زندہ ہو کر آجائیں گے۔

عیسٰی علیہ السلام کی وفات

رہا وفات کا مسئلہ۔ وہ ایسا صاف ہے کہ اس پر زیادہ کہنے کی حاجت ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اپنے قول سے يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ (اٰل عمران : ۵۶) اور حضرت مسیح نے اپنے اقرار سے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي (المائدۃ : ۱۱۸) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رؤیت سے جبکہ معراج کی رات حضرت عیسیٰ کو حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کے ساتھ اکٹھا دیکھا۔ ثابت کر دیا ہے کہ وہ وفات پاچکے ہیں؛ ورنہ اگر وہ زندہ ہیں تو مُردہ کے پاس رہنے کا کیا تعلق؟ اور اسکے علاوہ صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پہلا اجماع یہی کیا کہ مسیح فوت ہو گیا۔ جیسا کہ بارہا میں نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی وفات پر تلوار نکال لی اور کہا اگر کوئی آپؐ کو مُردہ کہے گا تو اس کا سَر اُڑا دوں گا۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران: ۱۴۵) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک رسول ہیں اور آپؐ سے پیشتر سب رسول وفات پا چکے ہیں۔ اب بتاؤ۔ اس میں مسیح یا کسی اَور کی کیا خصوصیت ہے؟ کیا حضرت ابوبکرؓ نے کسی کو باہر رکھ لیا تھا اور صحابہؓ کب گوارا کر سکتے تھے کہ وہ کسی اَور کو تو زندہ تسلیم کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تجویز کریں کہ آپؐ نے وفات پائی ہے۔

غرض صحابہؓ کا اجماع بھی موت پر مُہر کرتا ہے اور پھر عقل سلیم تو دُور سے اس کو دھکے دیتی ہے۔ عام طور پر ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اگر عقل کے سامنے یہ پیش کریں کہ کانوں سے دیکھتے ہیں تو وہ کب اس کو مان لے گی۔ اسی طرح جب آدم سے لے کر اب تک آسمان پر زندہ اسی جسم کے ساتھ جانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی تو ہم کیونکر مان لیں کہ مسیح زندہ اور اسی جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چلا گیا۔ نظیر اگر کوئی ملتی ہے تو وہ ایلیاء کی آمد کی نظیر ہے جس کا وعدہ ملاکی نبی کی کتاب میں کیا گیا تھا اور اس کے آنے کا فیصلہ خود حضرت مسیح نے کیا کہ آنیوالا ایلیاء یہی یوحنا ہے۔ چاہو تو قبول کرو۔ اب اس نظیر سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ آمد کے یہی معنے ہوتے ہیں اور ایسے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر فیصلہ موت میں شک ہو تو پہلے ان دلائل کو توڑو اور پھر آنے والے کا جو فیصلہ حضرت عیسٰی کی اپنی عدالت سے ہوا۔ اس کے خلاف کوئی فیصلہ پیش کرو۔ انہوں نے تو ثابت کیا کہ آنیوالا بروزی رنگ میں آیا کرتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ وہ حقیقی مُردے زندہ کر دیا کرتے تھے۔ پس اگر یہ سچ ہے تو کیوں انہوں نے ایلیاء کو زندہ نہ کر لیا تاکہ ان کی نبوت مشتبہ نہ ہوتی اور یہودیوں کی قوم تباہ نہ ہوتی۔ انہوں نے ملاکی نبی کی پیشگوئی ہی کا تو سوال کیا تھا۔ ان کی راہ میں روک اور پتھر وہی امر ہوا نہ کوئی اَور۔ اس تاویل پر جو حضرت مسیح نے کی تھی وہ راضی نہ ہوئے اور انکار کر کے لعنتی ٹھہرے۔

بعض اوقات جب اس دلیل کا نقض ہمارے مخالف نہیں کر سکتے تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ کتابیں محرّف مبدّل ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ محرّف و مبدّل ہی سہی لیکن تواتر قومی کو کیا کرو گے؟ یہودی اب تک موجود ہیں۔ ان سے پُوچھ لو کہ کیا وہ اس امر کے منتظر نہیں ہیں کہ مسیح سے پہلے ایلیاء ضرور آئے گا اور عیسائی بھی اس کے قائل۔ اگر وہ قائل نہ ہوتے تو ایلیاء کا بروز یُوحنا کو کیوں تسلیم کرتے۔

پس یہودی اور عیسائی باوجودیکہ وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مگر اس امر پر بالکل متفق ہیں۔ ایسی صورت میں یہ امر بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ یہ امور ہمارے زبردست مؤید ہیں جیسے یحیٰی کا نام الیاس رکھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے میرا نام عیسٰی رکھا۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ اس نام میں حکمت کیا ہوئی؟

اس کے جواب میں یاد رہے کہ یہود اسی شرارت کی وجہ سے منحرف ہوتے تھے کہ الیاس نہیں آیا؛ چنانچہ ایک فاضل یہودی کی کتاب میرے پاس موجود ہے اس نے اس امر پر بڑا زور دیا ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر قیامت کو ہم سے سوال ہوگا تو ہم ملاکی نبی کا صحیفہ پیش کریں گے کہ اس میں کہاں لکھا ہے کہ مثیل آئے گا؟۔

پس یہودیوں کے لعنتی اور منحرف ہونے کے لیے یہ ابتلا انہیں آگیا۔ اس امت کے لیے سلسلہ موسوی کی مماثلت کے لحاظ سے ضروری تھا کہ ایک مسیح آئے اور علاوہ بریں چونکہ اس اُمّت کے لیے یہ کہا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں وہ یہود کے ہمرنگ ہو جائے گی؛ چنانچہ بالاتفاق غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ: ۷) میں مغضوب سے مراد یہود لی گئی ہے۔ پھر یہ یہودی تو اسی وقت ہوتے جب ان کے سامنے بھی ایک عیسیٰ پیش ہوتا اور اسی طرح پر یہ بھی انکار کر دیتے؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آنے والا عیسیٰ آگیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو زیادہ ملزم ہیں۔ اس لیے کہ ان کے سامنے ایلیاء والی نظیر موجود تھی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ انہوں نے غور ہی نہیں کیا اور نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے۔[1] آمین۔

---

۲۷ ستمبر ۱۹۰۵ء

فرمایا:

انکسار اور فروتنی ماموروں کا خاصہ ہے

اللہ تعالیٰ بہت رحیم وکریم ہے۔ وہ ہر طرح انسان کی پرورش فرماتا اور اس پر رحم کرتا ہے اور اسی رحم کی وجہ سے وہ اپنے ماموروں اور مرسلوں کو بھیجتا ہے تا وہ اہلِ دُنیا کو گناہ آلود زندگی سے نجات دیں۔ مگر تکبّر بہت خطرناک بیماری ہے جس انسان میں یہ پیدا ہو جاوے اس کے لیے رُوحانی موت ہے۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ بیماری قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ متکبّر شیطان کا بھائی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ تکبّر ہی نے شیطان کو ذلیل وخوار کیا۔ اس لیے مومن کی یہ شرط ہے کہ اس میں تکبّر نہ ہو بلکہ انکسار، عاجزی، فروتنی اس میں پائی جائے اور یہ خدا تعالیٰ کے ماموروں کا خاصہ ہوتا ہے ان میں حد درجہ کی فروتنی اور انکسار ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ وصف تھا۔ آپؐ کے ایک خادم سے پوچھا گیا کہ تیرے ساتھ آپؐ کا کیا معاملہ ہے۔ اس نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء

مجھ سے زیادہ وہ میری خدمت کرتے ہیں (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ)

یہ ہے نمونہ اعلیٰ اخلاق اور فروتنی کا۔ اور یہ بات بھی سچ ہے کہ زیادہ تر عزیزوں میں خدام ہوتے ہیں جو ہر وقت گرد و پیش حاضر رہتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی کے انکسار و فروتنی اور تحمل و برداشت کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان سے معلوم ہو سکتا ہے۔ بعض مرد یا عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ خدمتگار سے ذرا کوئی کام بگڑا۔ مثلاً چائے میں نقص ہوا تو جھٹ گالیاں دینی شروع کر دیں یا تازیانہ لے کر مارنا شروع کر دیا اور ذرا شوربے میں نمک زیادہ ہو گیا بس بیچارے خدمتگاروں پر آفت آئی۔

دوسرے غرباء کے ساتھ معاملہ تب پڑتا ہے کہ وہ فاقہ مست ہوتے ہیں اور خشک روٹی پر گذارہ کر لیتے ہیں مگر یہ باوجود علم ہونے کے بھی پروا نہیں کرتے۔ وہ ان کو امتحان میں ڈالتے ہیں جب بصورت سائل آتے ہیں۔ خدا تعالیٰ تو ذرہ ذرہ کا خالق ہے کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ غریبوں کے ساتھ ہی معاملہ کر کے سمجھا جاتا ہے کہ کس قدر ناخدا ترسی یا خدا ترسی سے حصہ لیتا ہے یا لے گا۔

نوعِ انسان پر شفقت کرنا عبادت ہے

ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ بعض بندوں سے فرمائے گا کہ تم بڑے برگزیدہ ہو اور میں تم سے بہت خوش ہوں کیونکہ میں بہت بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں ننگا تھا تم نے کپڑا دیا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں بیمار تھا تم نے میری عیادت کی۔ وہ کہیں گے کہ یا اللہ تُو تو ان باتوں سے پاک ہے تو کب ایسا تھا جو ہم نے تیرے ساتھ ایسا کیا؟ تب وہ فرمائے گا کہ میرے فلاں فلاں بندے ایسے تھے تم نے ان کی خبر گیری کی وہ ایسا معاملہ تھا کہ گویا تم نے میرے ساتھ ہی کیا۔ پھر ایک اور گروہ پیش ہو گا۔ اُن سے کہے گا کہ تم نے میرے ساتھ بُرا معاملہ کیا۔ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ دیا، پیاسا تھا پانی نہ دیا، ننگا تھا کپڑا نہ دیا۔ میں بیمار تھا میری عیادت نہ کی۔ تب وہ کہیں گے کہ یا اللہ تعالیٰ تو تو ایسی باتوں سے پاک ہے۔ تو کب ایسا تھا جو ہم نے تیرے ساتھ ایسا کیا۔ اس پر فرمائے گا کہ میرا فلاں فلاں بندہ اس حالت میں تھا اور تم نے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی اور سلوک نہ کیا وہ گویا میرے ہی ساتھ کرنا تھا۔

غرض نوعِ انسان پر شفقت اور اس سے ہمدردی کرنا بہت بڑی عبادت ہے اور اللہ تعالےٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے یہ ایک زبردست ذریعہ ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس پہلو میں بڑی کمزوری ظاہر کی جاتی ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ان پر ٹھٹھے کیے جاتے ہیں۔ ان کی خبر گیری کرنا اور

کسی مصیبت اور مشکل میں مدد دینا تو بڑی بات ہے۔ جو لوگ غرباء کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش نہیں آتے بلکہ ان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ خود اس مصیبت میں مبتلا نہ ہو جاویں۔ اللہ تعالیٰ نے جن پر فضل کیا ہے اس کی شکرگذاری یہی ہے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ احسان اور سلوک کریں۔ اور اس خداداد فضل پر تکبّر نہ کریں اور وحشیوں کی طرح غرباء کو کچل نہ ڈالیں۔

بہت سی سعادتیں غربائ کے ہاتھ میں ہیں

خُوب یاد رکھو کہ امیری کیا ہے؟ امیری ایک زہر کھانا ہے۔ اس کے اثر سے وہی بچ سکتا ہے جو شفقت علیٰ خلق اللہ کے تریاق کو استعمال کرے اور تکبّر نہ کرے لیکن اگر وہ اس کی شیخی اور گھمنڈ میں آتا ہے تو نتیجہ ہلاکت ہے۔ ایک پیاسا ہو اور ساتھ کنواں بھی ہو لیکن کمزور ہو اور غریب ہو اور پاس ایک متموّل انسان ہو تو وہ محض اس خیال سے کہ اس کو پانی پلانے سے میری عزت جاتی رہے گی اس نیکی سے محروم رہ جائے گا۔ اس نخوت کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ نیکی سے محروم رہا اور خدا تعالیٰ کے غضب کے نیچے آیا۔ پھر اس سے کیا فائدہ پہنچا۔ یہ زہر ہوا یا کیا؟ وہ نادان ہے سمجھتا نہیں کہ اس نے زہر کھائی ہے لیکن تھوڑے دنوں کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اس نے اپنا اثر کر لیا ہے اور وہ ہلاک کر دے گی۔

یہ بالکل سچّی بات ہے کہ بہت سی سعادت غرباء کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے انہیں امیروں کی امیری اور تموّل پر رشک نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ انہیں وہ دولت ملی ہے جو ان کے پاس نہیں۔ ایک غریب آدمی بے جا ظلم، تکبّر، خود پسندی، دوسروں کو ایذا پہنچانے اتلافِ حقوق وغیرہ بہت سی برائیوں سے مُفت میں بچ جائے گا۔ کیونکہ وہ جھوٹی شیخی اور خود پسندی جو ان باتوں پر اسے مجبور کرتی ہے اس میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مامُور اور مُرسل آتا ہے تو سب سے پہلے اس کی جماعت میں غرباء داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں تکبّر نہیں ہوتا۔ دولت مندوں کو یہی خیال اور فکر رہتا ہے کہ اگر ہم اس کے خادم ہو گئے تو لوگ کہیں گے کہ اتنا بڑا آدمی ہو کر فلاں شخص کا مُرید ہو گیا ہے اور اگر ہو بھی جاوے تب بھی وہ بہت سی سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اِلَّا ماشاء اللہ۔ کیونکہ غریب تو اپنے مرشد اور آقا کی کسی خدمت سے عار نہیں کرے گا مگر یہ عار کرے گا۔ ہاں اگر خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے اور دولت مند آدمی اپنے مال و دولت پر ناز نہ کرے اور اس کو بندگانِ خدا کی خدمت میں صرف کرنے اور ان کی ہمدردی میں لگانے کے لیے موقع پائے اور اپنا فرض سمجھے تو پھر وہ ایک خیرِ کثیر کا وارث ہے۔

دشمن کے ساتھ بھی حد سے زیادہ سختی نہ ہو

اصل بات یہ ہے کہ سب سے مشکل اور نازک مرحلہ حقوق العباد ہی کا ہے کیونکہ ہر وقت

اس کا معاملہ پڑتا ہے اور ہر آن یہ ابتلا سامنے رہتا ہے۔ پس اس مرحلہ پر بہت ہی ہوشیاری سے قدم اٹھانا چاہیے۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی حد سے زیادہ سختی نہ ہو۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اس کی تخریب اور بربادی کے لیے سعی کی جاوے۔ پھر وہ اس فکر میں پڑ کر جائز اور ناجائز امور کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اس کو بدنام کرنے کے واسطے جھوٹی تہمت اس پر لگاتے، افترا کرتے اور اس کی غیبت کرتے اور دوسروں کو اس کے خلاف اکساتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ معمولی دشمنی سے کس قدر برائیوں اور بدیوں کا وارث بنا اور پھر یہ بدیاں جب اپنے بچے دیں گی تو کہاں تک نوبت پہنچے گی۔

میں سچ کہتا ہوں کہ تم کسی کو اپنا ذاتی دشمن نہ سمجھو اور اس کینہ توزی کی عادت کو بالکل ترک کر دو۔ اگر خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اور تم خدا تعالیٰ کے ہو جاؤ۔ تو وہ دشمنوں کو بھی تمہارے خادموں میں داخل کر سکتا ہے، لیکن اگر تم خدا ہی سے قطع تعلق کیے بیٹھے ہو اور اس کے ساتھ ہی کوئی رشتہ دوستی کا باقی نہیں۔ اس کی خلاف مرضی تمہارا چال چلن ہے۔ پھر خدا سے بڑھ کر تمہارا دشمن کون ہوگا؟ مخلوق کی دشمنی سے انسان بچ سکتا ہے لیکن جب خدا دشمن ہو تو پھر اگر ساری مخلوق دوست ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تمہارا طریق انبیاء علیہم السلام کا سا طریق ہو۔ خدا تعالیٰ کا منشا یہی ہے کہ ذاتی اعداء کوئی نہ ہوں۔

خوب یاد رکھو کہ انسان کو شرف اور سعادت تب ملتی ہے جب وہ ذاتی طور پر کسی کا دشمن نہ ہو۔ ہاں اللہ اور اس کے رسول کی عزت کے لیے الگ امر ہے یعنی جو شخص خدا اور اس کے رسول کی عزت نہیں کرتا بلکہ ان کا دشمن ہے اسے تم اپنا دشمن سمجھو۔ اس دشمنی سمجھنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ تم اس پر افترا کرو اور بلاوجہ اس کو دکھ دینے کے منصوبے کرو نہیں۔ بلکہ اس سے الگ ہو جاؤ اور خدا تعالیٰ کے سپرد کرو۔ ممکن ہو تو اس کی اصلاح کے لیے دعا کرو۔ اپنی طرف سے کوئی نئی بھاجی اس کے ساتھ شروع نہ کرو۔

یہ امور ہیں جو تزکیہ نفس سے متعلق ہیں۔ کہتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک دشمن سے لڑتے تھے اور محض خدا کے لیے لڑتے تھے۔ آخر حضرت علیؓ نے اس کو اپنے نیچے گرا لیا اور اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھے۔ اُس نے جھٹ حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ فوراً اس کی چھاتی پر سے اُتر آئے اور اسے چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ اب تک تو میں محض خدا تعالیٰ کے لیے تیرے ساتھ لڑتا تھا لیکن اب جبکہ تو نے میرے منہ پر تھوک دیا ہے، تو میرے اپنے نفس کا بھی کچھ حصہ اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ پس میں نہیں چاہتا کہ اپنے نفس کے لیے تمہیں قتل کر دوں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے

نفس کے دشمن کو دشمن نہیں سمجھا۔ ایسی فطرت اور عادت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔ اگر نفسانی لالچ اور اغراض کے لیے کسی کو دُکھ دیتے اور عداوت کے سلسلوں کو وسیع کرتے ہیں تو اس سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کو ناراض کرنے والی کیا بات ہوگی۔

ہم سے دو شغل نہیں ہو سکتے

ایک شخص نے ایک جائیداد کے متعلق جو فروخت ہونے والی ہے کہا کہ آپ اس کو خرید لیں۔ ایسا نہ ہو کہ فلاں سکھ یا کوئی اَور خرید لے۔ فرمایا :

ہمیں ان باتوں سے کیا غرض۔ ہم جائیدادیں اور زمینیں خریدنے کے واسطے نہیں آئے۔ ہم کو کیا سکھ خرید لے یا کوئی اَور خرید لے۔ ہمیشہ اس شعر کو یاد رکھا جاوے ؎

خواجہ دربند نقش ایوان است
خانہ از پائے بست ویران است

ہم سے دو شغل نہیں ہو سکتے۔ یہی خدمت جو خدا تعالیٰ نے ہمارے سپرد کی ہے۔ پورے طور پر ادا ہو جائے تو کافی ہے اس کے سوا ہمیں اور کسی کام کے لیے نہ فرصت ہے نہ ضرورت۔

ایک شخص نے کہا کہ تجارت کے متعلق خواہ نخواہ سود دینا پڑتا ہے۔ فرمایا :

ہم جائز نہیں رکھتے۔ مومن ایسی مشکلات میں پڑتا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود اس کا تکفل کرتا ہے۔ عذرات سے شریعت باطل ہو جاتی ہے۔ کون امر ہے جس کے لیے کوئی عذر آدمی نہیں تراش سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔

دقائقِ تقویٰ کی رعایت ضروری ہے

کسی نے پوچھا کہ بعض آدمی غلہ کی تجارت کرتے ہیں اور خرید کر اُسے رکھ چھوڑتے ہیں جب مہنگا ہو جاوے تو اسے بیچتے ہیں۔ کیا ایسی تجارت جائز ہے؟

فرمایا :

اس کو مکروہ سمجھا گیا ہے۔ مَیں اس کو پسند نہیں کرتا۔ میرے نزدیک شریعت اَور ہے اور طریقت اَور ہے ایک آن کی بدنیتی بھی جائز نہیں اور یہ ایک قسم کی بدنیتی ہے ہماری غرض یہ ہے کہ بدنیتی دور ہو۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بابت لکھا ہے کہ آپ ایک مرتبہ بہت ہی تھوڑی سی نجاست جوان کے کپڑے پر تھی دھو رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ نے اس قدر کے لیے تو فتویٰ نہیں دیا۔ اس پر آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ آں فتویٰ است و ایں تقویٰ پس انسان کو دقائقِ تقویٰ کی رعایت رکھنی چاہیے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہ کرے تو پھر ایک دن وہی چھوٹی چھوٹی باتیں کبائر کا مرتکب بنا دیں گی اور طبیعت میں کسل اور لاپروائی پیدا ہو کر ہلاک ہو جاوے گا۔ تم اپنے زیر نظر تقویٰ کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنا رکھو اور اس کے لیے دقائقِ تقویٰ کی رعایت ضروری ہے۔

اسی طرح کہتے ہیں۔ ذوالنون مصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ چالیس مُہر کی کیا زکوٰۃ دینی چاہیے۔ ذوالنون نے کہا کہ چالیس مُہر کی زکوٰۃ چالیس مُہر۔ سائل اس جواب پر حیران ہوا۔ اور پوچھا کہ یہ کیوں؟ اس پر ذوالنون نے کہا کہ چالیس مُہر اس نے رکھی ہی کیوں؟ گویا کیوں خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کر دیں۔ جمع ہی کیوں کیا؟ شریعت سے ایسا ہی پایا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ کوئی محدث وعظ کرتا تھا۔ ایک صُوفی نے بھی سُنا اور اس کو کہا کہ محدث صاحب زکوٰۃ بھی دیا کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس تو مال ہی نہیں۔ زکوٰۃ کس چیز کی دُوں؟ صُوفی بولا۔ چالیس حدیثیں لوگوں کو سُنایا کرو تو ایک پر آپ بھی عمل کر لیا کرو۔

انسانوں کے تین طبقات

فرمایا :

اسلام میں انسان کے تین طبقے رکھے ہیں۔ ظالم لنفسہٖ۔ مقتصد۔ سابق بالخیرات۔ ظالم لنفسہٖ تو وُہ ہوتے ہیں جو نفس امّارہ کے پنجے میں گرفتار ہوں اور ابتدائی درجہ پر ہوتے ہیں۔ جہانتک ان سے ممکن ہوتا ہے وہ سعی کرتے ہیں کہ اس حالت سے نجات پائیں۔

مقتصد وہ ہوتے ہیں جن کو میانہ رو کہتے ہیں۔ ایک درجہ تک وہ نفس امّارہ سے نجات پا جاتے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کا حملہ ان پر ہوتا ہے اور وہ اس حملہ کے ساتھ ہی نادم بھی ہوتے ہیں۔ پورے طور پر ابھی نجات نہیں پائی ہوتی۔

مگر سابق بالخیرات وہ ہوتے ہیں کہ ان سے نیکیاں ہی سرزد ہوتی ہیں اور وہ سب سے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات طبعی طور پر اس قسم کی ہو جاتی ہیں کہ ان سے افعالِ حَسنہ ہی کا صدور ہوتا ہے۔ گویا اُن کے نفسِ امّارہ پر بالکل موت آ جاتی ہے اور وہ مطمئنہ حالات میں ہوتے ہیں۔ ان سے

اس طرح پر نیکیاں عمل میں آتی ہیں گویا وہ ایک معمولی امر ہے۔ اس لیے ان کی نظر میں بعض اوقات وہ امر بھی گناہ ہوتا ہے جو اس حد تک دوسرے اس کو نیکی ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی معرفت اور بصیرت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو صوفی کہتے ہیں حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ۔

مثلاً چندہ کی حالت پر ہی لحاظ کرو۔ ایک آدمی غریب اور دو آنہ روز کا مزدور ہے اور ایک دوسرا آدمی دو لاکھ روپیہ حیثیت رکھتا ہے اور ہزاروں کی روزانہ آمدنی ہے۔ وہ دو آنہ کا مزدور بھی اس میں سے دو پیسہ دیتا ہے اور وہ لاکھ پتی ہزاروں کی آمدنی والا دو روپیہ دیتا ہے، تو اگرچہ اُس نے اس مزدور سے زیادہ دیا ہے مگر اصل یہ ہے کہ اس مزدور کو تو ثواب ملے گا مگر اس دولت مند لاکھ پتی کو ثواب نہیں بلکہ عذاب ہوگا۔ کیونکہ اس نے اپنی حیثیت اور طاقت کے موافق قدم نہیں بڑھایا بلکہ گویہ بخل کیا ہے۔

غرض یہ ہے کہ جس قسم کا انسان ہو اسے اپنی طاقت اور قدرت کے موافق قدم بڑھانا چاہیے۔ ہر شخص اپنی معرفت کے لحاظ سے پوچھا جائے گا۔ جس قدر کسی کی معرفت بڑھی ہوئی ہوگی اسی قدر وہ زیادہ جوابدہ ہوگا۔ اسی لیے ذوالنون نے زکوٰۃ کا وہ نکتہ سُنایا یہ خلافِ شریعت نہیں ہے۔ اس کے نزدیک شریعت کا یہی اقتضا تھا وہ جانتا تھا کہ مال رکھنے کے لیے نہیں ہے بلکہ اُسے خدمتِ دین اور ہمدردی نوعِ انسان میں صرف کرنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آخری وقت ایک مُہر تھی۔ آپ نے اسے نکلوا دیا۔ اصل یہی ہے کہ ہر امر کے مراتب ہوتے ہیں۔ بعض آدمی شُبہ کریں گے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غنی کہلاتے تھے۔ انہوں نے کیوں مال جمع کیا؟ یہ ایک بیہودہ شُبہ ہے۔ اس لیے کہ وہ مہاجن نہ تھے۔ خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس غنی کے کیا معنے ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ جو مال خدمتِ دین کے لیے وقف ہو۔ وہ اس کا نہیں ہے۔ اس نیت اور غرض سے جو شخص رکھتا ہے وہ اپنے لیے جمع نہیں کرتا وہ خدا تعالیٰ کا مال ہے لیکن جو اپنے اغراضِ نفسانی اور دنیاوی کو ملحوظ رکھ کر جمع کرتا جاتا ہے۔ وہ مال داغ لگانے کے لیے ہے جس سے آخر اس کو داغ دیا جائے گا۔

وہ کام کرو جو اولاد کے لیے بہترین نمونہ اور سبق ہو

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اولاد کے لیے کچھ مال چھوڑنا چاہیے۔ مجھے حیرت آتی ہے کہ مال چھوڑنے کا تو ان کو خیال آتا ہے۔ مگر یہ خیال ان کو نہیں آتا کہ اس کا فکر کریں کہ اولاد صالح ہو طالح نہ ہو۔ مگر یہ وہم بھی نہیں آتا اور نہ اس کی پروا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے لوگ اولاد کے لیے مال جمع کرتے ہیں اور اولاد کی صلاحیت کی فکر اور پروا نہیں کرتے۔ وہ اپنی

زندگی ہی میں اولاد کے ہاتھ سے نالاں ہوتے ہیں اور اس کی بد اطواریوں سے مشکلات میں پڑ جاتے ہیں اور وہ مال جو انہوں نے خدا جانے کن کن حیلوں اور طریقوں سے جمع کیا تھا آخر بدکاری اور شراب خوری میں صرف ہوتا ہے اور وہ اولاد ایسے ماں باپ کے لیے شرارت اور بدمعاشی کی وارث ہوتی ہے۔

اولاد کا ابتلا بھی بہت بڑا ابتلا ہے۔ اگر اولاد صالح ہو تو پھر کس بات کی پروا ہو سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف : ۱۹۷) یعنی اللہ تعالیٰ آپ صالحین کا متولی اور متکفل ہوتا ہے۔ اگر بدبخت ہے تو خواہ لاکھوں روپیہ اس کے لیے چھوڑ جاؤ۔ وہ بدکاریوں میں تباہ کر کے پھر قلاش ہو جائے گی اور ان مصائب اور مشکلات میں پڑے گی جو اس کے لیے لازمی ہیں۔ جو شخص اپنی رائے کو خدا تعالیٰ کی رائے اور منشا سے متفق کرتا ہے وہ اولاد کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ اسی طرح پر ہے کہ اس کی صلاحیت کے لیے کوشش کرے اور دعائیں کرے۔ اس صورت میں خود اللہ تعالیٰ اس کا تکفل کرے گا۔ اور اگر بدچلن ہے تو جاتے جہنم میں۔ اس کی پروا تک نہ کرے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک قول ہے کہ میں بچہ تھا۔ جوان ہوا۔ اب بوڑھا ہو گیا۔ میں نے متقی کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا کہ اسے رزق کی مار ہو اور نہ اس کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ تو کئی پشت تک رعایت رکھتا ہے۔

پس خود نیک بنو اور اپنی اولاد کے لیے ایک عمدہ نمونہ نیکی اور تقویٰ کا ہو جاؤ اور اس کو متقی اور دیندار بنانے کے لیے سعی اور دُعا کرو۔ جس قدر کوشش تم ان کے لیے مال جمع کرنے کی کرتے ہو اسی قدر کوشش اس امر میں کرو۔

خوب یاد رکھو کہ جب تک خدا تعالیٰ سے رشتہ نہ ہو اور سچا تعلق اس کے ساتھ نہ ہو جاوے۔ کوئی چیز نفع نہیں دے سکتی۔ یہودیوں کو دیکھو کہ کیا وہ پیغمبروں کی اولاد نہیں؟ یہی وہ قوم ہے جو اس پر ناز کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدۃ : ۱۹)

ہم اللہ تعالیٰ کے فرزند اور اس کے محبوب ہیں مگر جب انہوں نے خدا تعالیٰ سے رشتہ توڑ دیا اور دُنیا ہی دُنیا کو مقدم کر لیا تو کیا نتیجہ ہوا؟ خدا تعالیٰ نے اسے سؤر اور بندر کہا۔ اور اب جو حالت ان کی مال و دولت ہوتے ہوتے بھی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

پس وہ کام کرو جو اولاد کے لیے بہترین نمونہ اور سبق ہو اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سب

سے اول خود اپنی اصلاح کرو۔ اگر تم اعلیٰ درجہ کے متقی اور پرہیزگار بن جاؤ گے۔ اور خدا تعالیٰ کو راضی کر لو گے تو یقین کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کرے گا۔ قرآن شریف میں خضرؑ اور موسیٰ علیہما السّلام کا قصہ درج ہے کہ ان دونوں نے مل کر ایک دیوار کو بنا دیا جو یتیم بچوں کی تھی وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا۔ ان کا والد صالح تھا۔ یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ کیسے تھے۔ پس اس مقصد کو حاصل کرو۔ اولاد کے لیے ہمیشہ اس کی نیکی کی خواہش کرو۔ اگر وہ دین اور دیانت سے باہر چلے جاویں پھر کیا؟ اس قسم کے امور اکثر لوگوں کو پیش آ جاتے ہیں۔ بددیانتی خواہ تجارت کے ذریعہ ہو یا رشوت کے ذریعہ یا زراعت کے ذریعہ جس میں حقوقِ شرکاء کو تلف کیا جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہی میری سمجھ میں آتی ہے کہ اولاد کے لیے خواہش ہوتی ہے کیونکہ بعض اوقات صاحبِ جائیداد لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ کوئی اولاد ہو جاوے جو اس جائیداد کی وارث ہو تاکہ غیروں کے ہاتھ میں نہ چلی جاوے مگر وہ نہیں جانتے کہ جب مر گئے تو شرکاء کون اور اولاد کون۔ سب ہی تیرے لیے تو غیر ہیں۔

اولاد کے لیے اگر خواہش ہو تو اس غرض سے ہو کہ وہ خادمِ دین ہو۔

غرض حق العباد میں پیچ در پیچ مشکلات ہیں جب تک انسان ان میں سے نکلے نہیں مومن نہیں ہو سکتا۔ نری باتیں ہی باتیں ہیں۔

نجات نہ قوم پر منحصر ہے نہ مال پر

اللہ تعالیٰ کا کسی سے رشتہ ناطہ نہیں۔ اس کے ہاں اس کی بھی کچھ پروا نہیں کہ کوئی سیّد ہے یا کون ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ یہ خیال مت کرنا کہ میرا باپ پیغمبر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ کسی نے پوچھا کہ کیا آپؐ بھی؟ فرمایا ہاں میں بھی۔

مختصر یہ کہ نجات نہ قوم پر منحصر ہے نہ مال پر بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے اور اس کو اعمالِ صالحہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل اتباع اور دُعائیں جذب کرتی ہیں۔ قوم کا ابتلا بھی مال کے ابتلا سے کم نہیں۔ بعض لوگ دوسری قوموں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اس ابتلا میں سیّد سب سے زیادہ مبتلا ہیں۔ ایک عورت گداگر ہمارے ہاں آئی۔ وہ کہتی تھی میں سیّدانی ہوں۔ اس کو پیاس لگی اور پانی مانگا تو کہا کہ پیالہ دھو کر دینا کسی امتی نے پیا ہوگا۔ اس قسم کے خیالات ان لوگوں میں پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ خدا تعالےٰ کے حضور ان باتوں کی کچھ قدر نہیں۔ اس نے فیصلہ کر دیا ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات: ۱۴)

تنخواہ دار امام الصلوٰۃ

ایک مخلص اور معزز خادم نے عرض کی کہ حضور میرے والد صاحب نے ایک مسجد بنائی تھی وہاں جو امام ہے اس کو کچھ معاوضہ وہ دیتے تھے اس غرض سے کہ مسجد آباد رہے۔ وہ اس سلسلہ میں داخل نہیں۔ مَیں نے اس کا معاوضہ بدستور رکھا ہے اب کیا کیا جاوے؟ فرمایا :

خواہ احمدی ہو یا غیر احمدی جو روپیہ کے لیے نماز پڑھتا ہے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ نماز تو خدا کے لیے ہے۔ اگر وہ چلا جائے گا تو خدا تعالیٰ ایسے آدمی بھیج دے گا جو محض خدا کے لیے نماز پڑھیں اور مسجد کو آباد کریں۔ ایسا امام جو محض لالچ کی وجہ سے نماز پڑھتا ہے میرے نزدیک خواہ وہ کوئی ہو۔ احمدی یا غیر احمدی اس کے پیچھے نماز نہیں ہو سکتی۔ امام اتقیٰ ہونا چاہیے۔ بعض لوگ رمضان میں ایک حافظ مقرر کر لیتے ہیں اور اس کی تنخواہ بھی ٹھہرا لیتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی محض نیک نیتی اور خدا ترسی سے اس کی خدمت کر دے تو یہ جائز ہے۔[1]

۲۸؍ستمبر ۱۹۰۵ء

قبل دوپہر

امام مہدی کی جنگیں

آج ایک ترک اور ایک یہودی اعلیحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے حضرت اقدس سے چند سوالات پوچھے۔ جواب سمیت ذیل میں درج کرتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ سوال جواب عربی زبان میں تھے۔ مَیں اُن کا مفہوم لے کر اُردو میں لکھتا ہوں۔ (ایڈیٹر الحکم)

ترک :۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ مَیں مہدی ہوں اور احادیث میں آیا ہے کہ مہدی جب آئے گا تو لڑائی کرے گا۔

حضرت اقدس :۔ آپ کو معلوم نہیں۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ مہدی کے متعلق جس قدر احادیث اس قسم کی ہیں وہ محدثین نے مجروح قرار دی ہیں۔ صرف ایک حدیث لَا مَھْدِیَ اِلَّا عِیْسٰی ہے یعنی بجز مسیح موعود کے اَور کوئی مہدی آنے والا نہیں ہے۔ وہی موعود جس کو بخاری میں اِمَامُکُمْ

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ صفحہ ۴ تا ۶ مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۵ء

مِنْكُمْ فرمایا ہے یعنی اسی امت میں سے آنے والا۔ اور اس کے متعلق کہیں نہیں لکھا کہ وہ لڑائیاں کرے گا بلکہ بخاری میں جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے صاف لکھا ہے کہ یَضَعُ الْحَرْبَ۔ یعنی اس کے وقت میں مذہبی لڑائیاں نہ ہونگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب حرب کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے مخالف ہمارے ساتھ جنگ نہیں کرتے۔ وہ تو قلم کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں پس یہ کیسی کمزوری ہوتی کہ قلم کا جواب قلم سے نہ دیا جاتا بلکہ اس کے لیے ہتھیار استعمال ہوتے۔ ایسی صورت میں جبکہ قلم کے حملے ہو رہے ہیں ہمارا یہی فرض ہے کہ قلم کے ساتھ ان کو روکیں۔

علاوہ بریں اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہوتی کہ ایسے زمانہ میں اسلام کی ترقی جنگ سے وابستہ ہوتی تو ہر قسم کے ہتھیار مسلمانوں کو دیئے جاتے؛ حالانکہ جس قدر ایجادیں آلاتِ حربیہ کے متعلق یورپ میں ہو رہی ہیں کسی جگہ نہیں ہوتی ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ لڑائی کا زمانہ نہیں ہے۔ اور کبھی بھی کوئی دین اور مذہب لڑائی سے نہیں پھیل سکتا۔ پہلے بھی اسلام کی ترقی اور اشاعت کے لیے تلوار نہیں اٹھائی گئی۔ اسلام اپنے برکات، انوار اور تاثیرات کے ذریعہ پھیلا ہے اور ہمیشہ اسی طرح پھیلے گا پس یہ نہایت ہی غلط اور مکروہ خیال ہے کہ مسیح کے وقت جنگ ہوگی اور نہ مسیح کو اس کی حاجت۔ وہ قلم سے کام لے گا اور اسلام کی حقانیت اور صداقت کو پُرزور دلائل اور تاثیرات کے ساتھ ثابت کر کے دکھائے گا اور دُوسرے ادیان پر اس کو غالب کرے گا اور یہ ہو رہا ہے۔

قرآن دُنیا سے کس طرح اٹھایا جائے گا

ترک:۔ یہ بھی تو آیا ہے کہ مسیح کے زمانہ میں قرآن اٹھایا جائے گا۔ اب کہاں اُٹھایا گیا ہے؟

حضرت اقدس:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک صحابی نے یہ پُوچھا تھا کہ اس وقت قرآن شریف کیسے اُٹھایا جائے گا؟ آپ نے اس کو یہ جواب دیا تھا کہ مَیں تو تجھے عقلمند سمجھتا تھا یہی جواب میرا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ قرآن شریف پر کوئی عمل نہیں کیا جاتا۔ اس کی حمایت اور حمیت کے لیے کچھ بھی سعی نہیں ہوتی۔ قرآن شریف سے صوری اور معنوی اعراض کیا گیا ہے اس کے حقائق اور معارف اور اس کی تعلیم سے مسلمان بالکل بے خبر ہو رہے ہیں۔ اور کس طرح قرآن اُٹھایا جاوے گا؟

توحید اور شرک کی حقیقت

(ترک صاحب تو دو سوالوں کے بعد خاموش ہو گئے۔ پھر یہودی صاحب نے اپنے سوالات پیش کرنے شروع کئے۔)

یہودی :- یہودیوں میں بھی تو توحید موجود ہے۔ اسلام اس سے بڑھ کر کیا پیش کرتا ہے؟

حضرت اقدس :- یہودیوں میں توحید تو نہیں ہے۔ ہاں قشر التوحید بے شک ہے اور نرا قشر کسی کام نہیں آ سکتا۔ توحید کے مراتب ہوتے ہیں۔ بغیر ان کے توحید کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ نرا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی کہہ دینا کافی نہیں۔ یہ تو شیطان بھی کہہ دیتا ہے۔ جب تک عملی طور پر لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کی حقیقت انسان کے وجود میں متحقق نہ ہو۔ کچھ نہیں۔ یہودیوں میں یہ بات کہاں ہے؟ آپ ہی بتا دیں۔ توحید کا ابتدائی مرحلہ اور مقام تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول کے خلاف کوئی امر انسان سے سرزد نہ ہو۔ اور کوئی فعل اس کا اللہ تعالیٰ کی محبت کے منافی نہ ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کی محبت اور اطاعت میں محو اور فنا ہو جاوے۔ اسی واسطے اس کے معنے یہ ہیں۔ لَا مَعْبُوْدَ لِیْ وَلَا مَحْبُوْبَ لِیْ وَلَا مُطَاعَ لِیْ اِلَّا اللّٰہُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی میرا معبود ہے اور نہ کوئی محبوب ہے اور نہ کوئی واجب الاطاعت ہے۔

یاد رکھو۔ شرک کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک شرک جلی کہلاتا ہے دوسرا شرک خفی۔ شرک جلی کی مثال تو عام طور پر یہی ہے۔ جیسے یہ بت پرست لوگ بتوں، درختوں یا اور اشیاء کو معبود سمجھتے ہیں۔ اور شرک خفی یہ ہے کہ انسان کسی شئ کی تعظیم اسی طرح کرے جس طرح اللہ تعالیٰ کی کرتا ہے یا کرنی چاہیے۔ یا کسی شئ سے اللہ تعالیٰ کی طرح محبت کرے۔ یا اس سے خوف کرے یا اس پر توکل کرے۔

اب غور کر کے دیکھ لو کہ یہ حقیقت کامل طور پر توریت کے ماننے والوں میں پائی جاتی ہے یا نہیں۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں جو کچھ اُن سے سرزد ہوا۔ وہ آپ کو بھی معلوم ہوگا۔ اگر توریت کافی ہوتی تو چاہیے تھا کہ یہودی اپنے نفوس کو مزکّی کرتے مگر ان کا تزکیہ نہ ہوا۔ وہ نہایت قسی القلب اور گستاخ ہوتے گئے۔ یہ تاثیر قرآن شریف ہی میں ہے کہ وہ انسان کے دل پر بشرطیکہ اس سے صوری اور معنوی اعراض نہ کیا جاوے۔ ایک خاص اثر ڈالتا ہے اور اس کے نمونے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں، چنانچہ اب بھی موجود ہے۔

قرآن شریف نے فرمایا قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۲) یعنی اے رسول تو ان لوگوں کو کہہ دے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع انسان کو محبوبِ الٰہی کے مقام تک پہنچا دیتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کاملِ موحّد کا نمونہ تھے۔ پھر اگر یہودی توحید کے ماننے والے ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسے موحّد سے دُور رہتے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے تھا کہ خدا تعالیٰ کے خاتم الرسلؐ کا انکار اور عناد نہایت خطرناک امر ہے۔ مگر انہوں نے پروا نہیں کی اور باوجودیکہ ان کی کتاب میں آپ کی پیشگوئی موجود تھی مگر انکار کر دیا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اَور کیا ہو سکتی ہے کہ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ۔ (الانعام: ۴۴)

سوائے اسلام کے کسی مذہب میں نجات نہیں ہے

سوال: کیا کسی اور مذہب میں رہ کر انسان نجات نہیں پا سکتا؟

جواب: اس کا جواب خود قرآن شریف نفی میں دیتا ہے۔ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران: ۲۰) وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ۔ (آل عمران: ۸۶) اسلام کے سوا اور کوئی دین قبول نہیں ہو سکتا۔ اور یہ نرا دعویٰ نہیں۔ تاثیرات ظاہر کر رہی ہیں۔ اگر کوئی اہلِ مذہب اسلام کے سوا اپنے مذہب کے اندر انوار و برکات اور تاثیرات رکھتا ہے تو پھر وہ آئے ہمارے ساتھ مقابلہ کرے۔ اور ہم نے ہمیشہ ایسی دعوت کی ہے کوئی مقابلہ پر نہیں آیا۔

قرآن شریف کے انوار و برکات

سوال: اگر اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب اپنے اندر انوار و برکات نہ رکھتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول نہیں ہو سکتا تھا، تو پھر جزیہ کیوں رکھا تھا؟

جواب: یہ تو ایک الگ امر ہے۔ اس سے یہ تو نہیں ثابت ہوتا کہ دوسرے مذاہب سچے تھے۔ ہاں اس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام جبر سے نہیں پھیلایا گیا۔ ان لوگوں کو سوچنے اور غور کرنے کا موقعہ دیا گیا ہے اور جیسا فرمایا تھا لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (البقرۃ: ۲۵۷) اس پر عمل کیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ تو قابلِ قدر بات تھی جس پر آپ اعتراض کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت۔ اس لیے

کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) یعنی اے رسُول ہم نے تجھ کو رحمۃ للعالمین کر کے بھیجا ہے۔ پس یہ آپ کی رحمت کا ایک نمونہ تھا۔ قرآن شریف میں اگر تدبّر کریں تو اس کی روشن حقیقت آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ توریت میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ ورنہ چاہیے تھا کہ ان میں اولیاء اللہ اور صلحاء ہوتے۔

یہودی: چونکہ توریت پر عمل نہیں رہا۔ اس لیے ولی اور صلحاء نہیں ہوتے۔

حضرت اقدس: اگر توریت میں کوئی تاثیر باقی ہوتی تو اسے ترک ہی کیوں کرتے؟ اگر آپ کہیں کہ بعض نے ترک کیا ہے تو پھر بھی اعتراض بدستور قائم ہے کہ جنھوں نے ترک نہیں کیا۔ ان پر جو اثر ہوا ہے وہ پیش کرو۔ اور اگر کُل ہی نے ترک کر دیا ہے تو یہ ترکِ تاثیر کو باطل کرتا ہے۔ ہم قرآن شریف کے لیے یہی نہیں مانتے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر مسلمانوں نے قرآن شریف کو چھوڑ دیا ہے لیکن پھر بھی قرآن شریف کے انوار و برکات اور اس کی تاثیرات ہمیشہ زندہ اور تازہ بتازہ ہیں؛ چنانچہ مَیں اس وقت اسی ثبوت کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے اپنے وقت پر اپنے بندوں کو اس کی حمایت اور تائید کے لیے بھیجتا رہا ہے۔ کیونکہ اُس نے وعدہ فرمایا تھا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۱۰) یعنی بے شک ہم نے ہی اس ذکر (قرآن شریف) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

قرآن شریف کی حفاظت کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ توریت یا کسی اَور کتاب کے لیے نہیں۔ اسی لیے ان کتابوں میں انسانی چالاکیوں نے اپنا کام کیا۔ قرآن شریف کی حفاظت کا یہ بڑا زبردست ذریعہ ہے کہ اس کی تاثیرات کا ہمیشہ تازہ بتازہ ثبوت ملتا رہتا ہے اور یہود نے چونکہ توریت کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور ان میں کوئی اثر اور قوت باقی نہیں رہی جو اُن کی موت پر دلالت کرتی ہے۔

قیامت کی حقانیت

یہودی: مُسلمان قیامت پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ کون سی علامات ہیں جن کی وجہ سے وہ ایمان لاتے ہیں۔

حضرت اقدس: انسان کا اپنا جسم ہی اس کو حشر نشر پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرتا ہے کیونکہ ہر آن اس میں حشر نشر ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ تین سال کے بعد یہ جسم رہتا ہی نہیں اور دوسرا جسم آجاتا ہے یہی قیامت ہے۔ اس کے سوا یہ ضروری امر نہیں کہ کُل مسائل کو عقلی طور پر ہی سمجھ لے۔ بلکہ انسان

کا فرض ہے کہ وہ اس بات پر ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال اور صفات کے ساتھ موجود ہے اور اس کی صفات میں سے یہ بھی ہے یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ (اٰلِ عمران : ۴۸) اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرۃ : ۱۰۷) تو اس بات کے ماننے میں کہ قیامت ہوگی کیا شک ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ہم اس کا ثبوت یہاں بھی رکھتے اور دیکھتے ہوں۔ بے شک قیامت حق ہے۔ اور اس کی قدرتوں کا ایک نمونہ۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرۃ : ۱۰۷) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشر و نشر پر بھی قادر ہے اور حشر نشر قدرت ہی پر موقوف ہے۔ یہ اسلام کی خصوصیات ہیں کہ اسلام نری تعلیم ہی نہیں دیتا بلکہ جب انسان اس تعلیم پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے نشانات اور آیات بھی دکھاتا ہے چنانچہ جب وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے اور اس پر ایمان لاتا ہے تو وہ آیات اللہ کو دیکھتا ہے جس سے اس کا ایمان عرفان کے رنگ میں مضبوط ہو جاتا ہے۔

دوسرے ادیان کے متبعین میں یہ آیات اور نشانات نہیں ہیں۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل متبعین ہی کو ملتے ہیں جو اپنے دل کو صاف کرتے ہیں اور ان میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ اس وقت انہیں یہ نشانات دیئے جاتے ہیں جو ان کی معرفت اور قوتِ یقین کو بڑھا دیتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کا قادر ہونا

یہودی : اگر خدا قادر ہے تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ وہ مسیح کو آسمان سے لے آوے؟

حضرت اقدس : بے شک خدا تعالیٰ قادر ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ خلاف وعدہ کرتا ہے یا ایسے افعال بھی اس سے صادر ہوتے ہیں جو اس کی صفات کاملہ اور اس کی قدوسیت کے خلاف ہوں۔ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے آپ کو قتل کر دے یا کوئی اپنا مثیل پیدا کرے۔ اسی طرح پر جبکہ وہ ایک عہد کر چکا ہے کہ مُردے واپس اس دنیا میں نہیں آتے تو وہ اس کا خلاف کیونکر کرے؟

قادر سمجھ کر خدا تعالیٰ کے لیے ایسے امور تجویز کر لینا جو اس کی صفاتِ کاملہ کے منافی ہوں اللہ تعالیٰ کی سخت ہتک اور توہین ہے اور اس سے ڈرنا چاہیے۔ یہ محلِ ادب ہے[1]۔

(اس مقام پر یہودی صاحب بھی خاموش ہو گئے اور
سلسلہ کلام ختم ہو گیا اور اعلیٰ حضرت تشریف لے گئے)

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۷، ۸ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء

۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء

قبل دوپہر

سلسلہ مجددین ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا آپ کے بعد بھی مجدد آئے گا؟ اس پر فرمایا:

اس میں کیا ہرج ہے کہ میرے بعد بھی کوئی مجدد آجاوے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ختم ہوچکی تھی۔ اس لیے مسیح علیہ السلام پر آپ کے خلفا کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ قیامت تک ہے اس لیے اس میں قیامت تک ہی مجددین آتے رہیں گے۔ اگر قیامت نے فنا کرنے سے چھوڑا تو کچھ شک نہیں کہ کوئی اور بھی آجائیگا۔ ہم ہرگز اس سے انکار نہیں کرتے کہ صالح اور ابرار لوگ آتے رہیں گے اور پھر بَغْتَةً قیامت آجائے گی۔

اس زمانہ کے مولوی مولویوں کے ذکر پر فرمایا:

اگر تزکیہ نفس اور اتباعِ سُنّت ان میں ہوتا تو اس قدر اختلاف اور جھگڑا کیوں ہوتا۔ کوئی ہرج اسلام کا بھی نہ ہوتا۔ مگر اب تو عام طور پر ہر شخص جانتا ہے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی ہوگئی ہے۔ آزمائش کے لیے دو چار مولوی لے آؤ۔ پھر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم ایک بات کہیں گے قطع نظر اس کے کہ وہ اس پر غور کریں۔ فوراً اُس کی تردید پر آمادہ ہوجائیں گے۔ مَیں افسوس سے کہتا ہوں کہ جیسا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہودیوں کی سی حالت ہوجاوے گی۔ وہی حالت ہوچکی ہے۔ مجھے اس امر سے بہت محبت اور خواہش تھی اور ہے کہ کوئی ان میں درندگی چھوڑ کر انسانیت سے ہم پر اعتراض کرے اور اس کا جواب غور سے سُنے۔ مَیں اس بات پر بھی رضامند اور خوش تھا کہ یہاں آکر ہمارے پاس رہتے۔ ہم ہر طرح سے ان کی خاطر داری اور تواضع کرتے۔ وہ ٹھنڈے دل سے اپنے اعتراض پیش کرتے اور سعید الفطرت لوگوں کی طرح جواب سُنتے۔ پھر جو اعتراض رہتا یا جو اس جواب پر ہوتا۔ پیش کرتے۔ مگر انہوں نے اس طریق کو بالکل چھوڑ دیا اور عمداً حق پوشی کی ہے۔ وہ چاہتے نہیں کہ ان کی آنکھ کھلے اور حق ظاہر ہو۔ اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکتے اس لیے کہ یہ ارادہ ان کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا صریح مخالف ہے۔ کونسی گالی ہے جو انہوں نے ہم کو نہیں دی اور کونسا نام ہے جو انہوں نے ہمارا نہیں رکھا۔

آنے والا موعود حَکَم ہو کر آئے گا

انسان کا فرض تو یہ ہے کہ اگر اسے راستی ملے تو اس کے ملنے میں چون و چرا نہ کرے مگر انہوں نے ذرا سے اختلاف کی وجہ سے (جو وہ بھی اختلاف نہ تھا) ساری صداقتوں کا خون کر دیا۔ ہمارا ان کا بہت سے امور میں اتفاق تھا صرف ایک بات پیش کی تھی کہ مسیح ابنِ مریم مر گیا ہے اور آنے والا موعود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق تم ہی میں سے آیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ایک طرف تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آنے والا موعود حَکَم ہو کر آئے گا۔ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ ایک بات بھی ماننے کو تیار نہیں۔ پھر وہ حَکَم کس بات کا ہوگا؟ اگر ان کے زعم اور خیال کے موافق مسیح آسمان سے بھی آجاتا تب بھی یقینی امر تھا کہ اسے ہرگز تسلیم نہ کرتے کیونکہ بحیثیت حَکَم ہونے کے اس کا تو کام یہ ہوتا کہ وہ سب کی غلطیاں نکال کر صراطِ مستقیم پر سب کو لاتا اور یہ اپنی غلطیوں کو چھوڑنے والے نہیں۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، شیعہ، خوارج وغیرہ وغیرہ ہر فرقہ والا اپنی بات اسے منوانی چاہتا اور جس کی وہ نہ مانتا اس کے نزدیک ہی کافر اور بے دین ٹھہرتا پس ایسی صورت میں ہم کیونکر مان لیں کہ یہ اپنے فرضی مسیح کو مان لیں گے۔

حَکَم اسے کہتے ہیں جو قاضی ہو اور غلطیاں نکال کر اصلاح کرے۔ ہم نے تو ذرا سی ہی غلطی پیش کی تھی کہ مسیح مر گیا ہے اور وہ نہیں آئیں گے۔ آنے والا اُمّتی ہے جیسا کہ قرآن شریف مِنْکُمْ کہتا ہے اور بخاری اور مسلم میں بھی مِنْکُمْ ہی آیا ہے۔ اب اس غلطی کو جو اسلام کی عظمت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالتِ شان کی صریح مخالف ہے یہ چھوڑ نہیں سکتے اور میرا فیصلہ تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ خود مجھ پر حَکَم ہونا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں اس اختلاف کی وجہ سے جو اسلام کی زندگی کا اصل ذریعہ ہے۔ کافر۔ اور یہ اپنے ہزاروں خطرناک اختلافوں کی وجہ سے بھی مسلمان کے مسلمان ہی ہیں۔

شیعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص اور جان نثار صحابہؓ کو سب و شتم کرتے ہیں اور ان کو کافر اور مُرتد بتاتے ہیں اور پھر بھی وہ سچے کے سچے۔ اب کوئی انصاف کرے کہ وہ آنے والا حَکَم ان میں آکر کیا کرے گا؟ کیا وہ بھی ان کے ساتھ تبرا میں شامل ہوگا یا اس سے ان کو باز رہنے کی ہدایت کرے گا۔؟

اگر ان میں خوفِ خدا ہوتا اور یہ تقویٰ سے کام لیتے اور لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل: ۳۷) پر عمل کرتے اور میری باتوں کو غور سے سُنتے اور پھر ان پر فکر کرتے۔ اس کے بعد حق تھا جو چاہتے کہتے۔ مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور خدا تعالیٰ کے خوف سے نہ ڈرے۔ جو منہ میں آیا کہہ گذرے۔

مَیں سخت افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ ان لوگوں کی حالت مسخ ہو گئی ہے۔ یہی توفی کا لفظ یوسف علیہ السلام کے لیے ہو تو موت کے معنے کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو تو موت کے معنے

کریں۔ لیکن مسیح کی نسبت ہو تو اس کے معنے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر جانا ہو۔ کس قدر جرأت اور دلیری ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرا بھی عزت ان کے دل میں نہیں۔ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی یہی معنے کرتے تو ہم سمجھ لیتے کہ یہ کوئی خصوصیت پیدا نہیں کرتے۔ مگر اب تو یہ خاص طور پر مسیح ہی کے ساتھ اس امر کو مخصوص کرتے ہیں۔ حالانکہ جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر جانے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ نہ یہودی قائل نہ عیسائی۔ یہودی تو رفع روحانی کے بھی قائل نہیں۔ عیسائی جلالی جسم کے قائل ہیں گو وہ اس میں جھوٹے ہیں اس لیے کہ انہوں نے جب مسیح کو دیکھا تو وہ وہی عنصری جسم تھا کیونکہ اس میں زخم موجود تھے اور خود انھوں نے ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ بایں عیسائیوں نے سمجھ لیا کہ جسم عنصری آسمان پر نہیں جاتا۔ اسی لیے انھوں نے جلالی جسم تجویز کیا۔

حضرت مسیح کی وفات کا مسئلہ بہت صاف تھا اور اس کے لیے خود مسیح کا اپنا اقرار۔ اللہ تعالےٰ کا قول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم دید شہادت، صحابہؓ کا اجماع کافی دلائل تھے مگر انہوں نے ذرا بھی پروا نہ کی اور مسیح پوچھو تو یہودیوں سے بھی گئے گذرے ہوئے۔ اس لیے کہ وہ تو ایک جماعت بنا کر مسیح کے پاس گئے اور اُن سے اُن کے دعاوی کی تحقیق کی مگر یہ کب میرے پاس آئے اور اُنھوں نے پوچھا؟

---

۳۰ ستمبر ۱۹۰۵ء

قبل دوپہر

قرآن کریم کا اعجاز

مولوی غلام رسول صاحب راجیکی نے اپنا بے نقط عربی قصیدہ سُنایا۔ اسی تحریک سے فرمایا:

ایک پادری نے مجھ پر اعتراض کیا کہ فیضی کی تفسیر اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت میں ہے، کیونکہ ساری بے نقط لکھی ہے۔ مَیں نے اس کا جواب دیا کہ بے نقط لکھنا کوئی اعلیٰ درجہ کی بات نہیں یہ ایک قسم کا تکلف ہے اور تکلفات میں پڑنا لغو امر ہے۔ مومنوں کی شان یہ ہے وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔ (المومنون: ۴) یعنی مومن وہ ہوتے ہیں جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ اگر بے نقط ہی کو معجزہ سمجھتے ہو تو قرآن شریف میں بھی ایک بے نقط معجزہ ہے اور وہ یہ ہے لَا رَیْبَ فِیْهِ۔ (البقرۃ: ۲)

لہ الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۸ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء

اس میں رَیبَ کا کوئی لفظ نہیں۔ یہی اس کا معجزہ ہے۔ لَا یَأْتِیْهِ الْبَاطِلُ۔ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۳) اس سے بڑھ کر اور کیا خوبی ہوتی۔

میں نے کئی بار اشتہار دیا ہے کہ کوئی ایسی سچائی پیش کرو۔ جو ہم قرآن شریف سے نہ نکال سکیں۔ لَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (الانعام: ۶۰) یہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے اپنے حقائق اور معارف کے لحاظ سے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے رنگ میں۔ اگر بشر کا کلام ہوتا تو سطحی خیالات کا نمونہ دکھایا جاتا۔ مگر یہ طرز ہی اور ہے جو بشری طرزوں سے الگ اور ممتاز ہے۔ اس میں باوجود اعلیٰ درجہ کی بلند پروازی کے نمود نمائش بالکل نہیں۔ خود فرمایا کہ اُمیّوں کے لیے ہے۔ اور پھر اور لطف یہ ہے کہ ظاہر تو اُمیّوں کے لیے ہے اور باطن ہر ایک کے سیراب کرنے والا ہے۔

سورۃ الرحمٰن میں تکرار کی حکمت

خواجہ صاحب[1] نے پُوچھا کہ سورہ رحمان میں اعادہ کیوں ہوا ہے؟

فرمایا:

اس قسم کا التزام اللہ تعالیٰ کے کلام کا ایک ممتاز نشان ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ امر واقع ہوا ہے کہ موزوں کلام اسے جلد یاد ہو جاتا ہے اسی لیے فرمایا۔ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ (القمر: ۱۸) یعنی بے شک ہم نے یاد کرنے کے لیے قرآن شریف کو آسان کر دیا ہے۔

یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی ساری چیزوں میں حُسن ہے تو کیا یہ ضروری نہیں کہ اس کے کلام میں بھی حُسن ہو؟ یہ اس کا ایک حُسن ہے۔ اگر قرآن مجید ژولیدہ بیان ہوتا تو اس سے کیا فائدہ ہوتا۔ طبائع کو اس کی طرف توجہ ہی نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں عجیب عجیب قسم کی مخلوق دیکھی جاتی ہے۔ عجائب خانہ میں جا کر بعض جانور اس قسم کے دیکھے گئے ہیں کہ گویا وہ ایک خوبصورت چھینٹ ہیں۔ ان ساری باتوں پر نظر کر کے معلوم ہوتا ہے کہ رنگینیٔ خلق خدا تعالیٰ کی عادت ہے۔

یہاں تک بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جانور انڈے خود دیتے ہیں اور اس کے بچے اَور جانور نکالتے ہیں۔ کوئل انڈے خود دیتی ہے اور کوّے کے آشیانہ میں رکھ دیتی ہے۔ پس جس جس قدر کوئی مخلوقاتِ الٰہی

---

[1] غالباً خواجہ کمال الدین صاحب مراد ہیں (مرتب)

کا اور افعال اللہ کا مشاہدہ کرے گا۔ اسی قدر اس کا تعجب بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح اس کے اقوال میں لاانتہا اَسرار ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ افعال اللہ کی خوردبین سے ہوجاتا ہے۔

حضرت حکیم الامت نے عرض کیا کہ شاعر اور فصیح تو اس طرزِ بیان پر اعتراض کر ہی نہیں سکتا۔

اس لیے کہ خود ان کو اس امر کا التزام کرنا پڑتا ہے۔

پھر حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی سلسلہ کلام میں فرمایا کہ

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (الرحمان: ۱۴)

باربار توجہ دلانے کے واسطے ہے۔ اسی تکرار پر نہ جاؤ۔ قرآن شریف میں اَور بھی تکرار ہے۔ مَیں خود بھی تکرار کو اسی وجہ سے پسند کرتا ہوں۔ میری تحریروں کو اگر کوئی دیکھتا ہے تو وہ اس تکرار کو بکثرت پائے گا۔ حقیقت سے بے خبر انسان اس کو منافی بلاغت سمجھ لے گا۔ اور کہیگا کہ یہ بُھول کر لکھا ہے؛ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ شاید پڑھنے والا پہلے جو کچھ لکھا ہے اُسے بھُول گیا ہو۔ اس لیے باربار یاد دلاتا ہوں تاکہ کسی مقام پر تو اس کی آنکھ کھُل جائے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔

علاوہ بریں تکرار پر اعتراض ہی بے فائدہ ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی تو انسانی فطرت میں ہے کہ جبتک باربار ایک بات کو دہراتے نہیں وہ یاد نہیں ہوتی۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمُ باربار کیوں کہلوایا؟ ایک بار ہی کافی تھا۔ نہیں۔ اس میں یہی بہتر ہے کہ کثرتِ تکرار اپنا ایک اثر ڈالتی ہے اور غافل سے غافل قوتوں میں بھی ایک بیداری پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (الانفال: ۴۶)

یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ جس طرح پر ذہنی تعلق ہوتا ہے اور کثرتِ تکرار ایک بات کو حافظہ میں محفوظ کر دیتی ہے۔ اسی طرح ایک رُوحانی تعلق بھی ہے اس میں بھی تکرار کی حاجت ہے۔ بدُوں تکرار وہ رُوحانی پیوند اور رشتہ قائم نہیں رہتا۔ اور پھر سچ تو یہ ہے کہ اصل بات نیت پر موقوف ہے جو شخص صرف حفظ کرنے کی نیت سے پڑھتا ہے وہ تو وہیں تک رہتا ہے اور جو شخص رُوحانی تعلق کو بڑھالیتا ہے[1]۔

حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں ایک آیت اتنی مرتبہ پڑھتا ہوں کہ وہ آخر وحی ہوجاتی ہے۔ صوفی بھی اسی طرف گئے ہیں اور وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا (الانفال: ۴۶) کے یہ معنے ہیں کہ

---

[1] نقل مطابق اصل۔

اس قدر ذکر کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ کا نام کنٹھ ہو جاوے۔ انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام میں یہ بات عام ہوتی ہے کہ وہ ایک امر کو بار بار اور مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ تا مخلوق کو نفع پہنچے۔ مَیں خود دیکھتا ہوں اور میری کتابیں پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اگر چار صفحے میری کسی کتاب کے دیکھے جاویں تو ان میں ایک ہی امر کا ذکر پچاس مرتبہ آتے گا اور میری غرض یہی ہوتی ہے کہ شاید پہلے مقام پر اس نے غور نہ کیا ہو اور یونہی سرسری طور سے گذر گیا ہو۔

قرآن شریف میں اعادہ اور تکرار کی بھی یہی حکمت ہے۔ یہ تو احمقوں کی خشک منطق ہے جو کہتے ہیں کہ بار بار تکرار سے بلاغت جاتی رہتی ہے۔ وہ کہتے رہیں۔ قرآن شریف کی غرض تو ایک بیمار کا اچھا کرنا ہے۔ وہ تو ضرور ایک مریض کو بار بار دوا دے گا۔ اگر یہ قاعدہ صحیح نہیں تو پھر ایسے معترض جب کوئی ان کے ہاں بیمار ہو جاوے تو اسے بار بار دوا کیوں دیتے ہیں۔ اور آپ کیوں دن رات کے تکرار میں اپنی غذا لباس وغیرہ امور کا تکرار کرتے ہیں؟

پچھلے دنوں مَیں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک انگریز نے محض اسی وجہ سے خودکشی کر لی تھی کہ بار بار وہی دن رات اور غذا مقرر ہے اور مَیں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

معجزاتِ مسیح کی حقیقت

معجزاتِ مسیح کے متعلق کہا گیا کہ ازالہ اوہام میں جو تصریح کی گئی ہے اس سے انکار پایا جاتا ہے۔ فرمایا:

تعجب کی بات ہے کہ وہ انکار ہے یا اقرار؟ معجزاتِ مسیح کا تو اقرار کیا گیا ہے اور ہم اب بھی اقرار کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے خوارق کا ظہور ہوا لیکن یہ سچ ہے کہ ان معجزات کی حقیقت جو خدا تعالیٰ نے ہم پر کھولی اسے ہم نے بحیثیت حَکَم ظاہر کر دیا ہے۔ اس کی ہم کو کچھ پروا نہیں کہ یہ لوگ اس پر گالیاں دیتے ہیں یا کیا کہتے ہیں۔ یہ لوگ اگر میری بات سے انکار کرتے ہیں تو پھر مجھ سے نہیں بلکہ قرآن شریف سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ مَیں نے جو کچھ لکھا ہے اپنی طرف سے تو لکھا ہی نہیں۔ قرآن شریف ہی سے لکھا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن شریف نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ حقیقی مُردے واپس نہیں آتے۔ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ (الزمر: ۴۳) کے کیا معنے ہیں۔ پھر اگر مَیں نے یہ کہا کہ وہ مُردے جو حضرت مسیح نے زندہ کئے وہ حقیقی مُردے نہ تھے جو آیت فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ کے موافق واپس نہیں آتے تو کیا بُرا کیا؟ اس سے معجزات کا انکار کیونکر ثابت ہوا۔

میرا معجزات سے انکار تو ثابت نہیں ہوتا؛ البتہ ایسا اعتراض کرنے والے کا قرآن شریف سے انکار ثابت ہوتا ہے کیونکہ نہ ایک جگہ نہ دو جگہ بلکہ قرآن شریف کے متعدد مقامات سے یہ امر ثابت

ہو رہا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (الانبیاء: ۹۶) اب بتاؤ کہ جب اللہ تعالیٰ کھول کھول کر ایک امر کو بیان کر دے کہ مُردہ حقیقی واپس نہیں آیا کرتا تو پھر قرآن شریف کی تعلیم سے یہ کیسا انحراف ہے کہ خواہ مخواہ یہ تجویز کیا جاوے کہ فلاں شخص ایسا کرتا تھا۔ خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ ایسی باتوں کو مُنہ سے نکالتے وقت اللہ تعالیٰ کا ادب کرو۔

ہاں یہ سچ ہے کہ بعض لوگ جو مُردہ ہی کی طرح ہو جاتے ہیں اور کوئی امید زندگی کی باقی نہیں ہوتی۔ صرف دم باقی ہوتا ہے۔ ہر قسم کی تدابیر کی راہ بند ہوتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے اپنے کسی بندہ کی دعاؤں سے اس مُردہ کو زندہ کر دیتا ہے۔ یہ بھی احیاءِ موتیٰ ہی ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔

نواب صاحب کے لڑکے عبدالرحیم کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ اس کی کیا حالت تھی۔ اس کی زندگی کی کوئی بھی امید باقی نہ تھی[1] ایسا ہی خود میرا لڑکا مبارک ایسی حالت تک پہنچ گیا تھا کہ گھر والوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بھی پڑھ دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پھر اُسے زندہ کر دیا۔ یہ احیاءِ موتیٰ ہوتا ہے۔

اور علاوہ اس کے رُوحانی احیاء بھی ہوتا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور ان کی زندگی ایک گمراہی کی زندگی ہوتی ہے وہ بھی مُردہ ہی ہوتے ہیں کیونکہ رُوحانی طور پر مر چکے ہوتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کا ہدایت یاب ہو جانا یہ ان کا زندہ ہونا ہے۔ یہ حقیقت احیاءِ موتیٰ کی ہے جو قرآن شریف نے بیان کی ہے اور اسی کے موافق خدا تعالیٰ سے علم پا کر مَیں نے اس کی تصریح کی۔ اب اگر یہ انکارِ معجزات ہے تو ایسا الزام لگانے والا خود سوچ لے کہ وہ مجھے مُنکر نہیں ٹھہراتا۔ بلکہ قرآن شریف سے انحراف اور انکار کرتا ہے۔

یہ کس قدر ناسمجھی اور ناواقفی کی بات ہے کہ انسان اس طرز اور کلام کو اختیار کرے جس میں قرآن شریف پر حملہ ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ ہو۔ مَیں حیران ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیا ان کو معجزاتِ مسیح پیارے ہیں یا خدا تعالیٰ کا کلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم؟ یہ اگر معجزاتِ مسیح کے لیے خدا تعالیٰ کے کلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ سکتے ہیں تو چھوڑ دیں۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کے کلام کو چھوڑ دیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کریں۔ اس عقیدہ پر اگر

---

[1] بفضلہٖ تعالیٰ مَیں نے خود اس مُردہ کو زندہ ہوتے دیکھا۔ (ایڈیٹر الحکم)

ساری دُنیا مجھ کو چھوڑتی ہے تو چھوڑ دے مجھے اس کی پروا نہیں اس لیے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔

ان کو اعتراض کا حق تو اس وقت ہوتا جب ہم خدا تعالیٰ کے کلام کے خلاف کرتے لیکن جب ہم خدا تعالیٰ کے کلام کے بالکل موافق کہتے ہیں تو پھر اعتراض کرنا خدا تعالیٰ کے کلام پر اعتراض ہے نہ مجھ پر۔ اگر مسیح واقعی مُردوں کو زندہ کرتے تھے یعنی ایسے مُردوں کو جو قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ کے نیچے آچکے تھے تو پھر کیوں انہوں نے ایلیاء کو زندہ کر کے نہ دکھا دیا۔ تاکہ یہودی ٹھوکر نہ کھاتے اور خود بھی صلیبی ابتلا سے بچ جاتے۔

سعدی بھی یہی مذہب رکھتا تھا اور یہی سچا مذہب ہے۔ کوئی اکابر اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ سعدی کہتا ہے ؎

دہ کہ گر مردہ باز گردیدے　　ردِّ میراث سخت تر بودے
بسرائے قبیلہ پیوند　　وارثاں را ز مرگ خویشاوند[1]

بلا تاریخ[2]

حضرت اقدس علیہ السلام کے کلماتِ طیبات

(ایک شخص کے اپنے الفاظ میں)

انسان اور آدم فرمانے لگے کہ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کو آدم بننا چاہیے۔ آدم سے مراد کامل انسان ہے۔ جب انسان کامل آدم بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم سجدہ (اطاعت) کا دیتا ہے اور اس کے ہر ایک کام کو خدا تعالیٰ

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۹ - ۱۰ مورخہ ۱۷ ر نومبر ۱۹۰۵ء

[2] مندرجہ عنوان کے ماتحت بلا تاریخ یہ ملفوظات الحکم جلد ۹ نمبر ۵ کے صفحہ ۴ پر درج ہیں۔ جن کے آخر میں محمد خاں صاحب مرحوم کا نام لکھا ہے معلوم ہوتا ہے مکرم محمد خاں صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کسی مجلس میں یہ کلمات سُنے اور انہیں اپنے الفاظ میں قلمبند کر کے الحکم میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ (مرتّب)

فرشتوں کے ذریعہ سے سرانجام کرتا ہے لیکن آدم کامل بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا خدا تعالےٰ سے سچا تعلق ہو۔ جب انسان ہر ایک حرکت اور سکون حکم الٰہی کے نیچے ہو کر کرتا ہے تو انسان خدا کا ہو جاتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ انسان کا والی وارث ہو جاتا ہے اور پھر اس پر کوئی مخالفت سے دست اندازی نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ آدمی جو احکام الٰہی کی پروا نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ بھی اس کی پروا نہیں کرتا۔ جیسے کہ آیت کریمہ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (الشمس ۱۶) سے ظاہر کرتا ہے۔ یعنی نافرمانوں پر جب وہ عذاب کرنے پر آتا ہے تو ایسی لاأُبالی سے عذاب کرتا ہے کہ عذاب کسی ہلاکت سے ان کے بال بچوں کی بھی پروا نہیں کرتا کہ ان کا حال ان کے نافرمان والدین کے بعد کیا ہوگا جیسے کہ آیت کریمہ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان : ۷۸) یعنی خدا تعالیٰ کو تمہاری پروا ہی کیا ہے اگر تم اس کی فرماں برداری میں کوشاں نہ ہو اور اس کے احکاموں کو بے پروائی سے دیکھو۔

فرمایا کہ :

دُنیا میں لاکھوں بکریاں بھیڑیں ذبح ہوتی ہیں لیکن کوئی ان کے سرہانے بیٹھ کر نہیں روتا اس کا کیا باعث ہے؟ یہی کہ ان کا خدا تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایسے انسان کی ہلاکت کی بھی آسمان پر کوئی پروا نہیں ہوتی جو اس سے سچا تعلق نہیں رکھتا۔ انسان اگر خدا تعالیٰ سے سچا تعلق رکھتا ہے تو اشرف المخلوقات ہے! ورنہ کیڑوں سے بھی بدتر ہے۔ اس میں دو اُنس ہیں۔ ایک انس احکام الٰہی سے (جو ہو تو وہ کامل آدم ہے ورنہ وہ مُردہ کیڑا ہے۔) دوم مخلوق الٰہی سے۔ دُنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ کئی ایک محض بے گناہ قید ہو جاتے ہیں اور ظالمانہ دست اندازیوں کا نشانہ بنتے ہیں مگر اس کا باعث یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام کی پوری پروا نہیں کرتے اور دعاؤں سے اس کی پناہ نہیں چاہتے اور شریعت میں بالکل لاپروا ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی ان سے لاأُبالی کا معاملہ کرتا ہے ورنہ ان کا خدا تعالےٰ سے سچا تعلق ہوتا تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے دوست کو دشمنوں کے ہاتھوں میں یوں چھوڑے کیونکہ وہ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْن ہونے اور نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ - (حٰمٓ السجدة : ۳۲) کا وعدہ کرتا ہے۔

آدم علیہ السلام کامل انسان تھے تو فرشتوں کو سجدہ (اطاعت) کا حکم ہوا۔ اسی طرح اگر ہم میں ہر ایک آدم بنے تو وہ بھی فرشتوں سے سجدہ کا مستحق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کامل انسان کوئی نہیں

فرمایا کہ :

کامل انسان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوگا؟ دیکھو جب انہوں نے اپنی جان اپنا مال اپنی حیات ممات رب العالمین پر قربان کردیئے یعنی سارے کے سارے خدا کے ہوگئے تو کیسا خدا ان کا ہوا۔ اور کیسے فرشتوں سے ان کی مدد کی۔ اگر وہ فرشتوں سے مدد نہ کرتا تو ممکن نہ تھا ایک یتیم بچہ دنیا کو مغلوب کرلیتا۔ حکم اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (الاحزاب : ۴۲) کا وہی تعامل گذرا ہے۔ یعنی لڑائی کے وقت جب جھاگ منہ سے جاری ہے اور مارے غصہ کے آدمی جل رہا ہے۔ اس وقت بھی یہ حکم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو یاد کرکے کسی پر وار چلانا۔ ان دشمنانِ دین کے مقابلہ پر جنھوں نے سینکڑوں صحابہؓ کو ذبح کردیا تھا۔ فتح مکہ پر کیسا خدا کو یاد کیا اور کیسا ترحم دکھایا۔

ذکرِ الٰہی کی حقیقت فرمایا کہ :

خدا کا بننا اس طرح ہوسکتا ہے کہ ہر ایک گھنٹہ اور رات میں انسان ذکرِ الٰہی میں رہے۔ ذکرِ الٰہی سے مراد یہ نہیں کہ تسبیح پکڑ لے بلکہ ذکر سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک کام شروع کرتے وقت اس کو اس بات کا دھیان ہو کہ آیا یہ کام خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تو نہیں۔ جب اس طرح انسان کامل بن جاتا ہے تو خدا اس کا بن جاتا ہے اور حسب ولیُّ المومنین اس کو ہر موقعہ پر غموم و ہموم سے بچاتا ہے۔

بظاہر اکثر ایسے لوگ ہیں کہ وہ آدمی ہوتے ہیں لیکن حالتِ کشف میں ان کو کتوں اور گدھوں کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔

درازیٔ عمر پھر فرمایا کہ :

خدا تعالیٰ کا قرب اور نزدیکی بھی اور زندگی بھی انعام (اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) میں شامل ہے۔ مخالفین اس انعام میں مسیح کو تو شامل کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے نصیب رکھتے ہیں۔ کیوں ان کو اس عقیدہ سے شرم نہیں آتی۔ اور لمبی زندگی اس طرح انعام میں شمار ہوسکتی ہے کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد : ۱۸) اور مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان : ۷۸) یعنی نافع چیز کو درازیٔ عمر نصیب ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ دین سے غافلوں کو ہلاکت میں ڈالنے سے پروا نہیں کرتا۔ پس ثابت ہوا کہ جو دین سے غافل نہ ہوں۔ ان کی ہلاکت اور موت میں خدا تعالیٰ جلدی نہیں کرتا۔

سلسلہ کا منہاج نبوت پر ہونا

فرمایا کہ:

ہمارا سلسلہ منہاجِ نبوت پر ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود اور نصاریٰ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اسی طرح ہم کو بھی ان یہود صفت مسلمانوں اور نصاریٰ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کیا یہ مولوی ہم کو رطب یابس اور ضعیف حدیثوں اور قولوں سے جیتنا چاہتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام تورات اور انجیل کی آیات کو محرف قرار دیا جو آپ کے حَکم ہونے کی معارض تھیں یا ان کے ایسے معنے کئے جو آپ کے سلسلہ اسلام کے موافق ثابت ہوں اور ان آیات کے معنے خداداد فراست اور الہام سے کئے اور اہل کتاب کے غلط معنوں کو رد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری موجودہ تورات اور انجیل کو صحیح قبول نہ کیا۔ بلکہ کئی ایک آیات کو محرف اور کئی ایک کے معنے صحیح طور سے بذریعہ الہام کئے۔ اسی طرح ہمارا سلسلہ ہے۔

ہم بطور حَکم کے آئے ہیں۔ کیا حَکم کو یہ لازم ہے کہ کسی خاص فرقہ کا مُرید بن جاوے؟ بہتر فرقوں میں سے کس کی حدیثوں کو مانے؟ حَکم تو بعض احادیث کو مردُود اور متروک قرار دے گا اور بعض کو صحیح۔

مظالم سے بچنے کی واحد راہ

فرمایا:

بڑے بڑے صریح ظلم مظلوموں پر ڈھلتے جاتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے ظالموں سے کوئی چنداں بازپرس نہیں ہوتی۔ اس کا باعث بھی خدا تعالیٰ نے اسی آیت میں فرمایا ہے۔ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان : ۷۸) یعنی خدا تعالیٰ کو تمہاری پروا کیا ہے۔ اگر تم دُعاؤں اور عبادتِ الٰہی میں تغافل اختیار کرو۔ بے شک ظلم اور دست درازیاں مظلوموں پر ہودیں کوئی پروا نہیں کی جائے گی جب تک وہ مظلوم خدا تعالیٰ سے سچا تعلق بذریعہ صراطِ مستقیم پیدا نہ کرلیں۔ اور مظلوم پر ظلم اس لیے ہوتے ہیں کہ مظلوم خود ذبیحہ بکری یا کیڑے کی طرح ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ سے سچا تعلق نہیں رکھتا ورنہ ممکن ہے کہ خدا جو اُس کا دین و دُنیا کا متکفل ہو اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ پھر اس پر کسی ظالمانہ مخالفت کا وار چلنے دے؟[۱]

---

[۱] الحکم جلد ۹ نمبر ۵ صفحہ ۴، ۵ مورخہ ۱۰؍ فروری ۱۹۰۵ء

مامور من اللہ کی صداقت کا نشان

راستباز اور مامور من اللہ کی صداقت کا بڑا نشان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غیب کی خبریں دیتا ہے اور پھر ان خبروں میں ایک طاقت ہوتی ہے جو دوسروں کو نہیں دی جاتی نجومی جو خبریں دیتا ہے ان میں وہ طاقت اور جبروت نہیں ہوتی جو مامور کی خبروں میں ہوتی ہے۔ علاوہ بریں مامور کی خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ فراست اور قیافہ پر ان کی بنا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں جو بالکل بے سروسامانی اور بیکسی کی زندگی تھی۔ اپنی کامیابی اور دشمنوں کی ناکامی اور نامرادی کی پیشگوئی کی تھی۔ کیا کوئی عقلمند اور ملکی مدبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت کی حالت دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ شخص کامیاب ہو جائے گا اور وہ قوم جو اس کی مخالفت پر آمادہ ہے۔ ذلت کے ساتھ نامراد رہے گی؟ پھر دیکھ لو کہ انجام کیا ہوا پس یہ ایک زبردست نشان مامور کو دیا جاتا ہے۔

عیسائیت کا انجام اور اسلام کا مستقبل

عیسائیوں کے حملے اسلام پر اس صدی میں بہت تیزی کے ساتھ ہوئے ہیں۔ اُن کی زبان درازی اور چھیڑ چھاڑ بہت بڑھ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایک دم میں ان کی مخالفانہ کارروائیوں کا فیصلہ کر دیتا مگر وہ اپنا فیصلہ روزِ روشن کی طرح دکھانا چاہتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس مذہب کی حقیقت دُنیا پر کُھل جاوے۔ شیطان کی آدم کے ساتھ یہ آخری جنگ ہے ملائکۃ اللہ آدم کے ساتھ ہیں اور اب شیطان ہمیشہ کے لیے ہلاک کر دیا جائے گا۔ مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اگر میری طرف سے اس مُردہ پرستی کے دُور کرنے کے لیے کوئی تحریک نہ بھی ہوتی اور خدا تعالیٰ مجھے نہ بھی بھیجتا۔ تب بھی اس مذہب کی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ یہ خود بخود نمک کی طرح پگھل جاتا۔ مَیں خدا تعالےٰ کی تائیدوں اور نُصرتوں کو دیکھ رہا ہوں۔ جو وہ اسلام کے لیے ظاہر کر رہا ہے اور مَیں اس نظارہ کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ جو موت کا اس صلیبی مذہب پر آنے کو ہے۔ اس مذہب کی بنیاد محض ایک لعنتی لکڑی پر ہے جس کو دیمک کھا چکی ہے اور یہ بوسیدہ لکڑی اسلام کے زبردست دلائل کے سامنے اب ٹھہر نہیں سکتی۔ اس عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اب وقت آتا ہے کہ یکدم یورپ اور امریکہ کے لوگوں کو اسلام کی طرف توجہ ہوگی۔ اور وہ اس مُردہ پرستی کے مذہب سے بیزار ہو کر حقیقی مذہب اسلام کو اپنی نجات کا ذریعہ یقین کریں گے۔

اسلام، عیسائیت اور آریوں کا خُدا کے متعلق نظریہ

توحید ماننے والوں میں ایک خاص رُعب اور جلال ہوتا ہے جو بُت

پرست کو حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا قلب ملزم کرتا رہتا ہے اور اس کے اعتقاد کی بنیاد علوم حقہ پر نہیں ہوتی بلکہ ظنیات اور اوہام پر ہوتی ہے۔ مثلاً عیسائیوں نے یسوع کو خدا بنا لیا مگر کوئی ایسی خصوصیت آجتک دو ہزار برس ہونے کو آئے نہیں بتائی جو یسوع میں ہو اور دوسرے انسانوں میں نہ ہو، بلکہ جہانتک انجیل کے بیان کے موافق یسوع کی حالت پر غور کرتے ہیں۔ اسی قدر اسے انسانی کمزوریوں کا بہت بڑا نمونہ پاتے ہیں۔

بڑی خصوصیت اقتداری معجزات کی ہوتی ہے لیکن یسوع کی لائف میں اقتداری معجزات کا پتہ نہیں ملتا اور اگر عیسائیوں کے بیان کے موافق بعض مان بھی لیں تو پھر ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اسی رنگ کے اقتداری معجزات یسوع کے معجزات سے کہیں بڑھ چڑھ کر پہلے نبیوں کے بائبل میں موجود ہیں۔ پھر خصوصیت کیا رہی؟ وہ کیا بات تھی جس پر اُسے خدا مان لیا گیا۔ اگر ایک مجلس میں اللہ تعالےٰ کے صفات بیان کئے جاویں اور اس میں آریہ، عیسائی اور مُسلمان موجود ہوں تو اگر کسی کا ضمیر مر نہیں گیا تو بجز مسلمان کے ہر ایک خدا تعالیٰ کے صفات بیان کرنے سے شرمندہ ہوگا۔ مثلاً آریہ کیا یہ بیان کرکے خوش ہوگا کہ میں ایسے خدا پر ایمان لاتا ہوں جس نے دُنیا کا ایک ذرّہ بھی پیدا نہیں کیا۔ وہ میری رُوح اور جسم کا خالق نہیں۔ مجھے جو کچھ ملتا ہے میرے اپنے اعمال اور افعال کا ثمرہ ہے۔ خدا تعالیٰ کا کوئی عطیہ اور کرم نہیں۔ میرا خدا مجھے کبھی ہمیشہ کی نجات نہیں دے سکتا۔ میرے لیے لازمی ہے کہ میں جُونوں کے چکّر میں آکر کیڑے مکوڑے بنتا رہوں۔ یا کیا عیسائی صاحب یہ بیان کرکے راضی ہوگا کہ میں ایک ایسے خدا پر ایمان لاتا ہوں جو ناصرہ بستی میں یوسف نجار کے گھر معمولی بچوں کی طرح پیدا ہوا تھا۔ وہ معمولی بچوں کی طرح روتا چلاتا اور کبھی اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ماں باپ سے تھپڑ بھی کھاتا تھا۔ اسے اتنی بھی خبر نہ تھی کہ وہ انجیر کے پھل کے موسم کا علم رکھتا۔ وہ ایسا غصہ ور تھا کہ درختوں تک کو بددُعائیں دیتا تھا۔ وہ آخر میرے گناہوں کی وجہ سے صلیب پر لعنتی ہوا۔ اور تین دن ہاویہ میں رہا۔ بتاؤ کیا وہ یہ باتیں خوشی کے ساتھ بیان کرے گا یا اندر ہی اندر اس کا دل کھایا جائے گا۔ لیکن ایک مسلمان بڑی جرأت اور دلیری سے کہے گا کہ میں اس خدا پر ایمان لایا ہوں جو تمام صفات کاملہ سے موصوف اور تمام بدیوں اور نقائص سے منزہ ہے۔ وہ ربّ ہے۔ بلا مانگے دینے والا رحمان ہے۔ سچی محنتوں کے ثمرات ضائع نہ کرنے والا ہے۔ وہ حیّ و قیّوم، ارحم الراحمین خدا ہے۔ وہ ہمیشہ کی نجات دیتا ہے۔ اس کی عطا غیر مجذوذ ہے پس جب مُسلمان اپنے خدا کی صفات بیان کرے گا تو ہرگز شرمندہ نہیں ہوگا اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے جو ہم پر ہے۔ ایسا ہی اور بہت سی باتیں ہیں۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مان کر ہم کبھی کسی کے سامنے

شرمندہ نہیں ہو سکتے۔

معجزاتِ مسیح

معجزاتِ مسیح کی حقیقت ڈوئی نے خوب کھولی ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں بھی سلبِ امراض کرتا ہوں۔ اسی طرح پر جس طرح یسوع مسیح کیا کرتا تھا اور عجیب تر یہ بات ہے کہ جہاں کوئی شخص اچھا نہیں ہوتا وہاں وہ شرمندہ نہیں ہوتا، بلکہ کہہ دیتا ہے کہ یسوع مسیح سے بھی فلاں شخص اچھا نہیں ہوا۔

سلبِ امراض فی الحقیقت کوئی ایسی چیز نہیں جس پر ناز کیا جا سکے۔ یہودی بھی اس زمانہ میں سلبِ امراض کرتے تھے اور ہندوستان میں بھی بہت لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں اور آجکل تو ہزاروں ہزار دہریے اور ملحد بھی ایسے ہیں جو سلبِ امراض کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک فن اور مشق ہے جس کے لیے یہ بھی ضرور نہیں کہ اس فن کا عامل خدا تعالیٰ پر یقین رکھتا ہو یا نیک چلن ہو۔ جس طرح پر دوسرے علوم کے حصول کے لیے نیک چلنی اور خدا پرستی شرط نہیں ہے اس کے لیے بھی نہیں یعنی اگر کوئی شخص ریاضی کے قواعد کی مشق کرے تو قطع نظر اس کے کہ وہ دہریہ ہے یا موحد خدا پرست، وہ قواعد اس کے لیے کوئی روک پیدا نہیں کریں گے۔ برخلاف اس کے وہ رُوحانی کمالات جو اسلام سکھاتا ہے اُن کے لیے ضروری ہے کہ اعمال میں پاکیزگی اور صدق اور وفاداری ہو۔ بغیر اس کے وہ باتیں حاصل ہی نہیں ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلبِ امراض والے مسیح کے اچھے کئے ہوئے مَر گئے لیکن۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ (الشمس : ۱۰) کی تعلیم دینے والے کے زندہ کئے ہوئے آجتک بھی زندہ ہیں اور اُن پر کبھی فنا آ ہی نہیں سکتی۔

صحابہؓ کرام اور حواریانِ مسیح

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقابلہ میں حواریوں کو پیش کرتے ہوتے بھی شرم آ جاتی ہے۔ حواریوں کی تعریف میں ساری انجیل میں ایک بھی ایسا فقرہ نظر نہ آئے گا۔ کہ انہوں نے میری راہ میں جان دے دی۔ بلکہ برخلاف اس کے ان کے اعمال ایسے ثابت ہوں گے جس سے معلوم ہو کہ وہ حد درجہ کے غیر مستقل مزاج، غدار اور بے وفا اور دُنیا پرست تھے اور صحابہ کرامؓ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول کی راہ میں وہ صدق دکھلایا کہ انہیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ (البینۃ : ۹) کی آواز آ گئی۔ یہ اعلیٰ درجہ کا مقام ہے جو صحابہؓ کو حاصل ہوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے۔ اس مقام کی خوبیاں اور کمالات الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جانا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ یہ توکل، تبتّل اور رضا و تسلیم کا اعلیٰ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان کو کسی قسم کا شکوہ شکایت

اپنے مولیٰ سے نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی ہونا یہ موقوف ہے بندے کے کمال صدق و وفاداری اور اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی اور طہارت اور کمال اطاعت پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ نے معرفت اور سلوک کے تمام مدارج طے کر لیے تھے۔ اس کا نمونہ حواریوں میں اگر تلاش کریں تو ہرگز نہیں مل سکتا۔ پس نرے سلب امراض پر خوش ہو جانا یہ کوئی دانشمندی نہیں ہے اور رُوحانی کمالات کا شیدائی ان باتوں پر خوش نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مَیں تمہارے لیے یہی پسند کرتا ہوں کہ تم اپنے دل کو پاک کرو کہ مولیٰ کریم تم سے راضی ہو جاوے اور تم اس سے راضی ہو جاؤ۔ پھر وہ تمہارے جسم میں تمہاری باتوں میں ایسی برکت رکھ دے گا۔ جو سلب امراض کرنے والے بھی انہیں دیکھ کر حیران اور شرمندہ ہوں گے۔

ایک نُکتۂ معرفت

قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کے نام کے ساتھ کوئی صفت مفعول کے صیغہ میں نہیں ہے۔ قُدّوس تو ہے مگر معصُوم نہیں ہے کیونکہ معصوم کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو بچانے والا کوئی اَور ہے؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات ہی میں بے عیب پاک خدا ہے اور وحدہٗ لاشریک اکیلا خدا ہے۔ اس کو بچانے والا کون ہو سکتا ہے۔

ایک الزامی جواب

ایک مرتبہ آپ کی مجلس میں مفتی محمد صادق صاحب رسالہ "بے گناہی مسیح" سُنا رہے تھے۔ اس میں ایک مقام پر مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر محض اس بنا پر حملہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے نکاح کیوں کیا؟ اس پر فرمایا:

افسوس یہ لوگ ایسے بیہودہ اعتراض کرتے ہیں جن کو کوئی سلیم الفطرت پسند نہیں کر سکتا ایسی باتیں کر کے یہ لوگ کچھ سُننا چاہتے ہیں۔ اگر یہ اعتراض کرنے سے پہلے اتنا سوچ لیتے کہ ایک شخص جو بیگانی اور بد وضع مشہور عورتوں سے تعلق رکھتا ہے اس کی زندگی کو تو وہ بے عیب اور خدا کی زندگی قرار دیتے ہیں۔ پھر جائز طور پر نکاح کرنے والے پر اعتراض کیوں ہے؟ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے۔ اپنے گھر میں انجیل کا مطالعہ کرے اور کفارہ کی برکات جو یورپ کو اخلاقی طور پر ورثہ میں ملی ہیں ان پر نظر کرے۔ پھر وہ اسلام پر اعتراض کرنے کے لیے مُنہ کھولے جس کے گھر میں اس قدر گند ہو۔ اُسے تو شرم آنی چاہیئے۔

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۱۹ صفحہ ۹ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۵ء

بلا تاریخ[1]

اس زمانہ کی دنیا پرستی

افسوس کا مقام ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے لیکن اس کے لیے وہ وہ کوششیں کی جاتی ہیں گویا کبھی یہاں سے جانا ہی نہیں۔ انسان کیسا غافل اور ناسمجھ ہے کہ علانیہ دیکھتا ہے کہ یہاں کسی کو ہمیشہ کے لیے قیام نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔ اگر یہ لوگ جو بڑے کہلاتے ہیں۔ اس طرف توجہ کرتے تو کیا اچھا ہوتا۔ دنیا کی عجیب حالت ہو رہی ہے جو ایک دردمند دل کو گھبرا دیتی ہے۔ بعض لوگ تو کھلے طور پر طالب دنیا ہیں اور ان کی ساری کوششیں اور تگ و دو دنیا تک محدود ہے لیکن بعض لوگ ہیں تو اسی مردود دنیا کے طلبگار۔ مگر وہ اس پر دین کی چادر ڈالتے ہیں۔ جب اس چادر کو اٹھایا جاوے تو وہی نجاست اور بدبو موجود ہے۔ یہ گروہ پہلے گروہ کی نسبت زیادہ خطرناک اور نقصان رساں ہے۔ اکثر لوگ جب ان دینداروں کی حالت کو دیکھتے ہیں تو وہ دہریئے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے اعمال کو ان کے اقوال کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔ سننے والے جب ان کی باتوں کو سنکر پھر ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں تو ان کا ایمان بالکل جاتا رہتا ہے اور وہ دہریہ ہو جاتے ہیں۔

سلسلہ احمدیہ کے قیام کی وجہ

مَیں دیکھتا ہوں کہ اس وقت قریبًا علماء کی یہی حالت ہو رہی ہے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سورۃ الصّف: ۳) کے مصداق اکثر پائے جاتے ہیں اور قرآن شریف پر بگفتن ایمان رہ گیا ہے؛ ورنہ قرآن شریف کی حکومت سے لوگ بکلی نکلے ہوتے ہیں۔ احادیث سے پایا جاتا ہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا تھا کہ قرآن شریف آسمان پر اُٹھ جائے گا۔ مَیں یقینًا جانتا ہوں کہ یہ وہی وقت آگیا ہے۔ حقیقی طہارت اور تقویٰ جو قرآن شریف پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے آج کہاں ہے؟ اگر ایسی حالت نہ ہو گئی ہوتی تو خدا تعالیٰ اس سلسلہ کو کیوں قائم کرتا۔ ہمارے مخالف اس بات کو نہیں سمجھ سکتے لیکن وہ دیکھ لیں گے کہ آخر ہماری سچائی روزِ روشن کی طرح کھل جائے گی۔ خدا تعالیٰ خود ایک ایسی جماعت

---

[1] یہ ملفوظات جن پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ ایڈیٹر صاحب الحکم نے "پرانی نوٹ بک میں سے ایک صفحہ" کے زیر عنوان الحکم میں شائع کئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۰۵ء سے پہلے کی کسی تاریخ کے یہ ملفوظات ہیں۔ واللّٰہ اعلم (خاکسار مرتب)

تیار کر رہا ہے جو قرآن شریف کی ماننے والی ہوگی۔ ہر ایک قسم کی ملونی اس میں سے نکال دی جائے گی اور ایک خالص گروہ پیدا کیا جاوے گا اور وہ یہی جماعت ہے۔ اس لیے میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ تم خدا تعالیٰ کے احکام کے پورے پابند ہو جاؤ اور اپنی زندگیوں میں ایسی تبدیلی کرو جو صحابہ کرامؓ نے کی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہیں دیکھ کر ٹھوکر کھاوے۔ ہاں میں یہ بھی کہتا ہوں کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ افترا اور کذب کے سلسلہ سے الگ ہو جاوے۔ پس تم دیکھو اور منہاج نبوت پر اس سلسلہ کو دیکھو۔ یہ میں جانتا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے اور زمین پر بارش ہوتی ہے تو جہاں مفید اور نفع رساں بوٹیاں اور پودے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی زہریلی بوٹیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس وقت خدا تعالیٰ کا کلام اتر رہا ہے اور آسمان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ چونکہ ایک سلسلہ حقہ قائم ہوا ہے۔ ضروری تھا کہ اس کے ساتھ جھوٹے مدعی اور مفتری بھی ہوتے ہیں جو اکثروں کو گمراہ کرتے۔ پس ہر شخص کا فرض ہے کہ اس وقت خدا تعالیٰ سے کشودِ کار کے لیے دعا کرے اور دعاؤں میں لگا رہے۔ ہمارے سلسلہ کی بنیاد نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ پر ہے۔ پھر اس سلسلہ کی تائید اور تصدیق کے لیے اللہ تعالیٰ نے آیات ارضیہ اور سماویہ کی ایک خاتم ہم کو دی ہے۔ یہ بخوبی یاد رکھو کہ جو شخص خدا تعالےٰ کی طرف سے آتا ہے اسے ایک مہر دی جاتی ہے اور وہ مہر محمدی مہر ہے جس کو ناعاقبت اندیش مخالفوں نے نہیں سمجھا۔

میں بڑے یقین اور دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے۔ وہ شخص جھوٹا اور مفتری ہے جو آپ کے خلاف کسی سلسلہ کو قائم کرتا ہے اور آپؐ کی نبوت سے الگ ہو کر کوئی صداقت پیش کرتا ہے اور چشمۂ نبوت کو چھوڑتا ہے۔ میں کھول کر کہتا ہوں کہ وہ شخص لعنتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا آپؐ کے بعد کسی اور کو نبی یقین کرتا ہے اور آپؐ کی ختمِ نبوت کو توڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہیں آ سکتا جس کے پاس وہی مُہرِ نبوتِ محمدی نہ ہو۔ ہمارے مخالف الرائے مسلمانوں نے یہی غلطی کھائی ہے کہ وہ ختمِ نبوت کی مُہر کو توڑ کر اسرائیلی نبی کو آسمان سے اُتارتے ہیں۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی اور آپؐ کی ابدی نبوت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ تیرہ سو سال کے بعد بھی آپؐ ہی کی تربیت اور تعلیم سے مسیح موعود آپ کی امت میں وہی مُہرِ نبوت لے کر آیا ہے۔ اگر یہ عقیدہ کفر ہے تو پھر میں اس کفر کو عزیز رکھتا ہوں۔ لیکن یہ لوگ جن کی عقلیں تاریک ہو گئی ہیں جن کو نورِ نبوت سے حصہ نہیں دیا گیا اس کو سمجھ نہیں سکتے اور اس کو کفر قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ وہ بات

ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال اور آپؐ کی زندگی کا ثبوت ہوتا ہے۔

مامورین کی تائید اور تصدیق کے لیے نشانات

غرض ہر مامور اور راستباز کو اللہ تعالےٰ ایک نشانِ نبوت دیتا ہے اور وہ وہ آیاتِ ارضیہ اور سماویہ ہوتے ہیں جو اس کی تائید اور تصدیق کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور خدا تعالےٰ کا فضل ہے کہ اُس نے میری تائید اور تصدیق میں ایک دو نہیں لاکھوں لاکھ نشان ظاہر کئے ہیں۔ کوئی دیکھنے والا بھی ہو۔

پھر میری تائید اور تصدیق اور اس سلسلہ کی سچائی کے لیے دلائل عقلیہ موجود ہیں۔ کاش یہ لوگ اگر نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ سے واقف نہیں تھے اور ان آیاتِ ارضیہ اور سماویہ کو جو میری صداقت کے ثبوت میں میرے ہاتھ پر ظاہر ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے تو عقل ہی سے کام لیتے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کریم میں ذکر آیا ہے کہ جب وہ دوزخ میں داخل ہوں گے تو اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور اپنی غلطی پر اطلاع ہوگی تو کہیں گے۔

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک: ۱۱)

اے کاش اگر ہم سُنتے اور پھر سُنکر عقل سے کام لیتے تو ہم جہنمی نہ ہوتے۔

ضرورت زمانہ کی دلیل

مَیں کہتا ہوں کہ اگر دُوسرے امور پر نظر نہ بھی کریں تو ایک ضرورت موجود ہی ایسی ہے جو میری سچائی پر مُہر کر دیتی ہے۔ کیا اس طوفان اور جنگ کے وقت جب عیسائیوں نے اسلام کو نابُود کرنا چاہا ہے اور ہر طرف سے اور ہر رنگ سے اس پر حملے کر رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں اخبارات اور رسالے اس کی مخالفت میں شائع کر رہے ہیں، اس لیے کہ اسلام اُن کی راہ میں ایک روک اور پتھر ہے۔ اسلام ہی ان کی عیش میں تلخ ہے۔ اخبارات یورپ پُکار پُکار کر کہتے اور وہاں کے مدبّر اور اہل الرّائے اسلام ہی کو اپنی ترقی کی راہ میں روک قرار دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کے نیست و نابود کرنے کی جس قدر فکر عیسائیوں کو ہو سکتی ہے اس سے وہ لوگ جو حُجروں میں رہتے ہیں کب آشنا اور واقف ہو سکتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ آئے دن دو چار آدمی مُسلمان ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی ترقی ہو رہی ہے انہیں ان حملوں کی خبر نہیں جو مقدس اسلام پر مختلف رنگوں میں ہو رہے ہیں عیسائیت کی بربادکن آگ اسلام کے گھر کو لگ چکی ہے۔ ۲۹ لاکھ تو ایسے ہیں جو اس آگ کی نذر ہو چکے ہیں۔ اور

اسلام کے لختِ جگر کہلا کر مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کھڑے ہو کر وعظ کہتے ہیں۔ یہ تو علانیہ دشمن ہیں۔ پھر ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو گو کھلے طور پر عیسائی تو نہیں ہوتے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انہیں اسلام کے ساتھ کوئی محبت اور لگاؤ نہیں ہے وہ اسلام کے ارکان اور شعار پر ہنستے اور ٹھٹھے کرتے ہیں۔ آئے دن اس میں لگے رہتے ہیں کہ جہانتک ممکن ہو اور بس چلے اسلام کے احکام نماز روزہ میں ترمیم کریں اور اپنی تجویز اور تدبیر سے ایک ایسا اسلام پیدا کریں جس کے بانی مبانی وہ آپ ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ اسلام سے خواہ وہ الگ ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں کی حالت کسی صورت میں عیسائیوں سے کم نہیں ہے۔ وہ کھلم کھلا ان کی وردی پہنتے ہیں۔ جو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دشمنِ دین کی وردی وہ کیوں پہنتے ہیں اگر اسلام کے ساتھ انہیں محبت اور پیار ہے۔

منہاجِ نبوّت کے معیار پر اس صداقت کو آزماؤ

اگر کوئی شخص ہماری جماعت سے نفرت کرتا ہے تو کرے۔ لیکن اسے کم از کم غیرتِ اسلام کے تقاضا سے اور اسلام کی موجودہ حالت کے لحاظ سے یہ بھی تو ضرور ہے کہ وہ کسی ایسی جماعت کو تلاش کرے اور اس کا پتہ دے جو حجج و براہین اور خدا تعالےٰ کے تازہ بتازہ نشانات اور روشن آیات سے کسرِ صلیب کر رہی ہو۔ مگر مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ خواہ شرقاً غرباً شمالاً جنوباً کہیں بھی چلے جاؤ اس جماعت کا پتہ بجز میرے نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے اس غرض کے واسطے مجھے ہی مبعوث کر کے بھیجا ہے۔ میرے دعویٰ کو سُنکر نری بدظنی اور بدلگامی سے کام نہ لو بلکہ تمہیں چاہیے کہ اس پر غور کرو اور منہاجِ نبوّت کے معیار پر اس کی صداقت کو آزماؤ۔ انسان ایک پیسے کا برتن لیتا ہے تو اس کی بھی دیکھ بھال کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری باتوں کو سُنتے ہی بغیر فکر کئے گالیاں دینی شروع کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی نامناسب امر ہے۔ جو طریق مَیں نے پیش کیا ہے اس طرح پر میرے دعویٰ کو آزماؤ اور پھر اگر اس طریق سے بھی تم مجھے کاذب پاؤ تو بے شک افسوس کے ساتھ چھوڑ دو۔ لیکن مَیں تمہیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ مَیں مفتری نہیں ہوں۔ کاذب نہیں ہوں بلکہ مَیں وہی ہوں جس کا وعدہ نبیوں کی زبانی ہوتا چلا آیا ہے۔ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کہا ہے۔ وہی مسیح موعود ہوں۔ جو چودھویں صدی میں آنے والا تھا اور جو مہدی بھی ہے۔ مجھے وہی قبول کرتا ہے جس کو خدا تعالےٰ اپنے فضل سے دیکھنے والی آنکھ عطا کرتا ہے اور یہ جماعت اب دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ خدا تعالےٰ چاہتا ہے کہ یہ بڑھے پس یہ بڑھے گی۔ اور

ضرور بڑھے گی۔

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۰ صفحہ ۲ بابت ۱۰؍ جون ۱۹۰۵ء

بلا تاریخ[1]

حجۃ اللہ کا مقام

جب انسان حجّۃ اللّٰہ کے مقام پر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی اس کے جوارح ہو جاتا ہے مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (النجم : ۴) کے یہی معنے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ انسان کامل طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار اور اس کا وفادار بندہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ اسے کامل صلح ہوتی ہے۔ اس کی کوئی حرکت کوئی سکون اللہ تعالیٰ کے اذن اور امر[2] کی ایک کل ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اس پر مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ مقام کامل اور اکمل طور پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔

مکر کے معنے

مکر کا لفظ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کے لیے استعمال کیا ہے۔ پھر یہی لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی آیا ہے اور براہین احمدیہ میں میرے متعلق بھی ایک الہام ہے۔ مکر کی حد اس وقت تک ہوتی ہے۔ جب تک وہ انسانی تدابیر اور منصوبوں تک ہو۔ لیکن جب انسانی منصوبوں کی طرح نہ ہو تو پھر وہ خارقِ عادت ہوتا ہے مکر نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار نے جو منصوبے کئے وہ اس میں پورے ناکام اور نامراد رہے اور اللہ تعالیٰ نے خارقِ عادت طریق سے آپ کو وعدہ کے موافق بچا لیا۔

بُروز کا مسئلہ

مذہب کبھی سرسبز نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی رُوحانیت کا بروز نہ ہو اس لیے ضروری تھا کہ اسلام کے کامیاب اور بامراد ہونے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو چکے اور مدینہ طیبہ میں قبر کے اندر رکھے گئے۔ مگر میں یہ ماننے

---

[1] یہ ملفوظات بھی ایڈیٹر صاحب الحکم نے "پرانی نوٹ بک میں سے کچھ" کے زیرِ عنوان بغیر تاریخ کے شائع کیے ہیں۔ (مرتب)

[2] نقل مطابق اصل۔

کو تیار نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہی ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو قبر میں رکھے گئے وہ ایک پاک دانہ کی طرح رکھے گئے ہیں جس کو بہت سے خوشے لگے ہیں جو اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (ابراہیم: ۲۵) کا سچا مصداق ہے اگر کوئی شخص اس امر کو نہیں مانتا تو وہ گویا تسلیم کرتا ہے کہ معاذ اللہ آپؐ ضائع ہو گئے؛ حالانکہ آپؐ کے برکات اور فیوض کا تو یہاں تک اثر ہوا کہ مدینہ طیبہ کا نام یثرب بھی نہیں رہنے دیا، کیونکہ یثرب ہلاک ہونے کو کہتے ہیں۔ مَیں یقیناً کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس حقیقت کو کھول دیا ہے کہ آپؐ مدینہ کی خاک میں اس دانے کی طرح تھے جس سے ہزارہا دانے اُگیں۔ یہ لوگ جو میری مخالفت کرتے ہیں وُہ تعصب اور ضد میں اندھے ہو کر آپؐ کو اس دانہ سے مشابہ سمجھتے ہیں جو معاذ اللہ کرم خوردہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ قدیم سے عادت ہے کہ نبی کے اخلاق، عادات اور توجہ کسی اَور کو بھی دیئے جاتے ہیں جو اس کی اتباع میں اس کی محبت میں کامل طور پر فنا ہو گیا ہو۔ اور ظلّی طور پر اس کے کمالات اور خوبیوں کو اپنے اندر جذب کرتا ہو۔ اس صورت میں اس نبی کا حُلیہ جو اس کو دیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کا نام اس نبی کا ہوتا ہے۔ یہی سِرّ ہے جو انجیل[1] میں لکھا ہے مسیح نہ آئے گا جب تک ایلیا نہ آئے۔ اور دُوسرے مقام پر ایلیا کے آنے سے مراد اس کی خُو اور طبیعت اور طاقت پر آنے سے لی گئی ہے۔ پس مہدی کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر آئے گا اس سے یہی مُراد ہے کہ وُہ ظلّی اور بروزی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مظہر ہو گا۔

بعثتِ مسیح موعود کے مقاصد

میرے آنے کے دو مقصد ہیں۔ مُسلمانوں کے لیے یہ کہ اصل تقویٰ اور طہارت پر قائم ہو جائیں۔ وہ ایسے سچے مُسلمان ہوں جو مُسلمان کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے۔ اور عیسائیوں کے لیے کسرِ صلیب ہو۔ اور ان کا مصنوعی خدا نظر نہ آوے۔ دُنیا اس کو بالکل بھُول جاوے۔ خدائے واحد کی عبادت ہو۔

میرے ان مقاصد کو دیکھ کر یہ لوگ میری مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو کام نفاقِ طبعی اور دنیا کی گندی زندگی کے ساتھ ہوں گے وہ خود ہی اس زہر سے ہلاک ہو جائیں گے۔ کیا کاذب کبھی کامیاب ہو سکتا ہے؟ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (المؤمن: ۲۹)

---

[1] لفظ "بائبل" ہونا چاہیے۔ سہو کتابت سے "انجیل" لکھا گیا ہے۔ (مرتب)

کذّاب کی ہلاکت کے واسطے اس کا کذب ہی کافی ہے لیکن جو کام اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے رسُول کی برکات کے اظہار اور ثبوت کے لیے ہوں۔ اور خود اللہ تعالےٰ کے اپنے ہی ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہو۔ پھر اس کی حفاظت تو خود فرشتے کرتے ہیں۔ کون ہے جو اس کو تلف کر سکے؟ یاد رکھو۔ میرا سلسلہ اگر نِری دکانداری ہے تو اس کا نام و نشان مِٹ جائے گا لیکن اگر خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور یقیناً اسی کی طرف سے ہے تو خواہ ساری دُنیا اس کی مخالفت کرے یہ بڑھے گا اور پھیلے گا اور فرشتے اس کی حفاظت کریں گے۔ اگر ایک شخص بھی میرے ساتھ نہ ہو اور کوئی بھی مدد نہ دے۔ تب بھی مَیں یقین رکھتا ہوں کہ یہ سلسلہ کامیاب ہوگا۔

مخالفت کی مَیں پروا نہیں کرتا۔ مَیں اس کو بھی اپنے سلسلہ کی ترقی کے لیے لازمی سمجھتا ہوں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کا کوئی مامور اور خلیفہ دُنیا میں آیا ہو اور لوگوں نے چُپ چاپ اسے قبول کر لیا ہو۔ دُنیا کی تو عجیب حالت ہے۔ انسان کیسا ہی صدیق فطرت رکھتا ہو۔ مگر دُوسرے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے وہ تو اعتراض کرتے ہی رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ہمارے سلسلہ کی ترقی فوق العادت ہو رہی ہے۔ بعض اوقات چار چار پانچ پانچ سو کی فہرستیں آتی ہیں اور دس دس پندرہ پندرہ تو روزانہ درخواستیں بیعت کی آتی رہتی ہیں اور وہ لوگ علیحدہ ہیں جو خود یہاں آکر داخلِ سلسلہ ہوتے ہیں۔

سلسلہ کے قیام کی غرض

اس سلسلہ کے قیام کی اصل غرض یہی ہے کہ لوگ دُنیا کے گند سے نکلیں اور اصل طہارت حاصل کریں اور فرشتوں کی سی زندگی بسر کریں۔

وفاتِ مسیح

مسیح کی موت کا جھگڑا بالکل صاف ہو چکا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے قول سے اور مسیح علیہ السلام کے اپنے اقرار سے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ (المائدۃ: ۱۱۸) میں موت ثابت کر دی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فعل سے معراج کی رات میں اُن کو مُردوں میں دیکھا۔ یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص ابھی اس عالَم میں ہے وہ ان رُوحوں میں جو اس جہان سے گذر چکی ہیں کیونکر شامل ہو گیا؟

الحکم جلد ۹ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۰-۱۱ مورخہ ۱۷؍ جولائی ۱۹۰۵ء

یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء

تصویر کی حِلّت و حرمت

ذکر آیا کہ ایک شخص[1] نے حضور کی تصویر ڈاک کے کارڈ پر چھپوائی ہے تاکہ لوگ کارڈوں کو خرید کر خطوط میں استعمال کریں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

میرے نزدیک یہ دُرست نہیں۔ بدعت پھیلانے کا یہ پہلا قدم ہے۔ ہم نے جو تصویر فوٹو لینے کی اجازت دی تھی وہ اس واسطے تھی کہ یورپ امریکہ کے لوگ جو ہم سے بہت دُور ہیں اور فوٹو سے قیافہ شناسی کا علم رکھتے ہیں اور اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اُن کے لیے ایک رُوحانی فائدہ کا موجب ہو۔ کیونکہ جیسا تصویر کی حُرمت ہے۔ اس قسم کی حُرمت عموم نہیں رکھتی بلکہ بعض اوقات مجتہد اگر دیکھے کہ کوئی فائدہ ہے اور نقصان نہیں تو وہ حسبِ ضرورت اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ خاص اس وقت یورپ کی ضرورت کے واسطے اجازت دی گئی ؛ چنانچہ بعض خطوط یورپ امریکہ سے آتے ہیں جن میں لکھا تھا کہ تصویر کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل وہی مسیح ہے۔ ایسا ہی امراض کی تشخیص کے واسطے بعض وقت تصویر سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ شریعت میں ہر ایک

---

[1] حاشیہ (نوٹ از ایڈیٹر الحکم) بمبئی کے ایک سوداگر نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصویر والے کارڈ چھپوائے تھے اور ان کا اشتہار الحکم میں بھی شائع کر دیا گیا جو ایک معمولی اشتہار سمجھ کر شائع ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ میری نیت اس اشتہار کی اشاعت سے کیا تھی میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ یہ بھی تبلیغ کا ایک ذریعہ ہوگا۔ لیکن یہ مرض تصویر بازی کا کچھ ایسا ترقی کرنے لگا کہ حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خصوصیت کے ساتھ اس پر توجہ کرنی پڑی اور پُرزور الفاظ میں اس کی حُرمت اور ممانعت کا فتویٰ دیا اور اس طرح پر اس باب البدعت کو کھُلتے ہی بند کر دیا۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

الحکم کی گذشتہ اشاعت میں مختصر طور پر یہ اعلان دے دیا گیا تھا۔ آج تفصیل کے ساتھ حضرت اقدس (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تقریر کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ آج کے بعد یقین کیا جاتا ہے کہ اعلیٰحضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصویر کا کارڈ استعمال نہ کیا جاوے گا۔ (ایڈیٹر الحکم)

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ صفحہ ۳)

امر جو مَا يَنْفَعُ النَّاسَ (الرعد : ۱۸) کے نیچے آتے اس کو دیرپا رکھا جاتا ہے لیکن یہ جو کارڈوں پر تصویریں بنتی ہیں ان کو خریدنا نہیں چاہیے۔ بُت پرستی کی جڑ تصویر ہے۔ جب انسان کسی کا معتقد ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ تعلیم تصویر کی بھی کرتا ہے۔ ایسی باتوں سے بچنا چاہیے اور ان سے دُور رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ ہماری جماعت پر سر نکالتے ہی آفت پڑ جائے۔ مَیں نے اس ممانعت کو کتاب میں درج کر دیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔ جو لوگ جماعت کے اندر ایسا کام کرتے ہیں اُن پر ہم سخت ناراض ہیں۔ ان پر خُدا تعالےٰ ناراض ہے۔ ہاں اگر کسی طریق سے کسی انسان کی رُوح کو فائدہ ہو تو وہ طریق مستثنیٰ ہے۔

ایک کارڈ تصویر والا دکھایا گیا۔ دیکھ کر فرمایا ؛

یہ بالکل ناجائز ہے۔

ایک شخص نے اس قسم کے کارڈوں کا ایک بنڈل لاکر دکھایا کہ مَیں نے یہ تاجرانہ طور پر فروخت کے واسطے خرید کئے تھے۔ اب کیا کروں؟ فرمایا ؛

ان کو جلا دو اور تلف کر دو۔ اس میں اہانتِ دین اور اہانتِ شرع ہے۔ نہ ان کو گھر میں رکھو۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ بلکہ اس سے اخیر میں بُت پرستی پیدا ہوتی ہے۔ اس تصویر کی جگہ پر اگر تبلیغ کا کوئی فقرہ ہوتا تو خوب ہوتا[1]

(قبل دوپہر)

گناہ کی تعریف

تُرک صاحب نے مندرجہ ذیل دو سوال کئے اور جواب پایا۔

سوال۔ اگر کوئی چوری یا زنا کے ارادے سے جاوے مگر نہ کرے تو کیا گناہ ہوگا؟

جواب حضرت اقدس۔ جو خیالات وسوسہ کے رنگ میں دل میں گذرتے ہیں اور ان پر کوئی عزم اور ارادہ انسان نہیں کرتا ان پر مؤاخذہ نہیں ہے لیکن جب کوئی خیالِ بد دل میں گذرے اور انسان اس پر مصمم ارادہ کرے تو اس پر مؤاخذہ ہوتا ہے اور وہ گناہ ہے۔ جیسے ایک اُچکا دل میں خیال کرے کہ فُلاں بچہ کو قتل کرکے اس کا زیور اُتاروں گا تو گو قانونی جُرم نہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ کے

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ صفحہ ۳ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

نزدیک وُہ مجرم ہے اور سزا پائے گا۔ یاد رکھو دل کا ایک فعل ہوتا ہے مگر جب تک اس پر مصمّم ارادہ اور عزیمت نہ کرے اس کا کوئی اثر نہیں۔

سوال۔ جو لوگ لڑائیوں میں جاتے ہیں اور وہاں قتل کرتے ہیں۔ کیا وہ قتل ان کا گناہ ہے یا نہیں؟

جواب۔ عِلْمُھَا عِنْدَ رَبِّیْ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے اچھا کیا یا بُرا کیا۔[1]

۲؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

اسلامی جنگوں کی حقیقت

مسئلہ جہاد کے متعلق ذکر تھا۔ اس کے متعلق جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

اسلامی جہاد پر یہ اعتراض تو محض فضول ہے کہ وُہ لڑائیاں مذہب اور اشاعتِ اسلام کی خاطر تھیں اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک مکہ میں کفار کے ہاتھوں سے سخت تکلیف اُٹھاتے رہے اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ نے دُکھ اُٹھائے اور جانیں دیں۔ بعض غریب اور بیکس ضعیف عورتوں کو شرمناک تکالیف کفار نے پہنچائیں یہانتک کہ آخر آپؐ کو ہجرت کرنی پڑی اور ان کفار نے وہاں بھی آپؐ کا تعاقب کیا۔ ایسی صورت میں جب اُن کی شرارتیں اور تکلیفیں حد سے گذر گئیں تو پھر خدا تعالیٰ نے سدِّباب اور دفاع کے طور پر حکم دیا کہ ان سے جنگ کرو۔ چنانچہ پہلی آیت جس میں جہاد کا حکم ہوا وُہ یہ ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا (الآیۃ) (الحج: ۴۰)

یعنی ان لوگوں کو اجازت دی گئی کہ جنگ کریں جن پر ظلم ہوا۔ مُسلمان مظلوم تھے۔ اُن کی طرف سے ابتدا نہیں ہوئی تھی بلکہ بانیٔ فساد کفارِ مکہ تھے۔ ایسی حالت میں بھی جب اُن کی شرارتیں انتہائی درجہ تک جا پہنچیں تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مدافعت کے واسطے مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔

پس یہ اعتراض محض فضول اور لغو ہے کہ وہ لڑائیاں مذہب کے لیے تھیں۔ اگر محض مذہب کے لیے ہوتیں تو جزیہ دینے کی صورت میں اُن کو کیوں چھوڑا جاتا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ عیسائی تو اس قسم کا

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۷؍نومبر ۱۹۰۵ء

اعتراض کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنے گھر میں دیکھیں کہ اسلامی لڑائیاں موسوی لڑائیوں سے زیادہ ہیں؟ اور جبکہ وہ حضرت عیسیٰ کو موسیٰ علیہ السلام کا بھی (معاذاللہ) خدا مانتے ہیں تو ان لڑائیوں کا الزام عیسائیوں پر بدستور قائم ہے خصوصًا ایسی حالت میں کہ وہ لڑائیاں اسلامی جنگوں سے زیادہ سخت اور خونریز تھیں۔ اسلامی لڑائیوں میں بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کا لحاظ کیا جاتا تھا اور ان کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر موسوی لڑائیوں میں تو ان امور کی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا ہی اسلامی جنگوں میں مذہبی عبادت گاہوں اور پھلدار درختوں کو بھی ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر موسوی لڑائیوں میں پھلدار درخت تباہ کر دیئے جاتے۔ غرض اسلامی جنگ موسوی لڑائیوں کے مقابلہ میں کچھ چیز ہی نہیں۔

مامور من اللہ کی جماعت اور ایک الہام

فرمایا :

اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہی عادت چلی آئی ہے کہ جب کوئی مامور اور مُرسل اس کی طرف سے آتا ہے تو اوّلاً اس کی جماعت میں ضعفاء اور غرباء ہی آتے ہیں۔ بادشاہوں یا امراء کو توجہ نہیں ہوتی ہے اور آخر اللہ تعالیٰ غرباء کی جماعت کو ہر قسم کی ترقیاں دے دیتا ہے۔ میرا ایک الہام ہے کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ وہ بادشاہ مجھے دکھائے بھی گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زمانہ آئے گا جب اللہ تعالیٰ بعض کو اس سلسلہ کی سچائی کا فہم عطا کر دیگا۔

پنجاب کی سرزمین نرم ہے

فرمایا :

پنجاب کی سرزمین نرم ہے۔ ان لوگوں میں وہ شور اور شرارت نہیں ہے۔ جو ہندوستانیوں میں ہے۔ ہندوستانیوں نے غدر کر دیا تھا مگر پنجابی گورنمنٹ کے ساتھ تھے۔ ہمارے مرزا صاحب نے بھی پچاس گھوڑے اس وقت مدد کے لیے گورنمنٹ کو دیئے تھے۔

پنجابیوں نے جسقدر مجھے قبول کیا ہے۔ ہندوستان کو ابھی اس سے کچھ نسبت ہی نہیں۔[1]

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۷؍نومبر ۱۹۰۵ء

۳؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

نبی کا انکار کُفر کو مستلزم ہے

فرمایا :

نبی کا انکار موجب کفر ہوتا ہے مگر ولی کا انکار بھی سلب ایمان کا موجب ہو جاتا ہے اور آخر کُفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَاٰذَنْتُہٗ لِلْحَرْبِ۔ یعنی جو شخص میرے ولی کے ساتھ دشمنی کرتا ہے مَیں اس کو لڑائی کے لیے پکارتا ہوں۔

خدا تعالیٰ نے بلعم کا قصہ بیان کیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وجہ سے اس حد تک گر گیا کہ اس کی کُتّے سے مثال دی گئی۔ نبی کا انکار صریح کُفر کو مستلزم ہے مگر ولی کا جب دشمن بنتا ہے تو اندر ہی اندر توفیق چھن جاتی ہے۔

عبادت میں ذوق و شوق خدا تعالےٰ کے فضل پر ملتا ہے

کسی نے پوچھا کہ عبادت میں ذوق شوق کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا :

اعمالِ صالحہ اور عبادت میں ذوق شوق اپنی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا تعالیٰ کے فضل اور توفیق پر ملتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان گھبرائے نہیں اور خدا تعالیٰ سے اس کی توفیق اور فضل کے واسطے دعائیں کرتا رہے۔ اور ان دُعاؤں میں تھک نہ جاوے۔ جب انسان اس طرح پر مستقل مزاج ہو کر لگا رہتا ہے تو آخر خدا تعالیٰ اپنے فضل سے وہ بات پیدا کر دیتا ہے جس کے لیے اس کے دل میں تڑپ اور بے قراری ہوتی ہے۔ یعنی عبادت کے لیے ایک ذوق و شوق اور حلاوت پیدا ہونے لگتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص مجاہدہ اور سعی نہ کرے۔ اور وہ یہ سمجھے کہ پھونک مار کر کوئی کر دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ اور سنّت نہیں۔ اس طریق پر جو شخص اللہ تعالیٰ کو آزماتا ہے۔ وہ خُدا تعالیٰ سے ہنسی کرتا ہے اور مارا جاتا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ دل اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا فضل نہ ہو تو دُوسرے دن جا کر عیسائی ہو جاوے یا کسی اَور بے دینی میں مبتلا ہو جاوے۔ اس لیے ہر وقت اس کے فضل کے لیے دُعا کرتے رہو اور اس کی اِستعانت چاہو تاکہ صراطِ مستقیم پر تمہیں قائم رکھے۔ جو شخص خدا تعالیٰ سے بے نیاز ہوتا ہے وہ شیطان ہو جاتا ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان استغفار کرتا رہے تاکہ وہ زہر اور جوش پیدا نہ ہو جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔[1]

۱۱؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء

چند الہامات

قبل وفات مولوی صاحب۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ

۱۲؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء

اِنِّیْ مُھِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِھَانَتَکَ

فرمایا:

پہلے الہام کے یہ معنے معلوم ہوئے کہ مولوی عبدالکریم صاحب کی موت پر حد سے زیادہ غم کرنا ایک قسم کی مخلوق کی عبادت ہے کیونکہ جس سے حد سے زیادہ محبت کی جاتی ہے یا حد سے زیادہ اس کی جدائی کا غم کیا جاتا ہے۔ وُہ معبود کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ خُدا ایک کو بُلا لیتا ہے۔ دُوسرا اس کا قائم مقام کر دیتا ہے۔ قادر اور بے نیاز ہے۔

پہلے اس سے ایک یہ بھی الہام ہوا تھا جبکہ مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم زندہ تھے کہ:

دو شہتیر ٹوٹ گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ

یہ الہام بھی خوفناک ہے خدا تعالیٰ اس کے معنے بہتر جانتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ صفحہ ۱۰ مورخہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۵ء

مقامِ صدیقیت

فرمایا :

مُسلمانوں کو چاہیے کہ وہ محض اللہ کی رضا کو مقدم کریں۔ اگر اسے خوش کریں تو سب کچھ مل سکتا ہے۔ مگر ان کی یہی تو بدقسمتی ہے کہ وہ اسی کو ناراض کر رہے ہیں۔ مجھے بہت ہی افسوس ہوتا ہے جب مَیں دیکھتا ہوں کہ مُسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے ایک سچّا دین اسلام عطا کیا تھا مگر انھوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ خدا جانے یہ بے پروائی کیا نتیجہ پیدا کرے۔ دین کی کچھ بھی پروا اور غیرت نہیں۔ باہم اگر جنگ و جدل ہے تو اس میں شیخی، ریا، عُجب مقصود ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا جلال اور عظمت۔ لیکن جو شخص ہر امر میں اللہ تعالیٰ کو مقدم کرے۔ اور اس کے دین کی حمیت اور غیرت میں ایسا محو ہو کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا ظاہر کرنا اس کا مقصود خاطر ہو۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے دفتر میں صدیق کہلاتا ہے۔

جماعت کا صِدق اور ہمدردیٔ اسلام

ہم جس طریق پر اسلام کو پیش کر سکتے ہیں۔ دُوسرا نہیں کر سکتا۔ مگر مشکلات یہ ہیں کہ ہماری جماعت کا بہت بڑا حِصّہ غربا کا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شُکر ہے کہ باوجودیکہ یہ غربا کی جماعت ہے؛ تاہم مَیں دیکھتا ہوں کہ ان میں صدق ہے اور ہمدردی ہے اور وہ اسلام کی ضروریات سمجھ کر حتی المقدور اس کے لیے خرچ کرنے سے فرق نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ساتھ ہو تو کام بنتا ہے اور ہم اس کے فضل کے امیدوار ہیں۔

اسلام کا ضعف راتوں کی دعاؤں سے ہی دُور ہو سکتا ہے

جس طرح پر ایک طوفان قریب آتا ہو تو انسان کو فکر ہوتا ہے کہ یہ طُوفان تباہ کر دے گا اسی طرح پر اسلام پر طوفان آرہے ہیں۔ مخالف ہر وقت ان کوششوں میں لگے ہوتے ہیں کہ اسلام تباہ ہو جاوے لیکن مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو ان تمام حملوں سے بچائے گا اور وہ اس طوفان میں اس کا بیڑا اسلامتی سے کنارہ پر پہنچا دے گا۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کو مشکلات نظر آتی تھیں تو بجز اس کے اَور کوئی صورت نہ ہوتی تھی کہ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں کرتے تھے۔ قوم تو صمٌّ بکمٌ ہوتی ہے وہ ان کی باتیں سُنتی نہیں بلکہ تنگ کرتی اور دُکھ دیتی ہے۔ اس وقت راتوں کی دعائیں ہی

کام کیا کرتی تھیں۔ اب بھی یہی صورت ہے باوجودیکہ اسلام ضعف کی حالت میں ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی بحالی کے لیے پوری کوشش کی جائے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ہم سے جو اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر طرح سے ہماری مخالفت کے لیے سعی کی جاتی ہے یہ میری مخالفت نہیں خدا تعالےٰ سے جنگ ہے۔ میں تو یہاں تک یقین رکھتا ہوں کہ اگر میری طرف سے کوئی کتاب اسلام پر جاپان میں شائع ہو تو یہ لوگ میری مخالفت کے لیے جاپان بھی جا پہنچیں۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو خدا تعالیٰ چاہتا ہے۔

رُوحانیت کا صعود پاک دلی پر منحصر ہے

وہ شخص بڑا ہی مبارک اور خوش قسمت ہے جس کا دل پاک ہو اور وہ اللہ تعالےٰ کی عظمت اور جلال کے اظہار کا خواہاں ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ اُسے دُوسروں پر مقدم کر لیتا ہے۔ جو لوگ میری مخالفت کرتے ہیں ان کا اور ہمارا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے ہے۔ وہ ہمارے اور ان کے دلوں کو خوب جانتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کس کا دل دنیا کے نمود اور نمائش کے لیے ہے اور کون ہے جو خدا تعالیٰ ہی کے لیے اپنے دل میں سوز و گداز رکھتا ہے۔

یہ خوب یاد رکھو کہ کبھی رُوحانیت صعود نہیں کرتی جب تک دل پاک نہ ہو جب دل میں پاکیزگی اور طہارت پیدا ہوتی ہے تو اس میں ترقی کے لیے ایک خاص طاقت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے ہر قسم کے سامان مہیا ہو جاتے ہیں اور وہ ترقی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ بالکل اکیلے تھے اور اس بیکسی کی حالت میں دعویٰ کرتے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف: ۱۵۹)

کون اس وقت خیال کر سکتا تھا کہ یہ دعویٰ ایسے بے یار و مددگار شخص کا بار آور ہوگا۔ پھر ساتھ ہی اس قدر مشکلات آپؐ کو پیش آئیں کہ ہمیں تو ان کا ہزارواں حصہ بھی نہیں آئیں۔ وہ زمانہ تو ایسا تھا کہ سکھا شاہی سے بھی بدتر تھا۔ اب تو گورنمنٹ کی طرف سے پورا امن اور آزادی ہے۔ اس وقت ایک چالاک آدمی ہر قسم کی منصوبہ بازی سے جو کچھ بھی چاہتا دُکھ پہنچاتا۔ مگر مکہ جیسی جگہ میں اور عربوں جیسی وحشیانہ زندگی رکھنے والی قوم میں آپؐ نے وہ ترقی کی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ خود ان کی مذہبی تعلیم اور عقائد کے خلاف انہیں سُنایا کہ یہ لات اور عزّیٰ جن کو تم اپنا معبود قرار دیتے ہو۔ یہ سب پلید اور حَصَبُ جہنّم ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کونسی بات عربوں کی ضدی قوم کو جوش دلانے والی ہو سکتی ہے۔ لیکن انہیں عربوں میں آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے نشو و نما پایا اور ترقی کی۔ انہیں میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے بھی نکل آئے۔ اس سے ہمیں امید ہوتی ہے کہ انہیں مخالفوں میں سے وہ لوگ بھی نکلیں گے جو خدا تعالیٰ کی مرضی کو پورا کرنے والے اور پاک دل ہوں گے اور یہ جماعت جو اس وقت تک تیار ہوئی ہے آخر انہیں میں سے آئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہم کبھی نا امید نہیں ہو سکتے

کئی دفعہ میر صاحب[1] نے ذکر کیا کہ دلّی سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے مگر میرے دل میں یہی آتا ہے کہ یہ بات درست نہیں۔ دلّی میں بھی بعض پاک دل ضرور چھپے ہوتے ہوں گے جو آخر اس طرف آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہمارا تعلق دلّی سے کیا ہے۔ یہ بھی خالی از حکمت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہم کبھی نا امید نہیں ہو سکتے۔ آخر خود میر صاحب بھی دلّی ہی کے ہیں۔ غرض یہ کوئی نا امید کرنے والی بات نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک اور کامل نمونہ ہمارے سامنے ہے کہ مکّہ والوں نے کیسی مخالفت کی اور پھر اسی مکّہ میں سے وہ لوگ نکلے جو دنیا کی اصلاح کرنے والے ٹھہرے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں میں سے تھے۔ وہ ابوبکرؓ جن کی بابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکرؓ کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس بات سے جو اس کے دل میں ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں مکّہ والوں میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ بڑے بھاری مخالف تھے یہانتک کہ ایک مرتبہ مشورۂ قتل میں بھی شریک اور قتل کے لیے مقرر ہوتے لیکن آخر خدا تعالیٰ نے ان کو وہ جوش اظہارِ اسلام کا دیا کہ غیر قومیں بھی ان کی تعریف کرتی ہیں اور ان کا نام عزت سے لیتی ہیں۔

ہم کو وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے۔ باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہ ہوئے جب تک پورے کامیاب نہیں ہو گئے اور آپؐ نے إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا (النصر:۲-۳) کا نظارہ دیکھ نہیں لیا۔

نبی کا قائم کردہ سلسلہ تباہ نہیں ہوتا

آج ہمارے مخالف بھی ہر طرح کی کوششیں ہمارے نابود کرنے کی کرتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے اور انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ جس قدر مخالفت اس سلسلہ

---

[1] حضرت میر ناصر نواب صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں۔

کی انہوں نے کی ہے اسی قدر ناکامی اور نامرادی ان سب کے شاملِ حال رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو بڑھایا ہے۔ یہ تو خیال کرتے اور رائے لگاتے ہیں کہ یہ شخص مر جاوے گا اور جماعت متفرق ہو جاوے گی۔ یہ فرقہ بھی دوسرے فرقہ برہمو وغیرہ کی طرح ہے کہ جن میں کوئی کشش نہیں ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاوے گا۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ نے خود ارادہ فرمایا ہے کہ اس سلسلہ کو قائم کرے اور اسے ترقی دے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرقے نہ تھے؟ اس وقت ان کے مخالف بھی یہی سمجھتے ہونگے کہ بس اب انکا خاتمہ ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ان کو کیسا نشوونما دیا اور پھیلایا۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ اگر کوئی فرقہ تھوڑی سی ترقی کر کے رُک جاتا ہے تو ایسے فرقوں کی نظیر موجود نہیں جو عالم پر محیط ہو جاتے ہیں؟ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ارادوں پر نظر کر کے حکم کرنا چاہیے۔ جو لوگ رہ گئے اور ان کی ترقی رُک گئی ان کی نسبت ہم یہی کہیں گے کہ وہ اس کی نظر میں مقبول نہ تھے وہ اس کی نہیں بلکہ وہ اپنی پرستش چاہتے تھے۔ مگر میں ایسے لوگوں کو نظیر میں پیش کرتا ہوں جو اپنے وجود سے جل جاویں اور اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت اور جلال کے خواہشمند ہوں۔ اس کی راہ میں ہر دُکھ اور موت کے اختیار کرنے کو آمادہ ہوں۔ پھر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تباہ کر دے گا؟ کون ہے جو اپنے گھر کو خود تباہ کر دے؟ ان کا سلسلہ خدا کا سلسلہ ہوتا ہے اس لیے وہ خود اسے ترقی دیتا ہے اور ان کے نشوونما کا باعث ٹھہرتا ہے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دُنیا میں ہوئے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کون تباہ ہوا۔ ایک بھی نہیں اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجموعی طور پر دیکھو۔ کیونکہ آپ جامع کمالات تھے۔ ساری قوم آپ کی دشمن ہو گئی اور اس نے قتل کے منصوبے کئے مگر آپ کی اللہ تعالیٰ نے وہ تائید کی جس کی نظیر دُنیا میں نہیں ملتی۔[1]

۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

زندگی بے اعتبار ہے

فرمایا: ان لوگوں پر مجھے تعجب آتا ہے جو زندگی پر اعتبار کرتے ہیں بعض دفعہ انسان پر آنی موت وارد ہوتی ہے۔ ایک شخص

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۸ صفحہ ۲، ۳ مورخہ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

بڑے مرزا صاحب کے پاس آیا انہوں نے اس کی نبض دیکھ کر کہا کہ فوراً گھر چلے جاؤ اور پاس والوں کو کہا کہ اگر کسی نے مُردہ چلتا ہوا دیکھنا ہو تو اس کو دیکھ لے۔ وہ گھر پہنچ کر فوراً مر گیا۔

ایسا ہی خلیفہ محمد حسین پٹیالہ والے کچہری سے گھر جا کر ایک زینہ پر گرے۔ اُٹھے اور دُوسرے پر گرے اور جان نکل گئی۔

صدقہ اگرچہ قلیل ہو مگر اس پر دوام ہو

ایک مختصر سے چندہ کی ضرورت تھی۔ فرمایا:

بعض لوگ ایک بات مُنہ سے نکالتے ہیں اور پھر اس پر قائم نہیں رہ سکتے اور گنہگار ہوتے ہیں۔ صدقہ عمدہ وہ ہے جو اگرچہ قلیل ہو مگر اس پر دوام ہو۔

مولوی یار محمد صاحب کا اخلاص

مولوی صاحب مرحوم[1] کی علالتِ طبع کے ایام میں بعض کی خدمت گذاری کے ذکر میں مولوی یار محمد صاحب بی۔ او۔ ایل کی خدمتگذاری کا ذکر آیا۔ فرمایا:

بہت ہی مخلص یکرنگ آدمی ہے۔ کئی دفعہ بہت تکلیف کا سفر برداشت کیا۔ بدنی خدمت خوب ادا کرتا ہے۔ چالیس کوس روز پیدل چلنا پڑے تو بھی عذر نہیں کرتا۔ رات کو چلنا ہو یا دن کو چلنا ہو۔ ایامِ مقدمہ میں ہمارے یکّہ کے ساتھ برابر پیادہ دوڑ کر گورداسپور اور قادیان آتا جاتا رہا۔ محنت اور دیانت سے کام کرنے والا آدمی ہے۔ جس کے پاس ہوگا وہ مطمئن رہے گا۔ کیونکہ دانستہ غفلت کرنے والا آدمی نہیں سُنّتِ صحابہؓ کا ایک جزو اس میں ہے۔

قبل از نماز عصر

سچّے مذہب کی شناخت

گجرات کے مشن سکول کے ہیڈ ماسٹر ڈی نیل صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چند تحریری سوال پیش کئے جن کے جوابات تحریری دیئے جائیں گے۔ مختلف مذاہب کا

---

[1] حضرت مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ (مرتب)

تذکرہ تھا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا:

آجکل مذاہب کی عجیب حالت ہے۔ گھر گھر ایک نیا مذہب بن رہا ہے اور تلاش کرنے والے کے واسطے ایک حیرت کا مقام ہو رہا ہے اور اس وقت طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ واقعی انسان کو نجات دینے والا سچا مذہب کونسا ہے؟ اس کا جواب ہر ایک شخص اپنے اپنے رنگ میں دیگا، لیکن اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ ہر ایک مذہب میں یہ دیکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کے معاملات کیسے ہیں۔ اس کی عظمت جبروت اور خوف کس قدر دل پر غالب ہے۔ انسان شر سے طبعًا نفرت کرتا ہے اور جس چیز کے فوائد اور منافع مرکوزِ خاطر ہو جائیں اس سے طبعًا محبت کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ انسان کو رات رہنا ہو اور اس جگہ سانپ ہو تو گوارا نہ کرے گا کہ وہاں رہے۔ یا کسی گاؤں میں طاعون ہو تو طبعًا اس بات سے نفرت کرے گا کہ اس میں داخل ہو۔ فائدہ مند چیز کی طرف رغبت کرتا ہے۔ بُری چیز سے نفرت رکھتا ہے۔ پس جس شخص کے دل میں خدا کی واقعی عظمت ہو جاوے اور اس کو منافع دینے والا یقین کرے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی میں اپنی ہلاکت پر پورا ایمان قائم کرے تو پھر باوجود اس نظارہ کے وہ کس طرح خدا تعالیٰ کی خلاف مرضی کر سکے گا۔

انسان کو چلتے چلتے سونے کا خزانہ نظر آجائے تو ضرور اس کو لینے کی سعی کرتا ہے۔ پس اصل بات یقین اور ایمان ہے جس کے ذریعہ تمام بدیوں سے بچ کر نیکی کی طرف انسان آسکتا ہے۔ اب وہ یقین اور ایمان کس طرح سے حاصل ہو؟ سچا مذہب وہ ہے جو اس یقین کے واسطے صرف قصہ اور کہانیوں پر مدار نہ رکھے کیونکہ یہ کہانیاں تو سب میں پائی جاتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم مسیح کے معجزات کا قصہ مان لیں اور ایک ہندو کے دیوتاؤں کے معجزات جو اس کی پرانی کتابوں میں درج ہیں نہ مانیں۔ تاریخی امور میں سب قومیں تواتر پیش کرتی ہیں۔ یہ ایک تحکم ہے کہ ایک کی بات مانی جائے اور دوسرے کا انکار کیا جائے۔ یہ نامناسب ہے کہ انسان اپنے مذہب کے قصے کو درست جانے اور باقی سب کو غلط مانے۔ غرض قصوں کے ذریعہ سے حق کے تلاش کرنے کا سفر بہت دُور دراز کا ہے جو طے نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوائے آسان راہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جیسا پہلے قادر تھا اب بھی قادر ہے جیسا پہلے معجزات ظاہر کر سکتا تھا۔ اب بھی ظاہر کر سکتا ہے۔ جیسا پہلے سنتا تھا اب بھی سنتا ہے۔ اور جیسا پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے۔ یہ کیا وجہ ہے کہ پہلے تو سُننے اور بولنے کی دونوں صفتیں اس میں تھیں مگر اب سُننے کی صفت تو ہے لیکن بولنے کی نہیں۔ پس سچا طالب وہ ہے جو سب باتوں کو چھوڑ کر اس لَمْ یَزَل ازلی ابدی خدا ہمیشہ کی قدرتوں والے خُدا کی طرف جُھک جائے۔ اس خدا کی طرف

توجہ کرے جواب بھی وہی صفات اور اخلاق رکھتا ہے جو موسیٰؑ کے وقت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت رکھتا تھا۔ وہ اب بھی چاہتا ہے کہ گم گشتہ اس کے پاس آئے۔ وہ اب بھی محبت کرتا ہے کہ کوئی اس کے حضور میں آئے۔ سچا وہی ہے جو ایسے خدا کو ڈھونڈتا ہے۔ جس مذہب کا مدار صرف قصوں پر ہے وہ مُردہ مذہب ہے۔ سچا مذہب وُہ ہے جس میں وُہ خدا اب بھی بولتا ہے۔ جو تعصّب نہیں رکھتا ہے وہ محض خدائے حیّ و قیّوم کا طالب ہو کر اس کو پاتا ہے، خدا تعالیٰ اس دل کو دوست رکھتا ہے جو اس کو ڈھونڈنے والا ہو[1]

۲۲؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

(بمقام ریلوے اسٹیشن امرتسر)

حضرت مولوی عبدالکریمؓ کی وفات کے متعلق الہامات

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دہلی[2] تشریف لے جاتے ہوئے امرتسر کے سٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں تشریف فرما تھے۔ جماعت امرتسر کے دوست ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں حضرت مولانا عبدالکریم صاحب رضی اللہ عنہ کا تذکرہ آ گیا۔ حضور نے فرمایا:

بڑے ہی مخلص اور قابلِ قدر انسان تھے مگر اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی، اگرچہ بشریت کے لحاظ سے صدمہ ہوتا ہے مگر ہم اللہ تعالیٰ کی رضا پر خوش ہیں۔ اس نے ہماری تسلّی کیلئے پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ اب مولوی صاحب ہم سے الگ ہوں گے؛ چنانچہ اِنَّ الْمَنَایَا لَا تَطِیْشُ سِھَامُھَا۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۹ صفحہ ۲ مورخہ ۲۰؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

[2] بدر سے :- جب حضرت نے تشریف لے جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ تو آپ کے حکم اور اجازت سے چند خدام بھی ساتھ ہوتے۔ عاجز راقم (حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ۔ ناقل) کی طبیعت بیمار تھی اور چند روز بخار آتا رہا ہے مگر حضور نے فرمایا کہ :

"چلے چلو۔ تبدیلی آب و ہوا سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔"

بدر جلد ۱ نمبر ۳۰ صفحہ ۲ مورخہ ۲۷؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

ان کی بابت الہام ہوچکا تھا اور پھر کفن میں لپیٹا گیا اور پھر صاف طور پر سینتالیس[۴۷] برس کی عُمر۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ یہ سب الہامات اُن کی موت کی خبر دیتے تھے لیکن ہم ان کی نسبت خیر چاہتے تھے۔ اس لیے اپنے طور پر ان الہامات کو کسی اور مفہوم میں پورا ہونے کے خواہشمند تھے مگر اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر وہی تھی جو صاف طور پر ان الہامات میں بتادی گئی تھی اور آخر وہ پورے ہوگئے۔ ان الہامات پر غور کرکے مجھے ایک نکتہ سمجھ میں آیا ہے کہ جب مرض الموت کا وقت آجاوے تو وہ وقت دعا کا نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کو ظاہر کردیتا ہے۔ اسی طرح پر جو حالتیں مہلک بیماریوں کی ہوتی ہیں ان میں بھی نظر آجاتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ مولوی صاحب کے معاملہ میں ایک عجیب بات دیکھی گئی کہ ان کی اصل مرض سرطان جس کو انگریزی میں کاربنکل کہتے ہیں بالکل اچھا ہو گیا بلکہ خود انہوں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا اور یہی کہتے رہے کہ اب مَیں دو چار روز میں پھرنے لگوں گا۔ آخر ذات الجنب کی وجہ سے سخت بخار ہوگیا جو ایک سو چھ[۱۰۶] درجہ تک پہنچ گیا اور اسی عارضہ میں وفات پائی۔ اکیاون[۵۱] دن تک وہ اس بیماری میں زندہ رہے۔ یہ زیادتِ ایّام بھی استجابتِ دُعا پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس مرض سے اُن کو آخر نجات دیدی۔ رہی موت اس سے تو کوئی بچا ہے نہ بچ سکتا ہے۔

ان کی بیوی نے بتایا کہ وہ کہتے تھے کہ کئی مرتبہ خُدا بُلانے آیا ہے مگر تاخیر ہی ہوتی رہی۔

خدا تعالیٰ کا تردّد

اصل بات یہ ہے کہ یہ وہی تردّد ہے جس کا ذکر صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے مومن کی جان لینے میں تردّد ہوتا ہے۔

مَیں نے باوجودیکہ ان کی وفات کے متعلق الہامات ہوچکے تھے بہت دُعا کی تو الہام ہوا۔ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا۔ پھر یہ بھی الہام ہوا یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب انتہا درجہ تک کسی کا وجود ضروری سمجھا جاتا ہے تو وہ معبود ہو جاتا ہے اور یہ صرف خدا تعالےٰ ہی کا وجود ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ کسی انسان یا اور مخلوق کے لیے ایسا نہیں کہہ سکتے۔

چند الہامات

پھر فرمایا: پرسوں الہام ہوا تھا۔ اِنِّیۡ مَعَ الرَّسُوۡلِ اَقُوۡمُ وَ اَرُوۡمُ مَا یَرُوۡمُ وَ اُعۡطِیۡکَ مَا یَدُوۡمُ اور آج کا الہام یہ ہے تَاۡتِیۡکَ وَ اَنَا مَعَکَ۔ یہ الہام بخیر و عافیت سفر سے واپس آنے کی خبر دیتا ہے[1]۔

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۴ صفحہ ۴، ۵ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء

۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۵ء

بمقام دہلی

ایک رؤیا صبح حضرت نے فرمایا کہ :

آج رات مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تھوڑے سے چنے بھُونے ہوئے سفید ہیں اور ان کے ساتھ منقّہ بھی ہے۔

فرمایا۔ ہمارا تجربہ ہے کہ :۔

چنے، مولی، بینگن یا پیاز خواب میں دیکھیں تو کوئی امر مکروہ پیش آتا ہے لیکن منقہ دل کو قوت دینے والی شئے ہے اور اس کا دیکھنا اچھا ہے۔ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اَمر مکروہ چھوٹا یا بڑا درپیش ہے جو منقّہ کی آمیزش سے وہ کراہت جاتی رہے گی۔

تنگی کے بعد فراخی آتی ہے فرمایا :

انسان کی زندگی کے ساتھ مکروہات کا سلسلہ بھی لگا ہوا ہے۔ اگر انسان چاہے کہ میری ساری عمر خوشی میں گذرے تو یہ ہو نہیں سکتا۔ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا۔ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا (الم نشرح:۶-۷)۔ یہ زندگی کا چکر ہے۔ جب تنگی آوے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے بعد فراخی بھی ضرور آئے گی۔

زیارتِ قبور صُبح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مردانہ مکان میں تشریف لائے۔ دہلی کی سیر کا ذکر درمیان میں آیا۔ فرمایا :

لہو ولعب کے طور پر پھرنا دُرست نہیں؛ البتہ یہاں بعض بزرگ اولیاء اللہ کی قبریں ہیں۔ ان پر ہم بھی جائیں گے۔

عاجز[1] کو فرمایا کہ :

ایسے بزرگوں کی فہرست بناؤ تاکہ جانے کے متعلق انتظام کیا جائے۔

---

[1] حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ (مرتب)

حاضرین نے یہ نام لکھائے۔ (۱) شاہ ولی اللہ صاحب (۲) خواجہ نظام الدین صاحب (۳) جناب قطب الدین صاحب (۴) خواجہ باقی باللہ صاحب (۵) خواجہ میر درد صاحب (۶) جناب نصیر الدین صاحب چراغ دہلی۔

چنانچہ گاڑیوں کا انتظام کیا گیا اور حضرت بمعہ خدام گاڑیوں میں سوار ہو کر سب سے اوّل حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار پر پہنچے۔ راستہ میں حضرت نے زیارتِ قبور کے متعلق فرمایا:

قبرستان میں ایک رُوحانیت ہوتی ہے اور صبح کا وقت زیارتِ قبور کے لیے ایک سنّت ہے۔ یہ ثواب کا کام ہے اور اس سے انسان کو اپنا مقام یاد آجاتا ہے۔ انسان اس دُنیا میں مسافر ہے۔ آج زمین پر ہے تو کل زمین کے نیچے ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب انسان قبر پر جائے تو کہے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ۔

زیارتِ قبور کے آداب

خواجہ باقی باللہ کی مزار پر جب ہم پہنچے تو وہاں بہت سی قبریں ایک دوسرے کے قریب قریب اور اکثر زمین کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ میں نے غور سے دیکھا کہ حضرت اقدس نہایت احتیاط سے ان قبروں کے درمیان چلتے تھے تا کہ کسی کے اُوپر پاؤں نہ پڑے۔ قبر خواجہ صاحب پر پہنچ کر آپ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دُعا کی اور دُعا کو لمبا کیا۔ بعد دُعا میں نے عرض کیا کہ قبر پر کیا دُعا کرنی چاہیئے تو فرمایا کہ:

صاحبِ قبر کے واسطے دُعائے مغفرت کرنی چاہیئے اور اپنے واسطے بھی خدا تعالیٰ سے دُعا مانگنی چاہیئے۔ انسان ہر وقت خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کرنے کا محتاج ہے۔

قبر کے سرہانے کی طرف ایک نظم خواجہ صاحب مرحوم کے متعلق لکھی ہے۔ بعد دُعا آپ نے وہ نظم پڑھی اور عاجز راقم کو حکم دیا کہ اس کو نقل کرلو[1]۔ فرمایا:

حضرت خواجہ باقی باللہ

خواجہ باقی باللہ بڑے مشائخ میں سے تھے۔ شیخ احمد سرہندی کے پیر تھے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ان بزرگوں کی ایک کرامت تو ہم نے بھی دیکھ لی ہے اور وہ یہ ہے کہ دہلی جیسے شہر کو انہوں نے قائل کیا اور یہ وہ شہر ہے جو ہم کو مردود اور مخذول اور کافر کہتا ہے۔

---

[1] چنانچہ حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ نے وہ نظم نقل کرلی اور بدر میں اسے شائع کردیا۔ (مرتب)

سرزمین دہلی

سیٹھ صاحب[1] کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ:

یہ سرزمین بمبئی سے زیادہ سخت ہے اور اس کے لیے آسمانی سرزنش کا حصہ ہمیشہ رہا ہے صرف انگریزوں کے ساتھ ہی بغاوت نہیں کی بلکہ سلاطینِ اسلامیہ کے ساتھ بھی شورہ پشتی کرتے رہے ہیں۔ اس جگہ کے اکابر اور مشائخ کے اخلاق کا بھی اس سے پتہ لگ جاتا ہے کہ انہوں نے ایسے شہر میں کس طرح بسر کی۔ یہ بزرگ بہت ہی مسلوب الغضب تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو مٹی کی طرح کر دیا تھا۔ مرزا جانِ جاناں کو ان لوگوں نے قتل کر دیا۔ اور بڑے دھوکے سے کیا۔ یعنی ایک آدمی نذر دینے کو آیا اور دھوکا سے طپنچہ مار دیا۔ شاہ ولی اللہ کے لیے بھی دہلی والوں نے ایسے ہی قتل کے ارادے کئے تھے مگر ان کو خدا تعالیٰ نے بچا لیا۔ میرے ساتھ جب مباحثہ ہوا تھا تو آٹھ نو ہزار آدمی کا مجمع تھا اور میں نے سنا ہے کہ بعض کے ہاتھ میں چاقو اور بعض کے ہاتھ میں پتھر بھی تھے۔ یہاں تک کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اندیشہ ہوا کہ کہیں غدر نہ ہو جاوے اس واسطے اس نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر مجمع سے باہر کیا اور گھر پہنچایا۔ ایسے وقت میں یہ لوگ کوتاہ اندیش، پست خیال اور سفلہ ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

پنجاب میں بڑی سعادت ہے

اس کے بالمقابل پنجاب میں بڑی سعادت ہے۔ ہزارہا لوگ سلسلہ حقہ میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پنجاب کی زمین بہت نرم ہے اور اس میں خدا پرستی ہے طعن و تشنیع کو برداشت کرتے ہیں۔ مگر یہ لوگ بہت سخت ہیں جس سے اندیشہ ایسے عذاب الٰہی کا ہے جو پہلے ہوتا رہا ہے کیونکہ جب کوئی مامور من اللہ اور ولی اللہ آتا ہے اور لوگ اس کے درپئے ایذا اور توہین ہوتے ہیں، تو عادت اللہ اسی طرح واقع ہے کہ بعد اس کے ایسے شہر اور ملک پر جو سرکش اور بے ادب ہوتا ہے ضرور تباہی آتی ہے۔ پنجاب میں اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ وہ لوگ خدا تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس کثرت سے پنجابیوں کا ہماری طرف رجوع ہو رہا ہے کہ بعض اوقات ان کو ہماری مجالس میں کھڑا ہونے کی جگہ نہیں ملتی۔

فرمایا:

خواجہ باقی باللہ صاحب کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم سے بھی کم

---

[1] سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب مراد ہیں۔ (مرتب)

عمر پائی تھی۔ مولوی صاحب موصوف کی عمر سینتالیس ۴۷ سال کی تھی۔

خواجہ باقی باﷲ کی قبر پر کھڑے ہو کر بعد دُعا کے فرمایا کہ :

ان تمام بزرگوں کی جو دہلی میں مدفون ہیں کرامت ظاہر ہے کہ ایسی سخت سرزمین نے ان کو قبول کیا۔ یہ کرامت اب تک ہم سے ظہور میں نہیں آئی۔

ذِلّت کا رزق قبر پر بہت سے سائل جمع تھے فرمایا :

یہ سائلین بہت پیچھے پڑتے ہیں۔ پہلے معلوم نہ تھا ورنہ ان کے واسطے کچھ پیسے ساتھ لے آتے۔ شیخ نظام الدین کی قبر پر سائل اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ آپس میں لڑنے لگ جاتے ہیں۔ یہی ان کا رزق ہو گیا ہے جو ذلّت کا رزق ہے۔ رزق کی تنگی بعض لوگوں سے بہت بُرے کام کراتی ہے۔ ایک سائل لودھیانہ میں میرے پاس آیا اور ظاہر کیا کہ ایک آدمی مر گیا ہے اس کے کفن کے واسطے سامان کرتا ہوں۔ ۴ر (چار آنے) کی کسر باقی ہے۔ ایک آدمی نے کہا کہ پہلے دیکھنا چاہیے کہ وہ میّت کہاں ہے؟ پھر اس کی پُوری مدد کرنی چاہیئے چنانچہ وہ آدمی ساتھ گیا تو تھوڑی دُور جا کر سائل بھاگ گیا کیونکہ وہ سب جھوٹا قصّہ بنایا ہوا تھا۔ تنگیٔ رزق یہ بد مکر کراتی ہے۔

مساجد کی اصل زینت دہلی کی جامع مسجد کو دیکھ کر فرمایا کہ :

مسجدوں کی اصل زینت عمارتوں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ان نمازیوں کے ساتھ ہے جو اخلاص کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ ورنہ یہ سب مساجد ویران پڑی ہوئی ہیں۔ رسُول کریم صلی اﷲ علیہ وسلم کی مسجد چھوٹی سی تھی۔ کھجور کی چھڑیوں سے اس کی چھت بنائی گئی تھی اور بارش کے وقت چھت میں سے پانی ٹپکتا تھا۔ مسجد کی رونق نمازیوں کے ساتھ ہے۔ آنحضرت صلی اﷲ علیہ وسلم کے وقت میں دُنیاداروں نے ایک مسجد بنوائی تھی۔ وُہ خدا تعالیٰ کے حکم سے گرا دی گئی۔ اس مسجد کا نام مسجدِ ضرار تھا۔ یعنی ضرر رساں۔ اس مسجد کی زمین خاک کے ساتھ ملا دی گئی تھی۔ مسجدوں کے واسطے حکم ہے کہ تقویٰ کے واسطے بنائی جائیں۔

آثارِ قدیمہ ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ :

اگر آپ نے قلعہ نہیں دیکھا تو دیکھ لیں ؎

آثار پدید است صنادید عجم را

اجل میں تاخیر نہیں

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کا ذکر تھا۔ فرمایا:

خدا تعالیٰ نے دُعا کو قبول کر کے سرطان سے شفا دے دی۔ مگر جب کسی کی اجل آجاتی ہے تو پھر رُک نہیں سکتی اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ دُعا سے عمر بڑھ جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اجل کے آجانے سے پیشتر قبل از وقت جو دُعا کی جاوے وہ کام آتی ہے ورنہ جان کندن کے وقت کون دُعا کر سکتا ہے؟ ایسی سخت بیماری میں مولوی صاحب مرحوم کا اکیاون دن تک زندہ رہنا بھی استجابت دعا کا ہی نتیجہ تھا۔ یہ تاخیر بھی تعجب انگیز ہے۔ ہم بہت دُعا کرتے تھے کہ آدمی اچھا ہے زندہ ہی رہے تب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ الہام ہوا تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ یعنی کیا اگلے عالم کے تم قائل نہیں ہو جو اس دُنیا کی زندگی کے واسطے اتنا زور دیتے ہو۔

بعد نماز ظہر

جو آنے والا تھا وہ مَیں ہی ہوں

ایک شخص عبدالحق نام جو اپنے آپ کو صُوفی ابوالخیر صاحب کے مرید بتلاتے تھے چند طالب علموں کے ساتھ آئے۔ اَور بھی دہلی والے آموجود ہوئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ کیا تم سب دہلی کے ہو؟ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ پھر میاں عبدالحق صاحب نے سوال کیا کہ مَیں تشفّی کے واسطے ایک بات پوچھتا ہوں۔ حضرت نے اجازت دی۔

عبدالحق۔ کیا آپ اس مسیح اور مہدی کو یاد دلانے والے ہیں جو کہ آنے والا ہے یا کہ آپ خود مسیح اور مہدی ہیں؟

حضرت اقدس۔ مَیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ قرآن اور حدیث کے مطابق اور اس الہام کے مطابق کہتا ہوں جو خدا تعالیٰ نے مجھے کہا۔ جو آنیوالا تھا وہ مَیں ہی ہوں جس کے کان ہوں وہ سُنے اور جس کی آنکھ ہو وہ دیکھے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو گئے

اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رؤیت کی گواہی دی۔ دونو باتیں ہوتی ہیں قول اور فعل یہاں اللہ تعالیٰ کا قول اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل موجود ہے شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ کو دیگر گذشتہ انبیاء کے درمیان دیکھا۔ ان دو شہادتوں کے بعد تم اور کیا چاہتے ہو؟ اس کے بعد خدا تعالیٰ نے صد ہا نشانات سے تائید کی۔ جو طالب حق ہو۔ اور خوفِ خدا رکھتا ہو۔ اس کے سمجھنے کے واسطے کافی سامان جمع ہو گیا ہے۔ ایک شخص پہلی پیشگوئی کے مطابق، قال اللہ قال الرسول کے مطابق عین ضرورت کے وقت دعویٰ کرتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ عیسائیت اسلام کو کھا رہی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اسلام کی حمایت کے واسطے جو بات پیش کی ہے اس سے بڑھ کر کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ انیس سو سال سے عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ خدا ہے اور معبود ہے اور چالیس کروڑ عیسائی اس وقت موجود ہے۔ اس پر پھر مسلمانوں کی طرف سے اُن کی تائید کی جاتی ہے کہ بیشک عیسیٰ ابتک زندہ ہے نہ کھانے کا محتاج نہ پینے کا محتاج۔ سب نبی مر گئے پر وہ زندہ آسمان پر بیٹھا ہے۔ اب آپ ہی بتلائیں کہ اس سے عیسائیوں پر کیا اثر ہوگا۔

عیسائیت کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح ہتھیار

عبدالحق۔ عیسائیوں پر تو کوئی اثر ہو نہیں سکتا جبتک کہ شمشیر نہ ہو۔

حضرت اقدس۔ یہ بات غلط ہے۔ تلوار کی اب ضرورت نہیں ہے اور نہ تلوار کا اب زمانہ ہے۔ ابتدا میں بھی تلوار ظالموں کے حملہ کے روکنے کے واسطے اٹھائی گئی تھی ورنہ اسلام کے مذہب میں جبر نہیں۔ تلوار کا زخم تو مِل جاتا ہے پر حجت کا زخم نہیں ملتا۔ دلائل اور براہین کے ساتھ اس وقت مخالفین کو قائل کرنا چاہیئے۔ میں آپ لوگوں کی خیرخواہی کی ایک بات کہتا ہوں۔ ذرا غور سے سنو۔ ہر دو پہلوؤں پر توجہ کرو۔ اگر عیسائیوں کے سامنے اقرار کیا جائے۔ کہ وہ شخص جس کو تم خدا اور معبود مانتے ہو بیشک وہ اب تک آسمان پر موجود ہے۔ ہمارے نبی تو فوت ہو گئے پر وہ اب تک زندہ ہے اور قیامت تک رہے گا۔ نہ کھانے کا محتاج نہ پینے کا محتاج۔ اگر ہم ایسا کہیں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اور اگر ہم عیسائیوں کے سامنے یہ ثابت کر دیں کہ جس شخص کو تم اپنا معبود اور خُدا مانتے ہو وہ مر گیا۔ مثل دُوسرے انبیاء کے فوت ہو کر زمین میں دفن ہے اور اس کی قبر موجود ہے۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ بحثوں کو جانے دو اور میری مخالفت کے خیال کو چھوڑ دو۔ میں پروا

نہیں کرتا کہ مجھے کوئی کافر کہے۔ دجّال کہے یا کچھ اَور کہے۔ تم یہ کہو کہ ان ہر دو باتوں میں سے کونسی بات ہے جس سے عیسائی مذہب بیخ و بنیاد سے اُکھڑ جاتا ہے۔

اس تقریر کا میاں عبدالحق صاحب پر بہت اثر ہوا؛ چنانچہ فوراً اُٹھ کھڑا ہو کر حضرت اقدس علیہ السلام کے ہاتھ چومے اور کہا۔ مَیں سمجھ گیا۔ آپ اپنا کام کرتے جائیں۔ مَیں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ آپ کو ترقی دے۔ انشاءاللہ ضرور آپ کی ترقی ہوگی۔ یہ بات صحیح ہے۔

بدر جلد ۱ نمبر ۳۱ صفحہ ۱ تا ۳ مورخہ ۳۱ / اکتوبر ۱۹۰۵ء

---

۲۵ / اکتوبر ۱۹۰۵ء

بمقام دہلی

ایک رؤیا

دیکھا کہ بڑا سخت زلزلہ آیا ہے۔

ایک رؤیا کی تعبیر

فرمایا:

اگلے دن جو خواب میں پچھنے دیکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر ناصر نواب صاحب کی بیماری کی طرف اشارہ تھا۔[۱]

بدر جلد ۱ نمبر ۳۱ صفحہ ۴ مورخہ ۳۱ / اکتوبر ۱۹۰۵ء

مسیح موعود کو ماننا کیوں ضروری ہے

چند مولوی اور طلباء آئے۔ حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں روزے

---

[۱] حاشیہ۔ نوٹ از ایڈیٹر صاحب بدر:۔ میر صاحب دو روز سے دردِ شکم سے بہت تکلیف میں ہیں۔ لیکن اب بہ نسبت سابق آرام ہے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۳۱ صفحہ ۴ مورخہ ۳۱ / اکتوبر ۱۹۰۵ء)

رکھتے ہیں۔ قرآن اور رسول کو مانتے ہیں۔ آپ کو ماننے کی کیا ضرورت ہے؟

اس پر حضرت اقدس نے فرمایا:

انسان جو کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے وہ سب موجب معصیت ہو جاتا ہے۔ ایک ادنیٰ سپاہی سرکار کی طرف سے کوئی پروانہ لے کر آتا ہے تو اس کی بات نہ ماننے والا مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اور سزا پاتا ہے۔ مجازی حکام کا یہ حال ہے تو احکم الحاکمین کی طرف سے آنیوالے کی بے عزتی اور بے قدری کرنا کس قدر عدولِ حکمی اللہ تعالیٰ کی ہے۔ خدا تعالیٰ غیور ہے۔ اس نے مصلحت کے مطابق عین ضرورت کے وقت بگڑی ہوئی صدی کے سر پر ایک آدمی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو ہدایت کی طرف بلائے۔ اس کے تمام مصالح کو پاؤں کے نیچے کچلنا ایک بڑا گناہ ہے۔ کیا یہودی لوگ نمازیں نہیں پڑھا کرتے تھے؟ بمبئی کے ایک یہودی نے ہم کو لکھا کہ ہمارا خدا وہی ہے جو مسلمانوں کا خدا ہے اور قرآن شریف میں جو صفات بیان ہیں وہی صفات ہم بھی مانتے ہیں۔ تیرہ سو برس سے اب تک ان یہودیوں کا وہی عقیدہ چلا آتا ہے مگر باوجود اس عقیدہ کے ان کو سؤر اور بندر کہا گیا۔ صرف اس واسطے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانا۔ انسان کی عقل خدا تعالیٰ کی مصلحت سے نہیں مل سکتی۔ آدمی کیا چیز ہے جو مصلحتِ الٰہی سے بڑھ کر سمجھ رکھنے کا دعویٰ کرے۔ خدا تعالیٰ کی مصلحت اس وقت بدیہی اور اجلیٰ ہے۔ اسلام میں سے پہلے ایک شخص بھی مُرتد ہو جاتا تھا تو ایک شور بپا ہو جاتا تھا۔ اب اسلام کو ایسا پاؤں کے نیچے کچلا گیا ہے کہ ایک لاکھ مُرتد موجود ہے۔ اسلام جیسے مقدّس مطہّر مذہب پر اس قدر حملے کئے گئے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں کتابیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیوں سے بھری ہوئی شائع کی جاتی ہیں بعض رسالے کئی کروڑ تک چھپتے ہیں۔ اسلام کے برخلاف جو کچھ شائع ہوتا ہے۔ اگر سب کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک بڑا پہاڑ بنتا ہے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ گویا ان میں جان ہی نہیں اور سب کے سب مَر ہی گئے ہیں۔ اس وقت اگر خدا تعالیٰ بھی خاموش رہے تو پھر کیا حال ہوگا۔ خدا کا ایک حملہ انسان کے ہزار حملہ سے بڑھ کر ہے اور وہ ایسا ہے کہ اس سے دین کا بول بالا ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰؑ کو زندہ ماننے کا نتیجہ

عیسائیوں نے انیس سو سال سے شور مچا رکھا ہے کہ عیسیٰ خدا ہے اور ان کا دین اب تک بڑھتا چلا گیا اور مسلمان ان کو اور بھی مدد دے رہے ہیں۔ عیسائیوں کے ہاتھ میں بڑا حربہ یہی ہے کہ مسیح زندہ ہے اور تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) فوت ہو گئے۔ لاہور میں لارڈ بشپ نے

ایک بھاری مجمع میں یہی بات پیش کی۔ کوئی مُسلمان اس کا جواب نہ دے سکا۔ مگر ہماری جماعت میں سے مفتی محمد صادق صاحب جو یہ موجود ہیں، اُٹھے اور انہوں نے قرآن شریف، حدیث، تاریخ، انجیل وغیرہ سے ثابت کیا کہ حضرت عیسٰیؑ فوت ہو چکے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں کیونکہ آپؐ سے فیض حاصل کر کے کرامت اور خوارق دکھانے والے ہمیشہ موجود رہے۔ تب اس کا جواب وہ کچھ نہ دے سکا۔ اب خیال کرو کہ عیسٰیؑ کو زندہ ماننے کا کیا نتیجہ ہے اور دُوسرے انبیاء کی مانند وفات یافتہ ماننے کا کیا نتیجہ ہے۔ مُوذا چار دن فوت شدہ مان کر اس کا نتیجہ بھی تو دیکھ لیں۔ مَیں نے ایک دفعہ لدھیانہ میں عیسائیوں کو اشتہار دیا تھا کہ تمہارا ہمارا بہت اختلاف نہیں۔ تھوڑی سی بات ہے یہ کہ تم مان لو کہ عیسٰیؑ فوت ہو گئے اور آسمان پر نہیں گئے۔ تمہارا اس میں کیا حرج ہے؟ اس پر وہ بہت جھنجلائے اور کہنے لگے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ عیسٰیؑ مر گیا اور آسمان پر نہیں گیا تو آج دُنیا میں ایک بھی عیسائی نہیں رہتا۔

دیکھو۔ خدا تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ اس نے ایسا پہلو اختیار کیا ہے جس سے دشمن تباہ ہو جاتے۔ مُسلمان اِس معاملہ میں کیوں اَڑتے ہیں۔ کیا عیسٰیؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل تھا؟ اگر میرے ساتھ خصومت ہے تو اس میں حد سے نہ بڑھو اور وہ کام نہ کرو جو دینِ اسلام کو نقصان پہنچاتے۔ خدا تعالیٰ ناقص پہلو اختیار نہیں کرتا اور بجُز اس پہلو کے تم کسرِ صلیب نہیں کر سکتے۔

اِس زمانہ کا جہاد

اگر تم نے جنگوں سے فتح پانی ہوتی اور تمہارے لیے لڑائیاں کرنا مقدر تھا تو خدا تعالیٰ تم کو ہتھیار دیتا۔ توپ و تفنگ کے کام میں تم کو سب سے بڑھ کر چالاکی اور ہوشیاری دی جاتی۔ مگر خدا تعالیٰ کا فعل ظاہر کر رہا ہے کہ تم کو یہ طاقتیں نہیں دی گئیں بلکہ سلطانِ رُوم کو بھی ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ جرمن یا انگلستان وغیرہ سے ممالک سے بنواتا ہے اور آلاتِ حرب عیسائیوں سے خرید کرتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ کے واسطے یہ مقدر نہ تھا کہ مُسلمان جنگ کریں اس واسطے خدا تعالیٰ نے ایک اَور راہ اختیار کی۔

ہاں صلاح الدین وغیرہ بادشاہوں کے وقت ان باتوں کی ضرورت تھی۔ تب خدا تعالیٰ نے مُسلمانوں کی مدد کی اور کفار پر اُن کو فتح دی۔ مگر اب تو مذہب کے واسطے کوئی شخص جنگ نہیں کرتا۔ اب تو لاکھ لاکھ پرچہ اسلام کے برخلاف نکلتا ہے۔ جیسا ہتھیار مخالف کا ہے ویسا ہی ہتھیار ہم کو بھی تیار کرنا چاہیے۔ یہی حکم خداوندی ہے۔ اب اگر کوئی خونی مہدی آجاتے اور لوگوں کے سر کاٹنے لگے تو یہ بے فائدہ ہو گا ..... مارنے سے کسی کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ سر کاٹنے سے دلوں

کے شبہات دُور نہیں ہو سکتے۔ خدا تعالیٰ کا مذہب جبر کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام نے پہلے بھی کبھی پیش دستی نہیں کی۔ جب بہت ظلم صحابہؓ پر ہوا تو دشمنوں کو دفع کرنے کے واسطے جہاد کیا گیا تھا۔ خدا تعالےٰ کی حکمت کے مطابق کسی کی دانائی نہیں۔ ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اس معاملہ میں دعا کرے اور دیکھے کہ اس وقت اسلام کی تائید کی ضرورت ہے یا نہیں۔ جسم پر غالب آنا کوئی شئے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دلوں کو فتح کیا جاتے۔

اسلام کی فتح وفات مسیح کے عقیدہ میں ہے

میں نے کوئی بات قال اللہ اور قال الرسول کے برخلاف نہیں کی۔ اگر قرآن اور حدیث میں جسم عنصری کا لفظ آیا ہوتا تو اس کا منکر کافر اور ملعون ہوتا مگر اصل حقیقت خدا تعالیٰ نے بذریعہ الہام کے مجھ پر ظاہر کر دی اور قرآن اور حدیث اور اجماعِ صحابہؓ اس کی تائید میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات صحابہؓ کے واسطے ایک بڑا صدمہ تھا۔ باسٹھ ۶۲ یا تریسٹھ ۶۳ سال کوئی بڑی عمر نہیں۔ صحابہؓ کو اگر یہ کہا جاتا کہ عیسیٰؑ تو زندہ ہے مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو اُن کے واسطے ایک پشت شکن صدمہ تھا۔ اسی واسطے حضرت ابوبکرؓ نے سب کو اکٹھا کر کے وعظ کیا اور ان کو سمجھایا کہ سب نبی مر گئے۔ کوئی بھی زندہ نہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی فوت ہو گئے۔ صحابہؓ ایک عشق اور محبت کی حالت رکھتے تھے وفات مسیح کے بغیر دوسرا پہلو وہ ہرگز مان نہ سکتے تھے۔ اسلام کبھی ایسا عقیدہ پیش نہیں کر سکتا جو آنحضرت افضل الرسل (صلے اللہ علیہ وسلّم) کی ہتک کرنے والا ہو۔ کوئی ہمیں بُرا یا بھلا کہے ہم تو اپنا کام کرتے چلے جائیں گے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی فتح اسی میں ہے۔ اگر ہم عیسائیوں کی ہاں میں ہاں ملا دیں تو ہم ان کو کیونکر زیر کر سکتے ہیں۔ ہمارے مخالف مرنے کے بعد یقیناً سمجھ لیں گے کہ وہ اسلام کے دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ عادت بھی ایک بُت ہوتا ہے اور یہ لوگ اس بُت کی پرستش کر رہے ہیں۔

مسیح علیہ السلام کی زندگی اور نزول کے بارہ میں ایک گفتگو

یہاں پر ایک مولوی صاحب مخالفین کی جماعت میں سے بول اُٹھے اور چونکہ پھر انہوں نے حضرت اقدس علیہ السلام کو مسلسل تقریر کرنے نہیں دی بلکہ جلدی جلدی سوال پر سوال کرتے گئے اور کسی سوال کے متعلق حضرت کا جواب پُورا نہ سُنا۔ اس واسطے تقریر مذکورہ بالا تو ختم ہو گئی۔ مولوی صاحب

کے سوال و جواب میں مندرج کرتا ہوں تاکہ دہلی کے مولویوں کا نمونہ ناظرین کو نظر آجائے؛

مولوی صاحب :- تو جن روایات سے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی ثابت ہے ان کو کیا کریں؟

حضرت اقدس علیہ السلام :- جو روایت قرآن اور حدیث صحیح کے مخالف ہو، وہ ردّی ہے قابلِ اعتبار نہیں۔ قولِ خدا کے برخلاف کوئی بات نہیں ماننی چاہیے۔

مولوی صاحب :- اور جو وہ روایت بھی صحیح ہو۔

حضرت اقدسؑ :- جب قولِ خدا اور قولِ رسول کے برخلاف ہوگی تو پھر صحیح کس طرح؟ خود بخاری میں مُتَوَفِّيْكَ کے معنے مُمِيْتُكَ لکھے ہیں۔

مولوی صاحب :- ہم بخاری کو نہیں مانتے اور روایتوں میں مسیح کی زندگی لکھی ہے۔ قرآن کی تفسیروں میں لکھا ہے کہ مسیح زندہ ہے۔

حضرت اقدس :- تمہارا اختیار جو چاہو مانو یا نہ مانو اور قرآن شریف خود اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو گئے اور کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ کے مطابق یہ بات ہے جس کے کان سُننے کے ہوں سُنے۔ قرآن و حدیث کے مخالف ہم کوئی روایت نہیں مان سکتے۔

مولوی صاحب :- اور جو وہ بھی صحیح ہو تو؟

حضرت اقدسؑ :- وہ صحیح ہو ہی نہیں سکتی۔

مولوی صاحب :- اگرچہ صحیح ہو۔

حضرت اقدسؑ :- میں کئی دفعہ سمجھا چکا ہوں۔ اب بار بار کیا کہوں۔ کتاب اللہ کے برخلاف جو روایت ہو وہ کس طرح صحیح ہو سکتی ہے؟

مولوی صاحب : یہ کس نے لکھا ہے۔ کس کتاب میں درج ہے کہ برخلاف روایت ہو تو نہ مانو۔ امام بخاری نے بھی غلطی کھائی جو مُتَوَفِّيْكَ کے معنے مُمِيْتُكَ کر دیئے۔

حضرت اقدسؑ :- اگر بخاری نے غلطی کھائی تو تم اور کوئی حدیث یا لغت پیش کرو جہاں وفات کے معنے سوائے موت کے کچھ اَور کئے گئے ہوں۔

مولوی صاحب :- اچھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے تو فرشتوں کے ساتھ نازل ہونا ہے۔ تمہارے ساتھ فرشتے کہاں ہیں؟

حضرت اقدسؑ :- تمہارے کندھوں پر جو دو فرشتے ہیں وہ تم کو نظر آتے ہیں جو یہ فرشتے تم کو نظر آجائیں گے؟

مولوی صاحب :۔ تو زینہ کہاں ہے جس کا ذکر آیا کہ اس پر سے عیسٰی اُترے گا۔

حضرت اقدسؑ :۔ نزول کے یہ معنی نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ یہ ایک محاورہ ہے جب ہم مسافر سے پُوچھتے ہیں کہ تم کہاں اُترے ہو؟

اس کے بعد وہ لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔

بوقت شام

اولیائے دہلی کی کرامت

ڈاکٹر (یعقوب بیگ صاحبؓ) کو مخاطب کر کے فرمایا :

آج کہاں کہاں کی سیر کی

انہوں نے عرض کی کہ فیروز شاہ کی لاٹ، پرانا کوٹ، مہابت خاں کی مسجد، لال قلعہ وغیرہ مقامات دیکھے۔ فرمایا :

ہم تو بختیار کاکی۔ نظام الدین صاحب اولیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ اصحاب کی قبروں پر جانا چاہتے ہیں۔ دہلی کے یہ لوگ جو سطح زمین کے اُوپر ہیں نہ ملاقات کرتے ہیں اور نہ ملاقات کے قابل ہیں۔ اس لیے جو اہلِ دل لوگ ان میں سے گذر چکے ہیں اور زمین کے اندر مدفون ہیں ان سے ہی ہم ملاقات کر لیں تاکہ بدوں ملاقات تو واپس نہ جائیں۔ میں ان بزرگوں کی یہ کرامت سمجھتا ہوں کہ انہوں نے قسی القلب لوگوں کے درمیان بسر کی۔ اس شہر میں ہمارے حصّہ میں ابھی وہ قبولیت نہیں آئی جو ان لوگوں کو نصیب ہوئی۔

چشم باز و گوش باز و ایں ذکا
خیرہ ام از چشم بندیٔ خُدا

مصلح کی ضرورت

اسلام پر یہ کیسا مصیبت کا زمانہ ہے۔ اندرونی مصائب بھی بے انتہا ہیں۔ اور بیرونی بھی بے حد ہیں۔ پھر یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس وقت کسی مصلح کی ضرورت نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں پھر ہم کو

نوٹ از ایڈیٹر صاحب بدر :۔ آج شام کو یہ عاجز کسی کام پر باہر گیا ہوا تھا۔ حضرت مغرب کے وقت نشستگاہ میں تشریف لائے اور ایک تقریر فرمائی جس کو مخدومی اخویم ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب نے قلمبند فرمایا۔

کسی مصلح کی کیا ضرورت ہے مگر نہیں سمجھتے کہ جبتک خدا کی رحمت نہ ہو وہ رقت اور درد پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کے دل کو صاف کرتا ہے۔ چاہیے کہ بہت دعائیں کریں۔ صرف بحث کرنے والا فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ وُہ نہیں دیکھتے کہ اسلام پر کس طرح کے مصائب نازل ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام کو گویا خدا تعالیٰ نے فراموش کر دیا ہے۔ دلی کے لوگ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ لڑنے کو آتے ہیں۔ حق طلبی کا انہیں خیال نہیں۔ حلق کے نیچے بات تب اُترتی ہے جب حلق صاف ہو۔ دوائی کا بھی یہی حال ہے کہ جبتک حلق صاف نہ ہو اور معدہ بھی صاف نہ ہو دوائی کا اثر نہیں ہو سکتا۔ دوائی قے ہو جاتی ہے یا ہضم نہیں ہوتی۔

احمدی نام کیوں رکھا گیا ہے

ایک مولوی صاحب آئے اور انہوں نے سوال کیا کہ خدا تعالیٰ نے ہمارا نام مُسلمان رکھا ہے۔ آپ نے اپنے فرقہ کا نام احمدی کیوں رکھا ہے؟ یہ بات هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج:۷۹) کے برخلاف ہے۔

اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا:

اسلام بہت پاک نام ہے اور قرآن شریف میں یہی نام آیا ہے لیکن جیسا کہ حدیث شریف میں آچکا ہے اسلام کے تہتّر فرقے ہو گئے ہیں اور ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ انہی میں ایک رافضیوں کا ایسا فرقہ ہے جو سوائے دو تین آدمیوں کے تمام صحابہؓ کو سبّ و شتم کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ازواجِ مطہرات کو گالیاں دیتے ہیں۔ اَولیاء اللہ کو بُرا کہتے ہیں۔ پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں۔ خارجی حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو بُرا کہتے ہیں اور پھر بھی مسلمان نام رکھاتے ہیں۔ بلادِ شام میں ایک فرقہ یزیدیہ ہے۔ جو امام حسینؓ پر تبرّہ بازی کرتے ہیں اور مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ اسی مصیبت کو دیکھ کر سلفِ صالحین نے اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے تمیز کرنے کے واسطے اپنے نام شافعی، حنبلی وغیرہ تجویز کئے۔ آجکل نیچریوں کا ایک ایسا فرقہ نکلا ہے جو جنّت، دوزخ وحی، ملائک سب باتوں کا منکر ہے۔ یہاں تک کہ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ قرآن مجید بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کے خیالات کا نتیجہ ہے اور عیسائیوں سے سُن کر یہ قصّے لکھ دیئے ہیں۔ غرض ان تمام فرقوں سے اپنے آپ کو تمیز کرنے کے لیے اس فرقہ کا نام احمدیہ رکھا گیا۔

حضرت یہ تقریر کر رہے تھے کہ اس مولوی نے پھر سوال کیا کہ قرآن شریف میں تو حکم ہے کہ

لَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران : ۱۰۴) اور آپ نے تو تفرقہ ڈال دیا۔ حضرت نے فرمایا:

ہم تو تفرقہ نہیں ڈالتے بلکہ ہم تفرقہ دُور کرنے کے واسطے آتے ہیں۔ اگر احمدی نام رکھنے میں ہتک ہے تو پھر شافعی حنبلی کہلانے میں بھی ہتک ہے، مگر یہ نام ان اکابر کے رکھے ہوئے ہیں جن کو آپ بھی مسلمان مانتے ہیں، وہ شخص بدبخت ہوگا جو ایسے لوگوں پر اعتراض کرے اور اُن کو بُرا کہے۔ صرف امتیاز کے لیے ان لوگوں نے اپنے یہ نام رکھے تھے۔ ہمارا کاروبار خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم پر اعتراض کرنے والا خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے۔ ہم مُسلمان ہیں اور احمدی ایک امتیازی نام ہے۔ اگر صرف مُسلمان نام ہو تو شناخت کا تمغہ کیونکر ظاہر ہو۔ خدا تعالیٰ ایک جماعت بنانا چاہتا ہے اور اس کا دُوسروں سے امتیاز ہونا ضروری ہے۔ بغیر امتیاز کے اس کے فوائد مترتب نہیں ہوتے اور صرف مسلمان کہلانے سے تمیز نہیں ہو سکتی۔ امام شافعی اور حنبل وغیرہ کا زمانہ بھی ایسا تھا کہ اس وقت بدعات شروع ہو گئی تھیں۔ اگر اس وقت یہ نام نہ ہوتے تو اہلِ حق اور ناحق میں تمیز نہ ہو سکتی۔ ہزارہا گندے آدمی مِلے جُلے رہتے۔ یہ چار نام اسلام کے واسطے مثل چار دیواری کے تھے۔ اگر یہ لوگ پیدا نہ ہوتے تو اسلام ایسا مشتبہ مذہب ہو جاتا کہ بدعتی اور غیر بدعتی میں تمیز نہ ہو سکتی۔ اب بھی ایسا زمانہ آگیا ہے کہ گھر گھر ایک مذہب ہے۔ ہم کو مسلمان ہونے سے انکار نہیں، مگر تفرقہ دُور کرنے کے واسطے یہ نام رکھا گیا ہے۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت والوں سے اختلاف کیا اور عام نظروں میں ایک تفرقہ ڈالنے والے بنے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ تفرقہ خود خدا ڈالتا ہے۔ جب کھوٹ اور ملاوٹ زیادہ ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ خود چاہتا ہے کہ ایک تمیز ہو جائے۔

مولوی صاحب نے پھر وہی سوال کیا کہ خدا نے تو کہا ہے کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (الحج: ۷۹)

فرمایا:

کیا اس میں رافضی اور بدعتی اور آجکل کے مسلمان شامل ہیں؟ کیا اس میں آجکل کے وہ لوگ شامل ہیں جو اباحتی ہو رہے ہیں؟ اور شراب اور زنا کو بھی اسلام میں جائز جانتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس کے مخاطب تو صحابہؓ ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرونِ ثلاثہ کے بعد فیج اعوج کا زمانہ ہوگا جس میں جھوٹ اور کذب کا افشا ہوگا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس زمانہ کے لوگوں کے متعلق فرمایا ہے لَيْسُوْا مِنِّيْ وَلَسْتُ مِنْهُمْ نہ اُن کا مجھ سے کوئی تعلق ہے نہ میرا اُن سے کوئی تعلق ہے۔ وہ لوگ مسلمان کہلائیں گے مگر میرے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

جو لوگ اسلام کے نام سے انکار کریں یا اس نام کو عار سمجھیں۔ ان کو تو مَیں لعنتی کہتا ہوں۔ مَیں کوئی بدعت نہیں لایا۔ جیسا کہ حنبلی شافعی وغیرہ نام تھے۔ ایسا ہی احمدی بھی نام ہے بلکہ احمد کے نام میں اسلام کے بانی احمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ اِتّصال ہے۔ اور یہ اِتّصال دوسرے ناموں میں نہیں۔ احمد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ اسلام احمدی ہے اور احمدی اسلام ہے۔ حدیث شریف میں محمدی رکھا گیا ہے۔ بعض اوقات الفاظ بہت ہوتے ہیں مگر مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ احمدی نام ایک امتیازی نشان ہے۔ آجکل اس قدر طوفان زمانہ میں ہے کہ اوّل آخر کبھی نہیں ہوا۔ اس واسطے کوئی نام ضروری تھا۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک جو مُسلمان ہیں۔ وہ احمدی ہیں۔[1]

۲۶؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء

بمقام دہلی

صبح کے وقت حضور نے گاڑیاں منگوائیں اور خواجہ میر درد صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے مزار مبارک پر تشریف لے گئے۔ راستہ میں قبرستان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

یہ انسان کی دائمی سکونت ہے جہاں ہر قسم کے امراض سے نجات پاکر انسان آرام کرتا ہے۔

خواجہ میر درد صاحب کی قبر پر آپ نے فاتحہ پڑھی اور کتبہ کی طرف دیکھکر فرمایا کہ کتبہ لکھنا شریعت میں منع نہیں ہے۔ اس میں بہت سے فوائد ہیں۔[2]

یہاں سے ہوکر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی قبر پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔

فرمایا کہ:

شاہ ولی اللہ صاحب ایک بزرگ اہلِ کشف اور کرامت تھے۔ یہ سب مشائخ زیرِ زمین ہیں اور جو لوگ زمین کے اُوپر ہیں وہ ایسے بدعات میں مشغول ہیں کہ حق کو باطل بنا رہے ہیں اور باطل کو حق بنا رہے ہیں۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۳۲ صفحہ ۲ تا ۴ مورخہ ۳؍ نومبر ۱۹۰۵ء

[2] 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۴ 〃 〃 〃 〃

راستہ میں اہلِ لدھیانہ کی درخواست کا ذکر آیا کہ حضور واپس جاتے ہوئے راستہ میں لدھیانہ ٹھہریں۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب نے عرض کی کہ لدھیانہ کی جماعت اسٹیشن لُدھیانہ پر ملاقات کے واسطے آئی تھی، لیکن حضور سوتے ہوئے تھے۔ مَیں نے جگانے نہ دیا۔ فرمایا :۔

آپ نے اچھا کیا اس کے عوض ہم اب لُدھیانہ میں اُتر کر اہلِ لدھیانہ سے ملاقات کریں گے۔

راستہ میں مذبح کے پاس سے گذرے۔ کثیر التعداد بھیڑیں اور بکریاں ذبح ہو رہی تھیں اور سینکڑوں کا باہر ریوڑ کھڑا تھا۔ ان کو دیکھ کر فرمایا کہ :

کھانے کی حلال اشیاء کا کس قدر ذخیرہ اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیا ہے برخلاف اس کے حرام چیزیں مثلاً کتے وغیرہ بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔

فرمایا :

اس شہر میں اس قدر انقلاب آتے ہیں کہ شاید کسی دُوسرے شہر پر یہ حالات وارد ہوتے ہوں۔ کئی دفعہ یہ شہر آباد ہوا اور کئی دفعہ خاک میں مِل گیا۔

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مخاطب تھے اور ان کی رخصت کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر تھا۔

فرمایا :

دو دن اَور ہیں۔ یہ موقعہ غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ خُدا تعالیٰ کے فضل سے ایسا موقعہ ہاتھ آسکتا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ رُخصت لینے سے ایسا موقعہ مل جاتا ہے۔ کئی آدمی ایسے بھی ہیں جو نوکر نہیں مگر ان کو ہمارے پاس رہنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ فارغ البالی ہوتی ہے پر صحبت نصیب نہیں ہوتی[1]

جماعتِ احمدیہ کے قیام کا مقصد فرمایا : اللہ تعالیٰ کا یہ منشا نہیں کہ مسیح کی وفات کو

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۳۳ صفحہ ۱-۲ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۵ء

ثابت کرنے والی ایک جماعت پیدا ہو جاوے۔ یہ بات تو ان مولویوں کی مخالفت کی وجہ سے درمیان آگئی ہے۔ ورنہ اس کی تو کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کا تو یہ ہے کہ ایک پاک دل جماعت مثل صحابہؓ کے بن جاوے۔ وفاتِ مسیح کا معاملہ تو جملہ معترضہ کی مانند درمیان آگیا ہے۔ مولوی لوگوں نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ درمیان میں اڑا لی۔ ان لوگوں کو مناسب نہ تھا کہ اس معاملہ میں دلیری کرتے۔ قولِ خدا، سنتِ نبی اور اجماعِ صحابہؓ، یہ تین باتیں اس کے واسطے کافی تھیں۔ ہمیں تو افسوس آتا ہے کہ اس کا ذکر ہمیں خواہ مخواہ کرنا پڑتا ہے لیکن ہمارا اصلی امر ابھی دیگر ہے۔ یہ تو صرف خس و خاشاک کو درمیان میں سے اُٹھایا گیا ہے۔ سوچو کہ جو شخص دنیا داری میں غرق ہے اور دین کی پروا نہیں رکھتا۔ اگر تم لوگ بیعت کرنے کے بعد ویسے ہی رہو تو پھر تو تم میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ بعض لوگ ایسے کچے اور کمزور ہوتے ہیں کہ ان کی بیعت کی غرض بھی دنیا ہی ہوتی ہے۔ اگر بیعت کے بعد ان کی دنیا داری کے معاملات میں ذرا سا فرق آجاوے تو پھر پیچھے قدم رکھتے ہیں۔

یاد رکھو کہ یہ جماعت اس بات کے واسطے نہیں کہ دولت اور دنیا داری ترقی کرے اور زندگی آرام سے گذرے۔ ایسے شخص سے تو خدا تعالیٰ بیزار ہے۔ چاہیئے کہ صحابہؓ کی زندگی کو دیکھو، وہ زندگی سے پیار نہ کرتے تھے۔ ہر وقت مرنے کے لیے تیار تھے۔ بیعت کے معنے ہیں اپنی جان کو بیچ دینا۔ جب انسان زندگی کو وقف کر چکا تو پھر دُنیا کے ذکر کو درمیان میں کیوں لاتا ہے؟ ایسا آدمی تو صرف رسمی بیعت کرتا ہے۔ وہ تو کل بھی گیا اور آج بھی گیا۔ یہاں تو صرف ایسا شخص رہ سکتا ہے جو ایمان کو درست کرنا چاہے۔ انسان کو چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی زندگی کا ہر روز مطالعہ کرتا رہے۔ وہ تو ایسے تھے کہ بعض مر چکے تھے اور بعض مرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اس کے سوائے بات نہیں بن سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ کنارہ پر کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں تاکہ ابتلاء دیکھ کر بھاگ جائیں وہ فائدہ نہیں حاصل کر سکتے۔ دنیا کے لوگوں کی عادت ہے کہ کوئی ذرا سی تکلیف ہو تو لمبی چوڑی دُعائیں مانگنے لگتے ہیں اور آرام کے وقت خدا تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ کیا لوگ چاہتے ہیں کہ امتحان میں سے گذرنے کے سوائے ہی خدا خوش ہو جاوے۔ خدا تعالیٰ رحیم و کریم ہے مگر سچا مومن وہ ہے جو دُنیا کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دے۔ خدا تعالےٰ ایسے لوگوں کو ضائع نہیں کرتا۔ ابتدا میں مومن کے واسطے دُنیا جہنم کا نمونہ ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب پیش آتے ہیں۔ اور ڈراؤنی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں تب وہ صبر کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ اُن کی حفاظت کرتا ہے لیکن ؎

عشق اوّل سرکش و خونی بود ۔ تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

جو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کے لیے دو جنت ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی رضا کے ساتھ جو متفق ہو جاتا ہے خدا تعالیٰ اس کو محفوظ رکھتا ہے اور اس کو حیاۃ طیبہ حاصل ہوتی ہے اس کی سب مُرادیں پوری کی جاتی ہیں۔ مگر یہ بات ایمان کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

ایک شخص کے اپنے دل میں ہزار گند ہوتا ہے۔ پھر خدا پر شک لاتا ہے اور چاہتا ہے کہ مومنوں کا حِصّہ مجھے بھی ملے۔ جبتک انسان پہلی زندگی کو ذبح نہ کر دے، اور محسوس نہ کرے کہ نفسِ امّارہ کی خواہش مر گئی ہے اور خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں بیٹھ نہ جائے تب تک مومن نہیں ہوتا۔ اگر مومن کو خاص امتیاز نہ بخشا جائے تو مومنوں کے واسطے جو وعدے ہیں وہ کیونکر پورے ہوں گے۔ لیکن جب تک دورنگی اور منافقت ہو تب تک انسان کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ۔ (النسآء ۴: ۱۴۶) اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایک ایسی جماعت بنائے گا جو ہر جہت میں سب پر فوقیت رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کا فضل کرے گا۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ ہاں کمزوری میں اللہ تعالیٰ معاف کرتا ہے۔ جو شخص کمزور ہے اور ہاتھ اُٹھاتا ہے کہ کوئی اس کو پکڑے اور اُٹھائے، اس کو اُٹھایا جاتے گا۔ مگر مومن کو چاہیئے کہ اپنی حالت پر فارغ نہ بیٹھے۔ اس سے خدا راضی نہیں ہے۔ ہر طرح سے کوشش کرنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے راضی کرنے کے جو سامان ہیں وہ سب مہیا کئے جائیں۔

ریاکاری

ریاکار انسان بے فائدہ کام کرتا ہے۔ مومن کو تو خداوند تعالیٰ خود بخود شہرت دیتا ہے۔ ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ مسجدوں میں لمبی نمازیں پڑھا کرتا تھا تاکہ لوگ اُسے نیک کہیں لیکن جب وہ بازار سے گذرتا تو لڑکے بھی اس کی طرف اشارہ کرتے اور کہتے کہ یہ ایک ریاکار آدمی ہے جو دکھلاوے کی نمازیں پڑھتا ہے۔ ایک دن اس شخص کو خیال ہوا کہ میں لوگوں کا کیوں خیال رکھتا ہوں اور بے فائدہ محنت اٹھاتا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤں اور خالص خدا کی خاطر عبادت کروں۔ یہ بات سوچ کر اس نے سچی توبہ کی اور اپنے اعمال کو خدا کے واسطے خالص کر دیا اور دنیوی رنگ کی نمازیں چھوڑ دیں، اور علیحدگی میں بیٹھ کر دعائیں کرنے لگا اور اپنی عبادت کو پوشیدہ رکھنا چاہا۔ تب وہ جس کوچہ سے گذرتا لوگ اُس کی طرف اشارہ کرتے کہ یہ ایک نیک بخت آدمی ہے۔

سچّا مومن

سچا مومن وہ ہے جو کسی کی پروا نہ کرے۔ خدا تعالیٰ خود ہی سارے بندوبست کر دے گا۔ لوگوں کی تکلیف دہی کی پروا نہیں رکھنی چاہیئے۔

دُنیا میں کوئی کسی کے ساتھ دوستی پکی کرتا ہے تو دنیا کے لوگ اپنی دوستی کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ کون دوست ہے جس کے ساتھ سلوک کیا جاوے تو وہ بے تعلقی ظاہر کرے۔ ایک چور کے ساتھ ہمارا سچا تعلق ہو تو وہ بھی ہمارے گھر میں نقب زنی نہیں کرتا، تو کیا خدا تعالیٰ کی وفا چور کے برابر بھی نہیں۔ خدا تعالیٰ کی دوستی تو وہ ہے کہ دُنیا داروں میں اس کی کوئی نظیر ہی نہیں۔ دُنیا داروں کی دوستی میں تو غدر بھی ہے۔ تھوڑی سی رنجش کے ساتھ دُنیا دار دوستی توڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کے تعلقات پکے ہیں۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ دوستی کرتا ہے خدا تعالیٰ اس پر برکات نازل کرتا ہے۔ اس کے گھر میں برکت دیتا ہے۔ اس کے کپڑوں میں برکت دیتا ہے، اس کے پس خوردہ میں برکت دیتا ہے۔

بخاری میں ہے کہ نوافل کے ذریعہ سے انسان خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ نوافل ہر شئے میں ہوتے ہیں۔ فرض سے بڑھ کر جو کچھ کیا جائے وہ سب نوافل میں داخل ہے۔ جب انسان نوافل میں ترقی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرے ولی سے مقابلہ کرتا ہے وہ میرے ساتھ لڑائی کے لیے تیار ہو جاتے۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ سچی محبت کرنے والے بھی غنی، بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی تکذیب کی کچھ پروا نہیں رکھتے۔ جو لوگ خلقت کی پروا کرتے ہیں وہ خلق کو معبود بناتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے بندوں میں ہمدردی بہت ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ایک بے نیازی کی صفت بھی لگی ہوئی ہے۔ وہ دُنیا کی پروا نہیں کرتے۔ آگے خدا تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے کہ دنیا کھچی ہوئی ان کی طرف چلی آتی ہے۔

جماعت کو نصیحت

ہماری جماعت کو ایسا ہونا چاہیئے کہ نری لفاظی پر نہ رہے بلکہ بیعت کے سچے منشا کو پورا کرنے والی ہو۔ اندرونی تبدیلی کرنی چاہیئے۔ صرف مسائل سے تم خدا تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکتے۔ اگر اندرونی تبدیلی نہیں تو تم میں اور تمہارے غیر میں کچھ فرق نہیں۔ اگر تم میں مکر، فریب، کسل اور سُستی پائی جائے تو تم دوسروں سے پہلے ہلاک کئے جاؤ گے۔ ہر ایک کو چاہیئے کہ اپنے بوجھ کو اُٹھائے اور اپنے وعدے کو پورا کرے۔ عمر کا اعتبار نہیں دیکھو مولوی عبدالکریم صاحب فوت ہو گئے۔ ہر جمعہ میں ہم کوئی نہ کوئی جنازہ پڑھتے ہیں۔ جو کچھ کرنا ہے اب کر لو۔ جب موت کا وقت آتا ہے تو پھر تاخیر نہیں ہوتی۔ جو شخص قبل از وقت نیکی کرتا ہے امید ہے کہ وہ پاک ہو جائے۔ اپنے نفس کی تبدیلی کے واسطے سعی کرو۔ نماز میں دعائیں مانگو۔

صدقات خیرات سے اور دُوسرے ہر طرح کے حیلہ سے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا (العنکبوت: ۷۰) میں شامل ہو جاؤ۔ جس طرح بیمار طبیب کے پاس جاتا۔ دوائی کھاتا، مسہل لیتا، خون نکلواتا، ٹکور کرواتا اور شفا حاصل کرنے کے واسطے ہر طرح کی تدبیر کرتا ہے۔ اسی طرح اپنی روحانی بیماریوں کو دُور کرنے کے واسطے ہر طرح کی کوشش کرو۔ صرف زبان سے نہیں بلکہ مجاہدہ کے جس قدر طریق خدا تعالیٰ نے فرمائے ہیں وہ سب بجالاؤ۔ صدقہ خیرات کرو۔ جنگلوں میں جا کر دُعائیں کرو۔ سفر کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرو۔ بعض آدمی پیسے لے کر بچّوں کو دیتے پھرتے ہیں کہ شاید اسی طرح کشوف باطنی ہو جائے۔ جب باطن پر قفل ہو جائے تو پھر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ حیلے کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ جب انسان تمام حیلوں کو بجالاتا ہے تو کوئی نہ کوئی نشانہ بھی ہو جاتا ہے۔[۱]

۲۷ر اکتوبر ۱۹۰۵ء

بمقام دہلی (بعد نماز جمعہ)

ہر قوم کی طِبّ سے استفادہ کرنا چاہیئے

چند مولوی اور مدرسہ طبّیہ کے چند طالب علم اور طبیب آئے۔ طِبّ کا ذکر درمیان میں آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ:

مُسلمانوں کو انگریزی طِبّ سے نفرت نہیں چاہیئے۔ اَلْحِکْمَۃُ ضَآلَّۃُ الْمُؤْمِنِ۔ حِکمت کی بات تو مومن کی اپنی ہے۔ گُم ہو کر کسی اَور کے پاس چلی گئی تھی۔ پھر جہاں سے ملے جھٹ قبضہ کر لے اس میں ہمارا یہ منشا نہیں کہ ہم ڈاکٹری کی تائید کرتے ہیں بلکہ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ بموجب حدیث کے انسان کو چاہیئے کہ مفید بات جہاں سے ملے وہیں سے لے لے۔ ہندی، جاپانی، یُونانی، انگریزی ہر طِبّ سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے اور اس شعر کا مصداق اپنے آپ کو بنانا چاہیئے ؎

---

[۱] بدر جلد ۱ نمبر ۴۴ صفحہ ۳، ۴ مورخہ ۸ نومبر ۱۹۰۵ء

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

تب ہی انسان کامل طبیب بنتا ہے۔ طبیبوں نے تو عورتوں سے بھی نسخے حاصل کئے ہیں.... لَیْسَ الْحَکِیْمُ اِلَّا ذُوْ تَجْرِبَۃٍ لَیْسَ الْحَلِیْمُ اِلَّا ذُوْ عَثْرَۃٍ۔ حکیم تجربہ سے بنتا ہے اور حلیم تکالیف اُٹھا کر حلم دکھانے سے بنتا ہے اور یوں تو تجربوں کے بعد انسان رہ جاتا ہے کیونکہ تضاد قدر سب کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات تھے

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ۔ (الانعام: ۹۱) ان کی ہدایت کی پیروی کر یعنی تمام گذشتہ انبیاء کے کمالاتِ متفرقہ کو اپنے اندر جمع کرلے۔ یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فضیلت کا اظہار کرتی ہے۔ تمام گذشتہ نبیوں اور ولیوں میں جس قدر خوبیاں اور صفات اور کمال تھے وہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے۔ سب کی ہدایتوں کا اقتداء کرکے آپ جامع تمام کمالات کے ہوگئے۔ مگر جامع بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان متکبر نہ ہو۔ جو سمجھتا ہے کہ میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ خاکساری سے زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جہاں انسان کوئی فائدہ کی بات دیکھے، چاہیئے کہ اسی جگہ سے فائدہ حاصل کرلے۔ ڈاکٹروں کو بھی مناسب نہیں کہ پرانی طب کو حقارت سے دیکھیں بعض باتیں ان میں بہت مفید ہیں۔ میں نے بعض متن کتب طب کے بیس بیس جزو کے حفظ کئے تھے۔ ہزار سے زیادہ کتاب طب کی ہمارے کتب خانے میں موجود تھی۔ جن میں سے بعض کتابیں بڑی بڑی قیمتیں دے کر خرید کی گئی تھیں۔ مگر یہ علم ظنی ہوتا ہے۔ لاف مارنے اور دعوے کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

تقویٰ کی اہمیت

فرمایا:

افسوس ہے کہ لوگ اپنے کاروبار میں اس قدر مصروف ہیں کہ دُوسرے پہلو کی طرف ان کو بالکل کوئی توجہ نہیں۔ ہر ایک شخص ایک پہلو پر حد سے زیادہ جُھک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں جس قدر بار بار تقویٰ کا ذکر کیا ہے۔ اتنا ذکر اور کسی امر کا نہیں کیا۔ تقویٰ کے ذریعہ سے انسان

تمام مہلکات سے بچتا ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کے معاملہ میں تقویٰ سے کام نہ لیا اور کہا کہ جب تک الیاس آسمان سے نہ آئے ہم تم کو نہیں مان سکتے۔ انہیں چاہیے تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور خوارق کا مطالعہ کرتے اور بہت سی باتوں کے مقابلہ میں صرف ایک بات پر نہ اڑتے۔ ایسا ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودیوں نے کہا کہ آخری زمانہ کا نبی تو اسرائیلیوں میں سے آنا چاہیے تھا ہم تم کو نہیں مان سکتے۔ تائیداتِ الٰہی، نصرتِ حق اور معجزات کی انہوں نے کچھ پروا نہ کی۔

ہر نبی کے وقت ابتلاؤں کا ہونا ضروری ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک نبی کے وقت ابتلاؤں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو توریت میں ایسے لفظ صاف لکھ دیتا کہ آخری زمانہ کے نبی کے باپ کا نام عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ اور مسکن مکہ ہوگا۔ مگر خدا تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا ہی اس وقت کے مسیح کے زمانہ میں بھی ہوا۔ اگر لوگ نبی کریم کے ساتھ فرشتوں کو نازل ہوتے دیکھ لیتے تو کوئی بھی انکار نہ کرتا۔ مگر خدا تعالیٰ کی سنّت یہی ہے کہ ابتلا آئیں اور متقی لوگ اس ابتلا کے وقت بچ رہتے ہیں۔

آسمان سے نازل ہونے کی حقیقت

آسمان سے نازل ہونے کی سُنّت پہلے کبھی قائم نہیں ہوئی۔ آدم سے لے کر آج تک کوئی نظیر پیش کرو کہ کوئی نبی آسمان پر گیا ہو یا آسمان سے نازل ہوا ہو۔ خدا تعالیٰ کی عادت نہیں کہ کسی ایک شخص کے واسطے کوئی امر مخصوص کر دے۔ ایک امر مخصوص کے ساتھ تو کوئی نبی بھی نہیں آیا۔ اس طرح سے تو وہ شخص معبود بن جاتا ہے اور یسوع کو خصوصیت دینا تو خود نصاریٰ کو مدد دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر وفات ظاہر کر دی ہے۔ معراج کی حدیث کو پڑھو۔ جو لوگ معراج کے منکر ہیں وہ تو اسلام کے منکر ہیں۔ لاکھ احادیث کے برابر ایک حدیثِ معراج کی ہے۔ شبِ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ کو مُردوں میں دیکھا۔ اگر قبضِ رُوح نہیں ہوا اور زندہ مع الجسم آسمان پر گئے تو دُوسرے عالم میں کس طرح پہنچ گئے۔ متقی کے واسطے تو ایک ہی بات کافی ہوتی ہے۔ خیالی اور ظنی باتوں کے پیچھے پڑ کر اصلی اور صحیح بات کو چھوڑ دینا تقویٰ کے برخلاف

ہے مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے بار بار تفہیم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ نشانات، تائید، نصرتِ الٰہی، نصوصِ قرآن و حدیث ہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں۔ خیال کرو کہ اَحَقُّ بِالْاَمْن کونسی بات ہے۔ میں تو ایسا آیا ہوں جیسا کہ الیاس آیا۔ یہود سے پوچھو کہ وہ مسیح کے ماننے سے کیوں محروم رہے؟ ان کا عذر بھی یہی تھا کہ جیسا توریت میں لکھا ہے الیاس آسمان سے نہیں آیا۔ مگر ہمارے مسلمان تو یہ عذر بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ بہت واقعات پہلے کے اپنے آگے رکھتے ہیں کہ نزول کس طرح سے ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ جتنا چاہیں مجھ سے جھگڑا کر لیں۔ مرنے کے بعد ان کو معلوم ہو جاتے گا کہ حق کس طرف ہے۔ یہ لوگ عیسائیوں کی اس قدر مدد کرتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو خود ان مولویوں ہی نے عیسائی بنا دیا ہے جو پہلو خدا تعالیٰ نے پکڑا ہے وہی سب سے افضل ہے اور اسلام کی فتح اسی کے ذریعہ ہوگی۔ نزول اور نزیل کا لفظ مہمان کے واسطے بطور اعزاز و اکرام کے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر زبان میں یہ محاورہ ہے؛ چنانچہ اردو میں بھی کہتے ہیں کہ آپ کہاں اُترے ہیں؟

اتنے میں ایک مولوی صاحب درمیان میں بول پڑے اور کہنے لگے کہ مسیح تو دمشق میں نازل ہوگا۔ آپ کہاں نازل ہوتے؟

حضرت اقدس۔ حدیث سے یہ ثابت ہے کہ وہ دمشق کے مشرق کی طرف نازل ہوگا قادیان دمشق سے عین مشرق میں ہے۔

تَوَفّی کے معنے

تَوَفِّی کے معنے کے متعلق شہرِ بغداد میں ایک بڑا مباحثہ ہوا تھا کہ اس لفظ کے کیا معنے ہیں۔ اس مباحثہ میں بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ جہاں اللہ تعالےٰ فاعل ہو اور مفعول بہٖ عَلَم ہو وہاں سوائے مارنے کے اَور کوئی معنے نہیں آتے۔ اگر آج تم قرآن، حدیث یا لغت سے کوئی اَور معنے دکھا دو تو میں آج بھی مان لینے کے واسطے تیار ہوں۔ لغت بھی زبانِ عربی کی کلید ہے، کوئی مثال لغت سے ہی دکھا دو۔ تب بھی مان لُوں گا۔ تعجب ہے کہ دوسروں کی رؤیت کا تم اعتبار کرتے ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت پر تم کو کوئی اعتبار نہیں۔ یہ جسمِ عنصری کا لفظ تم نے کہاں سے نکال لیا؟ اگر کہیں یہ لفظ دکھا سکتے ہو تو لے آؤ۔ میں تو اس وقت بھی قبول کر لے کے واسطے تیار ہوں۔ قرآنِ شریف میں، حدیث میں، لغتِ عرب، کہیں کسی نبی، صحابی وغیرہ کے متعلق لفظ توفّی کا معنے آسمان پر جسمِ عنصری کے ساتھ جانے کا دکھا دو تو میں فوراً مان لوں گا۔ لیکن تم حضرت عیسٰی کے متعلق ایک لفظ کے وہ معنے کیوں کرتے ہو جو کسی نبی، کسی ولی، کسی صحابی،

کسی انسان کے متعلق نہیں کیے گئے۔ پچیس ۲۵ سال سے خدا تعالیٰ مجھے یہی بتلا رہا ہے پھر تائیدات سماوی اور نشانات میرے ساتھ ہیں۔ میں خدا تعالیٰ کی باتوں پر اب بھی ویسا ہی ایمان رکھتا ہوں جیسا کہ پہلی کتابوں پر رکھتا ہوں۔

اس جگہ بیچ میں پھر وہی مولوی صاحب بول پڑے کہ میں تَوَفِّی کے معنے آسمان پر جانے کے دکھا سکتا ہوں۔ فوراً ایک قرآن شریف مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیا گیا۔ لگے ورق گردانی کرنے اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے۔ کبھی اس کو کہتے کیوں میاں تم نکالو اور کبھی اس کو اشارہ کرتے ہیں کیوں بھائی کچھ بتاؤ نہ۔ بہت سے تھے، کبھی اس نے اُس ہاتھ سے قرآن چھینا کبھی اُس نے اِس کے ہاتھ سے قرآن چھینا۔ نکلنا تو کیا تھا۔ گھبرا کر بولے اچھا رَافِعُکَ (آل عمران : ۵۶) جو لکھا ہے۔

رفع کے معنے

حضرت اقدس نے فرمایا کہ :

رَافِعُکَ کے معنے اس جگہ وہی ہیں جو رَفَعْنَاہُ مَکَاناً عَلِیًّا (مریم : ۵۸) کے معنے ہیں مسلمان ہر روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہی دعا مانگتے ہیں کہ ان کا رفع ہو تو کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ جسمِ عنصری کے ساتھ آسمان پر چلے جائیں؟ بات وہی صحیح ہے جو خدا تعالےٰ نے بتلادی۔ اور الہامات سے اس کی تائید کی۔

سچے الہام کا معیار

مولوی صاحب : الہام کیا ہے؟ الہام تو مجھے بھی ہوتا ہے۔

(بعد میں معلوم ہوا کہ اس مولوی کا نام نظام الدین ہے اور کسی مسجد میں لڑکے پڑھاتا ہے)

حضرت اقدس : میں ایسے الہام نہیں مان سکتا جس کے ساتھ تائیدات سماوی کا نشان نہ ہو ایسے الہام کے مدعی تو ہر نبی کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی نشان ہے تو دکھلاؤ

اتنے میں حضرت مولوی محمد احسن صاحب نے لغت کی ایک کتاب مختار الصحاح نکالی اور اس مولوی کو دکھلایا کہ توفّی کے معنے مارنے کے لکھے ہیں۔

مولوی صاحب :- مَیں لغت نہیں مانتا۔ اچھا مان لیا۔ اگر عیسٰی مرگیا ہے تو اس کی لاش دکھلاؤ۔

حضرت اقدس :- جب مرجانا ثابت ہے تو کافی ہے۔ لاشیں حضرت ابراہیم اور موسٰی کی کہاں ہیں؟

مولوی صاحب :- دجّال کانا کہاں ہے؟

حضرت اقدس :- اگر اس طرح تم لفظی معنے لوگے تو بہت مشکل پڑے گی۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ جو اس دُنیا میں اندھا ہے وُہ اُس جہان میں بھی اندھا ہوگا، تو اس کے یہ معنے ہیں کہ جتنے نابینے ہیں وہ بہرحال سب کے سب جہنّم میں جائیں گے اگرچہ حافظِ قرآن اور مُسلمان ہی ہوں۔

اُمتی کی حقیقت

فرمایا :

آنے والے کے متعلق تو یہ لکھا ہے کہ وُہ اُمتی ہوگا۔ اُمتی تو وہ ہے جو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سچّی پیروی کے ذریعہ سے نُور حاصل کرتا ہے لیکن وہ جو پہلے ہی نُور اور بصیرت پاکر نبوّت کے درجہ تک پہنچ چکا ہے وہ اب اُمتی کس طرح بنے گا؟ کیا پہلے تمام کمالات حاصل کردہ سے وہ بے نصیب کر دیا جاوے گا؟ ہاں۔ ہم اُمتی ہیں جن کو سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعہ سے مِلا ہے اور تمام معرفت وہیں سے حاصل ہوئی ہے۔

اتنے میں وہ مولوی صاحب تو گھبرا کر اُٹھ گئے اور ان کے ساتھی گالیاں دیتے گئے اور ایک اور طالب علم آگے بڑھا۔

نبی کی تعریف

طالبعلم :- آپ کا مرتبہ کیا ہے، اس کی تعبیر نبوّت سے ہوگی یا کسی اَور لفظ سے؟

حضرت اقدسؑ :- جس کے ساتھ خدا تعالیٰ مکالمہ اور مخاطبہ کرتا ہے، وہ نبی ہے۔ نبی کے معنے ہیں خدا تعالیٰ سے خبر پاکر بتلانے والا۔ ہاں نبوتِ شریعت ختم ہوچکی ہے۔

سچی معرفت بغیر مخاطباتِ الٰہیہ کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ بات اس اُمّت کو حاصل نہیں تو خیرِ اُمّت کس طرح سے بن گئی؟ اللہ تعالےٰ نے مخاطبات کا دروازہ بند نہیں کیا، ورنہ نجات کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہتا۔

اُمّتِ محمدیہ میں وحی جاری رہے گی

طالبعلم:۔ تو آپ کو وحی ہوتی ہے؟ وحی تو صرف انبیاء کو ہوتی ہے۔

حضرت اقدس:۔ خدا تعالیٰ تو قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ موسیٰؑ کی ماں کو بھی وحی ہوئی۔ کیا یہ اُمّت عورتوں سے بھی بدتر ہو گئی؟ اس سے تو عارف کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ کیا ہمارے واسطے تمام دروازے بند ہو گئے؟ دُنیا دار کو آگے قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس اُمّت کو خدا تعالیٰ ادھورا رکھنا نہیں چاہتا۔ مَیں نہیں قبول کر سکتا کہ پہلی اُمّتوں نے اس قدر برکات حاصل کیں اور یہ امت بالکل محروم رکھی گئی۔

مسیح موعود کا مرتبہ

طالبعلم:۔ پھر یہ مرتبہ تو ولی کا ہوا۔

حضرت اقدس:۔ ہم کب کہتے ہیں کہ ہمارا مرتبہ وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا؟ مگر تم نہیں جانتے۔ ولی کا مرتبہ کم نہیں بلکہ بعض کے نزدیک تو ولایت بڑھ کر ہے کیونکہ ولایت، محبت، قرب اور معرفت کا ذریعہ ہے اور نبوت ایک عہدہ ہے۔ یہود کا تو یہ مذہب ہے کہ حضرت ابراہیم ولی تھے اور تمام انبیاء سے بڑھ کر تھے۔ ہم تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر ایک قدم بھی رکھنا کفر سمجھتے ہیں۔ ہم کو الہام ہوا ہے۔ کُلُّ بَرَکَۃٍ مِّنْ مُّحَمَّدٍ ہم اس دائرہ سے باہر نہیں جاتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے باہر جانا تو کفر ہے۔ لوگ محجوب ہونے کے سبب وحی کے لفظ سے گھبراتے ہیں، ورنہ وہاں تو لکھا ہے کہ مکھی کو بھی وحی ہوئی۔ بلکہ شیخ عبد القادرؒ نے لکھا ہے کہ جس کو کبھی بھی وحی نہیں ہوئی۔ خوف ہے کہ اس کا خاتمہ بُرا ہو۔ معرفتِ تامّہ بجز مکالمہ مخاطبہ کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

وحی کی ماہیّت

طالبعلم:۔ وحی کس طرح سے ہوتی ہے؟

حضرت اقدس:۔ کئی طریق ہیں۔ بعض دفعہ دل میں ایک گونج پیدا ہوتی ہے کوئی آواز نہیں ہوتی۔ پھر اس کے ساتھ ایک شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور بعض دفعہ تیزی اور شوکت کے ساتھ ایک لذیذ کلام زبان پر جاری ہوتا ہے جو کسی فکر، تدبر اور وہم و خیال کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ

خدا تعالیٰ کے نشانات ہزاروں ہیں۔ اگر کوئی چاہے تو اب بھی کم از کم چالیس روز ہمارے پاس رہے اور نشان دیکھ لے۔ صادق اور کاذب میں خدا تعالیٰ فرق کر دیتا ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے خداوند تعالیٰ نے مجھے وعدہ دیا تھا کہ تیرے پاس ہر جگہ سے لوگ آئیں گے اور تحفہ تحائف بھی لائیں گے۔ یہ ایسے وقت کا الہام ہے کہ ایک آدمی بھی میرے ساتھ نہ تھا۔ اب تم اس کی نظیر پیش کرو کہ کیا کوئی آدمی اتنا لمبا افترا کر کے ایسی بڑی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اور ایک بات نہیں۔ اگر ہمارے پاس آئیں اور کچھ مدت قیام رکھیں تو آپ کو معلوم ہو۔

اصل میں تمام مشکلات عدمِ معرفت کے باعث ہوتی ہیں ورنہ حضرت ابوبکرؓ نے کونسا معجزہ مانگا تھا۔

علمأ امت سے مراد

طالبعلم :- اُمت کے علماء بھی انبیاء کی مانند ہیں جو آپ کی مخالفت کرتے ہیں۔

حضرت اقدسؑ :- مَیں ان لوگوں کو علماء میں شامل نہیں سمجھتا جن کی زبان پر کچھ اَور ہے اور اعمال کچھ اَور ہی ہیں منبر پر چڑھ کر کچھ کہتے ہیں اور گھر میں جا کر کچھ اَور بیان کرتے ہیں۔ علماء اُمت وہ ہیں جو مذہب کی تاکید کرتے ہیں۔

مسیح موعود علیہ السلام مستقل نبی نہیں

طالبعلم :- کیا آپ مستقل نبی ہیں؟

حضرت اقدس :- میرے متعلق ایسا کہنا ایک تہمت ہوگی۔ مَیں اس کو کفر سمجھتا ہوں کہ کوئی مستقل نبی ہونے کا دعویٰ کرے۔

مسیح موعود علیہ السلام کے معجزات

طالبعلم :- معجزہ تو نبی کا ہوتا ہے۔ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مَیں معجزہ دکھاتا ہوں؟

حضرت اقدس :- ہمارے معجزات سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں۔ ہمارا اپنا کچھ نہیں۔ سب کاروبار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی چلا آتا ہے۔ دین انحطاط پر تھا۔ ہم نے سعی کی۔ اگر ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو خدا تعالیٰ ہماری مدد کرے گا۔ ورنہ یہ سلسلہ خود بخود ہی تباہ ہو جائے گا۔

مسیح موعود کی بعثت کا مقصد

ہمارے دو کام ہیں۔ اوّل یہ کہ اعتقاد میں نصوص کے برخلاف جو غلطیاں پڑ گئی ہیں وہ نکالی جاویں۔ دوم یہ کہ لوگوں کی عملی حالتیں درست کی جائیں اور صحابہؓ کے مطابق ان کو تقویٰ اور طہارت حاصل ہو جاتے۔

طالبعلم :۔ کیا پہلے بھی کسی نے دعویٰ کیا تھا کہ میں اسلام میں نبی ہوں؟
حضرت اقدسؑ :۔ پہلے کس طرح کوئی دعویٰ کر سکتا۔ وہ لوگ مامور نہ تھے کہ ایسا دعویٰ کریں اور میں مامور ہوں۔

طالبعلم :۔ آپ کے مخالف کو کافر کیوں کہا جاتے گا؟
حضرت اقدسؑ :۔ کفر کے معنے ہیں انکار کرنا۔ جب یہ لوگ مامور من اللہ کو نہیں مانتے اور گالیاں دیتے ہیں اور انکار کرتے ہیں تو بات یہاں تک نہیں رہتی بلکہ ایک فتح الباب ہوتا ہے اور زبان کھل جاتی ہے اور رفتہ رفتہ توفیق اعمال کی جاتی رہتی ہے۔

جبتک استقامت نہ ہو بیعت ناتمام ہے

ایک شخص نے بیعت کی۔ فرمایا:

خدا تعالیٰ ثابت قدم رکھے۔ ثابت قدمی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب تک استقامت نہ ہو، بیعت بھی ناتمام ہے۔ انسان جب خدا تعالیٰ کی طرف قدم اُٹھاتا ہے تو راستہ میں بہت سی بلاؤں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جبتک اُن میں سے انسان گذر نہ لے۔ منزل مقصود کو پہنچ نہیں سکتا۔ امن کی حالت میں استقامت کا پتہ نہیں لگ سکتا کیونکہ امن اور آرام کے وقت تو ہر ایک شخص خوش رہتا ہے اور دوست بننے کو تیار ہے۔ مستقیم وہ ہے کہ سب بلاؤں کو برداشت کرے۔

لہ بدر جلد ۱ نمبر ۳۲ صفحہ ۲-۴ مورخہ ۹ رنومبر ۱۹۰۵ء

طُولِ امل سے ہی سب خرابیاں پیدا ہوتی ہیں

مولوی عبدالکریم صاحب کی موت کو دیکھو اور اس پر غور کرو کہ بڑی عبرت کی جگہ ہے کس طرح ناگہانی موت ان پر وارد ہوئی۔ ہر ایک شخص کو سمجھنا چاہیے کہ یہ دن کسی وقت آنے والا ہے۔ سب کو اس کے واسطے تیار رہنا چاہیئے۔ ان باتوں کا تصور اور مطالعہ انسان کو سچا مومن بنا دیتا ہے۔ جب انسان دنیا کی طرف جھکتا ہے اور بہت امور کو اپنے گلے ڈال لیتا ہے تو ایک طولِ امل پیدا ہو جاتا ہے۔ طولِ امل سے ہی سب خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جو شخص عمر کو لمبا سمجھتا ہے اور بڑی بڑی امیدیں کرتا ہے اور کہتا ہے یہ کروں گا وہ کروں گا۔ اس کے واسطے دل کی پاکیزگی کا حصول مشکل ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ رات کو سوئے اور صبح اُٹھنے کی اُمید نہ کرے اور صبح اٹھے تو رات تک زندگی کی امید نہ رکھے۔ سب سے اعلیٰ اور آخری بات یہ ہے کہ دل کی پاکیزگی حاصل ہو۔ جب خدا تعالیٰ کسی پر فضل کرتا ہے تو دل کی پاکیزگی اس کو عطا کرتا ہے۔ بغیر فضلِ الٰہی کے پاکیزگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اوّل بات یہ ہے کہ طولِ امل جاتا رہے۔ تب انسان تسلی پکڑتا ہے۔ جب انسان دن بھر ناجائز وسائل اختیار کرتا ہے اور دنیا کمانے کے پیچھے پڑا رہتا ہے تو دل ناپاک ہو جاتا ہے۔ مگر موت سے زیادہ اور کوئی واعظ نہیں یہی بڑا واعظ ہے۔

مومن میں اللہ تعالیٰ نے قوتِ جذب رکھی ہے

اٹاوہ کے دوست سید صادق حسین صاحب اور دیگر دوست اس جگہ کے مخاطب تھے۔ فرمایا:

اگر ایک آدمی بھی متقی اور صالح کسی مقام پر ہو جو اشاعتِ حق کے لیے پورا جوش رکھتا ہو تو خدا تعالیٰ اس میں قوتِ جاذبہ پیدا کر دیتا ہے اور وہ ایک جماعت بنا ہی لیتا ہے کیونکہ مومن کبھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ یہ نہیں کہ صرف معجزات کے ذریعہ سے ہی لوگوں پر حجّت پوری کی جاتی ہے۔ بلکہ مومن میں اللہ تعالیٰ نے ایک قوتِ جذب رکھی ہے۔ سعید لوگ اس کی طرف کھینچے جاتے ہیں اور غیر سعید لوگ بھی سلسلۂ حقّہ کی خدمت میں لگائے جاتے ہیں۔ ان کے سپرد یہ خدمت کی جاتی ہے کہ سلسلۂ حقّہ کی مخالفت میں شور و غوغا مچا کر اس کی تشہیر کریں اور اس کی تبلیغ کو دُور تک پہنچا دیں۔ مومن میں قوتِ جاذبہ ضرور ہوتی ہے۔ جب میں براہین لکھتا تھا تو یہ الہام ہوا تھا کہ ہر ایک دُور کی راہ سے لوگ تیرے پاس آئیں گے۔ اس وقت ایک بھی آدمی میرے ساتھ نہ تھا۔ اور یہ کتاب وہ ہے جو ہر ایک

فرقہ عیسائی، ہندو، برہمو، آریہ اور سب مخالفین کے پاس ہے۔ مولوی محمد حسین نے اس پر بڑا ریویو لکھا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پیشگوئیاں ہم نے بنائی ہیں یا ایسے زمانہ میں لکھی گئی تھیں کہ لوگ آیا جایا کرتے تھے۔ ایسے وقت میں یہ الہامات شائع ہوئے اور کئی ایک زبانوں میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی عبرانی سب زبانوں میں الہامات ہوتے۔ یہ اس لیے ہوا کہ ہر ایک زبان گواہ رہے اور اس کتاب کی عظمت ہو۔ اور اس میں یہ بھی ایک راز معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک زبان کے لوگ گواہ ہوں گے اور اس جماعت میں داخل ہوں گے۔

اگر دُنیا میں یہ باتیں انسان اپنی طاقت سے بنا سکتا ہے تو اس کی نظیر کہاں ہے؟ اگر یہ ہو سکتا اور انسان کر سکتا تو تمام انبیاء کی پیشگوئیاں اور خوارق ایک شبہ میں پڑ جاتے۔ مگر بات یہ ہے کہ ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے۔ ہر نبی کے وقت میں ابتلاء آئے اور اب بھی وہی سُنّت اللہ جاری ہے۔ مجدد صاحب نے بھی ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ جب مسیح آئے گا تو علماء اس کا مقابلہ کریں گے اور اس کی تکذیب کریں گے۔

جماعت کو صبر کی تلقین

فرمایا :

صبر بڑا جوہر ہے۔ جو شخص صبر کرنے والا ہوتا ہے اور غصے سے بھر کر نہیں بولتا اس کی تقریر اپنی نہیں ہوتی بلکہ خدا تعالیٰ اس سے تقریر کراتا ہے۔ جماعت کو چاہیے کہ صبر سے کام لے اور مخالفین کی سختی پر سختی نہ کرے اور گالیوں کے عوض میں گالی نہ دے۔ جو شخص ہمارا مکذّب ہے اس پر لازم نہیں کہ وہ ادب کے ساتھ بولے۔ اس کے نمونے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی بہت پائے جاتے ہیں۔ صبر جیسی کوئی شے نہیں مگر صبر کرنا بڑا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تائید کرتا ہے جو صبر سے کام لے۔ دہلی کی سرزمین سخت ہے، تاہم سب یکساں نہیں۔ کئی آدمی مخفی ہوں گے۔ جب وقت آئے گا تو وہ خود بخود سمجھ لیں گے۔ عرب بہت سخت ملک تھا۔ وہ بھی سیدھا ہو گیا۔ دہلی تو ایسی سخت نہیں۔

مَیں اس کو پسند نہیں کرتا کہ ہماری جماعت کے لوگ کسی پر حملہ کریں یا اخلاق کے برخلاف کوئی کام کریں۔ خدا تعالیٰ بُردباری کا حکم دیتا ہے اور اسی کے مطابق کرنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کے الہامات کی تفہیم بھی یہی ہے کہ بُردباری کریں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا شربت نہیں کہ فوراً کسی کے ہاتھ پر ڈال

ویں۔ ابھی تو بعض ماننے والے بھی ایسے ہیں کہ وہ پورا یقین نہیں کرتے بلکہ وساوس کی قے کرتے ہیں۔ تاہم کمزوروں پر رحم کرنا چاہیئے اور ہر ایک کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ مَیں جب نیا تھا تو میرا حال بھی ایسا ہی کمزوری کا تھا۔ شیطان ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ سکینت کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ گذشتہ معاصی کا زہر نیش زنی کرتا رہتا ہے۔ کوئی سہل امر نہیں کہ یک دفعہ یہ سارا زہر نکل جائے۔ رفتہ رفتہ خدا کی رحمت دستگیر ہوتی ہے۔ بیمار تندرست ہوتا ہے تو نقاہت باقی رہتی ہے اور نقاہت کے لوازم میں سے ہے کہ انسان کسی وقت گِر جائے بلکہ بعض دفعہ مرض عود کر آتی ہے۔ مومن ولی ہوتا ہے مگر اس نعمت کا حاصل ہونا مشکل ہے۔ اِسی واسطے کہا گیا ہے کہ اٰمَنَّا نہ کہو بلکہ اَسْلَمْنَا کہو۔

مسیح موعود کو ماننے کی ضرورت

حضرت کی خدمت میں آج پھر سوال پیش ہوا کہ جب ہم لوگ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور شریعت کے دیگر امور کی پیروی کرتے ہیں تو صرف آپ کو نہ ماننے کے سبب کیا حرج ہو سکتا ہے؟

حضرت نے فرمایا:

مَیں نے اس بات کا جواب کئی دفعہ دیا ہے۔ ہم قال اللہ اور قال الرسول کو مانتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ کی وحی کو مانتے ہیں۔ میرا آنا اللہ اور رسول کے وعدے کے مطابق ہے۔ جو شخص خدا اور رسُول کی ایک بات مانتا ہے اور دوسری نہیں مانتا وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ مَیں خدا پر ایمان لاتا ہوں۔ یہ تو وہ بات ہے جو قرآنِ شریف میں تذکرہ ہے کہ وہ لوگ بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر ایمان نہیں لاتے؛ ورنہ دراصل ایمان نہیں۔ ایک خدا اور اس کے رسُول کا موعود اپنے وقت پر آیا۔ صدی کے سر پر آیا۔ نشانات لایا۔ عین ضرورت کے وقت آیا۔ اپنے دعویٰ کے دلائل صحیح اور قوی رکھتا ہے۔ ایسے شخص کا انکار کیا ایک مومن کا کام ہے؟ یہودی موحد کہلاتے تھے۔ اب تک ان کا دعویٰ ہے کہ ہم توحید پر قائم ہیں۔ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانتے۔ اسی سبب کافر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے ایک حکم فرمودہ رسُول کی ایک بات کا بھی جو شخص انکار کرتا ہے اور اس کے مخالف ضد کرتا ہے وہ کافر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ان لوگوں کی غلطی ہے جو کہتے ہیں کہ ہم نماز روزہ ادا کرتے ہیں اور تمام اعمالِ حسنہ بجا لاتے ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت ہے؟ یہ نہیں جانتے کہ اعمالِ حسنہ کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ملتی ہے۔ ہر قسم کے شرکِ اَنفسی آفاقی کا نکالنا، خلوصِ لذّت اور احسان کے ساتھ عبادت بجا لانا یہ کوئی اختیاری بات نہیں ہے۔ اس کے واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی پیروی نہایت ہی ضروری ہے۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن جائیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ نیک اعمال کی توفیق فضلِ الٰہی پر موقوف ہے۔ جبتک اللہ تعالیٰ کا خاص فضل نہ ہو اندر کی آلودگیاں دُور نہیں ہوسکتیں۔ جب کوئی شخص نہایت درجہ کے صدق اور اخلاص کو اختیار کرتا ہے تو ایک طاقت آسمانی اس کے واسطے نازل ہوتی ہے۔ اگر انسان سب کچھ خود کرسکتا تو دُعاؤں کی ضرورت نہ ہوتی۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے میں اس شخص کو راہ دکھاؤں گا جو میری راہ میں مجاہدہ کرے۔ یہ ایک باریک رمز ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ تم سب اندھے ہو مگر وہ جس کو خدا آنکھیں دے۔ اور تم سب مُردے ہو مگر وہ جس کو خدا تعالیٰ زندگی دے۔ دیکھو یہودیوں کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ مثل گدھوں کے ہیں جن پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ ایسا علم انسان کو کیا فائدہ دے سکتا ہے جب تک دل آراستہ نہ ہو ہدایت اور سکینت نازل نہیں ہوتی۔ شیطان سے مناسبت آسان ہے مگر ملائک سے مناسبت مشکل ہے کیونکہ اس میں اوپر کو چڑھنا ہے اور اُس میں نیچے گرنا ہے۔ نیچے گرنا آسان ہے مگر اُوپر چڑھنا بہت مشکل ہے۔ یہ مقام تب حاصل ہوسکتا ہے کہ انسان درحقیقت پاک ہوکر محبت الٰہی کو اپنے اندر داخل کرلیتا ہے لیکن اگر یہ امر آسان ہوتا تو اولیاء، ابدال، غوث اور اقطاب ایسے کمیاب کیوں ہوتے؟ بظاہر تو وہ سب عام لوگوں کی مانند نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں مگر فرق صرف توفیق کا ہے۔ ان لوگوں نے کسی قسم کی شوخی اور کج روی نہ کی بلکہ خاکساری کا راہ اختیار کیا اور مجاہدات میں لگ گئے۔ جو شخص دنیوی حکام کے بالمقابل شوخی کرتا ہے وہ بھی ذلیل کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا کیا حال ہوگا جو خدا تعالیٰ کے فرستادہ کے حکم کے ساتھ شوخی اور گستاخی سے پیش آتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُعا کیا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ لَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ۔ یا اللہ مجھے ایک آنکھ جھپکنے تک بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر۔

اب ان لوگوں کے تقویٰ کے حال کو دیکھنا چاہیئے۔ میں ان کے سامنے آیا۔ میرا دعویٰ مسیح موعود ہونے کا ہے۔ کیا انھوں نے میرے معاملہ میں تدبّر کیا؟ کیا اُنہوں نے میری کتب کا مطالعہ کیا؟ کیا یہ میرے پاس آتے؟ کہ مجھ سے سمجھ لیں۔ صرف لوگوں کے کہنے کہلانے سے بے ایمان، دجّال اور کافر مجھے کہنا شروع کیا اور کہا کہ یہ واجب القتل ہے۔ بغیر تحقیقات کے انہوں نے یہ سب کارروائی کی اور دلیری کے ساتھ اپنا مُنہ کھولا۔ مناسب تھا کہ میرے مقابلہ میں یہ لوگ کوئی حدیث پیش کرتے۔ میرا مذہب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا اِدھر اُدھر جانا بے ایمانی میں پڑنا ہے

لیکن کیا اس کی پہلے کوئی نظیر دُنیا میں موجود ہے کہ ایک شخص پچیس ۲۵ سال سے خدا پر افترا کرتا ہے اور خدا تعالیٰ ہر روز اس کی تائید اور نصرت کرتا ہے۔ وہ اکیلا تھا اور خدا تعالیٰ نے تین لاکھ آدمی اس کے ساتھ شامل کر دیا۔ کیا تقویٰ کا حق ہے کہ اس کے مخالف بے ہودہ شور مچایا جاوے اور اس کے معاملہ میں کوئی تحقیقات نہ کی جاوے۔

عقیدہ وفاتِ مسیح علیہ السّلام کی اہمیت

وفاتِ مسیح پر قرآن ہمارے ساتھ ہے۔ معراج والی حدیث ہمارے ساتھ ہے۔ صحابہؓ کا اجماع ہمارے ساتھ ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تم حضرت عیسیٰؑ کو وہ خصوصیت دیتے ہو جو دُوسرے کے لیے نہیں۔ مجھے ایک بزرگ کی بات بہت ہی پیاری لگتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر دنیا میں کسی کی زندگی کا مَیں قائل ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا قائل ہوتا۔ دُوسرے کی زندگی سے ہم کو کیا فائدہ؟ تقویٰ سے کام لو۔ ضد اچھی نہیں۔ دیکھو۔ پادری لوگ گلی اور کوچوں اور بازاروں میں یہی کہتے پھرتے ہیں کہ ہمارا یسُوع زندہ ہے اور تمہارا رسُول مر چکا ہے۔ اس کا جواب تم ان کو کیا دے سکتے ہو؟ یہ زمانہ تو اسلام کی ترقی کا زمانہ ہے۔ کسوف خسوف بھی پیشگوئی کے مطابق ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ترقی کے واسطے وہ پہلو اختیار کیا ہے جس کے سامنے کوئی بول نہیں سکتا۔ سوچو انیس ۱۹ سو سال تک مسیحؑ کو زندہ ماننے کا کیا نتیجہ ہوا؟ یہی کہ چالیس کروڑ عیسائی ہو گئے۔ اب دُوسرے پہلو کو بھی چند سال کے واسطے آزماؤ اور دیکھو کہ اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی عیسائی سے پُوچھو کہ اگر یسوع مسیح کی وفات کو تسلیم کر لیا جاتے تو کیا پھر بھی کوئی عیسائی دنیا میں رہ سکتا ہے۔ تمہارا یہ طیش اور یہ غضب مجھ پر کیوں ہے؟ کیا اسی واسطے کہ مَیں اسلام کی فتح چاہتا ہوں۔ یاد رکھو کہ تمہاری مخالفت میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی۔ مَیں اکیلا تھا۔ خدا تعالےٰ کے وعدے کے موافق کئی لاکھ آدمی میرے ساتھ ہو گئے اور دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔ لاہور میں بشپ صاحب نے یہی سوال مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ ہزاروں آدمی جمع تھے اور بڑا بھاری جلسہ تھا۔ یسُوع کی فضیلت اس نے اس طرح بیان کی کہ وہ زندہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو چکے ہیں تب کوئی مُسلمان اس کا جواب نہ دے سکا۔ لیکن ہماری جماعت میں سے مفتی محمد صادق صاحب اُٹھے جو اس جگہ اِس وقت موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مَیں ثابت کرتا ہوں کہ قرآن، حدیث، انجیل سب کے مطابق حضرت عیسٰی علیہ السّلام فوت ہو چکے ہیں، چنانچہ انہوں نے ثابت کر دیا۔ تب بشپ کوئی جواب نہ دے سکا اور ہماری جماعت کے ساتھ مخاطب ہونے سے اعراض کیا۔

اسلام کبھی تلوار کے ساتھ نہیں پھیلایا گیا

ان مولویوں پر افسوس ہے کہ میری تذلیل کی خاطر یہ لوگ اسلام پر حملہ کرتے ہیں اور اسلام کی بے عزتی کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مہدی آئے گا تو وہ تلوار کے ساتھ دین پھیلائے گا۔ اے نادانو! کیا تم عیسائیوں کے اعتراض کی مدد کرتے ہو کہ دینِ اسلام تلوار کے ساتھ پھیلا ہے۔ یاد رکھو کہ اسلام کبھی تلوار کے ساتھ نہیں پھیلایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دین جبراً پھیلانے کے واسطے تلوار نہیں اٹھائی، بلکہ دشمنوں کے حملوں کو روکنے کے واسطے اور وہ بھی بہت برداشت اور صبر کے بعد غریب مسلمانوں کو ظالم کفار کے ہاتھ سے بچانے کے واسطے جنگ کی گئی تھی اور اس میں کوئی پیش قدمی مُسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی تھی یہی جہاد کا سِر ہے۔ آجکل عیسائیوں کے حملے تلوار کے ساتھ نہیں بلکہ قلم کے ساتھ ہیں پس قلم کے ساتھ ان کا جواب ہونا چاہیے۔ تلوار کے ساتھ سچا عقیدہ نہیں پھیل سکتا۔ بعض بیوقوف جنگلی لوگ ہندوؤں کو پکڑ کر ان سے جبراً کلمہ پڑھواتے ہیں مگر وہ جا کر پھر ہندو ہی ہندو ہوتے ہیں۔ اسلام ہرگز تلوار کے ساتھ نہیں پھیلا بلکہ پاک تعلیم کے ساتھ پھیلا ہے۔ صرف تلوار اُٹھانے والوں کو مزہ چکھایا تھا۔ اب قلم کے ساتھ، دلائل اور براہین کے ساتھ اور نشانوں کے ساتھ مخالفوں کو جواب دیا جا رہا ہے۔ اگر خدا تعالےٰ کو یہی منظور ہوتا کہ مسلمان جہاد کریں تو سب سے بڑھ کر مُسلمانوں کو جنگی طاقت دی جاتی اور آلاتِ حرب کی ساخت اور استعمال میں ان کو بہت دسترس عطا کی جاتی ـــ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ مسلمان بادشاہ اپنے ہتھیار یورپ کے لوگوں سے خرید کر لیتے ہیں۔ تم میں تلوار نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء ہی نہیں کہ تم تلوار کا استعمال کرو۔ سچی تعلیم اور معجزات کے ساتھ اب اسلام کا غلبہ ہوگا۔ مَیں اب بھی نشان دکھلانے کو تیار ہوں۔ کوئی پادری آئے اور چالیس روز تک میرے پاس رہے۔ تلواروں کو تو زنگ بھی لگ جاتا ہے پر ان نشانات کو جو تازہ ہیں کون زنگ لگا سکتا ہے۔

اسلام کی فتح کا ذریعہ

اسلام کے واسطے ایک انحطاط کا وقت ہے۔ اگر ہمارا طریق ان لوگوں کو پسند نہیں تو فتحِ اسلام کے واسطے کوئی پہلو یہ لوگ ہم کو بتلائیں ہم قبول کر لیں گے۔ اب تو ہر ایک عقلمند نے شہادت دے دی ہے کہ اگر اسلام کی فتح کسی بات سے ہو سکتی ہے تو وہ یہی بات ہے۔ یہانتک کہ عیسائی خود قائل ہیں کہ وفاتِ مسیح کا یہی ایک پہلو ہے جس سے عیسوی مذہب بیخ و بُن سے اُکھڑ جاتا ہے۔

اگر یہ لوگ عیسائیت کو چھوڑ دیں گے تو پھر ان کے واسطے بجز اس کے اور کوئی دروازہ نہیں کہ اسلام قبول کریں اور اس میں داخل ہو جائیں۔ یہی ایک راہ ہے۔ اگر کوئی دوسری راہ کسی کو معلوم ہے تو اس پر فرض ہے کہ اس کو پیش کرے بلکہ اس پر کھانا پینا حرام ہے جب تک اس پہلو کو پیش نہ کرے۔

اے مسلمانو! سوچو۔ اس میں تمہارا کیا حرج ہے کہ عیسیٰ فوت ہو گیا۔ کیا تمہارا پیارا نبی فوت نہیں ہو گیا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے نام پر تمہیں غصہ نہیں آتا۔ عیسیٰ کی وفات کا نام سُن کر تمہیں کیوں غصہ آتا ہے؟

میرا مطلب نفسانیت کا نہیں۔ مَیں کوئی شہرت نہیں چاہتا۔ مَیں تو صرف اسلام کی ترقی چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے دل کو خوب جانتا ہے۔ اسی نے میرے دل میں یہ جوش ڈال دیا۔ مَیں اپنی طرف سے بات نہیں کہتا۔ پچیس برس سے خدا تعالیٰ کا الہام مجھ سے یہ بات کہلا رہا ہے۔ اُسی زمانہ کا یہ الہام ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (الرحمٰن: ۲-۳) خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ مُجرم علیحدہ ہو جائیں اور راستباز علیحدہ ہو جائیں۔ میرے پر حملہ کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ بصیرت والا اپنی بصیرت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی صادق طالبِ حق ہے تو میرے پاس آوے۔ مَیں تازہ تر نشان دکھاؤں گا۔ کیا مَیں اس قدر یقین کو ترک کر کے تمہاری ظنّی باتوں کے پیچھے پڑ جاؤں۔ جس شخص کو خدا تعالیٰ نے بصیرت دی۔ نشانوں کے ساتھ اپنے مخاطبات اور مکالمات کے ساتھ اس کی صداقت پر مُہر لگا دی وہ تمہاری خیالی باتوں کو کیا کرے؟ اگر تم اس قدر باتوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لا سکتے تو اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (انعام: ۱۳۶) تم اپنی جگہ کام کرو، مَیں اپنا کام کرتا ہوں۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سچا کون ہے۔[1]

۲۸؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

بمقام دہلی

ویران مساجد

دہلی کے اردگرد بہت سی ویران مساجد کا تذکرہ تھا۔ حضرت نے فرمایا:-

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۲۶ صفحہ ۳ تا ۵ مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۵ء

ان کا مرمت کرانا کچھ مشکل امر نہ تھا۔ اگر وہ لوگ چاہتے تو کر لیتے، مگر جب خدا تعالیٰ کسی امر سے توجہ کو ہٹا دیتا ہے تو پھر کوئی کر ہی کیا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض مساجد کسی صحیح نیت سے نہیں بنوائی جاتیں بلکہ صرف اس واسطے بنائی جاتی ہیں کہ ہماری مسجد ہو اور کہلائے۔

فرمایا :-

کُل امور نیتِ صحیح اور دل کے تقویٰ پر موقوف ہیں۔ ایک بزرگ کے پاس بہت دولت تھی۔ کسی نے اعتراض کیا اس نے جواب دیا ؎

کے انداختم در دل ٭ مگر انداختم در گل

غرض خدا کے ساتھ دل لگا کر جب دنیوی کاروبار کرتا ہے تو کوئی شئے اُسے خدا سے مانع نہیں ہوسکتی خواہ کتنے ہی بڑے مشاغل کیوں نہ ہوں۔

ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا

فرمایا :

یہ بالکل غلط ہے کہ ہند میں اسلام تلوار کے ذریعہ سے پھیلا۔ ہرگز نہیں۔ ہند میں اسلام بادشاہوں نے بجبر نہیں پھیلایا بلکہ ان کو تو دین کی طرف بہت ہی کم توجہ تھی۔ اسلام ہند میں ان مشائخ اور بزرگانِ دین کی توجہ، دُعا اور تصرفات کا نتیجہ ہے جو اس مُلک میں گذرے تھے۔ بادشاہوں کو یہ توفیق کہاں ہوتی ہے کہ دلوں میں اسلام کی محبت ڈال دیں۔ جب تک کوئی آدمی اسلام کا نمونہ خود اپنے وجود سے نہ ظاہر کرے تب تک دُوسرے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ یہ بزرگ اللہ تعالیٰ کے حضور میں فنا ہو کر خود مجسّم قرآن اور مجسّم اسلام اور مظہر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بن جاتے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ایک جذب عطا کیا جاتا ہے اور سعید فطرتوں میں ان کا اثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ نوّے کروڑ مُسلمان ایسے لوگوں کی توجہ اور جذب سے بن گیا۔ تھوڑے سے عرصہ میں کوئی دین اس کثرت کے ساتھ کبھی نہیں پھیلا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے صلاح و تقویٰ کا نمونہ دکھلایا اور ان کی برہانِ قوی نے جوش مارا اور لوگوں کو کھینچا۔ مگر یہ بزرگ بھی عوام کی طعن و تشنیع سے خالی نہ تھے۔ گو ہم زیادہ تر ان لوگوں کے آگے گالیوں کے لیے تختۂ مشق ہو رہے ہیں تاہم ان سب نے دُکھ اُٹھایا۔ یہ ہمارے علماء ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے ہیں۔

سماع

ذکر آیا کہ بعض بزرگ راگ سُنتے ہیں۔ آیا یہ جائز ہے؟

فرمایا:

اس طرح بزرگانِ دین پر بدظنی کرنا اچھا نہیں حُسنِ ظنی سے کام لینا چاہیئے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اشعار سُنے تھے۔ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک صحابی مسجد کے اندر شعر پڑھتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو منع کیا۔ اس نے جواب دیا ــ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسجد میں شعر پڑھا کرتا تھا تو کون ہے جو مجھے روک سکے؟ یہ سُنکر حضرت امیر المومنینؓ بالکل خاموش ہوگئے۔

قرآن شریف کو بھی خوش الحانی سے پڑھنا چاہیئے۔ بلکہ اس قدر تاکید ہے کہ جو شخص قرآن شریف کو خوش الحانی سے نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور خود اس میں ایک اثر ہے۔ عمدہ تقریر خوش الحانی سے کی جائے تو اس کا بھی اثر ہوتا ہے۔ وہی تقریر ژولیدہ زبانی سے کی جائے تو اس میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جس شئے میں خدا تعالیٰ نے تاثیر رکھی ہے اس کو اسلام کی طرف کھینچنے کا آلہ بنایا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔ حضرت داؤد کی زبُور گیتوں میں تھی جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب حضرت داؤد خدا تعالےٰ کی مُناجات کرتے تھے تو پہاڑ بھی ان کے ساتھ روتے تھے اور پرندے بھی تسبیح کرتے تھے۔

مزامیر

ایک شخص درمیان میں بول پڑا کہ مزامیر کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟

فرمایا:

بعض نے قرآنِ شریف کے لفظ لھو الحدیث (لقمان: ۷) کو مزامیر سے تعبیر کیا ہے۔ مگر میرا مذہب یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو مقام اور محل دیکھنا چاہیئے۔ ایک شخص کو جو اپنے اندر بہت سے علوم رکھتا ہے اور تقویٰ کی علامات اس میں پائی جاتی ہیں اور متقی باخدا ہونے کی ہزار دلیل اس میں موجود ہے۔ صرف ایک بات جو تمہیں سمجھ میں نہیں آتی اس کی وجہ سے اُسے بُرا نہ کہو۔ اس طرح انسان محروم رہ جاتا ہے۔ بایزید بسطامیؒ کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ لوگ بہت ان کے گرد ہوئے اور ان کے وقت کو پراگندہ کرتے تھے۔ رمضان

کا مہینہ تھا۔ انہوں نے سب کے سامنے روٹی کھانی شروع کر دی۔ تب سب لوگ کافر کہہ کر بھاگ گئے۔ عوام واقف نہ تھے کہ یہ مسافر ہے اور اس کے واسطے روزہ ضروری نہیں۔ لوگ نفرت کر کے بھاگے۔ ان کے واسطے عبادت کے لیے مقامِ خلوت حاصل ہو گیا۔

خضری اسرار

یہ اُسرار ہیں اور ان کے واسطے ایک عمدہ مثال خود قرآن شریف میں موجود ہے جہاں حضرت خضرؑ نے ایک کشتی توڑ ڈالی اور ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ کوئی ظاہر شریعت ان کو ایسے کام کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ اس قصہ سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ خضری اسرار اس امت میں ہمیشہ پائے جاتے رہے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالاتِ متفرقہ کے جامع تھے اور ظلّی طور پر وہ کمالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں موجود ہیں۔ جو خضر نے کیا آئندہ صاحبانِ کمالات بھی حسبِ ضرورت کرتے ہیں۔ جہاں حضرت خضر نے ایک نفسِ زکیہ کو قتل کر دیا اس کے بالمقابل مزامیر کیا شئے ہے۔ لہٰذا جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ جلد بازی انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ دوسری علامات کو دیکھنا چاہیئے جو اولیاء الرحمٰن میں پائی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اس میں بڑی احتیاط لازم ہے۔ جو اعتراض کرے گا وہ مارا جائے گا۔ تعجب ہے کہ زبان کھولنے والے خود گندے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے دل ناپاک ہوتے ہیں اور پھر بزرگوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

یہ بھی میں دیکھتا ہوں کہ اولیاء اللہ میں کسی ایسی بات کا ہونا بھی سنت اللہ میں چلا آتا ہے۔ جیسا کہ خوبصورت بچے کو جب ماں عمدہ لباس پہنا کر باہر نکالتی ہے تو اس کے چہرے پر ایک سیاہی کا داغ بھی لگا دیتی ہے تاکہ وہ نظرِ بد سے بچا رہے۔ ایسا ہی خدا بھی اپنے پاکیزہ بندوں کے ظاہری حالات میں ایک ایسی بات رکھ دیتا ہے جس سے بد لوگ اس سے دور رہیں اور صرف نیک لوگ اس کے گرد جمع رہیں۔ سعید آدمی چہرے کی اصلی خوبصورتی کو دیکھتا ہے اور شقی کا دھیان اس داغ کی طرف رہتا ہے۔

امرتسر کا واقعہ ہے۔ ایک دعوت میں چند مولوی شریک تھے اور صاحبِ مکان نے مجھے بھی بلایا ہوا تھا۔ چائے لائی گئی۔ میں نے پیالی بائیں ہاتھ سے پکڑ لی۔ تب سب نے اعتراض کیا کہ یہ سُنّت کے برخلاف کام کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ یہ سُنّت ہے کہ پیالی دائیں ہاتھ سے پکڑی جائے مگر کیا یہ سُنت نہیں کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ (بنی اسرائیل: ۳۷) یعنی جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے متعلق اپنی زبان نہ کھول۔ کیا آپ لوگوں کو مناسب نہ تھا کہ مجھ پر

حُسنِ ظن کرتے اور خاموش رہتے۔ یا یہ نہیں ہوسکتا تھا تو اعتراض کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ ہی لیتے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ پھر مَیں نے بتلایا کہ اصل بات یہ ہے کہ میرے دائیں بازو کی ہڈی بچپن سے ٹوٹی ہوئی ہے اور پیالی پکڑ کر مَیں ہاتھ کو اُوپر نہیں اُٹھا سکتا۔ جب یہ بات انہیں بتلائی گئی، تب وہ سُن کر شرمندہ ہوگئے[1]

۲۹؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء

بمقام دہلی

(بعد نمازِ ظہر)

وفاتِ مسیح کے متعلق ایک جامع تحریر

چند مولویوں کو حضرت اقدس علیہ السلام نے ایک تحریر لکھ کر دی کہ آپ کیوں مسیح کی وفات کے قائل ہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ تحریر درج ذیل کی جاتی ہے:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

وجوہ مفصلہ ذیل ہیں جن کی رُو سے مَیں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو فوت شدہ قرار دیتا ہوں۔

(۱) قرآن شریف میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نسبت یہ آیات ہیں۔ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ۔ (آل عمران: ۵۶)؛ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ (المائدۃ: ۱۱۸) ان آیات کے معنی صحیح بخاری کتاب التفسیر میں موت لکھے ہیں۔ جیسا کہ اس میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے لکھا ہے۔ مُتَوَفِّیْكَ مُمِیْتُكَ اور پھر تظاہر آیات کے لیے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کا اس جگہ ذکر کیا ہے اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ذکر کیا ہے کہ مَیں قیامت کے دن یہی عرض کروں گا کہ یہ لوگ میری وفات کے بعد بگڑے ہیں۔ جیسا کہ لکھا ہے کَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ۔ (الخ)

(۲) دُوسری دلیل تَوَفِّیْ کے ان معنوں پر جو اُوپر ذکر کئے گئے ہیں، لغت عرب کی کتابیں ہیں مَیں نے

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۳۶ صفحہ ۶-۷ مورخہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۵ء

جہانتک ممکن تھا قریبًا تمام شائع شدہ کتابیں لغت کی دیکھی ہیں۔ جیسے قاموس، تاج العروس، صراح، صحاح جوہری، لسان العرب اور وہ کتابیں جو حال میں بیروت میں تالیف کرکے عیسائیوں نے شائع کی ہیں۔ ان تمام کتابوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ محاورۂ عرب اسی طرح پر ہے کہ جب کسی جملہ میں خدا تعالیٰ فاعل ہو اور کوئی علَم انسان مفعول بہٖ ہو جیساکہ تَوَفَّى اللّٰهُ زَيْدًا۔ تو ایسی صورت میں بجز اماتت اور قبضِ رُوح اور کوئی معنے نہیں ہوتے۔ اور جو شخص اس سے انکار کرے اس پر لازم ہے کہ اس کے برخلاف لغت کی کتابوں سے کوئی نظیر مخالف پیش کرے۔

(۳) مَیں نے بہت محنت اور کوشش سے جہاں تک میرے لیے ممکن تھا صحاحِ ستہ وغیرہ حدیث کی کتابیں غور سے دیکھی ہیں اور مَیں نے کسی ایک جگہ پر توفّی کے معنے بجُز وفات دینے کے حدیث میں نہیں پائے بلکہ تین سو کے قریب ایسی جگہ پائی ہیں جہاں ہر جگہ موت دینے کے ہی معنے ہیں۔

(۴) مَیں نے جہاں تک میرے لیے ممکن تھا، عرب کے مختلف دیوان بھی دیکھے ہیں مگر نہ مَیں نے جاہلیت کے زمانہ کے شعراء اور نہ اسلام کے زمانہ کے مستند شعراء کے کلام میں کوئی ایسا فقرہ پایا ہے کہ ایسی صورت میں جو اُوپر بیان کی گئی ہے بجُز وفات دینے کے کوئی اور معنے ہوں۔

(۵) شاہ ولی اللہ صاحب کی الفوز الکبیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ مُتَوَفِّيْكَ مُمِيْتُكَ اور مَیں جانتا ہوں کہ شاہ ولی اللہ صاحب بڑے پایہ کے محدّث اور فقیہ اور عالم فاضل تھے۔

(۶) حدیثِ معراج جو بخاری میں موجود ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فوت شدہ انبیاء میں دیکھا تھا پس اس جگہ دو شہادتیں ہیں۔ ایک خدا تعالیٰ کی شہادت قرآنِ شریف میں، دوسری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت لیلۃ المعراج میں۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جیساکہ کنز العمال وطبرانی اور کتاب ماثبت بالسُّنۃ میں شیخ عبد الحق وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی عمر ایک سو پچیس برس کی تھی اور ایک روایت میں ایک سو بیس برس بھی ہے اور ہزاروں برس کی عمر کسی جگہ نہیں لکھی۔

(۸) جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوا وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر دلیلِ قاطع ہے جو اس آیت کی رُو سے اجماع تھا۔ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ (اٰل عمران : ۱۴۵)

(۹) ماسوائے اس کے خدا تعالےٰ نے اپنی وحی قطعی صحیح سے بار بار میرے پر ظاہر کر دیا ہے کہ

حضرت عیسیٰ وفات پا گئے اور اپنے کھلے کھلے نشانوں سے میری سچائی ظاہر فرمائی ہے۔ اسی طرح اور بہت سے دلائل ہیں مگر اسی قدر کافی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت قرآن شریف اور حدیث اور اجماع صحابہؓ سے ثابت ہے۔ اور سورہ نور سے ثابت ہے کہ اس اُمت کے کل خلفاء اسی اُمت میں سے آئیں گے اور صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ آنیوالا عیسیٰ اسی اُمت میں سے ہوگا۔ جیسا کہ لکھا ہے کہ اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ بلکہ صحیح بخاری میں پہلے مسیح کا اور حُلیہ لکھا ہے اور آنے والے مسیح کا اَور حُلیہ لکھا ہے۔ ماسوائے اس کے میرا آنا بے وقت نہیں۔ صدی جس کے سر پر آنا تھا، تیئیس برس اس میں سے گذر گئے۔ کسوف خسوف بھی رمضان میں ہوگیا، طاعون بھی پیدا ہوگئی۔ ایک نئی سواری یعنی ریل بھی پیدا ہوگئی اور خدا تعالیٰ نے دس ہزار سے زیادہ نشان میرے ہاتھ پر ظاہر فرمائے ہیں اور ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کی زندگی حضرت عیسیٰؑ کی موت میں ہے۔ اگر آج یہ امر عیسائیوں پر ثابت ہو کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہوگئے تو وہ سب کے سب عیسائی مذہب کو ترک کر دیں۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی ⁘

مرزا غلام احمد عفی اللہ عنہ
۲۹ / اکتوبر ۱۹۰۵ء

یکم نومبر ۱۹۰۵ء

بمقام دہلی

نزولِ برکات کے مقامات

آج حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر حضور علیہ السلام نے دُعا کی اور دُعا کو لمبا کیا۔ واپس آتے ہوئے حضرت نے راستہ میں فرمایا کہ:

بعض مقامات نزولِ برکات کے ہوتے ہیں اور یہ بزرگ چونکہ اولیاء اللہ تھے اس واسطے انکے مزار پر ہم گئے۔ ان کے واسطے بھی ہم نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور اپنے واسطے بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی اور دیگر بہت دعائیں کیں۔ لیکن یہ دو چار بزرگوں کے مقامات تھے جو جلد ختم ہوگئے۔ اور دہلی

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۳۲ صفحہ ۴ مورخہ ۶ / نومبر ۱۹۰۵ء

سے لوگ تو سخت دل ہیں۔ یہی خیال تھا کہ واپس آتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے ہوئے الہام ہوا۔

دست تو دُعائے تو ترحّم زخُدا[1]

۴؍ نومبر ۱۹۰۵ء

لیکچر لُدھیانہ

(جو حضور علیہ السلام نے ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں دیا)

دلائل صداقت اوّل میں اللہ تعالیٰ کا شُکر کرتا ہوں جس نے مجھے یہ موقعہ دیا کہ میں پھر اس شہر میں تبلیغ کرنے کے لیے آؤں۔ میں اس شہر میں چودہ ۱۴ برس کے بعد آیا ہوں اور میں ایسے وقت اس شہر سے گیا تھا جبکہ میرے ساتھ چند آدمی تھے اور تکفیر اور تکذیب اور دجّال کہنے کا بازار گرم تھا اور میں لوگوں کی نظر میں اس انسان کی طرح تھا جو مطرود اور مخذول ہوتا ہے۔ اور ان لوگوں کے خیال میں تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ جماعت مرُدود ہو کر منتشر ہو جائے گی اور اس سلسلہ کا نام و نشان مِٹ جائے گا؛ چنانچہ اس غرض کے لیے بڑی بڑی کوششیں اور منصوبے کئے گئے اور ایک بڑی بھاری سازش میرے خلاف یہ کی گئی کہ مجھ پر اور میری جماعت پر کُفر کا فتویٰ لکھا گیا اور سارے ہندوستان میں اس فتویٰ کو پھرایا گیا۔ میں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ سب سے اوّل مجھ پر کفر کا فتویٰ اس شہر کے چند مولویوں نے دیا۔ مگر میں دیکھتا ہوں اور آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کافر کہنے والے موجود نہیں اور خدا تعالیٰ نے مجھے اب تک زندہ رکھا اور میری جماعت کو بڑھایا۔ میرا خیال ہے کہ وہ فتویٰ کفر

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۴۴ صفحہ ۳ مورخہ ۸ نومبر ۱۹۰۵ء

جو دوبارہ میرے خلاف تجویز ہوا۔ اسے ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں پھرایا گیا اور دوسو کے قریب مولویوں اور مشایخوں کی گواہیاں اور مُہریں اس پر کرائی گئیں۔ اس میں ظاہر کیا گیا کہ یہ شخص بے ایمان ہے۔ کافر ہے، دجال ہے، مفتری ہے، کافر ہے بلکہ اکفر ہے۔ غرض جو جو کچھ کسی سے ہو سکا میری نسبت اس نے لکھا اور ان لوگوں نے اپنے خیال میں یہ سمجھ لیا کہ بس یہ ہتھیار اب اس سلسلہ کو ختم کر دیگا اور فی الحقیقت اگر یہ سلسلہ انسانی منصوبہ اور افترا۔ ہوتا تو اس کے ہلاک کرنے کے لیے یہ فتویٰ کا ہتھیار بہت ہی زبردست تھا لیکن اس کو خدا تعالیٰ نے قائم کیا تھا۔ پھر وہ مخالفوں کی مخالفت اور عداوت سے کیونکر مر سکتا تھا۔ جس قدر مخالفت میں شدّت ہوتی گئی اسی قدر اس سلسلہ کی عظمت اور عزت دلوں میں جڑ پکڑتی گئی اور آج میں خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ یا تو وہ زمانہ تھا کہ جب مَیں اس شہر میں آیا اور یہاں سے گیا تو صرف چند آدمی میرے ساتھ تھے اور میری جماعت کی تعداد نہایت ہی قلیل تھی اور یا اب وہ وقت ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ ایک کثیر جماعت میرے ساتھ ہے اور جماعت کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اور دن بدن ترقی ہو رہی ہے اور یقیناً کروڑوں تک پہنچے گی۔

پس اس انقلابِ عظیم کو دیکھو کہ کیا یہ انسانی ہاتھ کا کام ہو سکتا ہے دُنیا کے لوگوں نے تو چاہا کہ اس سلسلہ کا نام و نشان مٹا دیں اور اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ کبھی کا اسکو مٹا چکے ہوتے مگر یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ وہ جن باتوں کا ارادہ فرماتا ہے دنیا ان کو روک نہیں سکتی اور جن باتوں کا دُنیا ارادہ کرے مگر خدا تعالیٰ ان کا ارادہ نہ کرے وہ کبھی ہو نہیں سکتی ہیں۔ غور کرو۔ میرے معاملہ میں کل علماء اور پیرزادے اور گدی نشین مخالف ہوئے اور دُوسرے مذہب کے لوگوں کو بھی میری مخالفت کے لیے اپنے ساتھ ملایا۔ پھر میری نسبت ہر طرح کی کوشش کی۔ مسلمانوں کو بدظن کرنے کے لیے مجھ پر کفر کا فتویٰ دیا اور پھر جب اس تجویز میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو پھر مقدمات شروع کئے۔ خون کے مقدمے میں مجھے پھنسایا اور ہر طرح کی کوششیں کیں کہ مَیں سزا پا جاؤں۔ ایک پادری کے قتل کا الزام مجھ پر لگایا گیا۔ اس مقدمے میں مولوی محمد حسین نے بھی میرے خلاف بڑی کوشش کی اور خود شہادت دینے کے واسطے گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مَیں پھنس جاؤں اور مجھے سزا ملے۔ مولوی محمد حسین کی یہ کوشش ظاہر کرتی تھی کہ وہ دلائل اور براہین سے عاجز ہے۔ اس لیے کہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب دشمن دلائل سے عاجز ہو جاتا ہے اور براہین سے ملزم نہیں کر سکتا تو ایذا قتل کی تجویز کرتا ہے اور وطن سے نکال دینے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے خلاف مختلف قسم کے منصوبے اور سازشیں کرتا ہے۔

جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں جب کُفّار عاجز آ گئے اور ہر طرح سے ساکت ہو گئے تو آخر انہوں نے بھی اس قسم کے حیلے سوچے کہ آپ کو قتل کر دیں یا قید کریں یا آپ کو وطن سے نکال دیا جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو ایذائیں دیں مگر آخر وہ سب کے سب اپنے ارادوں اور منصوبوں میں نامراد اور ناکام رہے۔ اب وہی سنّت اور طریق میرے ساتھ ہو رہا ہے مگر یہ دُنیا بغیر خالق اور ربّ العالمین کے ہستی نہیں رکھتی۔ وہی ہے جو جھوٹے اور سچے میں امتیاز کرتا ہے اور آخر سچے کی حمایت کرتا اور اُسے غالب کر کے دکھا دیتا ہے۔ اب اس زمانہ میں جب خدا تعالیٰ نے پھر اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا ہے مَیں اس کی تائیدوں کا ایک زندہ نشان ہوں اور اس وقت تم سب کے سب دیکھتے ہو کہ مَیں وہی ہوں جس کو قوم نے رَدّ کیا اور مَیں مقبولوں کی طرح کھڑا ہوں۔ تم قیاس کرو کہ اس وقت آج سے چودہ برس پیشتر جب مَیں یہاں آیا تھا تو کون چاہتا تھا کہ ایک آدمی بھی میرے ساتھ ہو۔ علماء، فقراء اور ہر قسم کے معظّم مکرّم لوگ یہ چاہتے تھے کہ مَیں ہلاک ہو جاؤں اور اس سلسلہ کا نام و نشان مٹ جاوے۔ وہ کبھی گوارا نہ کرتے تھے کہ ترقیات نصیب ہوں۔ مگر وہ خدا جو ہمیشہ اپنے بندوں کی حمایت کرتا ہے اور جس نے راستبازوں کو غالب کر کے دکھایا ہے اس نے میری حمایت کی اور میرے مخالفوں کے خلاف ان کی امیدوں اور منصوبوں کے بالکل برعکس اس نے مجھے وہ قبولیت بخشی کہ ایک خلق کو میری طرف متوجہ کیا جو ان مخالفتوں اور مشکلات کے پردوں اور روکوں کو چیرتی ہوئی میری طرف آئی اور آ رہی ہے اب غور کا مقام ہے کہ کیا انسانی تجویزوں اور منصوبوں سے یہ کامیابی ہو سکتی ہے کہ دُنیا کے بارسوخ لوگ ایک شخص کی ہلاکت کی فکر میں ہوں اور اس کے خلاف ہر قسم کے منصوبے کئے جاویں۔ اس کے لیے خطرناک آگ جلائی جاوے۔ مگر وہ ان سب آفتوں سے صاف نکل جاوے؟ ہرگز نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کے کام ہیں جو ہمیشہ اس نے دکھاتے ہیں۔

پھر اسی امر پر زبردست دلیل یہ ہے کہ آج سے پچّیس ۲۵ برس پیشتر جبکہ کوئی بھی میرے نام سے واقف نہ تھا اور نہ کوئی شخص قادیان میں میرے پاس آتا تھا یا خط و کتابت رکھتا تھا، اس گمنامی کی حالت میں، اس کس مپرسی کے ایّام میں اللہ تعالیٰ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا:

يَأْتُوْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ وَيَأْتِيْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ لَا تُصَعِّرْ لِخَلْقِ
اللّٰهِ وَلَا تَسْئَمْ مِنَ النَّاسِ۔ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ
خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ۔

یہ وہ زبردست پیشگوئی ہے جو ان ایام میں کی گئی اور چھپ کر شائع ہوگئی اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے اسے پڑھا۔ ایسی حالت اور ایسے وقت میں کہ مَیں گمنامی کے گوشہ میں پڑا ہوا تھا اور کوئی شخص مجھے نہ جانتا تھا، خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرے پاس دُور دراز مُلکوں سے لوگ آئیں گے اور کثرت سے آئیں گے اور ان کے لیے مہمانداری کے ہر قسم کے سامان اور لوازمات بھی آئیں گے۔ چونکہ ایک شخص ہزاروں لاکھوں انسانوں کو مہمانداری کے جمیع لوازمات مہیا نہیں کر سکتا اور نہ اس قدر اخراجات کو برداشت کر سکتا ہے اس لیے خود ہی فرمایا یَاْتِیْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ ان کے سامان بھی ساتھ ہی آئیں گے اور پھر انسان کثرتِ مخلوقات سے گھبرا جاتا ہے اور ان سے کج خلقی کر بیٹھتا ہے اس لئے اس سے منع کیا کہ ان سے کج خلقی نہ کرنا اور پھر یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کی کثرت کو دیکھ کر تھک نہ جانا۔

اب آپ غور کریں کہ کیا یہ امر انسانی طاقت کے اندر ہے کہ پچیس تیس برس پہلے ایک واقعہ کی اطلاع دے؟ اور وہ بھی اسی کے متعلق اور پھر اسی طرح پر وقوع بھی ہو جاوے؟ انسانی ہستی اور زندگی کا تو ایک منٹ کا بھی اعتبار نہیں اور نہیں کہہ سکتے کہ دوسرا سانس آئے گا یا نہیں۔ پھر ایسی خبر دینا یہ کیونکر اس کی طاقت اور قیاس میں آسکتا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مَیں بالکل اکیلا تھا اور لوگوں سے ملنے سے بھی مجھے نفرت تھی اور چونکہ ایک وقت آنے والا تھا کہ لاکھوں انسان میری طرف رجوع کریں اس لیے اس نصیحت کی ضرورت پڑی۔ لَا تُصَعِّرْ لِخَلْقِ اللّٰهِ وَلَا تَسْئَمْ مِنَ النَّاسِ۔

اور پھر انہیں دنوں میں یہ بھی فرمایا۔ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ تَوْحِیْدِیْ۔ فَحَانَ اَنْ تُعَانَ وَتُعْرَفَ بَیْنَ النَّاسِ۔ یعنی وہ وقت آتا ہے کہ تیری مدد کی جاوے گی اور تُو لوگوں کے درمیان شناخت کیا جاوے گا۔ اسی طرح پر فارسی، عربی اور انگریزی میں کثرت سے ایسے الہامات ہیں جو اس مضمون کو ظاہر کرتے ہیں۔

اب سوچنے کا مقام ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں کہ اس قدر عرصہ دراز پیشتر ایک پیشگوئی کی گئی اور وہ کتاب میں چھپ کر شائع ہوئی۔ براہین احمدیہ ایسی کتاب ہے جس کو دوست دشمن سب نے پڑھا۔ گورنمنٹ میں بھی اس کی کاپی بھیجی گئی۔ عیسائیوں ہندوؤں نے اسے پڑھا۔ اس شہر میں بھی بہتوں کے پاس یہ کتاب ہوگی وہ دیکھیں کہ اس میں درج ہے یا نہیں؟ پھر وہ مولوی (جو محض عداوت کی راہ سے مجھے دجّال اور کذّاب کہتے ہیں اور یہ بیان کرتے ہیں کہ کوئی پیشگوئی

پوری نہیں ہوئی) شرم کریں اور بتائیں کہ اگر یہ پیشگوئی نہیں تو پھر اور پیشگوئی کس کو کہتے ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا ریویو مولوی ابوسعید محمد حسین بٹالوی نے کیا ہے۔ چونکہ وہ میرے ہم سبق تھے اس لیے اکثر قادیان آیا کرتے تھے۔ وہ خوب جانتے ہیں۔ اور ایسا ہی قادیان۔ بٹالہ۔ امرتسر اور گرد و نواح کے لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ اس وقت میں بالکل اکیلا تھا۔ اور کوئی مجھے جانتا نہ تھا اور اس وقت کی حالت سے عند العقل دور از قیاس معلوم ہوتا تھا کہ میرے جیسے گمنام آدمی پر ایسا زمانہ آئے گا کہ لاکھوں آدمی اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس وقت کچھ بھی نہ تھا۔ تنہا و بیکس تھا۔ خود اللہ تعالیٰ اس زمانہ میں مجھے یہ دعا سکھاتا ہے۔ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ یہ دعا اس لیے سکھائی کہ وہ پیار رکھتا ہے ان لوگوں سے جو دعا کرتے ہیں کیونکہ دعا عبادت ہے اور اس نے فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن: ۶۱) دُعا کرو میں قبول کروں گا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مغز اور مخ عبادت کا دُعا ہی ہے۔ اور دُوسرا اشارہ اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دُعا کے پیرایہ میں سکھانا چاہتا ہے کہ تو اکیلا ہے اور ایک وقت آئے گا کہ تُو اکیلا نہ رہے گا۔ اور میں پکار کر کہتا ہوں کہ جیسا یہ دن روشن ہے اسی طرح یہ پیشگوئی روشن ہے اور یہ امر واقعی ہے۔[1] میں اس وقت اکیلا تھا۔ کون کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے کہ تیرے ساتھ جماعت تھی۔ مگر اب دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے موافق اور اس پیشگوئی کے موافق جو اس نے ایک زمانہ پہلے خبر دی، ایک کثیر جماعت میرے ساتھ کر دی۔ ایسی حالت اور صورت میں اس عظیم الشان پیشگوئی کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ پھر جبکہ اسی کتاب میں یہ پیشگوئی بھی موجود ہے کہ لوگ خطرناک طور پر مخالفت کریں گے اور اس جماعت کو رد کرنے کے لیے ہر قسم کی کوششیں کریں گے مگر میں ان سب کو نامراد کروں گا۔

پھر براہین احمدیہ میں یہ بھی پیشگوئی کی گئی تھی کہ جبتک پاک پلید میں فرق نہ کروں گا نہیں چھوڑوں گا۔ ان واقعات کو پیش کر کے میں ان لوگوں کو مخاطب نہیں کرتا جن کے دلوں میں خدا تعالیٰ کا خوف نہیں اور جو گویا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے مرنا ہی نہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں، بلکہ میں ان لوگوں کو مخاطب کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ مرنا ہے اور موت کے دروازے قریب ہو رہے ہیں اس لیے کہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے والا ایسا گستاخ نہیں ہو سکتا۔ وہ غور کریں کہ کیا پچیس۲۵ برس پیشتر ایسی پیشگوئی کرنا انسانی طاقت اور قیاس کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ پھر ایسی حالت

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۱ صفحہ ۸-۹ مورخہ ۱۰؍ستمبر ۱۹۰۶ء

ہیں کہ کوئی اُسے جانتا بھی نہ ہو اور ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی ہو کہ یہ لوگ مخالفت کریں گے مگر وہ نامُراد رہیں گے۔ مخالفوں کے نامراد رہنے اور اپنے بامراد ہو جانے کی پیشگوئی کرنا ایک خارق عادت امر ہے۔ اگر اس کے ماننے میں کوئی شک ہے تو پھر نظیر پیش کرو۔

مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ حضرت آدمؑ سے لیکر اس وقت تک کے کسی مفتری کی نظیر دو جس نے پچیس ۲۵ برس پیشتر اپنی گمنامی کی حالت میں ایسی پیشگوئیاں کی ہوں اور وہ یوں روزِ روشن کی طرح پوری ہو گئی ہوں۔ اگر کوئی شخص ایسی نظیر پیش کر دے تو یقیناً یاد رکھو کہ یہ سارا سلسلہ اور کاروبار باطل ہو جائے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے کاروبار کو کون باطل کر سکتا ہے؟ یوں تکذیب کرنا اور بلاوجہ معقول انکار اور استہزا یہ حرامزادے کا کام ہے۔ کوئی حلال زادہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

مَیں اپنی سچائی کو اسی پر حصر کر سکتا ہوں۔ اگر تم میں کوئی سلیم دل رکھتا ہو۔ خوب یاد رکھو کہ یہ پیشگوئی کبھی ردّ نہیں ہو سکتی جب تک اس کی نظیر پیش نہ کی جاوے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ پیشگوئی براہین احمدیہ میں موجود ہے جس کا ریویو مولوی ابوسعید نے لکھا ہے۔ اسی شہر میں مولوی محمد حسن اور منشی محمد عمر وغیرہ کے پاس ہوگی۔ اس کا نسخہ مکہ، مدینہ، بخارا تک پہنچا۔ گورنمنٹ کے پاس اس کی کاپی بھیجی گئی۔ ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، برہموؤں نے اُسے پڑھا اور وہ کوئی گمنام کتاب نہیں بلکہ وہ شہرت یافتہ کتاب ہے کوئی پڑھا آدمی جو مذہبی مذاق رکھتا ہو اس سے بے خبر نہیں ہے۔ پھر اس کتاب میں یہ پیشگوئی لکھی ہوئی موجود ہے کہ ایک دُنیا تیرے ساتھ ہو جائے گی۔ دنیا میں تجھے شہرت دُوں گا۔ تیرے مخالفوں کو نامراد رکھوں گا۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ کام کسی مفتری کا ہو سکتا ہے؟ اگر تم یہی فیصلہ دیتے ہو کہ ہاں مفتری کا کام ہو سکتا ہے تو پھر اس کے لیے نظیر پیش کرو۔ اگر نظیر دکھا دو تو مَیں تسلیم کر لوں گا کہ مَیں جھوٹا ہوں مگر کوئی نہیں جو اس کی نظیر دکھا سکے۔ اور اگر تم اس کی نظیر نہ پیش کر سکو اور یقیناً نہیں کر سکو گے تو پھر مَیں تمہیں یہی کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور تکذیب سے باز آؤ۔

یاد رکھو۔ خدا تعالیٰ کے نشانات کو بدوں کسی سند کے ردّ کرنا دانشمندی نہیں اور نہ اس کا انجام کبھی بابرکت ہوا ہے۔ مَیں تو کسی کی تکذیب یا تکفیر کی پروا نہیں کرتا اور نہ ان حملوں سے ڈرتا ہوں جو مجھ پر کئے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے آپ ہی مجھے قبل از وقت بتا دیا تھا کہ تکذیب اور تکفیر ہوگی اور خطرناک مخالفت یہ لوگ کریں گے مگر کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ کیا مجھ سے پیشتر راستبازوں اور خدا تعالیٰ کے ماموروں کو ردّ نہیں کیا گیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون اور فرعونیوں نے، حضرت مسیح علیہ السلام پر فقیہوں نے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مشرکین مکہ نے کیا کیا حملے نہیں کئے؟

مگران حملوں کا انجام کیا ہوا؟ ان مخالفوں نے ان نشانات کے مقابلہ میں کبھی کوئی نظیر پیش کی؟ کبھی نہیں۔ نظیر پیش کرنے سے تو ہمیشہ عاجز رہے۔ ہاں زبانیں چلتی تھیں۔ اس لیے وہ کذاب کہتے رہے۔ اسی طرح پر یہاں بھی جب عاجز آ گئے تو اور تو کچھ نہ پیش گئی۔ دجال کذاب کہہ دیا۔ مگر ان کے مُنہ کی پھونکوں سے کیا یہ خدا تعالیٰ کے نُور کو بجھا دیں گے؟ کبھی نہیں بجھا سکتے۔ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔ (الصّف : ۹)

دوسرے خوارق اور نشانات کو وہ لوگ جو بدظنی کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہیں کہہ دیتے ہیں کہ شاید دست بازی ہو مگر پیشگوئی میں انہیں کوئی عذر اور باقی نہیں رہتا اس لیے نشانات نبوت میں عظیم الشان نشان اور معجزہ پیشگوئیوں کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ امر توریت سے بھی ثابت ہے اور قرآن مجید سے بھی۔ پیشگوئیوں کے برابر کوئی معجزہ نہیں۔ اس لیے خدا تعالیٰ کے ماموروں کو ان کی پیشگوئیوں سے شناخت کرنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نشان مقرر کر دیا ہے۔ لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ۔ (الجنّ : ۲۷) یعنی اللہ تعالیٰ کے غیب کا کسی پر ظہور نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسُولوں پر ہوتا ہے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ بعض پیشگوئیاں باریک اسرار اپنے اندر رکھتی ہیں اور دقیق امور کی وجہ سے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ جو دُور بین آنکھیں نہیں رکھتے اور موٹی موٹی باتوں کو صرف سمجھ سکتے ہیں۔ ایسی ہی پیشگوئیوں پر عموماً تکذیب ہوتی ہے اور جلد باز اور شتاب کار کہہ اُٹھتے ہیں کہ وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا۔ (یوسف : ۱۱۱) ان پیشگوئیوں میں لوگ شبہات پیدا کرتے ہیں مگر فی الحقیقت وہ پیشگوئیاں خدا تعالیٰ کی سُنن کے ماتحت پوری ہو جاتی ہیں؛ تاہم اگر وہ سمجھ میں نہ بھی آئیں تو مومن اور خدا ترس انسان کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان پیشگوئیوں پر نظر کرے جن میں دقائق نہیں۔ یعنی جو موٹی موٹی پیشگوئیاں ہیں۔ پھر دیکھے کہ وہ کس قدر تعداد میں پوری ہو چکی ہیں۔ یونہی مُنہ سے انکار کر دینا تقویٰ کے خلاف ہے۔ دیانت اور خدا ترسی سے ان پیشگوئیوں کو دیکھنا چاہیئے جو پوری ہو چکی ہیں۔ مگر جلد بازوں کا مُنہ کون بند کرے؟

اس قسم کے امور مجھے ہی پیش نہیں آتے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آتے۔ پھر اگر یہ امر مجھے بھی پیش آوے تو تعجب نہیں۔ بلکہ ضرور تھا کہ ایسا ہوتا کیونکہ سُنّت اللہ یہی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ مومن کے لیے تو ایک شہادت بھی کافی ہے۔ اسی سے اس کا دل کانپ

جاتا ہے مگر یہاں تو ایک نہیں صدہا نشان موجود ہیں بلکہ مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس قدر ہیں کہ مَیں انہیں گِن نہیں سکتا۔ یہ شہادت تھوڑی نہیں کہ دلوں کو فتح کرے گا۔ مکذّبوں کو موافق بنائے گا۔ اگر کوئی خدا تعالیٰ کا خوف کرے اور دل میں دیانت اور دُور اندیشی سے سوچے تو اسے بے اختیار ہو کر ماننا پڑے گا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔

پھر یہ بھی ظاہر بات ہے کہ مخالف جب تک ردّ نہ کرے اور اس کی نظیر پیش نہ کرے خدا تعالیٰ کی حجت غالب ہے۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ مَیں اسی خدا کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھے بھیجا ہے اور باوجود اس شر اور طوفان کے جو مجھ پر اُٹھا اور جس کی جڑ اور ابتداء اسی شہر سے اُٹھی اور پھر دلّی تک پہنچی۔ مگر اس نے تمام طوفانوں اور ابتلاؤں میں مجھے صحیح سالم اور کامیاب نکالا اور مجھے ایسی حالت میں اس شہر میں لایا کہ تین لاکھ سے زیادہ زن و مرد میرے مبائعین میں داخل ہیں اور کوئی مہینہ نہیں گذرتا جس میں دو ہزار چار ہزار اور بعض اوقات پانچ پانچ ہزار اس سلسلہ میں داخل نہ ہوتے ہوں۔

پھر اس خدا نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی کہ جب قوم ہی دشمن ہو گئی۔ جب کسی شخص کی دشمن اس کی قوم ہی ہو جاوے تو وہ بڑا بیکس اور بڑا بے دست و پا ہوتا ہے کیونکہ قوم ہی تو دست و پا اور جوارح ہوتی ہے۔ وہی اُس کی مدد کرتی ہے۔ دُوسرے لوگ تو دشمن ہوتے ہی ہیں کہ ہمارے مذہب پر حملہ کرتا ہے۔ لیکن جب اپنی قوم بھی دشمن ہو تو پھر بچ جانا اور کامیاب ہو جانا معمولی بات نہیں بلکہ یہ ایک زبردست نشان ہے۔

قرآنِ کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میرا عقیدہ ہے

مَیں نہایت افسوس اور دردِ دل سے یہ بات کہتا ہوں کہ قوم نے میری مخالفت میں نہ صرف جلدی کی بلکہ بہت ہی بے دردی بھی کی۔ صرف ایک مسئلہ وفاتِ مسیح کا اختلاف تھا جس کو میں قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت، صحابہؓ کے اجماع اور عقلی دلائل اور کتبِ سابقہ سے ثابت کرتا تھا اور کرتا ہوں اور حنفی مذہب کے موافق نقل، حدیث، قیاس، دلائلِ شرعیہ میرے ساتھ تھیں مگر ان لوگوں نے قبل اس کے کہ وہ پورے طور پر مجھ سے پوچھ لیتے اور میرے دلائل کو سُن لیتے، اس مسئلہ کی مخالفت میں یہانتک غلوّ کیا کہ مجھے کافر ٹھہرایا گیا اور اس کے ساتھ اَور بھی جو چاہا کہا اور میرے ذمہ لگایا۔ دیانت، نکوکاری اور تقویٰ کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے مجھ سے پوچھ لیتے۔ اگر مَیں قال اللہ اور قال الرسول سے تجاوز کرتا تو پھر بیشک

انہیں اختیار اور حق تھا کہ وہ مجھے جو چاہتے کہتے، دجّال، کذّاب وغیرہ۔ لیکن جبکہ میں ابتداء سے بیان کرتا آیا ہوں کہ میں قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے ذرا اِدھر اُدھر ہونا بے ایمانی سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ یہی ہے کہ جو اس کو ذرا بھی چھوڑے گا وہ جہنمی ہے۔ پھر اس عقیدہ کو نہ صرف تقریروں میں بلکہ ساٹھ کے قریب اپنی تصنیفات میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور دن رات مجھے یہی فکر اور خیال رہتا ہے۔ پھر اگر یہ مخالف خدا تعالیٰ سے ڈرتے تو کیا ان کا فرض نہ تھا کہ فلاں بات خارج از اسلام کی ہے اسکی کیا وجہ ہے یا اس کا تم کیا جواب دیتے ہو۔ مگر نہیں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی سُنا اور کافر کہہ دیا۔ میں نہایت تعجب سے ان کی اس حرکت کو دیکھتا ہوں کیونکہ اوّل تو حیات وفاتِ مسیح کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو اسلام میں داخل ہونے کے لیے شرط ہو۔ یہاں بھی ہندو یا عیسائی مسلمان ہوتے ہیں مگر بتاؤ کہ کیا اس سے یہ اقرار بھی لیتے ہو؟ بجز اس کے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ جبکہ یہ مسئلہ اسلام کی جزو نہیں پھر بھی مجھ پر وفاتِ مسیح کے اعلان سے اس قدر تشدّد کیوں کیا گیا کہ یہ کافر ہیں، دجّال ہیں۔ ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جاوے۔ ان کے مال لُوٹ لینے جائز ہیں اور ان کی عورتوں کو بغیر نکاح گھر میں رکھ لینا دُرست ہے۔ ان کو قتل کر دینا ثواب کا کام ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک تو وہ زمانہ تھا کہ یہی مولوی شور مچاتے تھے کہ اگر ننانوے وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ اسلام کی ہو تب بھی کفر کا فتویٰ نہ دینا چاہیئے، اس کو مسلمان ہی کہو مگر اب کیا ہوگیا۔ کیا میں اس سے بھی گیا گذرا ہوگیا؟ کیا میں اور میری جماعت اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ نہیں پڑھتی؟ کیا میں نمازیں نہیں پڑھتا؟ یا میرے مرید نہیں پڑھتے؟ کیا ہم رمضان کے روزے نہیں رکھتے؟ اور کیا ہم ان تمام عقائد کے پابند نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی صورت میں تلقین کئے ہیں؟ میں سچ کہتا ہوں اور خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اور میری جماعت مسلمان ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم پر اسی طرح ایمان لاتی ہے جس طرح پر ایک سچے مسلمان کو لانا چاہیئے۔ میں ایک ذرہ بھی اسلام سے باہر قدم رکھنا ہلاکت کا موجب یقین کرتا ہوں اور میرا یہی مذہب ہے کہ جس قدر فیوض اور برکات کوئی شخص حاصل کر سکتا ہے اور جس قدر تقرب الی اللہ پا سکتا ہے وہ صرف صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سچی اطاعت اور کامل محبت سے پا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ آپ کے سوا اب کوئی راہ نیکی کی نہیں۔

عقیدہ حیاتِ مسیحؑ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے

ہاں یہ بھی سچ ہے کہ میں ہرگز یقین نہیں کرتا کہ مسیح علیہ السلام اسی جسم کے ساتھ زندہ آسمان پر گئے ہوں اور اب تک زندہ قائم ہوں۔ اس لیے کہ اس مسئلہ کو ماننے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین اور بے حرمتی ہوتی ہے۔ میں ایک لحظہ کے لیے بھی اس بے ادبی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسیٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور مدینہ طیبہ میں آپؐ کا روضہ موجود ہے۔ ہر سال وہاں ہزاروں لاکھوں حاجی بھی جاتے ہیں۔ اب اگر مسیح علیہ السلام کی نسبت موت کا یقین کرنا یا موت کو ان کی طرف منسوب کرنا بے ادبی ہے تو پھر میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ گستاخی اور بے ادبی کیوں یقین کر لی جاتی ہے؟ مگر تم بڑی خوشی سے کہہ دیتے ہو کہ آپؐ نے وفات پائی۔ مولود خواں بڑی خوش الحانی سے واقعاتِ وفات کو ذکر کرتے ہیں۔ اور کفار کے مقابلہ میں بھی تم بڑی کشادہ پیشانی سے تسلیم کر لیتے ہو کہ آپؐ نے وفات پائی۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات پر کیا پتھر پڑتا ہے کہ نیلی پیلی آنکھیں کر لیتے ہو۔ ہمیں بھی رنج نہ ہوتا کہ اگر تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی وفات کا لفظ سُن کر ایسے آنسو بہاتے، مگر افسوس تو یہ ہے کہ خاتم النبیین اور سرورِ دوعالم کی نسبت تو تم بڑی خوشی سے موت تسلیم کر لو اور اس شخص کی نسبت جو اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جُوتی کا تسمہ کھولنے کے بھی قابل نہیں بتاتا، زندہ یقین کرتے ہو اور اس کی نسبت موت کا لفظ مُنہ سے نکالا اور تمہیں غضب آجاتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتک زندہ رہتے تو ہرج نہ تھا اس لیے کہ آپؐ وہ عظیم الشان ہدایت لیکر آئے تھے جسکی نظیر دُنیا میں پائی نہیں جاتی۔ اور آپؐ نے وہ عملی حالتیں دکھائیں کہ آدمؑ سے لے کر اس وقت تک کوئی ان کا نمونہ اور نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ میں تم کو سچ سچ کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی جس قدر ضرورت دنیا اور مسلمانوں کو تھی۔ اس قدر ضرورت مسیح کے وجود کی نہیں تھی۔ پھر آپؐ کا وجود باجُود وہ مُبارک وجود ہے کہ جب آپؐ نے وفات پائی تو صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ وہ دیوانے ہو گئے۔ یہانتک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار میان سے نکال لی اور کہا کہ اگر کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مُردہ کہے گا تو میں اس کا سَر جُدا کر دُوں گا۔ اس جوش کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک خاص نُور اور فراست عطا کی۔ انہوں نے سب کو اکٹھا کیا اور خطبہ پڑھا۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (اٰل عمران:۱۴۵) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسُول ہیں اور آپؐ سے پیشتر جس قدر رسُول آئے وہ سب

وفات پا چکے۔ اب آپ غور کریں اور سوچ کر بتائیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر یہ آیت کیوں پڑھی تھی؟ اور اس سے آپ کا کیا مقصد اور منشاء تھا؟ اور پھر ایسی حالت میں کہ کل صحابہؓ موجود تھے۔ میں یقیناً کہتا ہوں اور آپ انکار نہیں کر سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے صحابہؓ کے دل پر سخت صدمہ تھا اور اس کو بے وقت اور قبل از وقت سمجھتے تھے۔ وہ پسند نہیں کر سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سُنیں۔ ایسی حالت اور صورت میں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ جیسا جلیل القدر صحابیؓ اس جوش کی حالت میں ہو ان کا غصہ فرو نہیں ہو سکتا؛ بجز اس کے کہ یہ آیت ان کی تسلی کا موجب ہوتی۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا یا یہ یقین ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہ تو زندہ ہی مر جاتے۔ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق تھے اور آپ کی حیات کے سوا کسی اور کی حیات کو گوارا ہی نہ کر سکتے تھے۔ پھر کیونکر اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کو وفات یافتہ دیکھتے اور مسیح کو زندہ یقین کرتے یعنی جب حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ پڑھا تو ان کا جوش فرو ہو گیا۔ اس وقت صحابہؓ مدینہ کی گلیوں میں یہ آیت پڑھتے پھرتے تھے۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ گویا یہ آیت آج ہی اُتری ہے۔ اس وقت حسان بن ثابت نے ایک مرثیہ لکھا جس میں انہوں نے کہا۔

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

چونکہ مذکورہ بالا آیت نے بتا دیا تھا کہ سب مر گئے۔ اس لیے حسان نے بھی کہہ دیا کہ اب کسی کی موت کی پروا نہیں۔ یقیناً سمجھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی کی زندگی صحابہؓ پر سخت شاق تھی اور وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر یہ پہلا اجماع تھا جو دُنیا میں ہوا۔ اور اس حضرت مسیحؑ کی وفات کا بھی کُل فیصلہ ہو چکا تھا۔

مَیں بار بار اس امر پر اس لیے زور دیتا ہوں کہ یہ دلیل بڑی ہی زبردست دلیل ہے جس سے مسیحؑ کی وفات ثابت ہوتی ہے۔ آنحضرت کی وفات کوئی معمولی اور چھوٹا امر نہ تھا جس کا صدمہ صحابہؓ کو نہ ہوا ہو۔ ایک گاؤں کا نمبردار یا محلہ دار یا گھر کا کوئی عمدہ آدمی مر جاوے تو گھر والوں یا محلہ والوں یا دیہات والوں کو صدمہ ہوتا ہے۔ پھر وہ نبی جو کُل دُنیا کے لیے آیا تھا اور رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ہو کر آیا تھا جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۸) اور پھر دُوسری جگہ فرمایا۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (الاعراف: ۱۵۹) پھر وہ نبی جس نے صدق اور وفا کا نمونہ دکھایا۔ اور وہ کمالات دکھائے کہ جن کی نظیر نظر نہیں آتی۔ وہ

فوت ہو جائے اسکے ان جان نثار متبعین پر اثر نہ پڑے جنھوں نے اس کی خاطر جانیں دے دینے سے دریغ نہ کیا۔ جنھوں نے وطن کو چھوڑا۔ خویش و اقارب چھوڑے اور اس کے لیے ہر قسم کی تکلیفوں اور مشکلات کو اپنے لیے راحتِ جان سمجھا۔ ایک ذرا سے فکر اور توجہ سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس قدر بھی دُکھ اور تکلیف انہیں اس خیال کے تصور سے ہو سکتا ہے اس کا اندازہ اور قیاس ہم نہیں کر سکتے۔ ان کی تسلّی اور تسکین کا موجب یہی آیت تھی کہ جو حضرت ابوبکرؓ نے پڑھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے ایسے نازک وقت میں صحابہؓ کو سنبھالا۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض نادان اپنی جلد بازی اور شتاب کاری کی وجہ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت تو بیشک حضرت ابوبکرؓ نے پڑھی لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے باہر رہ جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ایسے نادانوں کو میں کیا کہوں۔ وہ باوجود مولوی کہلانے کے ایسی بیہودہ باتیں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ نہیں بتاتے کہ اس آیت میں کونسا لفظ ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو الگ کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تو کوئی امر قابلِ بحث اس میں چھوڑا ہی نہیں۔ قَدْ خَلَتْ کے معنے خود ہی کر دیئے۔ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ (آل عمران : ۱۴۵) اگر کوئی تیسری شق بھی اس کے سوا ہوتی تو کیوں نہ کہہ دیتا۔ اَوْ رُفِعَ بِجَسَدِهِ الْعُنْصُرِيِّ إِلَى السَّمَآءِ۔ کیا خدا تعالیٰ اس کو بھول گیا تھا جو یہ یاد دلاتے ہیں؟ نعوذ باللہ من ذالک۔

اگر صرف یہی آیت ہوتی تب بھی کافی تھی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو انہیں ایسی محبوب اور پیاری تھی کہ اب تک آپ کی وفات کا ذکر کر کے یہ لوگ بھی روتے ہیں۔ پھر صحابہؓ کے لیے تو اور بھی درد اور رقت اس وقت پیدا ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک مومن وہی ہوتا ہے جو آپ کی اتباع کرتا ہے اور وہی کسی مقام پر پہنچتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ، ۳۲) یعنی کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب بنالے۔ اب محبت کا تقاضا تو یہ ہے۔ کہ محبوب کے فعل کے ساتھ خاص موانست ہو اور مرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے۔ آپ نے مر کر دکھا دیا۔ پھر کون ہے جو زندہ رہے یا زندہ رہنے کی آرزو کرے؟ یا کسی اور کے لیے تجویز کرے کہ وہ زندہ رہے؟

محبت کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپؐ کی اتباع میں ایسا گُم ہو کہ اپنے جذباتِ نفس کو تھام لے اور یہ سوچ لے کہ میں کسی کی اُمت ہوں۔ ایسی صورت میں جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ ابتک زندہ ہیں وہ کیونکر آپ کی محبت اور اتباع کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ اس لیے کہ آپؐ

کی نسبت وہ گوارا کرتا ہے کہ مسیحؑ کو افضل قرار دیا جاوے اور آپؐ کو مُردہ کہا جاوے مگر اس کے لیے وہ پسند کرتا ہے کہ زندہ یقین کیا جاوے[1]؟

حیاتِ مسیحؑ کے عقیدہ کے نقصانات

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہتے تو ایک فرد بھی کافر نہ رہتا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زندگی نے کیا نتیجہ دکھایا؛ بجز اس کے کہ چالیس کروڑ عیسائی ہیں۔ غور کر کے دیکھو کہ کیا تم نے اس زندگی کے اعتقاد کو آزما نہیں لیا؟ اور نتیجہ خطرناک نہیں ہوا؟ مُسلمانوں کی کسی ایک قوم کا نام لو جس میں سے کوئی عیسائی نہ ہوا ہو۔ مگر مَیں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح بات ہے کہ ہر طبقہ کے مُسلمان عیسائی ہو چکے ہیں اور ایک لاکھ سے بھی ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔ عیسائیوں کے ہاتھ میں مُسلمانوں کو عیسائی بنانے کے واسطے ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ یہی زندگی کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ خصوصیت کسی دُوسرے میں ثابت کرو۔ اگر وُہ خدا نہیں تو پھر کیوں اُسے یہ خصُوصیت دی گئی؟ وہ حیّ و قیّوم ہے (نعوذ باللہ من ذالک)

اس حیات کے مسئلہ نے ان کو دلیر کر دیا اور اُنہوں نے مُسلمانوں پر وہ حملہ کیا جس کا نتیجہ مَیں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اب اس کے مقابل پر اگر تم پادریوں پر یہ ثابت کر دو کہ مسیح مر گیا ہے تو اسکا نتیجہ کیا ہوگا؟ مَیں نے بڑے بڑے پادریوں سے پُوچھا ہے۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ مسیح مر گیا ہے تو ہمارا مذہب زندہ نہیں رہ سکتا۔

ایک اَور غور طلب بات یہ ہے کہ مسیح کی زندگی کے اعتقاد کا آپ لوگوں نے تجربہ کیا۔ اب ذرا اس کی موت کا بھی تجربہ کرو اور دیکھو کہ عیسائی مذہب پر اس اعتقاد سے کیا زد پڑتی ہے۔ جہاں کوئی میرا مُرید عیسائیوں سے اس مضمون پر گفتگو کرنے کو کھڑا ہوتا ہے وہ فوراً انکار کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس راہ سے ان کی ہلاکت قریب ہے۔ موت کے مسئلہ سے نہ اُن کا کفارہ ثابت ہو سکتا ہے اور نہ ان کی اُلوہیت اور ابنیت۔ پس اس مسئلہ کا تھوڑے دنوں تک تجربہ کرو۔ پھر خود حقیقت کھُل جاوے گی۔

مسئلہ وفاتِ مسیح، غلبۂ اسلام اور کسرِ صلیب کا حربہ

سُنو! قرآن شریف اور احادیث میں یہ وعدہ تھا کہ اسلام پھیل جاوے گا اور وُہ دُوسرے ادیان پر غالب آجائے گا اور کسرِ صلیب ہوگی۔ اب غور طلب امر یہ ہے

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۲ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۱۷؍ستمبر ۱۹۰۶ء

کہ دُنیا تو جائے اسباب ہے۔ ایک شخص بیمار ہو تو اس میں تو شک نہیں کہ شفا تو اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ادویات میں خواص بھی اسی نے رکھ دئیے ہیں۔ جب کوئی دوا دی جاتی ہے تو وہ فائدہ کرتی ہے۔ پیاس لگتی ہے تو اس کے بجھانے والا تو خُدا ہے مگر اس کے لیے پانی بھی اسی نے مقرر کیا ہے۔ اسی طرح پر بھوک لگتی ہے تو اس کو دُور کرنے والا تو وہی ہے مگر غذا بھی اسی نے مقرر کی ہے۔ اسی طرح پر غلبۂ اسلام اور کسرِ صلیب تو ہوگا جو اس نے مقدر کیا ہے لیکن اس کے لیے اس نے اسباب مقرر کئے ہیں اور ایک قانون مقرر کیا ہے؛ چنانچہ بالاتفاق یہ امر قرآن مجید اور احادیث کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں جب عیسائیت کا غلبہ ہوگا۔ اس وقت مسیح موعود کے ہاتھ پر اسلام کا غلبہ ہوگا اور وہ کُل ادیان اور ملتوں پر اسلام کو غالب کر کے دکھا دے گا۔ اور دجّال کو قتل کرے گا اور صلیب کو توڑ دے گا اور وہ زمانہ آخری زمانہ ہوگا۔ نواب صدیق حسن خاں اور دُوسرے بزرگوں نے جنھوں نے آخری زمانہ کے متعلق کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ اب اس پیشگوئی کے پورا ہونے کے لیے بھی تو کوئی سبب اور ذریعہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ وہ اسباب سے کام لیتا ہے۔ دواؤں سے شفا دیتا ہے اور اغذیہ اور پانی سے بھوک پیاس کو دُور کرتا ہے۔ اسی طرح پر اب جبکہ عیسائی مذہب کا غلبہ ہو گیا ہے اور ہر طبقہ کے مُسلمان اس گروہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ اسلام کو اپنے وعدہ کے موافق غالب کرے اس کے لیے بہرحال کوئی ذریعہ اور سبب ہوگا اور وہ یہی موتِ مسیح کا حربہ ہے۔

اس حربہ سے صلیبی مذہب پر موت وارد ہوگی اور ان کی کمریں ٹوٹ جاویں گی۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اب عیسائی غلطیوں کے دُور کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر کیا سبب ہو سکتا ہے کہ مسیح کی وفات ثابت کی جاوے۔ اپنے گھروں میں اس امر پر غور کریں اور تنہائی میں بستروں پر لیٹ کر سوچیں۔ مخالفت کی حالت میں تو جوش آتا ہے۔ سعید الفطرت آدمی پھر سوچ لیتا ہے۔ دہلی میں جب مَیں نے تقریر کی تھی تو سعید الفطرت انسانوں نے تسلیم کر لیا اور وہیں بول اُٹھے کہ بیشک حضرت عیسٰیؑ کا پرستش کا ستون ان کی زندگی ہے۔ جب تک یہ نہ ٹوٹے اسلام کے لیے دروازہ نہیں کھُلتا بلکہ عیسائیت کو اس سے مدد ملتی ہے۔ جو ان کی زندگی سے پیار کرتے ہیں انہیں سوچنا چاہیئے کہ دو گواہوں کے ذریعہ سے پھانسی مل جاتی ہے مگر یہاں اس قدر شواہد موجود ہیں اور وہ بدستور انکار کرتے جاتے ہیں - اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ (اٰل عمران : ۵۶) اور پھر حضرت مسیحؑ کا اپنا اقرار اسی قرآن مجید میں موجود ہے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ (المائدۃ:۱۱۸)

اور توَفّی کے معنے موت بھی قرآن مجید ہی سے ثابت ہے کیونکہ یہی لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی آیا ہے۔ جیساکہ فرمایا۔ وَ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُھُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ۔ (یونس ، ۴۷)۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کہا ہے جس کے معنے موت ہی ہیں۔ اور ایسا ہی حضرت یوسفؑ اور دُوسرے لوگوں کیلئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ پھر ایسی صورت میں اس کے کوئی اَور معنے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی زبردست شہادت مسیح کی وفات پر ہے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات میں حضرت عیسیٰؑ کو مُردوں میں دیکھا۔ حدیث معراج کا تو کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اسے کھول کر دیکھ لو کہ کیا اس میں حضرت عیسیٰؑ کا ذکر مُردوں کے ساتھ آیا ہے یا کسی اَور رنگ میں۔ جیسے آپؐ نے حضرت ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور دُوسرے انبیاء علیہم السلام کو دیکھا، اسی طرح حضرت عیسیٰ کو دیکھا ان میں کوئی خصوصیت اور امتیاز نہ تھا۔ اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ اور دُوسرے انبیاء علیہم السلام وفات پاچکے ہیں اور قابض الارواح نے ان کو دُوسرے عالم میں پہنچادیا ہے۔ پھر ان میں ایک شخص زندہ بجسدہ العنصری کیسے چلا گیا؟ یہ شہادتیں تھوڑی نہیں ہیں۔ ایک سچے مسلمان کے لیے کافی ہیں۔

پھر دُوسری احادیث میں حضرت عیسیٰؑ کی عمر ایک سو بیس یا ایک سَو پچیس برس کی قرار دی ہے۔ ان سب امور پر ایک جائی نظر کرنے کے بعد یہ امر تقویٰ کے خلاف تھا کہ جھٹ پٹ یہ فیصلہ کردیا جاتا کہ مسیح زندہ آسمان پر چلا گیا ہے اور پھر اس کی کوئی نظیر بھی نہیں۔ عقل بھی یہی تجویز کرتی تھی۔ مگر افسوس ان لوگوں نے ذرا بھی خیال نہ کیا اور خدا ترسی سے کام نہ لے کر فوراً مجھے دجّال کہدیا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ کیا یہ تھوڑی سی بات تھی؟ افسوس۔

پھر جب کوئی عذر نہیں بن سکتا تو کہتے ہیں۔ درمیانی زمانہ میں اجماع ہوچکا۔ مَیں کہتا ہوں کب؟ اصل اجماع تو صحابہؓ کا اجماع تھا۔ اگر اس کے بعد اجماع ہوا ہے تو اب ان مختلف فرقوں کو اکٹھا کرکے دکھاؤ۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط بات ہے مسیح کی زندگی پر کبھی اجماع نہیں ہوا۔ انہوں نے کتابوں کو نہیں پڑھا ورنہ انہیں معلوم ہوجاتا کہ صُوفی موت کے قائل ہیں اور وہ ان کی دوبارہ آمد بروزی رنگ میں مانتے ہیں۔

غرض جیسے مَیں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی ہے۔ ویسے ہی مَیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہوں کہ آپؐ ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے اور آپؐ ہی کے فیضان اور برکات کا نتیجہ ہے جو یہ نصرتیں ہو رہی ہیں۔ مَیں کھول کر کہتا ہوں اور یہی میرا عقیدہ اور مذہب ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور نقشِ قدم پر چلنے کے بغیر انسان کوئی رُوحانی فیض اور فضل حاصل نہیں کرسکتا۔

حکومت کی امن پسندی، عدل اور مذہبی آزادی کی تعریف

پھر اس کے ساتھ ہی ایک اُور امر قابلِ ذکر ہے۔ اگر مَیں اس کا بیان نہ کروں تو ناشکری ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسی سلطنت اور حکومت میں پیدا کیا ہے جو ہر طرح سے اَمن دیتی ہے اور جس نے ہم کو اپنے مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے پوری آزادی دی ہے اور ہر قسم کے سامان اس مُبارک عہد میں ہمیں میسّر ہیں۔ اس سے بڑھ کر اَور کیا آزادی ہوگی کہ ہم عیسائی مذہب کی تردید زور شور سے کرتے ہیں اور کوئی نہیں پُوچھتا۔ مگر اس سے پہلے ایک زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے دیکھنے والے بھی اب تک موجود ہیں۔ اس وقت یہ حالت تھی کہ کوئی مُسلمان اپنی مسجدوں میں اذان تک نہیں کہہ سکتا تھا۔ اَور باتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور حلال چیزوں کے کھانے سے روکا جاتا تھا۔ کوئی باقاعدہ تحقیقات نہ ہوتی تھی مگر یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ ہم ایک ایسی سلطنت کے نیچے ہیں جو ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ یعنی سلطنت انگریزی جو امن پسند ہے۔ جس کو مذاہب کے اختلاف سے کوئی اعتراض نہیں۔ جس کا قانون ہے کہ ہر اہلِ مذہب آزادی سے اپنے فرض ادا کرے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ ہماری تبلیغ ہر جگہ پہنچ جاوے۔ اسلیئے اس نے ہمکو اس سلطنت میں پیدا کیا۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نوشیرواں کے عہدِ سلطنت پر فخر کرتے تھے۔ اسی طرح پر ہم کو اس سلطنت پر فخر ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ مامُور چونکہ عدل اور راستی لاتا ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ وہ مامُور ہو کر آئے۔ عدل اور راستی کا اجراء ہونے لگتا ہے۔ مَیں یقین رکھتا ہوں کہ اس رومی سلطنت سے جو مسیح کے زمانہ میں تھی یہ سلطنت بمراتب اَولیٰ اور افضل ہے اگرچہ اِس کا اور اُس کا قانون مِلتا جُلتا ہے لیکن انصاف یہی ہے کہ اس سلطنت کے قانون کسی سے دَبے ہوئے نہیں ہیں اور مقابلہ سے دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ رُومی سلطنت میں وحشیانہ حِصّہ ضرور پایا جاوے گا لیکن یہ بُزدلی تھی کہ یہودیوں کے خوف سے خدا کے پاک اور برگزیدہ بندے مسیح کو حوالات دیا گیا۔ اس قسم کا مقدمہ مجھ پر بھی ہوا تھا۔ مسیح علیہ السلام کے خلاف تو یہودیوں نے مقدمہ کیا تھا مگر اس سلطنت میں میرے خلاف جس نے مقدمہ کیا وہ معزّز پادری تھا اور ڈاکٹر بھی تھا یعنی ڈاکٹر مارٹن کلارک تھا جس نے مجھ پر اقدامِ قتل کا مقدمہ بنایا اور اُس نے شہادت پُوری بہم پہنچائی۔ یہانتک کہ مولوی ابوسعید محمد حسین بٹالوی بھی جو اس سلسلہ کا سخت دشمن ہے، شہادت دینے کے واسطے عدالت میں آیا اور جہانتک اس سے ہو

ہو سکا اس نے میرے خلاف شہادت دی اور پورے طور پر مقدمہ میرے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ مقدمہ کپتان ڈگلس ڈپٹی کمشنر گورداسپور کے اجلاس میں تھا جو شاید اب شملہ میں ہے[1]۔

ان کے رُوبرُو مقدمہ پُورے طور پر مرتب ہو گیا اور تمام شہادتیں میرے خلاف بڑے زور شور سے دی گئیں۔ ایسی حالت اور صورت میں کوئی قانون دان اہل الرائے بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مَیں بَری ہو سکتا ہوں۔ تقاضائے وقت اور صورتیں ایسی واقع ہو چکی تھیں کہ مجھے سیشن سپرد کر دیا جاتا اور وہاں سے پھانسی کا حکم ملتا یا عبورِ دریائے شور کی سزا دی جاتی۔ مگر خدا تعالیٰ نے جیسے مقدمہ سے پہلے مجھے اطلاع دی تھی اسی طرح یہ بھی قبل از وقت ظاہر کر دیا تھا کہ مَیں اس میں بَری ہوں گا چنانچہ یہ پیشگوئی میری جماعت کے ایک گروہِ کثیر کو معلوم تھی۔ غرض جب مقدمہ اس مرحلہ پر پہنچا اور دشمنوں اور مخالفوں کا یہ خیال ہو گیا کہ اب مجھے مجسٹریٹ سیشن سپُرد کرے گا۔ اس موقعہ پر اس نے کپتان پولیس سے کہا کہ میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ یہ مقدمہ بناوٹی ہے۔ میرا دل اس کو نہیں مانتا کہ فی الواقعہ ایسی کوشش کی گئی ہو اور انہوں نے ڈاکٹر کلارک کے قتل کے لیے آدمی بھیجا ہو۔ آپ اس کی پھر تفتیش کریں۔ یہ وہ وقت تھا کہ میرے مخالف میرے خلاف ہر قسم کے منصوبوں ہی میں نہ لگے ہوئے تھے بلکہ وہ لوگ جن کو قبولیتِ دُعا کے دعوے تھے، وہ دعاؤں میں لگے ہوئے تھے اور رو رو کر دُعائیں کرتے تھے کہ مَیں سزایاب ہو جاؤں مگر خدا تعالیٰ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کپتان ڈگلس صاحب کے پاس بعض سفارشیں بھی آئیں۔ مگر وہ ایک انصاف پسند مجسٹریٹ تھا۔ اس نے کہا کہ ہم سے ایسی بدذاتی نہیں ہو سکتی۔

غرض جب مقدمہ دوبارہ تفتیش کے لیے کپتان لیمارچنڈ کے سپرد کیا گیا تو کپتان صاحب نے عبدالحمید کو بلایا اور اس کو کہا کہ تو سچ سچ بیان کر۔ عبدالحمید نے اس پر بھی وہی قصہ جو اس نے صاحب ڈپٹی کمشنر کے روبرُو بیان کیا تھا، دوہرایا۔ اس کو پہلے سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر ذرا بھی خلاف بیانی ہوگی تو تُو پکڑا جاوے گا۔ اس لیے وہ وہی کہتا گیا مگر کپتان صاحب نے اس کو کہا کہ تُو تو پہلے بھی یہی بیان کر چکا ہے۔ صاحب اس سے تسلی نہیں پاتے کیونکہ تُو سچ سچ بیان نہیں کرتا۔ جب دوبارہ کپتان لیمارچنڈ نے اس کو کہا تو وہ روتا ہوا ان کے پاؤں پر گر پڑا۔ اور کہنے لگا کہ مجھے بچا لو۔ کپتان صاحب نے اس کو تسلی دی اور کہا کہ ہاں بیان کرو۔ اس پر اس نے اصلیت کھول دی اور صاف اقرار کیا کہ مجھے دھمکا کر یہ بیان

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۳ صفحہ ۴-۵ مورخہ ۲۴؍ ستمبر ۱۹۰۶ء

کرایا گیا تھا۔ مجھے ہرگز ہرگز مرزا صاحب نے قتل کے لیے نہیں بھیجا۔ کپتان اس بیان کو سُنکر بہت خوش ہوا۔ اور اس نے ڈپٹی کمشنر کو تار دیا کہ ہم نے مقدمہ نکال لیا ہے؛ چنانچہ پھر گورداسپور کے مقام پر یہ مقدمہ پیش ہوا اور وہاں کپتان لیمارچنڈ کو حلف دیا گیا اور اس نے اپنا حلفی بیان لکھوایا۔ مَیں دیکھتا تھا کہ ڈپٹی کمشنر اصلیت کے کُھل جانے پر بڑا خوش تھا اور ان عیسائیوں پر اسے سخت غصہ تھا جنہوں نے میرے خلاف جھُوٹی گواہیاں دی تھیں۔ اس نے مجھے کہا کہ آپ ان عیسائیوں پر مقدمہ کر سکتے ہیں۔ مگر چونکہ میں مقدمہ بازی سے متنفر ہوں۔ مَیں نے یہی کہا کہ مَیں مقدمہ نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مقدمہ آسمان پر دائر ہے۔ اس پر اسی وقت ڈگلس صاحب نے فیصلہ لکھا۔ ایک مجمع کثیر اس دن جمع ہو گیا ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ سناتے وقت مجھے کہا کہ آپ کو مبارک ہو۔ آپ بَری ہوتے۔

اب بتاؤ کہ یہ کیسی خوبی اس سلطنت کی ہے کہ عدل اور انصاف کے لیے نہ اپنے مذہب کے ایک سرگروہ کی پروا کی اور نہ کسی اَور بات کی۔ مَیں دیکھتا تھا کہ اس وقت تو میری دشمن ایک دُنیا تھی اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب دُنیا دُکھ دینے پر آتی ہے تو دَر و دیوار نیش زنی کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہی ہوتا ہے جو اپنے صادق بندوں کو بچا لیتا ہے۔

پھر مسٹر ڈوئی کے سامنے ایک مقدمہ ہوا۔ پھر ٹیکس کا مقدمہ مجھ پر بنایا گیا۔ مگر ان تمام مقدمات میں خدا تعالیٰ نے مجھے بَری ٹھہرایا۔ پھر آخر کرم دین کا مقدمہ ہوا۔ اس مقدمہ میں میری مخالفت میں سارا زور لگایا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ بس اب اس سلسلہ کا خاتمہ ہے اور حقیقت میں اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ سلسلہ نہ ہوتا اور وہی اس کی تائید اور نصرت کے لیے کھڑا نہ ہوتا تو اس کے مِٹنے میں کوئی شک و شبہ ہی نہ رہا تھا۔ مُلک کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک کرم دین کی حمایت کی گئی اور ہر طرح سے اس کو مدد دی گئی یہانتک کہ اس مقدمہ میں بعض نے مولوی کہلا کر میرے خلاف وہ گواہیاں دیں جو سراسر خلاف تھیں اور یہانتک بیان کیا کہ زانی ہو، فاسق ہو، فاجر ہو پھر بھی وہ متقی ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ ایک لمبے عرصہ تک ہوتا رہا۔ اس اثنا میں بہت سے نشانات ظاہر ہوئے۔ آخر مجسٹریٹ نے جو ہندو تھا مجھ پر پانچسو روپیہ جرمانہ کر دیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے پہلے سے یہ اطلاع دی ہوئی تھی "عدالتِ عالیہ نے اس کو بَری کر دیا۔" اس لیے جب وہ اپیل ڈویژنل جج کے سامنے پیش ہوا تو خداداد فراست سے انہوں نے فوراً ہی مقدمہ کی حقیقت کو سمجھ لیا اور قرار دیا کہ کرم دین کے حق میں مَیں نے جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل درست تھا یعنی مجھے اس کے لکھنے کا حق حاصل تھا؛ چنانچہ اس نے جو فیصلہ لکھا ہے وہ شائع ہو چکا ہے۔ آخر اس نے مجھے بَری ٹھہرایا اور جرمانہ واپس کیا اور ابتدائی عدالت کو بھی مناسب تنبیہہ کی کہ

کیوں اتنی دیر تک یہ مقدمہ رکھا گیا۔

غرض جب کوئی موقعہ میرے مخالفوں کو ملا ہے انہوں نے میرے کچل دینے اور ہلاک کر دینے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مجھے ہر آگ سے بچایا۔ اسی طرح جس طرح پر وہ اپنے رسولوں کو بچاتا آیا ہے۔ میں ان واقعات کو مدِنظر رکھ کر بڑے زور سے کہتا ہوں کہ یہ گورنمنٹ بمراتب اس رومی گورنمنٹ سے بہتر ہے جس کے زمانہ میں مسیح کو دُکھ دیا گیا۔ پیلاطوس گورنر جس کے روبُرو پہلے مقدمہ پیش ہوا وہ دراصل مسیح کا مُرید تھا اور اس کی بیوی بھی مُرید تھی اسی وجہ سے اُس نے مسیح کے خُون سے ہاتھ دھوتے مگر باوجود اس کے کہ وہ مُرید تھا اور گورنر تھا اس نے اس جرأت سے کام نہ لیا جو کپتان ڈگلس نے دکھائی۔ وہاں بھی مسیح بے گناہ تھا اور یہاں بھی مَیں بیگناہ تھا۔

مَیں سچ کہتا ہوں اور تجربہ سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو حق کے لیے ایک جرأت دی ہے پس مَیں اس جگہ پر تمام مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ ان پر فرض ہے کہ وہ سچّے دل سے گورنمنٹ کی اطاعت کریں۔

یہ بخوبی یاد رکھو کہ جو شخص اپنے محسن انسان کا شُکر گذار نہیں ہوتا، وہ خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کر سکتا۔ جس قدر آسائش اور آرام اس زمانہ میں حاصل ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ریل، تار، ڈاک خانہ، پولیس وغیرہ کے انتظام کو دیکھو کہ کس قدر فوائد ان سے پہنچتے ہیں۔ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے بتاؤ۔ کیا ایسا آرام و آسانی تھی؟ پھر خود ہی انصاف کرو۔ جب ہم پر ہزاروں احسان ہیں تو ہم کیونکر شکر نہ کریں۔

مسئلہ جہاد کی وضاحت

اکثر مُسلمان مجھ پر حملہ کرتے ہیں کہ تمہارے سلسلہ میں یہ عیب ہے کہ تم جہاد کو موقوف کرتے ہو۔ افسوس ہے کہ وہ نادان اس کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں۔ وہ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرتے ہیں۔ آپؐ نے کبھی اشاعتِ مذہب کے لیے تلوار نہیں اُٹھائی۔ جب آپؐ پر اور آپؐ کی جماعت پر مخالفوں کے ظلُم انتہا تک پہنچ گئے اور آپؐ کے مخلص خدّام میں سے مَردوں اور عورتوں کو شہید کر دیا گیا اور پھر مدینہ تک آپؐ کا تعاقب کیا گیا۔ اُس وقت مقابلہ کا حکم مِلا۔ آپؐ نے تلوار نہیں اُٹھائی مگر دشمنوں نے تلوار اٹھائی۔ بعض اوقات آپؐ کو ظالم طبع کفار نے سر سے پاؤں تک خون آلود کر دیا تھا مگر آپؐ نے مقابلہ نہیں کیا۔ خوب یاد رکھو کہ اگر تلوار اسلام کا فرض ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں اُٹھاتے۔ مگر نہیں، وہ تلوار جس کا ذکر ہے وہ اس وقت اُٹھی، جب

موذی کفار نے مدینہ تک تعاقب کیا۔

اُس وقت مخالفین کے ہاتھ میں تلوار تھی مگر اب تلوار نہیں اور میرے خلاف جھوٹی مخبریوں اور فتووں سے کام لیا جاتا ہے اور اسلام کے خلاف صرف قلم سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر قلم کا جواب تلوار سے دینے والا احمق اور ظالم ہوگا یا کچھ اور؟

اس بات کو مت بھولو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے کفار کے حد سے گذرے ہوئے ظلم و ستم پر تلوار اُٹھائی اور وہ حفاظتِ خود اختیاری تھی جو ہر مہذّب گورنمنٹ کے قانون میں بھی جُرم نہیں۔ تعزیراتِ ہند میں بھی حفاظتِ خود اختیاری کو جائز رکھا ہے۔ اگر ایک چور گھر میں گھُس آوے اور وہ حملہ کرکے مار ڈالنا چاہے۔ اس وقت اس چور کو بچاؤ کے لیے مار ڈالنا جُرم نہیں ہے[1]

پس جب حالت یہاں تک پہنچی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کے جان نثار خدّام شہید کر دیئے گئے اور مُسلمان ضعیف عورتوں تک کو نہایت سنگدلی اور بے حیائی کے ساتھ شہید کیا گیا تو کیا حق نہ تھا کہ ان کو سزا دی جاتی۔ اس وقت اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ اسلام کا نام و نشان نہ رہے تو البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ تلوار کا نام نہ آتا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ اسلام دُنیا میں پھیلے اور دنیا کی نجات کا ذریعہ ہو۔ اس لیے اس وقت محض مدافعت کے لیے تلوار اٹھائی گئی۔ مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اسلام کا اس وقت تلوار اُٹھانا کسی قانون، مذہب اور اخلاق کی رُو سے قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرتا۔ وہ لوگ جو ایک گال پر طمانچہ کھا کر دُوسری پھیر دینے کی تعلیم دیتے ہیں وہ بھی صبر نہیں کر سکتے اور جن کے ہاں کیڑے کا مارنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے، وہ بھی نہیں کر سکتے۔ پھر اسلام پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے؟

اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا

مَیں یہ بھی کھول کر کہتا ہوں کہ جو جاہل مسلمان کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے۔ وہ نبیّ معصوم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر افترا کرتے ہیں اور اسلام کی ہتک کرتے ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ اسلام ہمیشہ اپنی پاک تعلیم اور ہدایت اور اس کے ثمرات، انوار و برکات اور معجزات سے پھیلا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کے عظیم الشان نشانات آپؐ کے اخلاق کی پاک تاثیرات نے اُسے پھیلایا ہے اور وہ نشانات اور تاثیرات ختم نہیں ہوگئی ہیں۔ بلکہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں تازہ بتازہ موجود

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۴ صفحہ ۳ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۶ء

رہتی ہیں اور یہی وجہ ہے جو مَیں کہتا ہوں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم زندہ نبی ہیں۔ اس لیے کہ آپؐ کی تعلیمات اور ہدایات ہمیشہ اپنے ثمرات دیتی رہتی ہیں اور آئندہ جب اسلام ترقی کرے گا تو اس کی یہی راہ ہوگی نہ کوئی اَور۔ پس جب اسلام کی اشاعت کے لیے کبھی تلوار نہیں اُٹھائی گئی تو اس وقت ایسا خیال بھی کرنا گناہ ہے، کیونکہ اب تو سب کے سب اَمن سے بیٹھے ہوتے ہیں اور اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے کافی ذریعے اور سامان موجود ہیں۔

مجھے بڑے ہی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عیسائیوں اور دُوسرے معترضین نے اسلام پر حملے کرتے وقت ہرگز ہرگز اصلیت پر غور نہیں کیا۔ وہ دیکھتے کہ اس وقت تمام مخالف اسلام اور مُسلمانوں کے استیصال کے دَرپے تھے اور سب کے سب مِل کر اس کے خلاف منصوبے کرتے اور مُسلمانوں کو دُکھ دیتے تھے۔ ان دکھوں اور تکلیفوں کے مقابلہ میں اگر وہ اپنی جان نہ بچاتے تو کیا کرتے۔ قرآن شریف میں یہ آیت موجود ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا۔ (الحج : ۴۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا گیا جبکہ مسلمانوں پر ظلم کی حد ہوگئی، تو انہیں مقابلہ کا حکم دیا گیا۔ اس وقت کی یہ اجازت تھی۔ دُوسرے وقت کے لیے یہ حکم نہ تھا؛ چنانچہ مسیح موعود کے لیے یہ نشان قرار دیا گیا۔ یَضَعُ الْحَرْبَ۔ اب تو اس کی سچائی کا نشان ہے کہ وہ لڑائی نہ کرے گا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس زمانہ میں مخالفوں نے بھی مذہبی لڑائیاں چھوڑ دیں۔ ہاں اس مقابلہ نے ایک اَور صورت اَور رنگ اختیار کرلیا ہے اور وہ یہ ہے کہ قلم سے کام لے کر اسلام پر اعتراض کر رہے ہیں۔ عیسائی ہیں کہ ان کا ایک ایک پرچہ پچاس پچاس ہزار نکلتا ہے اور ہر طرح کوشش کرتے ہیں کہ لوگ اسلام سے بیزار ہو جائیں۔ پس اس مقابلہ کے لیے ہمیں قلم سے کام لینا چاہیئے یا تیر چلانے چاہئیں؟ اس وقت تو اگر کوئی ایسا خیال کرے تو اس سے بڑھ کر احمق اور اسلام کا دشمن کون ہوگا؟ اس قسم کا نام لینا اسلام کو بدنام کرنا ہے یا کچھ اَور؟ جب ہمارے مخالف اس قسم کی سعی نہیں کرتے حالانکہ وہ حق پر نہیں تو پھر کیسا تعجب اور افسوس ہوگا کہ اگر ہم حق پر ہو کر تلوار کا نام لیں۔ اس وقت تم کسی کو تلوار دکھا کر کہو کہ مسلمان ہو جا ورنہ قتل کر دُوں گا۔ پھر دیکھو نتیجہ کیا ہوگا؟ وہ پولیس میں گرفتار کرا کے تلوار کا مزہ چکھا دے گا۔

یہ خیالات سراسر بیہودہ ہیں۔ ان کو سروں سے نکال دینا چاہیئے۔ اب وقت آیا ہے کہ اسلام کا روشن اور درخشاں چہرہ دکھایا جاوے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ تمام اعتراضوں کو دُور کر دیا جاوے۔ اور جو اسلام کے نورانی چہرہ پر داغ لگایا گیا ہے اسے دُور کرکے دکھایا جاوے۔ مَیں یہ بھی افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے جو موقعہ خدا تعالیٰ نے دیا ہے اور عیسائی مذہب کے اسلام

میں داخل کرنے کے لیے جو راستہ کھولا گیا تھا اُسے ہی بُری نظر سے دیکھا اور اس کا کُفر کیا۔

مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں صادق ہوں

مَیں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ پُورے طور پر اس طریق کو پیش کیا ہے جو اسلام کو کامیاب اور دوسرے مذاہب پر غالب کرنے والا ہے۔ میرے رسائل امریکہ اور یورپ میں جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس قوم کو جو فراست دی ہے انہوں نے اس خداداد فراست سے اس امر کو سمجھ لیا ہے لیکن جب ایک مسلمان کے سامنے مَیں اسے پیش کرتا ہوں تو اُسکے مُنہ میں جھاگ آجاتی ہے گویا وہ دیوانہ ہے یا قتل کرنا چاہتا ہے، حالانکہ قرآن شریف کی تعلیم تو یہی تھی اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۵) یہ تعلیم اس لیے تھی کہ اگر دشمن بھی ہو تو وہ اس نرمی اور حُسنِ سلوک سے دوست بن جاوے اور ان باتوں کو آرام اور سکون کے ساتھ سُن لے۔ مَیں اللہ جلشانہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں اس کی طرف سے ہوں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ مَیں مفتری نہیں، کذّاب نہیں۔ اگر تم مجھے خدا تعالیٰ کی قسم پر بھی اور ان نشانات کو بھی جو اُس نے میری تائید میں ظاہر کئے، دیکھ کر مجھے کذّاب اور مفتری کہتے ہو تو پھر مَیں تمہیں خدا تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ کسی ایسے مفتری کی نظیر پیش کرو کہ باوجود اس کے ہر روز افتراء اور کذب کے جو وہ اللہ تعالیٰ پر کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی تائید اور نصرت کرتا جاوے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اسے ہلاک کرے، مگر یہاں اس کے برخلاف معاملہ ہے۔ مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں صادق ہوں۔ اس کی طرف سے آیا ہوں۔ مگر مجھے کذّاب اور مفتری کہا جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ ہر مقدمہ اور ہر بلا میں جو قوم میرے خلاف پیدا کرتی ہے، مجھے نصرت دیتا ہے اور اس سے مجھے بچاتا ہے اور پھر ایسی نصرت کی کہ لاکھوں انسانوں کے دل میں میرے لیے محبت ڈال دی۔ مَیں اس پر اپنی سچائی کو حصر کرتا ہوں۔ اگر تم کسی ایسے مفتری کا نشان دے دو کہ وہ کذّاب ہو اور اللہ تعالیٰ پر اس نے افتراء کیا ہو اور پھر خدا تعالےٰ نے اس کی ایسی نصرتیں کی ہوں اور اس قدر عرصہ تک اُسے زندہ رکھا ہو۔ اور اس کی مُرادوں کو پُورا کیا ہو۔ دکھاؤ۔

یقیناً سمجھو کہ خدا تعالےٰ کے مُرسل ان نشانات اور تائیدات سے شناخت کیے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ اُن کے لیے دکھاتا اور ان کی نصرت کرتا ہے۔ مَیں اپنے قول میں سچّا ہوں اور خدا تعالےٰ جو دلوں کو دیکھتا ہے وہ میرے دل کے حالات سے واقف اور خبردار ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں کہہ سکتے جو آلِ فرعون کے ایک آدمی نے کہا تھا۔ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ (المومن: ۲۹) کیا تم یہ یقین نہیں کرتے کہ اللہ تعالےٰ

جھوٹوں کا سب سے زیادہ دشمن ہے تم سب مل کر جو مجھ پر حملہ کرو۔ خدا تعالیٰ کا غضب اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ پھر اس کے غضب سے کون بچا سکتا ہے۔

وعیدی پیشگوئی ٹل سکتی ہے

یہ آیت جو مَیں نے پڑھی ہے اس میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وعید کی پیشگوئیاں بعض پوری کر دے گا۔ کُل نہیں کہا۔ اس میں حکمت کیا ہے؟ حکمت یہی ہے کہ وعید کی پیشگوئیاں مشروط ہوتی ہیں وہ توبہ، استغفار اور رجوع الی الحق سے ٹل بھی جایا کرتی ہیں۔

پیشگوئی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وعدہ کی جیسے فرمایا۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (النور:۵۶) اہلِ سنّت مانتے ہیں کہ اس قسم کی پیشگوئیوں میں تخلف نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کریم ہے۔ لیکن وعید کی پیشگوئیوں میں وہ ڈرا کر بخش بھی دیتا ہے اس لیے کہ وہ رحیم ہے۔ بڑا نادان اور اسلام سے دُور پڑا ہوا ہے وہ شخص جو کہتا ہے وعید کی سب پیشگوئیاں پُوری ہوتی ہیں۔ وہ قرآن کریم کو چھوڑتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم تو کہتا ہے۔ يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ (المومن: ۲۹)۔

افسوس ہے بہت سے لوگ مولوی کہلاتے ہیں مگر انہیں نہ قرآن کی خبر ہے نہ حدیث کی۔ نہ سُنّتِ انبیاء کی۔ صرف بغض کی جھاگ ہوتی ہے اس لیے وہ دھوکہ دیتے ہیں۔ یاد رکھو اَلْكَرِيْمُ اِذَا وَعَدَ وَفٰى۔ رحیم کا تقاضا یہی ہے کہ قابلِ سزا ٹھہرا کر معاف کر دیتا ہے اور یہ تو انسان کی بھی فطرت میں ہے کہ وہ معاف کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے سامنے ایک شخص نے بناوٹی شہادت دی۔ اس پر جُرم ثابت تھا۔ وہ مقدمہ ایک انگریز کے پاس تھا۔ اسے اتفاقاً چِٹھی آگئی کہ کسی دُور دراز جگہ پر اس کی تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہ غمگین ہوا۔ جو مجرم تھا وہ بوڑھا آدمی تھا۔ منشی سے کہا کہ یہ تو قید خانہ ہی میں مر جاوے گا اس نے بھی کہا کہ حضور بال بچہ دار ہے۔ اس پر وہ انگریز بولا کہ اب مثل مرتب ہوچکی ہے اب کیا ہوسکتا ہے۔ پھر کہا کہ اچھا اس مثل کو چاک کر دو۔ اب غور کرو کہ انگریز کو تو رحم آسکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو نہیں آتا؟

پھر اس بات پر بھی غور کرو کہ صدقہ اور خیرات کیوں جاری ہے اور ہر قوم میں اس کا رواج ہے۔ فطرتاً انسان مصیبت اور بَلا کے وقت صدقہ دینا چاہتا ہے اور خیرات کرتا ہے اور کہتے ہیں کہ بکرے دو۔ کپڑے دو۔ یہ دو وہ دو۔ اگر اس کے ذریعہ سے ردِّ بَلا نہیں ہوتا تو پھر اضطراراً انسان کیوں ایسا کرتا ہے؟ نہیں ردِّ بلا ہوتا ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کے اتفاق سے یہ ثابت ہے اور مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا مذہب نہیں بلکہ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا بھی یہ مذہب ہے۔ اور میری

سمجھ میں روئے زمین پر کوئی اس امر کا منکر ہی نہیں۔ جبکہ یہ بات تو صاف کھُل گیا کہ وہ ارادۂ الٰہی ٹل جاتا ہے۔

پیشگوئی اور ارادہ الٰہی میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ پیشگوئی کی اطلاع نبی کو دی جاتی ہے اور ارادۂ الٰہی پر کسی کو اطلاع نہیں ہوتی اور وہ مخفی رہتا ہے۔ اگر وہی ارادہ الٰہی نبی کی معرفت ظاہر کر دیا جاتا تو وہ پیشگوئی ہوتی۔ اگر پیشگوئی نہیں ٹل سکتی تو پھر ارادۂ الٰہی بھی صدقہ خیرات سے نہیں ٹل سکتا۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ چونکہ وعید کی پیشگوئیاں ٹل جاتی ہیں۔ اس لیے فرمایا: وَاِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ۔ (المومن: ۲۹)۔

اب اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتا ہے کہ بعض پیشگوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بھی ٹل گئیں۔ اگر میری کسی ایسی پیشگوئی پر ایسا اعتراض کیا جاتا ہے تو مجھے اس کا جواب دو۔ اگر اس امر میں میری تکذیب کرو گے تو میری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرنے والے ٹھہرو گے۔ میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ کُل اہلسنت جماعت اور کُل دُنیا کا مسلّم مسئلہ ہے کہ تضرّع سے عذاب کا وعدہ ٹل جایا کرتا ہے۔ کیا حضرت یُونس علیہ السلام کی نظیر بھی تمہیں بھُول گئی ہے؟ حضرت یُونس کی قوم سے جو عذاب ٹل گیا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ دُرّمنثور وغیرہ کو دیکھو اور بائبل میں یُونہ نبی کی کتاب موجود ہے۔ اس عذاب کا قطعی وعدہ تھا، مگر یُونسؑ کی قوم نے عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ کی اور اس کی طرف رجُوع کیا۔ خدا تعالیٰ نے اس کو بخش دیا۔ اور عذاب ٹل گیا۔ ادھر حضرت یُونس یوم مقررہ پر عذاب کے منتظر تھے۔ لوگوں سے خبریں پوچھتے تھے۔ ایک زمیندار سے پوچھا کہ نینوہ کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ اچھا حال ہے تو حضرت یُونسؑ پر بہت غم طاری ہوا۔ اور انہوں نے کہا لَنْ اَرْجِعَ اِلٰی قَوْمِیْ كَذَّابًا۔ یعنی میں اپنی قوم کی طرف کذّاب کہلا کر نہیں جاؤں گا۔ اب اس نظیر کے ہوتے ہوئے اور قرآن شریف کی زبردست شہادت کی موجودگی میں میری کسی ایسی پیشگوئی پر جو پہلے ہی سے شرطی تھی، اعتراض کرنا تقویٰ کے خلاف ہے۔ متقی کی یہ شان نہیں کہ بغیر سوچے سمجھے مُنہ سے بات نکال دے اور تکذیب کو آمادہ ہو جاوے۔

حضرت یُونس کا قصہ نہایت دردناک اور عبرت بخش ہے۔ اور وہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ اسے غور سے پڑھو۔ یہانتک کہ وہ دریا میں گرائے گئے اور مچھلی کے پیٹ میں گئے تب توبہ منظور ہوئی۔ یہ سزا اور عتاب حضرت یُونسؑ پر کیوں ہوا؟ اس لیے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو قادر نہ سمجھا کہ وہ وعید کو ٹال دیتا ہے۔ پھر تم لوگ کیوں میرے متعلق جلدی کرتے ہو؟ اور میری تکذیب کے لیے ساری نبوتوں کو جھٹلاتے ہو؟

خونی مہدی کا عقیدہ یاد رکھو خدا تعالیٰ کا نام غفُور ہے۔ پھر کیوں وہ رجُوع کرنے والوں کو

معاف نہ کرے۔ اس قسم کی غلطیاں ہیں جو قوم میں واقع ہوگئی ہیں۔ انہیں غلطیوں میں سے جہاد کی غلطی بھی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ جب میں کہتا ہوں کہ جہاد حرام ہے تو کالی پیلی آنکھیں نکال لیتے ہیں حالانکہ خود ہی مانتے ہیں کہ جو حدیثیں خونی مہدی کی ہیں وہ مخدوش ہیں۔ مولوی محمد حسین بٹالوی نے اس باب میں رسالے لکھے ہیں اور یہی مذہب میاں نذیر حسین دہلوی کا تھا۔ وہ ان کو قطعی صحیح نہیں سمجھتے۔ پھر مجھے کیوں کاذب کہا جاتا ہے۔ سچی بات یہی ہے کہ مسیح موعود اور مہدی کا کام یہی ہے کہ وہ لڑائیوں کے سلسلہ کو بند کرے گا۔ اور قلم، دُعا، توجہ سے اسلام کا بول بالا کرے گا۔ اور افسوس ہے کہ لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی اس لیے کہ جس قدر توجہ دنیا کی طرف ہے، دین کی طرف نہیں۔ دُنیا کی آلودگیوں اور ناپاکیوں میں مبتلا ہو کر یہ امید کیونکر کر سکتے ہیں کہ ان پر قرآن کریم کے معارف کھُلیں وہاں صاف لکھا ہے۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ (الواقعہ : ۸۰)

مسیح موعود کی بعثت کی علّتِ غائی

اس بات کو بھی دل سے سُنو کہ میرے مبعوث ہونے کی عِلّتِ غائی کیا ہے؟ میرے آنے کی غرض اور مقصود صرف اسلام کی تجدید اور تائید ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ کوئی نئی شریعت سکھاؤں یا نئے احکام دُوں یا کوئی نئی کتاب نازل ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے تو میرے نزدیک وہ سخت گمراہ اور بے دین ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شریعت اور نبوّت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب کوئی شریعت نہیں آسکتی۔ قرآن مجید خاتم الکتب ہے۔ اس میں اب ایک شعشہ یا نقطہ کی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات اور فیوضات اور قرآنِ شریف کی تعلیم اور ہدایت کے ثمرات کا خاتمہ نہیں ہوگیا۔ وہ ہر زمانہ میں تازہ بتازہ موجود ہیں اور انہیں فیوضات اور برکات کے ثبوت کے لیے خدا تعالیٰ نے مجھے کھڑا کیا ہے۔ اسلام کی جو حالت اس وقت ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ بالاتفاق مان لیا گیا ہے کہ ہر قسم کی کمزوریوں اور تنزّل کا نشانہ مسلمان ہو رہے ہیں۔ ہر پہلو سے وہ گِر رہے ہیں۔ ان کی زبان ساتھ ہے تو دل نہیں ہے اور اسلام یتیم ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے کہ میں اس کی حمایت اور سرپرستی کروں اور اپنے وعدہ کے موافق بھیجا ہے کیونکہ اس نے فرمایا تھا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر : ۱۰) اگر اس وقت اور حمایت اور نصرت اور حفاظت نہ کی جاتی تو وہ اَور کونسا وقت آئے گا۔ اب اس چودھویں صدی میں وہی حالت ہو رہی ہے جو بدر کے موقعہ پر ہوگئی تھی۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ۔ (آل عمران : ۱۲۴)

اس آیت میں بھی دراصل ایک پیشگوئی مرکوز تھی یعنی جب چودھویں صدی میں اسلام ضعیف اور ناتواں ہو جائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس وعدہ حفاظت کے موافق اس کی نصرت کرے گا۔ پھر تم کیوں تعجب کرتے ہو کہ اس نے اسلام کی نُصرت کی۔ مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میرا نام دجّال اور کذّاب رکھا جاتا ہے۔ اور مجھ پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں اس لیے کہ یہ ضرور تھا کہ میرے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو مجھ سے پہلے فرستادوں کے ساتھ ہوا تا مَیں بھی اس قدیم سنّت سے حِصّہ پاتا۔

مَیں نے ان مصائب اور شدائد کا کچھ بھی حِصّہ نہیں پایا لیکن جو مصیبتیں اور مشکلات ہمارے سیّد و مولا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں آئیں، اس کی نظیر انبیاء علیہم السّلام کے سلسلہ میں کسی کے لیے نہیں پائی جاتی آپؐ نے اسلام کی خاطر وہ دُکھ اٹھائے کہ قلم ان کے لکھنے اور زبان ان کے بیان سے عاجز ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کیسے جلیل الشّان اور اولوالعزم نبی تھے۔ اگر خدا تعالیٰ کی تائید اور نُصرت آپؐ کے ساتھ نہ ہوتی تو ان مشکلات کے پہاڑ کو اُٹھانا ناممکن ہو جاتا۔ اور اگر کوئی اَور نبی ہوتا تو وہ بھی رہ جاتا۔ مگر جس اسلام کو ایسی مصیبتوں اور دُکھوں کے ساتھ آپؐ نے پھیلایا تھا آج اس کا جو حال ہو گیا ہے وہ مَیں کیونکر کہوں؟

اسلام کی حقیقت اور تعلیم

اسلام کے معنے تو یہ تھے کہ انسان خدا تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں فنا ہو جاوے اور جس طرح پر ایک بکری کی گردن قصاب کے آگے ہوتی ہے اسی طرح پر مسلمان کی گردن خدا تعالیٰ کی اطاعت کے لیے رکھ دی جاوے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ خدا تعالیٰ ہی کو وحدہٗ لاشریک سمجھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اس وقت یہ توحید گُم ہو گئی تھی اور یہ دیش آریہ ورت بھی بُتوں سے بھرا ہوا تھا جیسا کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ ایسی حالت اور ایسے وقت میں ضرور تھا کہ آپ مبعوث ہوتے اس کا ہمرنگ یہ زمانہ بھی ہے جس میں بُت پرستی کے ساتھ انسان پرستی اور دہریت بھی پھیل گئی ہے اور اسلام کا اصل مقصد اور رُوح باقی نہیں رہی۔ اس کا مغز تو یہ تھا کہ خدا ہی کی محبت میں فنا ہو جانا اور اس کے سوا کسی کو معبود نہ سمجھنا اور مقصد یہ ہے کہ انسان رُو بخدا ہو جاوے رُو بدُنیا نہ رہے اور اس مقصد کے لیے اسلام نے اپنی تعلیم کے دو حِصّے کئے ہیں۔ اوّل حقوق اللہ، دوم حقوق العباد حق اللہ یہ ہے کہ اس کو واجب الاطاعت سمجھے اور حقوق العباد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق سے ہمدردی کریں۔ یہ طریق اچھا نہیں کہ صرف مخالفتِ مذہب کی وجہ سے کسی کو دُکھ دیں۔ ہمدردی اور سلوک الگ چیز ہے اور مخالفتِ مذہب دوسری شے۔ مسلمانوں کا وہ گروہ جو جہاد کی غلطی اور

غلط فہمی میں مبتلا ہیں انہوں نے یہ بھی جائز رکھا ہے کہ کفار کا مال ناجائز طور پر لینا بھی دُرست ہے خود میری نسبت بھی ان لوگوں نے فتویٰ دیا کہ ان کا مال لُوٹ لو بلکہ یہانتک بھی کہ ان کی بیویاں نکال لو، حالانکہ اسلام میں اس قسم کی ناپاک تعلیمیں نہ تھیں۔ وہ تو ایک صاف اور مصفیٰ مذہب تھا۔ اسلام کی مثال ہم یُوں دے سکتے ہیں کہ جیسے باپ اپنے حقوقِ ابوّت کو چاہتا ہے اسی طرح وہ چاہتا ہے کہ اولاد میں ایک دُوسرے کے ساتھ ہمدردی ہو۔ وہ نہیں چاہتا کہ ایک دُوسرے کو مارے۔ اسلام بھی جہاں یہ چاہتا ہے کہ خُدا تعالےٰ کا کوئی شریک نہ ہو، وہاں اس کا یہ بھی منشا ہے کہ نوعِ انسان میں مودّت اور وحدت ہو۔[1]

نماز میں جو جماعت کا زیادہ ثواب رکھا ہے اس میں یہی غرض ہے کہ وحدت پیدا ہوتی ہے اور پھر اس وحدت کو عملی رنگ میں لانے کی یہانتک ہدایت اور تاکید ہے کہ باہم پاؤں بھی مساوی ہوں اور صف سیدھی ہو اور ایک دُوسرے سے ملے ہوتے ہوں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ گویا ایک ہی انسان کا حکم رکھیں اور ایک کے انوار دُوسرے میں سرایت کر سکیں۔ وہ تمیز جس سے خودی اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے نہ رہے۔

یہ خوب یاد رکھو کہ انسان میں یہ قوت ہے کہ وُہ دوسرے کے انوار کو جذب کرتا ہے پھر اسی وحدت کے لیے حکم ہے کہ روزانہ نمازیں محلّہ کی مسجد میں اور ہفتہ کے بعد شہر کی مسجد میں اور پھر سال کے بعد عید گاہ میں جمع ہوں اور کُل زمین کے مسلمان سال میں ایک مرتبہ بیت اللہ میں اکٹھے ہوں۔ ان تمام احکام کی غرض وہی وحدت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حقوق کے دو ہی حِصّے رکھے ہیں۔ ایک حقوق اللہ دُوسرے حقوق العباد۔ اس پر بہت کچھ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ (البقرۃ : ۲۰۱) یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جس طرح پر تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اس جگہ دو رمز ہیں۔ ایک تو ذکر اللہ کو ذکر آباء سے مشابہت دی ہے اس میں یہ سر ہے کہ آباء کی محبت ذاتی اور فطری محبت ہوتی ہے۔ دیکھو بچہ کو جب ماں مارتی ہے وہ اس وقت بھی ماں ماں ہی پکارتا ہے۔ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی تعلیم دیتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے فطری محبت کا تعلق پیدا کرے۔ اس محبت کے بعد اطاعت امر اللہ کی خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ اصلی مقام معرفت کا ہے جہاں انسان کو پہنچنا چاہیئے۔ یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے فطری

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ صفحہ ۴-۵ مورخہ ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۰۶ء

اور ذاتی محبت پیدا ہو جاوے۔ ایک اَور مقام پر یوں فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی۔ (النحل : ۹۱) اس آیت میں ان تین مدارج کا ذکر کیا ہے جو انسان کو حاصل کرنے چاہئیں۔ پہلا مرتبہ عدل کا ہے اور عدل یہ ہے کہ انسان کسی سے کوئی نیکی کرے بشرطِ معاوضہ۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ ایسی نیکی کوئی اعلیٰ درجہ کی بات نہیں بلکہ سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عدل کرو اور اگر اس پر ترقی کرو تو پھر وہ احسان کا درجہ ہے یعنی بلا عوض سلوک کرو۔ لیکن یہ امر کہ جو بدی کرتا ہے اس سے نیکی کی جاوے، کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے دُوسری پھیر دی جاوے۔ یہ صحیح نہیں یا یہ کہو کہ عام طور پر یہ تعلیم عملدرآمد میں نہیں آسکتی؛ چنانچہ سعدی کہتا ہے ؎

نکوئی با بداں کردن چناں است
کہ بد کردن برائے نیک مرداں

اس لیے اسلام میں انتقامی حدود میں جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کوئی دوسرا مذہب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور وہ یہ ہے۔ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ (الشوریٰ : ۴۱) الآیۃ یعنی بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے اور جو معاف کر دے مگر ایسے محل اور مقام پر کہ وہ عفو اصلاح کا موجب ہو، اسلام نے عفو خطا کی تعلیم دی لیکن یہ نہیں کہ اس سے شر بڑھے۔

غرض عدل کے بعد دوسرا درجہ احسان کا ہے یعنی بغیر کسی معاوضہ کے سلوک کیا جاوے لیکن اس سلوک میں بھی ایک قسم کی خود غرضی ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی وقت انسان اس احسان یا نیکی کو جتا دیتا ہے اس لیے اس سے بھی بڑھ کر ایک تعلیم دی اور وہ ایتائے ذی القربیٰ کا درجہ ہے۔ ماں جو اپنے بچہ کیساتھ سلوک کرتی ہے وہ اس سے کسی معاوضہ اور انعام واکرام کی خواہشمند نہیں ہوتی۔ وہ اس کے ساتھ جو نیکی کرتی ہے محض طبعی محبت سے کرتی ہے۔ اگر بادشاہ اس کو حکم دے کہ تو اس کو دُودھ مت دے اور اگر یہ تیری غفلت سے مر بھی جاوے تو تجھے کوئی سزا نہیں دی جاوے گی بلکہ انعام دیا جاوے گا۔ اس صُورت میں وہ بادشاہ کا حُکم ماننے کو تیار نہ ہوگی بلکہ اسکو گالیاں دے گی کہ یہ میری اولاد کا دشمن ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ذاتی محبت سے کر رہی ہے، اس کی کوئی غرض درمیان نہیں۔ یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور یہ آیت حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں پر حاوی ہے حقوق اللہ کے پہلو کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انصاف کی رعایت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہاری پرورش کرتا ہے۔ اور جو اطاعتِ الٰہی میں اس مقام سے ترقی کرے تو احسان کی پابندی سے اطاعت کر کیونکہ وہ محسن ہے اور اس کے احسانات کو کوئی

شمار نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ محسن کے شمائل اور خصائل کو مدِ نظر رکھنے سے اس کے احسان تازہ رہتے ہیں، اس لیے احسان کا مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ ایسے طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ کہ اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ اس مقام تک انسان میں ایک حجاب رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جو تیسرا درجہ ہے ایتاء ذی القربیٰ کا یعنی اللہ تعالیٰ سے اسے ذاتی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور حقوق العباد کے پہلو سے مَیں اس کے معنے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی مَیں نے بیان کیا ہے کہ یہ تعلیم جو قرآن شریف نے دی ہے کسی اور کتاب نے نہیں دی اور ایسی کامل ہے کہ کوئی نظیر اس کی پیش نہیں کر سکتا یعنی جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا۔ الآیۃ (الشوریٰ: ۴۱) اس میں عفو کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ اس میں اصلاح ہو۔ یہودیوں کے مذہب نے تو یہ کہا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ ان میں انتقامی قوت اس قدر بڑھ گئی تھی اور یہانتک یہ عادت ان میں پختہ ہو گئی تھی کہ اگر باپ نے بدلہ نہیں لیا تو بیٹے اور اسکے پوتے تک کے فرائض میں یہ امر ہوتا تھا کہ وہ بدلہ لے۔ اس وجہ سے ان میں کینہ توزی کی عادت بڑھ گئی تھی اور وہ بہت سنگدل اور بے درد ہو چکے تھے۔ عیسائیوں نے اس تعلیم کے مقابل یہ تعلیم دی کہ ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسری بھی پھیر دو۔ ایک کوس بیگار لے جاوے تو دو کوس چلے جاؤ وغیرہ۔ اس تعلیم میں جو نقص ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ کہ اس پر عملدرآمد ہی نہیں ہو سکتا۔ اور عیسائی گورنمنٹوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ تعلیم ناقص ہے کیا یہ کسی عیسائی کی جرأت ہو سکتی ہے کہ کوئی خبیث طمانچہ مار کر دانت نکال دے تو وہ دوسری گال پھیر دے کہ ہاں اب دُوسرا دانت بھی نکال دو۔ وہ خبیث تو اور بھی دلیر ہو جائے گا اور اس سے امن عامہ میں خلل واقع ہوگا۔ پھر کیونکر ہم تسلیم کریں کہ یہ تعلیم عمدہ ہے یا خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہو سکتی ہے۔ اگر اس پر عمل ہو تو کسی مُلک کا بھی انتظام نہ ہو سکے۔ ایک مُلک ایک دشمن چھین لے تو دُوسرا خود حوالہ کرنا پڑے۔ ایک افسر گرفتار ہو جاوے تو دس اَور دے دیئے جاویں۔ یہ نقص ہیں جو ان تعلیموں میں ہیں اور یہ صحیح نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ احکام بطور قانون مختص الزمان تھے جب وہ زمانہ گذر گیا تو دوسرے لوگوں کے حسبِ حال وہ تعلیم نہ رہی۔ یہودیوں کا وہ زمانہ تھا کہ وہ چار سَو برس تک غلامی میں رہے۔ اور اس غلامی کی زندگی کی وجہ سے ان میں قساوتِ قلبی بڑھ گئی اور وہ کینہ کش ہو گئے۔ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس بادشاہ کے زمانہ میں کوئی ہوتا ہے اس کے اخلاق بھی اسی قسم کے ہو جاتے ہیں سکھوں کے زمانہ میں اکثر لوگ ڈاکو ہو گئے تھے۔ انگریزوں کے زمانہ میں تہذیب اور تعلیم پھیلتی جاتی ہے اور ہر شخص اس طرف کوشش کر رہا ہے۔ غرض بنی اسرائیل نے فرعون کی ماتحتی کی تھی، اسی

وجہ سے ان میں ظلم بڑھ گیا تھا۔ اس لیے توریت کے زمانہ میں عدل کی ضرورت مقدم تھی۔ کیونکہ وہ لوگ اس سے بے خبر تھے اور جابرانہ عادت رکھتے تھے اور انہوں نے یقین کر لیا تھا کہ دانت کے بدلے دانت کا توڑنا ضروری ہے اور یہ ہمارا فرض ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھایا کہ عدل تک ہی بات نہیں رہتی بلکہ احسان بھی ضروری ہے۔ اس سبب سے مسیحؑ کے ذریعہ انہیں یہ تعلیم دی گئی کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دُوسری پھیر دو۔ اور جب اسی پر سارا زور دیا گیا تو آخر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس تعلیم کو اصل نقطہ پر پہنچا دیا اور وہ یہی تعلیم تھی کہ بدی کا بدلہ اسی قدر بدی ہے لیکن جو شخص معاف کر دے اور معاف کرنے سے اصلاح ہوتی ہو۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور اجر ہے۔ عفو کی تعلیم دی ہے مگر ساتھ قید لگائی کہ اصلاح ہو۔ بے محل عفو نقصان پہنچاتا ہے۔ پس اس مقام پر غور کرنا چاہیئے کہ جب توقع اصلاح کی ہو تو عفو ہی کرنا چاہیئے۔ جیسے دو خدمتگار ہوں، ایک بڑا شریف الاصل اور فرمانبردار اور خیر خواہ ہو لیکن اتفاقاً اس سے کوئی غلطی ہو جاوے۔ اس موقعہ پر اس کو معاف کرنا ہی مناسب ہے۔ اگر سزا دی جاوے تو ٹھیک نہیں، لیکن ایک بدمعاش اور شریر ہے۔ ہر روز نقصان کرتا ہے اور شرارتوں سے باز نہیں آتا۔ اگر اسے چھوڑ دیا جاوے تو وہ اَور بھی بیباک ہو جائے گا۔ اس کو سزا ہی دینی چاہیے۔ غرض اس طرح پر محل اور موقع شناسی سے کام لو۔ یہ تعلیم ہے جو اسلام نے دی ہے اور جو کامل تعلیم ہے۔ اس کے بعد اَور کوئی نئی تعلیم یا شریعت نہیں آسکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں اور قرآن شریف خاتم الکتب۔ اب کوئی اَور کلمہ یا کوئی اَور نماز نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا کر کے دکھایا اور جو کچھ قرآن شریف میں ہے اس کو چھوڑ کر نجات نہیں مل سکتی۔ جو اس کو چھوڑے گا۔ وہ جہنّم میں جاوے گا۔ یہ ہمارا مذہب اور عقیدہ ہے۔

امّت کے لیے مکالمہ و مخاطبہ کا دروازہ کھلا ہے

مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس امت کے لیے مخاطبات اور مکالمات کا دروازہ کھُلا ہے اور یہ دروازہ گویا قرآن مجید کی سچائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر ہر وقت تازہ شہادت ہے اور اس کے لیے خدا تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ ہی میں یہ دعا سکھائی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ:۶،۷) اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی راہ کے لیے جو دُعا سکھائی تو اس میں انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے حصول کا اشارہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو کمال دیا گیا وہ معرفت الٰہی ہی کا کمال تھا۔ اور یہ نعمت ان کو مکالمات اور مخاطبات سے ملی تھی۔ اسی کے تم بھی خواہاں ہو۔ پس اس نعمت کے لیے یہ خیال کرو کہ قرآن

شریف اس دُعا کی تو ہدایت کرتا ہے مگر اس کا ثمرہ کچھ بھی نہیں یا اس اُمّت کے کسی فرد کو بھی یہ شرف نہیں مل سکتا اور قیامت تک یہ دروازہ بند ہوگیا ہے۔ بتاؤ اس سے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک ثابت ہوگی یا کوئی خوبی ثابت ہوگی؟ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے وہ اسلام کو بدنام کرتا ہے اور اس نے مغزِ شریعت کو سمجھا ہی نہیں۔ اسلام کے مقاصد میں سے تو یہ امر تھا کہ انسان صرف زبان ہی سے وحدہٗ لاشریک نہ کہے بلکہ درحقیقت سمجھ لے اور بہشت دوزخ پر خیالی ایمان نہ ہو بلکہ فی الحقیقت اسی زندگی میں وہ بہشتی کیفیات پر اطلاع پالے اور ان گناہوں سے جن میں یہ وحشی انسان مبتلا ہیں نجات پالے۔ یہ عظیم الشان مقصد انسان کا تھا اور ہے اور یہ ایسا پاک مطہر مقصد ہے کہ کوئی دوسری قوم اس کی نظیر اپنے مذہب میں پیش نہیں کر سکتی اور نہ اس کا نمونہ دکھا سکتی ہے۔ کہنے کو تو ہر ایک کہہ سکتا ہے مگر وہ کون ہے جو دکھا سکتا ہو؟

مَیں نے آریوں سے عیسائیوں سے پوچھا ہے کہ وُہ خدا جو تم مانتے ہو اس کا کوئی ثبوت پیش کرو۔ نری زبانی لاف گزاف سے بڑھ کر وہ کچھ بھی نہیں دکھا سکتے۔ وہ سچا خُدا جو قرآن شریف نے پیش کیا ہے اس سے یہ لوگ ناواقف ہیں۔ اس پر اطلاع پانے کے لیے یہی ایک ذریعہ مکالمات کا تھا جس کے سبب سے اسلام دُوسرے مذاہب سے ممتاز تھا۔ مگر افسوس ان مسلمانوں نے میری مخالفت کی وجہ سے اس سے بھی انکار کر دیا۔

یقیناً یاد رکھو کہ گناہوں سے بچنے کی توفیق اس وقت مل سکتی ہے جب انسان پورے طور پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لاوے۔ یہی بڑا مقصد انسانی زندگی کا ہے کہ گناہ کے پنجہ سے نجات پالے۔ دیکھو ایک سانپ جو خوشنما معلوم ہوتا ہے بچہ تو اس کو ہاتھ میں پکڑنے کی خواہش کر سکتا ہے اور ہاتھ بھی ڈال سکتا ہے لیکن ایک عقلمند جو جانتا ہے کہ سانپ کاٹ کھائے گا اور ہلاک کر دے گا وہ کبھی جرأت نہیں کرے گا کہ اس کی طرف لپکے۔ بلکہ اگر معلوم ہو جاوے کہ کسی مکان میں سانپ ہے تو اس میں بھی داخل نہیں ہوگا۔ ایسا ہی زہر کو جو ہلاک کرنے والی چیز سمجھتا ہے تو اُسے کھانے پر وہ دلیر نہیں ہوگا۔ پس اسی طرح پر جبتک گناہ کو خطرناک زہر یقین نہ کرے۔ اس سے بچ نہیں سکتا۔ یہ یقین معرفت کے بدوں پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ کیا بات ہے کہ انسان گناہوں پر اس قدر دلیر ہو جاتا ہے باوجودیکہ وہ خدا تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور گناہ کو گناہ بھی سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ معرفت اور بصیرت نہیں رکھتا جو گناہ سوز فطرت پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ بات پیدا نہیں ہوتی تو پھر اقرار کرنا پڑے گا کہ معاذ اللہ اسلام اپنے اصلی مقصد سے خالی ہے لیکن مَیں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں۔ یہ

مقصدِ اسلام ہی کامل طور پر پورا کرتا ہے اور اس کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ مکالمات اور مخاطباتِ الٰہیہ کیونکہ اسی سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر کامل یقین پیدا ہوتا ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ گناہ سے بیزار ہے اور وہ سزا دیتا ہے۔ گناہ ایک زہر ہے جو اوّل صغیرہ سے شروع ہوتا ہے اور پھر کبیرہ ہو جاتا ہے اور انجام کار کُفر تک پہنچا دیتا ہے۔

گناہ سے بچنے کا صحیح علاج

مَیں جملہ معترضہ کے طور پر کہتا ہوں کہ اپنی اپنی جگہ ہر قوم کو فکر لگا ہوا ہے کہ ہم گناہ سے پاک ہو جاویں مثلاً آریہ صاحبان نے تو یہ بات رکھی ہوئی ہے کہ بجُز گناہ کی سزا کے اَور کوئی صُورت پاک ہونے کی ہے ہی نہیں۔ ایک گناہ کے بدلے کئی لاکھ جُونیں ہیں جبتک انسان ان جُونوں کو نہ بھگت لے وہ پاک ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں بڑی مشکلات ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جبکہ تمام مخلوقات گناہ گار ہی ہے تو اس سے نجات کب ہوگی؟ اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اُن کے ہاں یہ امر مسلّمہ ہے کہ نجات یافتہ بھی ایک عرصہ کے بعد مکتی خانہ سے نکال دیئے جاویں گے تو پھر اس نجات سے فائدہ ہی کیا ہوا؟ جب یہ سوال کیا جاوے کہ نجات پانے کے بعد کیوں نکالتے ہو تو بعض کہتے ہیں کہ نکالنے کے لیے ایک گناہ باقی رکھ لیا جاتا ہے۔ اب غور کرکے بتاؤ کہ کیا یہ قادر خدا کا کام ہو سکتا ہے؟ اور پھر جبکہ ہر نفس اپنے نفس کا خود خالق ہے۔ خدا تعالیٰ اس کا خالق ہی نہیں (معاذ اللہ) تو اُسے حاجت ہی کیا ہے کہ وہ اس کا ماتحت رہے۔

دُوسرا پہلو عیسائیوں کا ہے انہوں نے گناہ سے پاک ہونے کا ایک پہلو سوچا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا اور خدا کا بیٹا مان لو اور پھر یقین کر لو کہ اس نے ہمارے گناہ اٹھا لیے اور وہ صلیب کے ذریعہ لعنتی ہوا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اب غور کرو کہ حصولِ نجات کو اس طریق سے کیا تعلق؟ گناہوں سے بچانے کے لیے ایک اَور بڑا گناہ تجویز کیا کہ انسان کو خدا بنایا گیا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اَور گناہ ہو سکتا ہے؟ پھر خدا بنا کر اُسے معًا ملعون بھی قرار دیا۔ اس سے بڑھ کر گُستاخی اور بے ادبی اللہ تعالیٰ کی کیا ہوگی؟ ایک کھاتا پیتا حوائج کا محتاج خدا بنا لیا گیا؛ حالانکہ توریت میں لکھا تھا کہ دوسرا خُدا نہ ہو۔ نہ آسمان پر نہ زمین پر۔ پھر دروازوں اور چوکھٹوں پر یہ تعلیم لکھی گئی تھی۔ اس کو چھوڑ کر یہ نیا خدا تراشا گیا جس کا کچھ بھی پتہ توریت میں نہیں ملتا۔

مَیں نے فاضل یہودی سے پُوچھا کہ کیا تمہارے ہاں ایسے خدا کا پتہ ہے جو مریم کے پیٹ سے نکلے اور وہ یہودیوں کے ہاتھوں سے ماریں کھاتا پھرے۔ اس پر یہودی علماء نے مجھے یہی

جواب دیا کہ یہ محض افترا ہے۔ توریت سے کسی ایسے خدا کا پتہ نہیں ملتا۔ ہمارا وہ خدا ہے جو قرآن شریف کا خدا ہے۔ یعنی جس طرح پر قرآن مجید نے خدا تعالیٰ کی وحدت کی اطلاع دی ہے اسی طرح پر ہم توریت کی رُو سے خدا تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں اور کسی انسان کو خدا نہیں مان سکتے۔ اور یہ تو موٹی بات ہے کہ اگر یہودیوں کے ہاں کسی ایسے خدا کی خبر دی گئی ہوتی۔ جو عورت کے پیٹ سے ہونے والا تھا تو وہ حضرت مسیحؑ کی ایسی سخت مخالفت ہی کیوں کرتے یہانتک کہ انہوں نے اس کو صلیب پر چڑھوا دیا۔ اور ان پر کفر کہنے کا الزام لگاتے تھے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس امر کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔

غرض عیسائیوں نے گناہ کے دُور کرنے کا جو علاج تجویز کیا ہے وہ ایسا علاج ہے جو بجائے خود گناہ کو پیدا کرتا ہے اور اس کو گناہ سے نجات پانے کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے[1]۔ انہوں نے گناہ کے دُور کرنے کا علاج گناہ تجویز کیا ہے جو کسی حالت اور صورت میں مناسب نہیں۔ یہ لوگ اپنے نادان دوست ہیں۔ اور ان کی مثال اس بندر کی سی ہے جس نے اپنے آقا کا خون کر دیا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لیے اور گناہوں سے نجات پانے کے لیے ایک ایسا گناہ تجویز کیا جو کسی صورت میں بخشا نہ جاوے یعنی شرک کیا اور عاجز انسان کو خدا بنا لیا۔ مسلمانوں کے لیے کس قدر خوشی کا مقام ہے کہ ان کا خدا ایسا خدا نہیں جس پر کوئی اعتراض یا حملہ ہو سکے۔ وہ اس کی طاقتوں اور قدرتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی صفات پر یقین لاتے ہیں۔ مگر جنہوں نے انسان کو خدا بنایا یا جنہوں نے اس کی قدرتوں سے انکار کر دیا، ان کے لیے خدا کا عدم و وجود برابر ہے۔ جیسے مثلاً آریوں کا مذہب ہے کہ ذرہ ذرہ اپنے وجود کا آپ ہی خدا ہے اور اس نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا۔ اب بتاؤ کہ جب ذرات کے وجود کا خالق خدا نہیں تو اس کے قیام کے لیے خدا کی حاجت کیا ہے جبکہ طاقتیں خود بخود موجود ہیں اور اُن میں اتصال اور انفصال کی قوتیں بھی موجود ہیں تو پھر انصاف سے بتاؤ کہ ان کیلئے خدا کے وجود کی کیا ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس عقیدہ کے رکھنے والے آریوں اور دہریوں میں انیس۱۹ اور بیس۲۰ کا فرق ہے اب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو کامل اور زندہ مذہب ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ پھر اسلام کی عظمت شوکت ظاہر ہو۔ اور اسی مقصد کو لے کر میں آیا ہوں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ جو انوار و برکات اس وقت آسمان سے اُتر رہے ہیں، وہ ان کی قدر

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۷ صفحہ ۳-۴ مورخہ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۵ء

کریں اور اللہ تعالیٰ کا شکر کریں کہ وقت پر ان کی دستگیری ہوئی اور خدا تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے موافق اس مصیبت کے وقت اُن کی نصرت فرمائی۔ لیکن اگر وہ خدا تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر نہ کرینگے تو خدا تعالےٰ ان کی کچھ پروا نہ کرے گا۔ وہ اپنا کام کرکے رہے گا، مگر اُن پر افسوس ہوگا۔

جو موعود آنے والا تھا وہ مَیں ہوں

مَیں بڑے زور سے اور پورے یقین اور بصیرت سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ دُوسرے مذاہب کو مٹا دے اور اسلام کو غلبہ اور قوت دے۔ اب کوئی ہاتھ اور طاقت نہیں جو خدا تعالیٰ کے اس ارادہ کا مقابلہ کرے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (ھود: ۱۰۸) ہے مسلمانو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تمہیں یہ خبر دے دی ہے اور مَیں نے اپنا پیام پہنچا دیا ہے۔ اب اس کو سُننا نہ سُننا تمہارے اختیار میں ہے یہ سچی بات ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام وفات پا چکے ہیں اور مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو موعود آنے والا تھا وُہ مَیں ہی ہوں۔

اسلام کی زندگی عیسیٰؑ کے مرنے میں ہے

اور یہ بھی سچّی بات ہے کہ اسلام کی زندگی عیسیٰ کے مرنے میں ہے۔ اگر اس مسئلہ پر غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہی مسئلہ ہے جو عیسائی مذہب کا خاتمہ کر دینے والا ہے یہ عیسائی مذہب کا بہت بڑا شہتیر ہے اور اسی پر اس مذہب کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ اسے گرنے دو۔ یہ معاملہ بڑی صفائی سے طے ہو جاتا۔ اگر میرے مخالف خدا ترسی اور تقویٰ سے کام لیتے مگر ایک کا نام لو جو درندگی چھوڑ کر میرے پاس آیا ہو اور اُس نے اپنی تسلّی چاہی ہو۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ میرا نام لیتے ہی اُن کے مُنہ سے جھاگ گرنی شروع ہو جاتی ہے اور وہ گالیاں دینے لگتے ہیں۔ بھلا اس طرح پر بھی کوئی شخص حق کو پا سکتا ہے؟ مَیں تو قرآن شریف کے نصوص صریحہ کو پیش کرتا ہوں اور حدیث پیش کرتا ہوں اجماعِ صحابہؓ پیش کرتا ہوں، مگر وہ ہیں کہ ان باتوں کو سنتے نہیں اور کافر کافر دجّال دجّال کہہ کر شور مچاتے ہیں۔

مَیں صاف طور پر کہتا ہوں کہ قرآن شریف سے تم ثابت کرو کہ مسیح زندہ آسمان پر چلا گیا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت کے خلاف کوئی امر پیش کرو اور یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جو پہلا اجماع ہوا۔ اس کے خلاف دکھاؤ تو جواب نہیں ملتا۔ پھر بعض لوگ شور مچاتے ہیں کہ اگر آنے والا وہی مسیح ابنِ مریم اسرائیلی نبی نہ تھا تو آنے والے کا یہ نام کیوں رکھا؟ مَیں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض کیسی نادانی کا اعتراض ہے۔ تعجب کی بات

ہے کہ اعتراض کرنے والے اپنے لڑکوں کا نام تو موسیٰ، عیسیٰ، داؤد، احمد، ابراہیم، اسماعیل رکھ لینے کے مجاز ہوں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کا نام عیسیٰ رکھ دے تو اس پر اعتراض۔

تائیداتِ سماوی اور نشانات

غور طلب بات تو اس مقام پر یہ تھی کہ آیا آنے والا اپنے ساتھ نشانات رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ ان نشانات کو پاتے تو انکار کے لیے جرأت نہ کرتے، مگر انہوں نے نشانات اور تائیدات کی تو پروا نہ کی اور دعویٰ سنتے ہی کہدیا اَنْتَ کَافِرٌ۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور خدا تعالیٰ کے ماٗمورین کی شناخت کا ذریعہ اُن کے معجزات اور نشانات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ گورنمنٹ کی طرف سے کوئی شخص اگر حاکم مقرر کیا جاوے تو اس کو نشان دیا جاتا ہے۔ اسی طرح پر خدا تعالےٰ کے ماٗمورین کی شناخت کے لیے بھی نشانات ہوتے ہیں اور مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے میری تائید میں نہ ایک نہ دو نہ دو سو بلکہ لاکھوں نشانات ظاہر کئے اور وہ نشانات ایسے نہیں ہیں کہ کوئی انہیں جانتا نہیں۔ بلکہ لاکھوں اُن کے گواہ ہیں اور مَیں کہہ سکتا ہوں کہ اس جلسہ میں بھی صدہا اُن کے گواہ موجود ہوں گے۔ آسمان سے میرے لیے نشان ظاہر ہوتے ہیں، زمین سے بھی ظاہر ہوئے۔

وہ نشانات جو میرے دعویٰ کے ساتھ مخصوص تھے اور جن کی قبل از وقت اُور نبیوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خبر دی گئی تھی، وہ بھی پُورے ہو گئے مثلاً ان میں سے ایک کسُوف خسوف کا ہی نشان ہے جو تم سب نے دیکھا۔ یہ صحیح حدیث میں خبر دی گئی تھی کہ مہدی اور مسیح کے وقت میں رمضان کے مہینے میں سورج اور چاند گرہن ہو گا۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ نشان پُورا ہوا ہے یا نہیں؟ کوئی ہے جو یہ کہے کہ اس نے یہ نشان نہیں دیکھا؟ اور ایسا ہی یہ بھی خبر دی گئی تھی کہ اس زمانہ میں طاعون پھیلے گی۔ یہانتک شدید ہو گی کہ دس میں سے سات مر جاویں گے۔ اب بتاؤ کہ کیا طاعون کا نشان ظاہر ہوا یا نہیں؟ پھر یہ بھی لکھا تھا کہ اس وقت ایک نئی سواری ظاہر ہو گی جس سے اُونٹ بیکار ہو جائیں گے۔ کیا ریل کے اجراء سے یہ نشان پُورا نہیں ہوا؟ مَیں کہانتک شمار کروں۔ یہ بہت بڑا سلسلہ نشانات کا ہے۔ اب غور کرو کہ مَیں تو دعویٰ کرنے والا دجال اور کاذب قرار دیا گیا۔ پھر یہ کیا غضب ہوا کہ مجھ کاذب کے لیے ہی یہ سارے نشان پُورے ہو گئے؟ اور پھر اگر کوئی آنے والا اور ہے تو اس کو کیا ملے گا؟ کچھ تو انصاف کرو اور خدا تعالیٰ سے ڈرو۔ کیا خدا تعالیٰ کسی جھوٹے کی بھی ایسی تائید کیا کرتا ہے؟ پھر عجیب بات ہے کہ جو میرے مقابلہ پر آیا وہ ناکام اور نامراد رہا اور مجھے جس آفت اور

مصیبت میں مخالفین نے ڈالا۔ مَیں اس میں سے صحیح سلامت اور بامُراد نکلا۔ پھر کوئی قسم کھا کر بتا دے کہ جھوٹوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوا کرتا ہے؟

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان مخالف الرائے علماء کو کیا ہو گیا۔ وہ غور سے کیوں قرآن شریف اور احادیث کو نہیں پڑھتے۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ جس قدر اکابرِ اُمّت کے گذرے ہیں وہ سب کے سب مسیح موعود کی آمد چودھویں صدی میں بتاتے رہے ہیں اور تمام اہلِ کشوف کے کشف یہاں آ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ حجج الکرامہ میں صاف لکھا ہے کہ چودھویں صدی سے آگے نہیں جاتے گا۔ یہی لوگ منبروں پر چڑھ چڑھ کر بیان کیا کرتے تھے کہ تیرھویں صدی سے تو جانوروں نے بھی پناہ مانگی ہے اور چودھویں صدی مبارک ہو گی مگر یہ کیا ہوا کہ وہ چودھویں صدی جس پر ایک موعود امام آنے والا تھا۔ اس میں بجائے صادق کے کاذب آ گیا۔ اور اس کی تائید میں ہزاروں لاکھوں نشان بھی ظاہر ہو گئے اور خدا تعالیٰ نے ہر میدان اور مقابلہ میں نُصرت بھی اسی کی کی۔ ان باتوں کا ذرا سوچ کر جواب دو۔ یُونہی مُنہ سے ایک بات نکال دینا آسان ہے مگر خدا تعالیٰ کے خوف سے بات نکالنا مشکل ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ خدا تعالیٰ ایک مفتری اور کذّاب انسان کو اتنی لمبی مہلت نہیں دیتا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ جاوے۔ میری عمر ستر سٹھ ۶۷ سال کی ہے اور میری بعثت کا زمانہ تینتیس ۳۳ سال سے بڑھ گیا ہے۔ اگر مَیں ایسا ہی مفتری اور کذّاب تھا تو اللہ تعالےٰ اس معاملہ کو اتنا لمبا نہ ہونے دیتا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہارے آنے سے کیا فائدہ ہوا ہے؟

مسیح موعود کے آنے کی غرض

یاد رکھو کہ میرے آنے کی دو غرضیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو غلبہ اس وقت اسلام پر دوسرے مذاہب کا ہوا ہے گویا وہ اسلام کو کھاتے جاتے ہیں اور اسلام نہایت کمزور اور یتیم بچّے کی طرح ہو گیا ہے۔ پس اس وقت خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تا مَیں ادیان باطلہ کے حملوں سے اسلام کو بچاؤں اور اسلام کے پُرزور دلائل اور صداقتوں کے ثبوت پیش کروں اور وہ ثبوت علاوہ علمی دلائل کے انوار اور برکاتِ سماوی ہیں جو ہمیشہ سے اسلام کی تائید میں ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت اگر تم پادریوں کی رپورٹیں پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اسلام کی مخالفت کے لیے کیا سامان کر رہے ہیں اور ان کا ایک ایک پرچہ کتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ اسلام کا بول بالا کیا جاتا۔ پس اس غرض کے لیے مجھے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے اور مَیں یقیناً کہتا ہوں کہ اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا اور اس کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں۔ ہاں یہ سچی بات ہے کہ اس غلبہ کے لیے کسی تلوار اور بندوق کی حاجت نہیں اور نہ

خدا تعالیٰ نے مجھے ہتھیاروں کے ساتھ بھیجا ہے۔ جو شخص اس وقت یہ خیال کرے وہ اسلام کا نادان دوست ہوگا۔ مذہب کی غرض دلوں کو فتح کرنا ہوتی ہے اور یہ غرض تلوار سے حاصل نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تلوار اُٹھائی، مَیں بہت مرتبہ ظاہر کر چکا ہوں کہ وہ تلوار محض حفاظتِ خود اختیاری اور دفاع کے طور پر تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ مخالفین اور منکرین کے مظالم حد سے گذر گئے اور بیکس مُسلمانوں کے خُون سے زمین سُرخ ہو چکی۔

غرض میرے آنے کی غرض تو یہ ہے کہ اسلام کا غلبہ دُوسرے ادیان پر ہو۔

دُوسرا کام یہ ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں اور یہ کرتے ہیں اور وہ کرتے ہیں۔ یہ صرف زبانوں پر حساب ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ وہ کیفیت انسان کے اندر پیدا ہو جاوے جو اسلام کا مغز اور اصل ہے۔ مَیں تو یہ جانتا ہوں کہ کوئی شخص مومن اور مُسلمان نہیں بن سکتا جبتک اُبوبکر، عُمر، عثمان، علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سا رنگ پیدا نہ ہو۔ وہ دُنیا سے محبت نہ کرتے تھے۔ بلکہ اُنہوں نے اپنی زندگیاں خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کی ہوئی تھیں۔ اب جو کچھ ہے وہ دنیا ہی کے لیے ہے اور اس قدر استغراق دُنیا میں ہو رہا ہے کہ خدا تعالیٰ کے لیے کوئی خانہ خالی نہیں رہنے دیا۔ تجارت ہے تو دُنیا کیلئے عمارت ہے تو دُنیا کیلئے بلکہ نماز روزہ اگر ہے تو وہ بھی دُنیا کیلئے۔ دنیا داروں کے قرب کے لیے تو کچھ کیا جاتا ہے مگر دین کا پاس ذرہ بھی نہیں۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کیا اسلام کے اعتراف اور قبولیت کا اتنا ہی منشا تھا جو سمجھ لیا گیا ہے؟ یا وہ بلند غرض ہے۔ مَیں تو یہ جانتا ہوں کہ مومن پاک کیا جاتا ہے اور اس میں فرشتوں کا رنگ ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے اللہ تعالیٰ کا قرب بڑھتا جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کا کلام سُنتا اور اس سے تسلی پاتا ہے۔ اب تم میں سے ہر ایک اپنے دل میں سوچ لے کہ کیا یہ مقام اُسے حاصل ہے؟ مَیں سچ کہتا ہوں کہ تم صرف پوست اور چھلکے پر قانع ہو گئے ہو حالانکہ یہ کچھ چیز نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ مغز چاہتا ہے۔ پس جیسے میرا یہ کام ہے کہ ان حملوں کو روکا جاوے جو بیرونی طور پر اسلام پر ہوتے ہیں ویسے ہی مسلمانوں میں اسلام کی حقیقت اور رُوح پیدا کی جاوے۔

مَیں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں میں جو خدا تعالیٰ کی بجائے دُنیا کے بُت کو عظمت دی گئی ہے اس کی امانی اور امیدوں کو رکھا گیا ہے۔ مقدّمات، صلح جو کچھ ہے وہ دُنیا کے لیے ہے۔ اس بُت کو پاش پاش کیا جاوے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جبروت ان کے دلوں میں قائم ہو اور ایمان کا شجر تازہ بہ تازہ پھل دے۔ اس وقت درخت کی صورت ہے مگر اصل درخت نہیں کیونکہ اصل درخت کے لیے تو فرمایا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم: ۲۵، ۲۶) یعنی کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ کیونکر بیان کی اللہ نے مثال یعنی مثال دین کامل کی کہ وہ بات پاکیزہ درخت پاکیزہ کی مانند ہے جس کی جڑھ ثابت ہو اور جس کی شاخیں آسمان میں ہوں اور وہ ہر وقت اپنا پھل اپنے پروردگار کے حکم سے دیتا ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ سے یہ مراد ہے کہ اصولِ ایمانیہ اس کے ثابت اور محقق ہوں اور یقین کامل کے درجہ تک پہنچے ہوئے ہوں اور وہ ہر وقت اپنا پھل دیتا رہے۔ کسی وقت خشک درخت کی طرح نہ ہو۔ مگر بتاؤ کہ کیا اب یہ حالت ہے؟ بہت سے لوگ کہہ تو دیتے ہیں کہ ضرورت ہی کیا ہے؟ اس بیمار کی کیسی نادانی ہے جو یہ کہے کہ طبیب کی حاجت ہی کیا ہے؟ وہ اگر طبیب سے مستغنی ہے اور اس کی ضرورت نہیں سمجھتا تو اس کا نتیجہ اس کی ہلاکت کے سوا اور کیا ہوگا؟ اس وقت مسلمان اَسْلَمْنَا میں تو بے شک داخل ہیں مگر اٰمَنَّا کی ذیل میں نہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک نُور ساتھ ہو۔

غرض یہ وہ باتیں ہیں جن کے لیے مَیں بھیجا گیا ہوں اس لیے میرے معاملہ میں تکذیب کے لیے جلدی نہ کرو بلکہ خدا تعالیٰ سے ڈرو اور توبہ کرو کیونکہ توبہ کرنے والے کی عقل تیز ہوتی ہے۔ طاعون کا نشان بہت خطرناک نشان ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کے متعلق مجھ پر جو کلام نازل کیا ہے وہ یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد: ۱۲) یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس پر لعنت ہے جو خدا تعالیٰ پر افترا کرے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے ارادے کی اس وقت تبدیلی ہوگی جب دلوں کی تبدیلی ہوگی۔ پس خدا تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے قہر سے خوف کھاؤ۔ کوئی کسی کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ معمولی مقدمہ کسی پر ہو تو اکثر لوگ وفا نہیں کر سکتے پھر آخرت میں کیا بھروسہ رکھتے ہو۔ جس کی نسبت فرمایا: یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ۔ (عبس: ۳۵)

مخالفوں کا تو یہ فرض تھا کہ وہ حسنِ ظنّی سے کام لیتے اور لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل ۳۷) پر عمل کرتے مگر انہوں نے جلد بازی سے کام لیا۔ یاد رکھو۔ پہلی قومیں اسی طرح ہلاک ہوئیں۔ عقلمند وہ ہے جو مخالفت کر کے بھی جب اسے معلوم ہو کہ وہ غلطی پر تھا، اُسے چھوڑ دے۔ مگر یہ بات تب نصیب ہوتی ہے کہ خدا ترسی ہو۔ دراصل مردوں کا کام یہی ہے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ وہی پہلوان ہے اور اسی کو خدا تعالیٰ پسند کرتا ہے۔

قیاس کی حجّت

ان ساری باتوں کے علاوہ مَیں اب قیاس کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ میرے ساتھ ہیں۔ اجماعِ صحابہؓ بھی

میری تائید کرتا ہے۔ نشانات اور تائیداتِ الٰہیہ میری موید ہیں۔ ضرورتِ وقت میرا صادق ہونا ظاہر کرتی ہے۔ لیکن قیاس کے ذریعہ سے بھی حجت پوری ہو سکتی ہے۔ اس لیے دیکھنا چاہیے کہ قیاس کیا کہتا ہے؟ انسان کبھی کسی ایسی چیز کو ماننے کو تیار نہیں ہو سکتا جو اپنی نظیر نہ رکھتی ہو۔ مثلاً اگر ایک شخص آکر کہے کہ تمہارے بچے کو ہوا اڑا کر آسمان پر لے گئی ہے یا بچہ کتا بن کر بھاگ گیا ہے تو کیا تم اس کی بات کو بلا وجہ معقول اور بلا تحقیق مان لو گے؟ کبھی نہیں، اس لیے قرآن مجید نے فرمایا ہے —— فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (الانبیاء: ۸) اب مسیح علیہ السلام کی وفات کے مسئلہ پر اور اُن کے آسمان پر اڑ جانے کے متعلق غور کرو۔ قطع نظر ان دلائل کے جو ان کی وفات کے متعلق ہیں۔ یہ پکی بات ہے کہ کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان پر چڑھ جانے کا معجزہ مانگا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ہر طرح کامل اور افضل تھے ان کو چاہیئے تھا کہ وہ آسمان پر چڑھ جاتے مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحی سے جواب دیا۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۴) اس کا مفہوم یہ ہے کہ کہدو اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ وہ خلاف وعدہ کرے جبکہ اس نے بشر کے لیے آسمان پر مع جسم کے جانا حرام کر دیا ہے اگر میں جاؤں تو جھوٹا ٹھہروں گا۔

اب اگر تمہارا یہ عقیدہ صحیح ہے کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے اور کوئی بالمقابل پادری یہ آیت پیش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرے تو تم اس کا کیا جواب دے سکتے ہو۔

پس ایسی باتوں کے ماننے سے کیا فائدہ جن کا کوئی اصل قرآن مجید میں موجود نہیں۔ اس طرح پر تم اسلام کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے والے ٹھہرو گے۔ پھر پہلی کتابوں میں بھی تو کوئی نظیر موجود نہیں اور ان کتابوں سے اجتہاد کرنا حرام نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الاحقاف: ۱۱) اور پھر فرمایا كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ (الرعد: ۴۴) اور ایسا ہی فرمایا۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ: ۱۴۷) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے لیے ان کو پیش کرتا ہے تو ہمارا ان سے اجتہاد کرنا کیوں حرام ہو گیا؟

اب انہیں کتابوں میں ملاکی نبی کی ایک کتاب ہے جو بائیبل میں موجود ہے۔ اس میں مسیح سے پہلے ایلیا نبی کے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا گیا۔ آخر جب مسیح ابنِ مریم آئے تو حضرت مسیح سے

الیاس کے دوبارہ آنے کا سوال ملاکی نبی کی اس پیشگوئی کے موافق کیا گیا مگر حضرت مسیح نے فیصلہ کیا کہ وہ آنے والا یُوحنا کے رنگ میں آچکا۔

اب یہ فیصلہ حضرت عیسیٰ ہی کی عدالت سے ہو چکا ہے کہ دوبارہ آنے والے سے کیا مراد ہوتی ہے۔ وہاں یحییٰ کا نام مثیل الیاس نہیں رکھا بلکہ انہیں ہی ایلیا قرار دیا گیا۔ اب یہ قیاس بھی میرے ساتھ ہے۔ میں تو نظیر پیش کرتا ہوں مگر میرے مُنکر کوئی نظیر پیش نہیں کرتے۔ بعض لوگ اس مقام پر عاجز آجاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ کتابیں محرّف مبدّل ہیں۔ مگر افسوس ہے یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ اس سے سند لیتے رہے اور اکثر اکابر نے تحریفِ معنوی مُراد لی ہے۔ بُخاری نے بھی یہی کہا ہے۔ علاوہ اس کے یہودیوں اور عیسائیوں کی جانی دشمنی ہے۔ کتابیں جُدا جُدا ہیں۔ وہ اب تک مانتے ہیں کہ الیاس دوبارہ آئے گا۔ اگر یہ سوال نہ ہوتا تو حضرت مسیح کو وہ مان نہ لیتے؟ ایک فاضل یہودی کی کتاب میرے پاس ہے وہ بڑے زور سے لکھتا ہے اور اپیل کرتا ہے کہ اگر مجھ سے یہ سوال ہوگا تو میں ملاکی نبی کی کتاب سامنے رکھ دُوں گا کہ اس میں الیاس کے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

اب غور کرو جبکہ باوجود ان عذرات کے لاکھوں یہودی جہنمی ہوئے اور سؤر بندر بنے تو کیا میرے مقابلہ میں یہ عُذر صحیح ہوگا کہ وہاں مسیح ابن مریم کا ذکر ہے۔ یہودی تو معذور ہو سکتے تھے، ان میں نظیر نہ تھی مگر اب تو کوئی عذر باقی نہیں۔ مسیحؑ کی موت قرآن شریف سے ثابت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت اس کی تصدیق کرتی ہے اور پھر قرآن شریف اور حدیث میں مِنْکُمْ آیا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ نے مجھے خالی ہاتھ نہیں بھیجا۔ ہزاروں لاکھوں نشان میری تصدیق میں ظاہر ہوئے۔ اور اب بھی اگر کوئی چالیس دن میرے پاس رہے تو وہ نشان دیکھ لے گا۔ لیکھرام کا نشان عظیم الشان نشان ہے۔ احمق کہتے ہیں کہ میں نے قتل کرا دیا۔ اگر یہ اعتراض صحیح ہے تو پھر ایسے نشانات کا امان ہی اُٹھ جائے گا۔ کل کو کہہ دیا جائے گا کہ خسرو پرویز کو معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کرا دیا ہوگا۔ ایسے اعتراض حق بین اور حق شناس لوگوں کا کام نہیں ہے۔

میں آخر میں پھر کہتا ہوں کہ میرے نشانات تھوڑے نہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ انسان میرے نشانوں پر گواہ ہیں اور زندہ ہیں۔ میرے انکار میں جلدی نہ کرو ورنہ مرنے کے بعد کیا جواب دو گے؟ یقیناً یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ سر پر ہے اور وہ صادق کو صادق ٹھہراتا اور کاذب کو کاذب[1]۔

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ صفحہ ۴ تا ۶ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء۔
نیز بدر جلد ۲ نمبر ۵۱ صفحہ ۴ تا ۱۸ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۶ء

۲۱ نومبر ۱۹۰۵ء

دو تازہ الہامات

آجکل اعلیٰ حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علی العموم معمول ہے کہ صبح کو دس بجے کے قریب نئے مہمانخانہ میں جہاں سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب نزیل ہیں تشریف لے آتے ہیں۔ دُوسرے احباب بھی حاضر ہو جاتے ہیں اور بارہ بجے کے قریب تک وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ کل آپ نے قبل ظہر اپنا تازہ الہام سُنایا جو ۱۹ر کی شب کو ہوا۔

فرمایا :

رات عجیب طرز کا الہام ہوا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے اس مفہوم کا ایک الہام ہو چکا ہے۔ مگر یہ طرز عجیب ہے۔

اِنِّيْ مَعَكَ يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ

دُوسرا الہام اس کے ساتھ یہ ہے :

سب مُسلمانوں کو جو رُوئے زمین پر ہیں جمع کرو عَلٰى دِيْنٍ وَّاحِدٍ

اس پر فرمایا :

پہلے ایک الہام ہوا تھا جس کو عرصہ ہوتا ہے۔ سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ مَشْرَبِ الْحَسَنِ۔ يُصَالِحُ بَيْنَ النَّاسِ[1]۔ اور اب یہ الہام ہوا ہے جس میں مجھے يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ فرمایا ہے۔

دُوسرے الہام کے متعلق فرمایا کہ

یہ امر جو ہے کہ سب مُسلمانوں کو جو رُوئے زمین پر ہیں جمع کرو۔ عَلٰى دِيْنٍ وَّاحِدٍ یہ ایک خاص قسم کا امر ہے۔

احکام و اوامر کی دو قسمیں

احکام اور امر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک شرعی رنگ میں ہوتے ہیں جیسے نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، خون نہ کرو وغیرہ۔ اس قسم کے اوامر میں ایک پیشگوئی بھی ہوتی ہے کہ گویا بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس کی خلاف ورزی کریں گے

---

[1] حاشیہ :- یہ الہام ۱۹۰۱ء کا ہے اور الحکم میں چھپا ہوا ہے (ایڈیٹر الحکم)

جیسے یہود کو کہا گیا کہ تورات کو محرّف مبدّل نہ کرنا یہ بتاتا تھا کہ بعض ان میں سے کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ غرض یہ امر شرعی ہے اور یہ اصطلاح شریعت ہے۔

دُوسرا امر کونی ہوتا ہے اور یہ احکام اور امر قضا و قدر کے رنگ میں ہوتے ہیں جیسے قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا (الانبیاء : ۷۰) اور وہ پُورے طور پر وقوع میں آگیا۔ اور یہ امر جو میرے اس الہام میں ہے یہ بھی اس قسم کا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مسلمانانِ رُوئے زمین علیٰ دینٍ واحدٍ جمع ہوں اور وہ ہو کر رہیں گے۔ ہاں اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان میں کوئی قسم کا بھی اختلاف نہ رہے۔ اختلاف بھی رہے گا مگر وہ ایسا ہوگا جو قابلِ ذکر اور قابلِ لحاظ نہیں[1]۔

۲۶ نومبر ۱۹۰۵ء

(قبل دوپہر)

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب رضی اللہ عنہٗ کا ذکرِ خیر

حضرت مولوی صاحب کے ذکر پر فرمایا :

مولوی صاحب ہر تقریب اور ہر جلسہ پر یاد آجاتے ہیں۔ ان کے سبب لوگوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ وہ بڑی زبردست تقریر کرنے والے تھے۔ مَیں نے مقابلہ کر کے خوب دیکھا ہے ان کے اندر محبت اور اخلاص کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا اور بجُز اس کے مَیں سمجھتا ہوں کہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اور اس حد تک تھا کہ مَیں دیکھتا ہوں کہ دوسروں میں وہ نہیں۔ مَیں ان سے بہت عرصہ سے واقف ہوں۔ اس وقت بھی مَیں نے اُن کو دیکھا تھا جب وہ نیچری تھے۔ اس وقت بیعت بھی کر لی تھی، لیکن ابھی بعض اُمور اُن کے دل میں تھے۔ چنانچہ مسیح کے بے پدر ہونے میں مجھ سے گفتگو بھی کیا کرتے تھے اور کئی بار کہا کرتے کہ ان کا بھی فیصلہ کر دو۔ مگر مَیں انہیں جواب دیا کرتا کہ ہمارا یہی مذہب ہے کہ وہ بن باپ ہوتے۔ اس کا زبردست ثبوت یہ ہے کہ یحییٰ اور عیسیٰ کا قصّہ ایک ہی جگہ بیان کیا ہے۔ پہلے یحییٰ کا ذکر کیا جو بانجھ سے پیدا ہوئے۔ دوسرا قصّہ مسیح کا اس کے بعد بیان فرمایا جو اس سے ترقی پر ہونا چاہیئے تھا اور وہ یہی ہے کہ وہ بن باپ ہوئے اور

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۲ صفحہ ۲ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء

یہی امر خارق عادت ہے اگر بانجھ سے پیدا ہونے والے یحییٰ کے بعد باپ سے پیدا ہونے والے کا ذکر ہوتا۔ تو اس میں خارق عادت کی کیا بات ہوئی؟ اور عیسائی جوان کے بن باپ ہونے سے خدا بناتے ہیں اس کا دوسری جگہ جواب دیدیا اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ (آل عمران: ۶۰) اب اگر بن باپ پیدا ہونے والا خدا ہو سکتا ہے تو پھر جس کا ماں باپ دونو نہ ہوں وہ تو بدرجہ اولیٰ خدا ہو گا مگر ان کو وہ خدا نہیں مانتے۔ اور ایسا ہی یحییٰ میں بھی خدائی ماننی چاہیے کیونکہ وُہ بانجھ سے پیدا ہوتے تھے۔

غرض اوائل میں اس قسم کی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ پھر جب اللہ نے ان کی معرفت زیادہ کی تو ایک دن کہنے لگے آپ گواہ رہیں آج سے مَیں نے سب گفتگوئیں ترک کر دیں۔ اس کے بعد موت تک بجز تسلیم اَور کچھ نہ ہو گا۔

اور پھر مَیں نے دیکھا کہ اس دن کے بعد موت تک واقعی یہی حالت رہی کہ رضا اور تسلیم کے سوا کوئی اور بات تھی ہی نہیں۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے ان کے خُطبات سُنے ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں کہ ان میں بجز میرے حالات اور ذکر کے اَور کچھ نہ ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات مَیں نے سُنا کہ بعض آدمی اس امر کو کسی حد تک پسند نہیں کرتے مگر وُہ بجز اس کے اَور کچھ کہنا نہ چاہتے تھے۔

> اس مقام پر مَیں[1] نے عرض کی حضور مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ وہ تقریر اور کلام میرے نزدیک حرام ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی کا ذکر نہ ہو۔ یہ الفاظ سنکر مَیں نے دیکھا کہ حضور کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں، لیکن ان لوگوں کا ضبط اور صبر لانظیر ہوتا ہے اس لیے ضبط کا نمونہ دکھلایا مگر چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور اس میں خاص قسم کی درخشندگی پائی جاتی تھی۔

پھر اس ذکر کے سلسلہ میں فرمایا کہ:

ان کی بڑی بیوی نے رؤیا دیکھا تھا کہ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ مَیں احمدی ہو گیا ہوں۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری محبت میں فنا ہو گئے تھے۔ اچھا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ آمین ثم آمین۔

---

[1] حاشیہ :- یعنی ایڈیٹر الحکم (مرتب)

راستباز وہی ہے جس کی شہادت خدا دے

مولوی صاحب کے اس ذکر کے بعد سید امیر علی شاہ صاحب نے جماعت علی کا ذکر کیا کہ وہ ان کی موت کو اپنی پیشگوئی کی بنا پر ظاہر کرتا ہے۔ اس پر فرمایا:

موت فوت سے تو کوئی رہ نہیں سکتا۔ انبیاء علیہم السلام پر بھی موت آتی۔ انہیں ٹھٹھا کرنا اور اس قسم کی شیخیاں اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح شیعہ بھی کہتے ہیں۔ اگر پیشگوئیاں اور خوارق یہی ہوتے ہیں تو پھر یزید کی کرامت کا بھی ان کو قائل ہونا پڑیگا۔

افسوس یہ لوگ نہیں سوچتے کہ راستباز وہی ہے جس کی شہادت خدا تعالیٰ دے۔ اور کسی قہر کے وقت امتیازی رنگ اس کے ساتھ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت فرعونی تباہ ہوئے مگر موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کو اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔

اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ طاعون کا ذکر چل پڑا۔ آپ نے پُرانی رؤیا۔ ہاتھی والی بیان کی اور بالآخر فرمایا کہ:

میرا الہام تو یہی ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد ۱۲) جب تک پوری تبدیلی اور اصلاح نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کا یہ عذاب ٹلتا نظر نہیں آتا[1]

---

۲۹ نومبر ۱۹۰۵ء

(قبل ظہر)

مدرسہ کے اجرا کی غرض

ہماری غرض مدرسہ کے اجرا سے محض یہ ہے کہ دین کو دنیا پر مقدم کیا جاوے۔ مروجہ تعلیم کو اس لیے ساتھ رکھا ہے کہ یہ علوم خادمِ دین ہوں۔ ہماری یہ غرض نہیں کہ ایف۔ اے یا بی۔ اے پاس کر کے دنیا کی تلاش میں مارے مارے پھریں۔ ہمارے پیشِ نظر تو یہ امر ہے کہ ایسے لوگ خدمتِ دین کے لیے زندگی بسر کریں۔ در اسی لیے مدرسہ کو ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ شاید دینی خدمت کے لیے کام آسکے۔

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۲ صفحہ ۲ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء

مشکل یہ ہے کہ جس کو ذرا بھی استعداد ہو جاوے وہ دنیا کی طرف جُھک جاتا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ایسے لوگ پیدا ہوں جیسے مولوی محمد علی صاحب کام کر رہے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اب وہ اکیلے ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا یا قائم مقام نظر نہیں آتا۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ آریوں کی یہ حالت ہے کہ ایک طرف تو وہ ذرّہ ذرّہ کو خدا بنا رہے ہیں اور اس طرح پر اللہ تعالیٰ کی معرفت سے بے نصیب اور حقوق کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور حقوق العباد کی طرف سے ایسے اندھے ہیں کہ نیوگ جیسے مسئلہ کو مانتے ہیں۔ باوجود ایسا مذہب رکھنے کے پھر ان میں اس کی حمایت کے لیے اس قدر جوش ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ اپنی زندگیاں مذہب کی خاطر وقف کر دیتے ہیں۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ جو مدرسہ سے نکلتا ہے اس کو دنیوی امور کی طرف ہی توجہ ہو جاتی ہے۔

جہانتک ہو سکے یہی آرزو ہے کہ کوئی دینی خدمت ہو جاوے۔

تازہ الہامات

رات پھر وہی الہام ہوا۔

(۱) بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔

(۲) قَلَّ مِیْعَادُ رَبِّکَ ۔

(۳) اس دن سب پر اُداسی چھا جائے گی۔

(۴) قَرُبَ اَجَلُکَ الْمُقَدَّرُ ۔ وَلَا نُبْقِیْ لَکَ مِنَ الْمُخْزِیَاتِ ذِکْرًا ۔

ان الہامات پر غور کر کے مَیں بھی سمجھتا ہوں کہ وُہ زمانہ بہت ہی قریب ہے۔ پہلے بھی یہ الہام ہوا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک رؤیا بھی تھی کہ ایک شخص نے مجھے کنوئیں کی ایک کوری ٹنڈ میں ٹھنڈا پانی دیا۔ وہ پانی بڑا ہی مصفّٰی اور مقطّر تھا مگر وہ تھوڑا سا تھا۔ اس کے ساتھ الہام ہوا تھا۔

آبِ زندگی

غرض زندگی کا زمانہ خواہ کتنا ہی لمبا ہو پھر بھی تھوڑا ہی ہے۔

(قبل عصر)

مامورین کے اغراض و مقاصد کا انکے متبعین کے ذریعہ پورا ہونا

۳۰ رنومبر ۱۹۰۵ء کی صبح کو جناب سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب مدراسی واپس وطن کو جانے والے تھے اس لیے حضرت اقدس سیٹھ صاحب کی ملاقات کے واسطے مہمان خانہ جدید میں جہاں سیٹھ صاحب اور دوسرے احباب فروکش تھے، تشریف لائے اور سیٹھ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:

رات مجھے الہام ہوا ہے (وہی الہام جو اُوپر درج ہو چکے ہیں سُناتے)

الہام سُنانے کے بعد فرمایا:

لَا نُبْقِیْ لَکَ مِنَ الْمُخْزِیَاتِ ذِکْرًا سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رُسوا کرنے والا ذکر باقی نہ چھوڑیں گے۔ یہ بڑا مبشر الہام ہے یعنی تیرے آنے کی جو علّتِ غائی ہے اس کو ہم پُورا کر دیں گے۔ کسی مامُور اور مرسل کے لیے رُسوا کرنے والا ذکر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد و اغراض میں ناکامیاب ہو۔ سو اللہ تعالیٰ نے بشارت دی کہ تیرے آنے کی جو غرض اور مقصد ہے اس کو ہم پورا کر دیں گے۔ مگر یہ سنّت اللہ ہے کہ جس قدر مامُور دنیا میں آتے ہیں یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ ان کے ہی زمانہ میں پوری تکمیل ہو جاوے۔ بلکہ بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں کہ انکے متبعین کے ہاتھوں سے پورے ہوتے ہیں اور انکے ہی ہاتھ پر وہ تکمیل سمجھی جاتی ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہدِ رسالت میں مکہ، مدینہ اور بعض نواح تک اسلام تھا، لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور بہت سے امور کی تکمیل صحابہؓ کے ہاتھ پر ہوئی جو درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کامیابی اور آپ کے دستِ مبارک پر ہی تکمیل تھی۔ اس کے بعد بنو امیہ اور دُوسرے سلاطین کے ذریعہ ان ترقیوں میں اَور ترقی ہوئی اور محمود غزنوی نے بھی ان میں حِصّہ لیا۔ اور یہ سلاطینِ ہند جو سات سو برس تک حکمران رہے کسی حد تک ان کو بھی حِصّہ ملا۔ انہوں نے ایسی ایسی جگہ مساجد تعمیر کروائیں جو ہندوؤں کے مرکز تھے۔

غرض یہ سُنّت اللہ ہے کہ جو مامور ہو کر آتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سب مقاصد اس کے وقت ہی میں مکمل ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اَور کون ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کُنجیاں مجھے دی گئی ہیں، لیکن وہ کُنجیاں آپؐ کے بعد حضرت عمرؓ کو دی گئیں۔

یہ کہنا کہ وُہ آپؐ کو نہیں ملیں غلط ہے۔ کیونکہ اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ متبعین کی فتوحات اور کامیابیاں بھی دراصل متبوع ہی کی فتوحات ہوتی ہیں۔

مامُور کی وفات پر جماعت کا غمگین ہونا فطری امر ہے

"اس دن سب پر اُداسی چھا جائے گی۔"

اس کے متعلق فرمایا کہ :

یہ بالکل سچ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا کوئی مامور دُنیا سے اُٹھتا ہے تو ہر چیز پر اُداسی چھا جاتی ہے خصوصاً ان لوگوں پر جو اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ہر بات کو قبل از وقت سمجھتا ہے۔ اس لیے جب ان کی کوئی محبوب چیز جاتی رہے تو پھر ضرور غمگین ہوتا ہے یہ ایک فطرتی تقاضا ہے۔ صحابہؓ کی حالت کا کون اندازہ کرسکتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تھی۔ ان کو تو قریباً ایک قسم کا جنون ہوگیا تھا اس غم میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں ان پر آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو وہ جوش آیا کہ انہوں نے تلوار ہی نکال لی کہ جو شخص کہے گا کہ آپؐ وفات پا گئے ہیں مَیں اسے قتل کر دوں گا۔ گویا وہ یہ لفظ بھی سُننا نہ چاہتے تھے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خُطبہ پڑھا اور آیت مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (اٰل عمران: ۱۴۵) پڑھی تو ان کا جوش فرو ہوا۔ یہ آیت دراصل ایک جنگ میں نازل ہوئی تھی جبکہ شیطان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی آواز دی گئی مگر اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھا تو صحابہؓ سمجھتے تھے کہ گویا یہ آیت ابھی اُتری ہے۔

یقینی الوجود عالمِ آخرت

فرمایا :

ایسے امور میں حیرت اور سرگشتگی ایک لازمی امر ہوتا ہے۔ یہ اختیاری بات نہیں کہ نہ ہو۔ مَیں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو قبل از وقت ان امور کو بار بار ظاہر کرتا ہے۔ اس میں یہ سِرّ ہے کہ تا جماعت کی تسلّی اور اطمینان کا موجب ہو۔ ہم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ دو عالَم ہیں جو یقینی الوجود ہیں۔ ایک تو یہی عالَم جس میں ہم اب ہیں اور زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دُوسرا وہ عالَم جس میں مرنے کے بعد ہم داخل ہوتے ہیں چونکہ انسان کو اس کا وسیع علم نہیں ہوتا اس لیے اسے وہمی سمجھتا اور اس سے کراہت کرتا ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کی خبر نہیں۔ اور اس عالَم میں چونکہ رہتا ہے اور اس کی خبر اور اطلاع ہے اس لیے اس سے

محبت کرتا ہے اور اسی میں رہنا چاہتا ہے۔ اگر اُس عالم پر پورا یقین ہو جاوے تو اس عالم سے چلے جانے کا کوئی غم اس کو نہ ہو اور ایسی صورت میں یہ عالم تو اسی قدر ہے کہ جیسے مسافر کسی جگہ کو کوچ کرنے کی تیاری کرے تو زادِ راہ کا بندوبست کر لیتا ہے۔ اسی قدر یہ عالم ہے کہ اس عالم کے سفر کے لیے زادِ راہ کا بندوبست کرے اور نہ اس سے زیادہ شریعت حکم دیتی ہے۔ اگر یہ عالم ہمیشہ کے لیے ہوتا تو آدم سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیاء و رسل اس دُنیا میں گذرے ہیں ان کے ہمیشہ یہاں رہنے کی بہت بڑی ضرورت تھی اور اس کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟ مگر دیکھو اللہ تعالیٰ نے جبتک ان کے لیے اس عالم میں رہنا پسند کیا وہ یہاں رہے اور آخر اپنا کام کر کے اس دُنیا سے رخصت ہوتے خواہ دُوسروں کے نزدیک ان کی وہ رخصت قبل از وقت ہی سمجھی گئی ہو۔ اَوروں کا ذکر چھوڑو کہ بنی اسرائیل میں بھیجے ہوئے رسولوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بڑے اولوالعزم رسول تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑے بڑے وعدے فرمائے۔ منجملہ ان کے ارضِ مقدس میں داخل ہونے کا وعدہ تھا مگر اس ارضِ مقدس کے راستہ ہی میں اُن کو موت آگئی اور وہ اس وعدہ کی زمین میں داخل نہ ہو سکے۔ پھر خدا تعالیٰ نے ان کے بعد یشوع بن نون کو برگزیدہ کیا اور وہ اس زمین میں داخل ہوا۔ غرض یہ ایک قسم کے اسرار ہوتے ہیں جن کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دُعائیں

حضرت عیسٰی علیہ السلام جو رو رو کر دُعائیں کرتے تھے اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ موت سے ڈرتے تھے یا اس زندگی سے پیار کرتے تھے بلکہ ان کو ناکامی کا اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو میں ناکام دُنیا سے اُٹھوں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعاؤں کو سُنا مگر یہ نہیں کہ وہ موت کا پیالہ اُن سے ٹل گیا۔ اپنے وقت پر انہوں نے پیا اور رخصت ہوتے۔

مامُور کی وفات سے خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ میں کوئی فرق نہیں آتا

فرمایا:-

ہم تو اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقدم کرتے ہیں اور ہم یقین کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ کے کاروبار میں جن کا اس نے ارادہ کیا ہوتا ہے کسی قسم کا فرق آجاتا ہے۔ ایسا تو وہم کرنا بھی سخت گناہ ہے۔ نہیں بلکہ وہ کاروبار جس طرح وہ چاہتا ہے بدستور چلتا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اُسے چلاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ راستہ ہی میں فوت ہو گئے۔ قوم چالیس دن تک ماتم کرتی رہی مگر خدا تعالیٰ نے وہی کام یشوع بن نون سے

لیا۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے اور نبی آتے رہے یہانتک کہ مسیح ابنِ مریمؑ آگیا اور اس سلسلہ میں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے شروع کیا تھا کوئی فرق نہ آیا۔

پس یہ کبھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ میں کوئی فرق آجاتا ہے۔ یہ ایک دھوکہ لگتا ہے اور بُت پرستی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اگر یہ خیال کیا جاوے کہ ایک شخص کے وجود کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ میں تو اللہ تعالیٰ کے وجود کے سوا کسی اور طرف نظر اُٹھانا بھی پسند نہیں کرتا۔

مولابس

فرمایا :

میرے ایک چچا صاحب فوت ہوگئے تھے۔ عرصہ ہوا میں نے ایک مرتبہ اُن کو عالم رؤیا میں دیکھا اور اُن سے اس عالم کے حالات پُوچھے کہ کس طرح انسان فوت ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ جب انسان کا آخری وقت قریب آتا ہے تو دو فرشتے جو سفید پوش ہوتے ہیں سامنے آتے ہیں اور وہ کہتے آتے ہیں مولابس۔ مولابس۔

[فرمایا :۔ حقیقت میں ایسی حالت میں جب کوئی مفید وجود درمیان سے نکل جاتا ہے تو یہی لفظ "مولابس" موزون ہوتا ہے۔]

اور پھر وہ قریب آکر دونوں اُنگلیاں ناک کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ اے رُوح! جس راہ سے آئی تھی اسی راہ سے واپس نکل آ۔

فرمایا :۔

طبعی امور سے ثابت ہوتا ہے کہ ناک کی راہ سے رُوح داخل ہوتی ہے اسی راہ سے معلوم ہوا نِکلتی ہے۔ توریت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نتھنوں کے ذریعہ زندگی کی رُوح پھُونکی گئی۔

وہ عالم عجیب اسرار کا عالم ہے جن کو اس زندگی میں انسان پُورے طور پر سمجھ بھی نہیں سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم خوش قسمتی

فرمایا :

اگر دن تھوڑے بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں بسر ہوں تو غنیمت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس مُلک میں رہے تھے وہاں کی زندگی صرف ساڑھے تین سال کی ہی رسالت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ رسالت تیئیس ۲۳ سال تھا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش قسمتی ثابت ہوتی ہے اور کوئی دُوسرا اس میں شریک نہیں۔ اُمورِ رسالت میں یہ کامیابی اور سعادت

کسی اَور کو نہیں ملی۔ آپؐ کی آمد کا وہ وقت تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے خود ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم : ۴۲) سے بیان کیا ہے یعنی نہ خشکی میں امن تھا نہ تری میں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب بگڑ چکے تھے اور قسم قسم کے فساد اور خرابیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ گویا زمانہ کی حالت بالطبع تقاضا کرتی تھی کہ اس وقت ایک زبردست ہادی اور مصلح پیدا ہو۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا اور پھر آپؐ ایسے وقت دُنیا سے رخصت ہوئے جب آپؐ کو یہ آواز آگئی۔۔۔۔۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ
الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدة : ۴)

یہ آواز کسی اور نبی اور رسُول کو نہیں آئی۔ کہتے ہیں جب یہ آیت اُتری اور پڑھی گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کو سُن کر رو پڑے۔ ایک صحابی نے کہا کہ اے بڈھے تجھے کیا ہوگیا۔ آج تو خوشی کا دن ہے تو کیوں رو پڑا؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا تو نہیں جانتا مجھے اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بُو آتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فراست بڑی تیز تھی۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ جب کام ہوچکا تو پھر یہاں کیا کام؟۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی بندوبست کا افسر کسی ضلع کا بندوبست کرنے کو بھیجا جاتا ہے وُہ اس وقت تک وہاں رہتا ہے جبتک کام ختم نہ ہولے۔ جب کام ختم ہوجاتا ہے تو پھر کسی اَور جگہ بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح پر مرسلین کے متعلق بھی یہی سُنّت ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے جب یہ امر دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا ابوبکرؓ سچ کہتا ہے اور پھر یہ بھی فرمایا کہ اگر مَیں کسی کو دُنیا میں دوست رکھتا تو ابوبکرؓ کو۔

خُلّت کی حقیقت

یہ جُملہ بھی قابلِ تشریح ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ دوست تو رکھتے تھے۔ پھر اس کا کیا مطلب؟ بات اصل میں یہ ہے کہ خُلّت اور دوستی تو وہ ہوتی ہے جو رگ وریشہ میں دھنس جاتے۔ وہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا خاصّہ اور اسی کے لیے مخصوص ہے۔ دُوسروں کے ساتھ محض اخوّت اور برادری ہے۔ خُلّت کا مفہوم ہی یہی ہے کہ وُہ اندر دھنس جاوے۔ جیسے یوسف زلیخا کے اندر رچ گیا تھا۔ بس یہی معنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس پاک فقرہ کے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں تو کوئی شریک نہیں۔ دُنیا میں اگر کسی کو دوست رکھتا تو ابوبکرؓ کو رکھتا۔

یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر کسی کو بیٹا بناتا تو ایک مقرب کو بنا لیتا۔ ایک

مفسّر کہتا ہے کہ مقرّب سے مُراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کو مقامِ لدُنّی حاصل ہے۔ غرض یہ امور تکمیل کے لیے ضروری ہیں جن کو ہر شخص سمجھ نہیں سکتا۔

اُمّت پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عظیم احسان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ہزاروں آدمی مُرتد ہوگئے حالانکہ آپؐ کے زمانہ میں تکمیلِ شریعت ہوچکی تھی۔ یہانتک اس ارتداد کی نوبت پہنچی کہ صرف دو مسجدیں رہ گئیں جن میں نماز پڑھی جاتی تھی۔ باقی کسی مسجد میں نماز ہی نہیں پڑھی جاتی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ (الحجرات: ۱۵) مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت اُبوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ دوبارہ اسلام کو قائم کیا اور وہ آدمِ ثانی ہوتے۔ میرے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت بڑا احسان اس اُمّت پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے کیونکہ ان کے زمانہ میں چار جھُوٹے پیغمبر ہوگئے۔ مسیلمہ کے ساتھ ایک لاکھ آدمی ہوگئے تھے۔ اور ان کا نبی ان کے درمیان سے اُٹھ گیا تھا مگر ایسی مشکلات پر بھی اسلام اپنے مرکز پر قائم ہوگیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو بات بنی بنائی ملی تھی۔ پھر وہ اس کو پھیلاتے گئے۔ یہاں تک نواحِ عرب سے اسلام نکل کر شام و رُوم تک جا پہنچا اور یہ ممالک مُسلمانوں کے قبضہ میں آگئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ والی مصیبت کسی نے نہیں دیکھی تھی نہ حضرت عمرؓ نے نہ حضرت عثمانؓ نے اور نہ حضرت علیؓ نے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور میرا باپ خلیفہ ہوا اور لوگ مُرتد ہوگئے تو میرے باپ پر اس قدر غم پڑا کہ اگر پہاڑ پر وہ غم پڑتا تو وہ زمین کے برابر ہو جاتا۔ ایسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ کا مقابلہ ہم کس سے کریں۔ اصل مشکلات اور مصائب کا زمانہ وہی تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت کوئی فتنہ باقی نہ تھا اور حضرت عثمانؓ کو تو میں حضرت سلیمانؑ سے تشبیہ دیتا ہوں اُن کو بھی عمارات کا بڑا شوق تھا۔ حضرت علیؓ کے وقت میں اندرونی فتنے ضرور تھے۔ ایک طرف معاویہ تھے اور دوسری طرف علیؓ۔ اور ان فتنوں کے باعث مُسلمانوں کے خون بہے۔ چھ سال کے اندر اسلام کے لیے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ اسلام کے لیے تو عثمانؓ تک ہی ساری کارروائیاں ختم ہوگئیں۔ پھر تو خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما

حضرت حسنؓ نے میری دانست میں بہت اچھا کام کیا کہ خلافت سے الگ ہوگئے

پہلے ہی ہزاروں خون ہو چکے تھے۔ انہوں نے پسند نہ کیا کہ اور خون ہوں۔ اس لیے معاویہ سے گذارہ لے لیا۔ چونکہ حضرت حسنؓ کے اس فعل سے شیعہ پر زد ہوتی ہے اس لیے امام حسنؓ پر پورے راضی نہیں ہوتے۔ ہم تو دونوں کے ثنا خواں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر شخص کے جُدا جُدا قویٰ معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسنؓ نے پسند نہ کیا کہ مسلمانوں میں خانہ جنگی بڑھے اور خون ہوں۔ انہوں نے امن پسندی کو مدِّ نظر رکھا اور حضرت امام حسینؓ نے پسند نہ کیا کہ فاسق فاجر کے ہاتھ پر بیعت کروں کیونکہ اس سے دین میں خرابی ہوتی ہے۔ دونو کی نیت نیک تھی۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔ یہ الگ امر ہے کہ یزید کے ہاتھ سے بھی اسلامی ترقی ہوئی۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے۔ وہ چاہے تو فاسق کے ہاتھ سے بھی ترقی ہو جاتی ہے۔ یزید کا بیٹا نیک بخت تھا۔

ہر شخص اپنے قویٰ کے موافق کام کرتا ہے

اصل یہی ہے کہ ہر شخص اپنے قویٰ کے موافق کام کرتا ہے قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (بنی اسرائیل: ۸۵) بعض لوگ دُنیا داری میں بڑے کامل ہوتے ہیں۔ بعض سادہ ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ دیکھا کہ لوگ کھجور کو پیوند کر رہے ہیں۔ یہ پیوند نر کا مادہ کو ہوتا ہے آپؐ نے انکو منع کیا۔ انہوں نے نہ لگایا۔ اس سال کھجوریں نہ لگیں تو آپؐ نے فرمایا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ یعنی تم اپنے دینوی معاملات کو بہت جانتے ہو۔

انبیاء علیہم السلام باوجود اس کے کہ بڑے قوی الحوصلہ اور صاحب ہمت لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں غلبہ رانی کے لیے کہا جاوے تو انہیں کب توفیق ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اس غرض کے لیے بنائے ہی نہیں جاتے۔ جس مقصد اور غرض کے لیے وہ آتے ہیں اور اس راہ میں جو تکالیف اور مصائب انہیں اُٹھانے پڑتے ہیں کوئی دوسرا شخص دُنیا کا خواہ وہ کیسا ہی بہادر اور تنومند کیوں نہ ہو وہ ان مشکلات کو ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو کچھ ایسا دل اور حوصلہ عطا کرتا ہے کہ وہ بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ ان کو برداشت کرتے ہیں۔

خود انسان کو دیکھو کہ باوجودیکہ بڑا عقلمند اور عجیب عجیب ایجادیں کرتا ہے مگر بئے کا سا گھونسلا نہیں بنا سکتا۔ اس لیے کہ اس قسم کے قویٰ اُسے نہیں ملے۔ شہد کی مکھی شہد بناتی ہے۔ انسان کا کیا مقدور ہے کہ اس قسم کا شہد بنا سکے۔ وہی بُوٹیاں موجود ہیں۔ مگر انسان عاجز ہے۔ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے جُدا جُدا طاقت دی ہے۔ اسی طرح ایک طبقہ اناس کا وہ ہے جس کو رُوحانی قوتیں دی جاتی ہیں۔

مُردوں سے استفاضہ

ایک شخص نے سوال کیا کہ زندگی میں کسی مُردے سے تعلق ہو یا مُرید کا اپنے پیر سے ہو۔ کیا وُہ بھی اس سے فیض پا لیتا ہے؟

فرمایا :-

صُوفی تو کہتے ہیں کہ انسان مرنے کے بعد بھی فیض پاتا ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں ایک دائرہ کے اندر محدود ہوتا ہے اور مرنے کے بعد وہ دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اس کے سب قائل ہیں؛ چنانچہ یہانتک بھی مانا ہے کہ حضرت عیسیٰ جب آسمان سے آئیں گے تو چونکہ وہ علوم عربیہ سے ناواقف ہوں گے، کیا کریں گے؟ بعض کہتے ہیں کہ وہ علوم عربیہ پڑھیں گے اور حدیث اور فقہ بھی پڑھیں گے بعض کہتے ہیں کہ یہ امر تو ان کے لیے موجب عار ہے کہ وہ کسی مولوی کے شاگرد ہوں۔ اس لیے مانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں بیٹھیں گے اور وہاں بیٹھ کر استفاضہ کریں گے۔ مگر اصل میں یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مگر اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ قبور سے استفاضہ ہو سکتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ یہ امر بطریق شرک نہ ہو جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔

دارِ فانی

فرمایا :-

ہماری نصیحت یہی ہے کہ ہر شخص گور کے کنارے بیٹھا ہے۔ یہ الگ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اطلاع دیدے اور کسی کو اچانک موت آجاوے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ گھر ہے بے بنیاد۔ بہت سے لوگ دیکھے ہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے گھر کے سارے آدمیوں کو مٹی میں دبایا اور اولادوں کو دفن کیا مگر کچھ ایسے سخت دل ہوتے ہیں کہ وہ موت ان پر اثر نہیں کرتی اور تبدیلی ان میں نہیں پائی جاتی۔ یہ بد قسمتی ہے۔ یہ تماشہ سلاطین کے ہاں بہت دیکھا جاتا ہے۔ لاکھوں لاکھ خُون ہو جاتے ہیں اور ان پر کوئی اثر نہیں۔ مساکین سے مال لیتے ہیں اور خود عیش کرتے ہیں۔ بڑی بھاری غفلت کا نمونہ ان کے ہاں دیکھا جاتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۹ نمبر ۴۳ صفحہ ۲ تا ۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء

۲؍دسمبر ۱۹۰۵ء

ایک رؤیا اور ایک الہام

رؤیا دیکھا کہ ایک دیوار پر ایک مُرغی ہے۔ وُہ کچھ بولتی ہے۔ سب فقرات یاد نہیں رہے مگر آخری فقرہ جو یاد رہا یہ تھا:

اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ

(ترجمہ) اگر تم مُسلمان ہو۔

اس کے بعد بیداری ہوئی۔ یہ خیال تھا کہ مُرغی نے یہ کیا الفاظ بولے ہیں۔ پھر الہام ہوا:

اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ اگر تم مُسلمان ہو۔

فرمایا کہ:-

مُرغی کا خطاب اور الہام کا خطاب ہر دو جماعت کی طرف تھے۔ دونوں فقروں میں ہماری جماعت مخاطب ہے۔ چونکہ آجکل روپیہ کی ضرورت ہے۔ لنگر میں بھی خرچ بہت ہے اور عمارت پر بھی بہت خرچ ہو رہا ہے اس واسطے جماعت کو چاہیئے کہ اس حکم پر توجہ کریں۔

پرندوں میں اِنفاق فی سبیل اللہ کا سبق

فرمایا:-

مُرغی اپنے عمل سے دکھاتی ہے کہ کس طرح اِنفاق فی سبیل اللہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ انسان کی خاطر اپنی ساری جان قربان کرتی ہے اور انسان کے واسطے ذبح کی جاتی ہے۔ اسی طرح مرغی نہایت محنت اور مشقت کے ساتھ ہر روز انسان کے واسطے انڈا دیتی ہے۔

ایسا ہی ایک پرند کی مہمان نوازی پر ایک حکایت ہے کہ ایک درخت کے نیچے ایک مسافر کو رات آگئی۔ جنگل کا ویرانہ اور سردی کا موسم۔ درخت کے اوپر ایک پرند کا آشیانہ تھا۔ نر اور مادہ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ یہ غریب الوطن آج ہمارا مہمان ہے اور سردی زدہ ہے۔ اس کے واسطے ہم کیا کریں؟ سوچ کر ان میں یہ صلاح قرار پائی کہ ہم اپنا آشیانہ توڑ کر نیچے پھینک دیں اور وہ اس کو جلا کر آگ تاپے؛ چنانچہ انہوں نے کہا کہ یہ بھوکا ہے۔ اس کے واسطے کیا دعوت تیار کی جائے۔ اور تو کوئی چیز

موجود نہ تھی۔ ان دونو نے اپنے آپ کو نیچے اس آگ میں گرا دیا، تاکہ ان کے گوشت کا کباب ان کے مہمان کے واسطے رات کا کھانا ہو جائے۔ اس طرح انہوں نے مہمان نوازی کی ایک نظیر قائم کی۔ سو ہماری جماعت کے مومنین اگر ہماری آواز کو نہیں سُنتے تو اس مرغی کی آواز کو سُنیں۔ مگر سب برابر نہیں۔ کتنے مخلص ایسے ہیں کہ اپنی طاقت سے زیادہ خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا تعالےٰ ان کو جزائے خیر دے۔[1]

۱۴؍ دسمبر ۱۹۰۵ء

غیر احمدی کے پیچھے نماز

دو آدمیوں نے بیعت کی۔ ایک نے سوال کیا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا:

وُہ لوگ ہم کو کافر کہتے ہیں۔ اگر ہم کافر نہیں ہیں تو وہ کفر لوٹ کر اُن پر پڑتا ہے۔ مسلمان کو کافر کہنے والا خود کافر ہے۔ اس واسطے ایسے لوگوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ پھر اُن کے درمیان جو لوگ خاموش ہیں وہ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ اُن کے پیچھے بھی نماز جائز نہیں کیونکہ وہ اپنے دل کے اندر کوئی مذہب مخالفانہ رکھتے ہیں جو ہمارے ساتھ بظاہر شامل نہیں ہوتے۔[2]

۶؍ دسمبر ۱۹۰۵ء

ایک الہام

فرمایا:

کل پھر الہام ہوا:۔ قَرُبَ اَجَلُكَ الْمُقَدَّرُ.

واقفین زندگی کی ضرورت

اس پر فرمایا کہ:

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۳۸ صفحہ ۲ مورخہ ۸؍ دسمبر ۱۹۰۵ء

[2] بدر جلد ۱ نمبر ۳۹ صفحہ ۲ مورخہ ۱۵؍ دسمبر ۱۹۰۵ء

مدرسہ کی حالت دیکھ کر دل پارہ پارہ اور زخمی ہوگیا۔ علماء کی جماعت فوت ہو رہی ہے۔ مولوی عبدالکریم کی قلم ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔ مولوی بُرہان الدین فوت ہوگئے۔ اب قائم مقام کوئی نہیں۔ جو عمر رسیدہ ہیں ان کو بھی فوت شدہ سمجھئے۔ دُوسرا جیسا کہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ تقویٰ ہو۔ اس کی تخم ریزی نہیں۔ یہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے؛ ورنہ اچھے آدمی مفقود ہو رہے ہیں۔ آریہ زندگی وقف کر رہے ہیں۔ یہاں ایک طالب علم کے مُنہ سے بھی نہیں نکلتا۔

ہزار ہا روپیہ قوم کا جو جمع ہوتا ہے وہ ان لوگوں کے لیے خرچ ہوتا ہے جو دُنیا کا کیڑا بنتے ہیں۔ یہ حالت تبدیل ہو کر ایسی حالت ہو کہ علماء پیدا ہوں۔ علمِ دین میں برکت ہے۔ اس سے تقویٰ حاصل ہوتی ہے۔ بغیر اس کے شوخی بڑھتی ہے۔ نبوی علم میں برکات ہیں۔

لوگ جو روپیہ بھیجتے ہیں لنگرخانہ کے لیے یا مدرسہ کے لیے۔ اس میں اگر بے جا خرچ ہوں تو گناہ کا نشانہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے تدبیر کرنے والوں کی قسم کھائی ہے۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (النّٰزعٰت:۶) میں تو ایسے آدمیوں کی ضرورت سمجھتا ہوں جو دین کی خدمت کریں۔ میرے نزدیک زبان دانی ضروری ہے۔ انگریزی پڑھنے سے میں نہیں روکتا۔ میرا مدعا یہ ہے اور میں نے پہلے بھی سوچا ہے اور جب سوچا ہے میرے دل کو صدمہ پہنچا ہے کہ ایک طرف تو زندگی کا اعتبار نہیں جیسا کہ خدا تعالیٰ کی وحی قَرُبَ اَجَلُکَ الْمُقَدَّرُ سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا اس مدرسہ کی بنا سے غرض یہ تھی کہ دینی خدمت کیلئے لوگ تیار ہو جاویں۔ یہ خدا تعالیٰ کا قانون ہے۔ پہلے گذر جاتے ہیں۔ دُوسرے جانشین ہوں۔ اگر دوسرے جانشین نہ ہوں تو قوم کے ہلاک ہونے کی جڑ ہے۔ مولوی عبدالکریم اور دُوسرے مولوی فوت ہوگئے اور جو فوت ہوئے ہیں اُن کا قائم مقام کوئی نہیں۔ دُوسری طرف ہزار ہا روپیہ جو مدرسہ کے لیے لیا جاتا ہے پھر اس سے فائدہ کیا؟ جب کوئی تیار ہو جاتا ہے تو دنیا کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اصل غرض مفقود ہے۔ میں جانتا ہوں جبتک تبدیلی نہ ہوگی کچھ نہ ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ کی جماعت رُوحانی سپاہیوں کے تیار کرنے والے تھے وہ نہیں رہے دُور چلے گئے ہیں۔ ہمیں کیا غرض ہے کہ قدم بقدم ان لوگوں کے چلیں جو دُنیا کے لیے چلتے ہیں[1]

---

[1] الحکم جلد ۱۳ نمبر ۱ صفحہ ۱۲-۱۳ مورخہ ۷ ؍ جنوری ۱۹۰۹ء

۷؍دسمبر ۱۹۰۵ء

وفات کے متعلق الہامات

فرمایا :

اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے۔ پانچ چھ روز سے یہی متواتر الہام ہو رہا ہے۔ انسان جن چیزوں کی بابت تمنا کرتا ہے ان کی بابت چاہتا ہے کہ معلوم ہوں۔ جن سے کراہت کرتا ہے چاہتا کہ وہ نامعلوم ہوں۔ مگر عادت اللہ یہ نہیں کہ وہ انسانی خواہشات کی پیروی کرے۔ مجھے پانچ چھ روز سے فجر کے قریب یہ الہام ہوتا ہے۔ قَرُبَ اَجَلُكَ الْمُقَدَّرُ۔ آج اس کے ساتھ یہ بھی تھا۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

انبیاء علیہم السّلام کے متعلق سُنّت اللہ یہی ہے کہ وہ تخم ریزی کر جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق صحابہؓ کا خیال غلط نکلا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کو فتح کریں گے۔ انہوں نے آپؐ کی وفات کو قبل از وقت سمجھا، مگر ابوبکرؓ کی فراست صحیح تھی۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ ۔ مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق جو الہام ہوا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب نُصرتِ الٰہی ظاہر ہو۔ میرا مذہب یہی ہے کہ طولِ امل کے طور پر کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ انبیاء علیہم السلام جس قدر آتے ہیں وہ تخم ریزی کر جاتے ہیں ـــــ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عرب میں اشاعتِ اسلام کی اور ان میں سے بھی بعض اَسْلَمْنَا میں داخل تھے۔ یہ گویا تخم ریزی تھی۔

وفات پا جانیوالے چند اصحاب کا ذکرِ خیر

مولوی بُرہان الدین صاحب کے متعلق فرمایا کہ :

وہ اوّل ہی اوّل ہوشیارپور میں میرے پاس گئے۔ ان کی طبیعت میں حق کے لیے ایک سوزش اور جلن تھی۔ مجھ سے قرآن شریف پڑھا۔ بائیس برس سے میرے پاس آتے تھے۔ صُوفیانہ مذاق تھا۔ جہاں فقراء کو دیکھتے وہیں چلے جاتے۔ میرے ساتھ بڑی محبت رکھتے تھے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ماتم پُرسی کے لیے لکھ دُوں۔ بہتر ہے کہ ان کا جو لڑکا ہو وہ یہاں آجاوے تا کہ وہ باپ کی جا بجا

ہو۔ اسے لکھو کہ وہ دین کی تکمیل کرے۔ کیونکہ باپ کی ہی رَوِش پر ہونا چاہیئے۔

منشی جلال الدین بھی بڑے مخلص تھے اور ان کے ہمنام پیرکوٹ والے بھی۔ دونوں میں سے ہم کسی کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ سال گذشتہ میں ہمارے کئی دوست جُدا ہو گئے۔ مولوی جمال الدین سیدوالہ بھی۔ مولوی شیر محمد ہوجن والے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادہ میں کوئی مصالح رکھے ہوں گے۔ اس سال میں حُزن کے معاملات دیکھنے پڑے۔[1]

۸ ؍دسمبر ۱۹۰۵ء

ایک مثالی قبرستان کی تجویز

مَیں چاہتا ہوں کہ جماعت کے لیے ایک زمین تلاش کی جاوے جو قبرستان ہو۔ یادگار ہو اور عبرت کا مقام ہو۔

قبروں پر جانے کی ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفت کی تھی۔ جب بُت پرستی کا زور تھا۔ آخر میں اجازت دے دی۔ مگر عام قبروں پر جا کر کیا اثر ہوگا جن کو جانتے ہی نہیں، لیکن جو دوست ہیں اور پارسا طبع ہیں ان کی قبریں دیکھ کر دل نرم ہوتا ہے۔ اس لیے اس قبرستان میں ہمارا ہر دوست جو فوت ہو اس کی قبر ہو۔ میرے دل میں خدا تعالیٰ نے پختہ طور پر ڈال دیا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ جو خارجاً مخلص ہو اور وہ فوت ہو جاوے اور اس کا ارادہ ہو کہ اس قبرستان میں دفن ہو۔ وہ صندوق میں دفن کر کے یہاں لایا جاوے۔ اس جماعت کو بہ ہیئتِ مجموعی دیکھنا مفید ہوگا۔ اس کے لیے اوّل کوئی زمین لینی چاہیئے اور مَیں چاہتا ہوں کہ باغ کے قریب ہو۔

فرمایا :

عجیب مؤثر نظارہ ہوگا جو زندگی میں ایک جماعت تھے مرنے کے بعد بھی ایک جماعت ہی نظر آئے گی۔ یہ بہت ہی خوب ہے۔ جو پسند کریں وہ پہلے سے بندوبست کر سکتے ہیں کہ یہاں دفن ہوں۔ جو لوگ صالح معلوم ہوں ان کی قبریں دُور نہ ہوں۔ ریل نے آسانی کا سامان کر دیا ہے اور اصل تو یہ ہے مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان : ۳۵) مگر اس میں یہ کیا لطیف نکتہ ہے کہ

---

[1] الحکم جلد ۱۳ نمبر ۱ صفحہ ۱۳ مورخہ ۷ ؍جنوری ۱۹۰۹ء

بِاَیِّ اَرْضٍ تُدْفَنُ نہیں لکھا۔ صلحاء کے پہلو میں دفن بھی ایک نعمت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے، کہ مرض الموت میں انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہلا بھیجا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں جو جگہ ہے انہیں دی جاوے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سے کام لے کر وہ جگہ ان کو دیدی تو فرمایا:

مَا بَقِیَ لِیْ هَمٌّ بَعْدَ ذَالِكَ

یعنی اس کے بعد اب مجھے کوئی غم نہیں۔ جبکہ مَیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے روضہ میں مدفون ہوں۔ مجاورت بھی خوشحالی کا موجب ہوتی ہے۔ مَیں اس کو پسند کرتا ہوں۔ اور یہ بدعت نہیں کہ قبروں پر کتبے لگاتے جاویں۔ اس سے عبرت ہوتی ہے اور ہر کتبہ جماعت کی تاریخ ہوتی ہے ہماری نصیحت یہ ہے کہ ایک طرح سے ہر شخص گور کے کنارے ہے کسی کو موت کی اطلاع مل گئی اور کسی کو اچانک آجاتی ہے یہ گھر بے بنیاد بہت سے لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے گھر بالکل ویران ہو جاتے ہیں۔ ایسے واقعات کو انسان دیکھتا ہے۔ جبتک مٹی ڈالتا ہے دل نرم ہوتا ہے۔ پھر دل سخت ہو جاتا ہے یہ بدقسمتی ہے۔[1]

۲۶/دسمبر ۱۹۰۵ء

ایک الہام اور اس کی لطیف تشریح

یَا قَمَرُ یَا شَمْسُ اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ

(ترجمہ) اے چاند اے سُورج تُو مجھ سے ہے اور مَیں تجھ سے ہوں

فرمایا۔

اس الہام میں خدا تعالیٰ نے ایک دفعہ اپنے آپ کو سُورج فرمایا ہے اور مجھے چاند اور دُوسری دفعہ مجھے سُورج فرمایا ہے اور اپنے آپ کو چاند۔ یہ ایک لطیف استعارہ ہے جس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے میری نسبت یہ ظاہر فرمایا ہے کہ مَیں ایک زمانہ میں پوشیدہ تھا اور اس کی روشنی

---

[1] الحکم جلد ۱۳ نمبر ۱ صفحہ ۱۳ مورخہ ۷/جنوری ۱۹۰۹ء

کے انعکاس سے میں ظاہر ہوا۔ اور پھر فرمایا کہ ایک زمانہ میں وہ خود پوشیدہ تھا۔ پھر وہ روشنی جو مجھے دی گئی اس روشنی نے اس کو ظاہر کیا۔ یہ ایک مشہور مسئلہ ہے کہ نُورُ الْقَمَرِ مُسْتَفَادٌ مِنْ نُوْرِ الشَّمْسِ۔ یعنی چاند کا نور سورج کے نُور سے فیض حاصل کرنے والا ہے۔ پس اس الہام میں اوّل خدا تعالیٰ نے اپنے تئیں سُورج قرار دیا اور اس کے انوار اور فیوض کے ذریعہ سے مجھ میں نُور پیدا ہونا بیان فرمایا۔ اس لیے میں قمر کہلایا۔ پھر چونکہ میری روشنی سے جو مجھے دی گئی اس کا نام روشن ہوا۔ اس لیے اس بنا پر مجھے سُورج قرار دیا گیا اور خدا تعالیٰ نے آپ کو قمر قرار دیا کیونکہ وہ میرے ذریعہ سے ظاہر ہوا۔ اور اس نے اپنا زندہ وجود میرے وسیلہ سے لوگوں پر نمایاں کیا۔

یہ شمس و قمر کا خطاب الہام کے دُوسرے حصّہ کی تشریح ہے کہ اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ یہ ایک ایسی نظیر ہے جو انسان کے وہم و گمان میں نہیں آسکتی[1]۔

تقریر حضرت مسیح موعُود علیہ السلام

جو ۲۶؍ دسمبر ۱۹۰۵ء کو قبل دوپہر آپ نے مہمان خانہ جدید میں فرمائی

میں نے یہ امر پیش کیا تھا کہ ہماری جماعت میں سے ایسے لوگ تیار ہونے چاہئیں جو واقعی طور پر دین سے واقف ہوں اور اس لائق بھی ہوں کہ وہ ان حملوں کا جو بیرونی اور اندرونی طور پر اسلام پر ہو رہے ہیں، پورا پورا جواب دے سکیں[2]۔ اسلام کی اندرونی بدعات اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ ان کی وجہ اور جہالت سے ہم کافر ٹھہرائے گئے ہیں۔ اور ہم ایسی کراہت کی نظر سے دیکھے گئے ہیں کہ حال کے مخالف علمار کے فتووں کے موافق ہماری جماعت مسلمانوں کے قبرستان میں بھی داخل ہونے کے قابل نہیں۔

---

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۱۴ صفحہ ۲ مورخہ ۲۹؍ دسمبر ۱۹۰۵ء

[2] بدر میں ہے کہ مدرسہ کے متعلق اصلاح کا ذکر کرتے ہوئے حضور نے یہ بات بیان فرمائی :۔
ملاحظہ ہو :۔ بدر جلد ۲ نمبر ۲ صفحہ ۲ مورخہ ۱۲؍ جنوری ۱۹۰۶ء

جماعت کی مخالفت کی وجوہات

اندرونی طور پر یہ حالت ہے اور بیرونی دشمن اور مخالف ہمارے فرقہ سے اس درجہ مخالفت اور عداوت رکھتے ہیں اور اس حد تک ہم کو اور ہماری جماعت کو بُرا کہتے ہیں کہ گویا ہم سے ذاتی عداوت ہے۔ اور کسی فرقہ سے ایسی عداوت نہیں۔ عیسائی پادریوں کے سینہ پر بھاری پتھر یہی جماعت ہے۔ آریوں کی نظر کے سامنے سخت دشمن ہم ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی دو وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ان لوگوں کو خُوب معلوم ہے کہ کمربستہ ہو کر کُفر اور مخالفوں کے طریق کو دُور کرنا ہمارا ہی کام ہے۔ ہم میں نفاق کا شعبہ نہیں پایا جاتا اور حقیقت میں جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کی طرف سے آکر تبلیغ کرتا ہے، اس میں نفاق ہوتا ہی نہیں۔ پس ہم چونکہ اُن کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے اور اظہارِ حق سے نہیں رُکتے اور نہیں دبتے اس لیے طبعًا ہم انہیں بُرے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا عکس دُوسروں کے دل پر ضرور پڑتا ہے اور انسان تو انسان حیوانوں میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ مثلاً ایک بکری کو جس نے ساری عُمر میں کبھی بھیڑیئے کو نہ دیکھا ہو اور ایسا ہی بھیڑیئے نے بھی نہ دیکھا ہو، تاہم جب ایک دُوسرے کو دیکھیں گے تو ایک دُوسرے کے دل پر وہ اثر جو ان تعلقات کا ہو سکتا ہے ضرور پڑے گا۔ اسی طرح پر یہ ہمارے مخالف فطرتاً جانتے ہیں کہ ہمارے غلط عقائد کا استیصال اس فرقہ کے ذریعہ ہوگا اور اس لیے وہ فطرتاً ہمارے دشمن ہیں اور فی الحقیقت یہ سچی بات ہے کہ جو آسمان سے نازل ہوتا ہے، اس کا اثر سب پر پڑتا ہے۔ سیاہ دل اور کافر بھی اس اثر کو محسوس کرتے ہیں اور ایسا ہی نیک طینت اور سعید الفطرت بھی اس اثر سے متاثر ہوتے ہیں چونکہ اس کی غرض ہر بدی کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس لیے ان بدیوں کے حامی اس کی مخالفت کو ضرور اُٹھتے ہیں۔ پھر ہم مخالفت سے کیونکر بچ سکتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے اور آپؐ نے دعوت کی تو جس قدر مخالفت آپؐ کی کی گئی اور جس قدر دُکھ آپؐ کو دیئے گئے کسی جھوٹے پیغمبر کو نہیں دیئے گئے۔ خود آپؐ ہی کے زمانہ میں جھوٹے پیغمبر بھی اُٹھے مگر کوئی بتا سکتا ہے کہ مسیلمہ کذّاب اور اسود عنسی کو بھی اس قسم کے دُکھ دیئے گئے اور ان کی بھی ویسی ہی مخالفت کی گئی؟ مَیں سچ کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وُہ دُکھ دیا گیا کہ ہم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ بیان کریں اور نہ الفاظ مل سکتے ہیں کہ اُن کی تفصیل پیش کریں۔ اور آپؐ کے بالمقابل جھوٹے نبیوں کو کوئی دُکھ نہیں دیا گیا۔ اس کی کیا وجہ

تھی؛ یہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فطرتاً دلوں پر اثر پڑ گیا تھا کہ یہی شخص ہے جو اس کفر اور بدعت کو جو اس وقت پھیل رہی ہے دُور کر دے گا اور آخر وہ ہو کر رہا۔

اسی طرح پر آج ہماری مخالفت کی جاتی ہے۔ یہ ہمارے مخالف طبعاً یقین کرتے ہیں کہ ان کے غلط عقائد کا استیصال ہمارے ہی ہاتھ سے ہوگا۔ اس لیے وہ فطرتاً ہماری مخالفت کرتے ہیں اور ہم کو دُکھ دینے میں کوئی کمی نہیں کرتے مگر اُن کے یہ دُکھ اور ایذائیں ہمیں اپنے کام سے نہیں روک سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آجکل ہم بہت ہی غریب ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا کوئی بھی نہیں۔ اور وہی ہمیں بس ہے۔ ہمیشہ ہمارے خلاف یہ کوشش کی جاتی ہے کہ جب اور جس طرح کسی کا بس چلے اس تھوڑی سی قوم کو نابُود کر دیا جاوے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ وہ ہماری حفاظت کرتا ہے؛ ورنہ مخالفت کی تو یہ حالت ہے کہ اگر کوئی بیرونی مخالف مقدمہ کرے تو اندرونی مخالف اس سے سازش کرتے ہیں اور اس کو ہر قسم کی مدد دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی اندرونی مخالف حملہ کرے تو بیرونی دشمن اس سے آملتے ہیں۔ اور پھر سب ایک ہو کر مخالفت میں اُٹھتے ہیں۔

یہ ساری مخالفتیں بے حقیقت ہیں

ان ساری مخالفتوں، عداوتوں کو مَیں دیکھتا ہوں اور برداشت کرتا ہوں اور مجھے یہ سب بے حقیقت نظر آتی ہیں جب خدا تعالیٰ کے وعدوں پر نظر کرتا ہوں۔

چنانچہ اس کا ایک وعدہ یہ ہے جو پچیس برس ہوئے اشاعت پا چکا ہے۔ براہین احمدیہ میں لکھا گیا ہے۔ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (اٰل عمران: ۵۶)۔

یہ وعدہ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے منکروں کو میرے متبعین پر غالب نہیں کرے گا بلکہ وُہ مغلوب ہی رہیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر لوگ اس فرقہ حقہ کے مخالف ہیں خواہ وہ اندرونی ہوں یا بیرونی مغلوب رہیں گے۔

پس اس وعدۂ الٰہی کو دیکھ کر ساری مخالفتیں اور عداوتیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ اگرچہ ہم مطمئن ہیں کہ یہ وعدے پورے ہوں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے وعدے سچے ہیں وہ پورے ہو کر رہتے ہیں۔ کوئی انسان ان کو روک نہیں سکتا۔

مجاہدہ اور سعی کی ضرورت

تاہم دنیا جائے اسباب ہے۔ اس لیے اسباب سے کام لینا چاہیئے۔ دُنیا میں لوگ حصولِ مقاصد

کے لیے سعی کرتے ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں ہر شخص کوشش کرتا ہے۔ دیکھو ایک کسان کی خواہ کیسی ہی عمدہ زمین ہو۔ آب پاشی کے لیے کنواں بھی ہو لیکن پھر بھی وہ تردد کرتا ہے۔ زمین کو جوتتا ہے قلبہ رانی کرکے اس میں بیج ڈالتا ہے۔ پھر اس کی آب پاشی کرتا ہے۔ حفاظت اور نگہبانی کرتا ہے اور بہت کوشش اور محنت کے بعد وہ اپنا ماحصل حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح پر ہر قسم کے معاملات میں دنیا کے ہوں یا دین کے محنت، مجاہدہ اور سعی کی حاجت اور ضرورت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی کا اثر

اوائل صدرِ اسلام میں جبکہ اللہ تعالیٰ کے محض فضل وکرم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ کو وہ قوتِ قدسی عطا ہوئی کہ جس کے قوی اثر سے ہزاروں با اخلاص اور جان نثار مسلمان پیدا ہو گئے۔ آپ کی جماعت ایک ایسی قابلِ قدر اور قابلِ رشک جماعت تھی کہ ایسی جماعت کسی نبی کو نصیب نہیں ہوئی۔ نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ میں نے اس امر کے بیان کرنے میں ہرگز ہرگز مبالغہ نہیں کیا۔ بلکہ میں جانتا ہوں کہ وہ جماعت جس مقام اور درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اس کو پورے طور پر بیان ہی نہیں کر سکتے۔ ہمارے مخالف علماء اور دوسرے فرقے اگرچہ ہمارے مخالف ہیں تاہم وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان میں ہم نے مبالغہ کیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت تو ایسی شریر، کج فہم تھی کہ وہ حضرت موسیٰ کو پتھراؤ کرنا چاہتی تھی۔ بات بات میں سرکشی اور ضد کر بیٹھتے تھے۔ توریت کو پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی حالت کیسی تھی۔ وہ ایک سنگدل قوم تھی۔ کیا توریت میں ان کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ کہا گیا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہاں تو سرکش، ٹیڑھی، شریر وغیرہ ہی لکھا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جماعت، وہ اس سے بدتر تھی۔ جیسا کہ انجیل سے معلوم ہوتا ہے۔ خود حضرت عیسیٰ اپنی جماعت کو لالچی، بے ایمان کہتے رہے بلکہ یہاں تک بھی کہا کہ اگر تم میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو تو تم میں یہ برکات ہوں وہ برکات ہوں غرض وہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی جماعت سے ناراض ہی گئے اور انہیں ایک وفادار جماعت کے میسر نہ آنے کا افسوس ہی رہا۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ نہ توریت میں اور نہ انجیل میں کہیں بھی ان کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ نہیں کہا گیا۔ مگر برخلاف اس کے جو جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میسر آئی تھی اور جس نے آپ کی قوتِ قدسی سے اثر پایا تھا اس کے لیے قرآن شریف میں آیا ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ (البیّنۃ ۹ :) اس کا سبب کیا ہے؟ یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ کا نتیجہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجوہِ فضیلت میں سے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ آپؐ نے ایسی اعلیٰ درجہ

کی جماعت تیار کی۔ میرا دعویٰ ہے کہ ایسی جماعت آدم سے لے کر آخر تک کسی کو نہیں ملی۔

جماعت کی موجودہ حالت

میں دیکھتا ہوں کہ ابھی تک ہم کو بھی ایسی جماعت نہیں ملی۔ جب ہم کسی امر میں فیصلہ کردیں تو تھوڑے ہیں جو اس کو شرح صدر سے منظور کرلیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تو وہ ایسے فدائی اور جاں نثار تھے کہ جانیں دے دیں۔ اب اگر اتنا ہی کہا جاوے کہ سو دو سو کوس پر جاؤ اور وہاں دو چار برس تک بیٹھے رہو تو پھر گننے مِننے لگ جاویں۔ زبان سے تو کہنے کو کہہ دیتے ہیں کہ آپ جو کردیں ہم کو منظور ہے لیکن جب کہا جاوے تو پھر ناراضگی کا موجب ہوتا ہے۔ یہ نفاق ہوتا ہے۔ میں منافقوں کو پسند نہیں کرتا اللہ تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے؛

اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۶)

یقیناً یاد رکھو کہ منافق کافر سے بھی بدتر ہے، اس لیے کہ کافر میں شجاعت اور قوتِ فیصلہ تو ہوتی ہے۔ وہ دلیری کے ساتھ اپنی مخالفت کا اظہار کر دیتا ہے مگر منافق میں شجاعت اور قوتِ فیصلہ نہیں ہوتی۔ وُہ چھپاتا ہے۔

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر جماعت میں وہ اطاعت ہوتی جو ہونی چاہیئے تھی تو اب تک یہ جماعت بہت کچھ ترقی کرلیتی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ ابھی تک کمزور ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ میرا کہا نہیں مانتے، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی ابتلا آجاوے تو موت آجاوے۔ جماعت کی ایسی حالت دیکھ کر دل میں درد پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے امر اور وحی سے قبرستان کی تجویز

اب جو بار بار اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا کہ تیری اجل کے دن قریب ہیں۔ جیسا کہ یہ الہام ہے:۔

قَرُبَ اَجَلُكَ الْمُقَدَّرُ۔ وَلَا نُبْقِیْ لَكَ مِنَ الْمُخْزِیَاتِ ذِكْرًا

ایسا ہی اُردو زبان میں بھی فرمایا ؛

بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اس دن سب پر اداسی چھا جائے گی۔

غرض جب خدا تعالیٰ نے مجھ پر یہ ظاہر کر دیا کہ اب تھوڑے دن باقی ہیں تو اسی لیے میں نے وہ تجویز سوچی جو قبرستان کی ہے۔ اور یہ تجویز میں نے اللہ تعالیٰ کے امر اور وحی سے کی ہے اور اسی کے امر سے اس کی بناء ڈالی ہے کیونکہ اس کے متعلق عرصہ سے مجھے خبر دی گئی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ

تجویز بھی بہت سے لوگوں کے لیے ابتلاء کا موجب ہو گی لیکن اس بنا سے غرض یہی ہے کہ تا آنیوالی نسلوں کے لیے ایک ایسی قوم کا نمونہ ہو جیسے صحابہؓ کا تھا اور تا لوگ جانیں کہ وہ اسلام اور اس کی اشاعت کے لیے فدا شدہ تھے۔ ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے؛ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (العنکبوت: ۳) یعنی کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اتنی ہی بات پر راضی ہو جاوے اور وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے؛ حالانکہ وہ ابھی امتحان میں نہیں ڈالے گئے اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (اٰل عمران: ۹۳) یعنی اس وقت تک تم حقیقی نیکی کو حاصل ہی نہیں کر سکتے جبتک تم اس چیز کو خرچ نہ کرو گے جو تم کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔

اب غور کرو جبکہ حقیقی نیکی اور رضاء الٰہی کا حصول ان باتوں کے بغیر ممکن ہی نہیں تو پھر نری لاف گزاف سے کیا ہو سکتا ہے۔ صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ ان میں سے مثلاً ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ قدم اور صدق تھا کہ سارا مال ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ خدا تعالےٰ کے لیے زندگی وقف کر چکے تھے۔ اور انہوں نے اپنا کچھ بھی نہ رکھا تھا۔ مومن کی بھلائی کے دن بھلے آتے ہیں تو ایسے موقعوں پر جبکہ اس کو کچھ خرچ کرنا پڑے خوش ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ جوہرِ صدق و صفا کے جو اب تک چھپے ہوتے تھے ظاہر ہوں گے۔ برخلاف اس کے منافق ڈرتا ہے اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اب اس کا نفاق ظاہر ہو جائے گا۔

یہ قبرستان کا امر بھی اسی قسم کا ہے مومن اس سے خوش ہوں گے اور منافقوں کا نفاق ظاہر ہو جائے گا۔ مَیں نے اس امر کو جبتک تواتر سے مجھ پر نہ کھلا پیش نہیں کیا۔ اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ آخر ہم سب مرنے والے ہیں۔ اب غور کرو کہ جو لوگ اپنے بعد اموال چھوڑ جاتے ہیں وہ اموال ان کی اولاد کے قبضہ میں آتے ہیں۔ مرنے کے بعد انہیں کیا معلوم کہ اولاد کیسی ہو؟ بعض اوقات اولاد ایسی شریر اور فاسق فاجر نکلتی ہے کہ وہ سارا مال شراب خانوں اور زنا کاری میں اور ہر قسم کے فسق و فجور میں تباہ کیا جاتا ہے اور اس طرح پر وہ مال بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتا ہے اور چھوڑنے والے پر عذاب کا موجب ہو جاتا ہے جبکہ یہ حالت ہے تو پھر کیوں تم اپنے اموال کو ایسے موقع پر خرچ نہ کرو جو تمہارے لیے ثواب اور فائدہ کا باعث ہو۔ اور وہ یہی صورت ہے کہ تمہارے مال میں دین کا بھی حِصّہ ہو۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ اگر تمہارے مال میں دین کا بھی حِصّہ ہے تو اس بدی کا تدارک ہو جائے گا۔ جو اس مال کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔ یعنی جو بدی اولاد کرتی ہے۔

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ تم اس بات کو خوب یاد رکھو کہ جیسا کہ قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے اور ایسا ہی دُوسرے نبیوں نے بھی کہا ہے یہ سچ ہے کہ دولت مند کا بہشت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اُونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا مال اس کے لیے بہت سی روکوں کا موجب ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا مال تمہارے واسطے ہلاکت اور ٹھوکر کا باعث نہ ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اُسے دین کی اشاعت اور خدمت کے لیے وقف کرو۔

سچّا مومن کون ہے ؟

یقیناً یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہی مومن اور بیعت میں داخل ہوتا ہے جو دین کو دُنیا پر مقدّم کرے جیسا کہ وہ بیعت کرتے وقت کہتا ہے۔ اگر دُنیا کی اغراض کو مقدّم کرتا ہے تو وہ اس اقرار کو توڑتا ہے اور خدا تعالےٰ کے نزدیک وہ مجرم ٹھہرتا ہے۔ پس اسی غرض سے یہ اشتہار (الوصیت) مَیں نے خدا تعالےٰ کے اذن سے دیا ہے۔ سچی بات یہی ہے۔ سال دیگر راکہ مے داند حساب۔ لیکن جبکہ خدا تعالےٰ کی متواتر وحی نے مجھ پر کھولا کہ وقت قریب ہے اور اجلِ مقدر کا الہام ہوا تو مَیں نے اللہ تعالیٰ ہی کے اشارہ سے یہ اشتہار دیا کہ تا آئندہ کے لیے اشاعتِ دین کا سامان ہو اور تا لوگوں کو معلوم ہو کہ آمنّا و صدّقنا کہنے والوں کی عملی حالت کیا ہے۔ یقیناً یاد رکھو کہ جبتک انسان کی عملی حالت درست نہ ہو زبان کچھ چیز نہیں۔ یہ نِری لاف گزاف ہے۔ زبان تک جو ایمان رہتا ہے اور دل میں داخل ہو کر اپنا اثر عملی حالت پر نہیں ڈالتا وہ منافق کا ایمان ہے۔ سچا ایمان وہی ہے جو دل میں داخل ہو اور اسکے اعمال کو اپنے اثر سے رنگین کر دے۔ سچا ایمان ابوبکرؓ اور دُوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا، کیونکہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال تو مال جان تک کو دے دیا اور اس کی پروا بھی نہ کی۔ جان سے بڑھ کر اَور کوئی چیز نہیں ہوتی، مگر صحابہؓ نے اُسے بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دیا۔ انہوں نے کبھی اس بات کی پروا بھی نہیں کی کہ بیوی بیوہ ہو جائے گی یا بچے یتیم رہ جائیں گے بلکہ وہ ہمیشہ اسی آرزو میں رہتے کہ خُدا تعالےٰ کی راہ میں ہماری زندگیاں قربان ہوں۔

مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا نقش دل پر ہو جاتا ہے اور کیسی بابرکت وہ قوم تھی اور آپؐ کی قوتِ قدسیہ کا کیسا قوی اثر تھا کہ اس قوم کو اس مقام تک پہنچا دیا۔ غور کر کے دیکھو کہ آپؐ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ایک حالت اور وقت ان پر ایسا تھا کہ تمام محرمات ان کے لیے شیرِ مادر کی طرح تھیں۔ چوری، شراب خوری، زنا، فسق و فجور سب

کچھ تھا۔ غرض کونسا گناہ تھا جو اُن میں نہ تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت اور تربیت سے اُن پر وُہ اثر ہوا۔ اور ان کی حالت میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شہادت دی اور کہا اَللّٰه اَللّٰه فِيْ اَصْحَابِيْ۔ گویا بشریت کا چولہ اُتار کر مظہر اللہ ہو گئے تھے اور ان کی حالت فرشتوں کی سی ہو گئی تھی جو يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (التحریم : ۷) کے مصداق ہیں ٹھیک ایسی ہی حالت صحابہؓ کی ہو گئی تھی۔ ان کے دلی ارادے اور نفسانی جذبات بالکل دُور ہو گئے تھے۔ ان کا اپنا کچھ رہا ہی نہیں۔ نہ کوئی خواہش تھی نہ آرزو بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ اور اس کے لیے وُہ خدا تعالیٰ کی راہ میں بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔ قرآن شریف ان کی اس حالت کے متعلق فرماتا ہے: مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ (الاحزاب : ۲۴)

دین کو دُنیا پر مقدم کرو

یہ حالت انسان کے اندر پیدا ہو جانا آسان بات نہیں کہ وہ خُدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کو آمادہ ہو جاوے مگر صحابہؓ کی حالت بتاتی ہے کہ انہوں نے اس فرض کو ادا کیا۔ جب انہیں حکم ہوا کہ اس راہ میں جان دے دو پھر وُہ دُنیا کی طرف نہیں جُھکے پس یہ ضروری امر ہے کہ تم دین کو دنیا پر مقدّم کرو۔

یاد رکھو اب جس کا اُصول دُنیا ہے اور پھر وہ اس جماعت میں شامل ہے۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ اس جماعت میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی اس جماعت میں داخل اور شامل ہے جو دنیا سے دست بردار ہے۔ یہ کوئی مت خیال کرے کہ مَیں ایسے خیال سے تباہ ہو جاؤں گا۔ یہ خداشناسی کی راہ سے دُور لے جانے والا خیال ہے۔ خدا تعالیٰ کبھی اس شخص کو جو محض اسی کا ہو جاتا ہے۔ ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ خود اس کا متکفّل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے جو شخص اس کی راہ میں کچھ کھوتا ہے وہی کچھ پاتا ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کو پیار کرتا ہے اور انہیں کی اولاد بابرکت ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کے حکموں کی تعمیل کرتا ہے۔ اور یہ کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو گا کہ خدا تعالیٰ کا سچا فرماں بردار ہو وہ یا اس کی اولاد تباہ و برباد ہو جاوے۔ دُنیا ان لوگوں ہی کی برباد ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کو چھوڑتے ہیں اور دُنیا پر جھکتے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہر امر کی طناب اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بغیر کوئی مقدمہ فتح نہیں ہو سکتا۔ کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی اور کسی قسم کی آسائش اور راحت میسّر نہیں آ سکتی دولت ہو سکتی ہے مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرنے کے بعد یہ بیوی یا بچوں کے ضرور کام آئے گی۔ ان باتوں پر غور کرو اور اپنے اندر ایک نئی تبدیلی پیدا کرو۔

غرض مجھے افسوس ہوتا ہے جب مَیں جماعت کو دیکھتا ہوں کہ یہ ابھی تھوڑے ابتلا کے بھی لائق نہیں

وجہ یہ ہے کہ ابھی تک وہ قوتِ ایمانی پیدا نہیں ہوئی جو ہونی چاہیئے۔ ابھی تک جو تعریف کی جاتی ہے وہ خدا تعالیٰ کی ستاری کرا رہی ہے۔ لیکن جب کوئی ابتلاء اور آزمائش آتی ہے تو وہ انسان کو ننگا کر کے دکھا دیتی ہے۔ اس وقت وہ مرض جو دل میں ہوتی ہے اپنا پورا اثر کر کے انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا۔ (البقرۃ : ۱۱) یہ مرض ابتلاء ہی کے وقت بڑھتی اور اپنا پورا زور دکھاتی ہے خدا تعالیٰ کی یہ بھی عادت ہے کہ وہ دلوں کی مخفی قوتوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ جو شخص اپنے دل میں ایک نُور رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا صدق اور اخلاص ظاہر کر دیتا ہے اور جو دل میں خبث اور شرارت رکھتا ہے اس کو بھی کھول کر دکھا دیتا ہے اور کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔

ایک صادق جماعت ملنے کا وعدہ

یقیناً سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ پیارے نہیں ہیں جن کی پوشاکیں عمدہ ہوں اور وہ بڑے دولت مند اور خوش خور ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ پیارے ہیں جو دین کو دُنیا پر مقدم کر لیتے ہیں اور خالص خدا ہی کے لیے ہو جاتے ہیں پس تم اس امر کی طرف توجہ کرو نہ پہلے امر کی طرف۔ اگر مَیں جماعت کی موجودہ حالت پر ہی نظر کروں تو مجھے بہت غم ہوتا ہے کہ ابھی بہت ہی کمزور حالت ہے اور بہت سے مراحل باقی ہیں جو اس نے طے کرنے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر نظر کرتا ہوں جو اس نے مجھ سے کئے ہیں تو میرا غم امید سے بدل جاتا ہے۔ منجملہ اس کے وعدوں کے ایک یہ بھی ہے، جو فرمایا :

وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ (آل عمران : ۵۶)

یہ تو سچ ہے کہ وہ میرے متبعین کو میرے منکروں اور میرے مخالفوں پر غلبہ دے گا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ متبعین میں سے ہر شخص محض میرے ہاتھ پر بیعت کرنے سے داخل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے اندر وہ اتباع کی پوری کیفیت پیدا نہیں کرتا متبعین میں داخل نہیں ہو سکتا۔ پوری پوری پیروی جب تک نہیں کرتا۔ ایسی پیروی کہ گویا اطاعت میں فنا ہو جاوے اور نقشِ قدم پر چلے، اس وقت تک اتباع کا لفظ صادق نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسی جماعت کے لیے مقدر کی ہے جو میری اطاعت میں فنا ہو اور پورے طور پر میری اتباع کرنے والی ہو۔ اس سے مجھے تسلّی ملتی اور میرا غم امید سے بدل جاتا ہے۔ مجھے اس بات کا غم نہیں کہ ایسی جماعت نہ ہوگی نہیں جماعت تو ضرور ہوگی اس لیے کہ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ ایسے لوگ ضرور ہوں گے۔ مگر غم اس

بات کا ہے کہ ابھی جماعت کچی ہے اور پیغام موت آرہا ہے۔ گویا جماعت کی حالت اس بچہ کی سی ہے جس نے ابھی دو چار روز دُودھ پیا ہو اور اس کی ماں مرجائے۔[1]

بہرحال خدا تعالیٰ کے وعدوں پر میری نظر ہے اور وہ خدا ہی ہے جو میری تسکین اور تسلی کا باعث ہے۔ ایسی حالت میں کہ جماعت کمزور اور بہت کچھ تربیت کی محتاج ہے۔ یہ ضروری امر ہے کہ میں تمہیں توجہ دلاؤں کہ تم خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرو۔ اور اسی کو مقدم کر لو اور اپنے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک جماعت کو ایک نمونہ سمجھو ان کے نقشِ قدم پر چلو۔

صحابہ کرام کی پاک جماعت کا نمونہ

میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ ایک ایسی صادق جماعت تھی جو اپنے ایمان قوی کے لحاظ سے جان فدا کرنے میں بھی دریغ نہ کرتی تھی بلکہ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ وہ ایک ایسی قوم ہے کہ اس کی نظیر مل سکتی ہی نہیں۔ جب ہم دوسری قوموں کا اُن سے مقابلہ کرتے ہیں تو اُن کی عظمت اور شوکت کا اَور بھی دل پر اثر ہوتا ہے۔ اور جس قدر غور کرتے جاویں آپؐ کے مراتب اور مدارج پر حیرت ہوتی ہے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے کیسی قوتِ قدسی عنایت فرمائی تھی اور اس میں ایسی تاثیر اور طاقت رکھی تھی کہ صحابہؓ جیسی جان نثار قوم آپؐ نے تیار کی۔ آپؐ ایسی قوم چھوڑ گئے تھے جو خالص خدا ہی کے لیے قدم اٹھانے والی تھی۔ وُہ خدا تعالیٰ کی راہ میں ایسے سرگرم اور تیار تھے اور اس راہ میں انہیں جان دے کر ایسی خوشی ہوتی تھی کہ آجکل کے دُنیا داروں کو کسی مقدمہ کی فتح سے بھی وہ خوشی نہیں ہو سکتی۔ وہ بالکل خدا ہی کے لیے ہو گئے تھے۔ ایسی زبردست اور بے مثل تبدیلی کوئی نبی اپنی قوم میں پیدا نہیں کر سکا۔ لکھا ہے کہ ایک صحابیؓ جنگ کر رہا تھا۔ اس نے دشمن پر تلوار ماری، لیکن وہ تلوار دشمن کو تو نہ لگی اُلٹ کر اُسی کے آ لگی۔ بعض نے کہا کہ وہ شہید نہیں ہوا۔ اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، تو اس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا کہ کیا میں شہید نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اُسے اس بات کا سخت غم تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تجھ کو دو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ ایک تو تُو نے دشمن پر حملہ کیا۔ دُوسرے خود اسی راہ میں مارا گیا۔ بات کیا تھی؟ صرف یہ کہ وہ نہ چاہتے تھے کہ یہ مرتبہ شہادت ہم سے

---

[1] حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مُنہ سے جس وقت یہ جُملے نکلے ان میں کچھ ایسا درد اور رقت تھی کہ اس نے سامعین کو بے قرار کر دیا اور کئی آدمی جو آخر ضبط نہ سکے پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑے۔ (ایڈیٹر)

[2] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ صفحہ ۳ تا ۵ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۶ء۔

رہ جاوے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اپنی محبت سے بھر دیا تھا اور اتنا ہی نہیں تھا بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت اور معرفت الٰہی میں اعلیٰ درجہ تک پہنچ گئے تھے اور اسی درجہ سے ان کی عقل فہم اور فراست میں بہت بڑی ترقی ہو گئی تھی۔

ایک انگریز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ لکھتا ہے کہ صحابہؓ میں علاوہ اس کے کہ ان میں صدق اور ایمان کی وہ طاقت موجود تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سر دینے کو تیار ہو جاتے تھے اور ایسی جگہ کھڑے ہوتے تھے، جہاں بجزُ جان دینے کے اَور کوئی چارہ ہی نہ ہوتا تھا، لیکن برخلاف اس کے مسیح کے حواریوں کی یہ حالت تھی کہ خود انہیں میں سے ایک نے تیس روپے لے کر پکڑوا دیا اور دُوسرے اس کے پاس سے بھاگ گئے اور دو گھڑی بھی اس کے ساتھ نہ ٹھہر سکے۔ سامنے کھڑے ہو کر ایک نے لعنت کی۔ ایسے حواریوں کو صحابہؓ کے ساتھ کیا نسبت اور کیا مقابلہ؟

پھر عقلی طور پر مقابلہ کر کے لکھا ہے کہ حواریوں کی تو یہ حالت تھی کہ وہ ایک گاؤں کا انتظام کرنے کی بھی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ برخلاف اُن کے صحابہؓ نے علومِ سیاست اور حکمرانی میں وہ کمال دکھایا اور ایسی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیا کہ آج اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ انہوں نے ایک عظیم الشان سلطنت کا انتظام کیا۔ حضرت عُمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کا نمونہ موجود ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں ایسا خطرناک فتنہ پیدا ہوا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو سخت مشکلات کا سامنا تھا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خدا تعالیٰ سے تائید پا کر اس فتنہ کو اور جو جنگلی بادیہ نشین مُرتد ہو گئے تھے ان کو سدھارا اور دُرست کیا۔ غرض باوجود اس بات کے کہ وہ تیار شدہ تھے اور صِدق اور نور سے بھرے ہوئے تھے، تاہم اللہ تعالیٰ ان کو فرماتا ہے:۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ (التوبہ: ۱۲۲) یعنی ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو تفقہ فی الدین کریں یعنی جو دین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے اس میں تفقہ کر سکیں۔ یہ نہیں کہ طوطے کی طرح یاد ہو اور اس میں غور و فکر کی مطلق عادت اور مذاق ہی نہ ہو۔ اس سے وہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے اور وہی غرض ہماری ہے یعنی محل اور موقعہ کے حسبِ حال جواب دے سکیں۔ مناظرہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ سب کے سب ایسے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ سب کے سب ایسے ہو جائیں بلکہ یہ فرمایا کہ ہر جماعت اور گروہ میں سے ایک ایک آدمی ہو اور گویا ایک جماعت ایسے لوگوں کی ہونی چاہیئے جو تبلیغ اور اشاعت کا کام کر سکیں۔

انسانوں کے تین درجات

اس لیے بھی کہ ہر شخص ایسی طبیعت اور مذاق کا نہیں ہوتا۔ خود اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تقسیم تین طرح پر کی ہے۔ مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ (فاطر: ۳۳) یعنی تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کہلاتے ہیں ان کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ خواہشِ نفس ان پر غالب ہوتی ہے اور وہ گویا پنجۂ نفس میں گرفتار ہوتے ہیں۔ دوم وہ لوگ ہیں جو مقتصد یعنی میانہ کہلاتے ہیں۔ یعنی کبھی نفس ان پر غالب ہو جاتا ہے اور کبھی وہ نفس پر غالب ہو جاتے ہیں اور پہلی حالت سے نکل چکے ہوتے ہیں، لیکن تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو پنجۂ نفس سے کلی رہائی پا لیتے ہیں اور سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ کہلاتے ہیں۔ یعنی نیکی کرنے میں سب سے سبقت لے جاتے ہیں۔ اور وہ محض خدا ہی کے لیے ہو جاتے ہیں۔ ان میں علمی اور عملی قوت آجاتی ہے۔ ایسے لوگ خدمتِ دین کے لیے مفید اور کار آمد ہوتے ہیں۔ اس قانون کو مدِنظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے بعض کا حکم دیا۔ کیونکہ کُل کے کُل تو اس مقصد کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت ہے کہ بعض لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو تجارت، زراعت یا ملازمت کریں اور ایسے بھی ہونے چاہئیں جو دین کی تبلیغ کرنے والے ہوں تاکہ قوم آئندہ ٹھوکروں سے بچ جاوے۔

یہ یاد رکھو کہ جب کوئی قوم تباہ ہونے کو آتی ہے تو پہلے اس میں جہالت پیدا ہوتی ہے اور وہ دین جو انہیں سکھایا گیا تھا اُسے بھول جاتے ہیں۔ جب جہالت پیدا ہوتی ہے تو اس کے بعد یہ معصیت اور بلا آتی ہے کہ اس قوم میں تقویٰ نہیں رہتا اور اس میں فسق و فجور اور ہر قسم کی بدکرداری شروع ہو جاتی ہے اور آخر اللہ تعالیٰ کا غضب اس قوم کو ہلاک کر دیتا ہے کیونکہ تقویٰ اور خدا ترسی علم سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ (فاطر: ۲۹) یعنی اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو عالم ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم خشیت اللہ کو پیدا کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ نے علم کو تقویٰ سے وابستہ کیا ہے کہ جو شخص پورے طور پر عالم ہوگا اس میں ضرور خشیۃ اللہ پیدا ہوگی۔ علم سے مراد میری دانست میں علم القرآن ہے۔ اس سے فلسفہ، سائنس یا اَور علوم مروجہ مُراد نہیں کیونکہ اُن کے حصول کے لیے تقویٰ اور نیکی کی شرط نہیں بلکہ جیسے ایک فاسق فاجر اُن کو سیکھ سکتا ہے ویسے ہی ایک دیندار بھی، لیکن علم القرآن بجُز متقی اور دیندار کے کسی دُوسرے کو دیا ہی نہیں جاتا۔ پس اس جگہ علم سے مُراد علم القرآن ہی ہے جس سے تقویٰ اور خشیت پیدا ہوتی ہے۔

مبلغین کے لیے دنیوی علوم کی ضرورت

ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن شریف سے ثابت ہے کہ جس قوم سے تمہیں مقابلہ پیش آوے اس مقابلہ میں تم بھی ویسے ہی ہتھیار استعمال کرو جیسے ہتھیار وہ مقابلہ والی قوم استعمال کرتی ہے۔ اور چونکہ آجکل مذہبی مناظرہ کرنے والے لوگ ایسے امور پیش کر دیتے ہیں جن کا سائنس اور موجودہ علوم سے تعلق ہے اس لیے اس حد تک ان علوم میں واقفیت اور دخل کی ضرورت ہے جیسے مثلاً اعتراض کر دیتے ہیں کہ جن ممالک میں چھ ماہ تک آفتاب طلوع یا غروب نہیں ہوتا۔ وہاں نماز یا روزہ کے احکام کی تعمیل کس طرح پر ہوگی؟ اب جو شخص ان ممالک سے واقف نہیں یا ان باتوں پر اطلاع نہیں رکھتا وہ سنتے ہی گھبرا جاویگا اور حیران ہوکر رہ جاویگا۔ ایسا اعتراض کرنے والوں کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کی تکمیل کو ناقص قرار دیں کہ ایسے ممالک کے لیے کوئی اور حکم ہونا چاہیئے تھا۔ غرض ایسے اعتراضات چونکہ آجکل ہوتے ہیں، اس لیے ضروری امر ہے کہ ان علوم میں کچھ نہ کچھ دسترس ضرور ہو۔

ایسا ہی بعض لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف گردشِ آسمان کا قائل ہے جیسے فرمایا وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ۔ (الطارق : ۱۲) حالانکہ آجکل کے بچے بھی جانتے ہیں کہ زمین گردش کرتی ہے۔ غرض اسی قسم کے بیسیوں اعتراض کر دیتے ہیں اور تا وقتیکہ ان علوم میں کچھ مہارت اور واقفیت نہ ہو جواب دینے میں مشکل پیدا ہوتی ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ زمین یا آسمان کی گردش ظنی امور ہیں ان کو یقینیات میں داخل نہیں کر سکتے۔ ایک زمانہ تک گردشِ آسمان کے قائل رہے پھر زمین کی گردش کے قائل ہو گئے۔ سب سے زیادہ ان لوگوں کی طبابت پر مشق ہے لیکن اس میں بھی دیکھ لو کہ آئے دن تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً پہلے ذیابیطس کے لیے یہ کہتے تھے کہ اس کے مریض کو میٹھی چیز نہیں کھانی چاہیئے مگر اب جو تحقیقات ہوئی ہے تو کہتے ہیں کچھ ہرج نہیں اگر سنگترہ بھی کھا لے یا چاء پی لے۔

غرض یہ سب علوم ظنی ہیں۔ اس موقعہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ کے معنے بتا دیئے جاویں۔ کیونکہ اس کا ذکر آگیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ سماء کے معنے آسمان ہی کے نہیں ہیں بلکہ سماء مینہ کو بھی کہتے ہیں۔ گویا اس آیت میں اس مینہ کی جو زمین کی طرف رجوع کرتا ہے قسم کھائی ہے اور پھر وہ زمین جس سے شگوفے نکلتے ہیں۔ اکیلی زمین اور اکیلا آسمان کچھ نہیں کر سکتا۔

وحیِ الٰہی کی ضرورت پر ایک عقلی دلیل

اس آیت کو اللہ تعالیٰ ضرورتِ وحی پر بطور مثال پیش کرتا ہے کہ ہر چند زمین میں جو جوہر

قابل ہوں اور اس کی فطرت میں نشوونما کا مادہ ہو لیکن وہ نشوونما نہیں پا سکتا اور فطرت بار آور نہیں ہو سکتی جبتک آسمان سے مینہ نہ برسے ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم وخس

اس غرض کے لیے کہ عمدہ عمدہ پھل اور پھول پیدا ہوں، عمدہ زمین اور اس کے لیے بارش کی ضرورت ہے جبتک یہ بات نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب اس نظارۂ فطرت کو اللہ تعالیٰ ضرورتِ وحی کے لیے پیش کرتا ہے اور توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو جب مینہ نہ برسے تو قحط کا اندیشہ ہوتا ہے یہانتک کہ زمینی پانی جو کنوؤں اور چشموں میں ہوتا ہے، وہ بھی کم ہونے لگتا ہے۔ پھر جبکہ دنیوی اور جسمانی ضرورتوں کے لیے آسمانی پانی کی ضرورت ہے تو کیا رُوحانی اور ابدی ضرورتوں کے لیے رُوحانی بارش کی ضرورت نہیں؟ اور وہ وحیٔ الٰہی ہے۔ جیسے مینہ کے نہ برسنے سے قحط پڑتا اور کنوئیں اور چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پر اگر انبیاء و رُسل دنیا میں نہ آئیں تو فلسفیوں کا وجود بھی نہ ہو کیونکہ قویٰ عقلیہ کا نشوونما وحیٔ الٰہی ہی سے ہوتا ہے اور زمینی عقلیں اسی سے پرورش پاتی ہیں۔

پس اس آیت وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۔ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (الطارق: ١٢، ١٣) میں وحی الٰہی کی ضرورت پر عقلی اور فطرتی دلائل پیش کئے ہیں۔ جو شخص اس امر کو سمجھ لے گا وہ بول اُٹھے گا کہ بیشک وحیٔ الٰہی کی ضرورت ہے۔ اور یہ وہ طریق ہے جو آدم سے چلا آتا ہے اور ہر شخص نے اپنی استعداد اور فطرت کے موافق اس سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ہاں جو جاہل اور ناقص تھے یا جن میں تکبّر اور خودسری تھی وہ محروم رہ گئے اور انہوں نے کچھ بھی حصّہ نہ لیا۔ یہی اصل اور سچّی بات ہے اور تم یقیناً یاد رکھو کہ آسمانی بارش کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے کہ عملی قوت بجُز اس بارش کے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

تقویٰ کا مدار علم پر ہے

غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تقویٰ بھی تب ہی پُورا ہوتا ہے، جب علمِ الٰہی اس کے ساتھ ہو۔ اور وُہ وُہ علم ہے جو کتاب اللہ میں مندرج ہے؛

یہ سچّی بات ہے کہ کوئی شخص مراتب ترقیات حاصل نہیں کر سکتا جب تک تقویٰ کی باریک راہوں کی پروا نہ کرے اور تقویٰ کا مدار علم پر ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مجید کے شروع ہی میں بیان فرمایا ہے؛

یہاں حضرتِ اقدس نے سُورہ بقرہ کے پہلے رکوع کے کچھ حصّہ کی تفسیر بیان فرمائی جس کو میں درج کرتا ہوں، لیکن سہولت اور اس تفسیر کی ترتیبِ اَبلغ کے لحاظ سے پہلے وہ حصّہ یکجائی طور پر درج کرتا ہوں اور پھر اس کا ترجمہ دیتا ہوں: زاں بعد تفسیر (ایڈیٹر الحکم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (البقرة : ۱ تا ۶)

ترجمہ:- میں اللہ جو بہت جاننے والا ہوں۔ یہ کتاب جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے۔ متقیوں کے لئے ہدایت نامہ ہے (متقی کون ہوتے ہیں) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو کھڑی کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں عطا کیا گیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور متقی وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر نازل کی گئی ہے اور اس وحی پر بھی جو تجھ سے پہلے نازل ہوئی۔ اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ربّ سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

تَفْسِیْر

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

میں اللہ جو بہت جاننے والا ہوں۔ یہ کتاب جو شک و شبہ اور ہر عیب و نقص سے پاک ہے متقیوں کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے۔

قرآن کریم کی عللِ اربعہ

ہر شَے کی چار علّتیں ہوتی ہیں۔ یہاں بھی ان عللِ اربعہ کو بیان کیا ہے۔ اور وہ عللِ اربعہ یہ ہوتی ہیں۔ علّت فاعلی۔ علّت صوری، علّت مادی، علّت غائی۔ اس مقام پر قرآن شریف کی چار علّتوں کا ذکر کیا۔

علّتِ فاعلی تو اس کتاب کی الٓمّٓ ہے۔ اور الٓمّٓ کے معنے میرے نزدیک اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ یعنی میں اللہ وہ ہوں جو سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اور علّتِ مادی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ہے۔

یعنی یہ کتاب خُدا تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے جو سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اور علّت صوری لَا رَیْبَ فِیْهِ ہے۔ یعنی اس کتاب کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ ہی نہیں۔ جو بات ہے مستحکم اور جو دعویٰ ہے وہ مدلّل اور روشن۔ اور علّتِ غائی اس کتاب کی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ یعنی اس کتاب کے نزول کی غرض و غایت یہ ہے کہ متقیوں کو ہدایت کرتی ہے۔

متقی کی صفات

یہ چاروں علّتیں بیان کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے متقیوں کی عام صفات بتائی ہیں کہ وہ متقی کون ہوتے ہیں جو ہدایت پاتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ یعنی وہ متقی ہوتے ہیں جو خدا پر ہنوز پردۂ غیب میں ہوتا ہے ایمان لاتے ہیں اور نماز کو کھڑا کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تجھ پر نازل کی ہے اور جو کچھ تجھ سے پہلے نازل ہوا۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ صفات متقی کے بیان فرمائے۔

اب یہاں بالطبع ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کتاب کی غرض و غایت تو یہ بتائی۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ اور پھر متقیوں کے صفات بھی وہ بیان کئے جو سب کے سب ایک باخدا انسان میں ہوتے ہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ پر ایمان لاتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو۔ صدقہ دیتا ہو۔ کتاب اللہ کو مانتا ہو۔ قیامت پر یقین رکھتا ہو۔ پھر جو شخص پہلے ہی سے ان صفات سے متصف ہے اور وہ متقی کہلاتا ہے اور ان امور کا پابند ہے تو پھر وہ ہدایت کیا ہوئی جو اس کتاب کے ذریعہ اس نے حاصل کی ہے؟ اس میں وہ امر زائد کیا ہے جس کے لیے یہ کتاب نازل ہوئی ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اَور امر ہے جو اس ہدایت میں رکھا گیا ہے کیونکہ یہ امور جو بطور صفاتِ متّقین بیان فرماتے ہیں یہ تو اس ہدایت کے لیے جو اس کتاب کا اصل مقصد اور غرض ہے بطور شرائط ہیں؛ ورنہ وہ ہدایت اَور چیز ہے اور وہ ایک اعلیٰ امر ہے جو خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے اور جس کو مَیں بیان کرتا ہوں۔

ایمان بالغیب سے اگلا درجہ

پس یاد رکھو کہ متقی کی صفات میں سے پہلی صفت یہ بیان کی يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ یعنی غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ مومن ایک ابتدائی حالت کا اظہار ہے۔ کہ جن چیزوں کو اس نے نہیں دیکھا ان کو مان لیا ہے۔ غیب اللہ تعالےٰ کا نام ہے۔ اور اس غیب میں بہشت،

دوزخ، حشر اجساد اور وہ تمام امور بھی جو ابھی تک پردۂ غیب میں ہیں، شامل ہیں۔ اب ابتدائی حالت میں تو مومن ان پر ایمان لاتا ہے لیکن ہدایت یہ ہے کہ اس حالت پر اسے ایک انعام عطا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا علم غیب سے انتقال کر کے شہود کی طرف آجاتا ہے اور اس پر پھر ایسا زمانہ آجاتا ہے کہ جن باتوں پر وہ پہلے غائب کے طور پر ایمان لاتا تھا وہ ان کا عارف ہو جاتا ہے اور وہ امور جو ابھی تک مخفی تھے اس کے سامنے آجاتے ہیں اور حالتِ شہود میں انہیں دیکھتا ہے۔ پھر وُہ خدا تعالےٰ کو غیب نہیں مانتا بلکہ اسے دیکھتا ہے اور اس کی تجلّی سامنے رہتی ہے۔ غرض اس غیب کے بعد شہود کا درجہ اُسے عطا کیا جاتا ہے۔ جیسے ایمان کے بعد عرفان کا مرتبہ ملتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کو اسی عالم میں دیکھ لیتا ہے۔ اور اگر اس کو یہ مرتبہ عطا نہ ہوتا تو پھر یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے مصداق کو کوئی ہدایت اور انعام عطا نہ ہوتا۔ اس کیلئے قرآن شریف گویا موجب ہدایت نہ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوتا اور اس کیلئے ہدایت یہی ہے کہ اس کے ایمان کو حالتِ غیب سے منتقل کر کے حالتِ شہود میں لے آتا ہے اور اس پر دلیل یہ ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل : ۷۳) یعنی جو اس دُنیا میں اندھا ہے وُہ دُوسرے عالم میں بھی اندھا اُٹھایا جاوے گا۔ اس نابینائی سے یہی مُراد ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی تجلّی اور ان امور کو جو حالتِ غیب میں ہیں اسی عالم میں مشاہدہ نہ کرے اور یہ نابینائی کا کچھ حصّہ غیب والے میں پایا جاتا ہے، لیکن هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے موافق جو شخص ہدایت پا لیتا ہے اس کی وہ نابینائی دُور ہو جاتی ہے اور وُہ اس حالت سے ترقی کر جاتا ہے اور وہ ترقی اس کلام کے ذریعہ سے یہ ہے کہ ایمان بالغیب کے درجہ سے شہود کے درجہ پر پہنچ جاوے گا اور اس کے لیے یہی ہدایت ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ سے اگلا درجہ

متقی کی دُوسری صفت یہ ہے يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یعنی وُہ نماز کو کھڑی کرتے ہیں۔ متقی سے جیسا ہو سکتا ہے نماز کھڑی کرتا ہے۔ یعنی کبھی اس کی نماز گر پڑتی ہے۔ پھر اسے کھڑا کرتا ہے۔ یعنی متقی خدا تعالیٰ سے ڈرا کرتا ہے اور وہ نماز کو قائم کرتا ہے۔ اس حالت میں مختلف قسم کے وساوس اور خطرات بھی ہوتے ہیں جو پیدا ہو کر اس کے حضُور میں حارج ہوتے ہیں اور نماز کو گرا دیتے ہیں۔ لیکن یہ نفس کی اس کشاکش میں بھی نماز کو کھڑا کرتا ہے۔ کبھی نماز گرتی ہے مگر یہ پھر اسے کھڑا کرتا ہے۔ اور یہی حالت اس کی رہتی ہے کہ وہ تکلّف اور کوشش سے بار بار اپنی نماز کو کھڑا کرتا ہے یہانتک کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس کلام کے ذریعہ ہدایت عطا کرتا ہے۔ اس کی

ہدایت کیا ہوتی ہے[1]؟ اس وقت بجائے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اس کشمکش اور وساوس کی زندگی سے نکل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس غیب کے ذریعہ انہیں وہ مقام عطا کرتا ہے جس کی نسبت فرمایا ہے کہ بعض آدمی ایسے کامل ہو جاتے ہیں کہ نماز ان کے لیے بمنزلہ غذا ہو جاتی ہے اور نماز میں ان کو وُہ لذّت اور ذوق عطا کیا جاتا ہے، جیسے سخت پیاس کے وقت ٹھنڈا پانی پینے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ نہایت رغبت سے اُسے پیتا ہے اور خوب سیر ہو کر حظ حاصل کرتا ہے یا سخت بھوک کی حالت ہو اور اُسے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا خوش ذائقہ کھانا مِل جاوے جس کو کھا کر وہ بہت ہی خوش ہوتا ہے۔ یہی حالت پھر نماز میں ہو جاتی ہے - وہ نماز اس کے لیے ایک قسم کا نشہ ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ سخت کرب اور اضطراب محسوس کرتا ہے۔ لیکن نماز کے ادا کرنے سے اسکے دل میں ایک خاص سرُور اور ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے جس کو ہر شخص نہیں پا سکتا اور نہ الفاظ میں یہ لذّت بیان ہو سکتی ہے اور انسان ترقی کر کے ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اُسے ذاتی محبت ہو جاتی ہے اور اس کو نماز کے کھڑے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اس لیے کہ وہ نماز اس کی کھڑی ہی ہوتی ہے اور ہر وقت کھڑی ہی رہتی ہے۔ اس میں ایک طبعی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے انسان کی مرضی خدا تعالےٰ کی مرضی کے موافق ہوتی ہے۔ انسان پر ایسی حالت آتی ہے کہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے محبتِ ذاتی کا رنگ رکھتی ہے۔ اس میں کوئی تکلّف اور بناوٹ نہیں ہوتی۔ جس طرح پر حیوانات اور دُوسرے انسان اپنے ماکولات اور مشروبات اور دُوسری شہوات میں لذّت اٹھاتے ہیں اس سے بہت بڑھ چڑھ کر وہ مومن متقی نماز میں لذّت پاتا ہے اس لیے نماز کو خوب سنوار سنوار کر پڑھنا چاہیئے۔ نماز ساری ترقیوں کی جڑ اور زینہ ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ نماز مومن کا معراج ہے۔ اس دین میں ہزاروں لاکھوں اولیاء اللہ، راست باز، ابدال، قطب گذرے ہیں۔ انہوں نے یہ مدارج اور مراتب کیونکر حاصل کئے؟ اسی نماز کے ذریعہ سے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے اور فی الحقیقت جب انسان اس مقام اور درجہ پر پہنچتا ہے تو اس کے لیے اکمل اتم لذّت نماز ہی ہوتی ہے اور یہی معنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ہیں پس کشاکشِ نفس سے انسان نجات پا کر اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ صفحہ ۴ - ۵ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء

غرض یاد رکھو کہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وہ ابتدائی درجہ اور مرحلہ ہے جہاں نماز بے ذوقی اور کشاکش سے ادا کرتا ہے۔ لیکن اس کتاب کی ہدایت ایسے آدمی کے لیے یہ ہے کہ اس مرحلہ سے نجات پاکر اس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں نماز اس کے لیے قرۃ العین ہو جاوے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس مقام پر متقی سے مراد وہ شخص ہے جو نفسِ لوّامہ کی حالت میں ہے۔

نفس کے تین درجے

نفس کے تین درجے ہیں۔ نفسِ امّارہ۔ لوّامہ۔ مطمئنہ

نفسِ امّارہ وہ ہے جو فسق و فجور میں مبتلا ہے اور نافرمانی کا غلام ہے۔ ایسی حالت میں انسان نیکی کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر ایک سرکشی اور بغاوت پائی جاتی ہے لیکن جب اس سے کچھ ترقی کرتا اور نکلتا ہے تو وہ وہ حالت ہے جو نفسِ لوّامہ کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اگر بدی کرتا ہے تو اس سے شرمندہ بھی ہوتا ہے اور اپنے نفس کو ملامت بھی کرتا ہے۔ اور اس طرح پر نیکی کی طرف بھی توجہ کرتا ہے لیکن اس حالت میں وہ کامل طور پر اپنے نفس پر غالب نہیں آتا، بلکہ اس کے اور نفس کے درمیان ایک جنگ جاری رہتی ہے جس میں کبھی وہ غالب آجاتا ہے اور کبھی نفس اسے مغلوب کر لیتا ہے۔ یہ سلسلہ لڑائی کا بدستور جاری رہتا ہے۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی دستگیری کرتا ہے اور آخر اُسے کامیاب اور بامراد کرتا ہے اور وہ اپنے نفس پر فتح پا لیتا ہے۔ پھر تیسری حالت میں پہنچ جاتا ہے جس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ اس وقت اس کے نفس کے تمام گند دُور ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے فساد مٹ جاتے ہیں۔ نفسِ مطمئنہ کی آخری حالت ایسی حالت ہوتی ہے جیسے دو سلطنتوں کے درمیان ایک جنگ ہو کر ایک فتح پاوے اور وہ تمام مفسدہ دُور کر کے اُمن قائم کرے اور پہلا سارا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اس امر کی طرف اشارہ ہے۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً۔ (النمل : ۳۵) یعنی جب بادشاہ کسی گاؤں میں داخل ہوتے ہیں تو پہلا تانا بانا سب تباہ کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے نمبردار، رئیس نواب ہی پہلے پکڑے جاتے ہیں اور بڑے بڑے نامور ذلیل کیے جاتے ہیں اور اس طرح پر ایک عظیم تغیر واقع ہوتا ہے۔ یہی ملوک کا خاصہ ہے اور ایسا ہی ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اسی طرح پر جب رُوحانی سلطنت بدلتی ہے تو پہلی سلطنت پر تباہی آتی ہے۔ شیطان کے غلاموں کو قابو کیا جاتا ہے۔ وُہ جذبات اور شہوات جو انسان کی

روحانی سلطنت میں مفسدہ پردازی کرتے ہیں۔ اُن کو کچل دیا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے اور روحانی طور پر ایک نیا سکّہ بیٹھ جاتا ہے اور بالکل امن وامان کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حالت اور درجہ ہے جو نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت کسی قسم کی کشمکش اور کوئی فساد پایا نہیں جاتا۔ بلکہ نفس ایک کامل سکون اور اطمینان کی حالت میں ہوتا ہے کیونکہ جنگ کا خاتمہ ہو کر نئی سلطنت قائم ہو جاتی ہے اور کوئی فساد اور مفسدہ باقی نہیں رہتا۔ بلکہ دل پر خدا تعالیٰ کی فتح کامل ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ خود اس کے عرشِ دل پر نزول فرماتا ہے۔ اسی کو کمال درجہ کی حالت بیان فرمایا ہے جیساکہ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل: ۹۱) یعنی بیشک اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے اور پھر اس سے ترقی کرو تو احسان کا حکم دیتا ہے اور پھر اس سے بھی ترقی کرو تو ایتاء ذی القربیٰ کا حکم ہے۔

حالتِ عدل

عدل کی حالت یہ ہے جو متقی کی حالت نفسِ امّارہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس حالت کی اصلاح کے لیے عدل کا حکم ہے۔ اس میں نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً کسی کا قرضہ ادا کرنا ہے لیکن نفس اس میں یہی خواہش کرتا ہے کہ کسی طرح سے اس کو دبا لوں اور اتفاق سے اس کی میعاد بھی گذر جاوے۔ اس صورت میں نفس اور بھی دلیر اور بیباک ہو گا کہ اب تو قانونی طور پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا دَین واجب ادا کیا جاوے اور کسی حیلے اور عذر سے اس کو دبایا نہ جاوے۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ ان امور کی پروا نہیں کرتے اور ہماری جماعت میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ اپنے قرضوں کے ادا کرنے میں۔ یہ عدل کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے لوگوں کی نماز نہ پڑھتے تھے۔ پس تم میں سے ہر ایک اس بات کو خوب یاد رکھے کہ قرضوں کے ادا کرنے میں سُستی نہیں کرنی چاہیئے اور ہر قسم کی خیانت اور بے ایمانی سے دُور بھاگنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ امرِ الٰہی کے خلاف ہے جو اس نے اس آیت میں دیا ہے۔

حالتِ احسان

اس کے بعد احسان کا درجہ ہے۔ جو شخص عدل کی رعایت کرتا ہے اور اس کی حد بندی کو نہیں توڑتا۔ اللہ تعالےٰ اسے توفیق اور قوت دے دیتا ہے اور وہ نیکی میں اَور ترقی کرتا ہے۔ یہانتک کہ عدل ہی نہیں کرتا بلکہ تھوڑی سی نیکی کے بدلے بہت بڑی نیکی کرتا ہے۔ لیکن احسان کی حالت میں بھی ایک کمزوری ابھی باقی ہوتی

ہے اور وُہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس نیکی کو جتا بھی دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص دس برس تک کسی کو روٹی کھلاتا ہے اور وہ کبھی ایک بات اُس کی نہیں مانتا تو اسے کہہ دیتا ہے کہ دس برس کا ہمارے ٹکڑوں کا غلام ہے اور اس طرح پر اس نیکی کو بے اثر کر دیتا ہے۔ در اصل احسان والے کے اندر بھی ایک قسم کی مخفی ریا ہوتی ہے۔ لیکن تیسرا مرتبہ ہر قسم کی آلائش اور آلودگی سے پاک ہے اور وہ ایتاء ذی القربیٰ کا درجہ ہے۔

حالتِ ایتارِ ذی القربیٰ

ایتار ذی القربیٰ کا درجہ طبعی حالت کا درجہ ہے یعنی جس مقام پر انسان سے نیکیوں کا صدور ایسے طور پر ہو جیسے طبعی تقاضا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ماں اپنے بچے کو دُودھ دیتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے کبھی اس کو خیال بھی نہیں آتا کہ بڑا ہو کر کمائی کرے گا اور اس کی خدمت کرے گا یہانتک کہ اگر کوئی بادشاہ اسے یہ حکم دے کہ تو اگر اپنے بچہ کو دُودھ نہ دے گی اور اس سے وہ مر جاوے تو بھی تجھے مؤاخذہ نہ ہوگا۔ اس حکم پر بھی اُس کو دُودھ دینا وہ نہیں چھوڑ سکتی بلکہ ایسے بادشاہ کو دو چار گالیاں ہی سُنا دے گی۔ اس لیے کہ وہ پرورش اس کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ وہ کسی امید یا خوف پر مبنی نہیں۔ اسی طرح پر جب انسان نیکی میں ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ نیکیاں اس سے ایسے طور پر صادر ہوتی ہیں گویا ایک طبعی تقاضا ہے تو یہی وہ حالت ہے جو نفس مطمئنہ کہلاتی ہے۔

غرض یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے یہ معنے ہیں کہ جبتک نفسِ مطمئنہ نہ ہو، اسی کشاکش میں لگا رہتا ہے۔ کبھی نفس غالب آجاتا ہے اور کبھی آپ غالب آجاتا ہے۔ صبح کو اُٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ٹھنڈا پانی ہے اس کو نہانے کی حاجت ہے۔ پس اگر نفس کی بات مان لیتا ہے تو نماز کو کھو لیتا ہے اور اگر ہمت سے کام لیتا ہے تو اس پر فتح پا لیتا ہے۔

شکر کی بات ہے کہ ایک مرتبہ خود مجھے بھی ایسی حالت پیش آئی۔ سردی کا موسم تھا۔ مجھے غسل کی حاجت ہوگئی۔ پانی گرم کرنے کے لیے کوئی سامان اس جگہ نہ تھا۔ ایک پادری کی لکھی ہوئی کتاب میزان الحق میرے پاس تھی، اس وقت وہ کام آئی۔ مَیں نے اس کو جلا کر پانی گرم کر لیا اور خدا تعالیٰ کا شکر کیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ بعض وقت شیطان بھی کام آجاتا ہے۔

پھر مَیں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے یہی معنے ہیں اور اس پر ترقی یہی ہے کہ ایسی حالت سے نجات پا کر مطمئنہ کی حالت میں پہنچ جاوے۔

خوب یاد رکھو کہ نِرا غیب پر ایمان لانے کا انجام خطرناک ہوتا رہا ہے۔ افلاطون جب مرنے

لگا تو کہنے لگا کہ میرے لیے بُت پر ایک مُرغا ہی ذبح کرو۔ جالینوس نے کہا میری قبر میں خچر کی پیشاب گاہ کے برابر ایک سوراخ رکھ دینا تاکہ ہوا آتی رہے۔ اب غور کرو کہ کیا ایسے لوگ ہادی ہو سکتے ہیں، جو ایسی مذبذب اور مضطرب حالت میں ہوتے ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ جب تک اندر روشنی پیدا نہ ہو کیا فائدہ؟ لیکن یہ روشنی خدا تعالیٰ کے فضل ہی سے ملتی ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ سب طبائع یکساں نہیں ہوتی ہیں اور خدا تعالیٰ نے سب کو نبی پیدا نہیں کیا۔

صادقین کی صُحبت کا اثر

لیکن صُحبت میں بڑا شرف ہے۔ اس کی تاثیر کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا ہی دیتی ہے۔ کسی کے پاس اگر خوشبو ہو تو پاس والے کو بھی پہنچ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح پر صادقوں کی صحبت ایک رُوح صدق کی نفخ کر دیتی ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ گہری صُحبت نبی اور صاحبِ نبی کو ایک کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن شریف میں كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ : ۱۱۹) فرمایا ہے۔ اور اسلام کی خوبیوں میں سے یہ ایک بے نظیر خوبی ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے صادق موجود رہتے ہیں، لیکن آریہ سماجی یا عیسائی اس طریق سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جبکہ ان کے ہاں یہ مسلّم امر ہے کہ اب کوئی شخص خدا رسیدہ ایسا نہیں ہو سکتا جس پر خدا تعالیٰ کی تازہ بہ تازہ وحی نازل ہو اور وُہ اس سے توفیق پا کر ان لوگوں کو صاف کرے جو گناہ آلود زندگی بسر کرتے ہیں۔ مَیں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ آریہ سماج کے اندر ایک نیش ہے وہ بے جا طور سے مسلمانوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اعتراض کرنا ہی اپنے مذہب کی خُوبی اور کمال پیش کرتے ہیں لیکن جب ان سے پوچھا جاوے کہ اسلام کے مقابلہ میں رُوحانیت پیش کرو۔ تو کچھ نہیں۔ نکتہ چینی کرنا کوئی خوبی کی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ شخص بڑا بد نصیب اور نادان ہے جو بغیر اس کے کہ کسی منزل پر پہنچا ہو دُوسروں پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ ایک بچّہ جو اقلیدس کے اصولوں سے ناواقف ہے اور اُن نتائج سے بے خبر ہے جو اس کی اشکال سے پیدا ہوتے ہیں۔ وُہ ان ٹیڑھی لکیروں کو دیکھ کر کب خوش ہو سکتا ہے وہ تو اعتراض کرے گا لیکن عقلمندوں کے نزدیک اس اعتراض کی کیا وقعت اور حقیقت ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی حال ان آریوں کا ہے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں مگر خود حق اور حقیقت سے بے خبر اور محروم ہیں۔ وہ اللہ کی قدرتوں سے آگاہ نہیں اور اس کی طاقتوں کا انہیں علم نہیں ہے اور نہ انہیں وہ حواس ملے ہیں جو وہ اسی عالم میں بہشتی نظاروں کو دیکھ سکیں اور اللہ تعالیٰ کی طاقتوں اور قدرتوں کے نمونے مشاہدہ کریں۔ ایسے مذہب کی بنیاد بالکل ریت پر ہے۔ وہ آج بھی نہیں اور کل بھی نہیں۔

اسلام کی صداقت

یہ خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی نابینا مذہب کی تائید نہیں کرتا اور کوئی نصرت اسے نہیں دی جاتی۔ اسلام کی سچائی کی یہی بڑی زبردست دلیل ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ اس کی نصرت فرماتا ہے اور اس زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تا مَیں اس کی تازہ بتازہ نصرتوں کا ثبوت دُوں، چنانچہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جس نے خدا تعالیٰ کے نشانات نہ دیکھے ہوں۔ اس کے بالمقابل ہمیں کوئی بتائے کہ وید کیا لایا؟ وہ تو بالکل ادھورا ہے، دُوسرے لوگوں کو تو خواب بھی آجاتی ہے، مگر وید والوں کے نزدیک خواب بھی بے حقیقت چیز ہے اور وُہ بھی نہیں آسکتی جبکہ وہ دروازہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کے لیے یقینی دروازہ ہے، بند ہے تو اَور وسائل خدارسی کے کیا ہوسکتے ہیں؟

مَیں سچ کہتا ہوں کہ جہاں تک مَیں نے اس فرقہ کے حالات دیکھے ہیں، ان میں شوخیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا یا بعض ایسے لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ مذہب کی اصل غرض کیا ہے؟

غرض اسلام ایک ایسا پاک مذہب ہے جو ساری نیکیوں کا حقیقی سرچشمہ اور منبع ہے اس لیے کہ نیکیوں کی جڑ ہے اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان۔ اور وُہ بُدوں اس کے پیدا نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں کے عجائبات اور نشانات تازہ بتازہ دیکھتا ہے اور یہ بجز اسلام کے کسی دُوسرے کو حاصل نہیں۔ اگر ہے تو کوئی پیش کرے۔

علاوہ بریں اسلام کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ بعض فطرتی نیکیاں جو انسان کرتا ہے یہ ان پر ازدیاد کرتا اور انہیں کامل کرتا ہے اس لیے ہی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرمایا هُدًى لِّلظّٰلِمِيْنَ یا هُدًى لِّلْكٰفِرِيْنَ نہیں کہا۔ عرصہ کی بات ہے ایک برہمو اگنی ہوتری نے کہا تھا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو ہم بھی کہتے ہیں تم مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کیوں کہتے ہو؟ ہم نے کہا تھا کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان دہریّہ نہیں ہوتا؛ چنانچہ اب وہ کھُلا دہریّہ ہے۔ اگر محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پُورا ایمان ہوتا تو کیوں دہریّہ بنتا۔

مَیں سچ کہتا ہوں کہ قرآن شریف ایسی کامل اور جامع کتاب ہے کہ کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ کیا وید میں کوئی ایسی شُرتی ہے جو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا مقابلہ کرے۔ اگر زبانی اقرار کوئی چیز ہے۔ یعنی اس کے ثمرات اور نتائج کی حاجت نہیں تو پھر ساری دُنیا کسی نہ کسی رنگ میں خدا تعالیٰ کا اقرار کرتی ہے۔ اور بھگتی، عبادت، صدقہ خیرات کو بھی اچھا سمجھتی ہے اور کسی نہ کسی

صورت میں ان باتوں پر عمل بھی کرتی ہے۔ پھر ویدوں نے آکر دُنیا کو کیا بخشا؟ یا تو یہ ثابت کرو کہ جو قومیں وید کو نہیں مانتی ہیں ان میں نیکیاں بالکل مفقود ہیں اور یا کوئی اور امتیازی نشان بتاؤ۔

قرآن شریف کو جہاں سے شروع کیا ہے ان ترقیوں کا وعدہ کر لیا ہے جو بالطبع رُوح تقاضا کرتی ہے، چنانچہ سُورۃ فاتحہ میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ (الفاتحہ : ۶) کی تعلیم کی اور فرمایا کہ تم یہ دُعا کرو کہ اے اللہ ہم کو صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما۔ وہ صراطِ مستقیم جو ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرے انعام واکرام ہوتے۔ اس دُعا کے ساتھ ہی سورۃ البقرہ کی پہلی ہی آیت میں یہ بشارت دے دی۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

گویا رُوحیں دُعا کرتی ہیں اور ساتھ ہی قبولیت اپنا اثر دکھاتی ہے اور وہ وعدہ دُعا کی قبولیت کا قرآن مجید کے نزول کی صورت میں پُورا ہوتا ہے۔ ایک طرف دُعا ہے اور دُوسری طرف اس کا نتیجہ موجود ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے جو اس نے فرمایا مگر افسوس دُنیا اس سے بے خبر اور غافل ہے اور اس سے دُور رہ کر ہلاک ہو رہی ہے۔

مَیں پھر کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جو ابتدائے قرآن مجید میں متّقیوں کے صفات بیان فرمائے ہیں۔ ان کو معمولی صفات میں رکھا ہے لیکن جب انسان قرآن مجید پر ایمان لا کر اُسے اپنی ہدایت کے لیے دستور العمل بناتا ہے تو وہ ہدایت کے ان اعلیٰ مدارج اور مراتب کو پا لیتا ہے جو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں مقصود رکھے ہیں۔ قرآن شریف کی اس علّتِ غائی کے تصوّر سے ایسی لذّت اور سُرور آتا ہے کہ الفاظ میں ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ کے خاص فضل اور قرآن مجید کے کمال کا پتہ لگتا ہے۔

متقی کی تیسری علامت

پھر متّقی کی ایک اور علامت بیان فرمائی وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (البقرۃ : ۴) یعنی جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ ابتدائی حالت ہوتی ہے اور اس میں سب کے سب شریک ہیں کیونکہ عام طور پر یہ فطرت انسانی کا ایک تقاضا ہے کہ اگر کوئی سائل اس کے پاس آ جاوے تو کچھ نہ کچھ اُسے ضرور دے دیتا ہے۔ گھر میں دس روٹیاں موجود ہوں اور کسی سائل نے آکر صدا کی تو ایک روٹی اس کو بھی دے دے گا۔ یہ امر زیرِ ہدایت نہیں ہے بلکہ فطرت کا ایک طبعی خاصّہ ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ یہاں مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ عام ہے۔ اس سے کوئی خاص شَے روپیہ پیسہ یا روٹی

پکڑا مُراد نہیں ہے بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں۔

غرض یہ انفاق عام انفاق ہے اور اس کے لیے مُسلمان یا غیر مُسلمان کی بھی شرط نہیں اور اس لیے یہ انفاق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک فطرتی، دُوسرا زیرِ اثر نبوّت۔ فطرتی تو وہی ہے جیسا کہ مَیں نے ابھی بیان کیا ہے کہ تم میں سے کون ہے اگر کوئی قیدی یا بُھوکا آدمی جو کئی روز سے بُھوکا ہو یا ننگا ہو آکر سوال کرے اور تم اُسے کچھ نہ کچھ دے نہ دو۔ کیونکہ یہ امر فطرت میں داخل ہے۔

اور یہ بھی مَیں نے بتا دیا ہے کہ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ روپیہ پیسہ سے مخصوص نہیں خواہ جسمانی ہو یا علمی سب اس میں داخل ہے۔ جو علم سے دیتا ہے وُہ بھی اسی کے ماتحت ہے۔ مال سے دیتا ہے وہ بھی داخل ہے۔ طبیب ہے وہ بھی داخل ہے۔

لِلّٰہی وقف کا مقام

مگر موجب منشار ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچا جہاں قرآن شریف اسے لے جانا چاہتا ہے اور وُہ وُہ مقام ہے کہ انسان اپنی زندگی ہی خدا تعالیٰ کے لیے وقف کر دے۔ اور یہ لِلّٰہی وقف کہلاتا ہے۔ اس حالت اور مقام پر جب ایک شخص پہنچتا ہے تو اس میں مِمَّا رہتا ہی نہیں۔ کیونکہ جبتک وہ مِمَّا کی حد کے اندر ہے اس وقت تک وہ ناقص ہے اور اس علّت غائی تک نہیں پہنچا جو قرآن مجید کی ہے۔ لیکن کامل اسی وقت ہوتا ہے جب یہ حد نہ رہے اور اس کا وجود، اس کا ہر فعل، ہر حرکت و سکون محض اللہ تعالیٰ کے حُکم اور اذن کے ماتحت بنی نوع کی بھلائی کے لیے وقف ہو۔ دُوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کا کمال یہی ہے جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے منشا کے موافق ہے[1]

مُتقی کی چوتھی صِفت

اس کے بعد ایک اور صِفت متقیوں کی بیان کی یعنی وہ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (البقرۃ : ۵) کے موافق ایمان لاتے ہیں اور ایسا ہی جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اگر اتنا ہی ایمان ہے تو پھر ہدایت کیا ہے؟ وہ ہدایت یہ ہے کہ ایسا انسان خود اس قابل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر وحی اور الہام کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور وُہ وحی الٰہی اس پر بھی اُترتی ہے جس سے اس کا ایمان ترقی کر کے کامل یقین اور

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ صفحہ ۴ - ۵ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء

معرفت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور وہ اس ترقی کو پالیتا ہے جو ہدایت کا اصل مقصود تھا۔ اس پر وہ انعام و اکرام ہونے لگتے ہیں جو مکالمہ الٰہیہ سے ملتے ہیں۔

اسلام میں وحی والہام کا دروازہ کھلا ہے

یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے وحی والہام کے دروازہ کو بند نہیں کیا۔ جو لوگ اس امت کو وحی و الہام کے انعامات سے بے بہرہ ٹھہراتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اور قرآن شریف کے اصل مقصد کو انہوں نے سمجھا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک یہ امت وحشیوں کی طرح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرات اور برکات کا معاذ اللہ خاتمہ ہو چکا اور وہ خدا جو ہمیشہ سے متکلم خدا رہا ہے اب اس زمانہ میں آکر خاموش ہو گیا۔ وہ نہیں جانتے کہ اگر مکالمہ مخاطبہ نہیں تو هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا مطلب ہی کیا ہوا؟ بغیر مکالمہ مخاطبہ کے تو اس کی ہستی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ اور پھر قرآن شریف یہ کیوں کہتا وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۷۰) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ۔ (حٰمٓ السجدة : ۳۱) یعنی جن لوگوں نے اپنے قول اور فعل سے بتا دیا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے اور پھر انہوں نے استقامت دکھائی ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ فرشتوں کا نزول ہو اور مخاطبہ نہ ہو۔ نہیں بلکہ وہ انہیں بشارتیں دیتے ہیں۔ یہی تو اسلام کی خوبی اور کمال ہے جو دُوسرے مذاہب کو حاصل نہیں ہے۔ استقامت بہت مشکل چیز ہے یعنی خواہ ان پر زلزلے آئیں، فتنے آئیں۔ وہ ہر قسم کی مصیبت اور دُکھ میں ڈالے جاویں مگر ان کی استقامت میں فرق نہیں آتا۔ ان کا اخلاص اور وفاداری پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان پر خدا تعالیٰ کے فرشتے اُتریں اور انہیں بشارت دیں کہ تم کوئی غم نہ کرو۔

یہ یقیناً یاد رکھو کہ وحی اور الہام کے سلسلہ کے متعلق خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اکثر جگہ وعدے کئے ہیں۔ اور یہ اسلام ہی سے مخصوص ہے ورنہ عیسائیوں کے ہاں بھی مُہر لگ چکی ہے۔ وہ اب کوئی شخص ایسا نہیں بتا سکتے جو اللہ تعالیٰ کے مخاطبہ مکالمہ سے مشرّف ہو۔ اور ویدوں پر تو پہلے ہی سے مُہر لگی ہوئی ہے۔ ان کا تو مذہب ہی یہی ہے۔ کہ ویدوں کے الہام کے بعد پھر ہمیشہ کے لیے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ گویا خدا پہلے کبھی بولا تھا مگر اب وہ گونگا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ اس وقت کلام نہیں کرتا اور کوئی اس کے اس فیض سے بہرہ ور نہیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ پہلے

بولتا تھا اور یا اب وہ سُنتا اور دیکھتا بھی ہے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے جب میں مسلمانوں کے مُنہ سے اس قسم کے الفاظ نکلتے سُنتا ہوں کہ اب مکالمہ مخاطبہ کی نعمت کسی کو نہیں مل سکتی۔ یہ کیوں عیسائیوں یا آریوں کی طرح مُہر لگاتے ہیں؟ اگر اسلام میں یہ کمال اور خوبی نہ ہو تو پھر دوسرے مذاہب پر اسے کیا فخر اور امتیاز حاصل ہوگا؟ نری توحید سے تو نہیں ہو سکتا کیونکہ برہمو بھی تو ایک ہی خدا کو مانتا ہے۔ وہ بھی صدقہ دیتا ہے۔ خُدا کو اپنے طور پر یاد بھی کرتا ہے اور یہی اخلاقی صفات اس میں پائے جاتے ہیں تو پھر ایک مسلمان میں اور اس برہمو میں کیا فرق ہوا؟ یہ امور تو نقل سے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسکا کیا جواب ہے؟ کچھ بھی نہیں بجُز اسکے کہ اسلام کا روشن چہرہ ان امتیازی نشانوں کے ذریعہ دکھایا جاوے جو خدا تعالیٰ کے مکالمہ کے ذریعہ ملتے ہیں۔ یقیناً سمجھو کہ اصل جو فضل آسمان سے آتا ہے اس کی کوئی چوری اور نقل نہیں کر سکتا۔ اگر اسلام میں مکالمہ مخاطبہ اور تفضلات نہ ہوتے تو اسلام کچھ بھی چیز نہ ہوتا۔ اس کا یہی تو فخر ہے کہ وہ ایک سچے مسلمان کو ان انعامات و اکرام کا وارث بنا دیتا ہے اور وہ فی الحقیقت خدا نما مذہب ہے۔ اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دکھا دیتا ہے اور یہی غرض ہے اسلام کی کیونکہ اسی ایک ذریعہ سے انسان کی گناہ آلود زندگی پر موت وارد ہو کر اسے پاک صاف بنا دیتی ہے اور حقیقی نجات کا دروازہ اس پر کھلتا ہے۔ کیونکہ جبتک خدا تعالیٰ پر کامل یقین نہ ہو گناہ سے کبھی نجات مل سکتی ہی نہیں۔ جیسے یہ ایک ظاہر امر ہے کہ جب انسان کو یقین ہو کہ فلاں جگہ سانپ ہے تو وہ ہرگز ہرگز اس جگہ داخل نہ ہوگا۔ یا زہر کے کھانے سے مر جانے کا یقین زہر کے کھانے سے بچاتا ہے پھر اگر خدا تعالےٰ پر پُورا پُورا یقین ہو کہ وہ سمیع اور بصیر ہے اور ہمارے افعال کی جزا دیتا ہے اور گناہ سے اُسے سخت نفرت ہے تو اس یقین کو رکھ کر انسان کیسے جرأت کر سکتا ہے؟۔

سچی بات یہ ہے کہ اسلام کی رُوح اور اصل حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مکالمہ اور مخاطبہ کا شرف وہ انسان کو عطا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ آسمان سے انعام و اکرام ملتے ہیں۔ جب انسان اس مرتبہ اور مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی نسبت کہا جاتا ہے أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو کامل ترقی پا کر اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے نجات پائی ہے۔

تم سچے مسلمانوں کا نمونہ بن کر دکھاؤ

غرض جب کہ یہ حالت ہے اور اسلام کے دنیا میں آنے کی یہ غرض اور غایت ہے اور نجات کی حقیقت بغیر اس کے متحقق نہیں ہوتی تو ہماری جماعت کو کس قدر فکر کرنا چاہیئے کہ وہ ان باتوں کو جب تک حاصل نہ کر لیں اس وقت تک بے فکر اور مطمئن نہ ہو جاویں۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری جماعت ایک درخت کی طرح ہے وہ اصل پھل جو شیریں ہوتا اور لذت بخشتا ہے نہیں آیا۔ جیسے درخت کو پہلے پھول اور پتے نکلتے ہیں۔ پھر اس کو پھل لگتا ہے جو سبز دھپل کہلاتا ہے وہ گر جاتا ہے۔ پھر ایک اور پھل آتا ہے۔ اس میں سے کچھ جانور کھا جاتے ہیں اور کچھ تیز آندھیوں سے گر جاتے ہیں آخر جو بچ رہتے ہیں اور آخر تک پک کر کھانے کے قابل ہوتے ہیں وہ تھوڑے ہوتے ہیں۔

اسی طرح سے میں دیکھتا ہوں کہ یہ جماعت تو ابھی بہت ہی ابتدائی حالت میں ہے اور پتے بھی نہیں نکلے چہ جائیکہ ہم آج ہی پھل کھائیں۔ ابھی تو سبزہ ہی نکلا ہے جس کو ایک کتا بھی پامال کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں حفاظت کی کس قدر ضرورت ہے؟ پس تم استقامت اور اپنے نمونے سے اس درخت کی حفاظت کرو۔ کیونکہ تم میں سے ہر ایک اس درخت کی شاخ ہے اور وہ درخت اسلام کا شجر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس شجر کی حفاظت کی جاوے۔

اسلام کی حفاظت اور سچائی کے ظاہر کرنے کے لیے سب سے اول تو وہ پہلو ہے کہ تم سچے مسلمانوں کا نمونہ بن کر دکھاؤ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کی خوبیوں اور کمالات کو دنیا میں پھیلاؤ۔ اس پہلو میں مالی ضرورتوں اور امداد کی حاجت ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسی ضرورتیں پیش آئی تھیں اور صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ ایسے وقتوں پر بعض ان میں سے اپنا سارا ہی مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیتے اور بعض نے آدھا دے دیا اور اس طرح جہاں تک کسی سے ہوسکتا فرق نہ کرتا۔

مجھے افسوس سے ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے ہاتھ میں بجز خشک باتوں کے اور کچھ بھی نہیں رکھتے اور جنہیں نفسانیت اور خود غرضی سے کوئی نجات نہیں ملی اور حقیقی خدا کا چہرہ ان پر ظاہر نہیں ہوا۔ وہ اپنے مذاہب کی اشاعت کی خاطر ہزاروں لاکھوں روپیہ دے دیتے ہیں اور بعض اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ عیسائیوں میں دیکھا ہے کہ بعض عورتوں نے دس دس لاکھ کی وصیت کر دی ہے۔ پھر مسلمانوں کے لیے کس قدر شرم کی بات ہے کہ وہ اسلام کے لیے کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے یا نہیں کرتے۔ مگر خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ اسلام کے دشمن

چہرہ پر سے وہ حجاب جو پڑا ہوا ہے دُور کر دے اور اسی غرض کے لیے اس نے مجھے بھیجا ہے۔

مر کر خُدا کے حضور جانا ہے

یقیناً یاد رکھو کہ خدا ہے اور مر کر اس کے حضور ہی جانا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سال آئندہ کے انہیں دنوں میں ہم میں سے یہاں کون ہوگا اور کون آگے چلا جائے گا۔ جبکہ یہ حالت ہے اور یہ یقینی امر ہے پھر کس قدر بدقسمتی ہوگی۔ اگر اپنی زندگی میں قدرت اور طاقت رکھتے ہوئے اس اصل مقصد کے لیے سعی نہ کریں۔ اسلام تو ضرور پھیلے گا اور وُہ غالب آئے گا کیونکہ خدا تعالیٰ نے ایسا ہی ارادہ فرمایا ہے مگر مبارک ہوں گے وہ لوگ جو اس اشاعت میں حصّہ لیں گے۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے جو اُس نے تمہیں موقعہ دیا ہے۔ یہ زندگی جس پر فخر کیا جاتا ہے یہ ہیچ ہے اور ہمیشہ کی خوشی کی وہی زندگی ہے جو مرنے کے بعد عطا ہوگی ہاں یہ سچ ہے کہ وہ اسی دُنیا اور اسی زندگی سے شروع ہو جاتی ہے اور اس کی تیاری بھی یہاں ہی ہوتی ہے۔

دین کو دُنیا پر مقدم کر کے وصیّت کرنے کی تلقین

عرصہ ہوا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا تھا کہ ایک بہشتی مقبرہ ہوگا۔ گویا اس میں وہ لوگ داخل ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادہ میں جنّتی ہیں۔ پھر اس کے متعلق الہام ہوا۔ اُنْزِلَ فِيهَا كُلُّ رَحْمَةٍ۔ اس سے کوئی نعمت اور رحمت باہر نہیں رہتی۔ اب جو شخص چاہتا ہے کہ وہ ایسی رحمت کے نزول کی جگہ میں دفن ہو۔ کیا عمدہ موقعہ ہے کہ وہ دین کو دنیا پر مقدم کرے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم کرے۔ یہ صدی جس کے تیئیس ۲۳ سال گذرنے کو ہیں گذر جائے گی اور اس کے آخر تک موجودہ نسل میں سے کوئی نہ رہے گا اور اگر نکما ہو کر رہا تو کیا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اپنا صدقہ پہلے بھیجو۔ یہ لفظ صدقہ کا صدق سے لیا گیا ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوئی کامل نمونہ اپنے صدق اور اخلاص کا نہیں دکھاتا۔ لاف زنی سے کچھ بن نہیں سکتا۔

اَلْوَصیت اشتہار میں جو مَیں نے حصّہ جائیداد کی اشاعتِ اسلام کے لیے وصیّت کرنے کی قید لگائی ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ کل بعض نے ½ کی کر دی ہے۔ یہ صدق ہے جو اُن سے کراتا ہے اور جب تک صدق ظاہر نہ ہو کوئی مومن نہیں کہلا سکتا۔

تم اس بات کو کبھی مت بھولو کہ خدا تعالےٰ کے فضل و کرم کے بغیر جی ہی نہیں سکتے چہ جائیکہ موت سر پر ہو۔ طاعُون کا موسم پھر آرہا ہے۔ زلزلہ کا خوف الگ دامنگیر ہے۔ وہ تو بڑا ہی

بے وقوف ہے جو اپنے آپ کو امن میں سمجھتا ہے امن میں تو وہی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا سچا فرمانبردار اور اس کی رضا کا جویاں ہے۔ ایسی حالت میں بے بنیاد زندگی کے ساتھ دل لگانا کیا فائدہ ؟

سلسلہ کے قیام اور وصیت کی غرض

دُوسری طرف اسلام سخت اور خطرناک ضعف کی حالت میں ہے۔ اس پر یہی آفت اور مصیبت نہیں کہ باہر والے اس پر حملے کر رہے ہیں؛ اگرچہ یہ بالکل سچ ہے کہ مخالف سب کے سب مل کر ایک ہی کمان سے تیر مار رہے ہیں اور جہانتک اُن سے ہو سکتا ہے وہ اس کو مٹا دینے کی سعی اور فکر کرتے ہیں۔ لیکن اس مصیبت کے علاوہ بڑی بھاری مصیبت یہ ہے کہ اندرونی غلطیوں نے اسلام کے درخشاں چہرہ پر ایک نہایت ہی تاریک حجاب ڈال دیا ہے۔ اور سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ اس میں رُوحانیت نہیں رہی۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ان لوگوں میں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور اسلام کے مُدعی ہیں روحانیت موجود نہیں ہے اور اس پر دُوسری بدقسمتی یہ کہ وہ انکار کر بیٹھے ہیں کہ اب کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس سے خدا تعالیٰ کا مکالمہ مخاطبہ ہو اور وہ خدا تعالیٰ پر زندہ اور تازہ یقین پیدا کر سکے۔ ایسی حالت اور صورت میں اس نے ارادہ فرمایا ہے کہ اسلام کے چہرہ پر سے وہ تاریک حجاب ہٹا دے۔ اور اس کی روشنی سے دلوں کو منوّر کرے اور ان بے جا اتہامات اور حملوں سے جو آئے دن مخالف اس پر لگاتے اور کرتے ہیں، اسے محفوظ کیا جاوے۔ اس غرض سے یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مُسلمان اپنا نمونہ دکھادیں۔ یہی وجہ ہے جو مَیں نے پسند کیا ہے کہ ایسے لوگ جو اشاعتِ اسلام کا جوش دل میں رکھتے ہیں اور جو اپنے صدق اور اخلاص کا نمونہ دکھا کر فوت ہوں اور اس مقبرہ میں دفن ہوں اُن کی قبروں پر ایک کتبہ لگا دیا جاوے جس میں اس کے مختصر سوانح ہوں اور اس اخلاص و وفا کا بھی کچھ ذکر ہو جو اس نے اپنی زندگی میں دکھایا تا جو لوگ اس قبرستان میں آویں اور ان کتبوں کو پڑھیں اُن پر ایک اثر ہو اور مخالف قوموں پر بھی ایسے صادقوں اور راستبازوں کے نمونے دیکھ کر ایک خاص اثر پیدا ہو۔ اگر یہ بھی اسی قدر کرتے ہیں جس قدر مخالف قومیں کر رہی ہیں اور وہ لوگ کر رہے ہیں، جن کے پاس حق اور حقیقت نہیں تو انہوں نے کیا کیا۔ پھر انہیں تو ایسی حالت میں شرمندہ ہونا چاہیئے۔ لعنت ہے ایسے بیعت میں داخل ہونے پر جو کافر جتنی بھی غیرت نہ رکھتا ہو۔

اسلام اس وقت یتیم ہو گیا ہے اور کوئی اس کا سرپرست نہیں اور خدا تعالیٰ نے اس جماعت کو اختیار کیا اور پسند فرمایا کہ وہ اس کی سرپرست ہو اور وہ ہر طرح سے ثابت کر کے دکھائے

کہ اسلام کی سچی غمگسار اور ہمدرد ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہی قوم ہوگی جو بعد میں آنے والوں کے لیے نمونہ ٹھہرے گی۔ اس کے ثمرات برکات آنے والوں کے لیے ہوں گے اور زمانہ پر محیط ہو جائیں گے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ یہ جماعت بڑھے گی لیکن وہ لوگ جو بعد میں آئیں گے ان مدارج اور مراتب کو نہ پائیں گے جو اس وقت والوں کو ملیں گے۔ خدا تعالیٰ نے ایسا ہی ارادہ فرمایا کہ وہ اس جماعت کو بڑھاتے اور وہ دینِ اسلام اور توحید کی اشاعت کا باعث بنے۔

خادمِ دین واقفینِ زندگی کی ضرورت

مدرسہ کی سلسلہ جنبانی کی بھی اگر کوئی غرض ہے تو یہی ہے۔ اسی لیے مَیں نے کہا تھا کہ اس کے متعلق غور کیا جاوے کہ یہ مدرسہ اشاعتِ اسلام کا ایک ذریعہ بنے اور اس سے ایسے عالم اور زندگی وقف کرنے والے لڑکے نکلیں جو دُنیا کی نوکریوں اور مقاصد کو چھوڑ کر خدمتِ دین کو اختیار کریں۔ ایسا ہی اس قبرستان کے ذریعہ بھی اشاعتِ اسلام کا ایک مستقل انتظام سوچا گیا ہے۔ مدرسہ کے متعلق میری رُوح ابھی فیصلہ نہیں کر سکی کہ کیا راہ اختیار کیا جاوے۔ ایک طرف ضرورت ہے ایسے لوگوں کی جو عربی اور دینیات میں توغل رکھتے ہوں۔ اور دُوسری طرف ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو آجکل کے طرزِ مناظرات میں پکے ہوں۔ علومِ جدیدہ سے بھی واقف ہوں۔ کسی مجلس میں کوئی سوال پیش آجاوے تو جواب دے سکیں اور کبھی ضرورت کے وقت عیسائیوں سے یا کسی اَور مذہب والوں سے انہیں اسلام کی طرف سے مناظرہ کرنا پڑے تو ہتک کا باعث نہ ہوں بلکہ وہ اسلام کی خُوبیوں اور کمالات کو پُر زور اور پُر شوکت الفاظ میں ظاہر کر سکیں۔

میرے پاس اکثر ایسے خطوط آتے ہیں جن میں ظاہر کیا گیا تھا کہ آریوں سے گفتگو ہوئی یا عیسائیوں نے اعتراض کیا اور ہم جواب نہیں دے سکے۔ ایسے لوگ اسلام کی ہتک اور بے عزتی کا موجب ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں اسلام پر ہر رنگ اور ہر قسم کے اعتراض کئے جاتے ہیں۔ مَیں نے ایک مرتبہ اس قسم کے اعتراضوں کا اندازہ کیا تھا تو مَیں نے دیکھا کہ اسلام پر تین ہزار اعتراض مخالفوں کی طرف سے ہوا ہے۔ پس یہ کس قدر ضروری ہے کہ ایک جماعت ایسے لوگوں کی ہو جو ان تمام اعتراضات کا بخوبی جواب دے سکے۔ آجکل کے مناظروں اور مباحثوں کی حالت اَور بھی بُری ہو گئی ہے کہ اصول کو چھوڑ کر فروع میں جھگڑتے ہیں، حالانکہ اس اصل کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے کہ جب کسی سے گفتگو ہو تو وہ ہمیشہ اصول میں محدود ہو۔ لیکن یاوہ گو اس طریق کو پسند نہیں کرتے وہ جہانتک ان سے ہو سکتا ہے اس سے نکلتے ہیں اور فروعات میں آکر اُلجھ جاتے ہیں۔ ایسے

لوگ اس امر کی بھی پابندی نہیں کرتے کہ پہلے اپنے گھر کو دیکھ لیں کہ دُوسرے مذاہب پر جو اعتراض کرتا ہوں۔ وُہ میرے گھر میں تو کسی تعلیم پر وارد نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی غرض محض اعتراض کرنا ہوتا ہے حق کو لینا نہیں ہوتا۔

ایک آریہ پر اگر نیوگ کا اعتراض کرو تو وہ قبل اُس کے کہ نیوگ کی حقیقت اور خوبی بیان کرے بلاسوچے سمجھے جھٹ اعتراض کر دے گا کہ تم میں متعہ ہے، حالانکہ اوّل تو مُتعہ ہے ہی نہیں اور علاوہ بریں مُتعہ کی حقیقت تو اتنی ہے کہ وہ میعادی طلاق ہے۔ طلاق کو نیوگ سے کیا نسبت؟ اور کیا تعلق؟ جو شخص محض حصولِ اولاد کے لیے اپنی بیوی کو دُوسرے سے ہمبستر کرواتا ہے وہ طلاق پر اعتراض کرے تو تعجب نہیں تو کیا ہے؟

غرض اعتراض کرنے والوں کی یہ حالت ہے اور نہایت شوخی اور بیباکی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔

واقفینِ زندگی کے لیے غیر زبانیں سیکھنے کی تلقین

مَیں جب اسلام کی حالت کو مشاہدہ کرتا ہوں تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایسے لوگ میری زندگی میں تیار ہو جاویں جو اسلام کی خدمت کر سکیں۔ ہم تو پا بگور ہیں اور اگر اور تیار نہ ہوں تو پھر مشکل پیش آتی ہے۔ میرا مدعا اس قدر ہے کہ آپ لوگ تدبیر کریں خواہ کسی پہلو پر صاد کیا جاوے مگر یہ ہو کہ چند سال میں ایسے نوجوان نکل آویں جن میں علمی قابلیت ہو اور وہ غیر زبان کی واقفیت بھی رکھتے ہوں اور پُورے طور پر تقریر کر کے اسلام کی خوبیاں دوسروں کے ذہن نشین کر سکیں۔ میرے نزدیک غیر زبانوں سے اتنی ہی مراد نہیں کہ صرف انگریزی پڑھ لیں۔ نہیں اَور زبانیں بھی پڑھیں اور سنسکرت بھی پڑھیں تاکہ ویدوں کو پڑھ کر اُن کی اصلیت ظاہر کر سکیں۔ اس وقت تک وید گویا مخفی پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی ان کا مستند ترجمہ نہیں۔ اگر کوئی کمیٹی ترجمہ کر کے صاد کر دے تو حقیقت معلوم ہو جاوے۔

اصل بات یہ ہے کہ مَیں چاہتا ہوں کہ اسلام کو ان لوگوں اور قوموں میں پہنچایا جاوے جو اس سے محض ناواقف ہیں اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جن قوموں میں تم اُسے پہنچانا چاہو اُن کی زبانوں کی پُوری واقفیت ہو۔ ان کی زبانوں کی واقفیت نہ ہو اور ان کی کتابوں کو پڑھ نہ لیا جاوے تو مخالف پورے طور پر عاجز نہیں ہو سکتا۔

مولوی عبیداللہ صاحب مرحوم نے تحفۃ الہند نام ایک کتاب لکھی۔ اندرامن نے اس کا جواب دیا اور بڑی گالیاں دیں۔ اسلام پر اعتراض کر دیئے۔ اگرچہ اس کی بعض کتابیں جلادی گئی تھیں مگر

انہیں اعتراضوں کو لے کر پنڈت دیانند صاحب نے پیش کر دیا۔ اگر مولوی عبید اللہ صاحب نے وید پڑھے ہوتے تو وہ عمدہ طور سے اس کا جواب دیتے۔ غرض زبان کا سیکھنا ضروری ہے[1]۔

واقفین کی تعلیم و تربیت

مجھے یہ بھی شُبہ ہے کہ دماغی حالتیں کچھ اچھی نہیں ہیں۔ بہت ہی کم ایسے لڑکے ہوتے ہیں جن کے قویٰ اعلیٰ درجہ کے ہوں، ورنہ اکثر کو سل یا دِق ہو جاتی ہے۔ پس ایسے کمزور قویٰ کے لڑکے بہت محنت برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو اور بھی فکر دامنگیر ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو ہم ایسے لڑکے تیار کرنا چاہتے ہیں جو دین کیلئے اپنی زندگی وقف کریں اور فارغ التحصیل ہو کر خدمت دین کریں مگر دوسری طرف اس قسم کی مشکلات ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ اس سوال پر بہت فکر کیا جاوے۔ ہاں میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ جو بچے ہمارے اس مدرسہ میں آتے ہیں، اُن کا آنا بھی بے سُود نہیں ہے۔ ان میں اخلاص اور محبت پائی جاتی ہے اس لیے اس موجودہ صورت اور انتظام کو بدلنا بھی مناسب نہیں ہے۔

میرے نزدیک یہ قاعدہ ہونا چاہیئے تھا کہ ان بچوں کو تعطیل کے دن مولوی سید محمد احسن صاحب یا مولوی حکیم نورالدین صاحب زبانی تقریروں کے ذریعہ ان کو قرآن شریف اور علم حدیث اور مناظرہ کا ڈھنگ سکھاتے اور کم از کم دو گھنٹہ ہی اس کام کے لیے رکھے جاتے۔ میں یقیناً کہتا ہوں کہ زبانی تعلیم ہی کا سلسلہ جاری رہا ہے اور طب کی تعلیم بھی زبانی ہوتی آئی۔ زبانی تعلیم سے طالب علموں کو خود بھی بولنے اور کلام کرنے کا طریق آجاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ معلم فصیح و بلیغ ہو۔ زبانی تعلیم سے بعض اوقات ایسے فائدے ہوتے ہیں کہ اگر ہزار کتاب بھی تصنیف ہوتی تو وہ فائدہ نہ ہوتا۔ اس لیے اس کا التزام ضروری ہے۔ تعطیل کے دن ضرور ان کو سکھایا جاوے۔ پھر باقاعدہ اُن کو قرآن شریف سُنایا جاوے۔ اس کے حقائق و معارف بیان کیے جاویں اور ان کی تائید میں احادیث کو پیش کیا جاوے۔ عیسائی جو اعتراض اسلام پر کرتے ہیں اُن کے جواب ان کو بتلائے جائیں اور اس کے بالمقابل عیسائیوں کے مذہب کی حقیقت کھول کر اُنکو بتائی جاوے تاکہ وہ اس سے خوب واقف ہو جاویں۔ ایسا ہی دہریوں اور آریوں کے اعتراضات اور اُن کے جوابات سے اُن کو آگاہ کیا جاوے۔ اور یہ سب کچھ سلسلہ وار ہو۔ یعنی کسی ہفتہ کچھ اور کسی ہفتہ کچھ۔ اگر یہ التزام کر لیا گیا تو میں یقیناً جانتا ہوں کہ بہت کچھ تیاری کر لیں گے۔ نِری عربی زبان کی واقفیت

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴ صفحہ ۲-۳ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۶ء

کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا نہیں ہوتے تھے تو اس زبان نے عربوں کے اخلاق، عادات اور مذہب پر کیا اثر ڈالا؟ اور اب شام و مصر میں کیا فائدہ پہنچایا؟ ہاں یہ سچ ہے کہ عربی زبان اگر عمدہ طور سے آتی ہو تو وہ قرآن شریف کی خادم ہوگی اور انسان قرآنِ شریف کے حقائق و معارف خوب سمجھ سکے گا۔ چونکہ قرآن اور احادیث عربی زبان میں ہیں اس لیے اس زبان سے پورے طور پر باخبر ہونا بہت ہی ضروری ہوگیا ہے۔ اگر عربی زبان سے واقفیت نہ ہو تو قرآنِ شریف اور احادیث کو کیا سمجھے گا؟ ایسی حالت میں تو پتہ ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ آیت قرآن شریف میں ہے بھی یا نہیں۔ ایک شخص کسی پادری سے بحث کرتا تھا اس سے کہدیا کہ قرآنِ شریف میں جو آیا ہے لَوْلَاکَ لَمَا پادری نے جب کہا کہ نکال کر دکھاؤ تو بہت ہی شرمندہ ہونا پڑا۔

سادہ ترجمہ پڑھ لینے سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا۔ ان علوم کا جو قرآنِ شریف کے خادم ہیں واقف ہونا ضروری ہے۔ اس طرح پر قرآن شریف پڑھایا جاوے اور پھر حدیث۔ اور اس طرح پر ان کو اس سلسلہ کی سچائی سے آگاہ کیا جاوے اور ایسی کتابیں تیار کی جاویں جو اس تقسیم کے ساتھ ان کے لیے مفید ہوں۔ اگر یہ سلسلہ اس طرح پر جاری ہو جاوے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ ہمارے مقاصد کا بہت بڑا مرحلہ طے ہو جاوے گا۔

یہ بھی یاد رہے کہ بیان کرنے والے تقسیم اوقات کے ساتھ بیان کریں اور پھر وہ ان بچوں سے امتحان لیں۔

غرض مَیں جو کچھ چاہتا ہوں وہ تم نے سُن لیا ہے اور میری اصل غرض اور منشاء کو تم نے سمجھ لیا ہے۔ اس کے پورا کرنے کے لیے جو جو تجاویز اور پھر ان تجاویز پر جو اعتراض ہوتے ہیں وہ بھی تم نے بیان کر دیئے ہیں اور مَیں سُن چکا ہوں۔ مَیں مدرسہ کی موجودہ صورت کو بھی پسند کرتا ہوں۔ اس سے نیک طبع بچے کچھ نہ کچھ اثر ضرور لے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہیئے کہ مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ۔ تجربہ کے طور پر سردست ایک سال کے لیے ہی ایسا انتظام کرکے دیکھو کہ ہفتہ وار جلسوں کے ذریعہ ان کو دینی ضروریات سے آگاہ کیا جاوے۔ ہاں عربی زبان کے لیے معقول انتظام ہونا چاہیئے۔ اگر اس کے لیے کچھ نہ ہو تو پھر ہماں آش در کاسہ والی بات ہوگی۔ گویا زبانی تو سب کچھ ہوا مگر عملی اور حقیقی طور پر کچھ بھی نہ ہوا۔

اس بات کو بھی زیرِ نظر رکھ لو کہ اگر ان بچوں پر اَور بوجھ ڈالا گیا تو وہ پاس ہونے کے خیالات میں دو طرفہ محنت نہیں کر سکیں گے۔ ایک ہی طرف کوشش کریں گے۔ اور اگر علیحدہ تعلیم ہوگی تو

اس کے لیے وقت وہی ہے وہ بڑھ نہیں سکتا۔ اس لیے ایک تو وہی صورت ہو سکتی ہے جو زبانی تعلیم کی مَیں نے بتائی ہے۔ اور ایک اَور یہ صورت ہے کہ وہ بچے جو پاس اور فیل کی پروانہ رکھیں بلکہ ان کی غرض خدمتِ دین کے لیے تیار ہونا ہو اور محض دین کے لیے تعلیم حاصل کریں ایسے بچوں کے لیے خاص انتظام کر دیا جاوے مگر اُن کے لیے بھی یہ ضروری امر ہے کہ علوم جدیدہ سے انہیں واقفیت ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اگر علوم جدیدہ کے موافق کسی نے اعتراض کر دیا تو وہ خاموش ہو جاویں اور کہہ دیں کہ ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ اس لیے موجودہ علوم سے انہیں کچھ نہ کچھ واقفیت ضروری ہے تاکہ وہ کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہوں اور ان کی تقریر کا اثر زائل نہ ہو جاوے محض اس وجہ سے کہ وہ بے خبر ہیں۔

ہاں ایک جماعت یہ ہو کہ وہ دونو علوم حاصل کر سکیں اور بجائے خود انہیں وقت کی پروا نہ ہو۔ پھر اس پر مشکل یہ ہوگی کہ استاد مستعد اور مقرر نہیں۔ غرض ہر پہلو کو سوچ کر یہ انتظام کرنے کی بات ہے۔ اس لیے مَیں جب ان تمام اُمور کو مدِّنظر رکھ کر سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں اور سمجھ نہیں سکتا کہ ہمارا جو مطلب ہے وہ کیونکر پورا ہو سکتا ہے۔ اگر موجودہ صورت ہی کو قائم رکھیں اَور کوئی انتظام نہ کیا گیا تو پھر ان ساری تقریروں سے فائدہ کیا ہوا؟ اور اگر اس پر مضامین بڑھا دیں تو استاد واویلا کرتے ہیں کہ وقت تھوڑا ہے اور ساتھ ہی لڑکوں کی صحت کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس نکتہ کو مدِّنظر رکھو کہ ایسے لوگ تیار ہو جاویں گے۔ اس لیے کہ مَیں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے تیار ہوں۔ خدا تعالیٰ نے جو نُوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا (ھود: ۳۸) تو کشتی ہمارے سامنے بنا۔ اسی طرح پر مَیں اس جماعت کو اپنے سامنے تیار کرانا چاہتا ہوں۔ فائدہ اسی سے ہوگا۔

مسیح موعود کی صُحبت کا اثر

مَیں یقیناً کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک ہفتہ ہماری صحبت میں رہے اور اُسے ہماری تقریریں سُننے کا موقعہ مل جاوے تو وہ مشرق و مغرب کے مولوی سے بڑھ جاوے گا۔ اس لیے جو کچھ ہو میرے سامنے ہو۔ آپ لوگ اس کی فکر کریں۔ مَیں اس امر میں تمہارے ساتھ اتفاق رائے کرتا ہوں کہ مدرسہ کو توڑا نہ جاوے۔ ان کے لیے تو تعطیل کا دن مناظرات اور دینیات کے واسطے قرار دیا جاوے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ سب کے سب مولوی ہی ہو جاویں اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر ان میں سے ایک بھی نکل آوے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا مقصد پُورا ہو گیا اور باقیوں کو کم از کم اپنے دین ہی کی خبر ہو جاوے گی اور وہ غیر قوموں کے فتنہ میں نہ پڑ سکیں گے۔

ہماری کسی سے دشمنی نہیں

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مخالف مذہبوں کے لوگوں سے ہمیں کوئی دشمنی نہیں بلکہ ان کے سچے خیرخواہ اور ہمدرد ہیں لیکن کیا کریں ہمارا مسلک اس جرّاح کی طرح ہے جس کو ایک پھوڑے کو چیرنا پڑتا ہے اور پھر وہ اس پر مرہم لگاتا ہے۔ بیوقوف مریض پھوڑے کو چیرنے کے وقت شور مچاتا ہے، حالانکہ اگر وہ سمجھے تو اس پھوڑے کو چیرنے کی اصل غرض اسی کے مفید مطلب ہے کیونکہ جبتک وہ چیرا نہ جاوے گا اور اس کی آلائش دُور نہ کی جاوے گی وہ اپنا فساد اَور بڑھائے گا اور زیادہ مُضر اور مہلک ہوگا۔ اسی طرح پر ہم مجبور ہیں کہ ان کی غلطیاں ان پر ظاہر کریں اور صراطِ مستقیم ان کے سامنے پیش کریں جب تک وہ صراطِ مستقیم اختیار نہ کریں گے تو کیا بن سکتے ہیں؟

آریوں کے بعض غیر معقول عقائد

ایک طرف ایسے لوگ موجود ہیں جو خدا تعالےٰ کے وجود ہی سے مُنکر ہیں اور دوسری طرف ایسے ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کے وجود کا بظاہر اقرار کیا ہے مگر وہ مانتے ہیں کہ اس نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا۔ گویا ذرّہ ذرّہ خود خدا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اس پر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرمیشر سرب شکتی مان ہے۔ یہ کیسا سرب شکتی مان ہے کہ کچھ پیدا نہیں کرسکتا ذرّہ ذرّہ انادی ہے اور رُوحیں انادی ہیں۔ اُن کے خواص اور قویٰ انادی ہیں۔ پھر جوڑنا جاڑنا بھی کوئی کام ہوسکتا ہے۔ میرے نزدیک ایسے عقیدہ میں اور دہریوں کے عقیدہ میں انیس[١٩] اور بیس[٢٠] کا فرق ہے۔ یہ لوگ درحقیقت اللہ تعالےٰ اور اس کی قدرتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ ہم تو اس خدا کو مانتے ہیں جو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرۃ: ١٠٧) ہے......

پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نیستی سے ہستی نہیں ہوسکتی۔ یہ ایسا بیہودہ اور غلط اصول ہے کہ اس کے لیے کسی بڑی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ خواب کے نظارے کس نے نہیں دیکھے؟ یہانتک کہ خواب میں مُردوں سے باتیں کرتا اور کھانے پینے کی چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ وُہ ہستی کہاں سے ہوتی ہے؟ کیا نیستی سے نہیں ہوتی؟

اگر عقل ہوتی اور باپ دادا میں رُوحانیت کا اثر ہوتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔ یہ باتیں یونانیوں کے اندھے فلاسفروں سے لی ہیں۔ اور علمِ دین سے محض بے خبر ہیں۔ علمِ دین کچھ اَور حواس عطا کرتا فلسفی اور طبعی نہیں پہنچ سکتے۔ رؤیا میں سب امور ہست ہوجاتے ہیں بلکہ بعض اوقات رُوحانی امور جسمانی رنگ بھی اختیار کرلیتے ہیں۔ جیسا کہ میری وہ رؤیا ہے جو سُرمہ چشم آریہ میں درج

ہے جس میں سیاہی کے چھینٹے کُرتے پر پڑے تھے اور وہ کُرتہ اب تک موجود ہے۔ یہ عجیب در عجیب اسرار ہیں جنکا ان پر ایمان نہیں وہ ایمان ہی کیا ہے؟

دین وہی ہے جو رُوحانیت سکھاتا ہے اور آگے قدم رکھواتا ہے۔ مَیں افسوس نہیں کرتا کہ ایسی بُری حالت کیوں ہوئی ہے جو اس وقت نظر آ رہی ہے۔ یہ سب اسلام کے کمالات کے ظہور کی خاطر ہوا۔ بُت پرستی سے دست برداری کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم پیدا کر دی۔ یہ لوگ اسلام کی ڈیوڑھی پر ہیں۔ ایک غیب کا دھکّا لگے گا، تو تمہارے بھائی ہو جائیں گے۔[1]

۲۷ر دسمبر ۱۹۰۵ء

مسیح موعود کی بعثت اور سلسلہ کے قیام کی غرض

اعلیٰحضرت حجۃ اللہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک تقریر جو آپ نے ۲۷ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو بعد نماز ظہر و عصر مسجد اقصیٰ میں فرمائی؛

۲۶ر دسمبر ۱۹۰۵ء کی صبح کو مہمان خانہ جدید کے بڑے ہال میں احباب کا ایک بڑا جلسہ اس غرض کے لیے منعقد ہوا تھا کہ مدرسہ تعلیم الاسلام کی اصلاح کے سوال پر غور کریں۔ اس میں بہت سے بھائیوں نے مختلف پہلوؤں پر تقریریں کیں۔ ان تقریروں کے ضمن میں ایک بھائی نے اپنی تقریر میں کہا کہ جہاں تک مَیں جانتا ہوں۔ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ اور دُوسرے مسلمانوں میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ وہ مسیح ابنِ مریم کا زندہ آسمان پر جانا تسلیم کرتے ہیں اور ہم یقین کرتے ہیں کہ وہ وفات پا چکے ہیں۔ اس کے سوا اَور کوئی نیا امر ایسا نہیں جو ہمارے اور ان کے درمیان اصولی طور پر قابلِ نزاع ہو۔ اس سے چونکہ کامل طور پر سلسلہ کی بعثت کی غرض کا پتہ نہ لگ سکتا تھا بلکہ ایک امر مشتبہ اور کمزور معلوم ہوتا تھا اس لیے ضروری امر تھا کہ آپ اس کی اصلاح فرماتے، چونکہ اس وقت کافی وقت نہ تھا۔ اس لیے ۲۷ر دسمبر کو بعد ظہر و عصر آپ نے مناسب سمجھا

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۵ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۰۶ء

کہ اپنی بعثت کی اصل غرض پر کچھ تقریر فرمائیں۔ آپ کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ تاہم محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی :۔

فرمایا :

افسوس ہے اس وقت میری طبیعت بیمار ہے اور مَیں کچھ زیادہ بول نہیں سکتا، لیکن ایک ضروری امر کی وجہ سے چند کلمے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کل مَیں نے سُنا تھا کہ کسی صاحب نے یہ بیان کیا تھا کہ گویا ہم میں اور ہمارے مخالف مسلمانوں کے درمیان فرق موت و حیاتِ مسیح علیہ السلام کا ہے ورنہ ایک ہی ہیں اور عملی طور پر ہمارے مخالفوں کا قدم بھی حق پر ہے یعنی نماز، روزہ اور دُوسرے اعمال مسلمانوں کے ہیں اور وہ سب اعمال بجا لاتے ہیں۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے بارے میں ایک غلطی پڑگئی تھی جس کے ازالہ کے لیے خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ پیدا کیا۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بات صحیح نہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلطی بہت بُری طرح پر پیدا ہوئی ہے لیکن اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ میرا دنیا میں آنا صرف اتنی ہی غلطی کے ازالہ کے لیے ہے اور اَور کوئی خرابی مسلمانوں میں ایسی نہ تھی جس کی اصلاح کی جاتی بلکہ وہ صراطِ مستقیم پر ہیں تو یہ خیال غلط ہے۔ میرے نزدیک وفات یا حیاتِ مسیح ایسی بات نہیں کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ اتنا بڑا سلسلہ قائم کرتا اور ایک خاص شخص کو دُنیا میں بھیجا جاتا اور اللہ تعالیٰ ایسے طور پر اس کو ظاہر کرتا جس سے اس کی بہت بڑی عظمت پائی جاتی ہے یعنی یہ کہ دنیا میں تاریکی پھیل گئی ہے اور زمین لعنتی ہو گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت[1] کی غلطی کچھ آج پیدا نہیں ہو گئی بلکہ یہ غلطی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پیدا ہو گئی تھی اور خواص اولیاء اللہ صلحاء اور اہل اللہ بھی آتے رہے اور لوگ اس غلطی میں گرفتار رہے۔ اگر اس غلطی ہی کا ازالہ مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس وقت بھی کر دیتا مگر نہیں ہوا۔ اور یہ غلطی چلی آئی۔ اور ہمارا زمانہ آ گیا۔ اس وقت بھی اگر نری اتنی ہی بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک سلسلہ پیدا نہ کرتا۔ کیونکہ وفاتِ مسیح ایسی بات تو تھی ہی نہیں جو پہلے کسی نے تسلیم نہ کی ہو۔ پہلے سے بھی اکثر خواص جن پر اللہ تعالیٰ نے کھول دیا۔ یہی مانتے چلے آتے۔ مگر بات کچھ اَور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو قائم کیا۔ یہ سچ ہے کہ مسیح کی وفات[2] کی غلطی کو دُور کرنا بھی اس سلسلہ کی بہت بڑی غرض تھی۔ لیکن صرف اتنی ہی بات کے لیے خدا تعالیٰ

---

[1] یہ لفظ دراصل "حیات" ہے جو سہو کتابت سے "موت" لکھا گیا ہے (مرتب)

[2] سہو کتابت ہے "مسیح کی حیات کی غلطی" ہونا چاہیئے۔ (مرتب)

نے مجھ کو کھڑا نہیں کیا بلکہ بہت سی باتیں ایسی پیدا ہو چکی تھیں۔ کہ اگر ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ ایک سلسلہ قائم کر کے کسی کو مامور نہ کرتا تو دُنیا تباہ ہو جاتی اور اسلام کا نام و نشان مٹ جاتا۔ اس لیے اسی مقصد کو دُوسرے پیرایہ میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بعثت کی غرض کیا ہے؟

حیاتِ مسیح کا فتنہ

وفاتِ مسیح اور حیاتِ اسلام یہ دونوں مقاصد باہم بہت بڑا تعلق رکھتے ہیں اور وفاتِ مسیح کا مسئلہ اس زمانہ میں حیاتِ اسلام کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ حیاتِ مسیح سے جو فتنہ پیدا ہوا ہے وہ بہت بڑھ گیا ہے۔ حیاتِ مسیح کے لیے یہ کہنا کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کو زندہ آسمان پر اُٹھا لے جاتا؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی[1] سے ناواقفی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم تو سب سے زیادہ اس بات پر ایمان لاتے اور یقین کرتے ہیں کہ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (البقرۃ: ۱۰۷)۔

اللہ تعالیٰ بیشک ہر بات پر قادر ہے اور ہم ایمان رکھتے ہیں کہ وہ بے شک وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسے امور سے پاک اور منزّہ ہے جو اس کی صفاتِ کاملہ کے خلاف ہوں اور وہ ان باتوں کا دشمن ہے۔ جو اس کے دین کے مخالف ہوں۔ حضرت عیسٰی کی حیات اوائل میں تو صرف ایک غلطی کا رنگ رکھتی تھی مگر آج یہ غلطی ایک اژدھا بن گئی ہے جو اسلام کو نگلنا چاہتی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں اس غلطی سے کسی گزند کا اندیشہ نہ تھا اور وہ غلطی ہی کے رنگ میں تھی۔ مگر جب سے عیسائیت کا خروج ہوا اور انہوں نے مسیح کی زندگی کو ان کی خدائی کی ایک بڑی زبردست دلیل قرار دیا تو یہ خطرناک امر ہو گیا۔ انہوں نے بار بار اور بڑے زور سے اس امر کو پیش کیا کہ اگر مسیح خدا نہیں تو وُہ عرش پر کیسے بیٹھا ہے؟ اور اگر انسان ہو کر کوئی ایسا کر سکتا ہے کہ زندہ آسمان پر چلا جاوے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آدم سے لے کر اس وقت تک کوئی بھی آسمان پر نہیں گیا؟ اس قسم کے دلائل پیش کر کے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا بنانا چاہتے ہیں اور انہوں نے بنایا اور دنیا کے ایک حصّہ کو گمراہ کر دیا۔ اور بہت سے مسلمان جو تیس لاکھ سے زیادہ بتائے جاتے ہیں اس غلطی کو صحیح عقیدہ تسلیم کرنے کی وجہ سے اس فتنہ کا شکار ہو گئے۔ اب اگر یہ بات صحیح ہوتی اور درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ آسمان پر چلے جاتے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں اور مُسلمان اپنی غلطی اور ناواقفی سے ان کی تائید کرتے ہیں تو پھر اسلام کے لیے تو ایک ماتم کا دن ہوتا۔ کیونکہ اسلام تو دُنیا میں اس لیے آیا ہے

---

[1] اس جگہ کتابت کی غلطی سے کوئی لفظ رہ گیا ہے۔ (مرتب)

تاکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دُنیا کو ایک ایمان اور یقین پیدا ہو اور اس کی توحید پھیلے۔ وہ ایسا مذہب ہے کہ کوئی کمزوری اس میں پائی نہیں جاتی اور نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو وحدہٗ لاشریک قرار دیتا ہے۔ کسی دُوسرے میں یہ خصوصیت تسلیم کی جاوے تو یہ تو اللہ تعالیٰ کی کسرِشان ہے اور اسلام اس کو روا نہیں رکھتا۔ مگر عیسائیوں نے مسیح کی اس خصوصیت کو پیش کر کے دنیا کو گمراہ کر دیا ہے اور مُسلمانوں نے بغیر سوچے سمجھے ان کی اس ہاں میں ہاں ملادی اور اس ضرر کی پروانہ کی جو اس سے اسلام کو پہنچا۔

اس بات سے کبھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ مسیح کو زندہ آسمان پر اُٹھا لے جاوے؟ بیشک وہ قادر ہے مگر وہ ایسی باتوں کو کبھی روا نہیں رکھتا جو مبدأ شرک ہو کر کسی کو شریک الباری ٹھہراتی ہوں اور یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک شخص کو بعض وجوہ کی خصوصیت دینا صریح مبدأ شرک ہے۔ پس مسیح علیہ السّلام میں یہ خصوصیت تسلیم کرنا کہ وُہ تمام انسانوں کے برخلاف ابتک زندہ ہیں اور خواصِ بشری سے الگ ہیں، یہ ایسی خصوصیت ہے جس نے عیسائیوں کو موقع دیا کہ وہ اُن کی خدائی پر اس کو بطور دلیل پیش کریں۔ اگر کوئی عیسائی مسلمانوں پر یہ اعتراض کرے کہ تم ہی بتاؤ کہ ایسی خصوصیت اس وقت کسی اَور شخص کو بھی ملی ہے؟ تو اس کا کوئی جواب اُن کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ یقین کرتے ہیں کہ سب انبیاء علیہم السّلام مر گئے ہیں مگر مسیح کی موت بقول ان مخالف مسلمانوں کے ثابت نہیں کیونکہ توفّی کے معنے تو آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کے کرتے ہیں۔ اس لیے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ (المائدة : ١١٨) میں بھی یہی معنے کرنے پڑیں گے کہ جب تو نے مجھے زندہ آسمان پر اُٹھا لیا۔ اور کوئی آیت ثابت نہیں کرتی کہ اس کی موت بھی ہوگی۔ پھر بتاؤ کہ اُن کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دے اور وہ اپنی غلطی کو سمجھیں۔

مَیں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ مُسلمان کہلا کر اس عقیدہ کی کمزوری اور شناعت کے کُھل جانے پر بھی اس کو نہیں چھوڑتے وہ دشمنِ اسلام اور اس کے لیے مارِ آستین ہیں۔

یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ بار بار قرآنِ شریف میں مسیحؑ کی موت کا ذکر کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ وہ دوسرے نبیوں اور انسانوں کی طرح وفات پا چکے ہیں۔ کوئی امر ان میں ایسا نہ تھا جو دوسرے نبیوں اور انسانوں میں نہ ہو۔ یہ بالکل سچ ہے کہ توفّی کے موت ہی معنے ہیں۔ کسی لغت سے یہ ثابت نہیں کہ توفّی کے معنے کبھی آسمان پر مع جسم اُٹھانے کے بھی ہوتے ہیں۔ زبان کی خوبی لغات کی توسیع پر ہے۔ دُنیا میں کوئی لغت ایسی نہیں ہے جو صرف ایک کے لیے ہو اور دوسرے کے لیے نہ ہو۔ ہاں خدا تعالیٰ کے لیے یہ خصوصیت ضرور ہے اس لیے کہ وُہ

وحدہٗ لاشریک خدا ہے۔ لغت کی کوئی کتاب پیش کرو جس میں توفّی کے یہ معنے خصوصیت سے حضرت عیسیٰؑ کے لیے گئے ہوں کہ زندہ آسمان پر مع جسم اٹھانا ہے اور سارے جہان کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے موت کے ہوں گے۔ اس قسم کی خصوصیت لغت کی کسی کتاب میں دکھاؤ۔ اور اگر نہ دکھا سکو اور نہیں ہے تو پھر خدا تعالیٰ سے ڈرو کہ یہ مبدأ شرک ہے۔ اس غلطی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان عیسائیوں کے مدیون ٹھہرتے ہیں۔ اگر عیسائی یہ کہیں کہ جس حال میں تم مسیح کو زندہ تسلیم کرتے ہو کہ وہ آسمان پر ہے اور پھر اس کا آنا بھی مانتے ہو اور یہ بھی کہ وہ حَکَم ہو کر آئے گا۔ اب بتاؤ کہ اس کے خدا ہونے میں کیا شبہ رہا جبکہ یہ بھی ثابت نہ ہو کہ اس کو موت ہوگی۔ یہ کتنا بڑا مصیبت کا امر ہے کہ عیسائی سوال کرے اور اس کا جواب نہ ہو۔

غرض اس غلطی کا اثر بد اب یہاں تک بڑھ گیا۔ یہ تو سچ ہے کہ دراصل مسیح کی موت کا مسئلہ ایسا عظیم الشان نہ تھا کہ اس کے لیے ایک عظیم الشان مامور کی ضرورت ہوتی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کی حالت بہت ہی نازک ہو گئی ہے۔ انہوں نے قرآن کریم پر تدبر چھوڑ دیا اور ان کی عملی حالت خراب ہو گئی۔ اگر ان کی عملی حالت درست ہوتی اور وہ قرآن کریم اور اس کی لغات پر توجہ کرتے تو ایسے معنے ہرگز نہ کرتے۔ انہوں نے اسی لیے اپنی طرف سے یہ معنے کر لئے۔ توفّی کا لفظ کوئی نرالا اور نیا لفظ نہ تھا اس کے معنے تمام لغت عرب میں خواہ وہ کسی نے لکھی ہوں موت کے کئے ہیں پھر انہوں نے مع جسم آسمان پر اُٹھانے کے معنے آپ ہی کیوں بنا لیے۔ ہم کو افسوس نہ ہوتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی اس لفظ کے یہی معنے کر لیتے کیونکہ یہی لفظ آپ کے لیے بھی تو قرآن شریف میں آیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (یونس ۴۷) اب بتاؤ کہ اگر اس لفظ کے معنے مع جسم آسمان پر اُٹھانا ہی ہیں تو کیا ہمارا حق نہیں کہ آپ کے لیے بھی یہی معنے کریں۔ کیا وجہ ہے کہ وہ نبی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہزارہا درجہ کمتر ہے اس کے لیے جب یہ لفظ بولا جاوے تو اس کے من گھڑت معنے کر کے زندہ آسمان پر لے جاویں لیکن جب سید الاولین والآخرین کے لیے یہ لفظ آوے تو اس کے معنے بجز موت کے اور کچھ نہ کریں۔ حالانکہ آپ کی زندگی ایسی ثابت ہے کہ کسی اور نبی کی ثابت نہیں۔

حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ثبوت

اور اس لیے ہم زور اور دعویٰ سے یہ بات پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی نبی زندہ ہے تو وہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اکثر اکابر نے حیات النبیؐ پر کتابیں لکھی ہیں۔ اور

ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایسے زبردست ثبوت موجود ہیں کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ منجملہ ان کے ایک یہ بات ہے کہ زندہ نبی وہی ہو سکتا ہے جس کے برکات اور فیوض ہمیشہ کے لیے جاری ہوں اور یہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک کبھی بھی مسلمانوں کو ضائع نہیں کیا۔ ہر صدی کے سر پر اس نے کوئی آدمی بھیج دیا جو زمانہ کے مناسب حال اصلاح کرتا رہا یہانتک کہ اس صدی پر اس نے مجھے بھیجا ہے تاکہ میں حیات النبیؐ کا ثبوت دوں۔

یہ امر قرآن شریف سے بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی حفاظت کرتا رہا ہے اور کرے گا جیساکہ فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ١٠) یعنی بیشک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا لفظ صاف طور پر دلالت کرتا ہے کہ صدی کے سر پر ایسے آدمی آتے رہیں گے جو گمشدہ متاع کو لائیں اور لوگوں کو یاد دلائیں۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب پہلی صدی گذر جاتی ہے تو پہلی نسل بھی اُٹھ جاتی ہے اور اس نسل میں جو عالم، حافظِ قرآن، اولیاء اللہ اور ابدال ہوتے ہیں وہ فوت ہو جاتے ہیں اور اس طرح پر ضرورت ہوتی ہے کہ احیاءِ ملت کے لیے کوئی شخص پیدا ہو، کیونکہ اگر دُوسری صدی میں نیا بندوبست اسلام کے تازہ رکھنے کے لیے نہ کرے تو یہ مذہب مر جاوے۔ اس لیے وُہ ہر صدی کے سر پر ایک شخص کو مامور کرتا ہے جو اسلام کو مرنے سے بچا لیتا ہے اور اس کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور دُنیا کو ان غلطیوں بدعات اور غفلتوں اور سُستیوں سے بچا لیتا ہے جو اُن میں پیدا ہوتی ہیں۔

یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے اور یہ آپ کی حیات کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح پر آپ کے برکات و فیوض کا سلسلہ لا انتہا اور غیر منقطع ہے اور ہر زمانہ میں گویا اُمت آپؐ کا ہی فیض پاتی ہے اور آپ ہی سے تعلیم حاصل کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبّ بنتی ہے جیساکہ فرمایا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اٰل عمران: ٣٢) پس خدا تعالیٰ کا پیار ظاہر ہے کہ اس اُمت کو کسی صدی میں خالی نہیں چھوڑتا۔ اور یہی ایک امر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر روشن دلیل ہے۔

بالمقابل حضرت عیسٰیؑ کی حیات ثابت نہیں۔ ان کی زندگی ہی میں ایسا فتنہ برپا ہوا کہ کسی اور نبی کی زندگی میں وہ فتنہ نہیں ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسٰیؑ سے مطالبہ کرنا پڑا کہ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ (المائدۃ: ١١٧) یعنی کیا تو نے ہی کہا تھا کہ

مجھے اور میری ماں کو خدا کو بنا لو۔ جو جماعت حضرت عیسیٰؑ نے تیار کی وہ ایسی کمزور اور ناقابلِ اعتبار تھی کہ خود یہی عیسائی بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔

صحابہؓ اور حواریوں کا موازنہ

انجیل سے ثابت ہے کہ وہ بارہ شاگرد جو اُن کی خاص قوتِ قدسی اور تاثیر کا نمونہ تھے۔ اُن میں سے ایک نے جس کا نام یہودا اسکریوطی تھا۔ اس نے تیس روپے پر اپنے آقا و مُرشد کو بیچ دیا اور دُوسرے نے جو سب سے اوّل نمبر پر ہے اور شاگرد رشید کہلاتا تھا اور جس کے ہاتھ میں بہشت کی کُنجیاں تھیں۔ یعنی پطرس۔ اس نے سامنے کھڑے ہو کر تین مرتبہ لعنت کی۔ جب خود حضرت مسیح کی موجودگی میں ان کا اثر اور فیض اس قدر تھا تو اب اُنیس سو سال گذرنے کے بعد خود اندازہ کرلو کہ کیا باقی رہا ہوگا۔ اس کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت تیار کی تھی وہ ایسی صادق اور وفادار جماعت تھی کہ انہوں نے آپؐ کے لیے جانیں دے دیں، وطن چھوڑ دیئے، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ دیا۔ غرض آپؐ کے لیے کسی چیز کی پروا نہ کی۔ یہ کیسی زبردست تاثیر تھی۔ اس تاثیر کا بھی مخالفوں نے اقرار کیا ہے اور پھر آپؐ کی تاثیرات کا سلسلہ بند نہیں ہوا بلکہ اب تک وہ چلی جاتی ہیں۔ قرآنِ شریف کی تعلیم میں وہی اثر وہی برکات اب بھی موجود ہیں۔

قرآنِ کریم اور انجیل کا موازنہ

اور پھر تاثیر کا ایک اور بھی نمونہ قابلِ ذکر ہے کہ انجیل کا کہیں پتہ ہی نہیں لگتا۔ خود عیسائیوں کو اس امر میں مشکلات ہیں کہ اصل انجیل کونسی ہے اور وہ کس زبان میں تھی اور کہاں ہے؟ مگر قرآن شریف کی برابر حفاظت ہوتی چلی آئی ہے۔ ایک لفظ اور ایک نقطہ تک اس کا ادھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ اس قدر حفاظت ہوئی ہے کہ ہزاروں لاکھوں حافظ قرآن شریف کے ہر مُلک اور ہر قوم میں موجود ہیں جن میں باہم اتفاق ہے۔ ہمیشہ یاد کرتے اور سناتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ آپؐ کے برکات اور زندہ برکات نہیں؟ اور کیا ان سے آپؐ کی حیات ثابت نہیں ہوتی؟

غرض کیا قرآن شریف کی حفاظت کی رُو سے اور کیا تجدید دین کے لیے ہر صدی پر مجدّد کے آنے کی حدیث سے اور کیا آپؐ کی برکات اور تاثیرات سے جو اب تک جاری ہیں آپؐ کی حیات ثابت ہوتی ہے۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی حیات کے عقیدہ نے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچایا ہے؟ کیا اخلاقی اور عملی طور پر اصلاح ہوئی ہے یا فساد پیدا ہوا ہے؟ اس امر پر جس قدر غور کریں گے اسی قدر اس کی خرابیاں ظاہر ہوتی چلی جائیں گی۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ اسلام نے اس عقیدہ سے بہت بڑا

ضرر اُٹھایا ہے یہاں تک کہ چالیس کروڑ کے قریب لوگ عیسائی ہو چکے ہیں جو سچے خدا کو چھوڑ کر ایک عاجز انسان کو خدا بنا رہے ہیں اور عیسائیت نے دُنیا کو جو نفع پہنچایا ہے۔ وہ ظاہر امر ہے خود عیسائیوں نے اس امر کو قبول کیا ہے کہ عیسائیت کے ذریعہ بہت سی بد اخلاقیاں دُنیا میں پھیلی ہیں کیونکہ جب انسان کو تعلیم ملے کہ اس کے گناہ کسی دُوسرے کے ذمہ ہو چکے تو وہ گناہ کرنے پر دلیر ہو جاتا ہے اور گناہ نوعِ انسان کے لیے ایک خطرناک زہر ہے جو عیسائیت نے پھیلائی ہے۔ اس صورت میں اس عقیدہ کا ضرر اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

وفاتِ مسیح کے مسئلہ کو مشیتِ ایزدی نے مخفی رکھا

میں یہ نہیں کہتا کہ حیاتِ مسیح کے متعلق اسی زمانہ کے لوگوں پر الزام ہے۔ نہیں بعض پہلوں نے غلطی کھائی ہے۔ مگر وہ تو اس غلطی میں بھی ثواب ہی پر رہے۔ کیونکہ مجتہد کے متعلق لکھا ہے یُخْطِئُ وَ یُصِیْبُ کبھی مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور کبھی صواب۔ مگر دونوں طرح پر اُسے ثواب ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مشیتِ ایزدی نے یہی چاہا تھا کہ ان سے یہ معاملہ مخفی رہے پس وہ غفلت میں رہے اور اصحابِ کہف کی طرح یہ حقیقت ان پر مخفی رہی جیسا کہ مجھے الہام ہوا تھا۔ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَ الرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا اسی طرح مسیح کی حیات کا مسئلہ بھی ایک عجیب سِرّ ہے۔ باوجودیکہ قرآنِ شریف کھول کھول کر مسیح کی وفات ثابت کرتا ہے۔ اور احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جو آیت استدلال کے طور پر پڑھی گئی۔ وہ بھی اسی کو ثابت کرتی ہے۔ مگر باوجود اس قدر آشکارا ہونے کے خدا تعالیٰ نے اس کو مخفی کر لیا اور آنے والے موعود کے لیے اس کو مخفی رکھا چنانچہ جب وہ آیا تو اس نے اس راز کو ظاہر کیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ وہ جب چاہتا ہے کسی بھید کو مخفی کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اُسے ظاہر کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس نے اس بھید کو اپنے وقت تک مخفی رکھا مگر اب جبکہ آنیوالا آگیا اور اس کے ہاتھ میں اس سِرّ کی کلید تھی اس نے اسے کھول کر دکھا دیا۔ اب اگر کوئی نہیں مانتا اور ضِد کرتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرتا ہے۔

وفاتِ مسیح کا مسئلہ ایک ثابت شدہ امر ہے

غرض وفاتِ مسیح کا مسئلہ اب ایسا مسئلہ ہو گیا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اخفا نہیں رہا۔ بلکہ ہر پہلو سے صاف ہو گیا ہے۔ قرآنِ شریف سے مسیح کی وفات

ثابت ہوتی ہے احادیث وفات کی تائید کرتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ معراج موت کی تصدیق کرتا ہے اور آپ گویا چشم دید شہادت دیتے ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے شب معراج حضرت عیسیٰؑ کو حضرت یحییٰؑ کے ساتھ دیکھا۔ اور پھر آیت قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ۹۴) مسیح کو زندہ آسمان پر جانے سے روکتی ہے۔ کیونکہ جب کفار نے آپؐ سے آسمان پر چڑھ جانے کا معجزہ مانگا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہی جواب دیا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۴) یعنی میرا رب اس وعدہ خلافی سے پاک ہے جو ایک مرتبہ تو وہ انسان کے لیے یہ قرار دے کہ وہ اسی زمین پیدا ہوا۔ اور یہاں ہی مرے گا۔ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ (الاعراف: ۲۶) لیکن تو ایک بشر رسول ہوں یعنی وہ بشریت میرے ساتھ موجود ہے جو آسمان پر نہیں جا سکتی۔ اور دراصل کفار کی غرض اس سوال سے یہی تھی۔ چونکہ وہ پہلے یہ سن چکے تھے کہ انسان اسی دنیا میں جیتا اور مرتا ہے اس لیے انہوں نے موقعہ پا کر سوال کیا جس کا جواب ان کو ایسا دیا گیا کہ ان کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ پس یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے کہ مسیح وفات پا چکے۔ ہاں یہ ایک معجزانہ نشان ہے کہ انہیں غفلت میں رکھا اور ہوشیاروں کو مست بنا دیا۔

مسیح کی موت میں اسلام کی زندگی ہے

یہ بھی یاد رکھو کہ جن لوگوں نے یہ زمانہ نہیں پایا وہ معذور ہیں۔ ان پر کوئی حجت پوری نہیں ہوتی اور اس وقت اپنے اجتہاد سے جو کچھ وہ سمجھے اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجر اور ثواب پائیں گے۔ مگر اب وقت نہیں رہا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس نقاب کو اٹھا دیا اور اس مخفی راز کو ظاہر کر دیا ہے اور اس مسئلہ کے بُرے اور خوفناک اثروں کو تم دیکھ رہے ہو کہ اسلام تنزل کی حالت میں ہے۔ اور عیسائیت کا یہی ہتھیار حیاتِ مسیح ہے جس کو لے کر وہ اسلام پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کی ذریت عیسائیوں کا شکار ہو رہی ہے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ ایسے ہی مسائل وہ لوگوں کو سنا سنا کر برگشتہ کر رہے ہیں اور وہ خصوصیتیں جو نادانی سے مسلمان ان کے لیے تجویز کرتے ہیں سکولوں اور کالجوں میں پیش کر کے اسلام سے جدا کر رہے ہیں۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اب مسلمانوں کو متنبہ کیا جاوے۔[1]

پس اس وقت چاہا ہے کہ مسلمان متنبہ ہو جائیں کہ ترقی اسلام کے لیے یہ پہلو نہایت ضروری ہے

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۶ صفحہ ۲-۳ مورخہ ۱۷؍ فروری ۱۹۰۶ء

کہ مسیح کی وفات کے مسئلہ پر زور دیا جاوے اور وہ اس امر کے قائل نہ ہوں کہ مسیح زندہ آسمان پر گیا ہے مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے مخالف اپنی بدقسمتی سے اس سِرّ کو نہیں سمجھتے اور خواہ نخواہ شور مچاتے ہیں۔ کاش یہ احمق سمجھتے کہ اگر ہم سب مل کر وفات پر زور دیں گے تو پھر یہ مذہب (عیسائی) نہیں رہ سکتا۔ مَیں یقیناً کہتا ہوں کہ اسلام کی زندگی اُس کی موت میں ہے۔ خود عیسائیوں سے پوچھ کر دیکھ لو کہ جب یہ ثابت ہو جاوے کہ مسیح زندہ نہیں بلکہ مر گیا ہے تو اُن کے مذہب کا کیا باقی رہ جاتا ہے؟ وہ خود اس امر کے قائل ہیں کہ یہی ایک مسئلہ ہے جو اُن کے مذہب کا استیصال کرتا ہے مگر مسلمان ہیں کہ مسیح کی حیات کے قائل ہو کر ان کو تقویت پہنچا رہے ہیں اور اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کی وہی مثال ہے ؎

یکے بر سرِ شاخ و بُن مے برید

صلیب کو توڑنے والا ہتھیار

عیسائیوں کا جو ہتھیار اسلام کے خلاف تھا۔ اسی کو ان مسلمانوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی ناسمجھی اور کم فہمی سے چلا دیا جس سے اسلام کو اس قدر نقصان پہنچا مگر خوشی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عین وقت پر اس سے ان کو آگاہ کر دیا اور ایسا ہتھیار عطا کیا جو صلیب کے توڑنے کے واسطے بے نظیر ہے اور اس کی تائید اور استعمال کے لیے اس نے یہ سلسلہ قائم کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور تائید سے اس موتِ مسیح کے ہتھیار نے صلیبی مذہب کو جس قدر کمزور اور سُست کر دیا ہے وہ اب چھُپی ہوئی بات نہیں رہی۔ عیسائی مذہب اور اس کے حامی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی فرقہ اور سلسلہ اُن کے مذہب کو ہلاک کر سکتا ہے تو وہ یہی سلسلہ ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ایک اہلِ مذہب سے مقابلہ کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں مگر اس سلسلہ کے مقابلہ میں نہیں آتے۔ بشپ صاحب کو جب مقابلہ کی دعوت کی گئی تو ہر چند اس کو بعض انگریزی اخباروں نے بھی جوش دلایا مگر پھر بھی وہ میدان میں نہیں نکلا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے پاس عیسائیت کے استیصال کے لیے وہ ہتھیار ہیں جو دُوسروں کو نہیں دیئے گئے اور اُن میں سے پہلا ہتھیار یہی موتِ مسیح کا ہتھیار

[ل] بدر میں ہے:۔ ”تعجب ہے کہ عیسائی تو مسلمانوں کی گردن کاٹنے کے واسطے یہ ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور مسلمان بھی اپنی گردنیں کٹوانے کے واسطے ان کی امداد میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

(بدر جلد ۲ نمبر ۴ صفحہ ۳ مورخہ ۶ جنوری ۱۹۰۶ء)

ہے۔ موت اصلی غرض نہیں۔ یہ تو اس لیے کہ عیسائیوں کا ہتھیار تھا جس سے اسلام کا نقصان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس غلطی کا تدارک کرے، چنانچہ بڑے زور کے ساتھ اس کی اصلاح کی گئی۔

سلسلہ کے قیام کا ایک اور مقصد

اس کے علاوہ ان غلطیوں اور بدعات کو دُور کرنا بھی اصل مقصد ہے جو اسلام میں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ قلتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اس سلسلہ میں اور دُوسرے مُسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر موجودہ مسلمانوں کے معتقدات میں کوئی فرق نہیں آیا اور دونو ایک ہی ہیں تو پھر کیا خدا تعالیٰ نے اس سلسلہ کو عبث قائم کیا؟ ایسا خیال کرنا اس سلسلہ کی سخت ہتک اور اللہ تعالےٰ کے حضور ایک جراَت اور گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار ظاہر کیا ہے کہ دنیا میں بہت تاریکی چھا گئی ہے۔ عملی حالت کے لحاظ سے بھی اور اعتقادی حالت کی وجہ سے بھی۔ وہ توحید جس کے لیے بے شمار نبی اور رسُول دُنیا میں آتے رہے اور انہوں نے بے انتہا محنت اور سعی کی آج اس پر ایک سیاہ پردہ پڑا ہوا ہے اور لوگ کئی قسم کے شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ دنیا کی محبت نہ کرو۔ مگر اب دُنیا کی محبت ہر ایک دل پر غلبہ کر چکی ہے اور جس کو دیکھو اسی محبت میں غرق ہے۔ دین کے لیے ایک تنکا بھی ہٹانے کے واسطے کہا جاوے تو وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے اور ہزاروں عذر اور بہانے کرنے لگتا ہے۔ ہر قسم کی بدعملی اور بدکاری کو جائز سمجھ لیا گیا ہے اور ہر قسم کی منہیات پر کھُلم کھلا زور دیا جاتا ہے دین بالکل بیکس اور یتیم ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں اگر اسلام کی تائید اور نصرت نہ فرمائی جاتی تو اَور کونسا وقت اسلام پر آنے والا ہے جو اس وقت مدد کی جاوے۔ اسلام تو صرف نام کو باقی رہ گیا۔ اب بھی اگر حفاظت نہ کی جاتی تو پھر اس کے مٹنے میں کیا شُبہ ہو سکتا تھا۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ یہ صرف قلت تدبّر کا نتیجہ ہے جو کہا جاتا ہے کہ دوسرے مُسلمانوں میں کیا فرق ہے؟

حُبِّ دُنیا کا فِتنہ

اگر صرف ایک ہی بات ہوتی تو اس قدر محنت اٹھانے کی کیا حاجت تھی۔ ایک سلسلہ قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مَیں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بار بار ظاہر کر چکا ہے کہ ایسی تاریکی چھا گئی ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ توحید جس کا ہمیں فخر تھا اور اسلام جس پر ناز کرتا تھا وہ صرف زبانوں پر رہ گئی ہے ورنہ عملی اور اعتقادی طور پر بہت ہی کم ہونگے جو توحید کے قائل ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا دُنیا کی محبت نہ کرنا۔ مگر اب ہر ایک دل اسی میں غرق ہے اور دین ایک بیکس اور یتیم کی طرح رہ گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے صاف طور پر فرمایا تھا۔ حُبُّ الدُّنیَا رَأْسُ كُلِّ خَطِیْئَۃٍ۔ یہ کیسا پاک اور سچا کلمہ ہے۔ مگر آج دیکھ لو۔ ہر ایک اس غلطی میں مبتلا ہے۔ ہمارے مخالف آریہ اور عیسائی اپنے مذاہب کی حقیقت کو خوب سمجھ چکے ہیں لیکن اب اسے نباہنا چاہتے ہیں۔ عیسائی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے مذہب کے اصول فروع اچھے نہیں۔ ایک انسان کو خدا بنانا ٹھیک نہیں۔ اس زمانہ میں فلسفہ، طبعی اور سائنس کے علوم ترقی کر گئے ہیں اور لوگ خوب سمجھ گئے ہیں کہ مسیح بجز ایک ناتواں اور ضعیف انسان ہونے کے سوا کوئی اقتداری قوت اپنے اندر نہ رکھتا تھا اور یہ ناممکن ہے کہ ان علوم کو پڑھ کر خود اپنی ذات کا تجربہ رکھ کر اور مسیح کی کمزوریوں اور ناتوانیوں کو دیکھ کر یہ اعتقاد رکھیں کہ وہ خدا تھا؟ ہرگز نہیں۔

شرک عورت سے شروع ہوا ہے اور عورت سے اس کی بنیاد پڑی ہے یعنی حوّا سے جس نے خدا تعالیٰ کا حکم چھوڑ کر شیطان کا حکم مانا۔ اور شرکِ عظیم یعنی عیسائی مذہب کی حامی بھی عورتیں ہی ہیں۔ درحقیقت عیسائی مذہب ایسا مذہب ہے کہ انسانی فطرت دُور سے اس کو دھکے دیتی ہے اور وہ کبھی اس کو قبول ہی نہیں کر سکتی۔ اگر درمیان دُنیا نہ ہوتی تو عیسائیوں کا گروہِ کثیر آج مسلمان ہو جاتا۔ بعض لوگ عیسائیوں میں مخفی مسلمان رہے ہیں اور انھوں نے اپنے اسلام کو چھپایا ہے لیکن مرنے کے وقت اپنی وصیت کی اور اسلام ظاہر کیا ہے۔ ایسے لوگوں میں بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ انہوں نے حُبِّ دُنیا کی وجہ سے زندگی میں اسلام کو چھپایا لیکن آخر انہیں ظاہر کرنا پڑا۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ان دنوں میں اسلام نے راہ بنا لیا ہے اور اب وہ ترقی کر رہا ہے۔ حُبِّ دُنیا نے لوگوں کو محجوب کر رکھا ہے۔

غرض مُسلمانوں میں اندرونی تفرقہ کا موجب بھی یہی حُبِّ دُنیا ہی ہوئی ہے کیونکہ اگر محض اللہ تعالےٰ کی رضا مقدم ہوتی تو آسانی سے سمجھ میں آسکتا تھا کہ فلاں فرقے کے اصول زیادہ صاف ہیں اور وہ انہیں قبول کر کے ایک ہو جاتے۔ اب جبکہ حُبِّ دُنیا کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہو رہی ہے تو ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان کہا جا سکتا ہے جبکہ ان کا قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے تو فرمایا تھا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (ال عمران ۳۲:۱) یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھے گا۔ اب اس حُبّ اللہ کی بجائے اور اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے حُبّ الدُنیا کو مقدم کیا گیا ہے۔ کیا یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا دار تھے؟ کیا وہ سُود لیا کرتے تھے؟ یا فرائض اور احکام الٰہی کی بجا آوری میں غفلت کیا کرتے تھے؟ کیا آپؐ میں معاذ اللہ نفاق تھا؟ مداہنہ تھا؟ دنیا کو دین پر مقدم کرتے تھے؟ غور کرو۔ اتباع تو یہ ہے کہ آپؐ کے نقشِ قدم پر چلو اور پھر دیکھو کہ خدا تعالیٰ کیسے کیسے فضل کرتا

ہے۔ صحابہؓ نے وہ چلن اختیار کیا تھا۔ پھر دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچایا۔ اُنہوں نے دُنیا پر لات مار دی تھی اور بالکل حُبِّ دُنیا سے الگ ہو گئے تھے۔ اپنی خواہشوں پر ایک موت وارد کر لی تھی۔ اب تم اپنی حالت کا ان سے مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کیا انہیں کے قدموں پر ہو؟ افسوس اس وقت لوگ نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ ان سے کیا چاہتا ہے۔ رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ نے بہت سے بچے دے دیئے ہیں۔ کوئی شخص عدالت میں جاتا ہے تو دو آنے لے کر جھوٹی گواہی دینے میں ذرا شرم و حیا نہیں کرتا۔ کیا وکلاء قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ سارے کے سارے گواہ سچے پیش کرتے ہیں۔ آج دنیا کی حالت بہت نازک ہو گئی ہے۔ جس پہلو اور رنگ سے دیکھو جھوٹے گواہ بنائے جاتے ہیں۔ جھوٹے مقدمہ کرنا تو بات ہی کچھ نہیں جھوٹے اسناد بنا لیے جاتے ہیں۔ کوئی امر بیان کریں گے تو سچ کا پہلو بچا کر بولیں گے۔ اب کوئی ان لوگوں سے جو اس سلسلہ کی ضرورت نہیں سمجھتے پوچھے کہ کیا یہی وہ دین تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے؟ اللہ تعالیٰ نے تو جھوٹ کو نجاست کہا تھا کہ اس سے پرہیز کرو۔ اِجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج : ۳۱) بُت پرستی کے ساتھ اس جھوٹ کو ملایا ہے جیسا احمق انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پتھر کی طرف سر جھکاتا ہے ویسے ہی صدق اور راستی کو چھوڑ کر اپنے مطلب کے لیے جھوٹ کو بُت بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بُت پرستی کے ساتھ ملایا اور اس سے نسبت دی جیسے ایک بُت پرست بُت سے نجات چاہتا ہے۔ جھوٹ بولنے والا بھی اپنی طرف سے بُت بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس بُت کے ذریعہ نجات ہو جاوے گی۔ کیسی خرابی آ کر پڑی ہے۔ اگر کہا جاوے کہ کیوں بُت پرست ہوتے ہو اس نجاست کو چھوڑ دو۔ تو کہتے ہیں کیونکر چھوڑ دیں اس کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو گی کہ جھوٹ پر اپنا مدار سمجھتے ہیں۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آخر سچ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ بھلائی اور فتح اسی کی ہے۔

سچائی کی برکت

مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ امرتسر ایک مضمون بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خط بھی تھا۔ رلیارام کے وکیل ہند اخبار کے متعلق تھا۔ میرے اس خط کو خلافِ قانون ڈاکخانہ قرار دے کر مقدمہ بنایا گیا۔ وکلاء نے بھی کہا کہ اس میں بجز اس کے رہائی نہیں جو اس خط سے انکار کر دیا جاوے۔ گویا جھوٹ کے سوا بچاؤ نہیں۔ مگر میں نے اس کو ہرگز پسند نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ اگر سچ بولنے سے سزا ہوتی ہے تو ہونے دو جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آخر وہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ ڈاک خانوں کا افسر بحیثیت مدعی حاضر ہوا۔ مجھ سے جس وقت اس کے متعلق پوچھا گیا تو میں نے صاف طور پر کہا کہ یہ میرا خط ہے مگر میں نے اس کو

جزوِ مضمون سمجھ کر اس میں رکھا ہے۔ مجسٹریٹ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو بصیرت دی۔ ڈاکخانوں کے افسر نے بہت زور دیا مگر اس نے ایک نہ سُنی اور مجھے رُخصت کر دیا[1]۔

مَیں کیونکر کہوں کہ جھوٹ کے بغیر گذارہ نہیں۔ ایسی باتیں نری بیہودگیاں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سچ کے بغیر گذارہ نہیں۔ مَیں اب تک بھی جب اپنے اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو ایک مزا آتا ہے کہ خدا تعالےٰ کے پہلو کو اختیار کیا۔ اس نے ہماری رعایت رکھی۔ اور ایسی رعایت رکھی جو بطور نشان کے ہوگئی —
مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق: ۴)"

---

[1] **حاشیہ**: بدر میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ یُوں درج ہے:

تخمیناً ستائیس یا اٹھائیس سال کا عرصہ گذرا ہوگا یا شاید اس سے کچھ زیادہ ہو کہ اس عاجز نے اسلام کی تائید میں آریوں کے مقابل پر ایک عیسائی کے مطبع میں جس کا نام رلیا رام تھا اور وکیل بھی تھا اور امرتسر میں رہتا تھا اور اس کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا ایک مضمون بغرض طبع ہونے کے ایک پیکٹ کی صورت میں جس کی دونوں طرفیں کھلی تھیں بھیجا۔ اور اس پیکٹ میں ایک خط بھی رکھ دیا۔ چونکہ خط میں ایسے الفاظ تھے جن میں اسلام کی تائید اور دُوسرے مذاہب کے بطلان کی طرف اشارہ تھا اور مضمون کے چھاپ دینے کے لیے تاکید بھی تھی اس لیے وہ عیسائی مخالفتِ مذہب کی وجہ سے افروختہ ہوا۔ اور اتفاقاً اس کو دشمنانہ حملہ کے لیے یہ موقعہ ملا کہ کسی علیحدہ خط کا پیکٹ میں رکھنا قانوناً ایک جُرم تھا جس کی اس عاجز کو کچھ بھی اطلاع نہ تھی اور ایسے جُرم کی سزا میں قوانینِ ڈاک کی رُو سے پانسو روپیہ جُرمانہ یا چھ ماہ تک قید ہے سو اس نے مخبر بن کر افسران ڈاک سے اس عاجز پر مقدمہ دائر کرا دیا اور قبل اس کے جو مجھے اس مقدمہ کی کچھ اطلاع ہو۔ رؤیا میں اللہ تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا کہ رلیا رام وکیل نے ایک سانپ میرے کاٹنے کے لیے مجھ کو بھیجا ہے اور مَیں نے اُسے مچھلی کی طرح تل کر واپس بھیج دیا ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ آخر وہ مقدمہ جس طرز سے عدالت میں فیصلہ پایا وہ ایک ایسی نظیر ہے جو وکیلوں کے کام آسکتی ہے۔

غرض مَیں اس جُرم میں صدر ضلع گورداسپور میں طلب کیا گیا اور جن جن وکلاء سے مقدمہ کے لیے مشورہ لیا گیا۔ اُنہوں نے یہی مشورہ دیا کہ بجز دروغگوئی کے اَور کوئی راہ نہیں اور یہ صلاح دی کہ کہ اس طرح اظہار دے دو کہ ہم نے پیکٹ میں خط نہیں ڈالا.....

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)